فاران

کراچی

ملک بھر میں مقبول
کے ٹو
سگریٹ
25 پیسے
میں ۱۰ سگریٹ

ترتیب

چندہ سالانہ :- سات روپے | پبلشر :- مسرور حسین | قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

مقامِ اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مستفیض احمد صدیقی ۔ مسرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپا کر دفتر ماہنامہ فاران کراچی کیمبل اسٹریٹ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اس شمارہ سے سہ ماہی "فاران" کی انیسویں جلد کا آغاز ہو رہا ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اُس مالک و آقا کی بندہ نوازی ہے کہ اٹھارہ سال کی اس طویل مدت میں "فاران" کی ایک اشاعت بھی ناغہ نہیں ہوئی، یہ سلسلہ جب چل نکلا ہے تو پھر رُکا نہیں، یہ ستارہ طلوع ہونے کے بعد پھر کسی دھندلکے سے دوچار نہیں ہوا، زندگی کا حال سمندر جیسا ہے جس میں مد و جزر آتے رہتے ہیں، ہر کسی کے حالات بالکل ایک جیسے کہاں رہتے ہیں، اتار چڑھاؤ سے کوئی زندگی محفوظ نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مسلسل نصرت کے سبب "فاران" کی اشاعت کو کسی "فترت" (طرہ حج ر) سے واسطہ نہیں پڑا، ہم اپنی بے سر و سامانی اور علمی تہی دامانی پر غور کرتے ہیں تو یہ ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے، راقم الحروف نے ایک زمانہ میں یہ شعر کہا تھا؛ ـــــ

مجھ کو بھی خود یقیں نہیں شوق نے کیسے طے کئے
غم کے ہزار مرحلے ہجر کی ایک رات میں

"فاران" کی ادارت و اہتمام کے مرحلہ میں اس شعر کی معنویت کا تجربہ بھی کر لیا۔

اللہ تعالیٰ "رب العالمین" ہے، کفار و مشرکین اور اُس کے فرمان سے دیدہ و دانستہ سرکشی اور بغاوت کرنے والے بھی اُس کے فضل و کرم کے سہارے زندہ ہیں، زندگی میں اُن کو بھی کامیابیاں اور فتح مندیاں اللہ تعالیٰ ہی کے فیضِ ربوبیت سے میسر آتی ہیں، مگر ایک کافر اور مسلمان کے زاویہ نگاہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، کافر اپنی زندگی کی ہر کامیابی راحت و آرام اور آسودگی کو اپنی قوتِ بازو [illegible] اور اپنے سعی و عمل کا حاصل سمجھتا ہے، مگر مسلمان کا یہ ایمان و یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا ہر جاندار کی چوٹی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس کے حکم کے بغیر نہ دل دھڑک سکتا ہے، نہ نبض حرکت کر سکتی ہے نہ آنکھ کی پتلی گردش میں آ سکتی ہے اور نہ سانس کو آمد و شد کی قوت مل سکتی ہے وہ شخص پرلے درجہ کا احسان فراموش، ناشکرا بلکہ کمینہ ہے، جو یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی سعی و عمل ہی کی بدولت زندگی کا قافلہ رواں دواں ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے۔

مری طلب بھی اُسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں

حمد و ستائش اور شکر و سپاس کی حقیقی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا، اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات میں کوئی "علیٰ کل شیٴ قدیر" اور "عالم الغیب والشہادہ" نہیں، وہی مشکل کشا ہے، داتا ہے، کارساز اور ناصر و مددگار ہے، وہی [illegible]

حیات کا خالق ہے اور کسی کی شرکت و اعانت کے بغیر خود ہی اس کارخانہ کو چلا رہا ہے، ابر و باد و مہ و خورشید سب اُس کے محکوم ہیں، وہ دور و نزدیک سے ہر کسی کی آواز صرف وہی سنتا ہے، دلوں کے حالات وہی جانتا ہے، وہی سب کی مشکلیں اور مصیبتیں دور فرماتا ہے! انبیاء کرام سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا مقبول و محبوب کون ہو سکتا ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و کرم کے محتاج رہے ہیں، سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقعہ پر عرفات میں اللہ تعالیٰ سے دعا بھکاریوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر مانگا کرتے تھے، طائف میں جب اللہ کے آخری نبی اور دنیا کے سب سے بڑے انسان پر سخت وقت آکر پڑا ہے، اُس عالم میں انسانِ کامل نے اپنے رب اور معبود کے حضور جو دعا کی ہے، وہ انتہائے بندگی اور اظہارِ تعبد کا غیر فانی منشور ہے!

دورِ حاضر کی معروف اصطلاح میں یوں کہنا چاہئے کہ یہ "فاران" کی اٹھارویں سالگرہ ہے، اور ہم اللہ تعالیٰ کے حضور شکر کے سجدوں سے اس سالگرہ کو منا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اخلاصِ عمل کی بھیک مانگتے ہیں اور مسلسل استقامت کی توفیق چاہتے ہیں! ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ آدمی زبان و قلم سے بڑی اچھی اچھی باتیں کہتا اور لکھتا ہے مگر جب عمل کا موقعہ آتا ہے تو نفس آنکھ مچولی کھیلنے لگتا ہے اور ہوس طرح طرح کے حیلے تراشتی اور معذرتیں پیش کرتی ہے، ہم اپنی اس کمزوری سے ناواقف نہیں ہیں، اور اُس کے لئے کسی قسم کا عذر تراشے بغیر اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور اصلاحِ حال کی التجا اور دعا کرتے ہیں!

ملتِ اسلامیہ کی تاریخ میں پاکبازی اور شرافتِ نفس کا وہ مبارک دور بھی گزرا ہے جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی یہ حالت تھی ——

ع کہ گنہ بھی نہ کیا اور پشیماں رہے

اور آج مسلمانوں کے معاشرے کی یہ حالت ہے کہ گناہ کرتے ہیں اور توبہ کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا بلکہ معصیت پر اُلٹا اتراتے ہیں۔
مگر یہ بندہ کمینہ غفور الرحیم کی بارگاہ میں توبہ و انابت اور شرمندگی و ندامت کی حقیر نذر پیش کرتا ہے!

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے، اُس کی رحمت کا ایک چھینٹا فردِ عمل کی سیاہی کو دھو سکتا ہے: "سبقت رحمتی علی غضبی" ہم جیسے سیاہ کاروں اور توبہ شکنوں کے لئے اس کلمہ رافت و رحمت میں اُمید و تسلی کا دریا ہلکورے لے رہا ہے!

عرضِ حال

"سیاست" کے لفظ سے ہمیں وحشت نہیں ہوتی اور نہ اسے ہم دنیاداری کا دھندا سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے دین میں سیاست بھی شامل ہے، یہ دوسری بات ہے کہ زر پرستوں اور جاہ پسندوں نے اس لفظ کو بدنام کر دیا ہے، ہم اُس دینِ جامع پر ایمان رکھتے ہیں، جو سیاست و حکومت کا بھی حامل ہے، سیاست و حکومت کس لئے؟ اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کے لئے! ہم نہ تو قیصر و کلیسا کی تقسیم کے قائل ہیں اور نہ اس غلط اندیشی کا شکار ہیں کہ دیندار طبقہ کو بس اللہ اللہ سے سروکار رکھنا چاہئے، سیاست و حکومت دنیاداروں کے کرنے کے کام ہیں! حالانکہ کتاب اللہ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا کی زمامِ کار اُن ہاتھوں میں ہونی چاہئے، جو نماز کو قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور امر بالمعروف[1] اور نہی عن المنکر جن کی پالیسی، مسلک اور طریقِ کار ہو!

پاکستان کے ہر دورِ حکومت میں قرآنی ہدایت کا یہ ورق سادہ ہی رہا ہے۔ اس لئے ہمارے قلم نے ہر دور میں نقد و احتساب کا فرض انجام دیا ہے اور ہم نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کسی کی برہمی، خفگی اور عتاب کی پروا نہیں کی، وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو مصلحت شناسی بدل

---

[1] الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ط

اور زمانہ ساز بناتی ہیں ـــــــ لالچ اور خوف ـــــــ ! اللہ تعالیٰ کے فضل سے نہ تو لالچ نے ہم کو زمانہ ساز بنایا ہے اور نہ کسی کے خوف نے ہم میں بزدلی پیدا کی ہے، آرام وراحت اور آسودگی کی خواہش ہم بھی رکھتے ہیں، فقر و فاقہ اور ناداری کی زندگی ہمیں بھی مطلوب نہیں ہے، لوگ حالات سے کن ترکیبوں کے ذریعہ فائدے اٹھاتے ہیں، یہ روایتیں ہمارے کانوں تک بھی پہونچتی ہیں بالتسلیم کا رخ موڑ کر اپنی دنیا ہم بھی بنا سکتے ہیں، اُن لوگوں کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں، جو ابن الوقت بن کر اور زمانہ سازی سے کام لے کر کیا سے کیا ہو گئے ہیں اور راوی جن کے لئے چین ہی چین لکھتا ہے ـــــ مگر اپنی تمام کمزوریوں اور غفلتوں کے باوجود ہم اپنی دنیا بنانے کے لئے اس روش و مسلک اور اُن افکار و نظریات کی تائید نہیں کر سکتے جو ہمارے نزدیک اسلامی مزاج کے آئینہ دار نہیں ہیں وکلمۂ باطل کی تائید میں ہمارے زبان و قلم سے ایک حرف بھی نہیں نکل سکتا

دینی امور میں عائلی قوانین ہوں یا سیاسی معاملات میں اعلانِ تاشقند، ہم نے ہر مسئلہ میں حق کا اظہار کیا ہے اور پیرایہ بدل بدل کر بتایا ہے کہ اسلامی حکومت کے کیا خدوخال ہونے چاہئیں اور اسلامی حکومت چلانے والوں کے کیا صفات ہیں اور اُن کو اخلاق و فراست کے کس معیار پر جانچنا اور پرکھنا چاہئے ـ

انکارِ سنت کی وبا ہو یا فتنۂ قادیانیت ـــــــ یا دوسرے گمراہ مسلک ہوں، ہم نے ان فتنوں اور گمراہیوں کی پوری شدت اور عصبیت کے ساتھ تردید کی ہے، قادیان کے جھوٹے نبی کی تکذیب و تفضیح کو ہم اپنے اعمالنامہ کا سب سے روشن ورق سمجھتے ہیں، متحدہ ہندوستان میں قادیانیوں کے تبلیغی لٹریچر کا ایک ورق بھی ہمارے پاس کبھی نہیں بھیجا گیا، مگر اب چند برس سے پاکستان میں قادیانیوں کی جرأتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ وہ اپنا سرتا پا کفر و ضلالت لٹریچر ہمارے پاس بھیجتے ہیں، جو عام طور پر قرآن کریم کی معنوی تحریف سے آلودہ ہوتا ہے !

شرک و بدعت کی تردید اور توحید کی تبلیغ و تائید ہماری نگارش کا سب سے نمایاں اہم اور مخصوص موضوع رہی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس موضوع پر ہمارے مضامین پڑھ کر نہ جانے کتنے مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح ہوئی ہے، "فاران" کے توحید نمبر نے توحیدِ خالص کی راہ میں سنگِ میل قائم کر دیا ہے ! مگر جن لوگوں کے دلوں میں مشرکانہ رسوم اور بدعات گھر کر چکی ہیں وہ ہمیں وہابی، نجدی، دیوبندی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، اور اپنی ہٹ دھرمی کے باعث "فزادھم اللہ مرضاً" کے مصداق بن گئے ہیں ! اُن کے پاس بس ایک ہی چلتا ہوا فقرہ ہے کہ تمہارا اندازِ تحریر بزرگانِ دین کی شان میں گستاخانہ ہوتا ہے، ہم نے عرض کیا کہ اُن مقامات کی نشاندہی کی جائے، جہاں ہمارا قلم گستاخ ہو گیا ہے، اس کے جواب میں اُن مقامات کی نشاندہی تو وہ کر نہیں سکتے کہ ہم نے گستاخی کا ارتکاب ہی نہیں کیا مگر اپنی بات کی پچ کے لئے مزاح و ظرافت کے پیرایہ میں طنز کئے جاتے ہیں ! ایک بدعتی نے تو گفتگو میں یہاں تک کہہ دیا کہ آپ شرک سے روکتے ہیں، اللہ پاک نے خود شرک کا ارتکاب کیا ہے وہ خود فرماتا ہے ـــــ

*

وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ

جب فکر و نظر کی پستی اور ذہن کی کجی کا یہ عالم ہو جائے، تو کوئی کہے بھی تو کیا کہے !

ہم نے "فاران" میں شروع ہی سے جماعت اسلامی کی تائید و حمایت بلکہ مدافعت کی ہے، ہمارا ضمیر اس پر پوری طرح مطمئن ہے کہ یہ جماعت اقامتِ دین کے لئے کام کر رہی ہے اور اس کی جدوجہد کا موضوع اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے ! اس جماعت کا لٹریچر ہمارے سامنے ہے، جس نے بے شمار لوگوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے، اس جماعت کی قربانیوں سے خاص و عام سب واقف ہیں، اس جماعت کے ارکان خریدے نہیں جا سکتے، کوئی لالچ ان کو رام نہیں کر سکتا اور کوئی دباؤ، خوف اور مصیبت ان کو جھکا نہیں سکتی، جماعت اسلامی کا وجود دین کا مستقل مورچہ اور اسلام کا مستحکم محاذ ہے، یہ وہ تحریک اور تنظیم ہے جس سے دینِ حق کے غالب ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے، جو لوگ اس کے درپئے آزار ہیں وہ دینی محاذ کو دانستہ یا نادانستہ طور پر نقصان پہنچا رہے ہیں اور اسلام کے مورچہ پر چاندماری

کر رہے ہیں۔

"فاران" میں کتابوں پر جو نقد و تبصرہ ہوتا ہے، اُسے اللہ تعالیٰ کے فضل سے دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے، ہم پوری ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ تنقید کا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور ہم نے قصداً کسی شاعر، اہلِ قلم اور مصنف کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی نہیں کی، ہمیں اس بات کا علم ہے کہ ہماری تنقید نے بعض حضرات کو ہمارا مخالف بنا دیا ہے! اگر ہم اس باب میں معذور ہیں، کسی کی خفگی کے خیال اور برہمی کے خوف سے ہم اُس بات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے جو کانٹے کی طرح خود ہمارے وجدان و ضمیر میں کھٹکتی ہے ـــــ

اللہ تعالیٰ کے فضل سے "فاران" کے کاروباری معاملات میں کسی کو ہم سے شکایت پیدا نہیں ہوتی، اس معاملہ میں ہم محتاط بھی ہیں اور حساس بھی ہیں، سینکڑوں روپیہ اس بات کی نذر ہو گیا ہے کہ کسی خریدار نے ایک یا چند شمارے نہ پہنچنے کی شکایت کی تو اُن صاحب کے شوق کے پیشِ نظر یا ان کی طنز خفگی سے متاثر ہو کر ہم نے رجسٹری کے ذریعہ رسالے ڈاک سے دوبارہ بھیجے ہیں! ہم نے ایک لفظ بھی توسیعِ اشاعت کے عنوان سے لکھ کر یا اپنی کسی پریشانی کا اظہار کر کے "فاران" کے خریدار صاحبان کے آرام و اطمینان کو مکدر نہیں کیا۔

نہ لب پہ حرفِ شکایت، نہ آرزو نہ طلب — بڑھا دیے ہیں ترے غم نے حوصلے دل کے

"فاران" کی ظاہری اور معنوی حالت پر ہم مطمئن نہیں ہیں، دوسرے رسالوں کے گیٹ اپ کو دیکھ کر ہمارے اندر بھی ترقی کا جذبہ ابھرتا ہے، ہم بھی مضمون نگاروں کو معاوضہ دینا چاہتے ہیں ــــ مگر چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلائے جاتے ہیں، بال و پر کی قوت ہی کے لحاظ سے پرواز ہو سکتی ہے اور آدمی اپنی وسعت اور وسائل ہی کے مطابق اپنی تمناؤں کے خاکوں میں رنگ بھر سکتا ہے۔

مستقبل کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہو گا! کن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا، کس قسم کے مراحل درپیش ہوں گے، بہرحال آسانیاں ہوں یا مشکلیں، مسرتیں ہوں یا ناخوش گواریاں "فاران" حق کی تائید اور منکر کے خلاف صدائے احتجاج ہی بلند کرتا رہے گا تا آستینوں میں چاہے کتنے ہی بُت چھپے ہوئے ہوں اور رسم آزری کو کتنا ہی فروغ کیوں نہ ہو رہا ہو۔

ــــــ مگر ــــــ

مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

ماہر القادری — ۲۳ مارچ

محمد حفیظ اللہ پھلواری

ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیرؒ

کی

علم پروری

اورنگ زیب عالمگیرؒ کو علوم دینیہ سے انتہائی رغبت تھی۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کا وہ بہت بڑا عالم تھا۔ سرجدو ناتھ سرکار کے بیان کے مطابق عربی اور فارسی میں ایک فاضل محقق کی طرح بولتا اور لکھتا تھا۔ فن خطاطی اور فن انشاء میں بڑی مہارت تھی۔ بادشاہی کے زمانے میں اپنے قلم سے قرآن مجید لکھا کرتا تھا۔ اس کے انشاء اور خط کے متعلق مقدمہ عالمگیر ص۱۰ تا ص۲۰ میں بہت سی شہادتیں جمع کی گئی ہیں۔ اس کے لکھے ہوئے قرآن پاک کے چھ نسخوں اور پنج سورہ ول کی نشان دہی کی گئی ہے، جو مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس کے بعد تحریر ہے کہ یہ واقعہ عجائب میں شمار ہوگا کہ اورنگ زیب جس کلام مجید میں تلاوت کیا کرتا تھا، وہ اس وقت کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ملکیت ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن پاک کا ایک نایاب نسخہ ٹیپو سلطانؒ کے کتب خانے میں تھا۔ جس کی زیب و زینت پر نو سے ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ مقام شکر ہے کہ سلطانی کتب خانے کا یہ انمول موتی زمانہ کی دست برد سے بچ گیا لیکن بدر مخالف کے جھونکوں نے اسے ہندوستان سے لندن پہنچا دیا اور اب یہ وہاں ونڈر کیسل (WINDER CASTLE) کے کتب خانہ کی زینت بنا ہوا ہے۔ (رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن بحوالہ اسلامی کتب خانے)

مآثر عالمگیری میں تحریر ہے کہ:۔

"قبلۂ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ علوم دینیہ یعنی فقہ و تفسیر و حدیث کی تحصیل ہے، جہاں پناہ کو حضرت امام غزالیؒ کی تصنیفات اور شیخ شرف الدین یحیٰ منیری بہاری کے مکتوبات اور شیخ زین الدین و قطب محی الدین شیرازی کے رسائل سے خاص شوق تھا، اور یہ کتابیں اکثر مطالعے میں رہتی تھیں۔

۔ حضرت کے فضائل میں سب سے اہم و عظیم الشان امر حفظ قرآن مجید کی سعادت ہے۔ ....

۔ قبلۂ عالم نے شروع حفظ کی تاریخ خود قرآن کریم کی آیت سنقرئک فلا تنسیٰ ـــــ ہے اور ختم کلام مجید کا سنہ لوح محفوظ کے اعداد سے برآمد ہوتا ہے۔

نیز خط نسخ نہایت خوب تحریر فرماتے تھے اور اس کی کتابت پر حضرت کو خاص قدرت حاصل تھی۔ جہاں پناہ نے دو قرآن مجید اپنے قلم خاص سے تحریر فرما کر مبلغ سات ہزار روپیہ ان کی جلد بندی اور جدول کی زیب و زینت میں صرف فرمائے اور دونوں نسخے مدینہ منورہ میں حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر بطور تحفہ نذر کھائے۔"

حضرت خواجہ معصوم سرہندیؒ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کرکے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی تجدید اور اصلاح میں لگے تھے، اورنگ زیب کا فطری اور ذہنی رجحان بھی ان ہی تعلیمات کی طرف تھا اس لئے وہ حضرت خواجہ معصوم کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا اور ان سے تعلیم پاکر اورنگ زیب کی سعادتی بصیرت اور مجلا ہو گئی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عربی، فارسی، ترکی (چغتائی) اور ہندوستانی چار زبانیں بوجہ احسن جانتا تھا اور ان زبانوں میں بے تکلف گفتگو کرتا تھا۔

مرآت العالم میں درج ہے کہ عالمگیر ہفتہ میں تین روز احیاء العلوم اور دیگر کتب محمد قنوجی کے ساتھ پڑھتا تھا۔ غالباً آل تیموریہ میں یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے قرآن مجید حفظ کیا۔ ۳۵ سال کی عمر (۱۰۶۲ھ) میں حفظ کرنا شروع کیا اور ختم حفظ ۱۰۶۸ھ میں کیا۔ اورنگ زیب چونکہ علم دین اور علمائے شریعت کی خدمت و اعانت میں زیادہ مصروف رہتا تھا اس لئے فنون لطیفہ کی طرف کم متوجہ ہوتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اہل علم میں شعر و سخن کا ذوق بدستور قائم تھا اور نعمت خاں عالی، عاقل خاں رازی، سید اشرف ماژندرانی، روشن ضمیر ایرانی، رفیع خاں باذل، محمد طاہر اصفہانی، غلام علی تحسین عبد الباقی اصفہانی اور محمد افضل سرخوش (صاحب تذکرہ) وغیرہ عالمگیر کے شعراء میں شامل ہیں (ثقافت اسلامیہ)

اورنگ زیب کو شاعری سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، ہاں ایسی شاعری پسند تھی جو مصلح اخلاق ہوتی۔ اس کے عہد میں شعراء کا بازار سرد تھا۔ وہ خود بھی کبھی کبھی شعر کہتا۔ اس کا ایک بلیغ شعر ہے :-

غم عالم مرا داداست و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

اس نے ملک الشعراء کا عہدہ موقوف کر دیا، مرزا بیدل، نظرت، ناصر علی سرہندی اور نعمت خاں اس کے زمانے کے شعراء ہیں (موج کوثر) سلطنت مغلیہ کا قدیم دستور تھا کہ جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھتا تو سب شعراء پایہ تخت سکہ کہہ کر لاتے جس کا سکہ پسند ہوتا اسے ایک لاکھ روپیہ انعام ملتا۔ عالم گیر کے لئے بھی شعراء سکہ کہہ کر لائے۔ عالم گیر نے کہا کہ ہم نے بھی سکہ کہا ہے تم سب اپنی رائے ظاہر کرو۔

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

سب کو بالاتفاق اقرار کرنا پڑا کہ حقیقت میں اس سے بہتر کوئی سکہ نہیں۔ (تاریخ ملت) علامہ شبلیؒ اورنگ زیب کے رقعات کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس کے رقعے باوجود اس کے کہ واقعات کا ذخیرہ قصہ طلب حوالوں کا مجموعہ اور جغرافیانہ اطلاعوں کی یادداشت ہیں، تاہم ادائے مطلب کی قدرت عبارت کی سادگی، فقروں کی ہمواری، مطالب کا اختصار، پہلو بہ پہلو جملے، دلنشین ترکیبیں، نہایت حیرت انگیز ہیں۔

اس عہد کے مشہور علماء شیخ احمد (ملا جیون) امیٹھوی، قاضی محب اللہ بہاری، ملا محمد عوض، بختاور خاں، ہمت خاں، میر یحیٰ، ملا شفیعائی شعراء میں مولوی خاں، شیخ ناصر علی سرہندی، نعمت علی، عاقل خاں رازی، ملا اشرف ماژندرانی اور بھاشا کا سب سے مشہور ہندو شاعر بھوشن کوی اور مسلمان شعراء دانا اور عبد الجلیل بلگرامی، اورنگ زیب کے دربار میں تھے۔ غرض الفنسٹن کے الفاظ میں اورنگ زیب کا دربار دوسرے شہنشاہان مغلیہ کی طرح علماء و فضلاء کا مرجع تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر کو علم و فضل کی تاسیس و ترویج کا بے حد شوق تھا اس لئے برصغیر ہند و پاکستان کے تمام شہروں اور قصبات میں علماء اور مدرسین کو مناسب وظیفے، روزینے اور املاک عطا کئے تاکہ یہ لوگ درس و تدریس میں مشغول رہیں۔ طلباء کے لئے ہر علاقہ میں ان کے حالات و رتبہ اور استعداد کے مطابق

ے پچیس سال ہوئے کابل کے مجلہ "انیس" میں اورنگ زیب عالمگیر کی ایک غزل میری نگاہ سے گزری تھی جس میں اورنگ زیب کا تخلص "عزت" درج تھا۔ (ماہر القادری)

وجوہ معیشت مقرر کئے گئے تھے، بہرحال اس میں معتد بہ رقم صرف ہوتی تھی اور شاہی فیاضی اور سخاوت کی بدولت طلبا کی تعداد بڑھ گئی اور وہ اطمینان و سکون کے ساتھ علوم و فنون کے حاصل کرنے میں مشغول رہتے۔ (عالمگیر نامہ)

مستعد خاں کے بیان کے مطابق جس قدر خیرات و مبرات اورنگ زیب کے عہد میں ہوئی اور جس قدر وظائف علماء، فقراء اور دیگر اہل احتیاج کو عطا کئے گئے اس کا عشر عشیر بھی کبھی کسی سابقہ حکومت میں رو نما نہ ہو سکا۔ تمام ممالک محروسہ کی مسجدوں کی تعمیر اور امام، مؤذن و خطیب کے تقررات ہمیشہ حکومت کی طرف سے ہوا کرتے تھے۔

مکرمت خاں، دیوان گجرات کو ایک فرمان بھیجا تھا کہ تمام مملکت میں علماء اور مدرسین مقرر کئے جائیں اور طلباء کو میزان سے لیکر کشاف تک تعلیم دی جائے اور سرکاری خزانہ سے طلبا کو وظیفے دئے جائیں۔ صوبہ گجرات کو علمی حیثیت سے خاص شہرت حاصل تھی اسے اورنگ زیب زینت ہندوستان کہا کرتا تھا۔ گجرات کے بوہروں کی تعلیم کے لئے اورنگ زیب نے بڑی کوشش کی۔ ان کے لئے تعلیم کو لازمی اور جبری قرار دیا تھا ان کے لئے ماہانہ امتحانات کا طریقہ ایجاد کیا۔ امتحان کے نتائج کی اطلاع اورنگ زیب کو دی جاتی تھی۔ ۱۶۷۸ء میں عالمگیر نے ایک بڑی رقم گجرات کے مدارس کی مرمت کے لئے منظور کی (مرآۃ احمدی)

اورنگ زیب کے زمانہ میں سیالکوٹ کو بھی علمی مرکزیت حاصل تھی۔ یہاں بڑے بڑے علماء و فضلاء تھے، اور ایک عظیم الشان دارالعلوم تھا ——
اورنگ زیب نے جبری تعلیم جاری کی تھی جس کی وجہ سے ہر شہر اور قصبہ میں سرکاری و غیر سرکاری مدرسے قائم ہو گئے تھے۔ بعض علاقوں میں تو مدرسوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ (اسلامی کتب خانے) مسٹر کین (KEENE) کے بیان کے مطابق اورنگ زیب نے اپنے حدود مملکت میں بے شمار دارالعلوم اور مدارس قائم کئے۔ اورنگ زیب کے دور حکومت میں برصغیر ہند و پاکستان کی تعلیمی حالت کے متعلق کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے :—

"شہر ٹھٹھہ (سندھ) علوم فقہ، فلسفہ و سیاست کے لئے مشہور ہے۔ ان علوم میں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لئے چار سو کالج یہاں ہیں"

عالمگیر کے عہد کی علمی و تعلیمی ترقیاں برصغیر ہند و پاکستان میں یہاں کے شاہان سلف سے بڑھ کر تھیں، مرکزی شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبات اور بستیوں میں بھی تعلیم پھیلانے کے لئے منجانب حکومت اور امراء مدرسے قائم کئے گئے، یہ مدارس علماء کے مدرسوں کے علاوہ تھے۔ طالب علموں کے لئے وظیفے جاری کئے اور ذاتی مدرسے جن علماء کے تھے ان کو سرکاری مدارس کے مدرسین کی طرح معیشت کی طرف سے فارغ البال کیا اور جاگیریں عطا کیں۔

عالمگیر کے عہد میں دونوں قسم کے مدرسے قائم تھے، شاہی مدرسے جن کے پورے مصارف حکومت کی طرف سے ادا ہوتے تھے اور جن کا انتظام و انصرام بھی حکومت کے متعلق تھا، دوسرے وہ مدرسے جو ارباب خیر اور علماء دین خود اپنی طرف سے جاری کرتے تھے، عالمگیر نے پہلی قسم کے مدرسوں کے لئے ہر صوبہ میں یہ انتظام کر دیا تھا کہ مدرسین اور طالب علموں کی تنخواہیں اور وظیفے اسی صوبہ کے خزانہ سے ادا کئے جائیں اور صوبہ دار مدرسین سے تنخواہوں کی وصولی کا سیاہہ حاصل کر کے خزانہ میں داخل کر لیا کرے اور غیر سرکاری مدرسوں کو وقتاً فوقتاً شاہی خزانہ سے امداد دیا کرتا تھا۔ (مرآۃ احمدی)

ایک بار مدرسہ سیف خاں کو ۱۵۸۰ روپے بھیجے گئے۔ موضع سوندرہ پرگنہ سانولی اور موضع سیمہ پرگنہ کڑا کے مدارس کے لئے یومیہ مقرر کئے گئے غنی عبید اللہ گوپاموی کو ایک فرمان کے ذریعہ زمینداری عطا کی۔ اکرام الدین حیدر نے احمد آباد میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپیہ کے صرف سے ایک مدرسہ تعمیر کیا ساتھ شہنشاہ اورنگ زیب سے امداد طلب کی۔ عالمگیر نے دو گاؤں سوندرہ اور سیہا بطور جاگیر مدرسے کے نام وقف کر دئے (مرآۃ احمدی) بارہ روپے یومیہ محتاج طلباء کے لئے منظور کئے گئے۔ تحفۃ الکرام کے بیان کے مطابق عالمگیر نے مدرسہ بہتین کے مدرس مخدوم طالب اللہ کو مدرسہ کے لئے

اس سلسلہ میں مولانا عبد الحلیم شرر مرحوم لکھتے ہیں :—

عہد اکبری میں . . . لکھنؤ ایک اچھی تجارت گاہ بن گیا تھا اور ترقی کے اس درجہ کو پہنچا کہ ایک فرانسیسی تاجر گھوڑوں کی

تجارت کرتا تھا یہاں قیام کر کے نفع حاصل کرنے کی کوشش کی اور عباس شاہی سے لکھنؤ کے قیام کے لئے سند رہائش حاصل کر کے یہاں اپنا اصطبل قائم کیا اور پہلے ہی سال میں اس قدر پھولا پھلا کہ چوک کے متصل چار عالی شان مکان تعمیر کر لئے۔ سال ختم ہونے پر جب اس نے پروانہ رہائش کی تجدید چاہی تو اسے قیام کی اجازت نہ ملی اس پر بھی اس نے زبردستی ٹھیرنے کا ارادہ کیا تو حسب الحکم شہنشاہی حکام شہر نے اس کے مکانات ضبط کر کے نزول سرکار کر لئے اور اسے وہاں سے نکال دیا۔ وہ چاروں مکان مدت تک سرکار کے قبضے میں رہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جب ملا نظام الدین سہالوی نے اپنے قصبے کے فسادوں سے عاجز آکے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو عطیۂ سرکار کے طور پر وہ چاروں مکان انہیں دے دیئے گئے۔ انہوں نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ آکے ان مکانوں میں سکونت اختیار کی جو اپنے گردوپیش کے بہت سے مکانات سمیت آج تک "فرنگی محل" کہلاتے ہیں۔ ملا صاحب کے قدوم کی برکت سے لکھنؤ علم و فضل کا مرکز اور طلبۂ علوم کا مرجع و ماویٰ بن گیا۔ اس علمی مرجعیت کو اس قدر ترقی ہوئی کہ ملا نظام الدین کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم جو سلسلہ نظامیہ کہلاتا ہے مدت دراز سے ہندوستان ہی کا نہیں سارے ایشیا کا نصاب تعلیم ہے اور علمی کمالات کے ساتھ اس میں ولیٰ نہ برکتیں بھی مضمر تصور کی جاتی رہیں اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قدیم زمانے میں کہاں کہاں اور کتنی کتنی دور کے طلبا و علوم لکھنؤ میں جمع رہتے ہوں گے . . . .

" چند ہی روز میں فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلیٰ ترین یونیورسٹی بنا دیا کہ سارے ہندوستان کے علما و فضلا کا مرکز لکھنؤ کا یہ چھوٹا سا محلہ قرار پا گیا۔

دیوبند میں دارالعلوم کے قیام سے کئی سو برس پہلے درس و تدریس کا سلسلہ عہد مغلیہ میں شروع ہو گیا تھا۔ عالمگیر نے یہاں ایک خانقاہ کے اخراجات کے لئے کچھ جاگیریں عطا کی تھیں۔ اس خانقاہ سے متعلق ایک کتب خانہ بھی تھا جس میں کتابوں کا بہترین ذخیرہ موجود تھا۔ (اسلامی کتب خانے)

نیز دلی کا وہ سرچشمۂ علم و فن جس کے فیوض و برکات سے سارے برصغیر ہندو پاکستان کی علمی تشنہ کامی دور ہوئی، وہ عالمگیر ہی کے عہد میں قائم ہوا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم دہلوی نے اس مدرسہ کو قائم کیا تھا۔ (عہد اسلامی کا ہندوستان)

عالمگیر کے عہد میں بنگال کا حاکم شائستہ خاں جہاں گیا وہاں مدرسے اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ڈھاکہ میں لب دریا ایک مدرسہ مع مسجد بنوایا۔ بہمنی دور میں محمد شاہ بہمنی کے وزیر اعظم خواجہ محمود گاواں نے ذاتی صرفہ سے درس و تدریس کے لئے بیدر میں ایک شاندار عمارت تعمیر کی تھی۔ خواجہ کے قتل اور بہمنی خاندان کے خاتمہ کے بعد عربی و فارسی کا یہ مرکز تباہ ہو گیا۔ عالمگیر غازی نے مدرسہ کی بے کسی اور بربادی سے متاثر ہو کر اس کی درستی اور تعمیر و ترمیم کا انتظام کیا اور حکم دیا کہ پچھلی حالت پر لانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ مدرسہ میں درس و تدریس کا کام بھی شروع ہو گیا۔ عالمگیر نے بیجاپور کے نامور عالم اور مقدس بزرگ صبغتہ اللہ مدنی کے جانشین مولانا محمد حسین کو منتخب فرما کر اس مدرسہ کی بیش الخدمت امام المدرسین پر مامور فرمایا اور مدد معاش کے طور پر کونٹوا وغیرہ مواضعات جاگیریں دے دیئے۔ (مضمون سید محمد بیدری انصاری)

شیخ احمد عرف ملا جیون امیٹھوی عالمگیری دربار کے علما میں شامل تھے، اورنگ زیب نے ان سے کلام پاک کی تفسیر کا درس لیا تھا۔ استاد الملک کا خطاب ملا اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار کی جاگیر ان کے مدرسہ کے لئے عطا کی گئی (مفتی انتظام اللہ شہابی) سورت کے ایک بزرگ سید سعد اللہ تھے عالمگیر کو ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا تو اس نے ان کی خانقاہ کے لئے ایک مکان اور ان کے اخراجات کے لئے دو گاؤں وقف کر دیئے۔

حضرت شیخ عبداللطیف برہان پوری کے ایک خاص مرید ملا قطب بانس بلمان کے رہنے والے تھے اورنگ زیب نے ان کی خدمت میں چار لاکھ دام پیش کئے اور ایک گاؤں بھی ان کے نام سے موسوم کیا جس کا نام قطب آباد رکھا گیا۔ (مرآۃ العالم)

عالمگیر ترکستانی علماء کو بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ترکستان کے بعض علماء کی مالی خدمت کرتا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مشہور ترکستانی عالم خواجہ عبدالغفار کی طرف سے جو مکتوب آتا تھا اس کے جواب میں پانسو روپے حتیٰ کہ بعض اوقات دس ہزار روپے بھیج دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی بعض پیداوار بھی۔ عالمگیر نامہ میں توران کے عالمگیر کے وظیفہ خوار علماء و مشائخ کی ایک طویل فہرست بھی درج ہے۔ ترکستان اور ایران سے جو علماء ہندوستان آتے تھے، عالمگیر کی طرف سے ان کی بڑے اعزاز کے ساتھ پذیرائی ہوتی تھی۔ چنانچہ سابق والی ازبک نظر محمد خاں کا داماد اور ترکستان کا مشہور عالم خواجہ یعقوب جب ہندوستان پہونچا تو اس کے لئے دس ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی اورنگ زیب نے تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قائم کیا تھا جس میں علماء و فضلاء جمع تھے اور کار آمد کتابیں تصنیف و تالیف ہوتی تھیں۔ اس شعبہ کی بہترین یادگار "فتاویٰ عالمگیری" ہے۔ علماء و فضلاء کا ایک گروہ جو پایۂ تخت میں موجود تھا اس کام میں مشغول ہوا۔ اور ہندو پاکستان کے اطراف میں جو شخص علم فقہ میں شہرت اور کمال رکھتا تھا، شاہی فرمان کے رو سے طلب کر کے ان کا شریک کار بنایا گیا اور تمام علماء و فضلاء معقول وظیفہ کے ساتھ اس کام میں مشغول رہے۔ علماء اور فقہا کی اس جماعت کی صدارت شیخ برہان پوری کو تفویض ہوئی تھی۔ آٹھ سال کی مدت میں یہ کتاب تیار ہوئی اس کتاب کی تیاری میں دو لاکھ روپیے صرف ہوئے (بزم تیموریہ) یہ کتاب متعدد جلدوں میں بصرفِ کثیر تیار ہوئی تھی اس کے لئے پوری سلطنت کے فقہا جمع ہو گئے تھے (حیدغا نقد سرکار) اس کی تالیف میں عالمگیر کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ فتاویٰ کا ہر صفحہ خود پڑھا کرتا اور حوالوں کا اصل کتابوں سے مقابلہ کرتا۔ اس سلسلہ میں حدیث و فقہ کی ان گنت کتابوں سے استفادہ کیا گیا جو سب شاہی کتب خانہ میں موجود تھیں (اسلامی کتب خانے)

حضرت شاہ ولی اللہؒ "انفاس عارفین" میں لکھتے ہیں کہ ان دنوں میں عالمگیر کو اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں انتہا سے زیادہ اہتمام تھا۔ ملا نظام (افسر سررشتہ تدوین) روزانہ ایک صفحہ بادشاہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے۔ اس کے معنی بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ کتاب فتاویٰ عالمگیری اورنگ زیب کے صرف حکم یا روپیہ کی امداد ہی سے مرتب نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کی تدوین و تصحیح میں بہ نفس نفیس خود بادشاہ بھی شریک تھا۔" (تذکرہ شاہ ولی اللہ)

حضرت شاہ ولی اللہ کے نانا شیخ وجیہ الدین اورنگ زیب عالمگیر کے لشکر میں ایک ممتاز سوار تھے۔ اور ان کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم دہلی کے نہایت نامور عالم دین اور صاحب دل بزرگ تھے، جنہوں نے پرانی دہلی میں ایک دینی درسگاہ "مدرسہ رحیمیہ" کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ آپ دربار شاہی سے الگ تھلگ رہ کر درس و ارشاد ہی میں مصروف رہتے تھے۔ البتہ حضرت اورنگ زیب عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تدوین میں انہیں شامل کر لیا تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کا ترجمہ فارسی میں مولانا چلپی عبداللہ رومی نے کیا۔ ملا محمد یعقوب صاحب درس تھے، انہوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا (مرآت العالم) ملا عبداللہ ابن ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے ہدایہ پر حاشیہ لکھا۔ عالمگیر نے دو سو اشرفی اور ایک ہاتھی پیش کیا۔ (مآثر عالمگیری)

مولانا نورالحق کئی کتابوں کے مصنف تھے، آپ کی سب سے مشہور تالیف شرح صحیح بخاری ہے جو چھ جلدوں میں مکمل ہوئی، اورنگ زیب سے منسوب کی گئی (معدن کو ثر)

اورنگ زیب کے عہد میں "مرآۃ العالم" کے نام سے بختاور خاں نے ایک تاریخ لکھی، نیز اولیاء و مشائخ کے حالات میں علیحدہ ایک کتاب فارسی میں "ریاض الاولیا" تصنیف کی۔ اورنگ زیب عالمگیر کی نگرانی میں جو کتابیں تیار ہوتی تھیں وہ چند ہی سال کے عرصہ میں وسط ایشیا کی تمام درسگاہوں میں پہونچ جاتی تھیں۔ بقول جادو ناتھ سرکار، اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا اور زندگی کے آخری سانس تک کتابوں سے محبت رکھتا تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کے سلسلہ میں خود عالمگیر نے بھی بہت سی کتابیں بیرون ہند و پاکستان سے منگائی تھیں۔ عالمگیری عہد کے ایک بزرگ ملا محب اللہ بہاری نے اپنی کتاب "مسلم الثبوت" کی تصنیف کے زمانے میں اصول فقہ کی کتابوں کا جو ذخیرہ جمع کیا تھا وہ پورا ہند و پاکستان سے باہر کی تصانیف پر مشتمل تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر احکام قرآن و حدیث کی ترویج و اجراء کی طرف زیادہ مائل تھا، اس لئے شاہی کتب خانہ اسلامی علوم و ادب کا ایک مخزن بن گیا تھا جس کے لئے اطراف عالم سے کتابیں حاصل کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ (اسلامی کتب خانے) غرض عالمگیر کا شاہی کتب خانہ اسلامیات کی کتابوں کا مخزن ہونے کی وجہ سے بے نظیر تھا۔ عالمگیر کے کتابی ذوق کا شہرہ سن کر ہرات سے اس کی خدمت میں قرآن کا ایک نفیس نسخہ بھیجا گیا تھا۔ یہ قرآن پاک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس پر ہرات سے آنے کی تاریخ ۸ ار شوال ۱۰۹۰ھ؟ درج ہے۔ محمد اسحاق نے تفسیر بیضاوی کا ایک قلمی نسخہ

خدمت میں پیش کیا۔ سید فتح محمد نے مصحف مجید پیش کیا۔ محمد اکبر معزول لکھن نے بجواہ احمد عرف ہدایت کیش کی معرفت مشکوٰۃ شریف پیش کر کے گذرانی۔ سرہند شریف کے پیرزادہ نور الحق نے ایک رسالہ پیش کیا اور گلبرگہ کے پیرزادے سید اللہ نے قرآن مجید۔

اگرچہ شہنشاہ اورنگ زیب نے فن تصویر کشی کی قدر افزائی نہیں کی، لیکن فن خطاطی کا وہ بڑا سرپرست تھا۔ اس نے اپنے کتب خانے کے ناظم اور دربار کے خطاط سید علی خان جواہر رقم سے اس فن کی باقاعدہ تحصیل کی تھی۔ جواہر رقم نستعلیق میں میر عماد کا پیرو تھا۔ بادشاہ کو نسخ اور نستعلیق دونوں میں دست گاہ تھی، بایں ہمہ وہ اپنے ایک اور ناظم کتب خانہ ہدایت اللہ خاں زریں رقم کے خط کا بڑا مداح تھا، جس کا ذکر اس نے اپنے رقعات میں بھی کیا ہے۔

اورنگ زیب کے عہد میں اس فن کے بعض ہندو ماہرین بھی موجود تھے۔ مثلاً پنڈت لکشمی رام، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی کسن سنگھ (ثقافت پاکستان)

عالمگیری عہد کا ایک قرآن شریف پٹنہ (صوبہ بہار) کے مارواڑی جالان (رائے بہادر) کے پاس ہے۔ یہ اول تا آخر سونے کے حروف میں ہے اور فن کار نے نقاشی کا فن اس پر ختم کر دیا ہے۔ (اسلامی کتب خانے)

اورنگ زیب نے موسیقی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ گانے والے بے روزگار ہو گئے۔ گانے والوں نے جنازے تیار کئے اور روتے پیٹتے ان جنازوں کو لے چلے اور قلعہ کے دروازے پر اس وقت پہونچے جبکہ شہنشاہ نماز کے لئے مسجد جا رہا تھا۔ اورنگ زیب کی نظر ان جنازوں پر پڑی تو دریافت کیا کہ "یہ کن کے جنازے ہیں۔" جواب میں کہا گیا کہ — "چونکہ آپ نے موسیقی کو ممنوع کر دیا ہے اور اس فن کو مار ڈالا ہے یہ لوگ موسیقی کو دفن کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔" اورنگ زیب نے کہا کہ "ان لوگوں سے کہہ دو کہ اچھی طرح تجہیز و تکفین کریں۔"

مآثر عالمگیری میں لکھا ہے :—

"بارگاہ شاہی میں نغمہ و سرود کے کامل استاد ہر وقت موجود رہتے اور باکمال سازندے اور اہل نشاط کا ایک گروہ دربار میں ہر وقت حاضر رہتا تھا، لیکن قبلہ عالم اس طرف بہت کم توجہ فرماتے تھے۔ ابتدائے عہد معدلت میں تو کبھی کبھی نغمہ و سرود سن بھی لیتے تھے، لیکن آخر میں اس سے بالکل تائب ہو گئے تھے۔

ارباب نشاط کے گروہ میں سے جو شخص پیشۂ سرود سے توبہ کر لیتا حضرت اس کو مدد معاش کے طور پر کچھ جاگیر عطا فرماتے تھے۔ مرزا مکرم خاں صفوی نے جو فن موسیقی کا بہترین ماہر تھا قبلہ عالم سے سوال کیا کہ نغمہ و سرود کی بابت حضرت کی کیا رائے ہے؟ قبلہ عالم نے فرمایا کہ "جو اس کے اہل ہیں ان کے لئے حلال ہے" مرزا نے عرض کیا کہ "پھر حضرت اہل ہونے کے باوجود کیوں اس سے پرہیز فرماتے ہیں؟" قبلہ عالم نے جواب دیا کہ "تمام راگ راگنیاں بغیر مزامیر اور خصوصاً پکھاوج کے مزہ نہیں دیتیں اور مزامیر بالاتفاق حرام ہیں۔ حرمت مزامیر کی وجہ سے میں نے نفس سرود سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔"

اورنگ زیب عالمگیر کو متعصب مورخین نے بدنام کیا ہے کہ اسے ہندوؤں سے سخت نفرت تھی، لیکن وہ ہندو باکمالوں کی بھی سرپرستی کرتا تھا۔ اورنگ زیب کے دربار میں بہت سے مورخین، شعراء اور ادباء موجود تھے جو اس کی بخشش اور عنایات سے برابر سیراب ہوتے تھے۔

ہسٹری آف ہندی (مصنفہ کی) میں لکھا ہے کہ "سخت گیر اورنگ زیب ہندوؤں کے فنون کا دلدادہ نہ تھا، لیکن ہندی کے ہندو شعراء دربار کی اعانت اور سرپرستی سے قطعاً محروم نہیں رہے"۔

علامہ شبلیؒ کے الفاظ میں عام خیال یہ ہے کہ اورنگ زیب ہندوؤں کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا لیکن مسلمانوں نے بھاشا زبان پر جس قدر اس کے زمانے میں توجہ کی پہلے نہیں کی، اورنگ زیب نے فارسی ملک الشعراء کا عہدہ منسوخ کر دیا تھا لیکن ہندی "کوی رائے" کا منصب برابر قائم رکھا (ثقافت اسلامیہ) اس زمانے میں ہندوؤں کے فن بلاغت (عروض)، ہیئت و نجوم اور رسوم و عقائد پر "تحفۃ الہند" "نظام النجم" اور "مت اچھراہ" جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ عالمگیر اپنے آباء کی طرح ارباب علم کی سرپرستی کرنے میں مذہب و ملت کا کوئی لحاظ نہیں کرتا تھا۔ اور مسلم علماء و فضلاء

ساتھ ہندو فضلاء کو بھی انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔ (اسلامی کتب خانے)

مولانا سید سلیمان ندوی نے ہندو کش عالمگیر کی دو عجیب کتابوں کا ذکر فرمایا تھا۔ جن میں ایک تو ۔۔۔ مت اچھرا سنسکرت سے فارسی ترجمہ۔ ترجم لال بہاری سے جو ہرک ہے اور تین مقالوں اور احکام مذہبی ہنود پر مشتمل ہے۔ مترجم نے عالمگیر کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے:-

"خلافت پناہ، عادل، مظفر، مجسم داد و کرم، قامع جفا و ستم ....

بدورش چوں دور قدح پر نشاط

وز مانش مانند ایام شباب پر سرور و انبساط

نواب علی وردی خاں کا متوسل تھا (مخطوط جامع ملیہ دہلی مکتوبہ ۱۲۶۳ھ برائے قاضی غلام محی الدین حیدر امین اعلیٰ)

رد الکفر حجۃ القوی مصنفہ عبدالقوی نو مسلم (سابق نام ہر کشن سامانی) لکھتا ہے:-

"قبل ازیں نام فقیر ہر کشن بود ایمان آورد بہ دین حضرت رسالت پناہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہ حق است و کفر باطل، کفر را رد ساختہ اسلام را حق شناختہ، نام خود عبدالقوی نہاد (شوال ۱۰۷۱ھ) اندر عہد خلیفۃ الرحمٰن ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی (مخطوط جامعہ ملیہ بحوالہ معارف جلد ۶۳)

جس سے ظاہر ہے کہ اہل ہنود کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ہم یہاں ایک اور نادر کتاب سراج الطریق ترجمہ ناسکیت پران کا اضافہ کرتے ہیں مصنف نے کمال انصاف کے ساتھ عالمگیر کی رواداری اور اس کی فراخ دلی اور صداقت پسندی اور مدح سرائی میں داد فصاحت و بلاغت دی۔ سوپ ناتھ کھتری سیگل متوطن سیالکوٹ (پنجاب) نے فصیح و بلیغ فارسی میں سنسکرت سے ناسکیت نامی رشی کے حالات اور تعلیمات کی ترجمانی کی۔ (سخاوت مرزا بحوالہ بصائر)

رات کھتری علمائے عالمگیری میں سے ایک وکیل (ایجنٹ) تھا۔ اس کے نظم و نثر ادب فارسی کی اس قدر دھوم تھی کہ شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک ادیب تھا، احسنت و آفریں کہتا تھا۔

لچھمی نرائن عالمگیر کے عہد میں شہزادہ بیدار بخت کی سرکار میں پیش کار کے عہدے پر تھا اور سہ صدی منصب رکھتا تھا ۱۱۱۰ھ میں اس نے انتخاب کیا۔ اس انتخاب کے دیباچہ کا پہلا شعر یہ ہے:-

شکر و سپاس و نعمت و منت خدائے را

پروردگار خلق و خداوند کبریا

مینی لال اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں تھا ۱۰۸۱ھ میں "بدائع الفنون" کے نام سے ریاضیات میں ایک عمدہ کتاب لکھی۔ (ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں)

مورخ جدونا تھ سرکار نے اورنگ زیب عالمگیر پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ اس نے ۱۶۶۹ء میں اس نے مندروں کو مسمار کرنے اور مدرسوں کے فرمان جاری کیا۔

IN APRIL 669 HE ORDERED THE PROVINCIAL GOVERNORS T[O]
DESTROY THE HINDU SCHOOLS AND TEMPLES AND PUT D[OWN]
THEIR TEACHINGS AND RELIGIOUS PRACTICES.

(ANECDOTES OF AURANGZEB AND HISTORICAL ESSAYS)

یہ فرمان صرف ایسے مدرسوں اور مندروں کے متعلق تھا جو مسلمانوں میں بے دینی پھیلانے کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔

فاضل مورخ نے بڑی چالاکی سے اورنگ زیب کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرمان کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:—

"اعلیٰ حضرت کو یہ خبر گزرا کہ ٹھٹھہ اور ملتان کے صوبے اور بالخصوص بنارس میں برہمن اپنے مدارس میں کتب باطلہ میں مصروف ہیں اس تعلیم سے ہندو اور مسلمان فتنے میں پڑتے اور گمراہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمام صوبوں کو ایسے مدارس کے انسداد انتظام اور اس منکرانہ فتنہ انگیز تعلیم کی قطعاً ممانعت کے احکام جاری کیے گئے ہیں" (مآثر عالمگیری ص۸۱ (۱۰۷۹ھ)

اگر عالمگیر اورنگ زیب کا یہی مقصد ہوتا کہ برصغیر ہند و پاکستان کے سارے مندر اور ہندو مدارس بند کرادیے جائیں تو اسے روکنے کی طاقت کس میں تھی اور ایک مندر اور پاٹ شالہ بھی برصغیر میں نظر نہ آتی۔ حالانکہ عالمگیر کے دور حکومت میں مندر بھی تھے اور ہندوؤں کے مدارس بھی۔ ہندو علوم کا مرکز بنارس تھا۔

خافی خاں لکھتا ہے:—

"بعض دنوں میں کہ راقم سوانح حیات، مندر سورت میں مقیم تھا، ایک شخص جس کا نام باتہا اور پیشہ طبابت سے متعلق تھا، یہ روایت بیان کرتا تھا کہ چونکہ ہماری قوم میں دستور ہے کہ علم نجوم و علم طبابت و علم شاستر (مذہبی) کے حاصل کرنے کے لئے غریب و بے مایہ برہمن دور و نزدیک کے علاقوں سے بنارس جایا کرتے اور وہاں جاکر اس مقام کے برہمنوں میں سے کسی ایک کو اپنا استاد مقرر کر لیتے ہیں اور اس سے سبق لیتے اور تعلیم حاصل کرتے ہیں اور صبح و شام روزانہ وقت اپنے استاد (گرو) کی طرف سے دریائے گنگا کے کنارے پہونچ کر مطابق اس اصول و ضابطہ کے جو مقرر ہے اس شخص کو جو اشنان کے لئے آتا ہے اس آئین و دستور مقررہ کے مطابق اُن کی خدمت انجام دیتے ہیں اور ان سے جو کچھ ملتا ہے بلاتصرف و خیانت اپنے گرو کے پاس لے جاتے ہیں البتہ کھانے پینے اور لباس و پوشاک کے تمام مصارف اس کے استاد کے ذمہ ہوتے ہیں جو ان کی قرابت دکفالت دستور کے مطابق اُن کی خبرگیری استاد کے ذمے لازمی ہے۔"

عالمگیر کی فرد قرار داد جرم میں ایک یہ بھی جرم بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے مظالم کی پردہ پوشی کے لئے اپنے عہد میں تاریخ نویسی کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ ایک ممتاز مورخ ڈاکٹر الفنسٹن کی بیشانی تاریخ ہندوستان میں عالمگیر کے جرائم تعصب و تشدد میں ایک اس جرم کا بھی اضافہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:—

"اورنگ زیب نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ کوئی اس کے زمانے کے واقعات کا حال نہ لکھے۔"

اگر درحقیقت عالمگیر کے عہد میں تدوین تاریخ کا سلسلہ واقعی روک دیا گیا ہوتا تو آج بہت سی کتابیں جو عہد عالمگیر میں ترتیب پائی ہیں، عالم وجود میں نہ آئی ہوتیں، اس وقت یورپ اور برصغیر ہند و پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں عہد عالمگیری کی بہ کثرت کتابیں موجود ہیں اور سب سے پر لطف بات تو یہ ہے کہ ان تالیفات میں نہ صرف مسلمان مورخین کی کتابیں بلکہ اس عہد کے ہندو مورخین کی کتابیں بھی ہیں۔

عالمگیر اورنگ زیب کے عہد کے مورخین:—

امیر خاں	واقعات عالمگیری
شہاب الدین تالش	عجیبہ غریبہ
عاقل خاں رازی	تاریخ شاہ شجاعی
بختاور خاں	(۱) آئینہ بخت (۲) مراۃ عالم

شیخ محمد بقا	ـ	مراۃ جہاں نما
عزیز اللہ	ـ	زینت التواریخ
ملا محمد	ـ	تنقیح الاخبار
شیخ ابوالفتح قابل خاں	ـ	آداب عالمگیری
...ت خاں ـ وقائع نعمت خاں عالی	ـ	سلمان قزوینی ـ جواہر التواریخ

<u>ہندو مورخین ۔</u>

رائے بندابن نے "لب التواریخ ہند" لکھی اور عالمگیر کے نام سے معنون کی ۔ ایسرداس نے "فتوحات عالمگیری" لکھی ۔ بھیم سین نے "نسخ...ن" کے نام سے عہد عالمگیر کی ایک تاریخ لکھی ۔ سوجان رائے کھتری نے "خلاصۃ التواریخ" کے نام سے ایک پر از معلومات تاریخ مرتب کی اور عالمگیر ...م سے معنون کی ۔ جگجیون داس نے "منتخب التواریخ" کے لئے مواد فراہم کیا تھا ۔

(بزم تیموریہ اور عہد اسلامی کا ہندوستان)

حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر اورنگ زیب کا عہد شاہان مغلیہ کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے ۔

محمد نواز (ایم۔اے)

انصاف کی تلاش

(یہ مقالہ سکریٹری بار ایسوسی ایشن حکیم یار خاں کی تحریک پر ہائی کورٹ کے صد سالہ جشن کے لئے ترتیب دیا گیا تھا۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر پڑھا نہ جا سکا)

انسان کی انفرادی خودی قوت و طاقت کا لازوال خزانہ ہے، اگر یہ قوت کسی ضابطہ اور آئین کی پابند ہو تو اس سے بڑھ کر انسانی زندگی کے لئے اور کوئی نعمت نہیں اور اگر یہ کسی قانون اور ضابطے کی پابند نہ ہو تو اس سے بڑھ کر فتنہ انگیز اور تباہ کن بھی کوئی اور چیز نہیں۔ کسی چیز کا محض قوت ہونا قطعاً کوئی خوبی نہیں کیونکہ محض قوت اندھی اور بہری ہوتی ہے۔ اس کے اندر خوبی اور وصف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ کسی آئین اور ضابطہ کو اپنا لیتی ہے۔ جب تک اسے کسی ضابطہ کا پابند نہ بنایا جائے اس وقت تک صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ یہ ہلاکت خیز بھی ہوتی ہے۔ انسان صدیوں تک بادلوں میں کوندنے والی بجلی سے خوف کھاتا رہا، یہ چمکتی تو اس کی آنکھیں چندھیا جاتیں، یہ گرجتی تو اس کی روح لرز اٹھتی اور جب یہ گرتی تو بہت آبادیوں کو جلا دیا کرتی تھی۔ لیکن جب اسی بجلی نے "تاروں" کے نظم و ضبط کو قبول کر لیا تو یہ انسانی زندگی کے آرام اور آسائش کے لئے ایک نہایت ہی مفید لعمت بن گئی، بلاشبہ ایک شخص کی انفرادی خودی بھی ایک طاقت ہے مگر اس کے مفید اور کارآمد ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ کسی ضابطہ اور آئین کی پابند ہو، کیونکہ جب کسی معاشرہ کے مختلف افراد کی بے قید اور شتر بے مہار خودیاں باہم ٹکراتی ہیں تو ان کے اس تصادم سے نہ تو کسی شخص کا مال بچتا ہے اور نہ اس کی جان اور آبرو۔ . . . . پھر انسانی معاشرے کی قریب قریب وہی حالت ہو جاتی ہے جس کا ذکر "جیری ٹیلر" نے ان الفاظ میں کیا ہے :—

"ان تمام انسانوں کے مقابلے میں، جن کا کوئی "مشترک مقصد" نہ ہو جن کے اوپر کوئی "جابر قوت" نہ ہو —— بھیڑیوں کا گلہ نسبتاً زیادہ پُرامن اور زیادہ متحدانہ متفق ہوتا ہے"

(JURISPRUDENCE by SALMOND p. ۵۰۲)

یہ بات تو یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ محض کوئی "مشترک مقصد" یا محض کسی "جابر قوت" ہی کا دبدبہ انسانی خودی کو آئینی ضابطہ کا پابند بنا سکتا ہے اور پھر اسے انسانی زندگی کے بناؤ اور سنوار کے کاموں میں بھی استعمال کر سکتا ہے، البتہ تاریخ انسانی کی یہ دردناک داستان ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا کے سارے انسان نہ تو پہلے کبھی کسی مشترکہ مقصد پر جمع ہوئے ہیں اور نہ کسی "جابر قوت" نے ان کی بپھری ہوئی خودی کی ہلاکت خیزیوں سے خرمن تہذیب کو بچایا ہے، انسان نے اپنی انفرادی زندگی کو وسیع المشربی (LAISSEZ FAIRE) کا خوگر بنا کر بھی دیکھ لیا کہ جب یہ شتر بے مہار ہوتی ہو تو اس کی ہلاکت آفرینی کا دائرہ کس قدر وسیع ہو جاتا ہے، پھر انسان نے اسے معاشرہ اور سیاست کی خودی میں فنا کر کے بھی دیکھ لیا کہ جب انفرادی "انا" اجتماعی خودی کے آستانہ پر قربان کر دی جاتی ہے تو ظلم و استبداد کا اژدہا کس قدر بے باک ہو کر انسانیت کے جسم سے خون چوستا ہے۔ مابعد اور دورِ حاضر کے جمہوری نظریات بھی انسانی زندگی کو بے قید خودی کی ہلاکت خیزیوں سے پناہ نہ دے سکے اور اشتراکی نظریات

کی روشنی میں پروان چڑھنے والی سیاست کی حکمران خودی بھی حیاتِ انسانی میں توازن اور اعتدال پیدا کرنے میں ناکام رہی، جنہوں نے انصاف کا یہ تصور دیا تھا کہ :۔

"آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" (توریت)

انہوں نے بھی اپنے اس قانون کی عملی تعبیروں سے دنیا کو مایوس کر دیا۔ جب ان کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا کہ ایک پیغمبر وقت اور ڈاکو میں سے کس کو رہا کیا جائے تو انہوں نے پیغمبر پر ایک ڈاکو کو ترجیح دے ڈالی۔ اس کھلے ننگے تضاد، قول و عمل کے اس بُعد اور قساوت قلبی کی اس مکروہ شکل کو شکسپیئر نے شائیلاک یہودی کے اس مشہور مقدمے میں بڑے ماہرانہ انداز میں بیان کیا ہے، جس میں شائیلاک نے اپنے ایک مقروض کے خلاف، اس کے جسم کا ایک پونڈ گوشت کاٹ لینے کا دعویٰ کیا تھا، جس کا سارا اثاثہ سمندر کی لہروں کی نذر ہو چکا تھا اور جو شائیلاک کو اس کے اصرار پر اپنے جسم کا گوشت کاٹ دینے کی تحریر دے چکا تھا۔ یہ مقدمہ بظاہر بڑا مضبوط تھا عدالت انصاف کا "تقاضا" پورا کرنے کے لئے بے بس تھی۔ اگر وکیل کی ذہانت بروقت کام نہ کرتی تو یہودی نے اپنے مقروض کے جسم کا گوشت کاٹ ہی لیا تھا . . . . یہودی نظام کے اس بے رحمانہ طرز عمل کے خلاف عیسائیت، رہبانیت کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آئی، اس نے انسانی خودی کو شکست خوردگی کا عادی بنانے کی کوشش کی، ظلم و استبداد کے مقابلے میں عاجزی اور انکسار اور بردباری اور فقر کے ساتھ مداہنت اور مصالحت کا رویہ اختیار کرنے کا درس دیا ـــــــ کہا گیا :۔

"میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ ہی نہ کرنا بلکہ جو کوئی تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو۔ اگر کوئی تم سے جھگڑا کر کے تمہارا کرتہ لینا چاہے تو اسے چادر بھی لے لینے دو اور جو کوئی تم کو ایک میل بے گار میں لے جانا چاہے اس کے ساتھ دو میل چلے جاؤ" (بائیبل)

بے شک اس تعلیم میں رأفت و محبت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ مگر ظالموں اور غلط کاروں نے اس تعلیم سے کس قدر غلط فائدہ حاصل کیا اور ظلم نے ان محبت آمیز کلمات کا سہارا لے کر، خدا کی اس سرزمین کو جہنم بنا دیا۔

افراد کی انفرادی "خودیوں" کے باہمی تصادم اور فرد اور معاشرہ کی خودیوں کے ٹکراؤ کی یہ داستان اتنی عبرتناک ہے کہ اس پر ایک امریکی جج یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے کہ :۔

"آیا انسان ہمیشہ آتش فشاں پہاڑ کی ایک ایسی نازک سطح پر زندگی بسر نہیں کرتا رہا ہے؟ جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتی ہے . . . . . . لیکن وہ اس پر باسہا زندگی بسر کرتا رہا ہے اور اپنے عظیم تصورات، اعلیٰ پائے کے ادارے اور اپنی تابندہ کامرانیاں . . . سب کچھ اسی گڑھے میں نذر کرتا رہا ہے . . . . . . انسانی تہذیب چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا ایک بیڑا ہے جس کے کبھی کوئی بانی ہوتے ہیں۔ یہ سائے کے سارے زندگی کی طوفانی سطح کو خطرناک طریقے سے پکڑے ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک بالآخر تباہ ہو جائے گا"

(JUSTICE LERNED HAND -- The Spirit of Liberty p-23)

انسان کی بپھری ہوئی بے پناہ سے آہنی خودی کی ان ہلاکت آفرینیوں کو دیکھ کر یہ سوال ہر دور کے مفکرین کے سامنے رہا ہے کہ انسان کی اس بے قید "انا" کو کس طرح قابو میں لایا جائے اور کس طرح مختلف افراد کی متخاصم "اناؤں" اور فرد اور معاشرے کی متخاصم خودیوں میں توازن اور اعتدال پیدا کیا جائے اور عدل و انصاف کا قیام کیونکر ہو؟ ۔ اس سوال پر فلسفہ اور عمرانیات کے ماہرین نے دماغی کاوشوں کے حیرت انگیز نمونے پیش کئے ہیں لیکن ان سب کی کوششیں ناتمام، ناقص اور نتائج کے اعتبار سے غیر تسلی بخش ہیں۔ البتہ فلسفہ قانون کے ماہرین نے اس کا ایک جواب دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ :۔

"اگر قانون کی حکومت قائم کی جائے تو انسانی خودی کی فتنہ انگیزیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے اور عدل و انصاف کی فضا قائم کی جا سکتی ہے۔"

یہ جواب جتنا مختصر اور قابل قبول ہے اس کی تفصیلات اتنی ہی پیچیدہ اور نتائج کے اعتبار سے مایوس کن ہیں چنانچہ اسی بات کے پیش نظر ایک ماہر قانون کو کہنا پڑا :-

"تحریری قانون مکڑی کے جالوں کی مانند ہے، کمزور اس میں پھنس جاتا ہے اور طاقت ور اس کو توڑ کر نکل جاتا ہے"

(چراغ راہ قانون نمبر ص ۸۳)

اسی طرح شیلر کو بھی یہ اعتراف ہے کہ :-

"قانون کا سہارا لینے میں کوئی چیز یقینی نہیں بجز خرچ کے" (حوالہ بالا)

ایک اور قانون دان اسے ایک چوہے دان سے تشبیہ دیتا ہے جس میں داخل ہونا آسان اور باہر نکلنا بے حد مشکل ہوتا ہے (حوالہ بالا)

اگر قانون کی حکومت سے یہ مراد لی جائے کہ عدالتوں کی پرشکوہ اور عالی شان عمارات ہوں، قانون اور فلسفۂ قانون کی ماہرین کی ایک بڑی تعداد موجود ہو، قانون پڑھنے، سمجھنے اور سمجھانے والوں کی اکثریت ہو اور قانون کی تعلیم اور اشاعت کے لئے کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوں تو پھر یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ دنیا میں آج قانون کو جو برتری حاصل ہے وہ انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اگر قانون کی حکومت سے مراد یہ ہے کہ عدل و انصاف ہو، حریت، مساوات اور تمام دوسرے انسانی حقوق کے تحفظ کا انتظام ہو، مجرمین اور سماج دشمن عناصر کے دلوں میں قانون کا خوف ہو اور عام لوگ اپنے اندر قانون کے احترام اور اس پر چلنے کا سچا جذبہ رکھتے ہوں تو اس مفہوم میں، اگر میں یہ کہنے کی جسارت کروں تو بے جا نہ ہوگی ـــــــ کہ دنیا میں کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جہاں قانون کی حکومت اپنے تمام شرائط اور لوازمات کے ساتھ قائم ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قانون کی تعلیم و تدریس کے لئے حیرت انگیز انتظامات موجود ہیں اور انسان کی زندگی کا ہر پہلو قانون کی دسترس میں ہے لیکن اس کے باوجود ایک انسان آزادی اور حریت کی سچی لذت سے نا آشنا ہے، طاقت ور کی خودی کمزوروں کو پامال کرتی اور مسلتی چلی جا رہی ہے مگر اس کی فریاد سننے والا اور اسے عدل و انصاف کی متاع سے فیضیاب کرنے والا کوئی نہیں۔ انسانی معاشرہ میں جرائم جس کثرت اور تیز رفتاری سے پھیل رہے ہیں اس کے مقابلے میں پولیس اور عدالتوں کی کارگزاری بدرجۂ صفر ہے، وہ مسلمہ اخلاقی اور انسانی قدریں جن کا انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے ہمیشہ احترام کیا ہے، جرائم کی کثرت کی وجہ سے ختم ہو کر رہ گئی ہیں، وہ باتیں جو ہر دور میں گردن زدنی جرائم خیال کی جاتی تھیں انہیں آج کا قانون جائز کہنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ خلاف وضع فطری فعل SODOMY جتنا کچھ شنیع اور مکروہ ہے، وہ محتاج بیان نہیں لیکن جب اس کی برطانوی معاشرے میں کثرت ہو گئی تو روایات کو دانتوں سے پکڑنے والی انگریز قوم مجبور ہو گئی کہ وہ اپنی ساری قومی خصوصیات کو بالائے طاق رکھ کر اس مکروہ فعل کو جواز کی قانونی سند عطا کرے۔ زنا کاری دنیا کے ہر مہذب معاشرے میں سختی سے ممنوع تھی لیکن موجودہ قانون نے اس کی صرف اس شکل کو ممنوع قرار دیا جس کا ارتکاب فریقین رضامندی سے کریں۔ ظلم و زیادتی کی ہر شکل قابل مذمت تھی، ایٹم بموں اور زہریلی گیسوں کے ذریعے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور پرامن شہریوں کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ روس، چین اور امریکہ۔ لبنان اور برباد ہوں ویتنام کے عوام، ہندوستان اگر کشمیریوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، فلسطینی اگر صیہونی سامراج کا نشانہ بنیں، قبرص میں اگر ترک ذبح ہوں، یمن اور حبشہ میں مظلوموں کی جان، مال اور آبرو کو آمرانہ استبداد برباد کرنے کی کوشش کرے تو ملکی اور بین الاقوامی قانون بیکار پادری کی طرح خاموش تماشائی بن کر دیکھتا رہتا ہے۔

چند سال قبل ایک صاحب نے اپنی ماں کو اس "قصور" میں کہ اس نے دوسری شادی کیوں کی تھی اور اپنی تین معصوم چھوٹی سوتیلی بہنوں کو محض اس "جرم" کے تحت کہ وہ اس کی ماں کے بطن سے کیوں پیدا ہوئی تھیں ـــــــ دھوکے سے جنگل میں لے جا کر نہایت بے دردی سے

... سبب اس کی روداد اخبارات میں شائع ہوئی تو ہر حساس دل اس سنگدلی اور سفاکی پر تڑپ اٹھا تھا۔ ملزم پکڑا گیا، اس نے اقبال جرم بھی کر لیا لیکن بعض قانونی پیچیدگیوں کے سبب وہ قاتل بری کر دیا گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے ذرائع اور وسائل کے باوجود قانون کی حکومت اور قانون کا احترام کیوں مفقود ہے۔ عدالتوں، وکیلوں اور پولیس کے اتنے وسیع انتظامات کے باوجود ایک انسان کے اندر اپنے تحفظ کا احساس کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ قانون اور فلسفۂ قانون کے ماہرین نے بڑے بڑے مرعوب کن نظریات کو جنم دیا ہے لیکن بات اس مشہور چینی کہاوت سے آگے نہیں بڑھ سکی، جس میں کہا گیا ہے :-

" قانون سے انصاف طلب کرنا ایسے ہی ہے جیسے بلی کو حاصل کرنے کی کوشش میں گائے کو کھو دینا "

(چراغ راہ قانون نمبر ص ۳۰۳)

اب اگر ہم قانون کے ماہرین سے یہ سوال کریں کہ قانون کی حکومت سے کیا مراد ہے تو وہ ہمیں سب سے پہلے لفظ " قانون " کی تعریف اور تشریح میں الجھا دیتے ہیں اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ وہ خود قانون کی کسی ایک جامع و مانع تعریف پر باہم متفق بھی نہیں ہوتے بقول شخصے اگر قانون کے دس ماہرین کو ایک جگہ بٹھا کر ان سے لفظ قانون کی متفق علیہ تعریف دریافت کریں تو وہ دس کے بجائے گیارہ مختلف جواب دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے " آسٹن " کی بیان کردہ تعریف کو لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

" وہ قاعدہ اور ضابطہ جو ایک صاحب امر ذہین آدمی اپنے ماتحت ذہین آدمی کے لئے وضع کرے "

(چراغ راہ قانون نمبر ص)

اس تعریف کی مدد سے " صاحب امر ذہین آدمی " کی خودی حاکم بھی ہے اور قانون ساز اور قانون دہندہ بھی۔ اس کے برعکس " ماتحت ذہین آدمی " کی خودی صرف مطیع و منقاد ہے۔ سوال ہو سکتا ہے کہ آخر " صاحب امر ذہین آدمی " کو اس کے ماتحت ذہین آدمی کی خودی قانون ساز اور قانون دہندہ تسلیم نہ کرے تو کیا چارہ ہے، جواب دیا جاتا ہے کہ اسے " صاحب امر ذہین آدمی " کی اس حیثیت کو بجبر لازماً تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس پر جب اعتراض ہوتا ہے کہ یہ تو انصاف کے منافی ہے جو ذہین صاحب امر قانون بنائے گا وہ لازماً اپنے ہی مفادات اور مقاصد کے تحفظ کے لئے بنائے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ ماتحت ذہین آدمی کے مفادات اور مقاصد کے خلاف ہو، جواب ملتا ہے، انصاف کا قانون کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ماتحت ذہین آدمی کا کام صرف اطاعت کرنا ہے انصاف طلب کرنا اس کا ہرگز کوئی حق نہیں۔ ایک طاقتور خودی اپنے سے کمزور خودی کو یوں پامال کرے، یہ صریح ظلم اور ناانصافی ہے لیکن آسٹن کے نزدیک یہ قانون ہے، گویا " جس کی لاٹھی اس کی بھینس " جیسے بدنام زمانہ مقولے کو آسٹن کی تعریف نے قانون کا درجہ عطا کر دیا ——————

آسٹن کے اس انتہا پسندانہ نظریے کے رد میں قانون کا عمرانی مکتب فکر میدان میں آ گیا اس نے دعویٰ کیا کہ :-

" قانون معاشرہ کے اجتماعی ضمیر کا اظہار ہے، جسے گاہ بگاہ علم و حکمت کے ذریعہ منضبط کر دیا جاتا ہے "

(چراغ راہ قانون نمبر ص ۳۵)

اس نظریہ کے حامی بھی ایک دوسری انتہا پر چلے گئے اور انہوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ قانون سازی کسی مملکت یا کسی ریاست کا قطعی کام نہیں ہے یہ کسی معاشرہ کی رسوم و رواج اور اس کی پسند و ناپسند اور اس کے ذوق وغیرہ کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے معاشرہ سالہا سال کے تعامل سے خود بخود وجود میں لاتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ جدید معاشرہ میں ہرگز راہ نہ پا سکا کیونکہ آج ریاستوں کا نظام خواہ وہ جمہوری طرز کا ہو یا اشتراکی قسم کا ہو یا آمریت کا خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو، وہ ایک فرد کی زندگی سے لے کر انسان کی اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ پر محیط ہے اور تمدن کی ترقی نے رسوم و رواج اور عادات و خصلات کے سارے پیمانے بدل دیے ہیں، اس لئے جدید مکتب فکر نے قانون کے اس عمرانی نقطۂ نظر کو

...کردیا اور قانون کی ایک نئی تعریف بیان کی ۔

جدید تعریف کی رو سے قانون کی حسب ذیل دو باتوں پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے ۔

- ایک یہ کہ قانون ایک با اختیار ادارہ بنائے اور نافذ کرے اور
- دوسری یہ کہ اس کا مقصد حصول انصاف ہو ۔

...ں تک پہلی بات کا تعلق ہے ۔ اس پر بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو ہم نے ابھی آسٹن کی بیان کردہ تعریف پر کیا ہے ۔ یعنی یہ کہ جو قوانین ایک با اختیار ...دہ بنائے گا وہ لازماً ایسے قوانین ہوں گے جو اس با اختیار ادارہ یا ہیئت حاکمہ کے اپنے مقاصد و مفادات کی تکمیل کے لئے ہوں گے ۔ اس لئے یہ فرض ...ی کہ ان قوانین سے انصاف کا تقاضا پورا ہو ۔ بس لحاظ سے اس تعریف کے دونوں اجزاء کا باہمی رشتہ نظری طور پر خواہ کتنا ہی حسین ہو لیکن عملی پہلو ...کچھ بے جوڑ اور مایوس کن ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ پیٹن کو یہ کہنا پڑا :۔

"جدید فلسفہ قانون ابھی تک کسی قابل قبول پیمانہ اقدار کو ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکا ۔ اس نے گاہ بگاہ قانون کے بنیادی تشریعی مسائل کا جو حل ہمارے سامنے رکھا ہے وہ خیالات میں ابتری پیدا کرنے کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکا"

(حوالہ بالا ص ۷۴)

قانون سازی کا مکمل اختیار انسانوں کی اگر کسی ہیئت حاکمہ کو مل جائے تو اس سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں ۔ اس بات پر راسکو پاؤنڈ نے ان ...ظ میں تبصرہ کیا ہے :۔

"انصاف کے کلیت پسند نظریات نے ہمیشہ حکومتوں کو وسیع اختیارات کا محور بنانے کی سعی کی ہے اور انصاف کے بارے میں لادینی نظریات اور ملحدانہ تصورات نے اہل اقتدار کو مطلق العنان بن جانے کی خوب وجہ جواز فراہم کر دی ہے انہیں مطلق العنان تصور کرنا متعدد خرابیوں کے پیدا کرنے کا موجب ہوگا ۔۔۔"

راسکو پاؤنڈ کے اس خیال کی تائید اشتراکی نظریات پر قائم ہونے والی حکومتوں کے قول و عمل سے ہوتی ہے ، وہاں با اختیار ادارہ جس طرح قانون ...ز کرتا ہے اس کی ایک مختصر روداد بھی سن لیجئے :۔

مارکس نے ابتداً قانون کے بارے میں جو تصور پیش کیا تھا وہ یہ تھا کہ قانون ریاست سے وابستہ ہوتا ہے اور ریاست مظالم ڈھانے کا ایک ذریعہ ...، وہ کہتا ہے :۔

"قانون جبر و استبداد کا ایک ایسا ادارہ ہے جس کی مدد سے ظالم اور جفا کار لوگ بے سہارا اور کمزور انسانوں کو ستاتے ہیں"

مارکس کے اس انتہا پسند تصور نے قانون کی اہمیت اور اس کے احترام کو ختم کر دیا ۔ اس پر مزید ستم یہ کیا کہ اسی تصور کو قانونی شکل بھی دے ڈالی ...۔ لیکن جلد ہی مارکس کے یہ نظریات عمل کی دنیا میں ناکام ثابت ہوئے بالآخر اشتراکی متفقین نے آسٹن کی مذکورہ بالا تعریف تسلیم کر لی اور قانون ...تعلق انصاف سے توڑ ڈالا ۔

اشتراکی نظام کے بارے میں یہ بات ہرگز فراموش نہ کیجئے کہ اس نظام کے تحت انفرادی زندگی کا ایک غالب حصہ انفرادی ہاتھوں سے نکل کر

قانون کی یہ مختلف تعریفیں اور مضمون کے اس حصہ کا مواد محترم پروفیسر خورشید احمد صاحب کے مضمون سے لیا گیا ہے ۔ خورشید صاحب کا یہ مضمون "چراغ راہ" ...نمبر ص ۳۳ میں موجود ہے ۔ جو حضرات اس موضوع کی فنی باریکیوں سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اس مضمون کی طرف رجوع کریں ۔
تفصیل کے لئے دیکھئے "قانون کا اشتراکی تصور" [illegible]

اجتماعی ہاتھوں میں منتقل ہو چکا ہے اور اس لحاظ سے وہاں دیوانی اور فوجداری قوانین کا ڈھانچہ عام فوجداری اور دیوانی قانون سے یکسر مختلف اس نظام میں انفرادی خودی کو یکسر کچل دیا گیا ہے۔ لیکن اشتراکی ریاست کے جابرانہ انتظام میں جو تجارتی عدالتیں مختلف تنظیموں کے فیصلے کرنے وجود میں لائی گئی ہیں ان میں صرف ۱۹۳۵ء کا تین لاکھ تیئیس ہزار مقدمات زیر سماعت آتے، روس میں عدلیہ اور قانون حاکم طبقہ کے آلہ کار ہیں وہاں کے ججوں کے لئے یہ بات ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے ملک کے قانون ساز اداروں اور حکومت کے دوسرے محکموں سے کسی قسم کا اختلاف کر سکیں باتوں سے بڑھ کر حیران کن بات یہ ہے کہ خفیہ پولیس بہت بڑے پیمانے پر قانونی گتھیاں سلجھاتی ہے اس سلسلے میں کسی عدالتی ضابطہ کا احترام نہیں اسے بند کمروں میں مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے[1]

روس کے اس جابرانہ نظام کے ظالمانہ تشدد کا جتنے لوگ نشانہ بنے ہیں ان کی ایک تعداد ۵۵۶۴۴۱۲ بیان کی جاتی ہے۔ ان میں جج، وکیل اور قانون پیشہ حضرات کی تعداد ۵۸۵۴۳۲ افراد ہے[2]

یہ ہے نتیجہ قانون کے اس غلط تصور کا جس کی رو سے قانون سازی کا اختیار کسی ہیئت حاکمہ کو ہوتا ہے۔

دوسری طرف اگر آپ جمہوریت پسند ممالک میں قانون سازی کو دیکھیں تو قانون کا وہاں بھی احترام مفقود ہے، جرائم کی رفتار ہولناک تیز بڑھ رہی ہے اور اخلاق کی مسلمہ اقدار پامال ہو رہی ہیں اس صورت حال سے پریشان ہو کر مغربی مفکرین کا گروہ ارسطو کے فطری قانون ——— (NATURAL LAW) کی طرف نظریں اٹھا کر مطالبہ کرتا ہے کہ قانون کو آفاقی ہونا چاہئے اور اس کا مقصد مجرد انصاف کا حصول لیکن اس نظریہ کی ناکامی پر فرائڈمین نے جو تبصرہ کیا ہے وہ ان کے اپنے الفاظ میں سنئے :۔

"قانون فطرت کی ساری تاریخ مجرد انصاف (ABSOLUTE JUSTICE) کے بارے میں انسان کی زبردست مگر ناکام جستجو کی داستان پر مشتمل ہے۔ گزشتہ ڈھائی ہزار سالوں سے قانون فطرت کا نظریہ مختلف شکلوں اور صورتوں میں بار بار نمودار ہو چکا ہے اور پھر اس کے ذریعے ہی نوع انسان نے بار بار ایجابی قانون سے بلند تر اور تصوراتی قانون کو ترک و مسترد کر دیا ہے اور یہ مسئلہ پھر وہیں کا وہیں رہ گیا ہے۔ . . . . آج جس طرح انسان کی عمرانی اور سیاسی زندگی کے احوال و ظروف کی نہایت آسانی سے ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ اسی طرح قانون فطرت کی ہنسی اڑانا بھی اس لحاظ سے آسان ہے کہ یہ ناانصافی اور ناقص زندگی کے چکر سے بنی نوع انسان کو باوجود انتہائی کوششوں کے نہیں نکال سکا۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو بھی اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرتی ہے"[3]

قانون فطرت کے ذریعے مجرد انصاف کی کوشش جب ناکام دیکھی تو تاریخی مکتب فکر نے یہ نظریہ پیش کر دیا کہ قانون ایک معاشرتی حقیقت کا نام ہے اور یہ ثقافت کی پیداوار ہے چنانچہ جس طرح ثقافت میں زمان و مکان کے لحاظ سے تبدیلی آ جاتی ہے، اسی طرح قانون بھی ... کو انگیز کرتا رہتا ہے۔ تاریخی مکتب فکر کی یہ بات کہ قانون سازی کے وقت اور ماحول کا فیکٹر بنیادی اہمیت کا حامل ہے کئی لحاظ سے محل نظر یہ بات تو قابل تسلیم ہے کہ قانون کے عملی انطباق کے وقت احوال و ظروف اور زمان و مکان کے عوامل اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور یہ عوامل قانون کے ... میں تاخیر، التوا اور تعطل کی کیفیت پیدا کرتے رہتے ہیں لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں کہ قانون لازماً کسی سیاسی اور معاشرے کے بدلتے ہوئے ...

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "قانون کا اشتراکی تصور" چراغ راہ قانون نمبر ص ۶۶-۶۷ [2] انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام از عبدالحمید صدیقی ص ۶۱

[3] چراغ راہ مذکور ص ۶۰۔

اتھ ہر آن بدلتے رہنا چاہیے۔ لیکن اس نظریہ کو "حقیقت پسندی" کے نام پر فروغ دینے کی کوشش کی گئی اور بالآخر اس کا جوڑ نظریہ
(RELATIVISM) سے ملا دیا گیا۔ جس کی رو سے یہ بات واضح طور پر کہہ ڈالی گئی کہ کسی اخلاقی اور قانونی قدر کا وجود قطعی
ی بلکہ اضافی ہے۔ کل اگر جھوٹ، فریب اور دغا بازی بری صفات تھیں تو وقت، ماحول اور معاشرے کے حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ
نہایت قابل تعریف قرار پا جائیں گی۔ اگر کل محبت، ایثار، وفاداری اور بہادری جیسے اوصاف قابل ستائش تھے تو زمان و مکان کی تبدیلی
اتھ یہ بھی قابل مذمت ہو جائیں گے۔ اس نظریہ نے صرف اخلاق ہی کو نہیں بلکہ قانون کی ساری اقدار کے استحکام کو ہلا کر رکھ دیا۔
صاف کا تصور بھی سیماب وش بن گیا۔ اس کی رو سے انصاف کا مفہوم مختلف افراد اور اقوام کے نزدیک، ان کے حالات کے لحاظ
ہو گیا۔ ایک وقت انصاف کا اگر ایک خاص تصور ہے تو حالات بدل جانے کے بعد وہی تصور قابل مذمت قرار پائے گا۔
انون جو انسانی معاشرے کا محض محافظ و نگران ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا مربی اور رہنما بھی ہوتا ہے، وہ کسی قوم کے ان افراد کا جب کہ
وہ اعمال اور سیرت و کردار کی پستیوں میں گر رہے ہوں، ہرگز ساتھ نہیں دیتا، بلکہ ان کی اصلاح اور ان کے احتساب ——
اصلاح اور احتساب سے اپنی روش نہ بدلیں تو —— انہیں سزا دینے کے لئے چوکس ہوتا ہے۔ لیکن اس جدید نظریہ نے قانون کے اس
یہ ہی کو ختم کر ڈالا۔ اس کی رو سے قانون معاشرہ کا رہنما اور مربی نہیں بلکہ یہ معاشرہ اور اس کے افراد کی مرضی کا تابع اور پابند ہوتا ہے۔
مرضی کسی وقت چوری کو سند جواز دے ڈالے تو قانون مجبور ہے کہ وہ بھی چوروں کا محافظ اور نگران بن جائے اور انہیں اپنے تحفظات
ے۔ اگر کسی وقت کسی سوسائٹی میں ظلم و استبداد کا چلن عام ہو تو قانون کا کام بس یہ ہے کہ وہ اسے حق و انصاف کا نام دے ڈالے اور
قوم میں زناکاری اور سدومی[*] (sodomy) وغیرہ جیسے قبیح جرائم عام ہو جائیں تو قانون کا بھی فرض ہے کہ ان بدترین افعال
شرہ میں فضا ہموار کرے۔ اس نظریہ کی رو سے اب قانون کا کام یہ ہے کہ وہ معاشرہ اور افراد معاشرہ کے پیچھے پیچھے چلے۔ وہ جن پستیوں
بھی ان کے پیچھے ان کی ساری پستیوں کی نگرانی اور ان کے تحفظ کا فرض انجام دیتا چلا جائے۔
سی نظریہ کا سہارا لے کر اشتراکیوں نے انسان کے بنیادی حقوق کو معاشی حالات کا تابع بنا دیا گویا انسان کے اندر آزادی، مساوات اور
کا جو بنیادی جوہر موجود ہے وہ دائمی نہیں بلکہ معاشی قوتوں کے رحم و کرم پر ہے۔ مغرب کی مادی جمہوریت کے قانون سازوں نے طاقتوں
اوات کے پیش نظر قانون سازی کی اور معیشت و معاشرت کے ان سارے اخلاقی ضابطوں اور قیمتی تاریخی روایات کو پامال کر کے
نسانی تاریخ کے سارے مہذب معاشروں کی مشترکہ مگر گرانقدر میراث سمجھے جاتے تھے ——
س ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ مغربی فلسفہ قانون ایک فرد کو بھی آزادی، بے لاگ انصاف اور اس کے بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت
کام رہا ہے نظری طور پر مغرب کا فلسفہ قانون سوائے خوب صورت اصطلاحات اور فنی موشگافیوں کے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ عملی
ظ سے مایوس کن ہے۔ دنیا ایک مدت سے قانون کی حکومت کے خواب تو دیکھ رہی ہے مگر اس خواب کی عملی تعبیروں سے ہرگز بہرہ ور نہیں
ن کی حکومت تو در کنار خود قانون کی جامع و مانع تعریف وضع کرنے، قوانین کی مختلف اقسام میں معنوی توافق پیدا کرنے اور انہیں ملکی اور بین الاقوامی
ریق پر نافذ کرنے میں موجودہ دور کا انسان بری طرح ناکام رہا ہے۔ قانون اور فلسفہ قانون کے ماہرین کو بھی اپنی اس ناکامی کا اعتراف ہے۔
اپنی کتاب "جمہوریت کا بحران" میں لکھتا ہے :-

---

[*] کا لفظ لواطت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس فعل بد کا یہ نام حضرت لوط علیہ السلام کے نام گرامی کی نسبت سے مشہور کیا گیا ہے۔ اس لفظ کا استعمال
ہے۔ اس کے لئے سدومی کا لفظ اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ قوم لوط کے علاقہ کا نام سدوم تھا اس علاقہ کی نسبت سے اس شنیع فعل کو "سدومی" کہنا اور لکھنا چاہیے۔

" قانون کا تانا بانا تیار کرتے وقت چند ہی مقاصد سامنے ہوتے ہیں، ججوں کے ہاتھ میں یہ اختیارات نہیں ہوتے کہ وہ خود قوانین وضع کریں اور پھر ان کے مطابق فیصلے دیں۔ ان کا فرض صرف یہی ہے کہ وہ رائج الوقت قانون کو حالات پر منطبق کرکے فیصلہ صادر کریں۔ جج ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ ہر روز اپنی آنکھوں سے ظلم ہوتا دیکھتے ہیں مگر اف تک نہیں کر سکتے ان کے قلم ہر صبح اور ہر شام ان کی بے بسی اور مجبوری کی چغلی کھاتے ہیں وہ با اختیار ہونے کے باوجود بے اختیار ہوتے ہیں "۔[1]

ایک اور مصنف وسکونٹ برائس اپنی کتاب " جدید جمہوریتیں " ——— میں لکھتا ہے :-

" فرانسیسیوں کو اپنی عدالتوں پر کوئی اعتماد نہیں رہا امریکہ میں بعض ججوں میں ایسے جج موجود ہیں جن کے انتخاب میں سیاستدانوں کا دخل ہے یا بڑے بڑے صنعتی اداروں کا۔ بعض شہروں میں وکلاء بھی عدالتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ ججوں کی رائے کے بدلنے کے طریقوں میں بھی اچھی خاصی تبدیلی واقع ہوئی ہے اب رشوت ستانی کے ایسے عمدہ طریقے نکل آئے ہیں جن پر کسی کو کوئی شک نہیں ہوتا۔ لوگ اب ججوں کے سامنے سونے اور چاندی کے ڈھیر نہیں لگاتے بلکہ ان کو صرف اپنی اطلاع دینا کافی ہے کہ اگر وہ بعض مقدمات کا فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق کر دیں تو فلاں فلاں، کمپنی میں انہیں بغیر سرمایہ لگائے اتنے حصوں کا مالک بنا دیا جائے گا "۔[2]

چند سال پیشتر امریکہ میں روزن برگ اور اس کی رفیقۂ حیات کو عدالت نے جس دباؤ کے تحت موت کا حکم سنایا وہ عدلیہ کی آزادی کے پرخچے چاک کرنے کے لئے کافی ہے ان بے چاروں کو محض حکمران طبقہ کے ایماء پر ختم کیا گیا۔ جیوری کے ایک ممتاز رکن نے اس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کیا کہ اس سزا کے لئے شہادتیں ناکافی ہیں مگر چونکہ حکمران طبقہ ان کے خون سے ہاتھ رنگنے پر تلا بیٹھا تھا، اس لئے کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی حتیٰ کہ جسٹس نے دلائل کو کمزور ہونے کی وجہ سے دوبارہ مقدمہ چلانے کی اجازت چاہی تو جمہوریت کے پرستاروں نے سخت واویلا کیا اور جج کو مواخذہ (کی دھمکی بھی دی۔ مرنے والے مرگئے مگر ان کی موت سے جمہوریت اور قانون کی حکومت کے بلند بانگ دعووں کی اصلیت دنیا پر آشکارہ ہوگئی "۔

(بحوالہ انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام ۲۰۶)

ان شواہد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آج کا انسان قانون کے نام پر لاقانونیت اور فتنہ و فساد کے ایک عالمگیر طوفان کی زد میں ہے۔ اس کی حالت فضا میں سفر کرنے والے اس مسافر کی سی ہوگئی ہے جس کے طیارے کا انجن فضا کی بلندیوں پر اچانک فیل ہوگیا ہو، مسافر اپنی عبرتناک موت کا یقین کرکے بے بس اور مایوس ہو کر ایک ایسی ہولناک موت کے انتظار میں اپنے آپ کو طیارے کی نشست پر ڈال دیتا ہے، جس پر رونے اور جس کا جنازہ پڑھنے والا بھی شاید کوئی نہ ہوگا ——— !

آج کا انسان اپنی ساری ترقیوں کے باوجود اپنے مستقبل سے مایوس ہے۔ یہ یاس اور قنوطیت اس پورے دور تہذیب کا عنوان ہے اور قانون و فلسفۂ قانون کی ساری موشگافیاں یاس اور قنوطیت کی اس ہلاکت آفریں فضاء کو حسین تر اور محبوب تر بنانے کی ناکام کوششیں ہیں۔ لاکھ جگنو جمع کریں ان سے نور کی وہ کرن پیدا نہیں ہو سکتی جس سے ظلمت کی سیاہ چادر کا دامن تار تار ہوتا ہے، جو تہذیب بانجھ ہو چکی ہے لاکھ فلسفے اور نظریات میدان میں لائیں اس کے پہلو میں امید اور رجائیت ہرگز جنم نہیں لے سکتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ سائنس کا کوئی کرشمہ ہاتھی کو سوئی کے ناکے سے پار کردے مگر یہ بات قطعی ممکن نہیں کہ مغرب کی مادی تہذیب کے ہاتھوں کبھی قانون کی حکومت قائم ہو ——— !!

---

[1] انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام " جناب عبدالحمید صدیقی ص ۲۰۶

مسلم ممالک میں قانون کے ان جدید نظریات نے جو گل کھلائے ہیں اس کا ذکر حضرت عبدالقادر عودہ شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں کیا ہے :-

"ان قوانین نے ہمارے افکار کو فاسد کر دیا ہے، ہمارے ذہنوں کو پراگندہ کر دیا ہے، ہمارے دلوں کو مسخ کر دیا ہے اور ہماری زندگی کو بگاڑ دیا ہے۔ انہوں نے ہماری صفوں میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔ ہمارے قلوب کو رنج والم سے بھر دیا ہے اور ہمارے سینوں میں تلخی کا بیج بو دیا ہے، ان قوانین نے ہمارے اندر عجیب و غریب منطق اور خطرناک قسم کا تضاد اور اضطراب پیدا کر دیا ہے، ہم بیک وقت ایک چیز کو حلال بھی قرار دیتے ہیں اور اسے حرام بھی سمجھتے ہیں، ہم ایک عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور اس کے خلاف عمل بھی کرتے ہیں یہ تناقض اور تضاد ہماری زندگی کے ہر معاملے میں پایا جاتا ہے خواہ وہ اہم ہو یا غیر اہم" (اسلام کا نظام قانون ص ۲۹)

حضرت موصوف ایک اور مقام پر ان الفاظ میں تنقید فرماتے ہیں :-

"یہ قوانین ہمیں کفر و الحاد کی طرف دھکیلتے ہیں اور ہمیں اباحیت اور مادر پدر آزادی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کے اصول و فروع کو ہمارے احوال و کوائف سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک بچے کو والدین سے لے کر زبردستی دوسروں کی سرپرستی میں دے دیا جائے ماں باپ سے ان کا بچہ چھین کر کسی ولد الحرام کو ان کی گود میں ڈال دیا جائے ــــ" (حوالہ بالا ص ۱۷)

مسلم ممالک میں ان قوانین کو رواج دینے کا مقصد "قانون کی حکومت" قائم کرنا نہیں تھا بلکہ ان قوانین کے ذریعے غیر ملکی سامراج کے مفادات کا تحفظ مقصود تھا۔ یہ شہری حقوق کو سلب کرنے والے قوانین اور مسلمانوں کے دین و اخلاق سے ٹکرانے والے اور برائیوں سے نرمی برتنے والے ضابطوں کا تعلق قانون کی حکومت قائم کرنے سے زیادہ استعمار کی خدمت گزاری تھی۔

اگرچہ قانون کی حکومت کا پاکیزہ تصور ایک مایوس کن عالمی بحران سے دوچار ہے تاہم اگر مغربی مفکرین اسلام سے روشنی حاصل کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کی ساری غلطیوں اور غلط اندیشیوں کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس بات کے پہچاننے میں دانستہ یا نادانستہ ٹھوکر کھائی ہے کہ قانون بنانے اور قانون دینے کا فی الواقع حق کس کو ہے۔ مطلق العنان حاکمیت کا صحیح معنوں میں کون سزاوار ہے۔ جمہور کو قانون ساز تسلیم کیا، تو الجھنیں اور پیچیدگیاں بڑھ گئیں، اشتراکی ریاست کو قانون بنانے کے اختیارات دیئے گئے تو انسان کو اپنے بنیادی حقوق سے یکسر محروم ہونا پڑا۔ یہ ساری ناکامیاں اور نامرادیاں حاکمیت کے تصور کو غلط سمجھنے اور انسانی خودی کی حقیقت کو نہ پہچاننے کا نتیجہ تھیں۔

انسانی خودی کی یہ صفت کہ وہ اس کائنات میں اپنے اظہار اور نمو کی جائز یا ناجائز راہیں نکالتی رہتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کائنات میں برتر سمجھتی ہے۔ وہ کسی فرد یا افراد انسانی کے کسی خاص گروہ یا پوری انسانیت کی غیر مشروط اطاعت کو اپنی توہین خیال کرتی ہے اس نے جب بھی اس طرح کی غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے بغاوت کی ہے اور کسی کی خدائی کو ہرگز تسلیم نہیں کیا۔ آپ اسے طاقت کے زور سے دبا سکتے ہیں اسے کچل بھی سکتے ہیں لیکن اسے زندہ رکھ کر خوشی خوشی غیر مشروط اطاعت پر راضی نہیں کر سکتے۔ اس سے اگر خوشی خوشی اطاعت کرانی ہے تو پہلے اسے یہ شعور دیجئے کہ جس کی اسے اطاعت کرنی ہے وہ ہر لحاظ سے اس سے برتر اور بہتر ہے قوت اور طاقت کے اعتبار سے بھی اور عظمت و جلال کی حیثیت سے بھی۔ اُسے اگر مطیع کرنا ہے تو اسے اس بات کا یقین دلایئے کہ جس ہستی کی وہ اطاعت کر رہی ہے وہ صرف قاہر اور جابر ہی نہیں، بلکہ اس کی خیر خواہ بھی ہے اور اس کی تمام ضرورتوں کی کفیل اور علیم بھی اور اس کی خالق اور مربی بھی اگر اسے اس بات پر مطمئن کر دیا جائے کہ اس کی خودی معاشرہ کی خودی میں فنا نہیں ہوگی بلکہ معاشرہ اور سیاست دونوں اس کی انفرادی خودی کی تربیت اور تحفظ کے ذمہ دار اور ضامن ہوں گے تو پھر وہ معاشرہ اور سیاست کی خادم اور فرمانبردار ہوگی ورنہ ہر آن یہ نئے نئے انقلابات اٹھاتی رہے گی اور زندگی کے سارے سکون کو برباد کر کے رکھ دے گی۔

اگر موجودہ دور کے ماہرین قانون خودی کی اس خصوصیت اور اس کی اس بنیادی طلب سے آگاہ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کو حاکم ا
قانون ساز تسلیم کرلیں تو ان کے قانون اور فلسفۂ قانون کے سارے مسائل ——— بالخصوص ذیل کے مسائل — حل ہو جائیں گے :—

١ — فلسفۂ قانون کے ماہرین قانون کی متفق علیہ تعریف دریافت کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں ملکی قانون کی تعریف وضع ک
ہیں تو وہ تعریف بین الاقوامی قانون پر منطبق نہیں ہوتی ۔ بین الاقوامی قانون کی تشریح کرتے ہیں تو طبعی اور اخلاقی اور مذہبی قوانین اس تشریح
باہر نکل جاتے ہیں ۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے انہیں ہر قانون کی الگ الگ تعریف کرنی پڑتی ہے ۔ قانون کی ہر قسم کی جب الگ الگ تعریفیں کرتے
تو ان اقسام میں کوئی ربط و تعلق پیدا نہیں ہوتا ۔ پھر ان تعریفوں میں معقولیت کا رنگ بھرنے کے لئے زندگی کو مختلف خانوں اور حصوں میں تقسیم کرکے
کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کو قانون ساز تسلیم کرلیں تو انہیں قانون کی مختلف اقسام کے لئے ایک ہی تعریف مل جائے گ
اور ان اقسام کے مابین انہیں توافق پیدا کرنے میں بھی آسانی ہو گی ۔

٢ — موجودہ دور کے ماہرین قانون کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ آیا فرد اہم ہے یا ریاست ۔ فرد اور ریاست کے حقوق اور اختیارات میں توازن
اعتدال پیدا ہو جاتا ہے کہ انسانی زندگی کا نظام " قسط " پر قائم ہو جاتا ہے ۔

٣ — فلسفۂ قانون کا یہ مسئلہ کہ قانون کا مقصد حصولِ انصاف ہے یا نہیں ——— طے ہو جاتا ہے کیونکہ جسے مجرد انصاف کہتے ہیں وہ انسا
ذرائع و وسائل سے قطعی باہر کی بات ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو عادل اور قانون ساز ماننے سے اس پہلو بھی انسان کو اطمینان ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ مجرد انصاف
(ABSOLUTE JUSTICE) صرف خدا ہی کے ہاتھوں ممکن ہے ۔ اگر کوئی شخص کسی کے گھر کو آگ لگا دے اور مجرم دستیاب
ہو ، اگر دستیاب ہو بھی تو اس کے خلاف ثبوت نہ ہو ، تو ایک مظلوم آدمی کی تسکین کے لئے کیا سامان ہے ۔ دنیا کی بڑی سے بڑی عدالت اس معاملے
میں بے بس ہے ۔ لیکن اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ کو عادل سمجھتا ہے تو اسے ایک تو اس بات کا یقین ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی حکومت میں وہ بے سہارا نہیں ۔
بلکہ معاشرہ کا ایک ایک فرد اس کا مددگار ہے اور اس کے ساتھ اسے یہ بھی اطمینان ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مجرم کو کسی نہ کسی وقت ضرور سزا دے گا اور اس کے
نقصان کی لازماً تلافی کرے گا ۔ اسی طرح اگر ایک شخص طاقت کے زور سے قوم کا حاکم بن بیٹھتا ہے پھر طاقت ہی کے بل بوتے پر ایسی حرکتیں کرتا ہے
جس کے نتیجے میں پوری قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے ۔ ایسے ظالم شخص کو اول تو دنیا کی کوئی عدالت سزا دے ہی نہیں سکتی اور اگر کسی ذریعے سے اسے سزا
ہو بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگی کہ اسے گولی مار دی جائے گی لیکن ایسا شخص جس نے قوم کے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو برباد
کیا اس کے لئے بس اتنی سزا کافی ہے کہ اسے گولی مار دی جائے ؟ مجرد انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس ظالم شخص کو بھی لاکھوں اور کروڑوں مرتبہ
اسے اسی طرح سزا دی جائے اور اسی نوعیت کی سزا دی جائے جس طرح اور جس نوعیت کی سزائیں اس ظالم نے اپنی قوم کے ایک ایک فرد کے لئے تجویز
کی تھیں لیکن یہ بات انسانوں کے بس میں نہیں ۔ مگر اللہ تعالیٰ کو حاکم تسلیم کرنے والا شخص سمجھتا ہے کہ مجرد انصاف یا قانونی انصاف ، دونوں صحیح
معنوں میں اللہ تعالیٰ ہی کے احکام کے مطابق حاصل ہو سکتے ہیں ۔

٤ — فلسفۂ قانون کا ایک مسئلہ قانون کے استحکام اور اس کے التزام کا بھی ہے بڑے بڑے نظریات کے باوجود دورِ حاضر کے مقننین اپنے قوانین
میں یہ خصوصیت پیدا نہیں کر سکے مگر جب اللہ تعالیٰ کو قانون دہندہ تسلیم کرلیا جائے تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان کی اخلاقی روحانی
اور اس کی تمدنی مستحکم اور غیر تغیر پذیر ہیں ۔ جس طرح سارا نظام کائنات اٹل قوانین اور مستحکم اصولوں کا پابند ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی اٹل
ضوابط اور غیر تغیر پذیر قوانین کی محتاج ہے ۔ پھر اللہ تعالیٰ کے قوانین محض کتابوں میں بند نہیں بلکہ ان کو اس نے اپنے رسولوں کی عملی تعبیرات اور
نظائر ——— سنت ——— سے اس حد تک مضبوط اور مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی معاشرہ اس سے اپنی اخلاقی اور مادی پستی کی کوئی دلیل فراہم نہیں کر سکتا ۔
یہ موجودہ قانون کی طرح معاشرہ کے پیچھے پیچھے چلنے والے اور معاشرہ جب پستیوں میں گر جائے تو اس کا پستیوں میں ساتھ دینے والے نہیں ہوتے ۔

یہ قوانین معاشرہ کے محافظ اور نگران بھی ہوتے ہیں اور مربی اور رہنما بھی ـــــــ اگر کوئی سوسائٹی پستیوں میں گر جائے تو اسے اوپر اٹھانے اور
حانی اور مادی ترقی و ارتقاء کی منزلوں پر گامزن کرنے میں مدد بھی پہونچاتے ہیں ۔ بلاشبہ ان قوانین کے اندر لچک بھی ہے مگر صرف اس معاشرہ
لئے اس میں لچک کی قطعی کوئی گنجائش نہیں ۔

جب انسانوں کو یہ اطمینان ہو کہ یہ قانون اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور اس کی بدل و جان پابندی کرنے کے لئے وہ اس کے سامنے جوابدہ بھی
ہے تو پھر ان کے اندر قانون کے احترام کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو حضرت ماعز اسلمیؓ اور ایک غامدی خاتون میں پیدا ہوئی تھی ۔ ان دونوں نے
زنا جیسے جرم کا ارتکاب کیا تھا ۔ خود چل کر آئے جرم کا اقبال کیا اور یہ جانتے ہوئے اقبال کیا کہ اس جرم کی سزا کیا ہے اور بار بار مطالبہ کیا "یا رسول اللہ
پاک کر دیجئے" ـــــــ بالآخر سزا نافذ ہوئی اور انہوں نے کھلے بندوں رجم جیسی سخت سزا قبول کی ۔

۵ ●ـــ جہاں تک حریت اور مساوات جیسے تصورات کا تعلق ہے موجودہ قوانین میں ان کی حیثیت محض زیب داستان کی سی ہے لیکن اگر
اللہ تعالیٰ کو حاکم اور قانون ساز تسلیم کر لیں تو پھر حضرت علیؓ جیسا خلیفۂ وقت ایک غیر مسلم یہودی کے ساتھ کھڑے ہو کر بیان بھی دے گا اور اپنے
خلاف جج کا فیصلہ سن کر اپنی توہین بھی محسوس نہیں کرے گا ـــــــ !!

۶ ●ـــ اگر اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بات ممکن ہو گی کہ قانون کی حکومت قائم ہو اور پھر اس بات کا امکان ہو گا
کہ دنیا میں انصاف کا دور دورہ ہو ـــــــ "قانون کی جو حکومت" خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ اگر آپ کی
لخت جگر چوری کرے گی تو ان کا بھی ہاتھ کاٹ لیا جائے گا ۔ اسی حکومت ہی کا یہ کرشمہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر خلیفہ کا لڑکا شراب پینے
کے جرم میں گرفتار ہو کر سامنے آتا ہے تو خلیفہ راشد کو قانون ہاتھ میں لینے کی جرأت نہیں ہوتی ۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بیٹے کی پیٹھ پر کوڑے برستے ہیں ۔
ان شدید ضربوں کی وجہ سے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے تو بھی حکم ہوتا ہے کہ کوڑوں کی گنتی پوری کی جائے اور جب تک قانون کا تقاضا
پورا نہیں ہو سکتا اس وقت تک نہ آہ بھرتے ہیں اور نہ آنسو آتے ہیں لیکن جب سزا نافذ ہو جاتی ہے تو بعد میں روتے بھی ہیں اور بچے کی لاش کو سینے سے
بھی لگاتے ہیں ـــــــ

اگر اللہ تعالیٰ کو حاکم اور قانون دہندہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر قانون کی حکومت کا یہ منظر دنیا ایک دفعہ پھر دیکھ لے گی کہ ولید بن عقبہ
جیسے گورنر شراب نوشی کے جرم میں سرِ عام کوڑوں کی سزا بھگت رہے ہوں گے ـــــــ اور رشوت و سفارش یا ان کے منصب کا دبدبہ انہیں اپنی غلط کاری
کی قانونی اور عدالتی سزا سے ہرگز نہ بچا سکے گا ۔

اور اگر خدا نخواستہ اللہ تعالیٰ کو حکم اور قانون ساز نہ مانا گیا تو قانون کی حکومت ، انصاف کا حصول اور آزادی اور مساوات جیسے
حقوق الفاظ کا خلاب تو ہوں گے لیکن ان کی تعبیر سے دنیا ہمیشہ محروم رہے گی ـــــــ !!

مس القادری

یادِ رفتگاں

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع، نظام دکن مرحوم

متحدہ ہندوستان میں ریاست حیدرآباد دکن حکومت مغلیہ کی یادگار اور مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا مظہر سمجھی جاتی تھی، اس لئے ہند کے مسلمانوں کے لئے حیدرآباد دکن کے نام اور نظام کی شخصیت میں غیر معمولی کشش تھی، راقم الحروف نے بھی بچپن ہی سے حیدرآباد دکن اور نام سنا تھا اور بدرِ شعور کو پہونچنے تک کوفہ و بغداد اور کابل و بخارا کے بعد حیدرآباد دکن کی شہرت و عظمت کا نقش دل و دماغ پر ثبت ہو چکا تھا۔

۱۹۲۸ء میں نواب میر عثمان علی خاں وائسرائے ہند سے ملنے کے لئے دلی تشریف لائے تو شمالی ہند میں دھوم مچ گئی، امیر حبیب اللہ خاں کی کابل کے شاہانہ خیر مقدم کے بعد یہ دوسرا استقبال تھا جس میں مسلمانانِ ہند نے اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دئے!

نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی تشریف آوری سے ہفتوں پہلے دلی میں ان کی آمد آمد کا ہنگامہ برپا تھا، اخبارات میں جلی سرخیوں اور نمایاں عنوانات کے ساتھ سفرِ شاہانہ کے انتظامات کی خبریں شائع ہوتی رہتیں، نئی دلی میں نظام پیلس کے اردگرد تماشائیوں کا ہجوم رہتا، قصرِ شاہی کو آراستہ کیا جا رہا تھا، خیموں، جھنڈیوں اور بیرقوں کے ہجوم میں گملوں کی قطاریں اور بہار دے رہی تھیں، حیدرآباد دکن سے مختلف سرکاری محکموں کے عہدیدار روزانہ دلی آرہے تھے!

اتفاق یا حسنِ اتفاق تھا کہ میں اُن دنوں دلی میں مقیم تھا اور وقتی طور پہ گزارے کے لئے صدیقیہ ہائی اسکول (پھاٹک حبش خاں) میں ملازمت کر لی تھی، طلبا جب راقم الحروف کو "ماسٹر صاحب" کہہ کر پکارتے تھے، تو میں اپنے اندر ایک عجیب قسم کی توحش انگیز کیفیت محسوس کرتا تھا!

مولانا عبد القدیر بدایونی مرحوم حضور نظام کے استقبال کے لئے بدایوں سے دلی آئے اور کشمیری بازار سے کچھ دور پرانے سکرٹریٹ کے علاقہ میں

---

* بدایوں کے سب سے زیادہ مشہور و معزز عثمانی خانوادے کی قابل ذکر شخصیت مولانا عبد القدیر کے دادا مولانا فضل رسول بدایونی علمبردارانِ توحید و سنت پر "وہابیت" کے نام سے تنقید کرنے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں! "بریلوی" مسلک تو مولانا احمد رضا بریلوی کی نسبت سے شہرت پا گیا ہے! اس مسلک کا اصل مرکز تو بدایوں تھا، مولانا احمد رضا خاں صاحب نے مولانا عبد القادر بدایونی محبِ رسولؐ سے علمی استفادہ کیا، اپنے اُستاد کی مدح میں اُن کا قصیدہ ان کے نعتیہ دیوان (حدائق بخشش) میں موجود ہے! پھر ایک ایسا دور بھی آیا کہ جمعہ کی اذانِ ثانی کے مسئلہ میں بدایوں اور بریلی کے دینی مرکزوں میں اتحاد قائد کے باوجود شدید اختلاف پیدا ہو گیا، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا قلم طنز و تعریض میں شمشیر برہنہ تھا، بات تفسیق و تضلیل تک پہونچی، علمائے بدایوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، یہاں تک کہ مقدمہ بازی کی نوبت تک آ گئی، نواب حامد علی خاں والیٔ رام پور کی حکمت عملی نے اس قضیہ نامرضیہ کو بے تلّے ختم کرا دیا۔

نواب معظم علی خاں کے یہاں ٹھیرے ہوئے تھے ۔ نواب صاحب موصوف بھوپال کے نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اُن کے والد کا نام نواب یٰسین علی خاں تھا، مولانا کی قیام گاہ پر ہی یہ بات سننے میں آئی کہ اگر بھوپال کے نوابی خانوادے میں کوئی مرد تاج و تخت کا وارث ہوتا، تو نواب یٰسین علی

مولانا عبدالقدیر بدایونی نے اپنے علمی و دینی گھرانے ہی میں دینی علوم کی تحصیل کی، پھر وہ ٹونک تشریف لے گئے اور وہاں مولانا سید برکات احمد مرحوم سے جو خیرآبادی فلسفہ کے سب سے بڑے ستون تھے منطق اور فلسفہ پڑھا۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی کو اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا عبدالمقتدر بدایونی سے شرف بیعت حاصل تھا۔ مولانا عبدالمقتدر صاحب لاولد تھے، اس لئے اُن کی وفات کے بعد خانوادۂ قادریہ کے مولانا موصوف ہی سجادہ نشین قرار پائے۔

تحریک خلافت کے زمانہ کے شہرۂ آفاق مقرر مولانا عبدالماجد بدایونی بھی اسی خاندان کے معزز فرد تھے، مگر مولانا عبدالقدیر بدایونی اور مولانا ماجد میاں کے درمیان آخر وقت تک ناچاقی اور چشمک ہی رہی، لیکن اس اختلاف کے باوجود جب بھی دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا تو ماجد میاں مرحوم اُن کے قدم چھونے کے لئے ہاتھ بڑھاتے اور مولانا عبدالقدیر محبت و شفقت کے ساتھ اُن کا ہاتھ تھام لیتے۔

ضلع بدایوں میں گنور ایک مشہور قصبہ ہے، ایک زمانہ میں وہاں کے مسلمان زمیندار تمام علاقہ پر چھائے ہوئے تھے ۔ مگر پھر شامت اعمال رنگ لائی اور اُن کے حالات خاصے ابتر ہو گئے ۔ اب سے پچاس سال قبل مشہور نعت گو شاعر مولانا ضیاء القادری بدایونی تحصیل گنور میں رجسٹرار قانون گو تھے، اُن کے اہتمام سے گنور میں سال کے سال بڑے دھوم کی رجبی ہوتی اور بدایوں اور بریلوی عقائد کے مشہور و معروف علما اس جلسہ میں شریک ہوتے ؛

اب سے کم و بیش سو سال پہلے گنور میں کوئی صاحب سخاوت حسین گزرے ہیں، وہ اپنی تحقیق کی بنا پر اہل حدیث ہو گئے انہی کے اثر، صحبت اور تبلیغ سے گنور میں مسلک اہل حدیث کو فروغ میسر آیا ۔ اور متعدد گھرانوں میں یہ مسلک مقبول اور رائج ہو گیا یہاں تک کہ اہل حدیث کی ایک مسجد بھی بن گئی ؛ اس قصبہ میں رجبی کے جو جلسے ہوتے تھے، اُن میں علماء اور واعظین کا اکثر و بیشتر موضوع " ردِ وہابیت " ہوتا تھا ۔ میری عمر بہت سے بہت بارہ تیرہ سال کی ہوگی، مجھے اب تک یاد ہے مولانا فاخر شاہ الہ آبادی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ :-

" وہابی کہتے ہیں، اولیاء اللہ اولاد نہیں دے سکتے، میں دعویٰ کرتا ہوں کہ تم اپنی عورتوں کو ہمارے یہاں لاؤ، ہم اولاد دیں گے "

اس قسم کے سطحی لطیفوں اور بازاری قسم کی چوٹوں سے اہل بدعت خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے وہ ان باتوں کو اپنے مسلک کی فتح اور وہابیت کی شکست سمجھتے تھے۔

ہمارے گاؤں کے لوگ گنور کے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے، مولانا عبدالقدیر بدایونی کی تقریروں سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور یہی تاثر مولانا موصوف کی عقیدت کی بنیاد بن گیا۔ پھر انہیں کسیر (ضلع بلند شہر) میں بلایا گیا، مولانا موصوف کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی، مگر چہرے سے وجاہت اور بزرگی کے آثار نمایاں تھے، گورا رنگ، طباقی سا چہرہ، موزوں ناک نقشہ، اُن کو دیکھ کر دل و نگاہ کشش و جاذبیت محسوس کرتے! وعظ کہنے کا انداز بھی خاصہ دل نشین تھا۔ اُن کا ایک مخصوص وعظ "مال، جمال اور کمال" بیسیوں بار کی تکرار کے باوجود بھلا لگتا، شروع شروع میں ہمارے گاؤں کے تین چار آدمی اُن کے مرید ہوئے اور پھر جو سلسلہ چلا ہے تو گاؤں کی ایک چوتھائی مسلمان آبادی اُن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئی !

مولانا عبدالقدیر بدایونی کسیر کلاں میں پہلی بار جب آئے تو گاؤں کی معروف شخصیت نیاض علی صاحب (جو مولانا کے لقب سے مشہور ہیں اور اُن کا گھرانا " لمبا پوری" کا خاندان کہلاتا ہے) کے یہاں قیام فرمایا، مولانا بدایونی کے اصل میں لانے والے یہی مولانا نیاض تھے، جلسہ میلاد کا اشتہار راقم الحروف کے والد مرحوم نے لکھا۔ اُس نواح میں یہ شاید پہلا اشتہار تھا جو عوام کی اطلاع کے لئے مسجدوں اور بعض دوسرے نمایاں مقامات پر چسپاں یا گیا تھا ! کسیر کلاں سے تین میل کی دوری پر ڈبائی مشہور قصبہ ہے، وہاں کی مسجد میں جب یہ اشتہار لگایا جا رہا تھا، تو ایک صاحب نے تندے طنز و مزاح

،کے والد ہوتے! ان دنوں دکی میں کرکٹ کا میچ ہو رہا تھا۔ نواب معظم علی خاں اُن کے امپائر کے فرائض انجام دے رہے تھے، یہ خاندان

مانہ میں پوچھا ؎

"ارے کستیر والو! تم میلاد شریف میں کیا تقسیم کروگے"

لگانے والے نے جواب دیا "نہ تو اس اشتہار میں لکھا ہوا ہے" ڈبائی کے اس شخص نے اشتہار پڑھتے ہوئے، جھنجلا کر کہا اس میں تو کہیں نہیں لکھا
یں کیا تبرک تقسیم ہوگا۔ ہمارے گاؤں والے نے جواب دیا اس اشتہار کا یہ شعر کیا آپ نے نہیں پڑھا ؎

تقسیم آج ہوگی ثواب عظیم کی
محفل ہے ذکر پاک رسولؐ کریم کی

،کی اس ذہانت اور حاضر جوابی پر وہ تعصباتی جھینپ کر رہ گیا۔

والد مرحوم گاؤں کے سب سے پہلے شاعر تھے، ظریفؔ تخلص تھا مگر انہوں نے مزاح و ظرافت میں ایک مصرعہ بھی نہیں کہا، یہ تو فارسی والوں نے "ظریف الطبع" اور اُردو والوں نے ہنسی دل لگی کی باتیں کرنے والا بنا دیا ہے عربی میں تو ظریف زیرک و دانا کو کہتے ہیں! میں اُن دنوں میلاد پڑھا کرتا
لد مرحوم نے میری خاطر پورا میلاد مرتب کیا، جو مولود شہیدی وغیرہ جیسی کتابوں سے مستفاد و ماخوذ تھا۔ نعتیہ نظمیں اور غزلیں سب کی سب
،تھیں!

والد مرحوم گاؤں کی مروجہ رسموں ـــ میلاد کے قیام، فاتحہ، سوم و چہلم ـــ میں حصہ لیتے تھے، مگر دوسرے مسلمانوں کی طرح علمائے دیوبند
ن نہ تھے بلکہ اُن کا احترام کرتے تھے، پوری بستی میں صرف ہمارے گھر میں مولانا اشرف علی تھانوی کا "بہشتی زیور" تھا، اس نسبت اور ربط و تعلق کے
ؤں کے مسلمانوں کی زبان سے اُن پر "دیوبندیت" کی طنز سننے میں آتی تھی!

میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا، اُن دنوں مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم ہمارے گاؤں میں آئے ہوئے تھے، گاؤں سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر
،کی چھوٹی سی بستی گودھنہ ہے وہاں ایک بزرگ کے عُرس میں مولانا مرحوم کا وعظ تھا مجھے پتہ چلا کہ ہمارے محلہ کے چند لوگ مولانا کے مرید ہو رہے
کی دیکھا دیکھی میرے دل میں بھی یہ شوق پیدا ہوا، میں نے اپنی پھوپھی سے جنہوں نے مجھے بیٹے کی طرح پالا تھا تو پیسے ضد کر کے لئے اور ان پیسوں کے
کان سے خرید کر، محفل وعظ میں پہونچا اور مولانا عبدالقدیر بدایونی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اُن کا مرید بن گیا۔ میں اس کمسنی میں شعر تو موزوں کر لیا کرتا
ہوں اور میلادوں میں دوسروں کی غزلیں لحن کے ساتھ پڑھا کرتا تھا، اس محفل میں مُرید ہونے کے بعد جو غزل میں نے سُنائی اُس کے یہ دو شعر اب
یں ؎

جانے کیا ساقی کی نظروں نے اشارا کر دیا	نذرِ ساغر آج میں نے زہد و تقویٰ کر دیا
کل تلک تھا میکدے میں خشک ساحل کی طرح	آج ساقی نے مجھے قطرے سے دریا کر دیا

لحاظ سے ان شعروں نے اُس محفل میں عجیب سماں پیدا کر دیا۔

مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کو سب لوگ "حضرت صاحب" کہتے تھے۔ پاس ادب اور فرطِ عقیدت کے سبب اُن کا نام کوئی نہ لیتا تھا، مُرید
، دباتے، اُن کی رکابی میں بچے ہوئے کھانے کو "تبرک" سمجھا جاتا، گھر گھر دعوتیں ہوتیں، حسب حیثیت و استطاعت نذرانے دئے جاتے! گاؤں
کھیتی باڑی کرتے تھے، دو چار کسان جن کے پاس سَو بیگھہ سے زیادہ زمین تھی وہ تو البتہ خاصے خوشحال تھے، باقی لوگوں کی بس گزر بسر ہو جاتی تھی،

مولانا عبدالقدیر بدایونی کے خانوادے سے بیعت و عقیدت کا تعلق رکھتا تھا! مہمانوں کی ضیافت میں نوابی اور امارت کی شان جھلکتی تھی!
دلی میں ہر طرف نظام دکن ہی کی آمد کے چرچے تھے، ہزاروں مسلمان باہر سے اُن کے دیکھنے کے لئے آ گئے تھے، مولانا عبدالقدیر بدایونی

اس لئے ایک پھیرے میں "حضرت صاحب" کو مریدوں سے چالیس پچاس روپیہ سے زیادہ کی یافت نہ ہوتی، اُن کے ذاتی عقیدت مندا ور جاں نثار مرید
راقم الحروف کے عزیز حافظ اللہ دیا، جن کا نام مولانا مرحوم نے بدل کر "عطاء الرحمٰن" رکھ دیا تھا۔ مولانا کی سب سے زیادہ پذیرائی اور خاطر و مدارات کرنا
اُنہی کے مردانہ مکان میں جو "کمرہ" کہلاتا تھا، مولانا قیام فرماتے!

۱۹۲۴ء میں مولانا مرحوم زیارتِ حرمین شریفین کے لئے روانہ ہوئے، ہمارے گاؤں کے پانچ چھ آدمی اور بمبئی کے چند عقیدت مند تاجر اس
سفر میں اُن کے ہمراہ تھے یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان ابن سعود نے حجاز پر حملہ کر دیا تھا اور شریف حسین کی فوجوں کو ہر محاذ پر شکست ہو رہی تھی، مولانا
عقیدے کے اعتبار سے نجدیوں کے انتہائی مخالف تھے! مکہ مکرمہ میں ہز مجسٹی شریف حسین سے اُن کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں نے ایک دوسرے
کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا، مولانا فرماتے تھے کہ ایک دو بار شریف حسین نے دُوربین سے اُنہیں کسی جنگی محاذ کا منظر بھی دکھایا تھا، سفرِ حجاز سے واپس آ
وہ ہندوستان کے تنہا عالم تھے، جنہوں نے شریف حسین کی کھُل کر تائید کی۔ پھر اُنہوں نے اپنے روابط و تعلقات اور شخصیت سے علماء فرنگی محل
بھی بڑی حد تک متاثر کر دیا، ان علماء کے اتحاد و تائید کی قدرِ مشترک "وہابیت اور نجدیت" سے ان کا اختلاف تھا۔ جنت البقیع کی قبروں اور گنبدوں
کی شکست و ریخت کے چرچے اور "تذکروں" نے متحدہ ہندوستان کے عوام ...... (مسلمانوں) کو نجدیوں کی طرف سے بہت کچھ بدظن کر دیا تھا۔

۱۹۲۶ء کے آخر میں لکھنؤ کی بارہ دری میں بڑے اہتمام کے ساتھ حجاز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سنّی اور شیعہ علماء ایک پلیٹ فارم
پر جمع ہو گئے تھے۔ دیوبندی فکر کا کوئی عالم اس اجتماع میں نظر نہیں آیا، بمبئی کے سیٹھ صالح بھائی بڑودہ والا اس کانفرنس کے صدر تھے۔
رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے بھی اپنی شرکت سے اس جلسہ کی زینت اور عزت کو دوبالا کر دیا، راقم الحروف نے بہت قریب سے
دیکھا کہ سر شیخ محمد خاں مہاراجہ محمود آباد نے کھڑے ہو کر کافی کی پیالی مولانا محمد علی کی خدمت میں پیش کی، حجاز کانفرنس کی پوری کارروائی تو
حافظہ میں محفوظ نہیں رہی، اتنا یاد ہے کہ "الحجاز للحجازیین" کی قرارداد غلبہ آراء سے منظور ہوئی، مولانا عبدالقدیر بدایونی اس کانفرنس پر
سب سے زیادہ فعال، نمایاں اور پیش پیش نظر آتے تھے، مولانا محمد علی مرحوم نے بھی شاید کوئی قرارداد پیش کرنی چاہی تھی، وہ پیش نہ ہو سکی، اس بار
پر مولانا شوکت علی خاصے کبیدہ نظر آتے تھے، اس کانفرنس میں صفیؔ لکھنوی نے بڑے معرکہ کی نظم پڑھی، ایک شعر یاد رہ گیا ہے ـــ

اُڑتی ہے گرد مرقدِ خیر الانامؐ سے
اے تیغِ انتقام نکل آ نیام سے

سلطان ابن سعود کی فوجیں جب سوادِ مکہ تک آ گئیں، تو شریف حسین صاحب شاہی خزانہ لے کر جدہ چلے آئے اور چند دن کے بعد اپنے
بڑے بیٹے علی کو اپنا قائم مقام مقرر فرما کر، وہاں سے پانی کے جہاز کے ذریعہ قبرص تشریف لے گئے، خلافتِ ترکی سے غداری اپنا رنگ لائی
اور شریف حسین کا حسرتناک انجام تاریخ کے صفحات پر عبرت کے نشان چھوڑ گیا۔

جلالۃ الملک علی چند مہینے جدہ میں ٹکے رہے، مگر ایک ملک میں دو دو بادشاہ کیسے رہ سکتے تھے، آخر انہیں بھی جدہ چھوڑنا پڑا اور
اپنے چھوٹے بھائی فیصل شاہ عراق کے پاس پناہ لینی پڑی، جن دنوں وہ جدہ میں اپنے والد ہز مجسٹی شریف حسین کے جانشین کی حیثیت سے اقامت
گزیں تھے اُس زمانہ میں اُنہوں نے طاہر الدباغ صاحب کی قیادت میں ایک وفد ہندوستان بھیجا، ہندوستان کے علماء کا ایک وفد بھی جدہ
بھیجا تھا، اس وفد کے ارکان میں مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم کا نام اچھی طرح یاد ہے، غالباً علامہ سید سلیمان ندوی بھی اس میں شریک تھے۔

ان کے خیر مقدم کے لئے نئی دلّی ریلوے اسٹیشن پر پہونچے، میں اُن کے ہمراہ تھا، پلیٹ فارم پر کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی، استقبال کرنے والے
ے اسٹیشن سے باہر کھڑے تھے، اتنے میں شاہی اسپیشل ٹرین آ گرُ کی ابدا عزازانہ خیر مقدم کی توپیں سر ہونے لگیں، سلامی سینا کے ریلوے

مولانا عبدالقدیر کے بھانجے مولانا خواجہ غلام نظام الدین جو اپنے ماموں کے انتہائی مخلص ہمدرد اور جاں نثار بہی خواہ تھے، انہوں
ہمارے گاؤں سے عربی کا ایک پوسٹر شریف علی کو جدہ بھیجا، جس میں ہندوستانی علماء کے اس وفد پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا (عبارت کے
کے الفاظ یہ تھے: "لا نعتمد علیٰ ھذا الوفد . . . . .) جب یہ وفد جدہ پہونچ کر شریف علی سے ملا تو انہوں نے وہی پوسٹر ارکانِ وفد
ہاتھ میں تھما دیا اور علماء سے کہا کہ ہندوستان کے مسلمان تو آپ کی نمائندگی پر اعتماد ہی نہیں کرتے! یہ بالکل خلافِ توقع صورت حال تھی،
س سے ان علماء کو دوچار ہونا پڑا۔

۱۹۲۴ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے جو امتحان میں نے دیا اُس کا تعلیمی بورڈ نے نام High School Examination
S. L. C. Examination رکھا، ریاضی کے علاوہ تمام دوسرے مضامین میں میری حیثیت امتیازی تھی، فارسی تو گھر ہی پر اتنی پڑھ لی
تھی، جو میٹرک تک کام آئی، اُردو میں پڑھانے والوں سے بھی دو چار قدم آگے، تاریخ میری خاص دلچسپی کی چیز تھی، مگر ریاضی سے میں ہمیشہ کتراتا اور کنی کاٹتا
رہتا، اساتذہ ریاضی کا کام (HOME WORK) دیتے تو دوسرے طلباء کی کاپیوں سے سوالات کے جوابات نقل کر لیتا اس
صورت میں کامیابی کی کیا سبیل اور توقع تھی۔ اس ناکامی کے چند مہینے بعد والد کی وفات کے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا، ہر باپ اپنی اولاد سے پیار کرتا
ہے مگر والد مرحوم کی شفقت و محبت کی کوئی حد و نہایت نہ تھی!

دوسروں کے سامنے میری ذہانت کا بیان

اور میرے سامنے میری شکایت ہائے ہائے!

میاں (والد مرحوم) کے انتقال کے بعد سوا سال کی مدت اضطراب میں گزری، نوجوانی کے جذبات، شاعری کا بدو شعور، سرمد، مومن، غالب
داغ اور آس اپنے زمانے کے اکابر شعراء ــــ فانی اور جگر ــــ کی عشق عاشقی کے قصّے سُن رکھے تھے، مولانا حسرت موہانی کی تغزل زندگی کی بہت شہرت تھی،
مگر اُن کے یہاں بھی اس قسم کے خیالات اور واردات نظر سے گزرے:

ـــ وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

۱۹۲۵ء کے آخری ہفتہ میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سلور جوبلی منائی جا رہی تھی، میری شادی ہوئی جس نے اس طوفان میں ٹھہراؤ سا پیدا
کر دیا۔ "نکاح" کو شاید اسی لئے "نصف دین" کہا گیا ہے، نئی ذمہ داری، گھر میں عورتوں کے علاوہ کوئی بڑا اور سرپرست نہ تھا۔ سوا سال کی ہنگامہ آفریں
زندگی نے گھر کے معاشی نظام پر بھی اثر ڈالا، سرکاری ملازمت کے لئے کم سے کم انٹرنس کی سند ہونی ضروری تھی۔

ڈیڑھ سال کی چھوٹی ہوئی پڑھائی خاص طور سے ریاضی میں تھوڑے بہت جو قاعدے آتے تھے اُنہیں بھول بھال گیا، مگر آدمی اللہ تعالیٰ پر
بھروسا کر کے حوصلہ سے کام لے اور کمر ہمت باندھ لے تو کیا نہیں ہو سکتا! چھ سات مہینے کی محنت میں سچ مچ لوہے کے چنے چبانے پڑے: ۱۹۲۶ء میں
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کا امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہو گیا، ریاضی کے پرچوں کا معاملہ خاصہ مذبذب تھا، امتحان میں پاس ہونے کی جب
خبر ملی ہے تو سجدے میں گر پڑا اور شکر و مسرت کے آنسو آنکھوں سے جاری ہو گئے!

ٓ افسوس ہے تقسیم ہند سے قبل گھریلو معاملات کے سبب ماموں اور بھانجے کے درمیان شدید ناچاقی ہو گئی۔

اسٹیشن سے لیکر نظام پیلیس تک تماشائیوں کے ٹھٹ لگے تھے، نظام دکن نے اپنی کار سے مولانا عبدالقدیر بدایونی کو دیکھا اور ان کے سلام
آنگلی کا اشارہ کیا ! اپریل

اس عرصہ میں مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم سے خط وکتابت ہوتی رہی ہر خط میں اُن سے اصلاح احوال کے لئے دُعا کی تمنا ! پھر وہ
گاؤں تشریف لائے تو اپنے ساتھ بدایوں لے گئے ! وہاں ایک صاحب تھے مولوی فصیح الدین، انگریزی دور کے خان بہادر، ریٹائرڈ کلکٹر اور یو۔ پی
کونسل کے ممبر! بڑھاپے میں بصارت سے قریب قریب معذور ہو چکے تھے، زرعی مسائل پر کونسل میں اُن کی تقریریں بڑی دلچسپی کے ساتھ سنی جاتیں
مرحوم نے خان بہادر صاحب سے مجھے ملایا اور نہ صرف سفارش کی بلکہ اُنہیں اس پر پوری طرح آمادہ کرلیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ نینی تال لے جائیں
وہاں کسی محکمہ میں سفارش کر کے ملازمت دلادیں !

بدایوں سے انٹر کلاس میں خان بہادر فصیح الدین، مولوی نظام الدین حسن ایڈیٹر "ذوالقرنین" اور میں نینی تال کے لئے روانہ ہوئے، بریلی
سے ڈاکٹر ضیاء الدین کا ساتھ ہوگیا، وہ بھی اُسی ڈبہ میں تشریف لے آئے، اُس زمانہ میں مسافروں کی آج جیسی بھیڑ نہیں ہوتی تھی، ہندوؤں کے اسٹ
اور میلوں کے علاوہ تھرڈ کلاس تک میں بڑی خلاصہ جگہ ملتی، نینی تال میں خان بہادر صاحب نواب سر محمد یوسف وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ کی قیام
پر ٹھیرے، اور اُن کے ساتھ مولوی نظام الدین اور راقم الحروف بھی ! اس کوٹھی کا نام "اوک اوور کالج (LODGE
ORK OVER) تھا اور غالباً نینی تال کی سب سے بلند چوٹی پر واقع تھی، اس کے اصل مالک نواب صاحب چھتاری تھے، گورنمنٹ نے اُن سے کرا
یہ لے لی تھی !

شب میں کھانے کی گھنٹی بجی، دوسرے مہمانوں کے ساتھ میں بھی کھانے کی میز پر پہونچا، ڈائننگ روم خاصہ سجا ہوا، کھانے کی میز پر خوبصا
سفید چادر، اُس پر چھُری کانٹے سلیقہ کے ساتھ چنے ہوئے اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے گلدان رکھے ہوئے، جن میں آج کی طرح پلاسٹک کے مصنوعی
پھول نہیں، اصلی پھول تھے ! میں نے ایک دو بار مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم ہی کی معیت میں البتہ راجہ صاحب سلیم پور کے یہاں کھانا کھایا تھا، مگر
یہاں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر نگاہ ٹھٹک سی گئی، چھری کانٹے سے کھانا کھانے کا یہ پہلا تجربہ تھا، بعض انگریزی کھانے میرے لئے بالکل نئے تھے ساتھ
والوں کو دیکھ دیکھ کر کھانا کھانے میں اُن کی نقل کر رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ نقل کی نوبت پر مضحکہ خیز نہ بن جائے۔ پہلے دن اسی اندیشہ و تکلف
کی بدولت پوری طرح سیر نہ ہوسکا، نواب سر محمد یوسف کے یہاں تین ہفتہ کے قریب قیام رہا، اور اس مدت میں انگریزی طرز پر کھانا کھانے کی خاصی مشق ہو
گئی ! نواب صاحب موصوف کے یہاں کھانے پر مہمانوں کا ہجوم رہتا، ایک دو اونچے درجہ کے انگریز عہدیدار لنچ یا ڈنر میں ضرور ہوتے، مسٹر اوڈونل
اُن دنوں فینانس منسٹر تھے، گورنر کے بعد اُنہی کا درجہ تھا، وہ متعدد بار کھانے میں شریک ہے ! نوابزادہ لیاقت علی خاں اور سر شفاعت احمد خاں بھی
نواب صاحب کے مہمان تھے، ان کے علاوہ محمود آباد اسٹیٹ کے منیجر خان بہادر حبیب اللہ (ریٹائرڈ کلکٹر) جو اپنی وجاہت کے سبب پورے مجمع پر چھا
جاتے، بار بار کھانے پر تشریف لاتے ! نیلی چھتری کے مصنف مسٹر ظفر عمر سے بھی نینی تال ہی میں ملاقات ہوئی۔
آنریبل منسٹر کی کوٹھی پر قیام، امیرانہ ضیافت اور اتنے بڑے بڑے آدمیوں کی ہم نشینی، میں یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ ملازمت ملے یا نہ ملے
مگر یہ فراغت وعزت اور لطف ومسرت بھی اپنی جگہ بہت کچھ ہے ایسے موقعے ہر کسی کو کہاں میسر آتے ہیں ! ہاں ! ایک خاص بات رہ ہی جاتی ہے وہ یہ
کہ نواب صاحب کے یہاں کھانے میں کبھی کوئی خاتون شریک نہیں ہوئی، مشرقی روایت اور اسلامی تمدن کی پاسداری اس حد تک کہ کوئی انگریز عہدیدار بھی
اپنی بیوی کو دعوت میں لے کر نہیں آیا اور اب . . . بس

یہاں کیا ذکر شرم وآبرو کا
یہ دورِ عظمتِ مریم نہیں ہے

دوسرے دن مولانا نے مجھے خط دے کر نظام پیلس بھیجا، یہ خط نواب اظہر جنگ بہادر مرحوم کے نام تھا، جہاں دنوں عرض بیگی کی
ت انجام دے رہے تھے، عربی میں اس عہدے کا نام "میدا التشریفات" ہے، اردو میں شاہی پیشکار کہہ سکتے ہیں۔ وہ معاندوں پہ باسعی

انگریز کے اس دور حکومت میں صوبہ کے وزراء کی تنخواہوں کا مجموعی بجٹ تمام وزیروں پر تقسیم کر دیا جاتا، اور یہ تقسیم آنے پائی کی کسر تک جا کر
، ہر وزیر کو پانچ ہزار تین سو تینتیس روپیہ تین آنہ یا پانچ آنہ چار پائی تنخواہ ملتی، نواب سر محمد یوسف کے اخراجات شاہانہ تھے، وزارت کی تنخواہ میں
پورا کہاں پڑتا تھا، زمینداری کی ساری آمدنی بھی صرف میں آجاتی، آقا کی حد سے بڑھی ہوئی کٹ وہ دلی اور سیر چشمی سے ملازمین خوب فائدہ اٹھاتے
بھرے اڑاتے!

نینی تال میں گورنر کے علاوہ اور کسی کو موٹر چلانے کی اجازت نہ تھی، وزراء کے پاس خوبصورت قسم کی رکشا ہوتیں جن کے آگے پیچھے آٹھ
لگے رہتے بلکہ یوں کہئے جتے رہتے وہ ان کی رنگ برنگ کی وردیاں ان پر سنہری لیس اور دیدہ زیب بیک، جھم جھم کرتی ہوئی!

صوبہ کی مجلس قانون ساز میں تماشائیوں کی گیلری سے وہاں کی کارروائی دیکھی، سر سیتا رام مجلس قانون ساز کے صدر تھے، جو برسوں اس
سب جلیل پر فائز رہے، بڑی رواں اور شستہ انگریزی بولتے تھے، کانگریس کے ٹکٹ پر کوئی صاحب جن کا نام بھگوتی سہائے اور بیدل تخلص تھا،
بائی کونسل میں ممبر منتخب ہو گئے تھے، یہ اپنی تقریر میں دو چار جملوں کے بعد اشعار پڑھتے ایک بار ان کی تقریر خاصی طول کھینچ گئی، سر سیتا رام
نہیں ٹوکا، مگر بڑے خوبصورت انداز میں!۔ ?Mr. Baidar — How many couplets more
لطیف طنز پر سب مسکرا دیتے! انہی سیتا رام صاحب کی صدارت میں سنا ہے لکھنؤ میں کوئی مشاعرہ تھا! مشہور مزاحیہ نگار شاعر ظریف لکھنوی
اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا —

نہ ہے یا مادہ عجب ترکیب ہے اس نام کی
کچھ حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے سیتا رام کی

مسٹر سی، وائی چنتا منی روزنامہ لیڈر (الہ آباد) کے نامور ایڈیٹر تھے، اور یو۔ پی میں وزیر تعلیم بھی رہ چکے تھے، کسی مسئلہ میں محکمہ تعلیمات
انگریز ڈائرکٹر سے اختلاف ہوا، بات گورنر تک پہونچی، گورنر نے ڈائرکٹر کی پچ کی، مسٹر چنتا منی اس مداخلت کو برداشت نہ کر سکے، انہوں نے کھٹ سے
استعفیٰ دے دیا، صاحب موصوف صوبائی مجلس قانون ساز کے سب سے اچھے مقرر تھے، محکمہ جیل کی اصلاحات پر اُن کی تقریر ہوئی اور سرکاری اور
غیر سرکاری حلقوں میں سب نے اس کی تعریف کی، مسلمانوں میں نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم چوٹی کے مقرر تھے۔ اور کانگریسیوں میں گووند بلبھ پنت، اخان بہادر
نظ ہدایت حسین مرحوم کے نام تک سے آج کا تعلیم یافتہ طبقہ واقف نہیں ہے مگر اُن دنوں وہ بڑی شہرت کے مالک تھے، کان پور کے مشہور وکیل انگریزی
بلند پایہ مقرر، اُن کی شہرت اور قابلیت کے سبب انہیں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں بلایا گیا۔

ہ مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

خان بہادر فصیح الدین صاحب نے محکمہ جنگلات کے سب سے بڑے انگریز عہدیدار سے جن کے عہدے کا نام CONSERVATOR
تھا مجھے بلایا، درخواست بھی دی، مگر کچھ ہوا ہوایا نہیں۔

اس تضاد پر اب غور کرتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آتی ہے کہ سرکاری ملازمت کی دوڑ دھوپ بھی کر رہا تھا اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں میرے
مضامین اور مراسلے بھی اخباروں میں چھپتے تھے،

اس کے بعد میرا بدایوں آنا جانا رہا اور بعض دفعہ مولانا عبدالقدیر بدایونی کے یہاں مدرسہ قادریہ میں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو مہینے قیام کی نوبت
بائی، مولانا مرحوم تو سراپا لطف و کرم تھے ہی، اُن کے اعزا اور متوسلین بھی بڑے احترام و محبت سے پیش آتے، غالباً ۱۹۲۷ء ہوگا، عرس قادری،

پہریدار سنگینیں لئے کھڑے تھے، چھوٹے بڑے ملازمین اور عہدیداروں کا قریب قریب ایک ہی سا پہناوا تھا، شیروانی، سر پر دستار اور کمر میں پٹہ بندھی ہوئی، حکومت آصفی کا پیلے رنگ کا لیٹر بکس بھی پیلس کے گیٹ کے قریب نصب تھا: قصر شاہی کی رونق اور بہار اپنے شباب پر تھی، لوگ

کے سلسلہ میں بزم شعر و سخن بھی منعقد ہوئی، باہر کے مہمانوں کے علاوہ شہر کے منتخب افراد کا مجمع تھا، اتنے اونچے درجہ کے سامعین میں شعر پڑھنے کا میرا پہلا اتفاق تھا، اتنی داد ملی کہ میں اپنے کو فضا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ حضرت مولانا احسن مارہروی بھی مشاعرے میں شریک تھے، مشاعرہ ختم ہو جانے کے بعد میں اپنی چھولداری میں چلا آیا، وہ وہاں سے گزرے تو مجھے پلنگ پر بیٹھا دیکھ کر رُکے، میں تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا، میری شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خاص لکنت زدہ انداز میں بولے ۔۔۔

"میاں! وہ شعر تو پھر پڑھنا جس کا قافیہ "غلط انداز" ہے"

اُن کے اس طرح فرمانے پر میرا ماتھا ٹھنکا کہ میرے اس شعر میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے، شعر تھا ۔

ہو چکی بیمارِ اُلفت کو تسلّی ہو چکی
اک نگاہِ واپسیں وہ بھی غلط انداز ہے

پلک جھپکتے میں ذہن "نگاہِ واپسیں" پر پہونچا کہ نگاہِ واپسیں تو مرنے والی کی آخری نگاہ کو کہتے ہیں، میں نے محبوب کی مرخصتی ہوتی نگاہ کو "نگاہِ واپسیں" کہا ہے، یہ تو بڑی فاحش غلطی ہے، میں نے تھوڑے تامّل کے بعد شعر پڑھا ۔۔۔

ہو چکی بیمارِ اُلفت کو تسلّی ہو چکی
ایک دزدیدہ نظر ۔۔۔ وہ بھی غلط انداز ہے

مولانا احسن مرحوم پھر وہاں رُکے نہیں، عجیب حیرت زدہ انداز میں اپنے خیمے کی طرف بڑھ گئے ۔

کراچی میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا میں نے ایک ادبی نشست میں اپنی غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ تھا ۔

غنچوں کے دل سے پوچھئے لُطف کشادگی
بادِ صبا پہ تہمتِ آوارگی سہی

اس پر ایک صاحب نے "لُطفِ کشادگی" طنزیہ انداز میں دُہرایا، میں نے برجستہ دوسری بار مصرعہ اولیٰ یوں پڑھا ۔

غنچوں کے دل سے پوچھئے لُطفِ شگفتگی

حیدرآباد دکن میں مولانا عبدالقدیر بدایونی ہی کی ذات میرے وہاں پہونچنے کی تقریب اور قیام کا سبب بنی ورنہ اب سے چالیس برس پہلے مجھے کون جانتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں مولانا کے ساتھ عراق کا سفر کیا اور انہی کی بدولت بغداد کے عمائد و مشاہیر یہاں تک کہ ہز مجسٹی شاہ غازی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس سفر میں تمام مصارف و اخراجات کے وہی کفیل تھے :

میرے حیدرآباد دکن جانے سے پہلے مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم اور اُن کے خواہر زادہ خواجہ غلام نظام الدین صاحب کے صلاح مشورے سے یہ بات طے پائی کہ بدایوں سے ایک ماہنامہ نکالا جائے جس کا نام "نظام الملک" تجویز کیا گیا، اس رسالہ کے مطبوعہ اشتہارات دوسرے رسالوں میں بھی چھپنے کے لئے بھیج دیئے گئے، میں نے رسالہ کے ایڈیٹر اور پرنٹر پبلشر کی حیثیت سے بدایوں کی کلکٹری کچہری میں ڈکلریشن داخل کیا، جو ایک گھنٹہ میں مل گیا۔ یہ انگریز کے دور استبداد کا واقعہ ہے اور آج پاکستان کی بنیادی جمہوریت کے دور میں کسی نئے رسالے اور اخبار کے لئے ڈکلریشن لینا ہفت خواں کو طے کرنا ہے، پرنٹر پبلشر کے نام کی تبدیلی کے لئے مہینوں گزر جاتے ہیں مگر شنوائی نہیں ہوتی اور خفیہ پولیس مشتبہ لوگوں کی طرح متعلقہ افراد کے بارے

---

[1] حیدرآباد کے دوران قیام میں راقم الحروف مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کی آمد و رفت کے اطلاعی مراسلے روزنامہ ہمدم (لکھنؤ) میں بھیجا کرتا تھا اور بغداد و طرابلس سے واپس ... ملاقات کی تفصیل ایک مضمون کی شکل میں روزنامہ ہمدرد کو ارسال کی، یہ مضمون نمایاں طور پر شائع ہوا اور دو دنوں ...

کی بھاگ دوڑ نے ماحول کو اور زیادہ پُر رعب بنا دیا تھا۔ نواب اظہر جنگ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مولانا کا خط پڑھ کر مختصر سا جواب لکھ دیا۔
دکن میں دس بارہ دن خوب چین چین سے اور گھما گہمی رہی۔ عوام میں نظام دکن کے بارے میں طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ یہ کہ وہ ملاقات کو

میں پوچھ گچھ کرتی رہتی ہے۔

سے اے جنوں! زنجیریہ تو اور بھاری ہو گئی

ریاست حیدرآباد دکن سے مولانا عبدالقدیر بدایونی کے تین پشتوں کے تعلقات تھے غالباً اُن کے دادا مولانا فضل رسول بدایونی کو نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ خامس کے عہد میں سو روپیہ مقرر ہوا تھا، اُس زمانہ میں قلمرو دکن میں "چلنی روپیہ" کا چلن تھا۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی کی اپنی شخصیت اور تعلقات اور ذاتی جدوجہد سے مدرسہ قادریہ اور اس کے کتب خانہ کے لئے کئی سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر ہوا خود اُن کا ذاتی منصب سو روپیہ ماہوار تھا، اُن کے خاندان کو مدرسہ قادریہ کی امداد سمیت ایک ہزار روپیہ ماہوار کے قریب ماہانہ وظیفہ ملتا تھا!

مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی نواب صدر یار جنگ بہادر صدر الصدور کے عہدے سے سبکدوش ہوئے، تو مولانا بدایونی نے اس کے لئے جدوجہد کی، مگر وہ عہدہ ہی توڑ دیا گیا، نواب صدر یار جنگ محکمۂ امور مذہبی قلمرو آصفیہ کے آخری صدر الصدور تھے اُن کا علم و فضل، دیانت و تقویٰ اور پھر ذاتی امارت و جاہت اس درجہ کی تھی کہ یہ عہدہ ان کی نسبت سے معزز و مشرف تھا! اللہ تعالیٰ آدمی کی تگ و دو اور دوڑ دھوپ کا پھل بھی کبھی نہ کسی عنوان سے اس دنیا میں عنایت فرما دیتا ہے، "من جد وجد" عربی کی مشہور ضرب المثل ہے! چند سال کے بعد مولانا مرحوم کو حکومت حیدرآباد کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) میں "مفتی" کا سرکاری عہدہ فرمانِ خسروی کے ذریعہ مل گیا، اُن کے دفتر افتاء کا اہلکار کہئے یا منشی کا منتظم راقم الحروف ہی تھا۔

میں جس گاؤں میں پیدا ہوا اور پل کر جوان ہوا، وہاں اور اس کے نواح میں بدایوں اور بریلی کے عقائد کا غلبہ تھا کوئی مسلمان مر جاتا تو اس کا تیجا اور چالیسواں فرض و واجب سمجھ کر کیا جاتا، محفل میلاد میں قیام عشقِ رسولؐ کا سب سے بڑا مظہر سمجھا جاتا۔ بچپن سے کانوں نے یہ آوازیں سنی تھیں کہ دیوبندی اور وہابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ دین کی توہین کرتے ہیں، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی وہ کتابیں جن میں اکابر دیوبند کی نام بنام تکفیر کی گئی ہے دین میں حجت اور سند سمجھ کر پڑھی جاتی تھیں، اہل بدعت کا یہ عقیدہ تھا کہ اولیاء اللہ اور اللہ تعالیٰ میں بس "ذات" اور "عطاء" کا فرق ہے۔ جو کام اللہ تعالیٰ کرتا ہے وہ کام اولیاء اللہ بھی انجام دینے کی باذن اللہ قدرت رکھتے ہیں اور اللہ اور رسولؐ اللہ کے درمیان اُنیس بیس کا (یعنی ذرا سا) فرق ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اس لئے ـــــ

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب
یعنی محبوب و محب میں نہیں میرا تیرا

شبِ معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعلین مبارک پہنے ہوئے عرش پر اللہ میاں کے برابر بیٹھ گئے تھے اور احمد و احد میں بس ایک میم کا پردہ ہے، اس قسم کے مشرکانہ اشعار تک ان کانوں نے سُنے ہیں کہ ـــــ

وہ جو کہ مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر
اُتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

اور بدایوں کے ایک شاعر (مولانا علی شاہ مذاق تلمیذ ذوق دہلوی) نے تو حد ہی کر دی۔

اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام   رکھ لیا خواجہ غریب نواز

لباس بدل کر شہر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ فلاں فقیر کو جو نٹ پاتھ پر پڑا تھا انہی بہت سی اشرفیاں عنایت فرما دیں۔ بعض اوقات غیر معمولی عقیدت، محبت تعظیم اور داستانوں میں "الف لیلہ" کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب بہ بیگمات دکن کے بادشاہ تھے، (اپریل - نظام گزٹ

ان عقائد و تصورات سے کروڑ بار اللہ تعالیٰ کی پناہ !

اس تو مولانا عبد القدیر بدایونی کے ایما سے جب ماہنامہ "نظام المشائخ" کا ڈکلریشن حاصل کیا گیا (جس کے نکلنے کی نوبت نہیں آئی) اور رسالہ کو میں ترتیب دینے لگا تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں فقہی مسائل کا باب بھی ہونا چاہئے! مدرسہ قادریہ کے کتب خانہ میں اُردو، فارسی اور عربی میں فقہ کی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا، اور رہنمائی کے لئے مدرسہ کے اُستاد ہر وقت میسر تھے؛ میرے دل و دماغ پر عرس و فاتحہ اور مزارات اپنے تمام لوازم کے ساتھ چھائے ہوئے تھے، میں نے فقہ کی کتابوں میں سب سے پہلے اسی موضوع پر لکھنے کے لئے مواد تلاش کیا، مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُن کتابوں میں سرے سے ان باتوں کا ذکر ہی نہیں تھا، پھر کتاب و سنت، سیرتِ رسولؐ، آثارِ صحابہ اور دوسری دینی کتابوں کا جس قدر مطالعہ کا موقعہ ملتا گیا، اہلِ بدعت کے ایک ایک عقیدہ کی آپ ہی آپ نفی اور تردید ہوتی گئی اور اس قسم کے غلط عقائد کی قلعی کھلتی گئی، سلسلہ قادریہ میں ـــ

یا عبد القادر جیلانی شیئاً للّٰہ

سب سے زیادہ مجرب ورد و وظیفہ بلکہ حرزِ جان اور علامتِ ایمان! مگر خود حنفی مسلک کے شیوخ و ائمہ کے یہاں اس عقیدے، نعرے اور جملہ پر شدید ترین وعید اور نکیر نگاہ سے گزری تو بہت دن تک ذہن اس کشمکش میں رہا کہ فلاں ہنگ کا جو یہ قابلِ اعتراض عمل اور قول ہے اُن کی مخالفت کا کہیں کوئی وبال نہ آپڑے مگر پھر سراج الامت حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم دینی شخصیتوں کے اس قسم کے مستند اقوال نگاہ سے گزرے کہ ہمارا کوئی قول کتاب و سنت کے خلاف نظر آتے تو اسے بے دریغ دیوار پر مار دو! قرآن کریم میں غور و فکر اور تدبر کیا کہ تو اہلِ بدعت کے عقائد تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ بودے نظر آتے، پورے قرآن شریف کے مضامین کا مرکزی نقطہ اور خلاصہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی ـــ عالم الغیب ہے نہ حلالِ مشکلات ہے، نہ خبیر بما فی الصدور ہے، انبیاء کرام تک کو بعض اوقات کیسی کیسی حیرانیاں، پریشانیاں اور مجبوریاں پیش آئی ہیں، قرآن کریم میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ملتا کہ کسی وفات پائے ہوئے بزرگ کی مدح سے کسی نے استغاثہ کیا ہو! مولانا عبد القدیر بدایونی کو میرے تاندک تبدیلی کا علم تھا، ایک دو بار میں نے اُن سے گفتگو بھی کی مگر وہ ناراض ہو گئے میں نے ایک دفعہ عرض کیا کہ قبروں پر جو کچھ ہو رہا ہے، پھول چادریں چڑھانا، چراغ جلانا، صندل ملنا، قبروں کو غسل دینا، انہیں چومنا کیا ان میں سے کوئی چیز بھی بدعت نہیں ہے؟ اس کے جواب میں ملامتہ لہجہ میں وہ بولے ـــ

"بدعت ـــــــ مولوی اشرف علی کا نام ہے"

پھر اُس دن کے بعد اُن سے میں نے ان مسائل پر گفتگو نہیں کی!

وہ قبروں کو چومتے تھے، انہیں غسل دیتے تھے، اور وہ سب کچھ کرتے تھے، جو اس مسلک و عقیدہ کے لوگ کرتے ہیں یہاں تک کہ صلوٰۃ غوثیہ پڑھتے تھے، سید ابو الاعلیٰ مودودی ننھیال کی طرف سے مولانا کے عزیز ہوتے ہیں، ایک بار بلدہ حیدرآباد میں وہ دونوں موٹر کار میں جا رہے تھے میں ایک بچہ کار کے نیچے آتے آتے رہ گیا اس موقعہ پر مولانا کی زبان سے بے ساختہ ـــ

"یا شیخ عبد القادر میراں محی الدین"

مودودی صاحب نے مولانا مرحوم سے کہا کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ مشرکین مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے اور جب مصیبت ٹل

نکال دیا، عمدہ چکنا کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب، شام کے وقت یہ بلیٹن شائع ہوتا اور نظام دکن کی نقل و حرکت کی ایک ایک خبر تفصیل کے ساتھ درج ہوتی !

چند مہینے کے بعد اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میں خود حیدرآباد دکن پہونچ گیا، مولانا عبدالقدیر بدایونی کے ساتھ ٹھیرا ہوا اور انہی کی ہمراہی میں مہاراجہ کرشن پرشاد بہادر یمین السلطنت صدر اعظم حکومتِ آصفیہ سے ملاقات ہوئی !

حضور نظام بلدہ حیدرآباد میں سیرت النبیؐ کے خاص خاص جلسوں میں شرکت فرماتے تو مولانا عبدالقدیر بدایونی کی معیت میں راقم الحروف کو بھی اُن کے قریب ہی جگہ مل جاتی، عام محفل میں حضور نظام کے لئے جو نشست مخصوص ہوتی اُس کا قرب ہر کسی کو کہاں میسر آتا تھا، ایک بار نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی ڈیوڑھی میں جلسہ سیرت تھا، نواب صاحب کی تقریر کا یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ زمانہ آغاز اور بدیہ شعور تھا، اس لئے وہ اس کی جرأت نہ کر سکے کہ اپنے یہاں کے جلسہ سیرت میں خود اپنی تقریر پروگرام میں رکھتے، تلاوت قرآن کریم کے بعد جوش ملیح آبادی صاحب نے نعتیہ نظم سنائی پھر ایک مہدوی معمر عالم نے وعظ شروع کیا مگر ان کا رنگ نہیں جما، پندرہ بیس منٹ کے بعد حضور نظام نے اپنے خاص انداز میں فرمایا۔

"لقا علی — لقا علی"

مولانا لقا علی[1] بدایونی تھوڑی دور پر بیٹھے ہوئے تھے وہ سامنے سے آئے، تو نواب میر عثمان علی خاں تند و تیز لہجہ میں بولے :—

"یہ کیا! پیچھے سے آؤ"

شاہانہ مزاج کی یہ بہت ہی ہلکی سی تندی و تیزی تھی مگر لقا علی صاحب کو پسینہ آگیا، پھر انہوں نے تقریر کی، حضور نظام نے کئی بار دورانِ تقریر

---

[1] بدایوں کے رہنے والے تھے، ان کا شمار شیعہ علماء میں نہیں، خوش بیان مقررین میں ہوتا تھا۔ اُن کے نام کے ساتھ "مبلغ اسلام بہ اتصالئے شرق" لکھا جاتا تھا۔ انگریز مصنفین کی عبارتیں فرفر تقریر میں سناتے چلے جاتے، حیدرآباد دکن میں چار پانچ سال ان کی تقریروں کی خوب دھوم رہی اُن کی تقریروں سے متاثر ہو کر نظام دکن نے وظیفہ مقرر کر دیا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آگئے مگر یاد دہ نمایاں نہ ہو سکے، ان کو وفات پائے ہوئے بھی کئی سال ہو گئے !

جاتی تھی تو اپنے معبودوں میں مشغول ہو جاتے تھے مگر آپ نے تو مصیبت کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ کے نام کی دُہائی دی ..... !

مولانا موصوف اور راقم الحروف کے عقائد میں بعد المشرقین پیدا ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود راقم الحروف سے بزرگانہ شفقت کے ساتھ پیش آتے،

مولانا موصوف ہر سال ربیع الثانی کے مہینہ میں بغداد شریف جایا کرتے تھے "بڑی گیارہویں" وہ بغداد ہی میں کرتے تھے، ۱۹۵۲ء میں بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعہ کراچی آئے اور چند گھنٹہ کے لئے یہاں اُترے میری بیماری کی خبر سن کر مجھے ڈھونڈتے ہوئے جیکب لائن پہونچے اور عیادت فرمائی !

بڑے ذہین، طباع اور ساتھ ہی بذلہ سنج بھی، شعر و شاعری سے غیر معمولی شغف، کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے اُن کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

پھر بھی واپس ہے تو آپ اسے با بدولت جانیئے
دل کہ جس کے صرف نے لینے کو قیمت جانیئے

میں "سبحان اللہ" اور "ماشاءاللہ" فرمایا۔

مولانا عبدالقادر بدایونی ایک بار بدایوں سے تشریف لائے، تو شیرنی اجمیر شریف کے تبرک کے عنوان سے اپنے ایک معروضہ کے ساتھ میرے ہاتھ کنگ کوٹھی بھجوائی۔ کنگ کوٹھی پر پولیس کا جو امین (انسپکٹر) متعین تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں شیرنی اور مولانا کا معروضہ کنگ کوٹھی میں بھجوا رہا ہوں، وہاں سے جواب آنے تک آپ یہیں ٹھیرے رہیں! تھوڑی دیر میں شاگرد پیشہ دوڑتا ہوا آیا کہ سرکار فرماتے ہیں کہ جو شخص معروضہ اور تبرک لے کر آیا ہے اُسے اندر بھیجو! میں ٹوپی پہنے ہوا تھا اور شاہی دربار میں دستار اور کرتہ کی پابندی تھی۔ امین پولیس نے اپنی دستار میرے سر پر رکھ دی اور چمڑے کا بگلوس دیا جو میں نے کمر سے باندھ لیا۔ کنگ کوٹھی مبارک کے دروازے پر پردہ پڑا رہتا تھا، اس سے گذر کر میں اندر پہونچا، حضورِ نظام برآمدے میں تہمد باندھے ہوتے ٹہل رہے تھے برآمدے میں چھوٹی سی میز دھری تھی، جس کے کانچ شیشہ کے پیپرویٹ کی جگہ اینٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے دبے ہوئے تھے، میں دروازے میں داخل ہوتے ہی آداب بجا لایا اور اسی حالت میں دونوں ہاتھوں سے سلام کرتا ہوا، حضورِ نظام کے سامنے جا پہونچا۔

"نام"؟ ـــ ارشاد ہوا

"منظور حسین ماہرالقادری" ـــ میں نے جواب دیا

"منظور حسین" نام (حضورِ نظام بولے) اور "ماہر" (میں نے عرض کیا تخلص) اسی سوال و جواب کے دوران میں گھبرا کر میں نے اپنی تازہ غزل کا مقطع سُنا دیا ـــ

میں نے ماہرؔ جب کہا طوفانِ غم میں یا علیؓ
موج کشتی بن گئی، گرداب ساحل ہو گیا

"تو تم شیعہ ہو" ـــ ؟ مجھ سے دریافت فرمایا گیا۔ میں نے عرض کیا "شیعہ نہیں ہوں" اس پر نطق ہمایونی کے یہ الفاظ میرے کانوں نے سُنے۔

"تو شیعت میں کیا برائی ہے"؟

میں خاموش رہا، ـــ "تمہارے یہاں محرم میں علم بٹھاتے ہیں"، مجھ سے سوال کیا گیا، "نہیں ہمارے یہاں علم نہیں بٹھائے جاتے" ـــ میں نے جواب دیا!

"کیا تم نے شیعیت کا بہ نگاہِ غائر مطالعہ کیا ہے"؟

میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا، کیا کہوں، کیا نہ کہوں، جس بات کو میں اپنے نزدیک حق سمجھتا تھا اُس کو چھپانے کے لئے میرا ضمیر آمادہ نہ تھا، معاً ایک بات سوجھ گئی، میں نے عرض کیا۔

"سرکار: فدوی کیا اور فدوی کی نگاہ کیا، میں نے ایک تقریر مولوی سبطِ حسن صاحب (ہاں! ہاں! سبطِ حسن کو میں جانتا ہوں۔ نظامِ بیچ میں بول پڑے) کی سنی ہے اس میں انہوں نے فرمایا کہ قرآن میں لاکھ قطع و برید کے بعد حضرت مولا علی کی تعریف موجود ہے' ورفعناہُ مکاناً علیّاً ـــ" یہ تو قرآن کریم کی لفظی اور معنوی

ئ نظام حیدرآباد ولی عہدی کے زمانہ سے اس کوٹھی میں رہتے تھے ۱۹۱۲ء میں نواب میر محبوب علی خاں کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھے تو پرانی حویلی یا چوک محلہ مبارک میں اپنے پیش رو فرمانرواؤں کی طرح قیام نہیں فرمایا یہیں رہتے ہے یہ کمال خاں نامی کسی جاگیردار کی بنوائی ہوئی عمارت تھی جس کی دیواروں پر "K – K" لکھا تھا، ان حرفوں کی رعایت سے" اس کا نام "کنگ کوٹھی" رکھ دیا گیا۔

تعریف کا عقیدہ ہے ...."

میرے اس کہنے پر وہ ڈیڑھ دو منٹ تک خاموش رہے! پھر بولے یہ بدایوں کس طرف ہے میں نے بتایا کہ دلی اور لکھنؤ کے درمیان! پھر پوچھا کہ "تو کہاں رہتا ہے" میں نے عرض کیا، ملک پیٹ میں سرکار سرور آبادِ ولا تشریف لے جایا کرتے ہیں، ادھر سے ریل گزرتی ہے، پل کے نیچے ہے، اسی مقام پر نو تعمیر کوارٹروں میں فدوی کی سکونت ہے ــــــ اور حضور! اُن کوارٹروں کا کرایہ بڑھائے جانے کی خبر سے رنگ پریشان ہیں!

یہ حاضری پون گھنٹہ کے قریب رہی، واپس آکر مولانا عبدالقدیر بدایونی اور دوسرے احباب کو تفصیل سنائی تو وہ مبارکباد دینے لگے کہ تم بڑے خوش قسمت ہو، جو سرکار سے کسی کوشش، جد و جہد اور انتظار کی زحمت اٹھائے بغیر مل آئے، اس پر لطف یہ کہ تمہاری جیب سے ایک کوڑی بھی خرچ نہیں ہوئی، کنگ کوٹھی میں حاضر ہونے والوں کو کم سے کم حیدرآباد کی ایک اشرفی اور پانچ روپیہ نذر دینے پڑتے ہیں، ملازمین شاہی کو باریابی کی خوشی میں انعام بھی دیا جاتا ہے وہ رقم مل ملا کر سو روپیہ ہوتی ہے۔

ان واقعات کو برسوں ہو گئے، تاریخ اور سن کسے یاد رہتے ہیں، غالباً یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے، اس کے آٹھ نو سال بعد ایک واقعہ نہیں سانحہ پیش آیا، میری مندرجہ ذیل نظم بلدہ حیدرآباد کے روزنامہ "صبح دکن" میں شائع ہوئی ـ

"سلطانِ کائنات سے خطاب"

جہاں میں نقش وفا چھوڑ کر گزرتا جا — تخیلِ دہر کے خاکوں میں رنگ بھرتا جا
مٹا سکے نہ جسے انقلابِ مستقبل — جبینِ دہر پہ ایسا بھی نقش کرتا جا
نگاہِ دہر ہے پھر تُو قبیس کی جانب — جہاں پہ لرزہ فشاں ہو کے خود نکھرتا جا
قسم ہے پائے محمدؐ کی ٹھوکروں کی تجھے — گزر رہا ہے تو پتھر کو نرم کرتا جا

خدا سے پھر کوئی نغمہ سنا رہا ہے تجھے
قریب آکر زمانہ بلا رہا ہے تجھے

ترے غلام ازل سے ہیں نصرت و اقبال — یہ کیوں کہوں کہ تجھے کامیاب ہونا ہے
تری نگاہِ کرم کا ہے منتظر شاید — وہ ذرہ جس کو ابھی آفتاب ہونا ہے
نہ دیکھ رشک سے تہذیب کی نمائش کو — تجھے جہاں میں فقط بوترابؓ ہونا ہے
نہیں ہوئی ابھی بیدار جرأتِ فاروقؓ — ابھی جہاں میں بڑا انقلاب ہونا ہے
ترے تبسم رنگیں پہ ہے چمن کی نظر — کہ خار و خس کو چمن میں گلاب ہونا ہے

تمام دہر کا سلطاں بنا کے بھیجا ہے
خدا نے تجھ کو مسلماں بنا کے بھیجا ہے

اس نظم کو نواب میر عثمان علی خاں نے نہ جانے کس موڈ میں پڑھا اور کیا اثر قبول کیا کہ راقم الحروف پر عتاب شاہانہ دشنام آمیز فرمان کی صورت میں نازل ہوا، یہ معمہ حل نہ ہو سکا کہ میری اس نظم کا عنوان "سلطانِ کائنات سے خطاب" انہیں ناگوار گزرا، یا اس مصرعہ ــــ تجھے جہاں میں فقط بوتراب ہونا ہے ــــ کو انہوں نے خلافِ ادب سمجھا یا پھر اس شعر میں ـ

نہیں ہوئی ابھی بیدار جرأتِ فاروقؓ
ابھی جہاں میں بڑا انقلاب ہونا ہے

حضرت "فاروق" (رضی اللہ عنہ) کی مدح و منقبت نے مزاج شاہانہ کو مکدر کر دیا۔

شخصی حکومتوں میں جو کوئی قسمت کا مارا شاہی عتاب کی زد میں آ جاتا ہے، اُس سے لوگ ہمدردی کرتے ہوئے بھی خوف کرتے ہیں کہ ہم بھی اس لپیٹ میں نہ آ جائیں، میں نے خود بھی اپنے بعض صاحب حیثیت اور معروف و خوشحال دوستوں کو کہلوا بھیجا کہ غریب خانہ پر ہمدردی کے لئے تشریف لا کر خطرے میں نہ پڑیں، اخبار میں میرے خلاف فرمانِ مبارک پڑھ کر بعض حضرات ہمدردی کے لئے آتے بھی تھے، نواب نثار یار جنگ بہادر (ڈپٹی کمشنر کلکٹر) نے اپنے داماد قمر مقصود (مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ کے والد) کے ہاتھ رات کے وقت روپیہ بھیجا کہ یہ حاضر ہے میں نے نواب صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے روپیہ اور لیڈ واپس کر دیا اور کہا کہ کچھ واجبی سا پس انداز بھی ہے ضرورت پڑنے پر وغیرہ بیچ کر وطن جانے کے لئے کرایہ کا بندوبست ہو جائے گا، اخراجات کے بارے میں مجھے کسی قسم کی تشویش نہیں ہے۔

دوسرے دن نواب رحمت یار جنگ بہادر کوتوال بلدہ نے مجھے بلا بھیجا میں اُن کی کوٹھی پر پہونچا، تو نظام حیدرآباد کے خسر، حکومت کے محکمہ فوج کے سابق معتمد (سکریٹری) نواب نذیر جنگ بہادر وہاں پہلے سے تشریف فرما تھے، نواب محسن الملک بہادر، ان نذیر جنگ کے پھوپھا محسن الملک کے کوئی اولاد نہ تھی، انہوں نے اولاد کی طرح مرزا نذیر بیگ کی پرورش کی تھی، انگلستان کے سفر میں وہ نواب محسن الملک کے ہمراہ تھے) کو صاحب نے مجھ سے اس نظم کے بارے میں چند سوالات کئے، نواب نذیر جنگ بہادر یہ سمجھے کہ کسی ملازمت کے سلسلہ میں مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا وہ کوتوال بلدہ سے بولے:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ یہ ماہر القادری تو زبان کا بادشاہ ہے"

اس پر نواب رحمت یار جنگ بہادر نے اُن کا ہاتھ دبا دیا۔

جناب خسروی کے چوتھے دن مجھے آغا جانی (نواب سلطان یار جنگ) اسسٹنٹ نائب کوتوال نے بلوایا۔ میں اُن کے پاس پہونچا تو کہنے لگے بھئی! کل شام کو سواری مبارک پرانی حویلی جانے کے لئے گزر رہی تھی، سرکار نے فرمایا کہ پرانی حویلی کے قریب ایک شخص اپنی غلطی پر نادم سر جھکائے کے ساتھ کھڑا تھا، تم لوگوں نے ماہر کا جو حلیہ بتایا ہے وہ آدمی اسی حلیہ کا تھا ——— میں نے جواب میں کہا کہ کل دن بھر میں گھر سے باہر ہی نہیں گیا سواری مبارک کا سامنا ہوا، اس پر وہ بولے تمہیں اپنی حیرانی پریشانی میں شاید وہاں جانا یاد نہ رہا ہو، میں نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کسی قسم کی حیرانی پریشانی نہیں ہے' اس پر آغا جانی نے میری بات کاٹتے ہوئے فرمایا۔ نہیں نہیں ایسا نہ کہو (مقصد یہ تھا کہ شاہی عتاب کے تمہیں پریشان اور آزردہ تو لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ ۔ ۔ ۔)

پھر وہ بولے اچھا تو آپ یہ بات کاغذ پر لکھ دیں، میں نے دو تین سطروں میں لکھ دیا کہ میں نہ تو کل شہر گیا اور نہ سواری مبارک کا سامنا ہوا، اس واقعہ کے دوسرے دن تین ساڑھے تین بجے کنگ کوٹھی سے شاگرد پیشہ آیا کہ آپ کی پیشی مبارک میں یاد ہوئی ہے، سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے یہاں آنا جانا رہتا تھا۔ دستار اور بنگلوس میرے پاس موجود تھی میں نے جلدی سے کپڑے بدلے، دستار لگائی اور کنگ کوٹھی کے قریب دروازے پر پہونچ کر کمر پٹہ کمر سے باندھا، قصرِ شاہی کا سرا پردہ اٹھا اور میں دونوں ہاتھوں سے تسلیم و آداب کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا، مجھے دیکھتے ہی نواب میر عثمان علی خاں گرجدار آواز میں بولے ـــ

"یہ ٹٹ پنجیا کیا چیز ہے، میں نے تو بڑے بڑوں کا دماغ درست کر دیا اور ایک کو مارا جاتا ہے، سو لوگ کانپتے ہیں سو آدمیوں کو تنبیہ کی جاتی ہے تو ہزاروں کی اصلاح ہوتی ہے دنیا کا مسلمہ قانون"

نظام دکن بات کرتے میں ٹہلتے جاتے تھے، نواب رحمت یار جنگ، ہوش بلگرامی اور نواب شہید یار جنگ اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

"اصلاح[1] کس سے لیتا ہے" ——— دریافت فرمایا گیا۔

[1] دکن میں شعر و سخن کی اصلاح کو "صلاح" اور تخلص کو مقطع کہتے ہیں۔

"ندوی کے والد بھی شاعر تھے ... مگر میں نے کسی سے شاعری میں اصلاح نہیں لی" ——— میرے جواب پر ہاتھوں کو خاص انداز میں جنبش دیتے ہوئے وہ بولے ———

"ہاں ہاں ! . . . . بس یہی کمزوری ہے ۔ ارے مجھے دیکھو کہ شاعری میں کیا ہوں . . . . مگر پھر بھی جائے اُستاد خالی است"

حضور نظام جو کچھ فرماتے تھے، اُن کے ہر جملہ کے آخری لفظوں کو اُن کے درباری دہراتے جاتے تھے ۔

"عمر کیا ہے ؟" نظام دکن نے استفسار فرمایا

"اکتیس سال" میں نے عرض کیا

"مجھے ہوش نے اس ماہر کا جو حلیہ بتایا تھا، اُس سے میں نے اندازہ لگایا، کہ اس کی عمر اٹھائیس سال کی ہے"

نظام کا جملہ ختم ہوتے ہی ہوش بلگرامی نے برجستہ عرض کیا ـــ

"سرکار ! اسے اپنی عمر کا کیا پتہ، اس کے باپ کو معلوم ہوگی"

ہوش کے اس جملہ پر میں نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی، پھر بھی دبی دبی سی مسکراہٹ تو ہونٹوں پر آ ہی گئی ! اس کے بعد انہوں نے جو کچھ فرمایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس ماہر کے دل میں کھوٹ نہیں ہے، اپنی نادانی اور شاعرانہ ناپختگی کے سبب اس سے غلطی ہوگئی :

شام کو ہوش بلگرامی نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ بادشاہ لوگ ہیں یہ جو کچھ بھی کر گزریں، اپنی غلطی کا کسی صورت اعتراف نہیں کرتے، شاہانہ معافی کے لئے کچھ نہ کچھ بہانہ چاہیئے، تم معذرت کے طور پر چند جملے لکھ دو، اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، میں نے با دل ناخواستہ چند معذرت آمیز سطریں لکھ دیں، دوسرے دن صبح کو دوسرا فرمان ہوا جس کا ایک جملہ یاد رہ گیا ہے ـــ

"ما از لغزش ماہر القادری درگزر کردیم، چراکہ ما درو خبث باطن نہ می بینیم"

چار پانچ دن کے بعد پھر آغا جانی (نواب سلطان یار جنگ اسپیشل نائب کوتوال) نے بلایا، اور مجھ سے کہا کہ ماہر! تم بہت خوش قسمت ہو، تمہیں وہ چیز مل رہی ہے جو آج تک کسی کو میسر نہیں آئی! میں نے اس اجمال کی تفصیل چاہی، انہوں نے کھل کر صاف طور پر تو نہیں بتایا، مگر اُن کے اشارے اور دفتر متعلقہ کے دوسرے کارکنوں سے پتہ چل گیا کہ میری وہ نظم جس پر عتاب شاہانہ ہوا تھا، حضور نظام نے اس پر اصلاح دی ہے اور وہ "صبح دکن" میں شائع ہوگی، خوش نویس اُس کی تبئیض کر رہا ہے ؛ مگر وہ نظم اخبارات میں نہ آسکی - ہوا یہ کہ نظام حیدرآباد نے میری غزل کے تمام اشعار کی اصلاح اور مرمت کر دی، مگر یہ شعر ـــ

ابھی نہیں ہوئی بیدار جرأت فاروق　　ابھی جہاں میں بڑا انقلاب ہونا ہے

چھوڑ دیا اس پر ہوش بلگرامی نے عرض کیا کہ حضور ! اس پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوں گی، پوری نظم اس شعر سمیت اخبار میں آنی چاہیئے اس پر انہوں نے اس اصلاح شدہ نظم کی اشاعت ملتوی فرمادی ـــ اور اس کے چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی ۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ دو سال بعد میری نظم کسی اخبار میں شائع ہوئی، جس کے تین شعر یہ تھے ـــ

جب تیرا اختیار ہے پابند غیر کا　　قبضہ میں تیرے ملک سلیماں ہوا تو کیا
شاہیں کے بازوؤں کی حرارت ہے اور چیز　　زاغ و زغن کی طرح پرافشاں ہوا تو کیا
دل میں ترے امنگ ہی باقی نہیں رہی　　تجھ پر طلوع صبح بہاراں ہوا تو کیا

اس پر کوتوال صاحب نے بلا کر مجھ سے فرمایا کہ آپ نے پھر اس قسم کے شعر کہنے اور چھپوانے شروع کر دئے ! میں نے جواب دیا کہ ان شعروں میں آخر قابل اعتراض بات

کیا ہے ؟ اس پر وہ بولے میں نے آپ کو بحث و مباحثہ کے لئے نہیں بلایا، آپ کو میں نے تنبیہ کر دی ہے۔

جھلکیاں

ہر انسان میں کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں، اور ہر زندگی کچھ لطائف و ظرائف رکھتی ہے، عام لوگوں کی باتیں گمنامی جاتی ہیں مگر مشاہیر کی زندگی کے واقعات سب کے سامنے آ جاتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عوام ہوں یا خواص زندگی واقعات کے حمام میں انسانوں کی غالب اکثریت برہنہ یا نیم برہنہ نظر آتی ہے!

بادشاہ اور اُمراء جن کے کان بچپن ہی سے اپنی تعریف و ستائش سننے کے عادی ہوتے ہیں اور جنہوں نے آنکھ کھولتے ہی لوگوں کو جھکتے اور آداب تعظیم بجا لاتے دیکھا ہے، وہ خود پسند ہو جائیں یا اپنی ذرا سی خوبی کو بہت بڑا سمجھنے لگیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے اس طبقہ کے لوگ فطری طور پر خوشامد، درآمد اور مدح و منقبت کے عادی ہوتے ہیں پھر ان کے اہل دربار اور متوسلین بھی اپنے حلوے مانڈے کے لئے بادشاہوں اور حاکموں کو عجیب چیز بنا دیتے ہیں۔ ریاست ٹونک کے فرمانروا نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے بارے میں مشہور ہے اُن کے درباریوں نے یہ باور کرا دیا تھا کہ آپ نماز کی نیت تو اپنے محل میں باندھتے ہیں، مگر دراصل حرم کعبہ میں نماز پڑھتے ہوتے ہیں۔

آئین حکمرانی اور امور سیاست میں نظام اپنے کو بہت بڑا ماہر سمجھتے تھے، مولانا عبدالقدیر بدایونی نے خود مجھ سے بیان کیا کہ بعض ملکی اضطرابات کی خبریں اخبارات میں آئیں تو حضور نظام نے اُن سے پوچھا ——

"مولانا! حکومت کون شخص سنبھال سکتا ہے"

مولانا نے جواب دیا ——

"سرکار! وہ جس کے یہاں سات پشتوں سے بادشاہت ہوتی آئی ہو"

نظام نے اس جملہ کی تحسین فرمائی کیونکہ وہ "آصف سابع" یعنی آصف جاہی خاندان کے ساتویں بادشاہ تھے۔

نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں مرحوم کی شاعری کا ایک تو وہ دور ہے، جب اُن کی شاعری "فکر دیگراں" کی بہت کچھ رہین منت ہوتی اُن کے اسی دور کی نعتیہ غزل کے دو شعر ہیں ——

حالیں چوں نگریم گیسوئے مصطفیٰ را — مانا رخ گلفت ایزد آں چشم حق نما را
اے تاج بخش کلاہاں، سلطان بادشاہاں — بر حال زار عثماں چشم کرم خدا را

ان کی فارسی اور اردو شاعری کا وہ دور جو لغت ریا ۱۹۳۱ء سے شروع ہوتا ہے اُس میں اِن شعروں جیسی پختگی، روانی اور سلاست کہاں پائی جاتی

جس پہلے دور کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اُس دور کی شاعری کلیات کی صورت میں شائع ہوئی تھی، مگر اس کے نسخے بازار میں نہیں لائے گئے، جن کے یہاں نظام دکن نسخہ بھیج دیتے وہ نذرے کر حاضر ہوتا، اُنہوں نے فرمان جاری کیا کہ اُن کا دیوان ایم۔ اے کے اُردو نصاب میں داخل کیا جائے شاہی فرمان تھا جس کی تعمیل ضروری تھی، محکمہ تعلیمات کے ارباب حل و عقد سخت پریشان تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں! بابائے اُردو مولوی عبدالحق ان دنوں دکن میں تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک بات سمجھا دی، وہ دربار شاہی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ سرکار کے دیوان کا جامعہ کے نصاب میں داخل ہو جانا بڑی سعادت کی بات ہے مگر حضور! مشکل یہ آن پڑی ہے کہ سرکار کے اشعار علوم و معارف کا گنجینہ اور حکمت و دانش کا خزینہ ہوتے ہیں انہیں طلبا کو پڑھائے گا کون! یہ بیچارے پروفیسر صاحبان شاہانہ فکر کی باریکیوں تک کہاں پہونچ سکتے ہیں! حضور نظام نے اس پر خوش ہو کر فرمایا، اچھا فرمان داخل دفتر کر دیا جائے! مولوی عبدالحق صاحب کی تدبیر کارگر ہوئی اور یونیورسٹی کے نصاب کو ایک عجیب مخمصہ سے نجات مل گئی!

"روزنامہ صبح دکن" میں نظام حیدرآباد کی غزلیں "استاد رائے جلیل" کے ساتھ چھپا کرتی تھیں، نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل تلمیذ جانشین حضرت امیر مینائی، اس امانت کے شعروں کو آخر کہاں تک درست کرتے ——

کس کا یہ بوجھ تھا جس کو کہ اُٹھایا اس نے
رکھی کرسی ہے کہاں پوچھ لے تو میز سے بھی

اخباروں میں جو غزلیں شائع ہوتیں، اُن میں نظام دکن کے نزدیک جو مشکل اور ادق الفاظ ہوتے، اُن کے معنی بھی خود ہی درج فرما دیتے "گل ـــ بمعنی پھول" ایک بار "حنا" کے معنی "سرسوں" لکھا ہے! فارسی میں جو تک بندی فرماتے اُس میں بعض اشعار کی شرح اور توصیف میں جملے لکھ دیتے، بعض خوشامدی حاشیہ نشینوں نے نظام حیدرآباد کو یہ باور کرایا کہ ایران کے اہلِ قلم مِل کر فارسی اندازِ تحریر کی نقل اتارنے کی کرتے ہیں! یہ لے پھر یہاں تک بڑھ گئی کہ اُن کے سامنے حافظ اور سعدی وغیرہ جیسے اکابر شعراء کا ذکر آتا تو "تا بجہ نولیش" اُن کی زبان سے نکلتا یہ کہ شعراء بس اپنی وسعت و استطاعت کی حد تک خوب ہیں، مگر بایدولت ...... !؟

فرمانروائے دکن میر عثمان علی خاں مرحوم کی یہ غزل جس کا مقطع تھا ــــ

سلاطینِ دکن نذرِ اجل سب ہو گئے عثماںؔ
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

مشہور بلکہ دکن میں زبان زدِ خاص و عام تھی اور دکن ریڈیو کا قومی ترانہ بن گئی تھی!

نواب سالار جنگ بہادر کے یہاں مجلس عزا تھی، لکھنؤ کے مشہور بلکہ اپنے دور کے سب سے بڑے سوز خواں منجھو صاحب کو سوز پڑھنے کے لئے خاص سے بلایا گیا تھا، راقم الحروف بھی منجھو صاحب کو سننے کے لئے وہاں پہونچا، جلسہ گاہ حاضرین سے کھچا کھچ بھری تھی اور حضور نظام کی تشریف آوری کا انتظار ہو رہا تھا، اتنے میں پولس کی سیٹیاں بجنی شروع ہوئیں اور سرکار تشریف لے آئے، مہاراجہ کشن پرشاد بہادر بھی اُس مجلس میں موجود تھے، نیازمندی اور احترام و تعظیم کا یہ عالم کہ جیسے رکوع کر رہے ہیں! اور کچھ دیر میں سجدے میں گر پڑیں گے۔

"مہاراجہ، قریب آؤ، قریب آؤ ......" ــــ نظام نے فرمایا۔

مہاراجہ بہادر صاحب ادب کے ساتھ، سر جھکائے ہوئے قریب آ کر بیٹھ گئے، زبانِ شاہ پھر یوں گویا ہوئی ــــ

"مہاراجہ یہ پرانے چاول ہیں، یہ میرے اشعار سمجھیں گے یہ (مجمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) عوام کالانعام میری شاعری کو بھلا کیا سمجھ سکتے ہیں"!

بعد منجھو صاحب نے حضور نظام کا کہا ہوا تازہ ترین سلام سنایا اور سوز خوانی میں جتنا فن بھی اُن کو آتا تھا وہ سارے کا سارا صرف کر دیا۔ اپنے ایک مرثیہ پر نظام خود ہی لوٹ ہوتے جاتے تھے، یہ غلط فہمی بھی تھی، خودستائی بھی اور خود فریبی بھی، مگر کس کی مجال تھی جو بادشاہِ وقت کی شاعری پر زبان دراز کرتا، راقم الحروف سے اگر وہ اپنی شاعری کے بارے میں رائے لیتے تو میری زبان سے بھی تعریف و توصیف ہی نکلتی۔ یہ مضمون تو میں اس فضا میں لکھ رہا ہوں جہاں نظام دکن کی ذات کا کوئی خوف ہے اور نہ لالچ ہے، ورنہ ...... !

جو "فرمانِ مبارک" وہ خود تحریر فرماتے تھے، اُس کی نثر اُن کی شاعری کے رنگ کی ہوتی تھی، ایک فرمان کے آخر میں ــــ باقی خیریت ہے ــ اختتام نواب بہادر یار جنگ نے چادر گھاٹ کے علاقہ میں جو تقریر کی تھی اور اُسے سُن کر "بہادر یار جنگ" کا خطاب اُنہیں عطا کیا گیا تھا، اُس فرمان سنا ہے کہ یہ جملہ بھی تحریر فرما دیا ــــ

"اُن کی تقریر سے علمی مادہ ٹپک رہا تھا"

نواب میر عثمان علی خاں موزوں طبع واقع ہوتے تھے اس لئے شاعری میں بہرحال کچھ نہ کچھ شد بد تھی۔ مگر شاعری کی طرح فن طب میں بھی وہ "امام" سمجھتے تھے، شاعری اور طب کی سلطانی کا خطاب اور سپاسنامہ اُن کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اُن کے متوسلین جاگیردار اور حکام اپنی

بیماری اُن سے چھپاتے اگر کوئی قسمت کا مارا اپنی بیماری کا بھولے سے ذکر کر دیتا تو اُس کے لئے نسخہ تجویز فرمایا جاتا، اور وہ نسخہ اُسے پینا پڑ

جواد جاہ غالباً حضور نظام کی آخری اولاد تھی، اُس کے بارے میں یہ سننے میں آیا کہ حکیم منیر الدین (افسر الاطبا) نے جواہر میں تجویز کیا تھا۔ اس مقدار میں بندگانِ عالی کی دخل در معقولات کے سبب اضافہ کر دیا گیا یہاں تک کہ اس بچہ کی موت واقع ہو گئی۔ بے چارے پر عتاب نازل ہوا ہے تو اس کی تذلیل میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ ملازمت سے برطرفی کے ساتھ شہر بدر بھی ہونا پڑا، معتوب میں "حکیم بد" کے عنوان و لقب سے غریب کو گالیاں دی جاتی رہیں یہاں تک کہ اُس کے بعض رشتہ دار عتاب شاہانہ کی لپیٹ میں آگئے

نظام حیدرآباد جمعہ کی نماز "باغ عام" کی مسجد میں پڑھا کرتے تھے، یہ مسجد انہی کی بنوائی ہوئی تھی اور حسن و موزونیت کے ا ایسی لگتی تھی جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہوا ـــــ بن گئی باغ عام کی مسجد ـــــ سے اس مسجد کی تاریخ تعمیر نکلتی ہے! ان کے آنے سے (انسپکٹر) لوگوں کو ہدایت کرتا:۔

"سرکار کے روبرو کوئی درخواست پیش نہ کی جائے، کوئی عرض معروضہ نہ کیا جائے۔ آنکھ کھجانے کی ضرورت پیش آئے تو دونوں آنکھیں ایک ساتھ کھجائی جائیں، ایک آنکھ نہیں! حضور کی تشریف آوری پر لوگ مسجد میں تعظیم کے لئے نہ اُٹھیں ....."

ایک زمانہ تک نظام اپنی صاحبزادیوں کو مسجد میں لاتے رہے وہ سب سے اگلی صف میں جماعت سے نماز ادا کرتیں، حضور نظا گیا کہ بعض لوگ ایک آنکھ ملتے ہوئے دوسری آنکھ سے شہزادیوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اسی بنا پر اُن کے ایما سے پولیس اف سے قبل یہ ہدایت کیا کرتا تھا کہ ضرورت محسوس ہو تو ایک آنکھ نہیں دونوں آنکھیں ایک ساتھ کھجائی جائیں۔

دکن میں علما اور مشائخ کی کمی نہ تھی، متحدہ ہندوستان کے علما بھی حضور نظام کے یہاں باریاب ہوتے رہتے مگر کسی کی شہزادیوں کو مسجد میں لانے اور سب سے اگلی صف میں با جماعت نماز پڑھنے پر نظام کو ٹوکتا، یہ جرأت پیر جماعت علی شاہ صاحب کو ہوئی سے حضور نظام نے مسجد میں شہزادیوں کا لانا بند کر دیا۔ پیر صاحب نے اُن کو ایک تلوار بھی دی تھی، جسے نظام باہر جاتے وقت ساتھ

اُن کے دربار اور ذات کے بارے میں اتنے لطیفے مشہور ہیں کہ انہیں جمع کیا جائے تو اچھی خاصی ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے، حی مشائخ میں ایک صاحب تھے مہدی پاشا زریں کلاہ، انہوں نے بارگاہ سلطانی میں ایک قصیدہ پیش کیا اور قصیدہ کے ذیل میں یہ عب

"دعا گو احقر الزماں مہدی پاشا"

نظام نے "احقر الزماں" کو "آخر الزماں" پڑھا، مہدی کے ساتھ "آخر الزماں" کو مناسبت بھی تھی، بس پھر کیا تھا، اُس غریب کی شامت قصیدہ گزران کر کسی صلہ کی توقع لے کر حاضر ہوا تھا، اُسے گردن دے کر، کنگ کوٹھی سے باہر نکال دیا گیا۔

ایک صاحب تھے مرزا منظور بیگ ان کی والدہ ہز ہائی نس نواب بہادر کی بہن تھیں، حکومت حیدرآباد دکن میں تعلقداری کے عہدے پر برسوں فائز رہے، "منظور جنگ" خطاب ملا، موصوف بڑے بذلہ سنج واقع ہوئے تھے، مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی مسلمان اکلوتی فرزند (بابو مرزا) کو بیاہی تھی۔ نواب منظور جنگ بہادر ہوش بلگرامی اور نواب شہید یار جنگ کی طرح روزانہ کے حاضر باشوں میں مگر نظام ان کو بلاتے رہتے۔ اور اُن کی بذلہ سنجی سے لطف لیتے۔

حیدرآباد دکن کے دار الضرب (۲۸ء) سے پرامیسری نوٹوں کی چوری ہو گئی تھی انہی دنوں نواب غازی یار بہادر جج ہائی کورٹ دیانت خانہ میں حاضر ہوتے اور حضور کو یہ قصہ سنایا کہ میرا سو روپیہ کا نوٹ کھو گیا تھا، والد مرحوم نواب عزیز جنگ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر جو فارغ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سو روپیہ کا نوٹ میرے پیروں کے پاس پڑا ہوا ہے اس پر نواب منظور جنگ بہادر حضرت ا

"حضور! اس کے باپ کی قبر کھدوائی جائے، دارالضرب سے جو نوٹ چوری گئے ہیں وہ وہاں مل جائیں گے"

ام نے تحسین آمیز قہقہہ لگایا اور دربار میں خوش طبعی کی لہر دوڑ گئی۔

نواب میر عثمان علی خاں نے اپنی والدہ کے نام پر اُن کے انتقال کے بعد "عزاخانہ زہرا" تعمیر کرایا، اُس عمارت کے نام ہی سے اُن کے عقائد
ا ہے ایک دور ایسا آیا کہ اخبارات میں نظام کی جو غزلیں، فرمان اور شعروں پر مبنی نوٹ شائع ہوا کرتے تھے ان میں مذہبی عقائد کی بھی
رتی تھی، اس نے اہل سنت والجماعت میں برہمی پیدا کر دی، میرٹھ کے ایک مولانا (مصباح الاسلام فاروقی) اُن دنوں بلدہ حیدرآباد میں آئے
ے۔ انہوں نے نظام دکن کے مذہبی رجحانات پر نقد و احتساب کیا۔ اس پر فرمان کے ذریعہ مولانا موصوف کا حدود ریاست سے اخراج عمل میں
ی فضا کو اور زیادہ مکدر بنا دیا، ریاست حیدرآباد دکن کے قانونچے میں یہ دفعہ درج تھی کہ حیدرآباد کے والی اور فرماں روا کا سنی اور حنفی
مسلمان ہونا ضروری ہے۔ اس خوف سے نواب میر عثمان علی خاں تبدیلی عقیدہ کا اعلان کرتے کرتے رُک گئے، مگر سنا ہے کہ مرنے سے دو تین سال
، نے جمعہ کی نماز کے لئے باغ عام کی مسجد جانا چھوڑ دیا تھا اور کھل کر "تشیع" کا اعلان فرما دیا، اسی لئے کراچی میں اُن کی وفات پر اُن کی رُوح کو
پانے کے لئے مجلسِ عزا برپا کی گئی۔

قرآن کریم میں "قصاص" کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے۔

"ولکم فی القصاص حیوۃٌ یا اولی الالباب لعلکم تتقون"

(عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم (اس) قانون کی خلاف ورزی سے بچتے رہو)

ن علی خاں بہادر کے ۳۶ سالہ دورِ حکومت میں کسی قاتل کو قصاص (قتل) کی سزا نہیں دی گئی، اس غلط روش کو جو جنیئ دھرم کی ترجمان و
، نظام جذبہ رحم و کرم کی دلیل سمجھتے تھے، قاتلوں کو عدالت عالیہ سے مفتی کے فتوے کی توثیق کے ساتھ قتل کی سزا کا حکم سنایا جاتا مگر فرمان
بجرم قید میں بدل دیتا۔

نظام کے محلات میں متعدد بیویاں بھی تھیں اور بہت سی خواصیں بھی یہ خرابی بین الاختین تک پہونچ گئی تھی، نرینہ اولاد ڈیڑھ درجن
ہو گی، شام کے وقت تین موٹر کار محل میں صاحبزادگان ہوا خوری کے لئے نکلتے تھے! بادشاہ دلہن سے دو لڑکے تھے، حمایت علی خاں اعظم جاہ
ت علی خاں معظم جاہ! یہ دونوں شہزادے اپنے مزاج و طبیعت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے! نواب اعظم جاہ شہسواری
ے شوقین، نواب معظم جاہ کو شاعری اور گانے بجانے سے دلچسپی! نظام معظم جاہ کو زیادہ چاہتے تھے۔

نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں ابھی میرا آنا جانا نہیں ہوا تھا، اُس زمانہ میں سیدنا ظراحسن ہوش بلگرامی نے (جو بعد میں جا کر ہوش یار
د ہو گئے) مجھ سے فرمایا کہ نواب اعظم جاہ بہادر کی طبیعت میں شعر و شاعری کی تھوڑی سی اُمنگ پیدا ہوئی ہے، تم ایک غزل لکھو،
ں دانستہ طور پر ایک دو غلطیاں رہنے دو، یہ غزل اعظم جاہ اپنے نام سے نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کے یہاں اصلاح کے لئے
ہ، میں نے ہوش بلگرامی کے کہنے پر غزل کہی، اور وہ غزل حضرت جلیل کی اصلاح کے بعد نواب اعظم جاہ بہادر کے نام سے اخبار میں شائع ہوئی!
ہوش بلگرامی میری ترقی اور منفعت کے لئے تجویز سوچتے تھے، مگر نہ جانے کیا بھید تھا کہ تھوڑی بہت جد و جہد کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا یہی
بات پیش آئی کہ اُس غزل کے بعد پھر انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہیں کیا اور میں نے بھی کسی قسم کی کوئی سلسلہ جنبانی نہیں کی!

نواب نصرت نواز جنگ بہادر خاندانی جاگیردار تھے۔ اب بھی بفضلہ بقید حیات ہیں برسوں نظم جمعیت کے ناظم رہے پھر محکمہ فوج کے معتمد
ہو گئے۔ بادشاہ دلہن یعنی حضور نظام کی ملکہ کے حقیقی بھائی، نظام کے برادر نسبتی اور نواب اعظم بہادر ولی عہد کے سگے ماموں! اعزاز
نصب کی اتنی بہت سی نسبتوں نے ان کی شخصیت کو بہت ممتاز اور نمایاں بنا دیا تھا، راقم الحروف کو موٹر کار بھیج کر اکثر اپنے یہاں بلاتے

ان کا دسترخوان طرح طرح کے لذیذ کھانوں کے لئے مشہور تھا!

نواب قدرت نواز جنگ بہادر نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ ولی عہد بہادر سے آپ کا ذکر آیا تھا وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں! اعظم جاہ کے یہاں حاضر ہونے کا دن مقرر ہوا، نواب صاحب نے ولی عہد بہادر کی نذر کے لئے گیارہ روپے جو خوب دُھلے ہوئے اور سنہری لیس کا کرشمہ عنایت فرمایا، پھر ہم اعظم جاہ بہادر کی قیام گاہ ــ بلا دستا ــ پہونچے، انہوں نے اپنی خوابگاہ ہی میں بلالیا، شب خوابی کا ملگجا سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔

"سرکار! ماہر کے بہت سے خریدار ہیں، ان کو مشکل ہی سے فرصت ملتی ہے، پھر یہ ہندوستان کے شہروں میں مشاعرے پڑھنے کے لئے بھی جاتے رہتے ہیں، بڑی مصروف زندگی ہے ان کی . . . . " ــــ نواب قدرت نواز ختم نہ ہو پائی تھی کہ نواب اعظم جاہ بہادر بیچ میں بول پڑے ــ

"ہاں! میں جانتا ہوں ان لوگوں کا یہی کنفقار رہتا ہے"

پھر انہوں نے فرمایا ــــ

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کسی اور دن تمہیں بلاؤں گا"

اس کے بعد اُن کا اسلحہ خانہ راقم الحروف کو دکھایا گیا جس میں خلیفہ عبدالمجید خاں سلطان ترکی کے دئے ہوئے قیمتی خنجر، نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں جو سلیقہ اور اہتمام دیکھنے میں آیا وہ اعظم جاہ بہادر کے یہاں نہیں دیکھا گیا۔ ولی عہد بہادر کی کو جاہ کی قیام گاہ سے بہت بڑی تھی، ان کے اخراجات بھی چھوٹے بھائی سے بڑھ چڑھ کر تھے، مگر مکان کی آرائش اور نظم و سلیقہ

؎ یہ اپنے اپنے ذوق و طبیعت کی بات ہے

اعظم جاہ بہادر نے ایک بار شکار میں اُنتیس شیر مارے، ہوش بلگرامی سے انہوں نے فخریہ لہجہ میں فرمایا ــــ ہوش! اتنے شیر میں شاید ہی کسی شکاری نے شکار کئے ہوں، ہوش بلگرامی نے اس پر کہا ــــ نہیں سرکار! آپ نے کچھ نہیں کیا، اس پر اعظم جاہ برہم ہو۔ ہوش اپنے لفظوں کو دہراتے رہے، پھر وہ بولے ــ

"سرکار! ایک شیر اور مار لیتے تو آپ تیس مار خاں ہو جاتے"

اس ظریفانہ نکتہ کو سن کر اعظم جاہ بہادر اس طرح پھڑک اٹھے، جیسے کوئی سخن سنج اچھے شعر کو سن کر بے اختیار ہو جاتا ہے۔

نواب اعظم بہادر کو اس کا بڑا غم تھا کہ میری عمر چالیس سال کی لگ بھگ ہو گئی مگر تخت شاہی سے محروم ہوں۔ اُن کے والد خان جب تخت نشین ہوئے ہیں تو اُن کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی، اس کے لئے وہ عاملوں سے وظیفے پڑھواتے، منتیں مانتے، مولانا عبدالقد کو ہر سال بغداد شریف بھیجتے، ایک بار اپنی پیشی کے ایک فوجی کپتان کو متحدہ ہندوستان کے تمام مزارات کی زیارت کے لئے بھیجا، اُن صاحب نے کراچی اور اور کوئٹہ تک شاید ہی کوئی مزار اور آستانہ حاضری دئے بغیر چھوڑا ہو، اجمیر، پیرانِ کلیر، دلی، بدایوں، بہار، لاہور، پاک پٹن اور مزارات کے لئے مشہور ہیں ان مقامات کے علاوہ کالپی، رودولی، امیٹھی، پھلواری، تونسہ اور چاچڑاں جیسے کم مشہور مقامات کے مزاروں پر بھی، میرا قیاس نہیں، یقین ہے کہ ولی عہد کے بھیجے ہوئے یہ گماشتے میر عثمان علی خاں کی موت کے لئے دعا ہرگز نہ کرتے ہوں گے، صحیح ہمایونی تک یہ خبر اس لئے نظام ولی عہد سے ناراض رہتے ــــ یہاں تک کہ مرنے کے چند سال پہلے اپنے پوتے (مکرم جاہ) کو اپنا وارث اور جانشین بنا دیا اور ہند نے اس تجویز کو سرکاری طور پر منظور کر لیا۔

نظام نے دلی کا سفر کیا تو راستہ میں مہاراجہ وتیا نے اُن کی ضیافت کا اہتمام کیا، نظام نے بھی اُن کو حیدرآباد بلایا اور مہاراجہ

ت کی، جس سفر میں نظام حیدرآباد دہلی کے بعد لکھنؤ تشریف لے گئے تھے، اس سفر میں نواب رضا علی خاں والیٔ رام پور کی درخواست پہ
ہنہ کے لئے نظام نے اپنے متعلقین اور لاؤ لشکر کے ساتھ رام پور میں قیام فرمایا، نواب رام پور نے لاکھوں روپیہ شاہانہ ضیافت میں صرف کر
خبو لگانے کے لئے نقرئی اور طلائی عطردان اُن کے سامنے پیش کئے گئے تو نظام نے وہ عطر دان ہی رکھ لئے! نواب رام پور اس پر کہتے تو
ے ـ

نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال بڑے رکھ رکھاؤ کے والیٔ ملک تھے، سر جوزف بھور والسرائے کی کونسل کے ممبر تھے، جب وہ وہاں سے
سبکدوش ہوئے تو نواب صاحب بھوپال نے اُن کو اپنے یہاں رکھ لیا۔ ریاست بھوپال آمدنی اور اپنی وسعت کے لحاظ سے اتنی بھاری تنخواہوں
ں کہاں ہو سکتی تھی۔ اس قسم کے مصارف کے سبب اب سے ۵۰ سال قبل ریاست بھوپال کے مالی حالات اچھے نہ تھے، نواب بھوپال نے نظام
بارے ذاتی طور پر بیس لاکھ روپیہ بطور قرض حسنہ مانگے، نظام نے اپنے ذاتی خزانہ سے قرض دینے کی بجائے یہ کارروائی باب حکومت میں بھیج دی
بھوپال کو اس کا پتہ چلا تو کبیدہ خاطر ہوئے اور اس کارروائی کو سرکاری سطح پر آگے چلنے سے رُکوا دیا! مگر دوسری جنگ عظیم میں نواب بھوپال نے
ے کے ذریعہ بہت کچھ کمایا اور خاصے سرمایہ دار ہو گئے۔

، حیدرآباد دکن کے تقرر والیان اور سرکار دربار میں کبھی کبھار سازشیں بھی ہوتیں، سر علی امام نے حکومتِ دکن کی صدارت عظمیٰ کے فرائض انتہائی
فراست کے ساتھ انجام دیئے! ان کی اسکیم یہ تھی کہ حکومت حیدرآباد میں مسلمانوں کو باہر سے لاکر آباد کیا جائے تاکہ اُن کی آبادی کم سے کم ایک تہائی
ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے انگریزی حکومت سے گفت و شنید کا آغاز بھی کر دیا تھا، مدراس کے موپلوں کو حیدرآباد میں بسانے کی تجویز زیر غور تھی۔
سکیم کے منڈھے چڑھنے سے پہلے، سر اکبر حیدری جو اُس زمانہ میں غالباً ہوم سکرٹری تھے اُن کی سازش کامیاب ہو گئی، اور سر علی امام کو استعفا
وطن واپس جانا پڑا، نواب نثار یار جنگ بہادر جو علی امام کی پیشی کے صدر منتظم تھے، راقم الحروف سے فرماتے تھے کہ علی امام نے استعفا دینے
ریاست حیدرآباد کی حدود پار کرنے تک پانی نہیں پیا، علی امام کہا کرتے تھے کہ میں اس ریاست میں مسلمانوں کی لاشیں تڑپتی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔
ام مرحوم بڑے دیدہ ور اور صاحب فراست تھے، انہوں نے جو کچھ کہا تقسیم ہند کے بعد حیدرآباد اسٹیٹ میں وہی ہو کر رہا!
حضور نظام نے جرأت کر کے علاقہ برار کی واپسی کے مسئلہ کو بھی اُٹھایا مگر اُس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لارڈ ریڈنگ ان دنوں ہندوستان کے
رائے تھے، انہوں نے بڑا سخت خط لکھا، جس میں یہ تک لکھ دیا کہ نظام حیدرآباد حکومت برطانیہ سے مساویانہ انداز میں مراسلت کرنے کا استحقاق
رکھتے ـ

ایک صاحب تھے عبد اللہ خاں کسمنڈوی، عجیب پُراسرار شخصیت تھی اُن کی! نہ وہ خاندانی طور پر نواب تھے اور نہ حکومت نے اُن کو یہ خطاب
، مگر اُن کے نام کے ساتھ "نواب" لکھا جاتا تھا، سننے میں یہ آیا کہ پرنس ویلز نے جب ہندوستان میں نزول اجلال فرمایا تو عبد اللہ خاں صاحب نے
خیر مقدم کا برقیہ بھیجا، اور اس میں اپنے نام کے ساتھ "نواب" لکھا، پرنس آف ویلز کی پیشی سے شکریہ کا جو تار بھیجا گیا، اُس میں "نواب" درج تھا۔
اُن کی "نوابی" کے لئے سند بن گیا! یہ بھی سننے میں آیا واللہ اعلم اس میں کتنی اصلیت ہے کہ پرنس آف ویلز کے دورے میں نواب عبد اللہ خاں
ڈوی شریک و ہم سفر رہے، والیانِ ملک یہ سمجھتے رہے کہ وہ پرنس ویلز کے اسٹاف میں ہیں اور پرنس ویلز کے اسٹاف والے اس گمان میں رہے کہ یہ
ن ملک کے نمائندے ہیں!

جناب ملا واحدی دہلوی فرماتے تھے کہ ۱۹۱۲ء میں دلی میں جب شاہی دربار ہوا تو عبد اللہ خاں کسمنڈوی کا خیمہ بادشاہ کی خواب گاہ سے
قریب تھا۔ آخری عمر میں وہ روزنامہ "ہمدم" لکھنؤ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے، ہاں! تو یہی عبد اللہ خاں کسمنڈوی حیدرآباد تشریف
اور نظام کے دربار میں باریابی حاصل کر کے اُن کو اس قدر متاثر کر دیا کہ حضور نظام کے یہاں اُنہیں کرسی ملنے لگی اور نظام سے ان کی بے تکلفی کی ملاقاتیں

ہونے لگیں، نظام ان صاحب کو مسئلہ برار کے سلسلہ میں جدوجہد کرنے کے لئے انگلستان بھیجنا چاہتے تھے، یہ ورچار لاکھ کا نہیں کروڑوں کا ایرپھیر تھا، مگر غالباً سر علی امام کی مداخلت نے اس ڈرامہ کو اسٹیج نہیں ہونے دیا۔

قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کے ساتھ کنگ کوٹھی میں یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ جب بارگاہ سلطانی میں پہونچے تو سگریٹ اُن کی انگلیوں میں تھا۔ نظام نے اس پر انہیں ٹوکا، مسٹر جناح نے سگریٹ کو ہاتھ سے پھینکتے پھینکتے اُن سے یہ پوچھا کہ کیا ریذیڈنٹ لیرائکرافٹیڈ ناتی لس کے روبرو سگریٹ پیتا، نظام اس پر خاموش ہوگئے اور قائداعظم بدستور سگریٹ پیتے رہے، نظام کو یہ بات خاصی ناگوار گزری مگر مسٹر جناح خود بے تاج کے تھے، نظام اُن کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

یتیم بائی کے طائفہ کی ایک چھوکری نواب میر محبوب علی خاں مرحوم آصف جاہ سادس کے محل میں داخل ہوئی، میر عثمان علی خاں اسی کے بطن اور فرمانروائے وقت کے سب سے بڑے فرزند ہونے کے سبب ولی عہد قرار پائے! اُن کی ولی عہدی کے زمانہ میں ضلع بیدر میں نمائش ہونے والی تھی، افتتاح کے لئے میر عثمان علی خاں وہاں تشریف لے گئے، اُن کے والد — یعنی نواب میر محبوب علی خاں مرحوم نے انہیں پچاس ساٹھ ہزار روپیہ اس غرض دیا کہ نمائش سے سامان خریدیں اور لوگوں کو انعام واکرام عنایت فرمائیں مگر میر عثمان علی خاں نے اُن روپیوں کو ہاتھ ہی نہیں لگایا، روپیوں کی یہ تھ جوں کی توں واپس آئیں بلکہ وہاں ہزار دو ہزار روپیہ کی جو نذریں ملیں وہ اس روپیہ پر مزید اضافہ تھیں! نواب میر محبوب علی خاں کو یہ تفصیل معلوم ہوئی بہت ناراض ہوئے، وہ لکھ لٹ تھے، اور یہ ایک ایک پیسہ کو دانتوں سے پکڑتے تھے، ہر باپ اپنے بیٹے میں اپنی اچھائیوں کی جھلک اور اپنی روایتوں اور خوبیوں کی نمود دیکھنا چاہتا ہے، یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا باپ کی داد و دہش کی کوئی حد و انتہا نہیں تھی، وہ سخاوت میں شہرہ آفاق اور یہ آپ اپنی نظیر!

نواب میر محبوب علی خاں ان سے خفا رہنے لگے اور یہ خفگی اس حد تک پہونچ گئی کہ ولی عہدی کا مسئلہ موضوع غور و فکر بن گیا، حیدرآباد کی ایک پارٹی جس میں سر مہاراجہ کشن پرشاد بھی شامل تھے، میر عثمان علی خاں کی مخالف تھی، اس نے اس کشمکش اور تلخی کو اور بڑھا دیا۔ راقم الحروف حیدرآباد کے بعض ثقہ لوگوں نے کہا کہ سنہ ١٩١٢ء میں دہلی میں جو شاہی دربار ہونے والا تھا اس میں نواب میر محبوب علی خاں اس منصوبہ کو ذہن میں رکھ شریک ہو رہے تھے کہ میر عثمان علی خاں کی ولی عہدی کو منسوخ کرا کے پرنس شہزادے صلابت جاہ بہادر کی ولی عہدی کا اعلان کر دیں گے، مگر میر عثمان علی خاں کی قسمت میں بادشاہ ہونا لکھا تھا، میر محبوب علی خاں کو ہیضہ ہوا اور وہ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے، ان کی وفات کے بعد میر عثمان علی تخت نشین ہوئے کیونکہ جائز وارث اور انگریزی حکومت کے منظور شدہ ولی عہد تھے۔

نواب میر عثمان علی خاں اپنے خدمت گاروں سے بھی زیادہ گھٹیا لباس پہنتے تھے، ڈاڑھی بڑھ جاتی، ترکی ٹوپی پر میل چڑھ جاتا، سرکاری طور فرمان نافذ ہوتے تھے وہ تو چکنے دبیز کاغذ پر خوشنویس کے لکھے ہوئے ہوتے مگر خود وہ جو کچھ لکھتے تھے اُس کے لئے زیادہ تر سگریٹ کیس استعمال کرتے یا پھر اخباروں کا جو حاشیہ بغیر لکھا ہوا ہوتا ہے اُسے قینچی سے کاٹ کر کام میں لاتے یہ سب کچھ بخل کے سبب تھا، روپیہ پیسہ کو سینت سینت کر رکھنا اور اس میں "ہل من مزید" کی تمنا یہ اُن کی فطرت، عادت اور [illegible] بن گئی تھی، ان کی کنجوسی کے قصے عام طور پر مشہور تھے، حیرت ہے کہ بادشاہت کے ساتھ بخل کو کس طرح نباہتے تھے۔

وہ روزانہ کسی نہ کسی عہدیدار یا جاگیردار کو خاصہ بھیجتے رہتے، جس کے یہاں خاصہ جاتا وہ دوسرے روز نذر لے کر حاضر ہوتا۔ خاصے میں عام پر تین سالن ہوتے، مقدار اتنی کہ ایک آدمی مشکل ہی سے سیر ہو سکتا تھا! کھانے لذیذ ہوتے خاص طور سے کوفتہ خاصہ کی چیز تھا، میز خانہ شاہی کی بالا لطافت اور لذت میں خوب سے خوب تر، نواب معظم جاہ بہادر کے یہاں تقریباً روزانہ بالائی بھجواتے۔ میں نے شاہی خاصہ بھی چکھا ہے اور بالائی سے بھی لذت اندوز ہوا ہوں۔ فلک نما کے قریب ایک تالاب ہے صرف اسی کا پانی پیتے، باہر سفر میں ہوتے تو اسی تالاب کا پانی ریل کے ذریعہ روزانہ بھیجا جاتا۔

ی دولت کے بارے میں بہت سی باتیں بلکہ افسانے سننے میں آتے ہیں، ۱۹۱۱ء میں جب وہ تخت نشین ہوتے ہیں تو نواب میر محبوب علی خاں
یاضی اور تعیش کے سبب صرفِ خاص کا خزانہ خالی تھا، صرفِ خاص کی آمدنی ڈیڑھ کروڑ کے قریب تھی، پچاس لاکھ روپیہ سالانہ ان کو
پر ملتا، سال میں دو عیدیں اور سالگرہ کی ایک تقریب ان تینوں موقعوں پر جو نذرانہ وصول ہوتا تھا وہ تقریباً چھ سات لاکھ ہونا چاہئے۔
ظام حیدرآباد کے پاس اربوں کا سونا تھا۔ یہ لوگوں کے غلط اندازے ہیں، وہ تجارت کرتے تو اُن کی دولت بیشک اربوں تک پہونچ جاتی
اور اُن کی نقد جمع پونجی ساٹھ ستر کروڑ کی ہوگی۔ انضمامِ حیدرآباد کے بعد جب وہ "اعلیٰحضرت اور ظلِ سبحانی" کی بجائے صرف "راج
تو انہوں نے کروڑوں کا سونا ہندوستان کی حکومت کو قرض کے طور پر دے دیا۔ یہ کام انہوں نے اپنی خوشی سے کا ہیکو کیا ہوگا، کئی کروڑ
، کی گزر بسر کے لئے ٹرسٹ بنا دئے۔ اس زمانہ میں سنا ہے انہیں اس کا شوق ہو گیا تھا کہ نوجوانوں کو جنہیں "خانہ زاد" کہا جاتا تھا، منتخب کرکے اُن
تے اور اُن کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے مصارف اپنے خزانہ سے برداشت فرماتے، اس شوق میں اُن کا مذہبی مسلک بھی شریک تھا،
س پلٹن پر لاکھوں روپیہ ماہانہ کا خرچ ہوتا۔

ایسے تھا ؟
ب اگیا ؟

غالباً ۱۹۴۳ء میں جب کانگریسی لیڈروں کو انگریزی حکومت نے رہا کیا ہے اور لارڈ مونٹ بیٹن نے گاندھی جی سے
کہا تھا کہ میں ہندوستان کا آخری وائسرائے ہوں، وہ وقت اس کے لئے موزوں تھا کہ اونچے درجہ کے ہندوستانی مسلم
اکابر جو حکومت میں اپنے اثرات رکھتے تھے وفد کی شکل میں انگلستان جاتے اور اس کی کوشش فرماتے کہ حکومت برطانیہ
بھی بندر نظام کو واپس کردے، برار پر نظام حیدرآباد کی سیادت کو تو حکومت برطانیہ نے تسلیم ہی کرلیا تھا، حیدرآباد اسٹیٹ کا ایجنٹ
تھا اور ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز کی طرح نظام دکن کے ولی عہد کو "ہز ہائی نس پرنس آف برار" کہا جاتا تھا، اور اس پر ہندوؤں نے یا
م کا احتجاج نہیں کیا تھا، برار کا علاقہ مل کر حیدرآباد دکن کی آبادی اُس زمانہ کے مصر کی آبادی کے برابر ہو جاتی اور ایک بندرگاہ بھی اُس کے
پھر اُسے خود مختار کا دیکر مجلس اقوام سے اس خود مختار آزاد حکومت کا الحاق کرا دیا جاتا، اس الحاق کے بعد ہندوستانی حکومت کا
م کرلینا بہت دشوار ہو جاتا یہ مسئلہ پھر ہندوستان کا داخلی مسئلہ نہ رہتا بلکہ بین الاقوامی پرابلم بن جاتا ــــ اس طرف کسی سیاستداں کی

!

قاسم رضوی کوئی شک نہیں مسلمانانِ دکن کے مخلص رہنما تھے مگر اُن کا جوش اُن کے ہوش پر غالب تھا، اپنی دھواں دھار پرجوش تقریروں
فضا انہوں نے پیدا کردی تھی اور جس کے سبب ہندوستانی حکومت حیدرآباد کی طاقت سے خوف کھاتی تھی اُس سے فائدہ اُٹھانا تھا
سطح پر پہونچنے نہیں دینا تھا کہ جنگ کی نوبت آجاتی، قاسم رضوی صاحب کو حیدرآباد کی طاقت کا پورا علم تھا، ہندوستان کی عظیم
ریاست کس طرح ٹکر لے سکتی تھی۔ پھر اتحاد المسلمین کے رضاکاروں کی اخلاقی تربیت ناقص تھی، ریاست حیدرآباد کی سرحدوں پر
نیاں اور زیادتیاں سرزد ہوتیں جس نے ہندوؤں میں مسلمانانِ حیدرآباد کے خلاف انتقام کا شدید جذبہ پیدا کر دیا۔
ت سے قصے مشہور ہیں ــــ یہ کہ حیدرآباد کے کمانڈر انچیف جنرل عید روس نے غداری کی، نظام حیدرآباد نے خفیہ طور پر نواب زین یار
ے ہندوستانی حکومت سے ساز باز کیا، مسٹر کے ایم منشی کی حکمت عملی نے اتحاد المسلمین کے جرأت آزما موقف کے لئے طرح طرح کی
اکردیں، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر یہ تمام باتیں نہ بھی ہوتیں اور حالات سازگار رہتے، پھر بھی ریاست حیدرآباد جو چاروں طرف سے
ں سے گھری ہوئی تھی، اس حالت میں کس طرح رہ سکتی تھی کہ ہندوستان کی دوسری ریاستیں تو حکومت ہند میں ضم ہو جائیں اور نظام کی بادشاہت
رہے۔
درآباد کے مسلم اکابر اور رہنماؤں کی یہ غلط اندیشی بلکہ عدم تدبر و فراست کی دلیل تھی کہ وہ پاکستان کی امداد پر بھروسا کئے ہوئے تھے۔

تین غزلیں

باباذہین شاہ تاجی

وہ آئیں گے، وہ آتے ہیں وہ آنے کو ہیں ، وہ آئے
تصور کو وہ بہلائیں تصور ہم کو بہلائے

وہ چمکا چاند، چھٹکی چاندنی، تارے نکل آئے
وہ کیا آئے زمیں پہ آسماں نے پھول برسائے

اچانک قلبِ مضطر کا سانس پھولی ، پاؤں تھرآئے
وہ ہم سے کچھ قریب آئے کہ ہم اُن کے قریب آئے

ازل سے تا ابد ہے جلوہ فرما حسن صد شیوہ
وہی صاحب نظر ہے، جو برابر دیکھتا جائے

کہاں انساں، کہاں عقل وخرد کی بیڑیاں ، توبہ
ذرا بھی عقل ہو تو آدمی دیوانہ ہو جائے

وجودِ نور پہ موقوف ہیں آثارِ ظلمت بھی
نہ ہوگی روشنی تو پھر کہاں جائیں گے یہ سائے

ذہینؔ آسودگی راہِ طلب میں ہے زیاں کاری
ہزاروں کوس ہیں وہ جو ذرا اک لمحہ سستائے

مولانا شمس تبریز خاں :

اہلِ وفا کو چاہیئے درد بھی لازوال سا
عشق بھی جاوداں نما، حسن بھی لازوال سا

دیدۂ و دل ہیں کھوئے سے بزمِ جمالِ یار میں
آنکھوں میں ہے سرور سا، لب پہ ہے کچھ سوال سا

عالمِ بے ثبات میں غم بھی نہیں ہے معتبر
ہجر ہے ایک بات سی وصل ہے اک خیال سا

اب ہے وہ آدمی کہاں اب ہے وہ زندگی کدھر
زیست ستارۂ سحر ، آدمی اک خیال سا

زیست پہ موت کا گماں موت حیات آشنا
وصل کبھی فراق سا ہجر کبھی وصال سا

یہ بھی کسی غریب کا خونِ وفا نہ ہو کہیں
بکھرا ہے کچھ عبیر سا پھیلا ہے کچھ گلال سا

یاد سے جگمگا اٹھی آج شبِ فراق بھی
ہجر کو ہم نے کر دیا آج تو کچھ وصال سا

آج ہے کس کے سوگ میں چہرۂ دوست اشکبار
دیدۂ یار میں ہے کیوں آج کچھ انفعال سا

ماہر القادری :

کچھ دن سے دل میں اب ہوسِ خام بھی نہیں
اس بتکدے کو حاجتِ اصنام بھی نہیں

اے دل! ادب کہ پرسشِ غم کو وہ آئے ہیں
شکوے شکایتوں کا یہ ہنگام بھی نہیں

انسان اور کشمکشِ جبر و اختیار
آزاد بھی نہیں ہے تہِ دام بھی نہیں

اے دوست! احتیاطِ محبت کی داد دے
فریاد کر رہا ہوں ترا نام بھی نہیں

رندی و تشنگی کا یہ اللہ رے غرور
ساقی سے اب معاملۂ جام بھی نہیں

اے اہلِ تاج و تخت! یہ طغیانِ کبر و ناز
تم کو خیالِ گردشِ ایام بھی نہیں

ماہرؔ! میں اپنی ذات سے جو کچھ ہوں ٹھیک ہوں
غالبؔ نہیں ہوں ، حافظ و خیام بھی نہیں

ہماری نظر میں

مفہوم القرآن (پارۂ اول) از محمد ادریس کیف بھوپالی، ناشر: محمد یوسف اسحاقی۔ ضخامت: ۴۰ صفحات۔ رائٹ پیپر، کتابت و طباعت دیدہ زیب، مجلد، رنگین سرورق، ہدیہ کے سامنے نقطے لگا دیئے گئے ہیں، غالباً اس سے حسب توفیق و استطاعت مراد ہے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ اسحاقی، اسحاقی گیسٹ ہاؤس ۱۲ بلاک ۲ بی۔ای۔سی ایچ سوسائٹی کراچی ۱۹۔

جناب کیف بھوپالی بڑے پُرگو ذہین اور مشاق شاعر ہیں، اور ساتھ ہی برجستہ گو بھی! ان کی غزل کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

سُنی جو پاؤں کی آہٹ تو جام پھینک دیا
نظر ملی تو صُراحی بھی توڑ دی میں نے

کیف صاحب کئی سال سے قرآن حکیم کے مفہوم و مطالب کی نظم میں ترجمانی کر رہے ہیں اور اس صنف میں انہوں نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے!

قرآن کریم کا اردو میں سب سے پہلے منظوم ترجمہ آغا شاعر دہلوی نے کیا تھا جس کے کچھ اجزا شائع بھی ہو چکے ہیں، آغا شاعر نے عربی الفاظ کے ترجمہ میں مفہوم و ترجمانی کی نسبتاً زیادہ رعایت رکھی تھی اس کے بعد مولانا سیماب اکبرآبادی نے پورے قرآن کا منظوم ترجمہ کیا اور مفہوم و معانی کی بجائے لفظی ترجمہ کی پابندی کی، مگر کتابی شکل میں اس کے چھپنے کی نوبت نہ آسکی۔ تیسرے صاحب اثر زبیری ہیں جن کا منظوم ترجمہ بھی خاصہ رواں ہے اور اس کے کئی اجزا منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن پر قرآن کریم نازل ہوا تھا اور جو حامل قرآن تھے اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو (دوسرے) شعر ہی نہیں سکھایا اور نہ (شاعری) ان کے (منصب کے) لائق ہے۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ جس کتاب (قرآن کریم) سے شعر و سخن کی نسبت کی نفی فرما رہا ہے، اس کا ترجمہ یا ترجمانی نظم میں، بہت زیادہ قابل غور ہے۔ ۔ مشہور مدرسے کے فقہاء نے قرآن کریم کے منظوم ترجمہ کو انتہائی ناپسندیدہ قرار دیا ہے، فتوے کے الفاظ بہت زیادہ شدید ہیں۔

قرآن کریم کے اب تک جتنے منظوم ترجمے اردو میں آئے ہیں، کیف بھوپالی کا ترجمہ سب سے زیادہ دلنشین، رواں اور اثر انگیز ہے۔ انہوں نے لفظی ترجمہ کی تو کم ہی پابندی کی ہے، زیادہ تر قرآنی مفہوم کو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔

پارۂ اول ہمارے سامنے ہے اُس کے منتخب اشعار حسب ذیل ہیں:—

دکھا دے ہم کو سیدھی راہ، سیدھی راہ پہ لے چل
جنہیں تو نے نوازا ہے، اُنہی کی راہ پہ لے چل

نہ اُن کی راہ پہ لے چل، خدا کی مار ہے جن پہ — تری پھٹکار ہے جن پہ، تری دھتکار ہے جن پہ
خدا کے نیک بندے اپنی یہ پہچان رکھتے ہیں — کہ بن دیکھے ہوئے "غیب" پر ایمان رکھتے ہیں

فی قلوبھم مرضٌ فزادھم اللہ مرضاً ــــــــ کی ترجمانی ؛ ــــ
بسی ہے روگ بن کر اُن کے دل میں یہ ریاکاری — بڑھا دی ہے خدا نے ایسے بیماروں کی بیماری

کہا جاتا ہے جب اُن کو کہ تم انسان بن جاؤ — اُنہی ایمان والوں کی طرح ایمان لے آؤ
انہوں نے وہ تجارت کی کہ خود برباد ہو بیٹھے — کہاں کا فائدہ اپنی گرہ کا مال کھو بیٹھے
پھر اُس گھنگھور ظلمت میں انہوں نے آگ سلگائی — بڑی مشکل سے لی پھر آگ کے شعلوں نے انگڑائی
بالآخر چھٹ گئی ظلمت، اندھیرا جگمگا اٹھا — شبِ تاریک میں گویا سویرا جگمگا اُٹھا
مگر جیسے ہی روشن ہو گیا ماحول وہ سارا — خدا نے چھین لی، اُن کی اچانک ــــ تابِ نظارہ
یہ اپنی انگلیوں کو ٹھونستے ہیں اپنے کانوں میں — کہ جیسے موت نے آواز دی ہے آسمانوں میں
کہاں لے جائیں گے لیکن بچا کر اپنی جانوں کو — خدا گھیرے ہوئے ہے منکروں کو بدگمانوں کو
زمیں اُس نے تمہارے پاؤں کے نیچے بچھا دی ہے — نظر کے سامنے یہ آسماں کی چھت بنا دی ہے
اگر قرآن کے بارے میں تم کو بدگمانی ہے — کہ یہ شاید کسی انسان کی جادو بیانی ہے
تو پھر منہ میں زباں رکھنے کے دعویدار ہو تم بھی — ادیب و شاعر و صورت گر و فنکار ہو تم بھی
بنا کر اس طرح کی ایک ہی تقریر لے آؤ — یہ اندازِ بیاں یہ حسن، یہ تاثیر لے آؤ
خدا کو چھوڑ کر سارے طرفداروں کو بُلوا لو — مدد کے واسطے اپنے مددگاروں کو بُلوا لو
ڈرو اُس آگ سے رُکتی نہیں ہے جو کسی پر بھی — کہ ہیں اُس کا نوالہ، آدمی بھی اور پتھر بھی
بھلا اللہ سے انکار کر سکتے ہو تم کیسے — حقیقت کو بلا مانے گزر سکتے ہو تم کیسے
کہ تم ناپید تھے، لیکن تمہیں پیدا کیا اُس نے — کہ تم اک بُوند تھے، لیکن تمہیں دریا کیا اُس نے

پھر آدم نے خدائے پاک سے کچھ سیکھ لی باتیں — اُنہی الفاظ میں کیں اپنے مولا سے مناجاتیں
سبھی کی التجائیں سُن لیا کرتا ہے وہ آقا — گنہگاروں کے آنسو چن لیا کرتا ہے وہ آقا
خدا سے عشق ہے جن کو وہ یہ باتیں سمجھتے ہیں — نمازوں کو خداوندی ملاقاتیں سمجھتے ہیں
اُنہیں یہ فکر ہوتی ہے کہ اُس کو منہ دکھانا ہے — اُسی کی ہم امانت ہیں اُسی کے پاس جانا ہے

وہ دن ہے یاد؟ جب تم مصر میں بدحال رہتے تھے — غلاموں کی طرح سے خستہ و پامال رہتے تھے
تمہیں ہم نے غلامی کے شکنجے سے چھڑایا تھا — تمہیں فرعون کے خونخوار پنجے سے چھڑایا تھا
ہمارا حکم پا کر بیچ میں سے پھٹ گیا پانی — اِدھر بھی ہٹ گیا پانی، اُدھر بھی ہٹ گیا پانی

تمہارا قافلہ گزرا چلا آیا بہ آسانی
تمہارے بعد پھر دونوں طرف سے مل گیا پانی

ارے اللہ سے منہ موڑنے والے تمہیں تو ہو
وفاداری کی رسمیں توڑنے والے تمہیں تو ہو

مٹا دو، ختم کر دو، قتل کر دو ایسی جانوں کو
نہیں ہے زندگی کا حق، تم ایسے بدگمانوں کو

یکایک آن گھیرا تم کو بجلی کے کڑاکے نے
تمہارے ہوش پراں کر دئے غیبی دھماکے نے

بجائے حطۃٌ کے حنطۃٌ چلائے وہ ظالم
مذاقاً گیہوں کے مفہوم میں لے آئے وہ ظالم

بدل کر ایک نقطہ کیا سے کیا کہنے لگے ظالم
"خدا" کے لفظ کو گویا "جُدا" کہنے لگے ظالم

وہ دن ہے یاد جب تپتے ہوئے میدان میں تم تھے
مثال ماہیٔ بے آب ریگستان میں تم تھے

تمہارے واسطے موسیٰ نے پانی کی دعا مانگی
تمہیں ناشاد پا کر، شادمانی کی دعا مانگی

کہا ہم نے کہ اس پتھر پہ لکڑی مار اے موسیٰؑ!
نہ ہو مایوس اے موسیٰ! نہ ہمت ہار اے موسیٰؑ

غرض وہ قوم اپنے ہاتھ سے برباد ہو بیٹھی
ذرا سے لقمۂ تر کے لئے سب آن کھو بیٹھی

چپک کر رہ گئی وہ ذلت و محتاجگی اُس سے
کہ جو چھوٹے نہیں چھوٹے نہیں ہرگز کبھی اُس سے

(مصرعۂ ثانی خاصہ کمزور ہے)

وہ بولے اپنے آقا سے گزارش کیجئے موسیٰؑ!
ہمیں بتلا دیا جائے، ذرا اُس گائے کا حلیہ

کہا موسیٰؑ نے وہ ارشاد فرماتا ہے اے لوگو!
وہ بوڑھی ہو، نہ بچھیا، درمیانی عمر رکھتی ہو

کہا موسیٰ نے وہ ارشاد فرماتا ہے اے لوگو!
کہ اُس گائے کی رنگت خوب پیلی خوب پیلی ہو

نہ اُس نے ہل چلایا ہو، نہ اُس نے باغ سینچا ہو
نہ کوئی عیب ہو اُس میں نہ کوئی داغ دھبہ ہو

خدا کے حکم سے آخر انہوں نے ذبح کی گائے
وہ اتنی حجتوں کے بعد سیدھی راہ پر آئے

مگر وہ دل[1] سے آمادہ نہیں معلوم ہوتے تھے
رضائے حق کے دلدادہ نہیں معلوم ہوتے تھے

خداوندی شریعت[2] سے یہ کیا منہ موڑتے ہو تم
کہیں سے مانتے ہو تم، کہیں سے چھوڑتے ہو تم

خدا نے اپنے جس بندے پہ چاہا فضل[3] فرمایا
کسی کو کیا اگر اُس کو محمد ہی پسند آیا

زباں سے تو کہا "ہاں سن لیا ہم نے یہ فرمانا"
مگر دل میں کہا تم نے "کہ ہم نے یہ نہیں مانا"

خداوند جہاں ان ظالموں سے خوب واقف ہے
انہیں ڈر ہے کہ عقبیٰ کی ہوا اُن کی مخالف ہے

یہ اپنے دل سے تعلیم خداوندی کو بھلا بیٹھے
یہ ناداں جنتروں سے منتروں سے لو لگا بیٹھے

---

[1] وما کادوا یفعلون [2] افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض [3] انزل اللہ من فضلہ علیٰ من یشاء من عبادہ

جہاں تک اُن سے ہوتا تھا جتا دیتے تھے پہلے ہی — وہ لوگوں کو نتیجہ سے ڈرا دیتے تھے پہلے ہی
وہ کہتے تھے کہ ہم اک آزمائش ہیں حقیقت میں — ہماری ذات سے کا ہے کو پڑتے ہو مصیبت میں

کسی آیت[2] کو ہم منسوخ کرتے ، یا بھلاتے ہیں — تو پھر اُس سے بھی بہتر یا اُسی کی مثل لاتے ہیں

یہ کہتے ہیں کہ جنت میں قدم رکھنے نہ پائے گا — کوئی جب تک یہودی اور نصاریٰ بن نہ جائے گا
یہودی اپنی کہتے ہیں نصاریٰ اپنی کہتے ہیں — غرض دونوں ہی ان خوش فہمیوں میں مست رہتے ہیں

بڑا دلچسپ منظر تھا بڑا دلکش نظارا تھا — جب ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ کے ہاتھوں میں گارا تھا
ادھر ہاتھوں سے دیواریں اُٹھاتے جا رہے تھے وہ — اُدھر اپنے خدا کے گیت گاتے جا رہے تھے وہ

دُوسرا رخ : ـــــ

تو کہتے ہیں کہ ہم اصلاح کرتے ہیں بُرائی کی — بڑی تکلیف ہے گویا اُنہیں ساری خدائی کی (ص۸)

یہ شعر یوں ہوتا تو زیادہ اچھا تھا ـــــ

تو کہتے ہیں کہ ہم اصلاح کرتے ہیں زمانے کی — توقع اس پہ رکھتے ہیں خدا سے داد پانے کی

اس شعر میں : ـــــ

لگامیں اور ڈھیلی اور ڈھیلی پاتے جاتے ہیں — وہ بربادی کے منہ میں جائے جاتے، جائے جاتے ہیں (ص۹)

مصرعہ اولیٰ زبان و روزمرہ کے اعتبار سے قابل غور ہے !

حقیقت میں خدا نے خود انہیں سے دل لگی کی ہے — بہکنے کے لئے ان کو سراسر ڈھیل دے دی ہے

اس شعر سے آیت متعلقہ کی ترجمانی ہو گئی "لگاموں کا ڈھیلی پاتے جانا" اس تکرار کی ضرورت ہی نہ تھی !

پڑے ہیں دور منزل سے یہ راہوں کا دھواں ہو کر — بھٹکتے پھر رہے ہیں یوسفِ بے کارواں ہو کر

"رہروِ بے کارواں" کہنا تھا ، یہ مصرعہ ـــــ

سے اکیلے پھر رہے ہیں یوسفِ بے کارواں ہو کر

اگرچہ اردو میں ضرب المثل بن گیا ہے مگر اس میں اللہ تعالیٰ کے مقدس نبی (سیدنا یوسف علیہ السلام) کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے اس لئے اس ترکیب (یوسفِ بے کارواں) کو بولنے اور لکھنے سے اجتناب کرنا چاہئے خاص طور سے قرآنی مفہوم کی ترجمانی میں !

تمہارے واسطے کتنے ہی پھل پیدا کئے اس نے — تمہارے پیٹ کی گتھی کے حل پیدا کئے اس نے (ص۱۱)

مصرعہ ثانی سطحی اور بھرتی کا ہے۔ "پیٹ کی گتھی کے حل پیدا کئے" یہ ٹکڑا شعر میں اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے ! یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا ـــــ

---

[1] وما یعلمٰن من احد حتیٰ یقولا انما نحن فتنۃ فلا تکفر [2] ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا ؕ

تمہارے پیٹ بھر لینے کے ساماں کر دئے اُس نے

...شعر ہے۔
تمہیں معلوم ہے سب کچھ کوئی ناداں نہیں ہو تم — خدا کے فضل سے من جملہ طفلاں نہیں ہو تم (ص۱۱)

یہ ثانی زمشقوں کے کہنے کا ہے ——
تمہیں سب کچھ پتہ ہے طفلکِ ناداں نہیں ہو تم — خدا کے فضل سے انساں ہو تم، حیواں نہیں ہو تم

یہ شعر مفہوم کی زیادہ اچھی ترجمانی کرتا ہے۔
ترمچھر کی کسی تمثیل سے بھی کام لیتا ہے — کبھی چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی نام لیتا ہے (ص۱۲)

مصرعہ اولیٰ ——

ترمچھر جیسی اک تمثیل سے بھی کام لیتا ہے

کردیا جائے —— تو!؟
اُسی کی کارسازی نے بلندی پہ توجہ کی — بہت اور پر لٹ ا نتح متدی پہ توجہ کی (ص۱۵)

...رعہ ثانی میں آورد کے سوا اور کیا رکھا ہے،

سے اُسی کی کارسازی نے توجہ کی بلندی پہ
زمین و آسماں کی اس طرح شیرازہ بندی پہ

...چہ بالا شعر اس مقام کے لئے موزوں ہے۔
مگر دیکھو کہیں تم اُس شجر کے پاس مت جانا — تم اُس کے سایۂ دلیانہ گر کے پاس مت جانا (ص۱۸)

...عہ ثانی میں زبان و بیان اور فکر و خیال کا تکلف پایا جاتا ہے، مصرعہ اولیٰ میں "کہیں" کی جگہ "کبھی" ہونا چاہئے
مگر دیکھو! کبھی تم اس شجر کے پاس مت جانا — تم اپنی جان پہ بیٹھے بٹھائے ظلم مت ڈھانا

...طرح ایک ہی شعر میں "فتکونا من الظالمین" کی بھی ترجمانی ہو گئی!
تجھکو آدم کے آگے تحفہ موجودات ہے آدم — انوکھی چیز ہے آدم، نرالی بات ہے آدم (ص۲۰)

...مصرعہ ثانی بے جان اور کمزور ہے۔

حقیقت میں چراغِ بزمِ مخلوقات ہے آدم

...ب مفہوم کی ٹھیک طرح ترجمانی ہوتی!
کہا ہم نے کہ اچھا اس زمیں سے تم نکل جاؤ — زمیں پہ پھیل کر اپنے خدا کا نام چمکاؤ

اللہ تعالیٰ کے نام کو کوئی کیا چمکائے گا۔

زمیں پہ پھیل کر اپنے خدا کا دین پھیلاؤ

کہتے تو یہ سقم دور ہو جاتا۔
نبھاؤ قول تم اپنا جو ہم سے کر چکے ہو تم — ہماری بندگی کرنے کی حامی بھر چکے ہو تم (ص۲۱)
صحیح املا "حامی" نہیں، "ہامی" ہے۔ "حامی" تو حمایت کرنے والے اور مددگار و محافظ کو کہتے ہیں اور "ہامی" کے معنی ہیں اقرار کرنا
ہاں کہنا، اس کا اظہار کہ ہاں! ایسا ہی ہوگا۔
نہ بیچو تم دو آیات کو تھوڑی سی قیمت پہ — نہ للچو تم فروشوں کی طرح دُنیا کی دولت پہ (ص۲۴)

"للچو" اسد میں کون لیتا ہے۔ "للچو" کی بجائے "ریجھو" آسکتا تھا۔

تمہارے دشمنوں کا منہ فقافق کر دیا ہم نے   سمندر کو تمہارے واسطے شق کر دیا ہم نے (ص)

"فقافق" مقامی محاورہ معلوم ہوتا ہے!

دکھایا ہم نے ریگستان میں قدرت کا یہ جلوہ   تمہارے واسطے آتا تھا دونوں وقت من سلویٰ (ص)

"من سلویٰ" بغیر عطف وتشدید "ن" رجحان کو بری طرح کھٹکتا ہے۔

یہی ہیں وہ کہ عیسیٰ کو جنہوں نے قتل کر ڈالا   خدا ہے دیکھنے والا، خدا ہے دیکھنے والا (ص)

مگر قرآن کریم تو اس عقیدے کی کہ —— حضرت عیسیٰ کو قتل کیا گیا یا انہیں سولی دی گئی —— تردید کرتا ہے! اس شعر کو کتاب سے نکال دینا چاہیئے۔

کھلا دی جائے گی کچھ دن جہنم کی ہوا ہم کو   پھر اس کے بعد جنت میں بلائے گا خدا ہم کو (ص)

"کھلا دی جائے گی" کی جگہ "میسر آئے گی" ہونا چاہیے تھا۔

بڑے مغرور ہو کر تم اکڑ فوں کر گزر بیٹھے   کسی کو تم نے جھٹلایا، کسی کو قتل کر بیٹھے (ص)

"اکڑ فوں کر گزرنا" یہ آخر کہاں کی زبان ہے!

بڑے مغرور ہو کر تم اِدھر اُٹھے اُدھر بیٹھے

یا

بڑے مغرور ہو کر تم بدی کی راہ (یا بدی کے موڑ) پر بیٹھے

ہوتا تو زبان ومحاورہ کی غلطی دور ہو جاتی۔

خدا کی بات میں تانتا نہ الجھاؤ سوالوں کا   دلیلیں چھانٹنا شیوہ نہیں ایمان والوں کا (ص)

"سوالوں کا تانتا الجھانا" یہ بھی روزمرہ نہیں ہے اور اس انداز بیان میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے! پھر شاعر سے بہت بڑی بھول چوک یہ ہوئی ہے کہ "تانتا" کو "تانت —— اور دھاگے" کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے۔ "تانتا" تو قطار اور سلسلہ کو کہتے ہیں، امیر مینائی فرماتے ہیں۔

شبِ غم بلاؤں کا تانتا لگا ہے

چلے آتے ہیں میہماں کیسے کیسے

مصرعہ اولیٰ یوں ہو سکتا تھا۔

؎ خدا کی بات میں ہرگز نہیں موقعہ سوالوں کا

یا

؎ خدا کی بات میں توبہ! یہ اُلجھاوا سوالوں کا

یہ مشرق بھی خدا کی ہے، یہ مغرب بھی خدا کی ہے   تجلی ہر طرف ارض وسما کی ہے (ص)

کسی خاص علاقہ یا شہر کی دوسری بات ہے ورنہ "مشرق ومغرب" دونوں مذکر بولے جاتے ہیں! (سمتوں کے معنیٰ میں)

کوئی دن چند باتوں میں بہانہ آزمایا تھا   وفا کی توبہ نو دشوار راہوں پہ چلایا تھا (ص)

اس میں شعریت کا دور دور پتہ نہیں! "کوئی" مصرعہ اولیٰ میں اور زیادہ کھٹکتا ہے!

کئی باتوں میں اُس کے رب نے اُس کو آزمایا تھا　　　مگر اُس نے خدا کا قول پورا کر دکھایا تھا　(ص)

اس شعر سے متعلقہ آیت کی ترجمانی شاید بہتر انداز میں ہو گئی۔

زمانے کے لئے ہم نے زیارت گاہ ٹھیرایا　　　زمیں کا ذکر ہی کیا ہے، دلوں پر نقش فرمایا　(ص۵)

مصرعہ ثانی، مصرعہ اولیٰ سے بے جوڑ سا لگتا ہے ــــ یوں ہو سکتا تھا۔

زمانے کے لئے ہم نے زیارت گاہ ٹھیرایا　　　یہ دارالامن وہ ہے جو کہ بیت اللہ کہلایا

کوئی شک نہیں جناب کیفؔ بھوپالی کا خلوص، مشاقی، پُرگوئی اور شاعرانہ قوت "مفہوم القرآن" سے عیاں ہے اگر وہ اس پر نظرِ ثانی فرماسکیں تو اپنے منظومات کے نوک پلک کو سنوار کر حسین تر بنا سکتے ہیں! جناب محمد یوسف اسحٰق نے "مفہوم القرآن" کو بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے!

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
آدم جی کاٹن ملز لانڈھی۔ کراچی

مئی ۱۹۶۷ء

جلد :- ۱۹
شمارہ :- ۲

ماہنامہ فاران کراچی

ایڈیٹر ——— ماہر القادری

ترتیب

چندہ سالانہ :- سات روپے	پبلشر :- مسعود حسین	قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

مقام اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مشتاق احمد صدیقی۔ مسعود حسین پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصل اول

اللہ تعالیٰ کی کتاب اس کی شاہد ہے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس چودہ سو سال کی مدت میں تمام امت مسلمہ کا یہ متفقہ عقیدہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دین ہر جہت سے مکمل ہو چکا ۔ اللہ تعالیٰ دین و رسالت کے معاملہ میں اپنی نعمت کا اتمام فرما چکا ، حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی پر نبوت کا خاتمہ فرما دیا گیا ، اب قیامت تک کسی قسم کا کوئی نبی نہیں آئے گا ! اللہ تعالیٰ کی قدرت اور فضل و نعمت کی کوئی حد و انتہا نہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہی کی حکمت بالغہ اور مشیت کاملہ نے نبوت کے عہدے کو ختم کر دیا اور اس آخری نبی کو مبعوث فرمایا جو انسان کامل ہے ۔ اور جس کا اسوۂ حسنہ قیامت تک کے لئے ہدایت کا معیار اور فوز و فلاح کا نمونہ ہے ۔

ایک مسلمان کے ذہن و فکر میں یہ خطرہ پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا دین کسی اضافہ یا ترمیم کا محتاج ہے اگر زمانہ کے تقاضوں اور دنیا کے حالات کے پیش نظر اللہ کے دین میں اضافہ یا کتر بیونت کی جا سکتی ہے ، جس مسلمان کے دل میں اس قسم کا خطرہ گذرتا ہو اسے صدق دل سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہئے ۔

اسلام اپنی ذات سے قطعی طور پر مکمل واقع ہوا ہے ، وہ کسی دوسرے نظریۂ حیات کے " دم چھلے " اور کسی " ازم " (ISM) کے پیوند کو گوارا نہیں کر سکتا ! اسلام کو وسعت اور ترقی دینے کا تصور دراصل ذہن و فکر کے مریض ہونے کی علامت اور اسلام سے بے خبری کی دلیل ہے ۔

اسلام دین فطرت ہے اس لئے وہ ہر دور میں انسانی فطرت کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور تمدن و تہذیب کی کسی جائز اور فطری ترقی کی راہ میں اسلام رکاوٹ نہیں بنتا ! اسلام مذہب (RELEGION) نہیں " الدین " ہے ، دین اسلام کا دوسرے مذاہب پر ہرگز ہرگز قیاس نہیں کرنا چاہئے ! دوسرے مذاہب پوجا پاٹ کی رسموں اور چند معاشرتی قوانین سے عبارت ہیں ، ان کے مقابلہ میں اسلام مکمل ترین ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ اور حیات کے ہر گوشہ کو روشنی اور رہنمائی دیتا ہے ! اسلام ہندو دھرم اور عیسائیت کی طرح پرائیویٹ مذہب نہیں ہے ، جن کو زمانہ کے مطابق بنانے کے لئے پروٹسٹنٹ اور آریہ سماج فرقوں نے جنم لیا ، جنہوں نے اپنے اپنے مذہب کی قطع و برید اور ترقی و وسعت میں مصلحین کا پارٹ انجام دیا ۔ مگر اسلام میں اس قسم کے مصلحین کی قطعاً گنجائش نہیں ہے ۔

اسلام کو اللہ تعالیٰ نے اتمام و تکمیل کی انتہائی حد تک پہونچا دیا اس لئے اس کے بارے میں اس طرز پر نہ سوچنا چاہئے اور نہ سوچا جا سکتا ہے کہ اسلام کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے ! جو لوگ اس قسم کے تصورات رکھتے ہیں انہوں نے اسلام کا بہت ہی سرسری اور اوپری مطالعہ کیا ہے ، اسلام کا صحیح فہم رکھنے والے ، اسلام کو مکمل ترین ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں جو کسی تغیر اور کمی بیشی کو گوارا نہیں کر سکتا ! اسلام کی مرمت اور وسعت (REPAIR AND EXPANSION) کا تصور خالص نیک نیتی کے باوجود اسلام کے ساتھ خیر خواہی نہیں ہے !

وہ جو علامہ اقبال نے فرمایا ہے ۔ ـــــــ

زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ ستیز

تو ـــــــ

زمانہ کو اسلام کے مطابق ڈھلنے یا ڈھالنے کی ضرورت ہے، اگر زمانہ اپنی خود سری، ناسمجھی اور غفلت و جہالت کے سبب اسلام کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے، تو زمانہ کی اس باغیانہ روش کے آگے سپر انداختہ ہونے کی بجائے زمانہ سے مصالحت اور مسانہ بازنہیں، اس سے جنگ کی جائے گی۔ زمانہ اگر صحت مند ہونا چاہتا ہے تو اس کے مرض کی دوا اسلام کے بیت الشفا ر سے مل سکتی ہے اور اگر وہ مرض ہی کو صحت اور بیماری کو توانائی سمجھے ہوئے ہے، تو زمانہ کی دل دہی کے لئے اسلام اپنی صحت کو زمانہ کے امراض کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا۔ زمانہ اپنی بھلائی چاہتا ہے اور انسانیت کی فلاح اسے مقصود اور مطلوب ہے تو زمانہ کو اسلام کا ساتھ دینا چاہئے بلکہ اسلام کی قدم بوسی اور ہمرکابی کا شرف حاصل کرنا چاہئے! اسلام خود اپنی ذات سے زمانہ کا صحیح تقاضا اور فطرت کی آواز واقع ہوا ہے، جس چیز کو اسلام "خوب" کہتا ہے، اُسی میں زمانہ کے لئے فلاح و ترقی کے زیادہ سے زیادہ امکانات پائے جاتے ہیں اور جس پر اسلام "ناخوب" کا حکم لگاتا ہے، اُس میں زمانہ کو نقصان و زحمت کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا۔ اہل نظر اور ارباب یقین زمانہ کے رنگ سے متاثر اور مرعوب نہیں ہوا کرتے یہ ڈھلتی پھرتی پرچھائیاں اور پانی کے بلبلے ہیں اور اسلام ایک مستقل حقیقت ہے جو پہاڑوں کی جڑ سے زیادہ مضبوط و مستحکم اور چڑھتی ہوئی دھوپ سے زیادہ تابناک اور یقینی ہے ـــــــ دین و دنیا کی لازوال نعمت!!

مسلمان دین حق کا منادی اور اسلام کا مبلغ ہے، اُس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کو دین فطرت کے سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد اور دنیا کو اس راہ پر لے جائے جو فوز و فلاح کی راہ اور صراط مستقیم ہے! اگر مسلمان ہی دنیا کے اضطراب اور زمانہ کے خلفشار کو دیکھ کر ڈر بیٹھے اور احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے تو دین و اخلاق کی یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے!

مسلمان اپنی جگہ اللہ کی آیت اور قدرت کی برہان ہے، اور ؎

دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

جس کو دیکھ کر دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں اور جگر لالہ کو اس سے ٹھنڈک بھی ملتی ہے! مسلمان جسے اقبال شاعرانہ زبان میں "قلندر" کہتا ہے۔ زمانہ کا مرکب نہیں راکب ہونا چاہئے ؎

ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

اجتہاد بعض لوگ شاید دین میں "اجتہاد" کی اصطلاح سے دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ "اجتہاد" کے ذریعہ دین کو زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق بنایا جا سکتا ہے، بیشک اسلام میں "اجتہاد" کی اجازت ہے، مگر اول تو اجتہاد کے لئے دین میں کچھ شرائط ہیں، جس طرح ہر شخص اس کا اہل نہیں ہے کہ وہ مریضوں کا آپریشن کرنے لگے، یہ فرض سرجن اور علم الجراحت کے تجربہ کار ماہرین ہی انجام دے سکتے ہیں اسی طرح اجتہاد کا حق اُن حضرات کو حاصل ہے جو دین کا صحیح علم رکھتے ہیں، دین کے مزاج سے واقف ہیں اور صاحب تقویٰ بھی ہیں ـــــــ پھر "اجتہاد" دین کی قدروں میں تصرف و تغیر کرنے کے لئے نہیں بلکہ اسلام کی قدروں کو اور زیادہ مؤکد بنانے کے لئے ہوتا ہے، دین کی قدر کسی بانڈی مجتہد کے اجتہاد سے مجروح ہو جائے تو ایسا اجتہاد دین میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اجتہاد دین کے حدود میں رہ کر کیا جاتا ہے، اور "اجتہاد" اصول میں نہیں فروع میں ہوتا ہے۔ مثلاً ہوائی جہاز ایجاد ہوئے تو نماز کی ادائیگی کے لئے ہوائی جہاز پر زمین پر چلنے والی سواریوں کا قیاس کیا گیا، مگر ہوائی جہاز میں یہ جو عورتیں مسافروں کی آؤ بھگت کرتی ہیں اُن کے اس اختلاط کو کسی اجتہاد کے ذریعہ جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو کام "ایر ہوسٹس" انجام دیتی ہیں، آسی کام، خدمت اور فرض کو مرد بھی کسی زحمت و دشواری کے بغیر انجام دے سکتے ہیں! "میزبان خواتین" ہوائی جہازوں میں جس آزادی، بے باکی اور

بے حجابی کیساتھ مردوں کی خدمت و خاطر (ENTERTAIN) کرتی ہیں، اُن میں طرح طرح کی کھلی ہوئی اخلاقی مضرتیں پائی جاتی ہیں، اس لئے اسلام عورتوں کی اس ڈیوٹی (خدمت) پیشہ، فرض اور وظیفہ و عمل کو جائز قرار نہیں دے سکتا! یہ اگر تقاضائے عصر کی تہذیب کی نشانی ہے تو اسلام اس نشانی کو بُرائی کی نشانی اور بداخلاقی کی علامت سمجھتا ہے' یہ اگر زمانہ کا تقاضا ہے تو غلط قسم کا تقاضا ہے، جسے اسلام کسی صورت میں سندِ جواز نہیں دے سکتا۔

اسلام مادی ترقی کا مخالف نہیں ہے مگر اسلام کا مزاج، اُس کی فطرت اور اُس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر ترقی کو اخلاقی پاکیزگی کے معیار پر جانچتا اور پرکھتا ہے، جو مادی ترقی اسلام کے معیارِ اخلاق پر پوری نہیں اُترتی، اسلام اُسے رد کر دیتا ہے چاہے اُس کے رد کر دینے سے معاشرے کو کتنے ہی عظیم مادی فوائد سے محروم ہو جانا پڑے! اور اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نگاہ سے اخلاقی مضرت اور سیرت و کردار کے بگاڑ کی تلافی کسی بڑی سے بڑی مادی ترقی سے نہیں ہو سکتی! ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے، کوئی شخص چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم اسلام کے اخلاقی اصول ہی کو سرے سے تسلیم نہیں کرتے، مگر کسی شخص کو اسلام کے اخلاقی اصول میں ترمیم و تنسیخ کا حق نہیں دیا جاسکتا، اسلام نے خوب اور ناخوب اور صواب و ناصواب کا جو پیمانہ مقرر کیا ہے اُس میں ذرہ برابر تبدیلی گوارا نہیں کی جاسکتی! جس کسی کو مسلمان بن کر رہنا ہے اُسے اسلام کے احکام کی کسی چون و چرا کے بغیر پوری پوری اطاعت کرنی ہوگی! یہ شدید قسم کی دورنگی ہے کہ کوئی شخص مسلمان بھی رہنا چاہے اور ساتھ ہی اسلام کی قدروں کو بدل دینے کا بھی داعیہ اپنے اندر رکھتا ہو! ذہانت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، مگر اس کا مصرف اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ اور اس جدوجہد میں ہونا چاہئے کہ دنیا پر ذہانت کے ذریعہ اسلام کی صداقت کو واضح کیا جائے اور زمانہ کو بتایا جائے کہ اسلام ہی کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اسلام ہی فطرت کے عین مطابق قابل عمل دستورِ حیات ہے اور یہی نسخہ شفا اور کیمیائے سعادت ہے! اس فرض کو انجام دینے کے بجائے، ذہانت کو اس راہ پر ڈال دینا کہ اسلام کو زمانہ کے تقاضوں کا حاشیہ بردار بنا دیا جائے، زمانہ کے مقابلہ میں شکست خوردگی کی دلیل ہے! مسلمان زمانہ کا امام ہے، زمانہ کا مقتدی نہیں ہے، مسلمان کو امامت کے بلند مقام سے کھینچ کر مقتدیوں کی صف میں لا کھڑا کرنا، ایک قسم کا تغیر تو ہے مگر کس قدر المناک تغیر ہے!

علامہ اقبال، کی قبر پر اللہ کی رحمت کی شبنم سدا برستی رہے اُنہوں نے اسی اندیشہ کو محسوس کر کے کہ مسلمان کہیں زمانہ کے تقاضوں سے مرعوب نہ ہو جائیں، یورپ کی مادی چمک دمک اُن کی آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے' اُن کی خودی جسے ہمیشہ اُبھرنا چاہئے کہیں دب کر نہ رہ جائے اپنے جگر کا لہو اس پیغام میں صرف کر دیا کہ ؎

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

مگر بورژوا "قیام صلوٰۃ" ہی کی اہمیت سے غافل ہوں وہ شبستانِ وجود میں کس طرح لرزہ پیدا کر سکتے ہیں!

مال و زر کی ضرورت اور مادی ترقیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا، مگر اقبال کی نگاہ میں ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اور یہ زوال اخلاق کا زوال ہے، اپنی دینی قدروں کو بے حقیقت جاننے کا زوال ہے' دنیا کے تقاضوں کے آگے سپر انداختہ ہونے کا زوال! اقبال زمانہ کا صحیح نبض شناس تھا، اُس نے یورپ میں رہ کر زمانہ کے مزاج و کیفیت کا مطالعہ کیا تھا، اس تجربہ، مشاہدہ اور مطالعہ کے بعد وہ بے اختیار پکار اُٹھا:—

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ ہے اُس کی نہاد کافرانہ

آج کا وہ زمانہ جو اقبال کی نگاہ میں "غارت گرِ دیں" ہے اور جس کی نہاد و طبیعت "کافرانہ" ہے ——— کیا وہ اس قابل ہے کہ تقاضوں کے سانچوں میں اسلام کو ڈھال کر اسلام کا حلیہ بگاڑ دیں، یا ملت کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق بننے کا پیغام دیں، یہ زمانہ کا نہیں ستیز و نزاع کا مستحق ہے، مسلمان اس زمانہ کا خیر مقدم نہیں کر سکتا جس کی بدولت ———

سرچشمۂ زندگی ہوا خشک باقی ہے کہاں مئے شبانہ

دورِ حاضر کی معاشرت پر اقبال کتنی عجیب طنز کرتا ہے ———

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال مرد بیکار و زن تہی آغوش

اقبال کافر کی یہ پہچان بتاتا ہے :—

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے

اور

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مسلمان جسے دنیا کی امامت و قیادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اگر یہی آفاق میں گم اور زمانہ کے تقاضوں میں جذب ہو کر رہ جاتے تو وہ بھٹکے ہوئے قافلہ کی کون رہنمائی کرے گا، یہ کتنا شدید المیہ ہے اور کس قدر دردناک ٹریجڈی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اُن مسلمانوں نے جو تقدیرِ اُمم اور زمانہ کے امام تھے، روم و ایران کے تمدن و تہذیب سے مصالحت نہیں کی، دُنیا کو انہوں نے اسلام کے ڈھانچے میں ڈھالا، وہ خود کسی دوسرے کے سانچے میں نہیں ڈھلے! وہ مردانِ باخدا و خود آگاہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ اللہ تعالیٰ کا دین دنیا پر غالب ہونے کے لئے آیا ہے، کوئی تہذیب اور تمدن اُسے مغلوب نہیں کر سکتا! دنیا کے تقاضے تو سراب کی مانند ہیں اور اس سراب سے اسلام کی قدروں کے لعل و گہر کو آلودہ نہیں کیا جا سکتا، ہاں جہاں "خیر" ہے اسلام اس کو اپنانے کے لئے تیار ہے یہ اپنانا بھی واقعہ کی صحیح ترجمانی نہیں ہے کیونکہ "خیر" تو اسلام ہی کی متاعِ گم گشتہ ہے یہ جہاں ملے اُسے اپنی چیز سمجھ کر لے لینا چاہئے۔

علامہ اقبال نے اُس فکر و ذہن کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو "آزادی اور حریتِ فکر" کے دھوکے میں دین اور قرآن کو "بازیچۂ اطفال" بنا دینا چاہتا ہے ——— اور نہ بھی چاہتا ہو تو اس قسم کے مزاج و فکر کا دانستہ یا نادانستہ طور پر نتیجہ یہی برآمد ہوتا۔

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدۂ پارس چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا کر چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

زمانہ کے تقاضے

زمانہ، فطرت اور قدرت ——— یہ الفاظ اور اصطلاحیں اگر صحیح معنی میں استعمال کی جائیں تو ان میں بڑا تقدس پایا جاتا ہے زمانہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

"لا تسبوا الدهر، انا الدهر بالدهور"

زمانہ کو برا نہ کہو، میں ہی زمانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ہوں،

اس اعتبار سے زمانہ کے تقاضے دین و اخلاق کے عین مطابق ہونے چاہئیں اور اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لئے فطرت کا کوئی تقاضہ بھی اس کے کسی تقاضے اور اصول کا مخالف نہیں ہو سکتا! مگر ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنی کوتاہ اندیشی کے سبب زمانہ کے تقاضے اور ہوائے نفس کے تقاضے

میان فرق نہیں کر پاتے ! مثلاً دورِ جاہلیت میں ملک عرب کے اندر بت پرستی کا عام چلن تھا۔ تو بت پرستی زمانہ کا تقاضا نہ تھی بلکہ یہ عرب کے بندوں کی ہوائے نفس کا تقاضا تھا ۔ اسی طرح قرآن شریف میں اُس معاشرے کا ذکر کیا گیا ہے جہاں لوگ ناپ تول میں کمی (تطفیف) کیا کرتے تھے، تو لوگوں کی اس حرکت کو زمانہ کا تقاضا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خود ان کی اخلاقی کمزوری کا داعیہ اور تقاضا تھا۔ برائیاں، بداخلاقیاں، بے اعتدالیاں زمانہ کا تقاضہ نہیں ہوا کرتیں ! مثلاً آج مشرق و مغرب کے بہت سے خطوں میں بے حیائی اور فحاشی کا چلن ہے ——
بے حیائی اور فحاشی " زمانہ " کا تقاضا نہیں ہے !

عرب کے باشندے توحید سے انحراف کرکے بت پرستی کی طرف جو مائل ہو گئے تھے تو اس کو زمانہ کا تقاضا کہنا یا سمجھنا واقعہ کے خلاف ہے یہ تو شیطان کا فریب تھا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے ! مگر شعر و ادب کی زبان میں " زمانہ " کا لفظ معاشرے کے چلن، وقت کی رو اور دنیا کی روش کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے اور " زمانہ سازی " دشنام بن کر رہ گئی ہے، جب ہم کسی کو " زمانہ ساز " کہتے ہیں، تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ شخص حق کے مقابلہ میں مصلحتوں کا پاس کرتا ہے، اُس میں عزیمت اور جرأت نہیں ہے، زر اور لالچ، خوف اور مصلحت نے اُس کے کردار میں لچک پیدا کر دی ہے۔ اقبال نے بھی :—

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

میں " زمانہ " سے یہی عام معنیٰ مراد لئے ہیں۔ شعر و ادب کی مروجہ اور عام اصطلاح میں " زمانہ " کا جو مفہوم لیا جاتا ہے، اُس کے پیش نظر ہم عرض کرتے ہیں کہ زمانہ کے تقاضوں کا آنکھیں بند کر کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا ، زمانہ کے تقاضوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، جو تقاضے اسلام کے اخلاقی معیار پر پورے اتریں اُن کو قبول کر لیا جائے گا اور جو پورے نہ اتریں اُن کو کسی افسوس اور معذرت کے بغیر رد کر دیا جائے گا۔

اسلام نے بت پرستی، سود خواری، شراب نوشی، بدکاری، قمار بازی فحاشی اور اس قسم کی تمام برائیوں کو حرام قرار دے کر، در اصل زمانہ کے غلط تقاضوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا ۔ ان تمام برائیوں کو اسلام آج بھی " الٹی میٹم " دے رہا ہے ! اس لئے ہم اسلام کے نام لیوا زمانہ کے ان تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا ہے بلکہ ان کے خلاف جنگ کرتی ہے۔

اب چودہ سو سال پہلے کی دنیا اور خاص طور سے عرب جس دورِ جاہلیت پر ہم ہمیشہ لعنت بھیجتے ہیں آج اُس جاہلیت کی ایک ایک برائی معاشرے میں نفوذ کر گئی ہے، حلال و حرام میں کوئی تمیز باقی نہیں رہی، شراب نوشی کا عام رواج ہے، قمار بازی کی ایک قسم کا نمبر د (R A C E S) بھی جاتی ہے، سودی کاروبار کے پھیلاؤ کی کوئی حد و انتہا نہیں رہی، مرد و زن کے آزادانہ اختلاط نے سوسائٹی میں بے حیائی اور فحاشی کو اُس گراوٹ تک پہنچا دیا ہے کہ آج کا مہذب انسان جانور بن کر رہ گیا ہے ! زمانہ اُس راہ پر چل رہا ہے جہاں خدا کا خوف اور محاسبہ آخرت کا تصور سرے سے مفقود ہے، ہوائے نفس ہی سچ " الٰہ " بن کر رہ گئی ہے، نفسانی خواہشات جدھر لے جانا چاہتی ہیں اُسی سمت معاشرے کا قافلہ چل پڑتا ہے۔ اخلاق و پاکیزگی اور طہارت و تقویٰ آج کی سوسائٹی کے لئے اجنبی اور نامانوس اصطلاحیں بن کر رہ گئی ہیں۔

اس ہوس زدہ معاشرے اور معصیت پرور دہ ماحول میں ایک مسلمان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے ! کیا وہ وقت کی اس غلط رو میں بہہ جائے، زمانہ کے تقاضوں پر لبیک کہے، معاشرے کی برائیوں کے سانچے میں ڈھل جائے، اس بگڑے ہوئے معاشرے نے جو فلسفی اور ادیب پیدا کئے ہیں اُن کے افکار و نظریات کے آگے سپر انداختہ ہو جائے —— مگر ایک مسلمان جو سچے دل سے اللہ، رسول، آخرت اور دین کے اخلاقی نظام پر یقین رکھتا ہے، ان برائیوں میں زمانہ کے تقاضوں کا ایک قدم بھی ساتھ نہیں دے سکتا، اور وہ یہ بھی نہیں کر سکتا اور نہ اسے کرنا چاہئے کہ خاموش تماشائی بن کر دنیا کے بگاڑ کے اس تماشے کو دیکھتا رہے، مسلمان پر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ ان برائیوں سے جنگ کرے اور وقت کے دھارے پر بہنے کی بجائے اپنی تمام کوششیں وقت کے دھارے کا رُخ بدلنے میں صرف

کردے ۔ مسلمان اس سے مرعوب اور متاثر نہیں ہوتا کہ دنیا کس راہ پر جا رہی ہے وہ تو یہ سوچتا ہے کہ دنیا کو کس راہ پر جانا چاہئے ۔ مسلمان نہ تو بت گر ہوتا ہے اور نہ بت پرست، اُسے تو اللہ تعالیٰ نے بت شکنی کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ بت پتھروں ہی کے نہیں ، افکار و نظریات، ہوا و ہوس اور خواہشوں کے بت بھی ہوتے ہیں ۔

اسلام خود اپنی جگہ ایک مکمل منشور ، دستور اور تحریک ہے اس کا پیوند کسی دوسرے دستور، تحریک یا "ازم" (ISM) سے نہیں جوڑا جا سکتا ۔ زمانہ اور دنیا اگر اپنی بھلائی چاہتی ہے تو اُسے اسلام کے تقاضوں کا ساتھ دینا چاہئے ، زمانہ کی اسی میں بھلائی ہے کہ وہ اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے ، اسلام کو زمانہ کے مطابق بنانے کی کوشش نہ اسلام کے حق میں مفید ہے اور نہ زمانہ کو اس سے کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے !

اسلام اور سائنس

اسلام اور سائنس کے درمیان کوئی تصادم ، نزاع اور کشمکش نہیں ہے ، سائنس کی کسی ایجاد اور ترقی پر علماء اسلام نے نکیر نہیں کی یہ محض بلا وجہ کا وہم اور خواہ مخواہ کی نکتہ آفرینی ہے کہ سائنس کے "جدید تقاضوں" کا تصور قائم کر کے ان تقاضوں کا اسلام سے پیوند جوڑنے کی تلقین کی جائے ۔ سائنس کسی عقیدہ کا نام نہیں ہے اور نہ وہ کسی معاشرتی اور روحانی نظریہ کی دعویدار ہے ۔ سائنس نے "برق و بخار" کی ایجاد کی اس ایجاد سے کوئی عقیدہ اور نظریہ وابستہ نہیں ہے ، کسی عالم دین نے اس ایجاد پر فتویٰ نہیں لگایا اور نہ سائنس کی ایجاد میں کوئی ایسا تصور یا نظریہ شامل ہے جس کو اسلام سے مطابقت دینے کی کوشش رائیگاں کی جائے ! اسلام تو سائنس کی اُن ایجادوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے جن سے خلقِ خدا فائدہ اٹھاتی ہے ، یہ محض وہم ہے کہ سائنس کے کچھ تقاضے اور نظریئے ہیں اور قدامت زدہ علماء نے اپنی نادانی اور بے خبری کے سبب اسلام اور ان سائنسی نظریوں کے درمیان کشمکش پیدا کر دی ہے ۔ سود ، بے پردگی ، قمار بازی ، شراب خواری ، رقص و غنا ، اس قسم کی تمام برائیوں کا سائنس سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے ، نہ تو یہ برائیاں سائنس کی ایجاد کردہ ہیں اور نہ سائنس نے ان کے جواز کے لئے کوئی تجربہ یا اکتشاف کیا ہے !

سائنس نے ہوائی جہاز ایجاد کئے مگر اس نے اس کا مشورہ نہیں دیا کہ ہوائی جہازوں میں بے پردہ عورتیں مسافروں کی تواضع کیا کریں وہ انہیں شراب پلایا کریں ! سائنس نے فن تعمیر کو کس قدر ترقی دی مگر اس نے اس قسم کی کوئی تجویز پیش نہیں کی کہ فلاں عمارتیں شہر میں ضرور قائم کرنا اور فلاں بلڈنگ کو رقص خانہ بنا دینا ۔ سائنس نے طرح طرح کے ملبوسات ایجاد کئے مگر اس نے اس کی تعلیم نہیں دی کہ عورتیں لباس کا اس انداز پر استعمال کریں کہ لباس پہننے کے باوجود وہ نیم برہنہ نظر آئیں ! "رقص" سائنس کی ایجاد نہیں ہے اور نہ عورتوں کی بے حجابی سائنس کا کوئی تجربہ یا اکتشاف ہے ۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی ملی جُلی تعلیم سے بھی سائنس کا کوئی واسطہ نہیں ہے ! سائنس نے آپریشن کے نازک آلات ایجاد کئے ہیں ، طرح طرح کی دوائیں بنائی ہیں ، مگر سائنس نے یہ مشورہ نہیں دیا کہ ہسپتالوں میں مرد مریضوں کی ٹہل اور دیکھ بھال کے لئے نرسیں رکھی جائیں !!

اسلام کسی مادی اور دنیوی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہے مگر اسلام اُن غلط باتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا جن پر دنیا نے "ترقی" کا لیبل لگا دیا ہے ! آج کے شعر و ادب ہی کو دیکھ لیجئے ، فحاشی ، برہنہ نگاری ، اسلام اور خدا و رسول کے انکار بلکہ استخفاف کو "ترقی پسند ادب" کہا جاتا ہے ، اس قسم کے نام نہاد "ترقی پسند ادب" میں اخلاقی عیوب کے ساتھ زبان و بیان کی بھی خامیاں پائی جاتی ہیں ، اسی کا قیاس معاشرے کی دوسری خرابیوں پر بھی کیا جا سکتا ہے کہ لوگ کھلی ہوئی "برائیوں" کو "ترقی" سمجھ بیٹھے ہیں ، آج صنفِ نازک میں آزادانہ اختلاط ، بے باکی اور بے حجابی کی جو رو چل پڑی ہے یہ ترقی نہیں تنزل ، گراوٹ اور زوال کی علامت ہے ، اسی طرح سود ہو یا شراب ، قمار بازی ہو یا رقص ان کو جو کوئی ترقی کہتا ہے وہ اخلاق و شرافت کی ہوا سے بھی واقف نہیں ہے اور شیطان نے اس کی نگاہ میں ان فواحش کو حسین بنا دیا ہے ۔

یورپ ہو یا امریکہ ، روس ہو یا چین ، جاپان ان سب کا اخلاق کے معاملہ میں قریب قریب ایک ہی رنگ ہے، ان ملکوں
برے سے سکتے ہیں ، صنعت وزراعت کی جو ترقیاں ان ممالک میں ہوئی ہیں ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ، ان کے یہاں وقت کی
نا سی پائی جاتی ہے اور وہاں کے خواص وعوام اپنے ملک و وطن کی ترقی اور خوشحالی اور اس کے استحکام کے لئے اپنے اندر اتحاد قربانی
رکھتے ہیں ، اس قسم کی تمام اچھی باتیں ہم ان سے اخذ کر سکتے ہیں ۔ مگر ان کے تمدن وتہذیب میں جو اخلاقی برائیاں ہیں وہ حقارت کے ما
نفرت کے ساتھ ٹھکرا دینے کے قابل ہیں ۔ "خذ ما صفا ودع ما کدر" یہ ہے وہ اصول جو مسلمان کا شعار ہونا چاہئے ۔ اس
یصیبی اور غلط اندیشی کی بھلا کوئی حد ونہایت ہے کہ دوسری قوموں کی اچھائیوں کو تو رد کر دیا جائے اور ان کی برائیوں کو گلے
لگایا جائے ۔

دنیا کے وہ ملک جو متمدن اور مہذب سمجھے جاتے ہیں ظاہری صفائی ستھرائی کا تو بہت خیال رکھتے ہیں مگر طہارت کا
جذبہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا ایک مسلمان کی نگاہ میں ان کی معاشرت کا یہ پہلو قابل نفرت ہونا چاہئے ۔ کوئی مسلمان ان کی
صفائی ستھرائی سے مرعوب ہو کر ان کی اندرونی نجاست و ناپاکی کو اپنا لے ، اور اس معاملہ میں ان جیسا بن جائے ، تو یہ بہت برا
کی یہ وبا اور "صاحب بہادر" بننے کا ہو کا غسل وطہارت کی خرابیوں تک ہی محدود نہیں رہتا ، یہ برائی شراب اور لحم خنزیر تک
بعض مسلمان ملکوں میں ان برائیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔

یہ زمانہ!

موجودہ دور کے تمدن وتہذیب ، دنیا کی روش اور عصر حاضر کے تقاضوں اور نظریوں سے اسلام
معنی ہیں کہ دین وشریعت کی حدوں کو توڑ دیا جائے ، اور کوئی مسلمان بصحت ہوش وحواس ان کو
——— مثلاً عورت کو دور حاضر نے جس قسم کی آزادی دی ہے ، اس چراغ خانہ کو شمع محفل بنا دیا ہے اور عورت کی عصمت
کے ہر حصار کو توڑ کر رکھ دیا ہے ۔ زمانہ کی اس روش کے سانچے میں ڈھل جانے کا اس کے سوا اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ
خمار" کی پابندی کے ساتھ عورت کے مقامات زینت کی پردہ پوشی اور عفت وحیا کی جو تعلیم دی ہے اس تعلیم کو دماغ
دور نبوی اور خلفاء راشدین کے معاشرے میں "عورت" کے رہنے سہنے کا کیا انداز تھا ؟ عفت وحیا اور پاکیزگی کے کن
کے ساتھ وہ اپنی "نسائیت" کے امتیاز وشرف کی حامل تھی ——— مگر آج کا زمانہ "عورت" کے کسی امتیاز وشرف کو
نے عورت کے چہروں سے نقابیں کھسوٹنے اور ان کے گریبانوں سے چادریں چھیننے پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ عورت کو زیا
زیادہ سے زیادہ عریانی اور برہنگی کا ذوق عطا کیا ہے ۔ اسلام عورت کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے مقامات زینت کو چھپا
اور آوازوں سے بھی فضا کو مرتعش اور ماحول کو بے چین نہ ہونے دے ، حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو عورت خوشبو لگا کر
اور آج زمانہ کا تقاضہ یہ ہے کہ عورت اپنے مقامات زینت کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرے ، غیر مردوں کو رجھانے
دید کی تسکین کے لئے لباس وآرائش اور ناز وانداز کے سہارے فتنہ مجسم اور قیامت سراپا بن جائے اسٹیجوں
اور نمرت کرے یہاں تک کہ وہ تمام داعیات ومحرکات جو آدمی کو "عمل زنا" تک پہنچاتے ہیں ، ان کو پوری طرح
یہ تمام فواحش "آرٹ" سمجھے جاتے ہیں ا

قرآن میں سود کے لئے کتنی شدید وعید آئی ہے ، اس فعل شنیع کو اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کا مترادف
"سود" کو شیر مادر بنا دیا ہے اور معاشرے کی رگ رگ میں اس زہریلی نجاست کو پہنچا دیا ہے ۔

اسلام نے "قمار" "بازی" کو فرض وواجب نہیں ٹھہرایا ہاں اس کی "اجازت" دی ہے اس "اجازت" ؟

ہے لیکن آج کا معاشرہ نساء پر تو کوئی پابندی نہیں لگاتا لیکن اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس "اجازت" کو منسوخ کرتا ہے۔ عورت جسمانی ساخت اور فطرت کے اعتبار سے مرد کے مقابلہ میں نازک اور منفعل واقع ہوئی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے عورت کی حفاظت و نگہبانی مرد سے متعلق کی ہے۔ "الرجال قوامون علی النساء" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مگر آج کا زمانہ عورت کی حفاظت و نگہبانی ہی کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، اس نے عورت کو کھلی چھٹی دے دی ہے اور "مرد" کو عورت کا محافظ نہیں بلکہ چھتری بردار بنا دیا ہے!

معاش و اقتصادیات اور تجارت و حکومت کے مسائل میں اسلام نے جو ہدایتیں دی ہیں۔ آج کی دنیا اُن ہدایتوں کے خلاف جا رہی ہے۔ یہ حالات ہوں تو اس صورت میں زمانہ کے تقاضوں سے مطابقت کی خاطر قرآن کریم کی شرح و تفسیر کا جدید ایڈیشن تیار کرنا ہوگا اور اسلامی قانونوں کو اس طرح بدل دینا پڑے گا کہ اسلام کا حلیہ بگڑ کر رہ جائے گا!

اللہ تعالیٰ کی آیات میں نسخ اور اُن سے بہتر آیات لانے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اور جب ضرورت محسوس ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے نسخ و تغیر کی اصلاح وحی کے ذریعہ اپنے نبیوں کو دی ہے۔ نبوت کا عہد ختم کر دیا گیا، قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا آخری ایڈیشن ہے! اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور دنیا کا کوئی انقلاب قرآن کریم کے ایک حرف کو بھی اِدھر سے اُدھر نہیں کر سکا۔ یہ کام تو نبی اور رسول کے کرنے کا تھا کہ انبیاء و رسل ضرورت کے مطابق اپنی کسی ہدایت کو منسوخ کر دیتا یا اس کی جگہ پہلے سے بہتر سانچے میں ڈھال دیتا، مگر حضور خاتم النبیین کی بعثت کے بعد اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ——— اُمت مسلمہ اگر اس کام کو انجام دے گی تو اس کے افراد "اُمتی" کہلانے کے بجائے سب کے سب "رسول" بن جائیں گے!

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر ایمان رکھتے ہیں کہ تکوین ہو یا تشریع اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے سوا اور کسی کی حاکمیت قبول نہیں کی جا سکتی اس پر بھی ایمان اور اعتماد ہو کہ حضور کی ذاتِ گرامی پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کر دیا، حضور کی سنت دین میں حجت ہے، حضور نے قرآنی احکام کی جو تعلیم دی ہے اور تشریح فرمائی ہے وہ بھی "یعلمہم الکتاب والحکمۃ" کے فرمانِ الٰہی اور منشورِ ربانی کے مطابق منصوص ہے، اس کا بھی یقین ہو کہ صحابہ کرام کے عہد میں کتاب و سنت کی ہدایت کے تحت جو معاشرہ متشکل ہوا تھا وہ بہترین معاشرہ تھا، اس ایمان و یقین اور اعتماد کے ساتھ اس پر بھی ایمان ہو کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے ہمیں حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے اس لئے دنیوی فائدوں کی خاطر اپنی عاقبت کو نہیں بگاڑنا ہے، اور اس پر بھی پوری طرح اطمینان ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک "اسلام" کے سوا اور کوئی مذہب، فلسفہ، نظریہ اور دستور و قانون اور "ازم" قابلِ قبول نہیں ہے ——— تو پھر اصل میں کام کرنے کا یہ ہے کہ زمانہ کے غلط تقاضوں نے آج کی دنیا کا جو ذہن بنا دیا ہے، اُس کی اصلاح کی کوشش کی جائے، اور اُن دلیلوں کے ساتھ جن کو آج کا ذہن قبول کرتا اور متاثر ہو سکتا ہے، سائنٹیفک انداز میں دنیا پر اسلام کی حقانیت اور ابدیت کو واضح کیا جائے! ان کے دلوں میں اس حقیقت کو اُتارا جائے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اس کی تمام قدریں فطرت کے عین مطابق ہیں یہ نہ تو سرمایہ دارانہ نظام ہے جو جلبِ منفعت اور دولت کی انتہا کو پہنچ گیا ہے اور نہ سرشلسٹ نقطہ نظر ہے جو سرمایہ داری کی دشمنی میں دوسری انتہا کی طرف ڈھلک گیا ہے۔ اسلام اقتصاد و معاش کا ایسا توازن رکھتا ہے اور وہ اُن لوگوں کو ذہنی مریض سمجھتا ہے جنہیں مساوات کا سرسام ہو گیا ہے۔

اے تمدن و تہذیب اور معاش و معیشت کے ہر گوشہ پر نمو پذیر ہونے کی ضرورت ہے اسلام ہی کو غالب کرنے کے لئے ہمیں جد و جہد کرنی ہے دُنیا نے اسلام کو قبول کر لیا تو یہی ہماری فتح ہے اور خدانخواستہ قبول نہیں کیا تو بھی ہم اس لحاظ سے کامیاب ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنا فرض ہم نے ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اس فرض کے ادا کرنے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے (آمین)

ماہر القادری

ا ہے نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد (اقبال)

مولانا شمس تبریز خاں آروی

حدیث بطور تفسیر قرآن

(۲)

مضمون کی دوسری قسط کے لئے بہتر معلوم ہوا کہ علامہ سیوطیؒ کی الاتقان سے ایک باب کی تلخیص پیش کر دی جائے جس کی جامعیت اور افادیت مسلم ہے۔ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ہم الاتقان کا خاتمہ ایسی حدیثوں پر کرتے ہیں جن میں صراحۃً قرآن کی تفسیر آئی ہے اور یہ حصہ شانِ نزول سے الگ ہے۔ مضمون میں ہم صرف صحابی کا نام لے کر حدیث لکھیں گے مگر اس سے مراد یہ ہے کہ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں۔

(الفاتحہ) احمد و ترمذی نے تخریج اور ابن حبان نے تائید کی ہے کہ عدی ابن حاتم حضورؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں۔
المغضوب علیہم ـ یہود ہیں اور الضالین ـ نصاریٰ ہیں۔ ابن مردویہ نے حضرت ابوذرؓ سے یہی روایت کی ہے۔

(البقرۃ) ابوسعید خدریؓ ـ "لہم فیہا ازواج مطہرۃ" ـ یعنی حوریں حیض و نفاس، بول و براز اور رینٹھ وغیرہ سے پاک ہوں گی۔ (مستدرک، ابن مردویہ
ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اسے حسن کہا ہے)

ابوہریرہؓ ـ "قولاً غیر الذی قیل لہم" بنی اسرائیل گھسٹتے ہوئے شہر میں داخل ہوتے اور حبۃ فی شعرۃ کہتے ہوتے ــــ (بخاری و مسلم)

ابوسعید خدریؓ : "ویل" جہنم کی ایک وادی ہے جس میں کافر ۴۰ سال گرتا رہے گا۔ (ترمذی)

: حضورؐ نے فرمایا قرآن میں جہاں قنوت ہے وہ طاعت کے معنی میں ہے۔ (احمد)

ابن عمرؓ : "یتلونہ حق تلاوتہ" کا مطلب اتباع کامل ہے۔ (خطیب)

علیؓ : "لا ینال عہدی الظالمین" لا طاعۃ الا فی المعروف ــ کہ اطاعت صرف نیکیوں میں ہے (ابن مردویہ، احمد، ترمذی، حاکم)

ابن عباسؓ : "اذکرونی اذکرکم" یعنی تم عبادت میں مجھے یاد کرو اور میں مغفرت سے تمہیں یاد کروں گا (دیلمی)

ابن عازبؓ : "یلعنہم اللاعنون" کافروں پر حیوانات بھی لعنت کرتے ہیں۔

انسؓ : حضورؐ نے "التسریح باحسان" کو تیسری طلاق قرار دیا۔ (احمد، ابن مردویہ)

علیؓ : "السکینۃ" ریح خجوج۔

(آل عمران) ابوالدرداءؓ : "راسخین فی العلم" وہ ہیں جو قسم کے پورے، زبان کے سچے، صاف دل اور حرام سے گریزاں ہیں (طبرانی)

ابن عمرؓ : "یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ" اہل سنت کے چہرے درخشاں اور اہل بدعت کے سیاہ ہوں گے (مسند دیلمی)

(النساء) ابن عمرؓ : "بدلناہم جلوداً غیرہا" ایک منٹ میں سو بار جہنمیوں کی کھالیں بدلیں گی (طبرانی)

(المائدہ) ابو عامر اشعریؓ : "لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم" یعنی کفار تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ (احمد، طبرانی)

عبدالرحمٰن مزنیؓ : "اصحاب اعراف" وہ ہیں جو جہاد میں والدین کی نافرمانی سے جنت میں نہ جا سکے اور اسلام کی وجہ سے جہنم سے بچ گئے (طبرانی، بیہقی، ابن کثیر) اور حضرت انسؓ

روایت میں دو مسلم جنات ہوں گے۔

انس رض: تجلی صرف انگوٹھے یا چھوٹی انگلی کی جھلک سے پیدا ہوئی تھی۔ (احمد، ترمذی، حاکم)

ابوسعید رض: " انما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ والیوم الآخر "
حضورؐ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو مسجد کے عادی ہو جاتے ہیں قلبہ معلق بالمساجد (ان کے دل مسجدوں میں لگے رہتے ہیں) پھر فرمایا جس کا یہ حال دیکھو تو اس کے ایمان کی شہادت دو۔ (احمد، ترمذی، ابن حبان، حاکم)

ابوہریرہؓ: " ومساکن طیبۃ فی جنات عدن " کی تشریح میں رسول اللہؐ نے فرمایا۔ وہ موتیوں کے محل ہوں گے جن میں سرخ یاقوت کے ستر گھر ہوں گے اور ہر گھر سبز زمرد کے ستر کمرے ہوں گے، اور ہر کمرہ میں ستر تخت ہوں گے اور ہر تخت پر ستر بستر ہوں گے جن پر ستر حوریں ہوں گی ستر دستر خوانوں پر ستر قسم کے کھانے (ابن مبارک، طبرانی، بیہقی)

عمر رض: " اولیاء اللہ " ـــــ خاص اللہ کے لئے محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون انہی کے بارے میں ہے۔

(الرعد) ابن عمرؓ: " یمحو اللہ ما یشاء " سوا شقاوت وسعادت، اور موت وحیات کے ہر تقدیر بدل سکتی ہے (طبرانی)
مگر ابن مردویہ، جابر بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ رزق اور اجل دونوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ علاوہ والدین کے ساتھ نیکی اور عمل صالح، بدنصیبی کو خوش بختی سے بدل دیتی ہے اور عمر بڑھا دیتی ہے ـــــ (ابن مردویہ)

(ابراہیم) " سواء علینا اجزعنا ام صبرنا مالنا من محیص " کعب بن مالک کہتے ہیں۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا جہنمی کہیں گے کہ اصحاب خوب روئیں دھوئیں اور آہ و زاری کریں مگر آخر ہیں ۵۰۰ سال کے بعد یہی کہیں گے کہ صبر اور بے صبری کسی میں نجات نہیں۔ پہلے ۵۰۰ سال صبر کریں گے پھر جب کوئی فائدہ نہ دیکھیں گے
براء بن عازبؓ: " القول الثابت فی الحیاۃ الدنیا وفی الآخرۃ " کلمہ طیبہ ہے جو ہر جگہ کام دے گا (صحاح ستہ) (ابن ابی حاتم، طبرانی، ابن مردویہ)

(الحجر) ابوسعیدؓ: " ربما یود الذین کفروا لو کانوا مسلمین " یہ جہنمی لوگ ہیں جو اسلام کی تمنا کریں گے (طبرانی، ابن حبان)

(الکہف) ابوہریرہؓ: " الباقیات الصالحات "
سبحان اللہ، والحمد للہ، ولا الہ الا اللہ، واللہ اکبر ـــــ ہیں (احمد، طبرانی، ابن جریر)

(مریم) ابوہریرہؓ: " سیجعل لہم الرحمن ودا " حضورؐ نے فرمایا جب اللہ کسی سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو گواہ بناتا ہے۔ اور کہتا ہے تم بھی محبت کرو پھر وہ آسمانی یہ اعلان عام کرتے ہیں آسمان سے دنیا پر قبول عام اسے نصیب ہوتا ہے (مسلم، ترمذی)

(المومنون) عائشہؓ: " الذین یؤتون ما آتوا وقلوبہم وجلۃ "
وہ لوگ ہیں جو گناہ کرتے ہیں۔ مگر اللہ سے پشیمان بھی ہوتے ہیں بلکہ وہ جو نیکیوں کے باوجود خوف خدا سے کانپتے ہیں (احمد)

(الاحزاب) معاویہؓ: " من قضی نحبہ " حضورؐ نے فرمایا، طلحہ انہی میں سے ہے۔ (ترمذی)

(السبا) ابوالدرداء رض: " فمنہم ظالم لنفسہ ومنہم مقتصد ومنہم سابق بالخیرات "
پہلے لوگوں سے سخت حساب ہوگا۔ دوسروں سے کم اور تیسرے بلا حساب جنت میں جائیں گے۔ (احمد، ترمذی)

(الصافات) ام سلمہؓ: " حور عین " حوریں بڑی آنکھوں والیاں ہوں گی جن کی پلکیں پرندے کی پر کی طرح ہوں گی۔
" بیض مکنون " یعنی ان کی جلد اس جلد کی طرح نازک ہوگی جو انڈے کے اندر ہوتی ہے۔ (ابن جریر)

" وجعلنا ذریتہ ہم الباقین "
جن کی اولاد میں سام ابوالعرب ہوا، حام ابوالحبش ہوا، اور یافث ابوالروم ہوا (ترمذی، حاکم)

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے

محمد نواز۔ ایم۔اے

اقبال کا حقیقی کارنامہ

(۱)

کوئی اقبال کو عظیم شاعر سمجھتا ہے اور کوئی انہیں بڑا مفکر قرار دیتا ہے کسی کے نزدیک وہ بلند پایہ فلسفی ہیں اور کوئی انہیں اس لحاظ سے عقیدت و احترام سے دیکھتا ہے کہ انہوں نے پاکستان کا تخیل پیش کیا تھا۔ بلاشبہ یہ ساری باتیں ان کی عظمت کی دلیل ہیں انہوں نے شاعری کو اسلوب کی جو ندرت، الفاظ کی جو شوکت، خیالات کی جو گہرائی اور آہنگ کا جو حسن دیا ہے وہ پاک و ہند کے شعرا میں نہ تو ان سے پہلے کسی کو نصیب ہوا اور نہ ان کے بعد ——— اسی طرح وہ فلسفے کے میدان میں ہیگل، مارکس اور نطشے وغیرہ کو جس طرح پیچھے چھوڑ گئے ہیں وہ بھی اہل علم کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں لیکن کسی شخص کا اچھا شاعر اور عظیم فلسفی ہونا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں کہ وہ عظیم انسان بھی ہے۔ شاعر یا فلسفی اپنے فن میں چاہے جتنا عظیم کیوں نہ ہو لیکن کیا اس کے کسی بڑے سے بڑے مداح میں بھی یہ حوصلہ ہے کہ وہ اسے عظیم انسان کی حیثیت سے پیش کرے۔ فرائیڈ اور ڈارون کو نفسیات اور حیاتیات میں خواہ کتنا ہی اونچا مقام دیں لیکن کیا انہیں انسانیت کے اعلیٰ تختوں پر بھی بٹھایا جا سکتا ہے۔ غالب عظیم شاعر ہیں لیکن کوئی ایسا ہے جو انہیں عظیم شاعر کہنے کے ساتھ ساتھ عظیم انسان بھی ثابت کر سکے .... لیکن مجھے یہ بات کہنے کی اجازت دیجئے کہ علامہ اقبال [illegible] شاعر، مفکر، فلسفی اور ایک اعلیٰ درجے کے مفکر تھے، بلکہ ان سب خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔

انسان کا پیدا ہو جانا اس کے ذاتی کمالات کا ہرگز مظہر نہیں بلکہ یہ خالق کائنات کے تخلیقی عمل کا ایک معمولی سا کرشمہ ہے لیکن انسان کا پیدا ہو کر اپنی انسانیت پر قائم رہ جانا فی الواقع ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ تاریخ عالم کی یہ بڑی دردناک حقیقت ہے کہ انسان کا ایک بڑا حصہ اپنی انسانی عظمت کو خود اپنے ہاتھوں برباد کرتا رہا ہے۔ درختوں کے آگے جھکا، پتھروں اور جانوروں کو اپنا رب اور معبود بنایا، سورج، آگ اور پانی کی پرستش کی، وطن، قوم اور بادشاہ کو خدا بنا کر پوجتا رہا، اپنے جیسے انسانوں کے سامنے گردن جھکائی ——— اور اگر کسی وقت سنبھلا بھی تو مادے کو خدا بنا ڈالا۔ یہ سارے پاپڑ بیلنے کے باوجود بھی وہ انسانی عظمت کے مقام سے گرتا ہی چلا گیا۔

تاریخ کے اس افسوسناک المیے کی روشنی میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ انسان کا اپنی انسانیت پر قائم رہ جانا [illegible] ایک سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اقبال نسل انسانی کے ان خوش نصیب افراد میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی انسانی خصوصیات کی حفاظت کی ہے ——— لیکن ہم ان کے اس کام کو کارنامہ خیال نہیں کرتے کیونکہ اقبال مسلمان تھے۔ اور انسانی برادری کے دوسرے افراد کے برعکس انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے وارث تھے۔ اس لئے ان کا انسانیت کے مقام پر فائز رہنا ہرگز کوئی حیرت انگیز بات نہیں ——— لیکن انہوں نے صرف اپنی انہی خصوصیات ہی کی حفاظت نہیں کی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر "انسان سازی" کا نہایت ہی مشکل کام انجام دینے کی کوشش کی اور اس کا ایک تفصیلی پروگرام سمجھایا ——— اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اسی لحاظ سے میں انہیں ایک عظیم انسان خیال کرتا ہوں کیونکہ ان کا یہ کارنامہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو عام انسان سرانجام نہیں دے سکتے۔ یہ تو [illegible] اور مجدد ہی کے کرنے کا کام ہے اور سب سے بڑے سیرت ساز اور "انسان گر" ہی کیا کرتے تھے۔

پھر وہ ساقی سے خطاب کرکے کہتے ہیں کہ مجھے ایسی شراب دے جس کی اصل زمزم ہو نقیر بھی جو۔ تو ہر شیشہ جانے جس کی برکت سے گداس کے نیکی کو پہاڑ کا وقار اور لومڑی کو شیر کی قوت حاصل ہو جائے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مولانا روم نے انہیں خواب میں کہا کہ کب تک غنچہ کی طرح خاموش بیٹھے رہوگے کیوں پھول کی طرح اپنی خوشبو ہر سمت نہیں بکھیرتے۔ تم ایک قافلے کے لئے بانگ درا کی حیثیت رکھتے ہو۔ اٹھو اور قافلے کو راہ مقصود پر لگا دو۔ یہ سنتے ہی اقبال نے "انسان سازی" کی اس عظیم مہم کا آغاز کر دیا۔

اقبالؒ انسان سازی کے اس عظیم کام کے لئے ملت کے اجتماعی وجود کو لازمی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

؎ فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　　موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

؎ فرد را ..... جماعت رحمت است　　　جوہر او را کمال از ملت است

اس بات کو وہ ایک مثال سے واضح فرماتے ہیں کہ درخت کا پتا جب اپنی شاخ سے وابستہ رہتا ہے اسے امید باقی رہتی ہے کہ بہار آئیگی تو وہ بھی اپنے حصہ کی تازگی حاصل کریگا۔ لیکن اگر وہ شاخ سے الگ ہو جائے تو اس کے ساتھ ہی بہار سے فائدہ اٹھانے کی امید ختم ہو جائے گی۔

ملت کا وجود اگر صحت مند اور توانا ہے، تو اس کے افراد بھی شاہین صفت ہوں گے، اور اگر ملت کا وجود مختلف امراض کی آماجگاہ بن چکا ہو اور اسے مختلف قسم کے فتنوں نے گھیر رکھا ہو تو "انسان سازی" ——— شیر خدا اور رستم دستان جیسے انسانوں کا پیدا ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے اقبال ملت کے وجود کو مستحکم، صحت مند اور توانا رکھنے کے لئے سب سے پہلے ان فتنوں سے ٹکراتے ہیں اور ان کے خلاف سینہ سپر ہو جاتے ہیں جن سے ملت کا اجتماعی وجود گھائل ہو چکا ہے۔

عجمی تصوف :-

ملت کے وجود کو جن فتنوں نے نقصان پہونچایا ہے ان میں زیادہ خطرناک فتنہ عجمی تصوف کا ہے۔ عجمی تصوف دین و شریعت کے نظام میں ایک چور دروازے سے داخل ہوا۔ یہ بظاہر بڑا پاکیزہ تھا لیکن بباطن اس قدر زہریلا کہ اس کے برے اثرات صدیاں گزر جانے کے باوجود اب تک ملت کے جسم میں موجود ہیں۔

اقبالؒ کے نزدیک انسانی زندگی پیہم حرکت کا نام ہے جو زندگی حرکت نا آشنا ہے وہ موت ہے۔ زندگی اگر اسلام سے تحریک حاصل کرے تو وہ کامیاب زندگی ہے۔ اسلام ایک زبردست تحریکی قوت کا حامل ہے۔ زندگی کو ہمیشہ رواں دواں اور ہر دم جواں رکھتا ہے۔ وہ رہبانیت کا مخالف ہے کیونکہ اس میں حرکت نہیں اس کی معمولی سی پرچھائیاں بھی زندگی کو منجمد اور ساکن بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ لیکن عافیت پسند طبیعتوں کا رجحان ہمیشہ رہبانیت کی طرف رہا ہے انہوں نے کشمکش حیات کے جھمیلوں سے کترا کر اسی کے سائے میں تسکین حاصل کی ہے۔ رہبانیت چونکہ اسلام میں حرام حق کھلم کھلا اسلام میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے یہ نہایت مقدس روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ عجمی تصوف کا لبادہ اوڑھ کر، ذکر و اذکار، وظیفوں اور چلوں کے ایک پورے خاندان کے ساتھ آئی اور قرآن و حدیث کا غلط سہارا لے کر متعدد سلسلوں کا ایک عجیب نظام بنا ڈالا۔ اس نظام میں اس قسم کے چلوں اور اوراد و وظائف کی بھرمار ہے جن کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے شدت کیسا تھ ان خرابیوں کو محسوس کیا، چنانچہ اپنے ایک لیکچر میں جس کا عنوان ہی "عجمی تصوف اور اسلام" تھا وہ فرماتے ہیں —

"اس مروجہ تصوف کو اسلام کے سادہ قواعد اور عربی روح دین سے کوئی علاقہ نہیں اور اس کا بنیادی ستم یہ ہے کہ یہ خودی کو تباہ کرتا ہے حالانکہ خودی ہی ایک ایسی چیز ہے جو افراد و اقوام کی زندگی کی ضامن ہے اور انسان کو بلند ترین مادی اور روحانی مقامات پر پہونچانے کی کفیل ہے"

(مطالب اسرار و رموز از غلام رسول مہر ص۶)

ہمارے بزرگوں نے بنو امیہ کے دورِ استبداد میں احسان اور تصوف کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا وہ ہرگز خانقاہی نہ تھی بلکہ تحریکِ تجدید و احیائے دین کا ایک موثر ذریعہ تھی۔ اس تحریک نے اسلامی تاریخ میں حیرت انگیز کارنامے سرانجام دئے ہیں اور ہمیشہ جبر و استبداد کا مقابلہ کیا ہے۔ تصوف اور احسان کا اصلی منبع اہل بیت بتائے جاتے ہیں۔ سیدنا حسین سے لے کر حضرت نفس زکیہ تک کی پوری تاریخ پڑھ جائیے کہیں آپ کو ٹھنڈی اور سرد قسم کی ذہنیت نظر نہیں آئے گی۔ حضرت حسن بصری کو تصوف کا امام بتایا جاتا ہے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ یہ وہ شخصیت تھی جو حجاج بن یوسف جیسے جابر حکمران کے زمانے میں بھی تحریکِ اقامتِ دین کی کوشش جاری رکھے ہوئی تھی۔ یہ غزالی، یہ مجدد الف ثانی، یہ شاہ ولی اللہ، یہ معین الدین اجمیری، یہ عبدالقادر جیلانی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین جنہیں ہم اپنا امام اور قائد سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کون سے بزرگ ایسے ہیں جن کا تصوف تحریکی نہ تھا۔ جنہوں نے تصوف کی بنیاد دین کو قرآن و سنت اور صحابہ کے طرزِ عمل سے مختلف خطوط پر مرتب کیا ہو یا جن کے تصوف میں آج وہ فرار اور بے عملی پائی جاتی ہو، اس کا ہیولیٰ تعویذ، حرکت اور وقت کے منکرات سے گریز اور کشمکش نہ ہو۔ حقیقت یہی ہے کہ انہی بزرگوں کا تصوف اسلامی تصوف تھا اس میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کی تحریک تھی۔ اس تصوف نے بیعت کا جو نظام چلایا تھا اس کا منشا یہ نہ تھا کہ خانقاہوں کو آباد کرنا ہے بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ قابل قدر ائمہ و مجددینِ ملت کی مطلق العنان حکومت کی بیعت کو ناکافی سمجھتے اور جابر کے خلاف عوام کو منظم کر کے اسلام کے احیاء اور اقامت کے لئے ان کی تربیت کرتے تھے۔ اس کی درخشاں ترین مثال حضرت سید احمد بریلوی اور سید اسماعیل شاہ شہید رحمہما اللہ کے تصوف میں ملے گی یا پھر انیسویں صدی کی عسکری تحریک کے بزرگوں میں ملے گی جنہوں نے طرابلس (لیبیا) میں دین کی اقامت کی شمع روشن کی تھی ـــــــ لیکن بعد کے عافیت کوشوں نے اس تصوف سے تحریکی روح نکال لی اور اسے رہبانیت کا پیرہن بنا ڈالا۔ اس میں ہندو ویدانت کے ویدانتی فلسفہ سے لے کر یونانیوں کی اشراقیت تک کی ساری خرافات موجود ہیں۔ لیکن حاملِ یہی اگرچہ موجود نہیں تھا۔ اسلام کی روح موجود نہیں۔

تصوف کے اس عجمی ایڈیشن نے فرائض اور واجبات کو غیر اہم بنا ڈالا اور نوافل اور مستحبات کو فرض سے زیادہ اہمیت دے ڈالی۔ خدا کے دین کی وحدت کو شریعت، طریقت اور معرفت جیسے مختلف اور متضاد خانوں میں تقسیم کر ڈالا۔ دین کو سیاست سے الگ کیا گیا۔ امت کی سیاسی قیادت اور سربراہی خالصۃً دنیا پرستوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ عجمی تصوف کے حامیوں اور جابر حکمرانوں کے ناپاک اتحاد سے حق پرستوں کے لئے اور اقامتِ دین کا کام کرنے والوں کے لئے کام کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہو گیا اور معاشرہ دن بدن انحطاط کا شکار ہوتا گیا اور اہلِ حق انتہائی کمزور ہو گئے۔ معاشرہ تنزل اور انحطاط کے اس مقام پر پہنچ گیا کہ اسے تباہی کے گڑھے میں گرنے سے نہ دنیا پرستوں کی قیادت بچا سکی اور نہ منقرضین کی خانقاہی کرامات اسے حیات نو بخش سکیں۔

ملت کے اس دردناک انجام پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں :ـ

"جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جاتی ہے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جایا کرتی ہے۔ اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی، کاہلی اور شکست کو جو انہیں تنازع للبقاء میں ہو چکی ہوتی ہے چھپایا کرتی ہیں۔" (بحوالہ بالا صفحہ ۱۵)

اس بات کو اشعار میں اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں　　　بہانۂ بے عملی بن گئی شرابِ الست
فقیہِ شہر ...... پہ ہے مجبور　　　کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگِ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی　　　اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

؎ مستحب را فرض گردانیده اند — زندگی را عین قدرت دیده اند

؎ به بند صوفی و ملا اسیری — حیات از حکمت قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست — که از یٰسین او آساں بمیری

؎ ز من بر صوفی و ملا سلامے — که پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

اسلام میں عبادات خواہ فرائض و واجبات ہوں یا نوافل اور مستحبات، صرف دین کو مقبولوں میں جدین کی اقامت کے لئے ہوں۔ اگر یہ مقصد نہیں تو ان عبادات کا اسلام کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں۔ اقبال نے اس بات کو اپنے مخصوص پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے۔

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تصوف کے اس عام ہمرنگ دین سے بچنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری — کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی — یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری
فتنۂ عصری پر شیاطین ملوکیت میں ہے وہ ... جادو — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوق نخچیری

فتنۂ قادیانیت:-

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ "انسان سازی" کے اس عظیم کام کے لئے ملت کے اجتماعی وجود کی صحت و توانائی ضروری ہے۔ اس کی اس صحت اور توانائی کو نقصان پہنچانے والے فتنوں میں سب سے بڑا فتنہ جس سے ہند و پاک کے مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑا وہ نئی نبوت کا فتنہ تھا جس نے عقیدۂ ختم نبوت کے خلاف نبوت کے تسلسل کا نظریہ پیش کر کے اس پر ایمان لانے والوں کو ایک الگ امت کی حیثیت دے دی تھی یہ نئی امت مسلمانوں کو کافر کہنے اور انہیں مرتد ہونے والوں سے تشبیہ دینے کے باوجود مسلمانوں کے اجتماعی وجود سے چمٹے رہنے پر مصر تھی، اور اس نے امت مسلمہ کے اندر ایک نئی امت پیدا کر کے مسلمانوں کے لئے دہری مصیبت حال پیدا کر دی تھی جو کسی قائم شدہ حکومت کے اندر نئی حکومت ر

ے کے وجود میں آ جانے سے پیدا ہو جایا کرتی ہے اور دوسری طرف اس نے جہاد کی منسوخی کا فتویٰ دے کر امت کے جسم سے اس کی روح اور توانائی کشید کر لینے کی کوشش کی تھی۔

اقبال نے اس تحریک کے ان دونوں خطرناک پہلوؤں پر سخت گرفت کی ہے جیسا کہ لکھتے ہیں:—

"تاریخی طور پر اسلام کے اندر اٹھنے والا ہر وہ مذہبی گروہ جس کی بنیاد نئی نبوت کے دعوے پر رکھی گئی ہو اور جو اس نبوت کے نام نہاد الہامات پر ایمان نہ لانے والے تمام مسلمانوں کو کھلم کھلا کافر قرار دیتا ہو، ہر مسلمان کی نظر میں اسلام کی سالمیت کے لئے ایک زبردست خطرہ سمجھا جاتا ہے اور ایسا لازمی ہونا بھی چاہئے کیونکہ مسلم معاشرہ کا اتحاد و سالمیت صرف ایک ہی عقیدہ ختم نبوت سے محفوظ ہے۔"

اس بات کی مزید وضاحت اس طرح فرماتے ہیں۔

"سب سے پہلی بات جو پیش نظر رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام ایک ایسی مذہبی قومیت کا علمبردار ہے جس کے حدود کا تعین ہیں۔ اور وہ حدود یہ ہیں۔ (۱) اللہ کی وحدانیت پر ایمان (۲) تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان (۳) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان۔ مؤخرالذکر عقیدہ فی الحقیقت ایک ایسا عنصر ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ایک واضح خط امتیاز کھینچ دیتا ہے اور صرف اسی کی بنیاد پر ایک آدمی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کونسا گروہ یا فرد ملت میں شامل ہے اور کون نہیں؟ مثلاً برہمو سماج کو لیجئے یہ لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ کے انبیاء میں سے ایک نبی خیال کرتے ہیں لیکن ہم انہیں اسلام کا جزو نہیں سمجھتے اس لئے کہ وہ بھی قادیانیوں کی طرح وحی نبوت کے تسلسل کے نظریہ کے قائل ہیں اور حضور کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان نہیں رکھتے۔ میرے علم کی حد تک اسلام کے منسلیں فرقہ آج تک نہیں ہوا جس نے اس خط امتیاز کو پھاندنے کی کوشش کی ہو۔ ایران میں بہائیوں نے کھلم کھلا ختم نبوت کے عقیدے کو مسترد کیا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے صاف طور پر یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ ایک نئی ملت ہیں اور اصطلاحاً مسلمان نہیں۔ ہمارے عقائد کے مطابق اسلام بطور ایک دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی نازل کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے ایک ملت اور سوسائٹی کی حیثیت سے زندہ رہنے کا انحصار کلیتہً حضور کی ذات گرامی پر ہے میری رائے میں قادیانیوں کے لئے صرف دو ہی راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ سیدھی طرح بہائیوں کے طرز عمل کو اختیار کریں اور یا ختم نبوت کے عقیدے کو اس کے تمام مضمرات کے ساتھ قبول کریں۔ ان کی حیالانہ تاویلات دراصل ان کی محض اس خواہش کی بناء پر ہیں کہ واضح سیاسی مفادات کے حصول کے لئے وہ اپنے آپ کو ملت اسلامیہ کا ایک حصہ شمار کراتے رہیں"۔ (قادیانی مسئلہ از مولانا مودودی ص ۲۷۷ - ۲۷۸)

قادیانی تحریک کا دوسرا خطرناک ترین پہلو جہاد کی منسوخی تھا جیسا کہ اس تحریک کے بانی کی تحریر ہے:-

"آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا۔ خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا ہے اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں ہماری طرف سے امان اور صلح کاری کا سفید جھنڈا بلند کیا گیا"۔

(اربعین نمبر ۴ - بحوالہ قادیانی مذہب صفحہ ۴۹)

اسی طرح یہ اشعار بھی قادیانی مذہب میں الہام کا درجہ رکھتے ہیں:-

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال	دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے	دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نور خدا کا نزول ہے	اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد	منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(بحوالہ بالا صفحہ ۲۴۳)

نیز کہتے ہیں:-

"اسلام میں جہاد کا جو مسئلہ ہے میری نگاہ میں اس سے بدتر اسلام کو بدنام کرنے والا اور کوئی مسئلہ نہیں"

(از مرزا غلام احمد بحوالہ قادیانی مسئلہ صفحہ ۱۸)

قطع نظر اس بات کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح موعود کے بارے میں کیا فرمایا تھا اور قادیانی علم کلام نے اسے کیا بنا دیا ہے اقبال مرحوم بھی سمجھتے تھے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جہاد سے ملت کی زندگی وابستہ ہے جہاد کے بغیر یہ ملت زندہ نہیں رہ سکتی جہاد اگر ختم کر دیا جائے تو پورے کا

یا دین چیستاں بن کر رہ جائے۔ جیسا کہ پیر بدّی اپنے مرید سے کہتے ہیں سے

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ

مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ

علامہ اقبالؔ نے قادیانی تحریک کے اس پہلو پر بھرپور تنقید فرمائی۔

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

تعلیم اس کو چاہیئے ترکِ جہاد کی — دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر

باطل کی فال و فر کی حفاظت کے واسطے — یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے — مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات — اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے — غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیئے برگِ حشیش — جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

فتنہ تہذیبِ عصرِ جدید :۔

انسان سازی کے لیئے ملت کی اجتماعی شیرازہ بندی نہایت ضروری ہے جس طرح پانی کے بغیر مچھلی زندہ نہیں رہ سکتی بالکل اسی طرح ایک فرد اپنی خصوصیات کو ملت کے آزاد اجتماعی وجود کے بغیر برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ملت کے آزاد اجتماعی وجود کو نقصان پہونچانے والے فتنوں میں سے سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک فتنہ عصری تہذیب کا فتنہ ہے۔ اقبال نے جس طرح اس کا مقابلہ کیا ہے ان کے دور میں اس کی مثال مشکل ہی سے نظر آئے گی۔

عصری تہذیب کی عمارت خدا اور رسولؐ سے بیزاری کی بنیاد پر اٹھائی گئی تھی۔ اس تہذیب کا خالق اور معبود مادہ فرض کر لیا گیا۔ مادے کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ وہ نہ تخلیق کیا جا سکتا ہے اور نہ فنا ہو سکتا ہے گویا یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اس کا کوئی خالق نہیں بلکہ یہ خود ہی خالقیت کی صفات سے متصف ہے۔ خدا کوئی نہیں یہ ایک مفروضہ ہے جسے انسان نے اپنے فطری جذبۂ خوف کی تسکین کے لئے گھڑ لیا ہے۔ وحی و الہام کی کوئی حقیقت نہیں اور نہ کسی نبی کی ضرورت ہے۔ ڈارون نے زندگی کی ابتداء اور اس کے ارتقاء کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ اس نے زندہ رہنے اور زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے دو اہم اصول بتائے۔ ان میں سے ایک اصول بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا تھا اور دوسرا تنازع للبقاء (Struggle for existence) کا۔ تہذیبِ حاضر نے ان دونوں اصولوں پر بڑی وفاداری اور نہایت ہوشیاری سے عمل کیا۔ بقائے اصلح کے قانون سے یہ ہدایت ملی کہ زندہ اور باقی رہنے کا حق صرف اسے ہے جو اصلح یعنی فائق تر ہے۔ "اصلح" صرف وہ ہے جسے کسی نہ کسی طرح مادی وسائل میسر ہیں گویا زندگی کے مزے صرف وہ اٹھا سکتا ہے جو مادی اعتبار سے قوی ہے اور جو بدقسمتی سے کمزور ہے اسے زندہ رہنے کا ہرگز کوئی حق نہیں۔ انسانی معاشرے پر دریا کا قانون نافذ کر دیا گیا۔ جس طرح دریا میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جانا اپنا فطری حق سمجھتی ہے اسی طرح طاقت ور افراد یا قوموں کو یہ حق ہے کہ وہ قوموں کو دبائیں اور غلام بنائیں اور اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے جو ذریعے بھی وہ استعمال کریں بالکل بجا اور درست ہوگا۔

ڈارون کا یہ اصول ممکن ہے کہ حیاتیات کے طالب علموں کے لئے کوئی نادر دریافت ہوں لیکن اجتماعیات کے میدان میں ان اصولوں کی وجہ سے انسانی زندگی فساد سے بھر گئی کیونکہ انہوں نے زندہ رہنے کے لئے تنازع " [illegible] " کو ضروری قرار دیا یعنی "اصلح" بننے اور اپنے

آپ کو "اصلح" (survival of the fittest) ثابت کرنے کے لئے باہم جنگ و جدال ایک ناگزیر شے ہے۔ انہی اصولوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ
یہ سرمایہ دارانہ تہذیب اپنی مادی قوت کے بل بوتے پر "اصلح" بن گئی اور عالم انسانیت کے ایک بہت بڑے حصے کو غلام بنا کر اس میں بسنے والے کروڑ
انسانوں کے بنیادی انسانی حقوق سلب کر لئے اور دوسری طرف مختلف قوموں نے اپنے آپ کو "اصلح" ثابت کرنے کے لئے باہمی "تنازع" ۔۔۔۔ !
واضح الفاظ میں "جنگ" کی روش اختیار کر لی - اور تباہ کن ہتھیاروں کے بنانے اور جمع کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش کی
یہ اسی فلسفہ ہی کا نتیجہ تھا کہ اسلحہ بنیں اور اپنے آپ کو "اصلح" ثابت کرنے کی دوڑ میں انسانیت دو ہولناک جنگوں کا سامنا کر چکی ہے
جنگ کے خوف سے اس کے جسم پر لرزہ طاری ہے۔

تہذیب حاضر کی اصلیت کے اس تصور نے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جیسی بدنام ضرب المثل کو فلسفیانہ اور خالصۃً سائنسی طرز
سے مزین اور آراستہ کر کے اسے نہایت مدلل اور معقول بنا دیا ہے۔ اس کے لبادے میں چنگیزیت، آمریت اور ہٹلر کی نازیت کو خوب کھل کھیلنے کا موقع
ملا۔ جب انسانیت اس کے ہولناک نتائج سے تڑپ اٹھی تو جھٹ سے اس نے قومیت اور وطنیت کا لباس پہن کر "سلطانئ جمہور" کا راگ الاپنا شروع
کر دیا۔ لیکن سلطانئ جمہور کی اس قبا میں بھی "دیو استبداد" پائے کوبی کرنے لگا۔ جب اس مستبدانہ جمہوریت کے خلاف بھی انسانی ضمیر نے صدائے
احتجاج بلند کی تو اصلیت کا تمغہ حاصل کرنے کا ایک نیا فلسفہ گھڑ لیا گیا۔ کہا گیا اصلح وہ نہیں جس کے پاس سرمایہ یا مادی وسائل ہیں بلکہ اصلح وہ
یا وہ طبقہ ہے جو مظلوم ہے اور تعداد میں زیادہ ہے۔ مزدوروں اور غریب طبقہ کو "اصلح" بنانے کے لئے ایک عظیم فلسفہ تصنیف کیا گیا اور ایک
تاریخ گھڑ لی گئی۔

یہ بات تو بالکل سچ کہی گئی کہ تاریخ ایک میدان جنگ ہے اور اس میں اضداد کی کشمکش ہوتی رہتی ہے لیکن جس طرح ہیگل کی یہ بات غلط ہے
یہ ضدیں تصورات کی ہیں جو عصری روح کے بطن سے پیدا ہو ہو کر ______________ وقت
تصورات سے ٹکراتی رہتی ہیں یعنی ایک وقت کا دعویٰ (Thesis) اپنے مقابلہ کے لئے اپنے ہی اندر سے ایک جوابی دعویٰ ۔۔۔
(Antithesis) پیدا کرتا ہے۔ پھر ان دونوں میں غضب کا رن پڑتا ہے۔ جب یہ لڑ بھڑ کر تھک جاتے ہیں
تو ایک دوسرے کے انکسار سے "صلح" کر کے ایک مصالحتی فارمولا (Synthesis) گھڑ لیتے ہیں۔ پھر یہی "دعویٰ" بن جاتا ہے
اور اس کے بطن سے ایک دوسرا "جواب دعویٰ" جنم لیکر اس سے ٹکراتا ہے کچھ عرصہ کی رزم و پیکار کے بعد ایک اور مصالحتی فارمولا وجود میں آتا
ہے اسی طرح عصری روح اپنی ضد خود ہی پیدا کرتی ہے اور پھر اس سے باربار ٹکراتی اور کشمکش کرتی رہتی ہے اضداد کے اس پیہم تصادم ہی سے
"روح مطلق" اپنا ارتقاء کر رہی ہے . . . . انسان اس کشمکش سے نہ بھاگ سکتا ہے، نہ اسے روک سکتا ہے اور نہ اس میں
غیر جانب دار رہ سکتا ہے وہ اس میں حصہ لینے پر مجبور ہے کیونکہ "روح مطلق" یہ سارا ڈرامہ صرف اپنی ہی ذات کی تکمیل کے لئے رچا
رہی ہے ______________ بالکل اسی طرح مارکس کی یہ بات بھی سو فیصدی غلط ہے کہ تاریخ کے میدان میں کچھ معاشی اضداد ہیں جو
ٹکرا رہی ہیں - اور انہی کے ٹکراؤ سے تاریخ ترقی کر رہی ہے۔ یعنی جب "معاشی آلات" "حالات پیدائش" سے ٹکراتے ہیں اور ان میں باہمی ہم آہنگی اور
توافق ختم ہو جاتا ہے تو سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مزدوروں اور کارخانہ داروں میں، مزارعوں اور جاگیرداروں میں، آقاؤں اور غلاموں
میں اور عوام اور سرمایہ داروں میں باہم جنگ چھڑ جاتی ہے اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک حالات پیدا وار آلات پیدائش
سے مطابقت پیدا نہیں کر لیتے۔ اضداد کی یہ جنگ ازل سے ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک سرمایہ پرست طبقہ مٹ نہ جائے اور
کمانے والا کوئی طبقہ زندہ رہ سکا ہے آپ کو "اصلح" (survival of the fittest) ثابت نہ کر دیں یہ نیا فلسفہ غریبوں کو اصلیت کا
تمغہ عطا کرتا ہے اور انہیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ سرمایہ داروں کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ فتنہ، فساد اور تنازع کی

باریں اساس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک اصلیت کا حق حاصل کر کے دنیا میں مزید ڈھانچہ قائم نہ کریں۔ وہ پھر پورے عالم انسانیت کو راج میں تبدیل کر دیں۔

دور حاضر کے یہ مادی فتنہ محض فلسفہ اور نظریات کے فتنے نہیں بلکہ حکمران تہذیب کی فتنہ انگیز اور طاقتور تحریک ہے اس کی پشت پر زور دار لٹریچر، طاقتور ترین حکومتیں اور ایک عظیم الشان تمدن ہے۔ اس تحریک الحاد و مادیت نے اسلام اور امت کے اجتماعی وجود کو جس طرح نقصان پہنچایا ہے۔ اس سے کوئی بھی صاحب علم ناواقف نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے بارے میں کہا ہے سے

چہ عصر است این که دین فریادی اوست | ہزاراں بند در آزادی اوست
جہاناں را برآموز است این عصر | شب ابلیس را روز است این عصر
بدامانش مثال شعلہ پیچم | کہ بے نور است بے سوز است این عصر

مسلمان فقر و سلطانی بہم کرد | ضمیرش باقی و فانی بہم کرد!
ولیکن الاماں از عصر حاضر | کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد!

دین مادیت کی یہ صرف کا فکری تحریک نہیں بلکہ اس نے اپنے بطن سے کئی اور فسادی دور تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ وطنیت اور قومیت کی تحریکیں اسی سے پھوٹی ہیں اور دور حاضر کی آمریت، مغربی جمہوریت اور اشتراکیت کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ وہ بیک وقت ان سب سے ٹکراتے ہیں۔ دین مادیت کے بنیادی اصولوں اور معتقدات پر بھی بھرپور حملہ کرتے ہیں اور وطنیت، قومیت، آمریت، مغربی جمہوریت اور اشتراکیت کی فتنہ انگیزیوں کا مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ اقبال کے اس حملے کی تفصیل بیان کرنے کے لئے اس مقالے کا دامن ناکافی ہے۔ لیکن یہ حملہ اس زور کا تھا کہ اس دین کی برتری کا جادو ٹوٹنے لگا۔ اب یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ دین مادیت کا بڑے سے بڑا پرستار اقبال کا ایمانداری سے مطالعہ کرے اور پھر وہ اپنے نظریات اور معتقدات پر جما رہ سکے۔ اقبال کا یہ کام منفی نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے جہاں اس بے خدا تحریک کی تردید کی وہاں اس کے بالمقابل خالصۃً عقلی انداز میں مثبت فلسفہ بھی پیش کیا اور اس کی بنیاد پر پیدا ہونے والی خالصۃً اسلامی تحریک کی بنیادیں اور تفصیلی پروگرام بھی دیا۔

اگر دین مادیت نے خدا کا انکار کیا تو اقبال نے اس بات کو واضح کیا کہ ایک خدا کا انکار کر کے جدید تہذیب نے وطن، قوم، روح مطلق اور تاریخ کی بے بصر معاشی قوتوں کے کئی خدا بنا ڈالے اور ان اندھے اور بہرے خداؤں کے قدموں پر انسانیت کا خون بہا کر بھی دنیا میں امن پیدا نہ کر سکی اور اب یہ تہذیب بانجھ ہو چکی ہے۔ اس کی کوکھ میں اب کوئی نیا خدا نہیں کہ جسے جنم دے کر وہ مایوس اور مصیبت زدہ انسانیت کو چند دن اور بہلا سکے۔ کہتے ہیں سے

فکر انساں بت پرستے بت گرے | ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرح آذری انداخت است | تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب | نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند | پیش پائے ایں بت نا ارجمند

اگر دین مادیت نے روحانیت کا انکار کر کے زندگی کی زمام کار عقل کے سپرد کی تھی۔ تو اقبال نے یہ بات ثابت کر دی کہ یہ عقل زندگی کے لئے ناکافی ثابت ہوتی ہے اور انسانیت کی شب تاریک کو سحر پیدا نہیں کر سکی۔ کہتے ہیں کہ سے

اک دانش نورانی اک دانش برہانی | ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

اسی دانش برہانی سے انسانیت کو جو سکھ اور چین نصیب ہوا ہے۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد — زیر گردوں رسم لادینی نہاد
مشکلات حضرت انساں ازوست — آدمیت را غم پنہاں ازوست

پھر وہ عقل گزیدہ انسان کو خطاب کر کے سمجھاتے ہیں ؎

ہر چہ می بینی ز انوار حق است — حکمت اشیاء ز اسرار حق است
ہر کہ آیات خدا بیند حُر است — اصل ایں حکمت ز حکم اُنظر است

اگر دین مادیت نے زندگی کی بقا کے لئے "اصلحیت" (Survival of the fittest) کی شرط عائد کی تھی تو اقبال نے اسے ناکافی قرار دیا کہ زندگی کی بقا کے لئے "اصلح" ہونا ہرگز لازمی شرط نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ "انفع" ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ باغ میں صرف انہی پودوں کو باقی رہنے دیا جاتا ہے جو اس کے لئے مفید اور منفعت ہوتے ہیں اور جو اس کے لئے مفید نہیں ہوتے انہیں کاٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ فرعون باوجود "اصلح" ہونے کے اپنے آپ کو نیل کی موجوں سے نہ بچا سکا۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل باوجود کمزور ہونے کے چونکہ "انفع" تھے۔ اس لئے زندہ رہ گئے۔ زندگی اس وقت تک موجود رہتی ہے جب تک اس میں نفع کا پہلو غالب ہو اور بگاڑ کے بجائے "بناؤ" کی صلاحیت پائی جاتی ہو۔ جونہی اس سے یہ خصوصیت ختم ہوتی ہے تو اس سے زندگی کی متاع چھین لی جاتی ہے۔

کسی فرد یا گروہ کے زندہ رہنے کا دارومدار اس کی انفرادی یا اجتماعی خودی پر ہے۔ خودی جتنی طاقتور ہوگی اتنی ہی زندگی ارتقاء کے معراج پر ہوگی اور خودی جتنی کمزور ہوگی اتنی ہی یہ پستی اور تنزل کا شکار ہوگی۔ اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کا وجود خودی کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔ پانی کا قطرہ جب خودی کا حرف حفظ کر لیتا ہے تو وہ اپنے بے حقیقت وجود کو موتی بنا لیتا ہے۔ شراب کی خودی کمزور ہے اس کی اپنی کوئی شکل نہیں۔ وہ ہر پیالے اور ظرف کا احسان گوارا کر لیتی ہے۔ اور اسی کی شکل میں ڈھل جاتی ہے جب خودی زندہ رہنے کی قوت بہم پہنچا لیتی ہے تو زندگی کی ندی بیکراں سمندر پیدا کر لیتی ہے ؎

چوں خودی می آورد نیروئے زیست — می کشاید قلزمے از جوئے زیست
خودی را از وجود حق وجودے — خودی را از نمود حق نمودے
نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر — کجا بودے اگر دریا نبودے

اگر دین مادیت نے زندہ رہنے کے لئے "تنازع" ضروری قرار دیا تھا تو اقبال نے اس کے ساتھ "توافق" پر بھی زور دیا تھا۔ انہوں نے بڑی مچھلی کا یہ حق ہرگز تسلیم نہیں کیا کہ وہ چھوٹی مچھلی کو نگل جائے۔ اس کے برعکس ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک انسانی معاشرے میں انسانوں کا باہمی تعلق ویسا ہی ہونا چاہئے جو عام طور پر بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی کے ساتھ ہوتا ہے اس معاشرے کا بنیادی وصف تعاون اور توافق ہے اور یہی اصول خود کائنات کے تکوینی نظام میں کارفرما ہے۔ کائنات کا سارا نظام، تاروں اور سیاروں کا یہ سارا نظام اسی جذب و کشش اور باہمی توافق و تعاون کے قانون اور قاعدے کا پابند ہے۔ "اگر ذرے کا دل چیریں تو خورشید سے ہو سکتا ہے" اگر تنکا ہل جائے تو سارا نظام شمسی لرز اٹھتا ہے اگر یتیم آہ بھرے تو عرش الٰہی ہل جاتا ہے۔ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، بھائی کا ایثار، اور بہن کا خلوص سب اسی قانون کے آئینہ دار ہیں گویا "جہاد زندگانی" میں "یقین محکم" اور "عمل پیہم" کے ساتھ ساتھ "محبت فاتح عالم" کا ہونا ضروری ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اسی اصول کی روشنی میں یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسانی معاشرہ کے لئے نہ تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول بہتر ہے اور
حق ہے کہ وہ بڑی مچھلی کی طرح چھوٹی مچھلی کو نگل جائے بلکہ اس کے بجائے حق و انصاف ، ہمدردی اور تعاون اور انس اور محبت کا
ن بہتر ہے ۔

اگر دین مادیت نے تاریخ کو اضداد کی جنگگاہ قرار دیا تھا اور اس میں معاشیات کی بے شعور قوتوں کو باہم ٹکراتے ہوئے دیکھا تھا تو اقبال نے کہا
مادی معاشیات کی نہیں بلکہ حق و باطل ، معروف و منکر ، سچ اور جھوٹ سنت اور بدعت کی شعوری قوتیں ہیں اور تاریخ کا سارا ہنگامہ
ن کی باہمی رزم و پیکار کا مرہون منت ہے ۔ تاریخ کے اس فلسفے کو اقبال نے صرف ایک شعر میں بیان فرمایا ہے ، کہتے ہیں ؂

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

حق و باطل کی یہ تاریخی کشمکش تاریخ انسانیت کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے اس دنیا کا وجود اسی کشمکش کی وجہ سے قائم ہے ،
یہ کشمکش ختم ہوئی تو اسی وقت یہ دنیا بھی ختم ہو جائے گی اور اس کے کھنڈرات پر دو اور دنیاؤں کو آباد کیا جائے گا ایک وہ جس میں صرف حق
ہوگا یعنی عالم بہشت اور دوسری وہ جس میں باطل کو قید کرکے اس میں جلایا جائے گا ۔ یعنی عالم دوزخ !!

اگر دین مادیت کے پرستاروں نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ تاریخ میں صرف ارتقاء ہی ارتقاء ہے اس میں ہر چیز بدلتی رہتی ہے ۔ مذہب ،
ن اور انسانی قدریں ہر آن متغیر ہوتی رہتی ہیں اور ان کی حیثیت محض اور اضافی ہے ہر نئی چیز قابل تسلیم اور ہر پرانی چیز قابل ترک ہے اقبال اس
انہیں وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تاریخ کا بنیادی وصف ارتقاء نہیں بلکہ "تکرار" ہے ۔ جس طرح دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن
ہے ۔ بالکل اسی طرح تاریخ کے میدان میں کبھی ابراہیم اور نمرود ظاہر ہوتے ہیں تو کبھی موسیٰ اور فرعون ۔ کبھی شرار بولہبی سے چراغ مصطفوی کی
زہ کاری ہوتی ہے تو کبھی کربلا میں حسینؓ و یزید برسر پیکار نظر آتے ہیں ۔ غرض اس جنگ کی نوعیت اور حقیقت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں ہوتی
ن اقدار اضافی اور ہر آن بدلنے والی نہیں بلکہ یہ مستقل اور مستحکم ہیں ۔ وہی غزنوی اور سومنات جیسے پہلے تھے آج بھی موجود ہیں ۔ بلاشبہ اس
ن کی ٹیکنک بدلی ہے ۔ لڑائی کے ہتھیاروں کی دریافت اور ایجاد میں ارتقاء ہوا ہے ۔ لیکن لڑنے اور ٹکرانے والی قوتیں وہی ہیں ۔ یہ کہانی ہمیشہ
رہتی ہے صرف کردار بدلتے رہتے ہیں ؂

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے ۔ وہی فطرت اسداللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

شبے بہ میکدہ خوش گفت پیر زندہ دلے ۔ بہ ہر زمانہ خلیل است و آتش نمرود

ل کی سب سے بڑی تمنا تھی کہ حق و باطل کی یہ کشمکش سرزمین پاک و ہند میں بھی چھڑ جائے چنانچہ کہتے ہیں ؂

کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں ۔ بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں ۔ گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

قبال اپنے آپ کو "چراغ مصطفویؐ" کا امین سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں اس دور جدید کے "شرار بولہبی" سے ٹکرا رہا ہوں چنانچہ فرماتے ہیں ؂

گہے انتم گہے مستانہ خیزم ۔ چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم
نگاہے التفاتے بر سر بام ۔ کہ من با عصر خویش اندر ستیزم

پھر مسلمانوں سے خطاب کرکے کہتے ہیں ؂

میا ما بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیزاست
بدریا غلط و با موجش در آویز — حیات جاوداں اندر ستیزاست

تہذیب جدید کی ہلاکت خیزیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو اُکساتے ہیں اور کہتے ہیں سے

اے کہ جاں را باز می دانی زتن — سحرایں تہذیب دینی شکن
اے اسیر رنگ، پاک از رنگ شو — مومن خود، کافر افرنگ شو
ایں کہن اقوام را شیرازہ بند — رایت صدق و صفا را کن بلند
اہل حق را زندگی از قوت است — قوت ہر ملت از جمعیت است
اے امین دولت تہذیب دیں — آں ید بیضاء بر آر از آستیں
خیزو از کار امم بکشا گرہ — نشئہ افرنگ را از سر بنہ

پھر ارشاد ہوتا ہے سے

غریب شہر ہوں میں سن تو لے میری فریاد — کہ تیرے سینے میں ہوں قیامتیں آباد

لیکن یہ "قیامتیں" کیسے آباد ہوں۔ حق و باطل کی یہ "بزمانہ ستیزہ" کشمکش کیسے شروع ہو؟ امت کی شیرازہ بندی کس طرح کی جائے۔ لادینی تہذیب کا سحر کیونکر توڑا جائے اور "ید بیضاء" سے نشئہ افرنگ کا سر کیسے کچلا جائے۔ . . . . یا واضح تر الفاظ میں . . . . اعلاء کلمتہ اللہ اور شہادت حق کی تحریک کن بنیادوں پر اٹھائی جائے۔

یہ وہ سوال ہے جس کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہمیں اقبال مرحوم کی شہرہ آفاق تصنیف اسرار خودی اور رموز خودی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس میں انہوں نے وہ ضروری بنیادیں تفصیل سے بیان فرمائی ہیں جن میں اقامت دین کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔

ہر قسم کے سوتی دھاگے کیلئے ہمیشہ
اٹونیا برانڈ کو یاد رکھیے
THE
ETONIA
MADE BY
SULTAN INDUSTRIES LTD.

خیابان خیابان

نا قریشی :—

نہ پھر میخانے میں آیا اور نہ دورِ جام ہوا
ے میں نے کی تھی ساقی کیوں بدنام ہوا
پیرِ مغاں کے اُٹھتے ہی ہنگامۂ ہستی عام ہوا
ہونے کو ہے اب میکدہ ویراں صبح ہوا یا شام ہوا
نیک مزاج ستمگر کون ہے آج زمانے میں
ی جور سے کی ہے توبہ اور بھی قتلِ عام ہوا
صحبتِ رنداں بھی ہوتی تھی اتنی باعثِ رسوائی
جتنا اہلِ دیر و حرم میں بیٹھ کے میں بدنام ہوا
ساں کے دل میں ہے پنہاں جنت ہو کہ جہنم ہو
نظ ظاہر میں کیا جانے کس کا کیا انجام ہوا
دل کی بدولت کیا کیا بیتی مجھ پہ کیفی آہ نہ پوچھ
عشق کیا، بدنام ہوا، برباد ہوا، ناکام ہوا

غا گوالیاری :—

ہونے کو تو یوں شام بھی ہوتی ہے سحر بھی
لیکن کسی صورت سے ہو تسکین نظر بھی
ہم اپنی تباہی پہ ذرا غور تو کر لیں
کیا ظلم ہے اے گردشِ ایام ٹھہر بھی
ہاں! ذوقِ طلب، سوزِ یقیں، جذبۂ کامل
جب عزمِ سفر ہے تو ہو کچھ رختِ سفر بھی
آیا ہوں سُنانے کو وہاں غم کی کہانی
ہو جاتے ہیں ناکام جہاں دیدۂ تر بھی
آئی ہے شفاؔ شعر نگاری میں وہ منزل
ہو جاتا ہے بے رنگ جہاں خونِ جگر بھی

نسیم شاہجہانپوری :—

کھلے ہوئے ہیں شگوفے مگر بہ دیدۂ تر
بہار بھی ہے چمن میں خزاں کے زیرِ اثر
وہ تیری زلف کی شب ہو کہ تیرے رُخ کی سحر
ہر اک جلوہ ہے میری نظر میں حدِ نظر
نہ کوئی وعدہ و پیماں، نہ کوئی عہد مگر
لگی ہوئی ہے نظر شام ہی سے جانبِ در
نہ جانے راہ میں گم ہو گیا کہاں رہبر
کیا جو غور تو تنہا ہمیں تھے منزل پر
چمن میں لاکھ نشیمن سہی، یقیں ہے مگر
گرے گی برق ہمارے ہی آشیانے پر
بتا رہی ہیں مرے دل کی دھڑکنیں مجھ کو
گزر رہی ہے جو کچھ کائنات کے دل پر
قدم قدم پہ یہ رُک رُک کے سوچتا ہوں میں
• یہ ابتدائے سفر ہے کہ انتہائے سفر
نسیمؔ شب کے چراغوں کو یونہی جلنے دو
کہ اعتبار کے قابل نہیں نمودِ سحر

سہیل اختر :—

گزری تمام عمر، مگر کائناتِ دل
کچھ دوستی کے گھاؤ ہیں کچھ دشمنی کے زخم
اے دوست آ بھی جا کہ ترے انتظار میں
لو دے اُٹھے ہیں لب پہ مرے تشنگی کے زخم
عقل و شعور کی شبِ تاریک میں سہیلؔ
قندیلِ راہِ شوق بنے گمرہی کے زخم

عنوان چشتی ؛

احساسِ کرب، ذہن کی تنویر چھین لے
وہ کون ہے جو ہم سے یہ جاگیر چھین لے

پھٹ جائے چاہے نامۂ تقدیر کی طرح
دستِ عدو سے دوست کی تحریر چھین لے

یہ جس کے ہاتھ میں ہے اسی کی رفیق ہے
موقع ہے اب حریف سے شمشیر چھین لے

اخلاق کی نگاہ میں نادیدنی سہی
عریاں ہے اب سماج کی تصویر چھین لے

یہ ارتباطِ بلبل و نرگس بھی خوب ہے
دشمن کے ساتھ دوست کی تصویر چھین لے

عنوان پھر پلٹ کے یہ شاید نہ آسکے
اٹھ اور بہارِ رفتہ کی تصویر چھین لے

محمود سعیدی ؛

بیانِ شوق پہ مائل وہ کم نظر ہوں گے
جو ضبطِ شوق کی لذّت سے بے خبر ہوں گے

لذیذ ہو تو حکایت دراز ہوتی ہے
ہم اہلِ غم کے فسانے تو مختصر ہوں گے

ملے گی عشق کی ان میں بھی کارفرمائی
وہ حادثے جو کسی اور نام پر ہوں گے

یہ کہکشاں ترے قدموں کی دھول ہے شاید
یہ مہر و مہ مرے ذرّاتِ رہگذر ہوں گے

پہونچ ہی جائے گی ان تک حکایتِ شبِ غم
نسیم صبح کے جھونکے پیامبر ہوں گے

ہمیں تو ہیں تری رفتارِ ناز کے مارے
ہمیں کبھی مہ و انجم کے ہم سفر ہونگے

اب ان کا ذکر مری گفتگو میں ہے محمود
اب اعتراض مری بات بات پر ہونگے

شفقت کاظمی ؛

کیا اٹھاتے کسی کا احساں ہم
تھے گھڑی دو گھڑی کے مہماں ہم

عشقِ رفتہ کی یاد کیا آئی
ہو گئے اور بھی پریشاں ہم

اپنی قسمت تھی اپنی رسوائی
کیا کریں اب تجھے پشیماں ہم

اے غمِ دوست! شکریہ تیرا
یاد رکھیں گے تیرے احساں ہم

جس نے دردِ حیات حیات بخشا ہے
چاہتے ہیں اسی سے درماں ہم

کاظمی ذکر کیا زمانے کا
تھے خود اپنے سے بھی گریزاں ہم

ماشاء اللہ خاں جوہر ؛

کون مجبورِ محبت تری محفل سے اٹھا
اٹھ بھی جائے تو زمانہ پوچھے کہ کس دل سے اٹھا

حیرتِ دیدۂ مشتاق کا عالم توبہ
آئینہ بن کے اٹھا جو تری محفل سے اٹھا

ہائے وہ کشتی جو گرداب سے بچ کر نکلی
اُف وہ طوفانِ بلاخیز جو ساحل سے اٹھا

سایۂ گل میں ذرا دیر ہی سویا ہوگا
آہ وہ سبزہ کہ جو شورِ عنادل سے اٹھا

التفاتِ نگہِ غیر کا احسان نہ لے
لطف اٹھانا ہے تو پھر اپنے غمِ دل سے اٹھا

ملتفت ہو کے کسی غیر نے دیکھا مری سمت
یعنی اور دھواں آج مجھے دل سے اٹھا

یاد آیا ہمیں انجامِ مسرت جوہر
مسکرایا کوئی غنچہ تو دھواں دل سے اٹھا
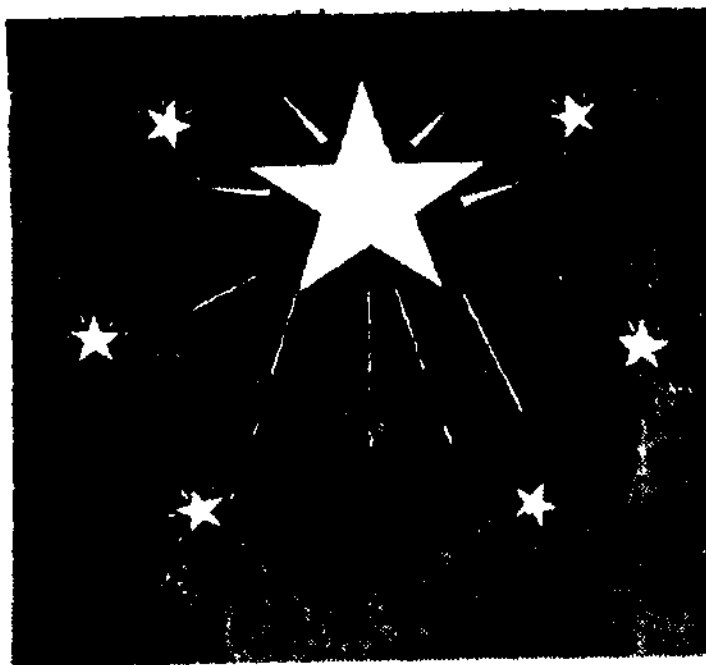
تفہیم القرآن جلد چہارم از:- سید ابوالاعلیٰ مودودی ، ضخامت ۶۸۴ صفحات ، سورۂ لقمٰن سے الاحقاف تک ! (سہا یبار جلد
نقاشی ، سرورق رنگین دیدہ زیب) ہدیہ چھبیس ۲۶ روپے ،

ملنے کا پتہ :- مکتبہ تعمیر انسانیت گوجر گلی ، موچی دروازہ ، لاہور ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام ، اُن کی شخصیت اور اُن کے علمی و دینی کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ، موصوف کے بارے میں
کہا جائے کہ وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں ، تو یہ بات مبالغہ آمیز نہ ہوگی ! ان کی تفسیر "تفہیم القرآن" بھی غیر معمولی شہرت حاصل کر چکی ہے ، اس کی
جلدیں ہزاروں کی تعداد میں شائقین کے ہاتھوں میں پہونچ چکی ہیں ! اب کئی سال کے انتظار کے بعد چوتھی جلد منظر عام پر آئی ہے ! مولانا موصوف حق گو
جرم میں بار بار جیل جاتے رہتے ہیں اس سے ان کے کاموں میں کھنڈت اور خاص طور سے "تفہیم القرآن" کی ترتیب و تسوید میں فترت واقع ہو جاتی ہے ، د
جو مولانا موصوف کی تحریر و نگارش کے شیدائی ہیں ، اُن کو یہ بات بہت زیادہ شاق گزرتی ہے کہ قید و بند کے دوران مولانا کی تازہ بہ تازہ تحریر وا
رہ محروم رہ جاتے ہیں !

"تفہیم القرآن" کی تین جلدوں کی کتابت ، طباعت اور اشاعت کا اہتمام شیخ قمر الدین صاحب نے کیا تھا ، جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہ
مگر تقریباً دو سال سے وہ بیمار ہیں ، چوتھی جلد کی تیاری کا کریڈٹ اُن کے عزیز اور شریک کار شیخ عبدالحمید صاحب کو ملنا چاہئے کیونکہ چوتھی جلد اُن کی
روز کی محنت و عرق ریزی کے سبب گیٹ اپ کے اعتبار سے گزشتہ جلدوں پر فوقیت لے گئی ۔

اس جلد میں چھ ۶ نقشے ہیں :-

(۱) عہد نبوی میں قبائل عرب کے علاقے (۲) جنگ احزاب (۳) وہ یہودی ریاست جس کا خواب اسرائیلی لیڈر دیکھ رہے ہیں (۴) حقیقی مسیح
نزول کا مقام (۵) صحرائے الاحقاف اور (۶) وادی نخلہ ——— کتاب کا آخری حصہ فہرست موضوعات پر مشتمل ہے ، یہ انڈکس بڑی محنت ا
دیدہ ریزی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے ، چند عنوانات :-

ابراہیم علیہ السلام ——— احسان ——— اسلامی نظام معاشرت ——— اصحاب الایکہ ——— اللہ ——— اُم الکتاب ———
برزخ ——— توکل ——— جنگ بنی قریظہ ——— زندگی بعد موت ——— (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ———
نامۂ اعمال ——— ہجرت !!

ہر سورۃ کے آغاز میں ، اُس کی وجہ تسمیہ ، زمانۂ نزول اور سورۃ کے موضوع و مضمون کو پیش کیا گیا ہے ، تاکہ قاری پہلے سے باخبر ہو جائے کہ
جس سورۃ کی وہ تلاوت کرنے والا ہے ، اُس کا کیا موضوع ہے اور اس میں کن مضامین کو بیان کیا گیا ہے ، مثلاً "المومن" کے تعارف کا اقتباس :-

- ان دو گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی معاشرے میں موجود تھا، اور وہ اُن لوگوں کا گروہ تھا جو دل میں جان چکے تھے کہ حق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ ہے اور کفار قریش سراسر زیادتی کر رہے ہیں، مگر یہ جان لینے کے باوجود وہ خاموشی کے ساتھ حق و باطل کی اس کشمکش کا تماشا دیکھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر اُن کا ضمیر جھنجوڑا ہے اور اُنہیں بتایا ہے کہ جب حق کے دشمن علانیہ تمہاری آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ظالمانہ اقدام کرنے پر تُل گئے ہیں تو حیف ہے تم پر اگر اب بھی تم بیٹھے تماشا ہی دیکھتے رہو، اس حالت میں جس شخص کا ضمیر بالکل نہ مر چکا ہو، اُسے اُٹھ کر وہ فرض انجام دینا چاہیے جو فرعون کے بھرے دربار میں اس کے اپنے درباریوں میں سے ایک راستباز آدمی نے اُس وقت انجام دیا تھا۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ کو قتل کرنا چاہا تھا، جو مصلحتیں تمہیں زبان کھولنے سے باز رکھ رہی ہیں یہی مصلحتیں اُس شخص کے آگے بھی راستہ روک کر کھڑی ہوتی تھیں مگر اس نے افوض امری الی اللہ کہہ کر ساری مصلحتوں کو ٹھکرا دیا اور اس کے بعد دیکھ لو کہ فرعون اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔" (صفحہ ۳۸۹)

- .... اس سلسلہ میں کفار کو پے در پے تنبیہات کی گئی ہیں کہ اگر اللہ کی آیات کے مقابلہ میں مجادلہ کرنے سے باز نہ آؤ گے، تو اُسی انجام سے دوچار ہو گے جس سے پچھلی قومیں دوچار ہو چکی ہیں اور اس سے بدتر انجام تمہارے لئے آخرت میں مقدر ہے، اس وقت تم پچھتاؤ گے مگر اس وقت کا پچھتانا تمہارے لئے کچھ بھی نافع نہ ہوگا" (ص ۳۹۰)

اردو میں قرآن کریم کے متعدد ترجمے اور تفسیریں موجود ہیں، اُن کے ہوتے ہوتے مولانا مودودی نے اتنی عظیم ذمہ داری کی جرأت کیوں کی؟ جواب آپ کو مولانا کے "ترجمہ" اور تفسیر کے اقتباسات اور نمونوں سے ملے گا:—

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ .... (لقمان — رکوع ۱۱)

- اگر وہ دونوں تجھ سے لڑیں ...... (شاہ عبدالقادرؒ)
- اگر وہ تجھ سے اڑیں اس بات پر کہ شریک مان میرا۔ (شیخ الہند مولانا محمود حسین)
- اگر وہ تیرے در پے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے۔ (مولانا فتح محمد جالندھری)
- اور اگر تجھ پر وہ دونوں اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھیرا (مولانا اشرف علی تھانوی)
- اور اگر وہ دونوں تجھ پر اس کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھیرائے۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی)
- لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرے۔ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ۔ (لقمان)

- اور جو کوئی تابع کرے اپنا منہ اللہ کی طرف۔ (شاہ عبدالقادرؒ)
- ایضاً (شیخ الہند)
- اور جو شخص اپنے تئیں خدا کا فرمانبردار کر دے (فتح محمد جالندھری)
- اور جو شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے (مولانا تھانوی)
- اور جو کوئی اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے (مولانا دریابادی)
- جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے۔ (مولانا مودودی)

---

[1] یہ اُن آیتوں کا ایک جزو ہے جن میں والدین سے حسنِ سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ..... (لقمان)

- تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بٹھاتا ہے رات کو دن میں اور بٹھاتا ہے دن کو رات میں (شاہ عبدالقادر)
- تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں (شیخ الہند)
- کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور (وہی) دن کو رات میں داخل کرتا ہے (فتح محمد جالندھری)
- اے مخاطب کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے (مولانا تھانوی)
- کیا تو نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ رات کو داخل کرتا رہتا ہے دن میں اور دن کو داخل کرتا رہتا ہے رات میں۔
(مولانا دریابادی)
- کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا آتا ہے اور دن کو رات میں (مولانا مودودی)

وَقَالُوا أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ .... (السجدہ)

- جب ہم رُل گئے زمین میں (شاہ عبدالقادر)
- ایضاً (شیخ الہند)
- جب ہم زمین میں ملیا میٹ ہو جائیں گے (فتح محمد جالندھری)
- جب ہم زمین میں نیست نابود ہو گئے (مولانا دریابادی)
- جب ہم مٹی میں رَل مل چکے ہوں (مولانا مودودی)

وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا (الاحزاب)

- وہ لڑائی میں نہیں آتے مگر کبھی (شاہ عبدالقادر)
- وہ لڑائی میں نہیں آتے مگر کبھی (شیخ الہند)
- وہ لڑائی میں نہیں آتے مگر کم (مولانا جالندھری)
- وہ لڑائی میں بہت کم آتے ہیں (مولانا تھانوی)
- یہ لوگ لڑائی میں تو بس نام ہی کو آتے ہیں (مولانا دریابادی)
- جو لڑائی میں حصہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو (مولانا مودودی)

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا (الاحزاب)

- اور پھیر دیا اللہ نے منکروں کو اپنے غصہ میں بھرے ہاتھ نہ لگی کچھ بھلائی (شاہ عبدالقادر)
- ایضاً (شیخ الہند)
- اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان کے غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کی کچھ مراد بھی پوری نہ ہوئی (مولانا تھانوی)
- اور جو کافر تھے ان کو خدا نے پھیر دیا وہ اپنے غصے میں (بھرے ہوئے تھے) کچھ بھلائی حاصل نہ کر سکے۔ (فتح محمد جالندھری)
- اور اللہ نے کافروں کو اس غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کے کچھ بھی نہ ہاتھ لگا۔ (مولانا دریابادی)
- اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا وہ کوئی فائدہ حاصل کئے بغیر اپنے دل کی جلن لئے یوں ہی پلٹ گئے۔
(مولانا مودودی)

تحیتھم یوم یلقونہ سلٰم (الاحزاب)

- وعا اُن کی جس دن اُن سے ملیں گے سلام ہے۔ (شاہ عبدالقادر)
- ایضاً (شیخ الہند)
- جس روز وہ اُس سے ملیں گے، اُن کا تحفہ (خدا کی طرف سے) سلام ہوگا۔ (فتح محمد جالندھری)
- وہ جس روز اللہ سے ملیں گے، تو اُن کو جو سلام ہوگا وہ یہ ہوگا کہ السلام علیکم (مولانا تھانوی)
- جس روز وہ اُس سے ملیں گے انہیں (دعا دی جائے گی) سلام ہے (مولانا دریابادی)
- جس روز وہ اُس سے ملیں گے ان کا استقبال سلام سے ہوگا (مولانا مودودی)

یقولُ الذین استضعفوا للذین استکبروا لولا انتم لکنا مومنین (سبا)

- کہتے ہیں جن کو کمزور سمجھا تھا بڑائی کرنے والوں کو، اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایماندار ہوتے (شاہ عبدالقادر)
- کہتے ہیں وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے بڑائی کرنے والوں کو اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایماندار ہوتے (شیخ الہند)
- چنانچہ ادنیٰ درجہ کے لوگ بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ ہم (تمہارے سبب برباد ہوئے) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آئے ہوتے۔ (مولانا تھانوی)
- ادنیٰ درجہ کے لوگ بڑے لوگوں سے کہہ رہے ہوں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آتے (مولانا دریابادی)
- جو لوگ کمزور سمجھے جاتے تھے وہ بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن بن جاتے (مولانا جالندھری)
- جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ (مولانا مودودی)

وقد کفروا بہ من قبل ویقذفون بالغیب من مکان بعید (سبا)

- اور اس سے منکر ہو رہے آگے سے اور پھینکتے رہے ہیں بن دیکھے نشانہ پر دور جگہ سے (شاہ عبدالقادر)
- اور اس سے منکر رہے پہلے سے اور پھینکتے رہے بن دیکھے نشانہ پر دور جگہ سے (شیخ الہند)
- حالانکہ پہلے سے (دنیا میں) یہ لوگ اس کا انکار کرتے رہے اور بے تحقیق باتیں دور ہی سے ہانکا کرتے تھے (مولانا تھانوی)
- اور پہلے سے تو اس کا انکار کرتے رہے اور بن دیکھے دور ہی سے (ظن) کے تیر چلاتے رہے (مولانا فتح محمد جالندھری)
- درآنحالیکہ پہلے سے یہ لوگ اس (حق) کا انکار کرتے رہے اور بے تحقیق باتیں دور ہی سے ہانکا کرتے تھے (مولانا دریابادی)
- اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلا تحقیق دور دور کی کوڑیاں لایا کرتے تھے۔ (مولانا مودودی)

مایملکون من قطمیر (فاطر)

- مالک نہیں ایک چھلکے کے (شاہ عبدالقادر)
- وہ تو کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کی برابر اختیار نہیں رکھتے (مولانا تھانوی)

دوسرے مفسرین و مترجمین نے بھی "قطمیر" کا ترجمہ "کھجور کی گٹھلی کا چھلکا" ہی کیا ہے۔

- وہ ایک پرِ کاہ کے بھی مالک نہیں ہیں (مولانا مودودی)

لے اردو میں ایماندار مومن کو نہیں اُس آدمی کو کہتے ہیں جو لین دین میں قابلِ اعتماد اور معاملہ کا سچا ہو۔ اس سے ایما مناسب نہیں ہے۔

اس ترجمہ

پر انہوں نے نوٹ دیا ہے کہ ــــ اصل میں لفظ "قطمیر" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ پتلی جھلی ہے، جو کھجور کی گٹھلی پر ہوتی ہے لیکن اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ مشرکین کے معبود کسی حقیر سے حقیر چیز کے بھی مالک نہیں ہیں، اس لئے ہم نے لفظی ترجمہ چھوڑ کر مرادی ترجمہ کیا ہے۔

"والذین سعوفی اٰیٰتنا معٰجزین ....." (سبا)

کا تمام مترجمین نے ترجمہ "ہماری آیتوں کے ہرانے کو" کیا ہے ــــ مگر مولانا مودودی نے اس کی ترجمانی ان لفظوں میں کی ہے ــــ

"اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لئے زور لگایا ہے"

ان کانت الا صیحۃ واحدۃ ..... (یٰس)

میں "صیحہ" کا ترجمہ مترجمین نے "چنگھاڑ" یا "سخت آواز" کیا ہے، مگر مولانا مودودی نے اس کی ترجمانی یوں کی ہے ــــ

"بس ایک دھماکا ہوا اور یکایک وہ سب بجھ کر رہ گئے"

اسی طرح ایک دوسری آیت ــــ

"ماینظرون الا صیحۃ واحدۃ تاخذھم وھم یخصمون (یٰس)

میں "تاخذھم" کا ترجمہ مترجمین نے "آپکڑے گی" کیا ہے، مثلاً مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کا یوں ترجمہ فرمایا ہے۔

- ــــ یہ لوگ بس ایک آواز سخت کے منتظر ہیں، جو اُن کو آپکڑے گی اور وہ سب باہم لڑ جھگڑ رہے ہونگے۔"

ــــ اور مولانا مودودی ــــ

- ــــ دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکا ہے جو یکایک انہیں عین اس حالت میں دھر لے گا، جب یہ اپنے (دنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے۔"

وامتازوا الیوم ایھا المجرمون (یٰس)

- ــــ اور تم الگ ہو جاؤ، اے گنہگارو (شاہ عبدالقادر)
- ــــ ایضاً (شیخ الہند)
- ــــ اور گنہگارو! آج الگ ہو جاؤ (مولوی فتح محمد جالندھری)
- ــــ اور مجرمو آج (اہل ایمان سے) الگ ہو جاؤ (مولانا تھانوی)
- ــــ اور آج الگ ہو جاؤ اے مجرمو! (مولانا دریابادی)
- ــــ اور اے مجرمو! آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ (مولانا مودودی)

واذا راٰوا اٰیۃ یستسخرون (الصّٰفٰت)

"یستسخرون" کا ان سب نے ترجمہ "ہنسی میں ڈال دیتے ہیں" یا "ہنسی میں اڑاتے ہیں" کیا ہے۔ مولوی فتح محمد جالندھری کے یہاں البتہ "ٹھٹھے کرتے ہیں" ملتا ہے ــــ مولانا مودودی کی "تفہیم القرآن" میں اس آیت کا حسب ذیل ترجمہ ملا ــــ

"کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اُسے ٹھٹھوں میں اُڑاتے ہیں"

---

[1] اردو میں یوں تو بولتے ہیں "اس نے بحث میں فلاں شخص کو ہرا دیا" مگر یوں نہیں بولتے "کہ فلاں شخص نے فلاں شخص کی دلیلوں کو ہرا دیا۔"

فراغ علیھم ضربا بالیمین (الصّٰفّٰت) ۔ (حضرت ابراہیم کی بت شکنی کا واقعہ)

- پھر گھسا ان پر مارتا داہنے ہاتھ سے (شاہ عبدالقادر)
- پھر گھسا ان پر مارتا ہوا داہنے ہاتھ سے (شیخ الہند)
- پھر اُن کو داہنے ہاتھ سے مارنا (اور توڑنا) شروع کیا (مولوی فتح محمد جالندھری)
- پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (مولانا تھانوی)
- پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (مولانا عبدالماجد دریا بادی)
- اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں (مولانا مودودی)

"الصّٰفنٰت الجیاد" (ص)

کا ترجمہ کسی نے "خاصے کے گھوڑے" اور کسی نے "اصیل اور عمدہ گھوڑے" کیا ہے، اور مودودی صاحب ——

"خوب سدھے ہوئے تیز رو گھوڑے"

کا ترجمہ کرتے ہیں۔

لیکفر اللہ عنھم اسوا الذی ...... (الزمر)

- تاکہ اتارے اللہ اُن سے برے کام جو کئے تھے (شاہ عبدالقادر)
- تاکہ خدا ان سے برائیوں کو جو انہوں نے کیں دور کر دے (مولوی فتح محمد جالندھری)
- تاکہ اتار دے اللہ ان پر سے بُرے کام جو انہوں نے کئے تھے ۔ (شیخ الہند)
- تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کے برے عملوں کو دُور کر دے ۔ (مولانا تھانوی)
- "تاکہ اللہ ان سے ان کے عمل کی برائیوں کو دور کر دے (مولانا دریا بادی)
- تاکہ جو بدترین اعمال انہوں نے کئے تھے ۔ انہیں اللہ ان کے حساب سے ساقط کر دے (مولانا مودودی)

وذلکم ظنکم الذی ظننتم بربکم اردٰکم فاصبحتم من الخسرین (حٰم السجدہ)

- اور یہ وہی تمہارا خیال ہے جو رکھتے تھے، اپنے رب کے حق میں اُسی نے تم کو کھپایا پھر آج رہ گئے ٹوٹے میں (شاہ عبدالقادر)
- اور اسی خیال نے جو تم اپنے پروردگار کے بارے میں رکھتے تھے، تم کو ہلاک کر دیا (مولوی فتح محمد)
- اور تمہارے اُس گمان نے جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تمہیں برباد کیا اور تم ابدی خسارے میں پڑ گئے (مولانا تھانوی)
- اور یہ وہی تمہارا خیال ہے جو تم رکھتے تھے اپنے رب کے حق میں اُسی نے تم کو غارت کیا اور پھر آج رہ گئے ٹوٹے میں (شیخ الہند)
- اور تمہارے اسی گمان نے جو تم نے اپنے پروردگار کے ساتھ کئے تھے تمہیں برباد کیا اور تم گھاٹے میں پڑ کر رہے (مولانا دریا بادی)
- تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے ۔ (مولانا مودودی)

واما ینزغنک من الشیطن نزغ فاستعذ باللہ (حٰم السجدہ)

- اور کبھی چوک لگے تجھ کو شیطان کے چوکنے سے، تو پناہ پکڑ اللہ کی (شاہ عبدالقادر)
- اور کبھی چوک لگے تجھ کو شیطان کی چوک لگانے سے تو پناہ پکڑ اللہ کی (شیخ الہند)

- اور اگر تمہیں شیطان کی جانب سے کوئی وسوسہ پیدا ہو تو خدا کی پناہ مانگ لیا کرو (مولوی فتح محمد)
- اور اگر (ایسے وقت میں) آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو (فوراً) اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے۔ (مولانا تھانوی)
- اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اُکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔ (مولانا مودودی)

والذین لا یؤمنون فی آذانھم وقر وھو علیھم عمی (حٰم السجدہ)

- اور جو یقین نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ قرآن اُن کے حق میں اندھاپا ہے (شاہ عبدالقادر)
- اور جو یقین نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ قرآن اُن کے حق میں اندھاپا ہے (شیخ الہند)
- اور جو ایمان نہیں لاتے اُن کے کانوں میں گرانی (بہراپن ہے) اور یہ اُن کے حق میں (موجب) نابینائی ہے (مولوی فتح محمد)
- اور جو ایمان نہیں لاتے اُن کے کانوں میں ڈاٹ ہے اور وہ قرآن کے حق میں نابینائی ہے (مولانا تھانوی)
- اور جو ایمان نہیں لاتے اُن کے کانوں میں ڈاٹ ہے اور وہ (قرآن) اُن کے حق میں نابینائی ہے (مولانا دریابادی)
- اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لئے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے (مولانا مودودی)

مالکم من ملجا یومئذ وما لکم من نکیر (الشوریٰ)

- نہ ملے گا تم کو بچاؤ اُس دن اور نہ ملے گا الوپ ہو جانا (شاہ عبدالقادر)
- نہ ملے گا تم کو بچاؤ، اُس دن اور نہ ملے گا الوپ ہو جانا (شیخ الہند)
- اُس دن تمہارے لئے نہ کوئی پناہ ہوگی، اور نہ تم سے گناہوں کا انکار ہی بن پڑے گا (مولوی فتح محمد جالندھری)
- نہ تم کو اُس روز کوئی پناہ ملے گی اور نہ تمہارے بارے میں کوئی (خدا سے) روک ٹوک کرنے والا ہے (مولانا تھانوی)
- تم کو اُس روز کوئی جائے پناہ نہ ملے گی اور نہ تمہارے بارے میں کوئی روک ٹوک کرنے والا ہے (مولانا دریابادی)
- اُس دن تمہارے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا۔ (مولانا مودودی)

یطاف علیھم بصحاف من ذھب واکواب وفیھا ما تشتھیہ الانفس وتلذ الاعین (الزخرف)

- لئے پھرتے ہیں اُن کے پاس رکابیاں سونے کی اور آبخورے اور وہاں ہے جو دل چاہے اور آنکھیں آرام پاویں (شاہ عبدالقادر)
- ان پر سونے کی پرچوں اور پیالوں کا دور چلے گا اور وہاں جو جی چاہے اور جو آنکھوں کو اچھے لگے (موجود ہوگا) (مولوی فتح محمد جالندھری)
- لئے پھریں گے اُن کے پاس رکابیاں سونے کی اور آبخورے اور وہاں ہے جو دل چاہے اور جس سے آنکھیں آرام پائیں (شیخ الہند)
- اُن کے پاس سونے کی رکابیاں اور گلاس لائے جاویں گے (یعنی غلمان لاویں گے) اور وہاں وہ چیزیں ملیں گی جس کو جی چاہے گا اور جس سے آنکھوں کو لذت ملے گی۔ (مولانا تھانوی)
- ان کے پاس سونے کی رکابیاں لائی جائیں گی اور گلاس (بھی) اور وہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کو جی چاہے گا اور جس سے آنکھوں کو لذت ملے گی۔ (مولانا دریابادی)
- اُن کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کریں گے اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز موجود ہوگی۔ (مولانا مودودی)

ہم القرآن" میں ترجمہ کا رنگ اور ترجمانی کا انداز ہے، اب تفسیر کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے !

تلک ایت الکتاب الحکیم لا ھدیً و رحمۃ للمحسنین (لقمٰن)

سید مودودی صاحب نے یوں کی ہے ـــــ

"مراد نہیں ہے کہ جن لوگوں کو نیکوکار (محسنین) کہا گیا ہے وہ بس انہی تین صفات کے حامل ہوتے ہیں بلکہ اصل پہلے "نیکوکار" کا عام لفظ استعمال کر کے اس کی طرف اشارہ کیا گیا کہ وہ ان تمام برائیوں سے رکنے والے ہیں جن سے یہ کتاب روکتی ہے اور ان سارے نیک کاموں پر عمل کرنے والے ہیں جن کا یہ کتاب حکم دیتی ہے پھر ان "نیکوکار" لوگوں کی تین اہم صفات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ باقی ساری نیکیوں کا دار و مدار انہی تین چیزوں پر ہے، وہ نماز قائم کرتے ہیں جس سے خدا پرستی و خدا ترسی ان کی مستقل عادت بن جاتی ہے وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، جس سے ایثار و قربانی کا جذبہ ان کے اندر مستحکم ہوتا ہے، متاعِ دنیا کی محبت دبتی ہے اور رضائے الٰہی کی طلب ابھرتی ہے، وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں، جس سے ان کے اندر ذمہ داری و جواب دہی کا احساس ابھرتا ہے جسے یہ شعور حاصل ہو کہ میں خود مختار نہیں ہوں، کسی آقا کا بندہ ہوں اور اپنی ساری کارگزاریوں پر اپنے آقا کے سامنے مجھے جوابدہی کرنی ہے ان تین خصوصیات کی وجہ سے یہ نیکوکار" اس طرح کے نیکوکار نہیں رہتے جن سے اتفاقاً نیکی سرزد ہو جاتی ہے اور بدی بھی اسی شان سے سرزد ہو سکتی ہے جس شان سے نیکی سرزد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ خصوصیات ان کے نفس میں ایک مستقل نظامِ فکر و اخلاق پیدا کر دیتی ہیں، جس کے باعث ان سے نیکی کا صدور باقاعدہ ایک ضابطہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اور بدی اگر سرزد ہوتی بھی ہے تو محض ایک حادثہ کے طور پر ہوتی ہے:" (صفحہ ۸-۷)

خلق السمٰوٰت بغیر عمدٍ ترونھا (لقمٰن)

"یہ الفاظ ہیں "بغیر عمدٍ ترونھا" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تم دیکھ رہے ہو کہ وہ بغیر ستونوں کے قائم ہیں، دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے ستونوں پر قائم ہیں جو تم کو نظر نہیں آتے" ابن عباسؓ اور مجاہدؒ نے دوسرا مطلب لیا ہے اور بہت سے مفسرین پہلا مطلب لیتے ہیں، موجودہ زمانے کے علم طبیعی کے لحاظ سے اگر اس کا مفہوم بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام عالم افلاک میں یہ بے حد و حساب عظیم الشان تارے اور سیارے اپنے اپنے مقام و مدار پر غیر مرئی سہاروں سے قائم کئے گئے ہیں کوئی تار نہیں ہیں جنہوں نے ان کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہو، کوئی سلاخیں نہیں جو ان کو ایک دوسرے پر گر جانے سے روک رہی ہوں، صرف قانونِ جذب و کشش ہے جو اس نظام کو تھامے ہوئے ہے یہ تعبیر ہمارے آج کے علم کے لحاظ سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل ہمارے علم میں کچھ اور اضافہ ہو اور اس سے زیادہ لگتی ہوئی کوئی دوسری تعبیر اس حقیقت کی کی جا سکے" (ص ۱۱-۱۲)

نعمہٗ ظاھرۃً و باطنۃً ط (لقمٰن)

ـــــ "کھلی نعمتوں سے مراد وہ نعمتیں ہیں، جو آدمی کو کسی نہ کسی طرح محسوس ہوتی ہیں، یا جو اس کے علم میں ہیں اور چھپی ہوئی نعمتوں سے وہ نعمتیں مراد ہیں جنہیں آدمی نہ جانتا ہے نہ محسوس کرتا ہے، بے حد و حساب چیزیں ہیں جو انسان کے اپنے جسم میں اور اس کے باہر دنیا میں اس کے مفاد کے لئے کام کر رہی ہیں۔ مگر انسان کو ان کا پتہ تک نہیں ہے کہ اس

خالق نے اس کی حفاظت کے لئے، اس کی رزق رسانی کے لئے اس کی نشو ونما کے لئے اور اس کی فلاح کے لئے، کیا کیا سروسامان فراہم کر رکھا ہے، سائنس کے مختلف شعبوں میں انسانی تحقیق کے جتنے قدم آگے بڑھتا جا رہا ہے اس کے سامنے خدا کی بہت سی وہ نعمتیں بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں جو پہلے اس سے بالکل مخفی تھیں، اور آج تک جن نعمتوں سے پردہ اٹھا ہے وہ ان نعمتوں کے مقابلے میں اور حقیقت میں کسی شمار میں بھی نہیں ہیں جن پر سے اب تک پردہ نہیں اُٹھا ہے۔" (ص ۲۰)

ان اللہ سمیع بصیر (لقمان)

● "یعنی وہ بہ یک وقت ساری کائنات کی آوازیں الگ الگ سن رہا ہے اور کوئی آواز اس کی سماعت کو اس طرح مشغول نہیں کرتی کہ اسے سنتے ہوتے وہ دوسری چیزیں نہ سن سکے۔ اسی طرح وہ بہ یک وقت ساری کائنات کو اس کی ایک ایک چیز اور ایک ایک واقعہ کی تفصیل کے ساتھ دیکھ رہا ہے، اور کسی چیز کے دیکھنے میں اس کی بینائی[1] اس طرح مشغول نہیں ہوتی کہ اُسے دیکھتے ہوئے وہ کسی دوسری چیزیں نہ دیکھ سکے، ٹھیک ایسا ہی معاملہ انسانوں کے پیدا کرنے اور دوبارہ وجود میں لانے کا بھی ہے، ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے آدمی بھی پیدا ہوئے ہیں اور آئندہ قیامت تک ہوں گے ان سب کو وہ ایک آن کی آن میں پھر پیدا کر سکتا ہے اس کی قدرت تخلیق ایک انسان کو بنانے میں اس طرح مشغول نہیں ہوتی کہ اس وقت وہ دوسرے انسان نہ پیدا کر سکے، اس کے لئے ایک انسان کا بنانا اور کھربوں انسانوں کا بنا دینا یکساں ہے۔" (ص ۲۱ و ۲۲)

ان اللہ عندہ علم الساعۃ ؛ وینزل الغیث (لقمن)

● "اس آیت میں امور غیب کی فہرست نہیں دی گئی، جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے، یہاں تو صرف سامنے کی چند چیزیں مثالاً پیش کی گئی ہیں جن سے انسان کی نہایت گہری اور قریبی دلچسپیاں وابستہ ہیں اور انسان ان سے بے خبر ہے۔ ان سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ صرف یہی پانچ امور غیب ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، حالانکہ غیب نام ہی اس چیز کا ہے جو مخلوقات سے پوشیدہ اور صرف اللہ پر روشن ہو اور فی الحقیقت ان غیب کی کوئی حد نہیں۔" (ص ۲۹)

وما زادھم الا ایمانا وتسلیما (الاحزاب)

"اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ایمان وتسلیم دراصل نفس کی ایک کیفیت ہے جو دین کے ہر حکم اور ہر مطالبہ پر امتحان میں پڑ جاتی ہے، دنیا کی زندگی میں ہر ہر قدم پر آدمی کے سامنے وہ مواقع آتے ہیں، دین یا تو کسی چیز کا حکم دیتا ہے یا کسی چیز سے منع کرتا ہے یا جان اور مال اور وقت اور محنت اور خواہشات نفس کی قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے، ایسے ہر موقع پر جو شخص اطاعت سے انحراف کرے گا، اُس کے ایمان وتسلیم میں کمی واقع ہوگی، اور جو شخص بھی حکم کے آگے سر جھکا دے گا، اس کے ایمان وتسلیم میں اضافہ ہوگا۔ اگرچہ ابتداءً آدمی صرف کلمہ اسلام کو قبول کر لینے سے مسلمان ہو جاتا ہے لیکن یہ کوئی ساکن وجامد حالت نہیں ہے جو بس ایک ہی

---

[1] بینائی کی بجائے بصارت ہوتا تو ہر اعتبار سے بہتر تھا۔

مقام پر ٹھیری رہتی ہو۔ بلکہ اس میں تنزل اور ارتقاء دونوں کے امکانات ہیں، خلوص و اطاعت میں کمی اس کے تنزل کی موجب ہوتی ہے، یہاں تک کہ ایک شخص پیچھے ہٹتے ہٹتے ایمان کی آخری سرحد پر پہونچ جاتا ہے جہاں سے یک سرِ مو بھی تجاوز کر جائے تو مومن کی بجائے منافق ہو جائے، اس کے برعکس خلوص جتنا زیادہ ہو، اطاعت جتنی مکمل ہو، اور دین حق کی سربلندی کے لئے لگن اور دھن جتنی بڑھتی چلی جائے، ایمان اسی نسبت سے بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک آدمی صدیقیت کے مقام پر پہونچ جاتا ہے، لیکن یہ کمی بیشی جو کچھ ہے اخلاقی مراتب میں ہے، جس کا حساب اللہ کے سوا کوئی نہیں لگا سکتا بندوں کے لئے ایمان بس ایک ہی اقرار و تصدیق ہے، جس سے ہر مسلمان داخلِ اسلام ہوتا ہے اور جب تک اس پر قائم رہے مسلمان مانا جاتا ہے، اس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ آدھا مسلمان ہے یہ پاؤ یا یہ دوگنا مسلمان ہے اور یہ تین گنا! اسی طرح قانونی حقوق میں سب مسلمان یکساں ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کو ہم زیادہ مومن کہیں اور اس کے حقوق زیادہ ہوں اور کسی کو کم مومن قرار دیں اور اس کے حقوق کم ہوں ان اعتبارات سے ایمان کی کمی بیشی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا درا صل اسی معنی میں امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے الایمان لایزید ولا ینقص (ایمان کم و بیش نہیں ہوتا) (ص ۸۳)

وقلن قولاً معروفاً (الاحزاب)

● "یعنی ضرورت پیش آنے پر کسی مرد سے بات کرنے میں مضائقہ نہیں ہے، لیکن ایسے مواقع پر عورت کا لہجہ اور اندازِ گفتگو ایسا ہونا چاہئے، جس سے بات کرنے والے مرد کے دل میں کبھی یہ خیال نہ گزر سکے کہ اس عورت سے کوئی اور توقع بھی قائم کی جا سکتی ہے اس کے لہجہ میں کوئی لوچ نہ ہو، اس کی باتوں میں کوئی لگاوٹ نہ ہو اس کی آواز میں دانستہ شیرینی گھلی ہوئی نہ ہو جو سننے والے مرد کے جذبات میں انگیخت پیدا کر دے اور اسے آگے قدم بڑھانے کی ہمت دلائے، اس طرزِ گفتگو کے متعلق اللہ تعالیٰ صاف صاف فرماتا ہے کہ یہ کسی عورت کو زیب نہیں دیتا، جس کے دل میں خوفِ خدا اور بدی سے پرہیز کا جذبہ ہو، دوسرے الفاظ میں یہ فاسقات و فاجرات کا طرزِ کلام ہے نہ کہ مومنات و متقیات کا! اس کے ساتھ اگر سورۃ نور کی وہ آیت بھی دیکھی جائے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولا یضربن بارجلهن لیعلم ما یخفین من زینتهن اور وہ زمین پر اس طرح پاؤں مارتی نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے کسی کا علم لوگوں کو ہو—! رب العلمین کا صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں خواہ مخواہ ایسی آواز یا اپنے زیوروں کی جھنکار غیر مردوں کو نہ سنائیں اور اگر بضرورت اجنبیوں سے بولنا پڑ جائے تو پوری احتیاط کے ساتھ بات کریں! اسی بنا پر عورت کے لئے اذان دینا ممنوع ہے۔۔۔۔"

" اب ذرا یہ سوچنے کی بات ہے کہ جو دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلا ضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے کیا وہ کبھی اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ عورت اسٹیج پر آکر گائے، ناچے، تھرکے، بھاؤ بتائے اور ناز و نخرے دکھائے! کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سریلے نغموں کے ساتھ

فحش مضامین سُناسُنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگاتے ! کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں کبھی کسی کی بیوی اور کسی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں ۔ ۔ " (۹۸-۹۰)

وازواجہ امھاتھم (الاحزاب)

"یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید کی رو سے یہ مرتبہ تمام ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے جن میں لامحالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں ، لیکن ایک گروہ نے جب حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی اولاد کو مرکز دین بنا کر سارا نظام دین انہی کے گرد گھما دیا اور اس بنا پر دوسرے بہت سے صحابہ کے ساتھ حضرت عائشہ کو بھی ہدف لعن طعن بنایا تو ان کی راہ میں قرآن کی یہ آیت حائل ہو گئی جس کی رو سے ہر اُس شخص کو انہیں اپنی ماں تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایمان کا مدعی ہو، آخر کار اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے یہ عجیب و غریب دعویٰ کیا گیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی ازواج مطہرات میں سے جس کو چاہیں آپ کی زوجیت میں باقی رکھیں اور جسے چاہیں آپ کی طرف سے طلاق دیدیں ۔ ابومنصور احمد بن ابوطالب طبرسی نے "کتاب الاحتجاج" میں یہ بات لکھی ہے اور سلیمان بن عبداللہ البحرانی نے اُسے نقل کیا ہے کہ حضور نے حضرت علی سے فرمایا ـــــ یا ابا الحسن ان ھذا الشرف باق ما دمنا علیٰ طاعۃ اللہ تعالیٰ فایتھن عصت اللہ تعالیٰ بعدی بالخروج علیک فطلقھا من الازواج واسقطھا بن شرف امھات المومنین (اے ابوالحسن ! یہ شرف تو اسی وقت تک باقی ہے ، جب تک ہم لوگ اللہ کی اطاعت پر قائم رہیں ، لہٰذا میری بیویوں میں سے جو بھی میرے بعد تیرے خلاف خروج کر کے اللہ کی نافرمانی کرے، اُسے تو طلاق دیدیجیو اور اُس کو امہات المومنین کے شرف سے ساقط کر دیجیو ۔"

اصولی روایت کے اعتبار سے تو یہ روایت بے اصل ہے ہی ، لیکن اگر آدمی سورۃ احزاب کی آیات ۲۸-۲۹ اور ۵۱-۵۲ پر غور کرے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے بھی خلاف پڑتی ہے ۔ کیونکہ آیۂ تخییر کے بعد جن ازواج مطہرات نے ہر حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کو پسند کیا تھا انہیں طلاق دینے کا اختیار حضور کو باقی نہ رہا تھا ۔

علاوہ بریں ایک غیر متعصب آدمی اگر محض عقل ہی سے کام لے کر اس روایت کے مضمون پر غور کرے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ انتہائی لغو اور رسول پاک کے حق میں سخت توہین آمیز افترا ہے ۔ رسول کا مقام تو بہت بالا و برتر ہے ۔ ایک معمولی شریف آدمی سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ وفات کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا اور دنیا سے رخصت ہوتے ہوتے اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے کہ اگر کبھی تیرا اور اُس کا جھگڑا ہو تو میری طرف سے اُسے طلاق دیدیجیو ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اہل البیت کی محبت کے مدعی ہیں ان کے دلوں میں صاحب البیت کی عزت و ناموس کا پاس کتنا کچھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ " (صفحہ ۳)

ان اللہ کان لطیفاً خبیرا (الاحزاب)

" اللہ لطیف ہے یعنی مخفی سے مخفی باتوں تک اس کا علم پہونچ جاتا ہے اس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی ۔"

فسئلوھن من وراء حجاب ط ذلکم اطھر لقلوبکم وقلوبھن ط (الاحزاب)

"اب جس شخص کو بھی خدا نے بینائی عطا کی ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جو کتاب مردوں کو عورتوں سے دوبدو بات کرنے سے روکتی ہے اور پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مصلحت یہ بتاتی ہے "تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لئے یہ طریقہ زیادہ مناسب ہے" اس میں سے آخر یہ نرالی روح کیسے کشید کی جا سکتی ہے کہ مخلوط مجالس اور مخلوط تعلیم اور جمہوری ادارات اور دفاتر میں مردوں اور عورتوں کا بے تکلف میل جول بالکل جائز ہے اور اس سے دلوں کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کو قرآن کی پیروی نہ کرنی ہو تو اس کے لئے زیادہ معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرے اور صاف صاف کہے کہ میں اس کی پیروی کرنا نہیں چاہتا، لیکن یہ تو بڑی ہی ذلیل حرکت ہے کہ وہ قرآن کے صریح احکام کی خلاف ورزی بھی کرے اور پھر ڈھٹائی کے ساتھ یہ بھی کہے کہ یہ اسلام کی روح ہے جو میں نے نکالی ہے آخر وہ اسلام کی کون سی روح ہے جو قرآن و سنت سے باہر کسی جگہ ان لوگوں کو مل جاتی ہے۔" (ص ۱۲۱-۱۲۲)

قل من یرزقکم من السمٰوٰت والارض قل اللّٰہ (سبا)

"سوال و جواب کے درمیان ایک لطیف خلا ہے، مخاطب مشرکین تھے، جو صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر تھے بلکہ یہ بھی جانتے اور مانتے تھے کہ رزق کی کنجیاں اُسی کے ہاتھ میں ہیں، مگر اس کے باوجود وہ دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے اور جناب ان کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا کہ بتاؤ کون تمہیں زمین و آسمان سے رزق دیتا ہے، تو وہ مشکل میں پڑ گئے، اللہ کے سوا اور کسی کا نام لیتے ہیں تو خود اپنے اور اپنی قوم کے عقیدے کے خلاف بات کہتے ہیں، ہٹ دھرمی کی بنا پر ایسی بات کہہ بھی دیں تو خود اپنی قوم کے لوگ ہی اس کی تردید کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اگر تسلیم کر لیتے ہیں کہ اللہ ہی رزق دینے والا ہے تو فوراً دوسرا سوال سامنے آجاتا ہے کہ پھر یہ دوسرے کس مرض کی دوا ہیں جنہیں تم نے خدا بنا رکھا ہے؟ رزق تو دے اللہ اور پوجے جائیں یہ، آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے، اس دوگونہ مشکل میں پڑ کر وہ دم بخود رہ جاتے ہیں، نہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہی رزق دینے والا ہے، نہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی دوسرا معبود رزاق ہے، پوچھنے والا جب دیکھتا ہے کہ یہ لوگ کچھ نہیں بولتے تو وہ خود اپنے سوال کا جواب دیتا ہے کہ "اللہ"" (ص ۲۰۰-۲۰۱)

واللّٰہ ھو الغنی الحمید (فاطر)

"غنی سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے، ہر ایک سے مستغنی اور بے نیاز ہے کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے اور "حمید" سے مراد یہ ہے کہ وہ آپ سے آپ محمود ہے، کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے مگر حمد (شکر و تعریف) کا استحقاق اسی کو پہنچتا ہے، ان دونوں صفات کو ایک ساتھ اس لئے لایا گیا ہے کہ محض غنی تو وہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنی دولت مندی سے کسی کو نفع نہ پہنچاتا ہو، اس صورت میں وہ غنی تو ہوگا حمید نہ ہوگا، حمید وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جبکہ کسی سے خود تو کوئی فائدہ نہ اٹھائے مگر اپنی دولت کے خزانوں سے دوسروں کو ہر طرح کی نعمتیں عطا کرے، اللہ تعالیٰ چونکہ ان دونوں صفات میں کامل ہے، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ وہ محض غنی نہیں بلکہ ایسا غنی ہے جسے ہر تعریف اور ہر شکر کا استحقاق پہنچتا ہے، کیونکہ وہ تمہاری اور تمام موجودات عالم کی حاجتیں پوری کر رہا ہے" (ص ۲۲۸)

ربّ السمٰوٰت والارض وما بینھما ورب المشارق (الصّٰفّٰت)

"ان آیات میں جو حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا مالک و فرماں روا ہی انسانوں کا

اصل معبود ہے . . . . . رہیں یہ اقتدار ہستیاں تو وہ نہ اس کی مستحق ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے اور نہ ان کی عبادت کرنے والوں کی دعائیں مانگنے کا کچھ حاصل ہے، کیونکہ ہماری کسی کی درخواست پر کوئی کاروائی کرنا سرے سے اُن کے اختیار میں ہے ہی نہیں! اُن کے آگے عاجزی و نیازمندی کے ساتھ جھکنا اور اُن سے دعا مانگنا بالکل ویسا ہی احمقانہ فعل ہے جیسے کوئی شخص کسی حاکم کے سامنے جائے اور اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے بجائے جو دوسرے سائلین وہاں درخواستیں لئے کھڑے ہیں انہی میں سے کسی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔ (ص ۲۷۹)

وما انت بمسمع من فی القبور (فاطر)

"یعنی اللہ کی مشیت کی بات ہی دوسری ہے وہ چاہے تو پتھروں کو سماعت بخش دے، لیکن رسول کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ جن لوگوں کے سینے ضمیر کے مدفن بن چکے ہیں اُن کے دلوں میں اپنی بات اُتار سکے اور جو بات سننا ہی نہ چاہتے ہوں اُن کے بہرے کانوں کو صدائے حق سنا سکے" (ص ۲۳)

احشروا الذین ظلموا وازواجھم (الصّٰفّٰت)

"اصل میں لفظ "ازواج" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد اُن کی وہ بیویاں بھی ہو سکتی ہیں جو اس بغاوت میں اُن کی رفیق تھیں اور وہ سب لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو انہی کی طرح باغی و سرکش اور نافرمان تھے، علاوہ بریں اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ایک قسم کے مجرم الگ الگ جتھوں کی شکل میں جمع کئے جائیں گے۔" (ص ۲۵۳)

اولئک لھم رزق معلوم فواکہ (الصّٰفّٰت)

"اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جنت میں کھانا غذا کے طور پر نہیں بلکہ لذت کے لئے ہوگا یعنی وہاں کھانا اس غرض کے لئے نہ ہوگا کہ جسم کے تحلیل شدہ اجزاء کی جگہ دوسرے اجزاء غذا کے ذریعہ فراہم کئے جائیں کیونکہ اس ابدی زندگی میں سرے سے اجزاء جسم تحلیل ہی نہ ہوں گے نہ آدمی کو بھوک لگے گی، جو اس دنیا میں تحلیل عمل کی وجہ سے لگتی ہے اور نہ جسم اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے غذا مانگے گا، اسی بنا پر جنت کے ان کھانوں کے لئے "فواکہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں تغذیہ کی بجائے تلذذ کا پہلو نمایاں ہے۔"

بیضاء لذۃ للشّٰربین لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون (الصّٰفّٰت)

"یعنی وہ شراب اُن دونوں قسم کی خرابیوں سے خالی ہوگی جو دنیا کی شرابوں میں ہوتی ہیں، دنیا کی شراب میں ایک قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے قریب آتے ہی پہلے تو اس کی بدبو اور سڑاند ناک تک پہنچتی ہے پھر اس کا مزہ آدمی کے ذائقہ کو تلخ کرتا ہے پھر حلق سے اترتے ہی وہ پیٹ پکڑ لیتی ہے، پھر وہ دماغ کو چڑھتی ہے اور دوران سر لاحق ہوتا ہے پھر وہ جگر کو متاثر کرتی ہے اور آدمی کی صحت پر اس کے برے اثرات مترتب ہوتے ہیں، پھر جب اس کا نشہ اترتا ہے تو آدمی خمار میں مبتلا ہو جاتا ہے، یہ سب جسمانی ضرر ہیں، دوسری قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اسے پی کر آدمی بہکتا ہے اول فول بکتا ہے اور عربدہ کرتا ہے، یہ شراب کے عقلی نقصانات ہیں، دنیا میں انسان صرف سرور کی خاطر شراب کے یہ سارے نقصانات برداشت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت کی شراب میں سرور تو پوری طرح ہوگا (لذۃ للشّٰربین) لیکن ان دونوں قسم کی خرابیوں میں سے کوئی خرابی اس میں نہ ہوگی" (ص ۲۵۶)

انی اذبحک فانظر ماذا ترٰی (الصّٰفّٰت)

"صاحبزادے سے یہ بات پوچھنے کا مدعا یہ نہ تھا کہ تو راضی ہو تو خدا کے فرمان کی تعمیل کروں ورنہ نہ کروں، بلکہ حضرت ابراہیم دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ جس صالح اولاد کی انہوں نے دُعا مانگی تھی وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے اگر وہ بھی اللہ کی خوشنودی پر جان قربان کر دینے کے لئے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا مکمل طور پر قبول ہوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت ہی سے اُن کی اولاد نہیں ہے بلکہ اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بھی اُن کا سپوت ہے۔" (ص ۲۹۵)

قال فبعزتک لاغوینھم اجمعین o الا عبادک منھم المخلصین (ص)

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تیرے چیدہ بندوں کو بہکاؤں گا نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "تیرے چیدہ بندوں پر میرا بس نہ چل سکے گا۔" (۳۴۹)

خلقکم من نفس واحدۃ ثم جعل منھا زوجھا (الزمر)

"یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے حضرت آدم سے انسانوں کو پیدا کیا اور پھر ان کی بیوی حضرت حوا کو پیدا کیا بلکہ بیان کلام میں ترتیب زمان کے بجائے ترتیب بیان ہے جس کی مثالیں ہر زبان میں پائی جاتی ہیں مثلاً ہم کہتے ہیں کہ تم نے آج جو کچھ کیا ہے وہ مجھے معلوم ہے پھر جو کچھ تم کل کر چکے ہو اس سے بھی میں باخبر ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ کل کا واقعہ آج کے بعد ہوا ہے۔" (ص ۳۵۹)

ان تکفروا فان اللہ غنیٌّ عنکم (الزمر)

"یعنی تمہارے کفر سے اس کی خدائی میں ذرہ برابر کمی نہیں آسکتی، تم مانو گے تب بھی وہ خدا ہے اور نہ مانو گے تب بھی وہ خدا ہے اور رہے گا اس کی فرمانروائی اپنے زور پر چل رہی ہے، تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا، حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

یا عبادی لو ان اولکم وآخرکم وانسکم وجنکم کانوا علیٰ
افجر قلب رجل منکم ما نقص من ملکی شیئاً

اے میرے بندو اگر تم سب کے سب اگلے پچھلے انسان اور جن اپنے میں سے کسی فاجر سے فاجر شخص کے دل کی طرح ہو جاؤ تب بھی میری بادشاہی میں کچھ کمی نہ ہوگی (مسلم) (ص ۳۶۱)

واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون (الزمر)

"یہ بات قریب قریب ساری دنیا کے مشرکانہ ذوق رکھنے والے لوگوں میں مشترک ہے حتیٰ کہ ان مسلمانوں میں بھی جن پرستوں کو یہ بیماری لگ گئی ہے وہ بھی اس عیب سے خالی نہیں ہیں۔ زبان سے کہتے ہیں ہم اللہ کو مانتے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ اکیلے اللہ کا ذکر کیجیے تو ان کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں، کہتے ہیں ضرور یہ شخص بزرگوں اور اولیا کو نہیں مانتا . . . . علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں اس مقام پر خود اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی مصیبت میں ایک وفات شدہ بزرگ کو مدد کے لئے پکار رہا ہے میں نے کہا اللہ کے بندے اللہ کو پکار، وہ خود فرماتا ہے واذا سألک عبادی

عنی فانی قریب اُجیبُ دعوۃ الداع اذا دعان۔ میری بات سن کر اسے سخت غصہ آیا اور
بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا وہ کہتا تھا یہ شخص اولیا، کا منکر ہے اور بعض لوگوں نے اس کو یہ کہتے بھی سنا کہ اللہ
کی بہ نسبت ولی جلدی سن لیتے (ص ۲۷۷ - ۲۷۸)

..... فی ایام نحسات ..... (حٰمٓ السجدہ)

"منحوس دنوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دن بجائے خود منحوس تھے اور عذاب اس لئے کہ آیا یہ منحوس دن
قوم عاد پر آ گئے تھے۔ یہ مطلب اگر ہوتا تو اور بجائے خود ان دنوں ہی میں کوئی نحوست ہوتی تو عذاب دور و
نزدیک کی ساری قوموں پر آ جاتا، اس لئے صحیح مطلب یہ ہے کہ ان ایام میں چونکہ اس قوم پر خدا کا عذاب
نازل ہوا اس بنا پر وہ دن قوم عاد کے لئے منحوس تھے، اس آیت سے دنوں کے سعد و نحس پر استدلال کرنا
درست نہیں: (ص ۴۴۴)

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ (حٰمٓ السجدہ)

"سامنے نہ آ سکنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کر کے اگر کوئی شخص اس کی کسی بات کو غلط اور
کسی تعلیم کو باطل و فاسد ثابت کرنا چاہے۔ تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیچھے سے نہ آ سکنے کا مطلب یہ ہے
کہ کبھی کوئی حقیقت و صداقت ایسی منکشف نہیں ہو سکتی جو قرآن کے پیش کردہ حقائق کے خلاف ہو، کوئی علم
ایسا نہیں آ سکتا جو فی الواقع "علم" ہو اور قرآن کے بیان کردہ علم کی تردید کرتا ہو، کوئی تجربہ اور مشاہدہ
ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت کر دے کہ قرآن نے عقائد، اخلاق، قانون، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت
اور سیاست مدن کے باب میں انسان کو جو رہنمائی دی ہے وہ غلط ہے اس کتاب نے جس چیز کو حق کہہ دیا ہے وہ
باطل ثابت نہیں ہو سکتی اور جسے باطل کہہ دیا ہے وہ کبھی حق ثابت نہیں ہو سکتی، مزید برآں اس کا مطلب یہ بھی
ہے کہ باطل خواہ سامنے سے حملہ آور ہو یا ہیر پھیر کے راستوں سے چھاپہ مارے، بہر حال کسی طرح بھی وہ اس
دعوت کو شکست نہیں دے سکتا، جسے لے کر قرآن آیا ہے، تمام مخالفتوں اور مخالفین کی ساری خفیہ اور علانیہ
چالوں کے علی الرغم یہ دعوت پھیل کر رہے گی اور کوئی اسے روک نہیں سکے گا۔" (ص ۴۶۲)

..... ان اقیموا الدین ..... (الشوریٰ)

"..... جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے حکومت قائم کی تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اس نے اپنی حکومت
کی طرف دعوت دی بلکہ یہ ہوتے ہیں کہ اس نے ملک کے لوگوں کو اپنا مطیع کر لیا اور حکومت کے تمام شعبوں کی ایسی
تنظیم کر دی کہ ملک کا سارا نظام اس کے احکام کے مطابق چلنے لگا، اس لئے جب ہم کہتے ہیں کہ ملک میں عدالتیں
قائم ہیں تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ انصاف کے لئے منصف مقرر ہیں اور وہ مقدمات کی سماعت کر رہے ہیں اور
فیصلے دے رہے ہیں، نہ یہ کہ عدل و انصاف کی خوبیاں خوب خوب بیان کی جا رہی ہیں اور لوگ ان کے قائل
ہو رہے ہیں........"

اس تشریح کے بعد یہ بات سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی کہ انبیا علیہم السلام کو جب اس دین
کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں

اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کرلیں، بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کرلیں تو اس کے آگے قدم بڑھا کر پورا کا پورا دین ان میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے تاکہ اس کے مطابق عملدرآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اس کام کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا مرحلہ پیش نہیں آسکتا، لیکن ہر صاحب عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے کہ اس حکم میں دعوت و تبلیغ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے مگر بجائے خود یہ مقصد نہیں ہے کجا کہ کوئی شخص اسے انبیاءؑ کے مشن کا مقصد وحید قرار دے بیٹھے۔

اب دوسرے سوال کو لیجئے بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے، اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ "لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجاً" اس لئے انہوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام وضوابط نہیں ہیں بلکہ صرف توحید، آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ کی عبادت بجا لانا ہے یا حد سے حد اس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں مشترک رہے ہیں لیکن یہ ایک بڑی سطحی رائے ہے جو محض سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کرلی گئی ہے اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کردی جاتے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی تفریق تک پہونچتی ہے جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دین بلا شریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی امت کو خراب کردیا۔

قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کرکے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دین حق کو فکری، اخلاقی تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لئے جان لڑادیں۔

" ...... اس کتاب میں کفار سے قتال کا حکم (البقرہ ـــ ۱۹۰ ـــ ۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کرکے اس حکم کی تعمیل کریں گے، اس کتاب میں اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم (التوبہ ـ ۲۹) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے اُن سے جزیہ وصول کریں گے اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔ اور یہ معاملہ صرف مدنی سورتوں تک ہی محدود نہیں ہے، مکّی سورتوں میں بھی دیدۂ بینا کو علانیہ نظر آسکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیش نظر تھا وہ دین کے غلبۂ اقتدار کا تھا نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہل دین کے ذمی بن کر رہنے کا۔ (۴۸۸ ـــ ۴۹۰ ـ ۴۹۱ ـ ۴۹۲)

وسئل من أرسلنا من قبلك من رسلنا ـــ (الزخرف ۲)

" رسولوں سے پوچھنے کا مطلب اُن کی لائی ہوئی کتابوں سے معلوم کرنا ہے جس طرح فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی معاملہ میں اگر تمہارے درمیان نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ بلکہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت کی طرف رجوع کرو، اسی طرح

رسولوں سے پوچھنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جو رسول دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں ان کے پاس جا کر دریافت کرو، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ خدا کے رسول دنیا میں جو تعلیمات چھوڑ گئے ہیں ان سب میں تلاش کر کے دیکھ لو، آخر کس نے یہ بات سکھائی تھی کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا بھی کوئی عبادت کا مستحق ہے (ص ۵۴۰)

...... لقد جئنٰکم بالحق ولکن اکثرکم للحق کٰرھون ...... (الزخرف)

"یعنی ہم نے حقیقت تمہارے سامنے کھول کر رکھ دی، مگر تم کو حقیقت کے بجائے افسانوں کے دلدادہ تھے اور سچائی تمہیں سخت ناگوار تھی، اب اپنے اس احمقانہ انتخاب کا انجام دیکھ کر بلبلاتے کیوں ہو؟ ہوسکتا ہے کہ یہ داروغۂ جہنم ہی کے جواب کا ایک حصہ ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا جواب "تم یونہی پڑے رہو گے" پر ختم ہوگیا ہو اور یہ دوسرا فقرہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہو، پہلی صورت میں داروغۂ جہنم کا یہ قول "ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے" ایسا ہی ہے جیسے حکومت کا کوئی افسر حکومت کی طرف سے بولتے ہوئے "ہم" کا لفظ استعمال کرتا ہے اور اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حکومت نے یہ کام کیا یا یہ حکم دیا" (ص ۵۵)

ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لا یستجیب لہٗ الیٰ یوم القیٰمۃ وھم عن دعآئھم غٰفلون (الاحقاف)

"یعنی ان تک ان پکارنے والوں کی پکار سرے سے پہونچتی ہی نہیں، نہ وہ خود اپنے کانوں سے سنتے ہیں نہ کسی ذریعہ سے ان تک یہ اطلاع پہونچتی ہے کہ کوئی انہیں پکار رہا ہے، اس ارشاد الٰہی کو تفصیلاً یوں سمجھئے کہ دنیا بھر کے مشرکین خدا کے سوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں وہ تین اقسام پر منقسم ہیں ایک بے روح اور بے عقل مخلوقات، دوسرے وہ بزرگ انسان جو گزر چکے ہیں، تیسرے وہ انسان جو خود بگڑے ہوئے تھے اور دوسروں کو بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے، پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے عابدوں کی دعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر ہی ہے، رہے دوسری قسم کے معبود جو اللہ کے مقرب انسان تھے، تو ان کے بے خبر رہنے کی دو وجوہ ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں جہاں انسانی آوازیں براہِ راست ان تک نہیں پہونچتیں، دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہونچاتے کہ جن لوگوں کو آپ ساری عمر اللہ سے دعا مانگنا سکھاتے رہے تھے وہ اب الٹے آپ سے دعائیں مانگ رہے ہیں، اس لئے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو صدمہ پہونچانے والی کوئی چیز نہیں ہوسکتی اور اللہ اپنے نیک بندوں کی ارواح کو اذیت دینا ہرگز پسند نہیں کرسکتا ...... !

- اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا والوں کے سلام اور ان کی دعائے رحمت پہنچا دیتا ہے کیونکہ یہ چیزیں ان کے لئے فرحت کا موجب ہیں اور اسی طرح وہ مجرموں کو دنیا والوں کی لعنت اور پھٹکار اور زجر و توبیخ سے مطلع فرما دیتا ہے، جیسے جنگ بدر میں مارے جانے والے کفار کو ایک حدیث کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توبیخ سنوا دی گئی، کیونکہ ان کے لئے اذیت کی موجب ہے لیکن کوئی ایسی بات جو صالحین کے رنج کی موجب یا مجرمین کے لئے فرحت کی موجب ہو وہ ان تک نہیں پہونچائی جاتی، اس تشریح سے سماعِ موتیٰ کے مسئلہ کی حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے"

(صـ۶۰۳)

وھو الغفور الرحیم (الاحقاف)

" اس مقام پر یہ فقرہ دو معنی دے رہا ہے، ایک یہ کہ فی الواقع یہ اللہ کا رحم اور اُس کا درگزر ہی ہے جس کی
وجہ سے وہ لوگ زمین میں سانس لے رہے ہیں جنہیں خدا کے کلام کو افترا قرار دینے میں کوئی باک نہیں، ورنہ کوئی
بے رحم اور سخت گیر خدا اس کائنات کا مالک ہوتا تو ایسی جسارتیں کرنے والوں کو ایک سانس کے بعد دوسرا سانس
لینا نصیب نہ ہوتا۔ دوسرا مطلب اس فقرے کا یہ ہے کہ ظالمو اب بھی اس ہٹ دھرمی سے باز آ جاؤ تو خدا کی رحمت
(ص ۶۰۵)
کا دروازہ تمہارے لئے کھلا ہوا ہے اور جو کچھ تم نے کیا ہے وہ معاف ہو سکتا ہے "

دوسرا رخ :—
مولانا مودودی صاحب انسان ہی فرشتہ نہیں ہیں اور انسان سے انتہائی احتیاط کے باوجود تحقیق و تشریح اور افہام و تفہیم میں بھول چوک
ہو جاتی ہے ان کی تفسیر میں بعض باتیں ہمیں کھٹکیں، جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، کہ قرآن کی تفسیر کا معاملہ ہے جو دین و ایمان کی سب سے
ن بنیاد ہے۔

وزلزلوا زلزالاً شدیداً (الاحزاب)
" اور بری طرح ہلا مارے گئے " (ص ۶۔ تفہیم القرآن)
سے خیال میں شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ " اور جھڑ جھڑا دیئے گئے " مفہوم و معنی سے زیادہ قریب ہے اور اس میں وہ شدت بھی پائی
تی ہے جو قرآن کریم کے لفظوں سے نمایاں ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ
(درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا)
" تھا " کی جگہ " ہے " ترجمہ ہونا چاہئے! قرآن کریم میں " کان " ماضی مطلق، ماضی قریب، ماضی بعید، ماضی استمراری، ماضی غیر منقطع، مستقبل اور
حال کے لئے استعمال ہوا ہے ——— اور کہیں محض تاکید کے لئے آیا ہے " کان " فعل ناقص بھی ہے اور فعل تام بھی! مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی
—: " . . . . رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا " ہی ترجمہ کیا ہے، مگر حضور کا اسوۂ حسنہ ہر زمانہ میں اُمت کے لئے نمونہ ہے اس لئے
" ہے " ہی ترجمہ کیا جانا چاہئے۔
" متواتر تین سال کے اس مقاطعہ نے مسلمانوں اور بنی ہاشم کی کمر توڑ کر رکھ دی " (ص ۵۹۶۔ الاحقاف کا تاریخی پس منظر)
یہ ٹکڑا " کمر توڑ کر رکھ دی " اس عبارت میں خاصہ کھٹکتا ہے، اس مفہوم کی ترجمانی زیادہ اچھے لفظوں میں ہو سکتی تھی۔
" بعل کے پوجاری " (ص ۳۰۳) " پوجا " سے اسم فاعل " پوجاری " یہ املا قدیم اہلِ قلم میں رائج تھا مگر اب زیادہ تر " پجاری " لکھا اور بولا
جاتا ہے، اس کا قیاس " بھکاری " پر کرنا چاہئے، کہ اسم فاعل بناتے ہیں " بھیک " کی " ی " حذف کر دی گئی!
" یعنی اس میں اینچ بینچ کی بھی کوئی بات نہیں " (صفحہ ۳۶۹) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ " اینچ بیچ " میں " ن " کا اضافہ کر دیا گیا

ولنذیقنھم من عذاب غلیظ ○ (حٰمٓ السجدہ)
" بڑے گندے عذاب کا مزہ چکھائیں گے " (صفحہ ۴۶۸) عربی میں غلیظ گندے، نجس اور غیر طاہر کو نہیں " گاڑھے " اور سخت و شدید کو کہتے ہیں
عذاب کی صفت " گندہ " عجیب سی لگتی ہے۔ اس لئے " گندے عذاب " کی بجائے " شدید یا سخت عذاب " ترجمہ ہونا چاہئے۔
" یہ اللہ کا رحم اُس کا درگزر ہی ہے " (ص ۶۰۵) " درگزر " مذکر بھی بولا جاتا ہے مگر شعراء نے اکثر و بیشتر اسے مونث باندھا ہے، اللہ تسلیم کہتے ہیں۔

"یہ کلیہ آخر کس قرآن سے برآمد کی گئی ہے" (صفحہ ۹۰)

مولانا مودودی نے یہ لفظ اپنے بچپن بلکہ نوجوانی میں اورنگ آباد یا دہلی میں نہیں سنا ہوگا، کیونکہ یہ لفظ اردو ادب میں اب سے تقریباً چالیس سال پہلے استعمال ہونا شروع ہوا ہے اور اہل زبان اسے "مذکر" برتتے ہیں؛ ہاں پنجاب میں غالباً مونث بولا جاتا ہے، یہ درست ہے کہ دوسری زبان کے لفظوں پر اردو زبان کے مترادف و ہم معنی الفاظ کا قیاس کرکے تذکیر و تانیث کا استعمال ہوتا ہے جس طرح سویلیزیشن کا ترجمہ "تہذیب" ہے جو مونث ہے اس لئے سویلیزیشن کو بھی مونث بولا جاتا ہے مگر یہ قاعدہ ہر جگہ نہیں چلتا، مثلاً انگریزی کے "ٹوٹل" کو اردو میں "میزان" کہتے ہیں جو مونث ہے مگر "ٹوٹل" (TOTAL) مذکر بولا جاتا ہے، اس طرح ۔۔۔

"کلرک نے غلط ٹوٹل لگایا"

ENTRY کو اردو والے مونث بولتے ہیں ۔۔۔ کیا تم نے ان خطوں کی رسید بک میں انٹری کرلی، حالانکہ اس لفظ کا ترجمہ ۔۔۔ اندراج ۔۔۔ مذکر ہے، منطق کی اصطلاح، Category مونث بولی جاتی ہے حالانکہ "مقولہ" مذکر ہے۔

چند خصوصیات

دنیا کے پردے پر کوئی مصنف، شاعر، ادیب، اہل قلم اور مفکر ایسا نہیں گزرا جس سے بھول چوک نہیں ہوئی، ابن جوزی ہوں، یا غزالی، ابن تیمیہ ہوں یا شاہ ولی اللہ، شبلی نعمانی ہوں یا مولانا اشرف علی تھانوی، ان اکابر سے فکر و نگارش کی غلطیاں ہوئی ہیں، شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ امامت کا درجہ رکھتے ہیں مگر ان کی کتابوں میں ایسی وحشت انگیز عبارتیں پائی جاتی ہیں، جو نقل کرنے اور دہرانے کے قابل نہیں ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے چند تسامحات سے ان کے علم و فضل تفقہ فی الدین اور علمی بصیرت پر کوئی حرف نہیں آتا!

ہم "تفہیم القرآن" کے اقتباسات اور دوسرے مترجمین کے ترجموں کے نمونے اوپر درج کر چکے ہیں جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، مولانا مودودی نے آیات قرآنی کی ترجمانی میں دیدہ ریزی اور قابل قدر و تحسین بصیرت کا ثبوت دیا ہے، انہوں نے "تفہیم القرآن" کے دیباچہ میں لکھا تھا، ۔۔۔

"لفظی ترجمے کے طریقے میں کسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کرنے کے لئے میں نے "ترجمانی" کا ڈھنگ اختیار کیا ہے میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کی یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کردوں، اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو "عربی مبین" کی ترجمانی "اردوئے مبین" میں ہو"

اور اس اپنی کوشش میں مولانا صرف اللہ تعالیٰ کے فضل سے کامیاب رہے ہیں، اردو زبان میں قرآن کریم کی یہ بہترین ترجمانی ہے جس نے اردو زبان و ادب کو ثروت ہی نہیں نفاست بھی عطا کی ہے۔

"تفہیم القرآن" میں مولانا مودودی کی شرح و تفصیل سے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے انہوں نے قرآن کریم کی شخصیات اور مقامات کی بھی نشاندہی کی ہے، یہ دلیل ہے ان کی وسعت مطالعہ کی! جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے مستشرقین کی گمراہ کن غلطیوں کی تردید بھی کردی ہے۔ مثلاً :۔

"یہاں اس بات کی تصریح بھی ضروری ہے کہ مستشرق دیرنبورگ (DEREN BOURG) کے پیرس کے کتب خانہ کا ایک عربی مخطوطہ جو امثال لقمان الحکیم (FABLES DE LOOMAN LESAGE) کے نام سے شائع کیا ہے، وہ حقیقت میں ایک موضوع چیز ہے جس کا مجلہ لقمان سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے یہ امثال تیرہویں صدی عیسوی میں کسی شخص نے مرتب کی تھیں، اس کی عربی بہت ناقص ہے اور اسے پڑھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ دراصل کسی اور زبان کی کتاب کا ترجمہ ہے، جسے مصنف یا مترجم نے اپنی طرف سے لقمان حکیم کی طرف

...کر دیا ہے۔ مستشرقین اس قسم کی جعلی چیزیں نکال نکال کر جس مقصد کے لئے سامنے لاتے ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کسی طرح قرآن ...کردہ قصوں کو غیر تاریخی افسانے کر کے ساقط الاعتبار ٹھیرا دیا جائے، جو شخص بھی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "لقمان" کے عنوان پر (B. HALLER) کا مضمون پڑھے گا اس سے ان لوگوں کی نیت کا حال مخفی نہ رہے گا" (ص۲۱)

مولانا مودودی نے بعض مفسرین سے بھی اختلاف کیا ہے۔ مثلاً :-

"اس اختلاف روایات کا یہ نتیجہ ہوا کہ علما اسلام میں سے بعض پورے جزم و وثوق کے ساتھ حضرت اسحٰق کے حق میں رائے دیتے ہیں۔ مثلاً ابن جریر اور قاضی عیاض، اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل تھے، مثلاً ابن کثیر اور بعض مذبذب ہیں مثلاً جلال الدین سیوطی، لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک و شبہ سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل ہی ذبیح تھے"

"قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحٰق کی بشارت دی گئی ہے وہاں ان کے غلام علیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، فبشروہ بغلام علیم ـــــ لا توجل انا نبشرک بغلام علیم، مگر یہاں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اس کے لئے غلام حلیم (بردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں صاحبزادوں کی صفات الگ الگ تھیں اور ذبح کا حکم غلام علیم کے لئے نہیں غلام حلیم کے لئے تھا"

...کے بعد مولانا نے ابن جریر کی دلیلوں کی کمزوری کو عقلی و نقلی دلیلوں سے واضح کیا ہے، آخر میں وہ لکھتے ہیں :-

"یہ دراصل یہودی پروپیگنڈے کا اثر تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں اس لئے ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو جو وہ قدیم صحیفوں سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصب کارفرما ہے" (ص ۲۹۹-۳۰۱)

"وخر راکعاً و اناب" (ص)

مفسرین اور فقہا کے درمیان اس پر اختلاف ہے کہ اس آیت پر تلاوت کرتے ہوئے سجدہ واجب ہے یا نہیں ـــــ مولانا مودودی صحابہ کرام کی مختلف روایتیں اس سلسلہ میں درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ان روایات سے اگرچہ وجوب سجدہ کی قطعی دلیل تو نہیں ملتی، لیکن کم از کم اتنی بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر اکثر سجدہ فرمایا ہے اور سجدہ نہ کرنے کی بہ نسبت یہاں سجدہ کرنا بہر حال افضل ہے، بلکہ ابن عباس کی تیسری روایت جو ہم نے اوپر بخاری کے حوالے سے نقل کی ہے، عدم وجوب کی بہ نسبت وجوب کے حکم کا پلڑا جھکا دیتی ہے"

"ایک مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے یہاں خر راکعاً (رکوع میں گر پڑا) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں مگر تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد خر ساجداً (سجدہ میں گر پڑا) ہے۔ اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب نے یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ نماز یا غیر نماز میں آیت سجدہ سن کر یا پڑھ کر آدمی سجدے کے بجائے صرف رکوع بھی کر سکتا ہے، کیونکہ جب اللہ تعالٰی نے رکوع کا لفظ استعمال کر کے سجدہ مراد لیا ہے، تو معلوم ہوا کہ رکوع سجدے کا قائم مقام ہو سکتا ہے فقہائے شافعیہ میں سے امام خطابی کی بھی یہی رائے ہے،

یہ رائے اگرچہ بجائے خود صحیح اور معقول ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور صحابہ کرام کے عمل میں ہم کو ایسی کوئی نظیر نہیں ملی کہ آیت سجدہ پر سجدہ کرنے کے بجائے رکوع ہی کر لینے پر اکتفا کیا گیا ہو، لہٰذا اس رائے پر عمل صرف اُس صورت میں کرنا چاہئے جب سجدہ کرنے میں کوئی امر مانع ہو۔ اُسے معمول بنا لینا درست نہیں اور خود امام ابو حنیفہؒ اور اُن کے اصحاب کا منشاء بھی یہ نہیں ہے کہ اسے معمول بنا لیا جائے بلکہ وہ صرف اس کے جواز کے قائل ہیں ــــــ" (ص ۳۲۶)

کس متانت و سنجیدگی کے ساتھ حدود و آداب کا پوری طرح لحاظ رکھتے ہوئے مولانا مودودی نے ائمہ فقہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے، یہ دلیل ہے ان کے تفقہ فی الدین اور دینی بصیرت کی ــــــ مگر اُن کی روشنیٔ طبع اُن کے حق میں بلا ہو گئی ہے اور وہ حضرات جو فقہی جمود میں مبتلا ہیں اور فقہی مذاہب کے بارے میں انتہائی غلو رکھتے ہیں، مولانا مودودی سے اس بات پر ناراض ہو جاتے ہیں! حالانکہ اہل علم کو خوش ہونا چاہئے کہ اس دور میں ایک ایسا عالم دین بھی ہم میں پایا جاتا ہے جو فقہی مسائل میں مجتہدانہ طور پر کلام کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔

فقال انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی حتی توارت بالحجاب ۵ ردوھا علی ط فطفق مسحا بالسوق والاعناق (ص)

اس آیت کی تفسیر میں مودودی صاحب نے بعض اکابر مفسرین سے اختلاف کیا ہے اور عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ان کی رائے میں کیا کمزوری ہے! "تفہیم القرآن" میں اس بحث کو پڑھا جا سکتا ہے، ہم ان مباحث کا تھوڑا سا حصہ درج ذیل کرتے ہیں۔

" ثانیاً وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ سورج چھپ گیا، حالانکہ وہاں سورج کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ حتیٰ توارت بالحجاب کے الفاظ پڑھ کر آدمی کا ذہن بلا تامل الصّٰفنٰت الجیاد کی طرف پھرتا ہے، جن کا ذکر پچھلی آیت میں آ چکا ہے ثالثاً وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ حضرت سلیمان نے گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر خالی مسح نہیں کیا بلکہ تلوار سے مسح کیا حالانکہ قرآن میں مَسْحًا بالسیف کے الفاظ نہیں ہیں اور کوئی قرینہ بھی ایسا موجود نہیں ہے جس کی بنا پر مسح سے مسح بالسیف مراد لیا جا سکے، ہمیں اس طریق تفسیر سے اصولی اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ سے زائد کوئی مطلب لینا چار ہی صورتوں میں درست ہو سکتا ہے، یا تو قرآن ہی کی عبارت میں اس کے لئے کوئی قرینہ موجود ہو، یا قرآن میں دوسرے مقام پر اس کی طرف کوئی اشارہ ہو یا کسی صحیح حدیث میں اس اجمال کی تشریح ملتی ہو، یا اس کا اور کوئی قابل قدر ماخذ ہو مثلاً تاریخ کا معاملہ ہے تو تاریخ میں اس کی اجمالی تفصیلات ملتی ہوں، یا آثار کائنات کا ذکر ہے تو مستند علمی تحقیقات سے اُس کی تشریح ہو رہی ہو، اور احکام شرعیہ کا معاملہ ہے تو فقہ اسلامی کے ماخذ اس کی وضاحت کر رہے ہوں، جہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو، وہاں محض بطور خود ایک قصہ تصنیف کر کے قرآن میں شامل کر دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے" (۳۳۳ــــ۳۳۴)

ولقد فتنا سلیمٰن والقینا علی کرسیہ جسدا ثم اناب ..... (ص)

"یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ فتنہ کیا تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام پڑ گئے تھے، اور ان کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دینے کا کیا مطلب ہے؟ اور جسد لا کر ڈالا جانا ان کے لئے کس نوعیت کی تنبیہ تھی، جس پر انہوں نے توبہ کی، اس کے جواب میں مفسرین نے چار مسلک اختیار کئے ہیں۔

ایک گروہ نے ایک لمبا چوڑا افسانہ بیان کیا ہے جس کی تفصیلات میں اُن کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں مگر

سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان سے یا تو یہ قصور ہوا تھا کہ اُن کے محل میں ایک بیگم چالیس دن تک بت پرستی کرتی رہی اور وہ اس سے بے خبر رہے یا یہ کہ وہ چند روز تک گھر میں بیٹھے رہے اور کسی مظلوم کی دادرسی نہ کی، اس پر ان کو یہ سزا ملی کہ ایک شیطان کسی نہ کسی طرح اُن کی وہ انگوٹھی اڑا لے گیا جس کی بدولت وہ جن و انس اور ہواؤں پر حکومت کرتے تھے، انگوٹھی ہاتھ سے جاتے ہی حضرت سلیمان کا اقتدار چھن گیا اور چالیس دن تک دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے اس دوران میں وہ شیطان سلیمان بنا ہوا حکمرانی کرتا رہا، سلیمان کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دینے سے مراد یہی شیطان ہے جو اُن کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ بعض حضرات یہاں تک کہہ گزرے ہیں، اس شیطان سے حرم سلیمانی کی خواتین تک کی عصمت محفوظ نہ رہی، آخر کار سلطنت کے اعیان و اکابر علماء کو اس کی کارروائیاں دیکھ کر شک ہو گیا کہ یہ سلیمان نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے اس کے سامنے توراۃ کھولی اور وہ ڈر کر بھاگ نکلا، راستے میں انگوٹھی اس کے ہاتھ میں سے سمندر میں گر گئی یا خود اُس نے پھینک دی اور اسے ایک مچھلی نے نگل لیا پھر اتفاق سے وہ مچھلی حضرت سلیمان علیہ السلام کو مل گئی اسے پکانے کے لئے انہوں نے اس کا پیٹ چاک کیا تو انگوٹھی نکل آئی اور اس کا ہاتھ آنا تھا کہ جن و انس سب سلام کرتے ہوئے اُن کے سامنے حاضر ہو گئے ——— یہ پورا افسانہ از سر تا پا خرافات پر مشتمل ہے جنہیں نو مسلم اہل کتاب نے تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے اخذ کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا۔ اور حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کو قرآن کے مجملات کی تفصیلات سمجھ کر اپنی زبان سے نقل کر دیا حالانکہ انگشتری سلیمانی کی کوئی حقیقت ہے نہ حضرت سلیمان کے کمالات کسی انگشتری کا کرشمہ تھے نہ شیاطین کو اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ انبیاءؑ کی شکل بنا کر آئیں اور خلقِ خدا کو گمراہ کریں اور نہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نبی کے قصور کی سزا ایسی فتنہ انگیز شکل میں دے، جس سے شیطان نبی بن کر ایک پوری امت کا ستیاناس کر دے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن خود اسی تفسیر کی تردید کر رہا ہے، آگے آیات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب یہ آزمائش حضرت سلیمان کو پیش آئی اور انہوں نے ہم سے معافی مانگ لی تب ہم نے ہوا اور شیاطین کو اُن کے لئے مسخر کر دیا، لیکن یہ تفسیر اس کے برعکس یہ بتا رہی ہے کہ شیاطین پہلے ہی انگشتری کے طفیل حضرت سلیمان کے تابع فرمان تھے، تعجب ہے جن بزرگوں نے یہ تفسیر بیان کی ہے انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بعد کی آیات کیا کہہ رہی ہے"۔

- دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمان کے ہاں ۲۰ سال کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا شیاطین کو خطرہ پیدا ہوا کہ اگر سلیمان کے بعد یہ بادشاہ ہو گیا تو ہم پھر اس کی غلامی میں مبتلا رہیں گے، اس لئے انہوں نے اسے قتل کر دینے کی ٹھانی، حضرت سلیمان کو اس کا علم ہو گیا اور انہوں نے لڑکے کو بادلوں میں چھپا دیا تاکہ وہیں اس کی پرورش ہوتی رہے یہی وہ فتنہ تھا جس میں حضرت سلیمان مبتلا ہوئے تھے، کہ انہوں نے اللہ پر توکل کرنے کی بجائے بادلوں کی حفاظت پر اعتماد کیا، اس کی سزا ان کو یہ دی گئی کہ وہ بچہ مر کر اُن کی کرسی پر آ گرا۔ یہ افسانہ بھی بالکل بے سروپا اور صریح قرآن کے خلاف ہے کیونکہ اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہوائیں اور شیاطین پہلے سے حضرت سلیمان کے لئے مسخر تھے، حالانکہ قرآن صاف الفاظ میں ان کی تسخیر کو اس فتنہ کے بعد کا واقعہ بتا رہا ہے"۔

- تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمان نے ایک روز قسم کھائی کہ آج رات ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر

ایک سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہوگا مگر یہ بات کہتے ہوئے انہوں نے ان شاء اللہ نہیں کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
صرف ایک بیوی حاملہ ہوئیں اور ان سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا جسے دائی نے لاکر حضرت سلیمان کی کرسی پر ڈال دیا
. . . . . جہاں تک اسناد کا تعلق ہے ان میں سے اکثر روایات کی سند قوی ہے اور باعتبار روایت اس
کی صحت میں کلام نہیں کیا جا سکتا، لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ
بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہوگی جس طرح وہ نقل ہوئی ہے بلکہ آپ نے غالباً یہود کی
یاوہ گوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر اسے بطور مثال کے بیان فرمایا ہوگا اور سامع کو یہ غلطی لاحق ہوگئی کہ
حضور خود بطور واقعہ بیان فرما رہے ہیں . . . . . ؟

" ایک اور تفسیر جس کو امام رازی ترجیح دیتے ہیں یہ ہے کہ حضرت سلیمان کسی سخت مرض میں مبتلا ہوگئے تھے
یا کسی خطرے کی وجہ سے اس قدر متفکر رہتے تھے کہ گھلتے گھلتے وہ بس ہڈی کا ایک پنجر بن کر رہ گئے تھے، لیکن یہ تفسیر
قرآن کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم نے سلیمان کو آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک
جسد لاکر ڈال دیا پھر اس نے رجوع کیا" ان الفاظ کو پڑھ کر کوئی شخص بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس جسد سے مراد خود
حضرت سلیمان ہیں . . . . . "

حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے اور حتمی طور پر اس کی تفسیر بیان کرنے
کے لئے ہمیں کوئی یقینی بنیاد نہیں ملتی، لیکن حضرت سلیمان کی دعا کے یہ الفاظ :-

" اے میرے رب مجھے معاف کردے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد
کسی کو سزاوار نہ ہو "

اگر تاریخ بنی اسرائیل کی روشنی میں پڑھے جائیں — تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ آن کے دل میں غالباً یہ خواہش
تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو اور حکومت و فرمانروائی آئندہ انہی کی نسل میں باقی رہے، اسی چیز کو اللہ تعالیٰ
نے ان کے حق میں " فتنہ " قرار دیا اور اس پر وہ اس وقت متنبہ ہوئے جب ان کا ولی عہد رحبعام ایک ایسا نالائق نوجوان
بن کر اٹھا جس کے لچھن صاف بتا رہے تھے کہ وہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی سلطنت چار دن بھی نہ سنبھال
سکے گا : ان کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈالے جانے کا مطلب غالباً یہی ہے کہ جس بیٹے کو وہ اپنی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے
وہ ایک کندۂ ناتراش تھا تب انہوں نے اپنی اس خواہش سے رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی "

(ص ۳۳۶ - ۳۳۷ - ۳۳۸)

حضرت سیدنا ایوب علیہ السلام نے جو قسم کھائی تھی، اس کی شرح و تفسیر کے بعد مولانا نے ایک فقہی غلط فہمی کو رفع کیا ہے —
فرماتے ہیں :—

" بعض لوگوں نے اس آیت کو حیلۂ شرعی کے لئے دلیل قرار دیا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ایک حیلہ ہی تھا
جو حضرت ایوبؑ کو بتایا گیا تھا لیکن وہ کسی فرض سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ ایک برائی سے بچنے کے لئے بتایا گیا
تھا لہٰذا شریعت میں صرف وہی حیلے جائز ہیں جو آدمی کو اپنی ذات سے یا کسی دوسرے شخص سے ظلم اور گناہ
اور برائی دفع کرنے کے لئے اختیار کئے جائیں ورنہ حرام کو حلال کرنے یا فرائض کو ساقط کرنے یا نیکی سے

بچنے کے لئے حیلہ سازی گناہ در گناہ ہے، بلکہ اس کے ڈانڈے کفر سے جا ملتے ہیں کیونکہ جو شخص ان ناپاک اغراض کے لئے حیلہ کرتا ہے وہ گویا خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے مثلاً جو شخص زکوٰۃ سے بچنے کے لئے سال ختم ہونے سے پہلے اپنا مال کسی اور کو منتقل کر دیتا ہے وہ محض ایک فرض ہی سے فرار نہیں کرتا، وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ظاہری فعل سے دھوکا کھا جائے گا اور اسے فرض سے سبکدوش سمجھ لے گا، جن فقہا نے اس طرح کے حیلے اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں اُن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احکام شریعت سے جان چھڑانے کے لئے یہ حیلہ بازیاں کرنی چاہئیں، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گناہ کو قانونی شکل دے کر بچ نکلے تو قاضی یا حاکم اس پر گرفت نہیں کر سکتا اس کا معاملہ خدا کے حوالے ہے۔" (ص ۳۴۲)

وَلَا یَکَادُ یُبِیْنُ (الزخرف)

"بعض مفسرین نے خیال کیا ہے کہ فرعون کا اعتراض اس لکنت پر تھا، جو موسیٰ کی زبان میں بچپن سے تھی لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، سورہ طٰہٰ میں گزر چکا ہے کہ حضرت موسیٰ کو جب نبوت کے منصب پر سرفراز کیا جا رہا تھا، اس وقت انہوں نے حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ میری زبان کی گرہ کھول دیجئے تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھ سکیں اور اسی وقت ان کی دوسری درخواستوں کے ساتھ یہ درخواست بھی قبول کر لی گئی تھی (آیات ۲۷ تا ۳۶) پھر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر حضرت موسیٰ کی جو تقریریں نقل کی گئی ہیں وہ کمال درجے کی طلاقت لسانی پر دلالت کرتی ہے، لہٰذا فرعون کے اعتراض کی بنا کوئی لکنت نہ تھی، جو آنحضرت کی زبان میں ہو بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص نہ معلوم کیا اُلجھی اُلجھی باتیں کرتا ہے، جو دولت کی سمجھ میں تو کبھی ان کا مدعا آیا نہیں۔" (ص ۵۴۴ - ۵۴۵)

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ یَصِدُّوْنَ (الزخرف)

"اس آیت سے پہلے آیت ۴۵ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ تم سے پہلے جو رسول ہو گزرے ہیں ان سب سے پوچھ دیکھو کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کئے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے۔ یہ تقریر جب اہل مکہ کے سامنے ہو رہی تھی، ایک تو ایک شخص نے جس کا نام روایات میں عبداللہ ابن الزبعریٰ آیا ہے اعتراض جڑ دیا کہ کیوں صاحب عیسائی مریم کے بیٹے کو خدا کا بیٹا قرار دے کر اس کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں! پھر ہمارے معبود کیا بُرے ہیں، اس پر کفار کے مجمع سے ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا اور نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ وہ مارا، پکڑے گئے، اب بولو اس کا کیا جواب ہے، لیکن اُن کی اس بیہودگی پر سلسلہ کلام توڑا نہیں گیا، بلکہ جو مضمون چلا آ رہا تھا پہلے اسے مکمل کیا گیا اور پھر اس سوال کی طرف توجہ کی گئی جو معترض نے اُٹھایا تھا (واضح رہے کہ اس واقعہ کو تفسیر کی کتابوں میں مختلف طریقوں سے روایت کیا گیا ہے، جن میں بہت کچھ اختلاف ہے، لیکن آیت کے سیاق و سباق اور اُن روایات پر غور کرنے کے بعد ہمارے نزدیک واقعہ کی صحیح صورت وہی ہے جو ابھی ہم نے بیان کی ہے)

وَقِیْلِهٖ یٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (الزخرف)

"یہ قرآن مجید کی نہایت مشکل آیات میں سے ہے، جس میں نحو کا یہ نہایت پیچیدہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقیلہ میں واؤ کیسا ہے اور اس لفظ کا تعلق اوپر کے سلسلہ کلام میں کس چیز کے ساتھ ہے۔ مفسرین نے اس پر بہت کچھ کلام کیا ہے مگر کوئی تشفی بخش بات مجھے اُن کے ہاں نہیں ملی، میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح بات وہی ہے جو شاہ عبدالقادر صاحب

کے ترجمے سے مترشح ہوتی ہے یعنی اس میں واؤ عطف کا نہیں بلکہ قسمیہ ہے اور اس کا تعلق قالنی یونکون سے ہے اور قیلہ کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرتی ہے جس پر یارب ان ھؤلاء قوم لا یومنون کا فقرہ صریح دلالت کر رہا ہے، آیت کا مطلب یہ ہے ۔

"قسم ہے رسول کے اس قول کی کہ اے رب! یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے، کیسی عجیب ہے ان لوگوں کی فریب خوردگی کہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اور ان کے معبودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور پھر بھی خالق کو چھوڑ کر مخلوق ہی کی عبادت پر اصرار کئے جاتے ہیں "

" رسول کے اس قول کی قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ روش صاف ثابت کئے دے رہی ہے کہ فی الواقع یہ ہٹ دھرم ہیں کیونکہ ان کے رویہ کا غیر معقول ہونا ان کے اپنے اعتراف سے صاف ظاہر ہے اور ایسا غیر معقول رویہ نہیں شخص اختیار کر سکتا ہے جو نہ ماننے کا فیصلہ کئے بیٹھا ہو، بالفاظ دیگر یہ قسم اس معنی میں ہے کہ بالکل ٹھیک کہا رسول نے کہ فی الواقع یہ مان کر دینے والے لوگ نہیں ہیں " (ص ۵۵۳ - ۵۵۴)

. . . . . . یوم تاتی السماء بدخان مبین . . . . . . (الدخان)

" ان آیات کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہوا ہے اور یہ اختلاف صحابہ کرام کے زمانے میں بھی پایا جاتا تھا . . . . . . ! (اس کے بعد مولانا مودودی نے تفاسیر کے تعارض و اختلاف کی تفصیل پیش کر کے اس سے بحث کی ہے اور آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں) :۔

" قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ آسمان دھواں لئے ہوئے آ گیا ہے اور لوگوں پر چھا گیا، وہاں تو کہا گیا ہے کہ " اچھا تو اس دن کا انتظار کرو جب آسمان صریح دھواں لئے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا " بعد کی آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس ارشاد کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم نہ رسول کے سمجھانے سے مانتے ہو، نہ قحط کی شکل میں جو تنبیہ کی گئی ہے، اس سے ہوش میں آتے ہو تو پھر قیامت کا انتظار کرو اس وقت جب پوری طرح شامت آئے گی، تب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا تھا " پس جہاں تک دھوئیں کا تعلق ہے، اس بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ قحط کے زمانہ کی چیز نہیں بلکہ علاماتِ قیامت میں سے ہے اور یہی بات احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے، تعجب ہے کہ مفسرین کبار میں سے جنہوں نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تائید کر دی اور جنہوں نے ان کی تردید کی انہوں نے پوری بات کی تردید کر دی حالانکہ آیات اور احادیث پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا کونسا حصہ صحیح ہے اور کونسا غلط ؟

(ص ۵۶۴ - ۵۶۵)

مولانا مودودی نے ان عقائد کی بھی تردید کی ہے، جو بعض غلط اندیش فرقوں نے قرآن ہی سے اخذ و منسوب کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً :۔

(انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا) (الاحزاب)

" ایک گروہ نے اس آیت کی تفسیر میں صرف اتنا ہی ستم نہیں کیا ہے کہ ازواج مطہرات کو " اہل البیت " سے خارج کر کے صرف علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد کے لئے اس لفظ کو خاص کر دیا بلکہ مزید ستم یہ بھی کیا ہے کہ اس کے الفاظ " اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے " سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ حضرت علیؓ و

فاطمہؓ کی اولاد انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم ہیں اور اُن کا کہنا یہ ہے کہ گندگی سے مراد خطا اور گناہ ہے اور ارشادِ الٰہی کی رو سے یہ اہل البیت اس سے پاک کر دئے گئے۔" حالانکہ آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ تم سے گندگی دور کر دی گئی، اور تم بالکل پاک کر دئے گئے بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تم سے گندگی کو دور کرنا اور تمہیں پاک کر دینا چاہتا ہے۔ سیاق و سباق یہ نہیں بتاتا کہ یہاں مناقب اہل بیت بیان کرنے مقصود ہیں بلکہ یہاں تو اہل بیت کو نصیحت کی گئی ہے کہ تم فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو اس لئے اللہ تمہیں پاک کرنا چاہتا ہے بہ الفاظ دیگر مطلب یہ ہے کہ تم فلاں رویہ اختیار کرو گے تو پاکیزگی کی نعمت تمہیں نصیب ہوگی ورنہ نہیں، تاہم اگر یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس . . . . ویطہرکم تطہیرا کا یہ مطلب لیا جائے، کہ اللہ نے ان کو معصوم کر دیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وضو، غسل اور تیمم کرنے والے تمام مسلمانوں کو معصوم نہ مان سمجھ لیا جائے، کیونکہ ان کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولکن یرید لیطہرکم و لیتم نعمتہ علیکم مگر اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے (المائدہ — آیت ۶)

قل یعبادی الذین اسرفوا . . . . (الزمر)

"بعض لوگوں نے ان الفاظ کی عجیب تاویل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خود "اے میرے بندو" کہہ کر لوگوں سے خطاب کرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا سب انسان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے ہیں، یہ درحقیقت ایک ایسی تاویل ہے جسے تاویل نہیں قرآن کی بدترین معنوی تحریف اور اللہ کے کلام کے ساتھ کھیل کہنا چاہئے۔ جاہل عقیدتمندوں کا کوئی گروہ تو اس نکتے کو سن کر جھوم اٹھے گا لیکن یہ تاویل صحیح ہو تو پورا قرآن غلط ہوا جاتا ہے، کیونکہ قرآن تو از اول تا آخر انسانوں کو صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیتا ہے اور اس کی ساری دعوت ہی یہ ہے کہ تم ایک اللہ کے سوا اور کسی کی بندگی نہ کرو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود بندے تھے، ان کو اللہ نے رب نہیں رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس لئے بھیجا تھا کہ خود بھی اُس کی بندگی کریں اور لوگوں کو بھی اسی کی بندگی سکھائیں۔ آخر کسی صاحب عقل آدمی کے دماغ میں یہ بات کیسے سما سکتی ہے کہ مکہ معظمہ میں کفار قریش کے درمیان کھڑے ہو کر ایک روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یکایک یہ اعلان کر دیا ہوگا کہ تم عبدالعزیٰ اور عبدشمس کی بجائے دراصل عبدِ محمد ہو، (اعاذنا اللہ من ذالک) (ص ۳۶۹)

قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ (الشوریٰ)

. . . . . اس لفظ "قربیٰ" کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہوا ہے۔

"ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنیٰ میں لیا ہے اور آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ یعنی اہل قریش کم از کم اس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، چاہئے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے، لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تل گئے ہو، یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے واسطے سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور ابن سعد وغیرہم نے نقل کیا ہے اور یہی تفسیر مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سدی، ابو مالک، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ضحاک، عطاء بن دینار اور دوسرے اکابر مفسرین نے کی ہے۔

"دوسرا گروہ" قربیٰ" کو قرب اور تقرب کے معنی میں لیتا ہے اور آیت کا یہ مطلب بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام کا کوئی اجر نہیں چاہتا اس کے سوا کہ تمہارے اندر اللہ کے قرب کی چاہت پیدا ہو جائے" یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ بس یہی میرا اجر ہے" یہ تفسیر حضرت حسن بصری سے منقول ہے اور ایک قول قتادہ سے بھی اس کی تائید میں نقل ہوا ہے" بلکہ طبرانی کی ایک روایت میں ابن عباس کی طرف بھی یہ قول نقل کیا گیا ہے، خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر بھی مضمون ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے "قل لا اسئلکم علیہ من اجر الا من شاء ان یتخذ الی ربہ سبیلا (الفرقان ۵۷)" ان سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرے"

"تیسرا گروہ قربیٰ کو اقرب (رشتہ داروں) کے معنی میں لیتا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو" پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمطلب مراد لیتے ہیں اور بعض اسے صرف حضرت علی و فاطمہ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں، یہ تفسیر سعید بن جبیر اور عمرو بن شعیب سے منقول ہے اور روایات میں یہی تفسیر ابن عباس اور حضرت علی بن حسین (زین العابدین) کی طرف منسوب کی گئی ہے، لیکن متعدد وجوہ سے یہ تفسیر قابل قبول نہیں ہو سکتی، اول تو جس وقت مکہ معظمہ میں یہ سورۃ شوریٰ نازل ہوئی ہے اس وقت حضرت علیؓ و فاطمہؓ کی شادی تک نہیں ہوئی، اولاد کا کیا سوال؟ اور بنی عبدالمطلب سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ ان میں بعض کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھی تھے اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمطلب ہی نہ تھے، آپ کی والدہ ماجدہ آپ کے والد ماجد اور آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ کے واسطے سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپ کی رشتہ داریاں تھیں اور سب گھرانوں میں آپ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی آخر حضور کے لئے کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اقرباء میں سے صرف بنی عبدالمطلب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس مطالبہ محبت کو انہی کے لئے مخصوص رکھتے، تیسری بات جو ان سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ نبی جس مقام بلند پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے اس مقام سے اس کار عظیم پر اجر مانگنا کہ میرے رشتہ داروں سے محبت کرو اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحب ذوق سلیم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبی نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی، قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصے آئے ہیں ان میں ہم دیکھتے ہیں نبی پر نبی اٹھ کر یہی کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ رب العالمین کے ذمہ ہے، سورہ یٰسین میں نبی کی صداقت جانچنے کا یہ معیار بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے میں اللہ کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقریر کے مخاطب اہل ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں، اوپر سے ساری تقریر انہی سے خطاب کرتے ہوئے چلی آ رہی ہے اور آگے بھی روئے سخن انہی کی طرف ہے اس سلسلہ کلام میں مخالفین میں سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا سوال آخر

کہاں پیدا ہوتا ہے' اجر تو ان لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اُس کام کی کوئی قدر ہو، جو کسی شخص نے اُن کے لئے انجام دیا ہو' کفار حضورؐ کے اس کام کی کون سی قدر کرتے تھے کہ آپ ان سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمہاری انجام دی ہے اس پر تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرنا، وہ تو الٹا جرم سمجھ رہے تھے، اور اسی کی بنا پر آپ کی جان کے درپے تھے۔" (ص ۵۰۱-۵۰۲)

وکل فی فلک یسبحون (یٰسٓ)

"فلک کا لفظ عربی میں سیاروں کے مدار (ORBITS) کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفہوم سماء (آسمان) کے مفہوم سے مختلف ہے یہ ارشاد کہ "سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں" چار حقیقتوں کی نشاندہی کرتا ہے ایک یہ کہ نہ صرف سورج اور چاند، بلکہ تمام تارے اور سیارے اور اجرام فلکی متحرک ہیں' دوسرے یہ کہ ان میں ہر ایک کا فلک یعنی ہر ایک کی حرکت کا راستہ یا مدار الگ ہے' تیسرے یہ کہ افلاک تاروں کو لئے ہوئے گردش نہیں کر رہے ہیں، بلکہ تارے افلاک میں گردش کر رہے ہیں، اور چوتھے یہ کہ افلاک میں تاروں کی حرکت اس طرح ہو رہی ہے جیسے کسی سیال چیز میں کوئی شے تیر رہی ہو۔

" ان آیات کا اصل مقصد علم ہیئت کے حقائق بیان کرنا نہیں ہے بلکہ انسان کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور عقل سے کام لے تو زمین سے لے کر آسمان تک جدھر بھی وہ نگاہ ڈالے گا اس کے سامنے خدا کی ہستی اور یکتائی کے بے حد و حساب دلائل آئیں گے اور کہیں کوئی ایک دلیل بھی دہریت اور شرک کے ثبوت میں نہ ملے گی (اس کے بعد مولانا مودودی نے نظام شمسی کی جدید ترین تحقیقات کے اعداد و شمار اور ضروری تفصیل درج کی ہے)

" . . . . . ان میں سے قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی دس لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہونچتی ہے، رہے بعید ترین اجرام فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں اُن کی روشنی تو زمین تک پہونچنے میں دس کروڑ سال لگ جاتے ہیں اس پر بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے' خدا کی خدائی کا بہت تھوڑا حصہ ہے جو اب تک انسانی مشاہدے میں آیا ہے' آگے نہیں کہا جا سکتا کہ مزید ذرائع مشاہدہ فراہم ہونے پر کتنی وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔" (ص ۲۶۱)

"تفہیم القرآن" میں قرآن کریم کی آیات کی ترجمانی جس انداز میں کی گئی ہے اُردو زبان و ادب میں وہ اپنی جگہ منفرد ہے اس اعتبار سے "تفہیم" اُردو داں طبقہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے! اس کتاب میں قرآنی آیات کی شرح و تفسیر میں جو حواشی دئے گئے ہیں وہ مدلل ہی نہیں یقین افروز بھی ہیں، عقل و نقل کے امکانی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر کلام الٰہی کی شرح کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے ذہن و فکر کو اطمینان بلکہ روحانی فرحت و آسودگی حاصل ہوتی ہے! وہ مقامات جہاں مفسرین کے درمیان اختلافات ہیں، وہاں مولانا مودودی نے ان اختلافات کے درمیان محاکمہ کر کے "معقول" سے اختیار کی ہے یا اس تفسیر کو ترجیح دی ہے جو ان کے نزدیک اقرب الی الحق اور قرآن کی روح کے مطابق ہے! مولانا مودودی جدید علوم سے بھی واقف ہیں مگر ترجمانی و تفسیر میں "تجدد و تفرنج" کا رنگ پیدا ہونے نہیں پایا! انہوں نے جہاں ضرورت محسوس کی ہے صحف سابق سے بھی قرآنی آیتوں کی تطبیق کا کام لیا ہے اور جہاں قرآن سے انحراف ملتا ہے اس "تحریف" کی بھی انہوں نے نشاندہی کر دی ہے۔

جو حضرات مودودی صاحب کے علم و فضل پر بحث بلکہ طنز کیا کرتے ہیں، اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ اگر مولانا نے متداول علوم دینیہ پر عبور

قرآن کریم کی اس قدر شاندار ترجمانی اور عالمانہ شرح و تفسیر فرمادی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ یا تو یہ کتابیں کسی اکیڈمی درمجمع علماء نے اُن کے نام سے لکھ دی ہیں یا پھر مولانا مودودی کو الہام ہوا کرتا ہے! "تفہیم القرآن" مولانا مودودی کے علم و فضل اور دینی بصیرت کی سب سے بڑی شہادت، سند اور صداقت نامہ ہے۔

جو حضرات مولانا کی کتابیں پڑھے بغیر سنی سنائی باتوں کی بنا پر مولانا پر فساد دین کا الزام لگایا کرتے ہیں اُن کو چاہیے کہ وہ آخرت کے مواخذہ سے بچنے کے لئے "تفہیم القرآن" کا مطالعہ کریں اور سوچیں کہ اسلام کے کسی بنیادی عقیدہ اور رکن کے خلاف کیا کوئی ایک حرف بھی اس کتاب میں ملتا ہے؟ فلنی مباحث بلکہ کلامی عقائد میں بھی مولانا مودودی نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے فساد دین سے تعبیر کیا جائے! حیرت ہے جس شخص کی تحریریں لوگوں کو دین کی طرف بلاتی ہیں اور دلوں سے شکوک و اوہام دور کر کے یقین و ایمان پیدا کرتی ہیں اُس پر "فساد دین" کا الزام لگایا جاتا ہے ــــ گروہی تعصب اور فتنۂ معاصرت سے اللہ کی پناہ!

"تفہیم القرآن" ــــ دین و اخلاق اور علم و بصیرت کا قابل قدر سرمایہ ہے، یہ کتاب تفاسیر قرآن میں خاص شانِ امتیاز رکھتی ہے۔ یہ کتاب دورِ حاضر کے فتنوں، گمراہیوں اور دہشت پسندانہ بے اعتدالیوں کے لئے پیغام مرگ اور ایمان و یقین کی طاقتوں کو مژدۂ حیات ہے خاص طور پر "ختم نبوت" پر جو ضمیمہ تفہیم القرآن میں شامل ہے اُس نے "فتنۂ قادیانیت" کی اچھی طرح قلعی کھول دی ہے اور اس مسلک کفر کو پوری طرح عریاں و بے آبرو کردیا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مولانا مودودی مقام دعوت ہی نہیں مقام عزیمت پر بھی فائز ہیں اور کلمۂ حق کہنے میں وہ اُس ستائش کے مستحق ہیں جسے حدیث شریف میں "افضل الجہاد" فرمایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو ہر طرح کے کید و شر سے محفوظ رکھے اور ان کو اعلان حق اور استقامت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے (آمین)

وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
منگھا پیر روڈ
کراچی
ہر قسم کا سوتی اور کپڑا
کورا اور دھلا لٹھا اور ہر قسم کا
دھاگا
تیار ہوتا ھے
باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کا تیار شدہ کپڑا
ہر اعتبار سے قابل اعتماد ہے پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی آپ کا
قومی فریضہ ہے

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
آدم جی کاٹن ملز لانڈھی۔ کراچی

آپ کے اور
آفتاب کے مابین!
جب آپ لُو اور گرمی کے ہاتھوں پریشان پژمردہ
اور بے جان ہوں تو رُوح افزا کے ایک گلاس سے تسکین
تازگی اور فرحت حاصل کیجئے۔ یہ ایک صحت بخش شروب
ہے جو آپ کو گرمی کے مضر اثرات سے بچاتا ہے اور لُو لگنے
سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے استعمال
سے آپکو فرحت اور تازگی کا احساس ہوگا۔
سرخی اور شیرینی میں اس کا مقابل نہیں۔
رُوح افزا
مشروب مشرق
ufp
ہمدرد فروٹ پروڈکٹس (پاکستان)
لاہور - کراچی
اب آسانی سے دستیاب ہے

جون ۱۹۶۷ء

کراچی

ماهنامہ فاران

جلد ۱۹
شمارہ ۳

ایڈیٹر: ـــــــ ماہرالقادری

ترتیب

چندہ سالانہ ۷ روپے | پبلشر :- سرور حسین | قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

مقامِ اشاعت: دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام [illegible] سرور حسین پبلشر نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

دنیا کی ہر حکومت اور سلطنت میں ملک کا نظم و نسق چلانے کے لئے محکموں اور دفتروں کی ضرورت پیش آتی ہے ــــــ ــــــ ان محکموں میں اعلیٰ عہدیداروں سے لے کر دفتر کے چپراسی تک اپنے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہیں۔ ان کی تعاون و اشتراکِ عمل سے حکومت کی مشنری رواں دواں اور اس کے کل پرزے فعال و متحرک رہتے ہیں۔ عمالِ حکومت، حکومت کے ناقد محتسب نہیں بلکہ اس کے فرمانبردار ہوتے ہیں! یہ لوگ ملازمت کسی اپنے نظریہ اور عقیدہ کی ترویج و اشاعت کی غرض سے اختیار نہیں کرتے بلکہ ان کے سامنے سب سے پہلا اور اصل سوال ان کے روزگار اور تن پروری کا ہوتا ہے، ان میں شاذ و نادر ہی کوئی مائی کا لال ایسا نکلتا ہے جو کسی اصول کی خاطر کلمۂ حق بلند کر کے اپنے روزگار کو خطرے میں ڈال دے، حکومت کے عمال اور کارپرداز اگر تعمیلِ حکم اور اطاعتِ فرمان کی بجائے حکومت کی پالیسیوں پر جرح و تنقید کرنے لگیں تو حکومت کی مشنری ٹھپ ہو کر رہ جائے۔

یہ ہم سب کے سامنے کی بات ہے کہ انگریز کے دورِ حکومت میں جو عہدیدار ــــ انگریز کے حکم کی تعمیل میں قومی لیڈروں کو گرفتار اور قید کیا کرتے تھے، جب انگریز چلا گیا اور قومی حکومت آئی تو وہ انگریز کی بجائے ان لیڈروں کی تابعداری کرنے لگے۔

ـــــــ مگر ـــــــ

علمائے کرام چاہے وہ حکومت ہی کے کسی علمی ادارے سے متعلق کیوں نہ ہوں، اور حکومت کے خزانہ سے تنخواہ یا وظیفہ پاتے ہوں، اُن کا حال حکومت کے عمال اور کارندوں جیسا نہیں ہوتا وہ صرف روزی کمانے اور تن پروری کے لئے کوئی ذمہ داری، منصب اور عہدہ قبول نہیں کرتے، یہ حضرات اربابِ حکومت کے مشیر ہی نہیں محتسب بھی ہوتے ہیں، مثال کے طور پر حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے ہارون الرشید جیسے طاقتور با جبروت خلیفہ کی زندگی اور حکومت کی پالیسی پر سخت انداز میں احتساب کیا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ــــ شہنشاہ جہانگیر کے دورِ حکومت کے منکرات سے کھل کر اختلاف فرمایا تھا اور محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بادشاہ کے حکم سے علماء کی جو کمیٹی مقرر ہوئی تھی، وہ فتاویٰ کی تشکیل اور قوانین کی تالیف و تسوید میں شریعت کے تقاضوں کا پورا خیال رکھتی تھی؛ حاکم وقت کے کسی رجحان کی رعایت مدِ نظر نہ تھی۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں وہ یہ کہ حکومت پاکستان نے تحقیقات اسلامی کے لئے ایک ادارہ مقرر کیا ہے ظاہر ہے جو افراد اس کارِ عظیم کے لئے متعین و منتخب کئے گئے ہیں وہ حکومت کی نگاہ میں "علماء دین" ہوں گے، کیونکہ اس اہم بالشان خدمت کو وہی حضرات انجام دے سکتے ہیں جو دینی علوم میں بصیرت رکھتے ہوں، اور جن کی فکر، معلومات رائے اور دینی فراست پر اعتماد اور جن سے دینی مسائل میں کلمۂ حق سننے کی توقع کی جا سکے۔

ادارۂ تحقیقات اسلامی کی جانب سے ماہنامہ "فکر و نظر" شائع ہوتا ہے اور اس ادارے کی متعدد کتابیں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں! جہاں تک ہمارے مطالعہ اور معلومات کا تعلق ہے ادارہ ہذا نے حکومت پاکستان کو اس قسم کا کوئی مشورہ نہیں دیا کہ اسلامی علوم کی تحقیقات تو بعد کی چیز ہے، سب سے پہلے حکومت کو وہ معروف قائم کرنے چاہئیں جو تمام مسلمان فرقوں کے نزدیک مسلم ہیں اور ان منکرات پر قدغن لگانی چاہئے، جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، ادارۂ تحقیقات اسلامی کے فاضل ارکان اور دانشور کیا یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ انگریز اپنے راج میں جس طرح "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" سے بیگانہ اور غیر متعلق تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی اس فریضہ کی انجام دہی سے اسی طرح کی بے تعلقی کا رنگ نظر آتا ہے۔ صرف ایک "منکر" ——— شراب نوشی ——— کو ہی لے لیجئے، اس کی روک تھام تو ایک طرف رہی اس کے مدارج، دوکانیں صرف اور کھپت میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے ایسا ہی حال زندگی کے دوسرے شعبوں کا ہے کہ معاشرے کو اسلامی اخلاق کی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے حکومت نے اپنے ذرائع استعمال کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی، جو حکومت اپنی مرضی سے دارالخلافہ منتقل کر سکتی ہے۔ جس حکومت نے معروف جمہوریت کے مقابلہ میں "بنیادی جمہوریت" کو ایجاد کیا ہے، جو حکومت ملک گیر پیمانہ پر ایک سیاسی جماعت کو وجود میں لا سکتی ہے، جس حکومت نے علماء کرام کے فتووں کے علی الرغم عائلی قوانین کو نافذ فرمایا گیا۔ اور وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ــ

ہم گئے تھے عرض کرنے مدعا
اور عرض مدعا ہی رہ گیا

جو حکومت کشمیر کا ذکر کئے بغیر تاشقند کی سرزمین پر صلح کا معاہدہ کر سکتی ہے وہ طاقت ور حکومت چاہتی تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتی تھی، مگر افسوس ہے کہ اس معاملہ میں حکومت کی کارکردگی کا ورق سادہ ہی نظر آتا ہے، ادارۂ تحقیقات اسلامی کے علماء جن کو دینی معاملات میں حکومت کا مشیر ہونا چاہئے وہ پاکستان کی موجودہ صورت حال سے مطمئن نظر آتے ہیں اور اس میں غالباً تبدیلی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں فرماتے، اگر اپنے اندر وہ کوئی خلش، بے چینی اور اضطراب محسوس کرتے تو اس کا اظہار ان کے قول و عمل سے ہونا چاہئے تھا

اس کے برخلاف ادارۂ تحقیقات اسلامی نے اب تک تحقیق و انکشاف کا جو کارنامہ انجام دیا ہے اس میں وہ "تجدد" نمایاں طور پر جھلکتا ہے، جس کے ہاتھوں دین کی قدریں صحیح سلامت نہیں رہ سکتیں اور جس کا مزاج تحقیقات سے زیادہ تاویلات بلکہ تحریفات کا مزاج ہے! اس ادارے کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے افکار اور نظریوں پر علماء دین اور فقہائے امت جرح و تنقید کا فرض انجام دے چکے ہیں ——— صرف ایک اقتباس :۔

"لگے ہاتھوں یہ بھی فرما دیا جائے کہ آپ کا نام نہاد "ادارہ تحقیقات" جو صرف اجماعی مسائل کو نہیں بلکہ صریح کتاب اور صریح سنت مشہورہ کے قطعی مسائل کو بھی وقتی اور ہنگامی قرار دیکر بدل ڈالنا "کار ثواب" سمجھتا ہے" (مجلہ "الحق" اکوڑہ خٹک ۔ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۹ھ)

خاندانی منصوبہ بندی ہو، سود ہو، عائلی قوانین یا اس قسم کے دوسرے مسائل ہوں، ان میں ادارۂ تحقیقات اسلامی کا قریب قریب وہی نظریہ ہے جو پاکستان کے ارباب حل و کشاد کا ہے! مختصر لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ادارۂ مذکور دینی مسائل میں حکومت کے رجحانات کی تائید کے لئے اپنی بصیرت و فراست اور مذہبی علم و مطالعہ کو صرف کرتا ہے۔

تکفیر ــ مجلہ "فکر و نظر" کا ماہ اپریل ۶۹ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے اس کے اداریئے میں لکھا ہے :۔

"تکفیر یعنی مسلمانوں کا ایک دوسرے کو کافر قرار دینا دینی اور اخلاقی لحاظ سے ہمیشہ مذموم رہا ہے۔"

فاضل مدیر کی رائے سے ہم حرفاً حرفاً متفق ہیں کہ مسلمانوں میں ایک دوسرے کی "تکفیر" ہر اعتبار سے مذموم، منفرت رساں اور قابل
ت وبیزاری ہے خاص طور سے فروعی مسائل میں تفسیق وتکفیر کی حد تک آ جانا یہ وہ فعل ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے ! مثلاً جن
ئ علماء نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تکفیر کی، انہوں نے ایک طرف اپنی عاقبت کو خراب کیا اور دوسری طرف مسلمانوں
ا افتراق پیدا کر دیا ! اس اعتراف کے بعد عرض ہے کہ تکفیر کوئی عنقا صفت شے نہیں ہے جس کا خارج میں سرے سے وجود ہی نہ ہو، اور کوئی
ہ گو چاہے عقیدے اور نظریے کی شدید سے شدید ضلالت میں کیوں نہ مبتلا ہو جائے اور کیسی ہی غلیظ کفریات کیوں نہ بکنے لگے اس کو کافر
سیار نہیں دیا جا سکتا۔ ایک مسلمان سے ایسے فعل کا ارتکاب بھی ممکن ہے جس پر —————— "کفر" کا حکم لگایا جا سکتا
ہے اور ایسی تکفیر دینی نقطہ نگاہ سے کوئی عیب کی بات اور ناپسندیدہ چیز نہیں ہے مثلاً بعض مسلمان فلسفیوں کا یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ کو
زئیات کا علم نہیں ہے، کیا یہ کفریہ عقیدہ نہیں ہے؟ یا جو کوئی دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ماخذ اور حجت ہونے کی تردید
رکے در اصل منصب نبوت کی نفی کرتا ہے اس نظریہ اور عقیدہ کے بعد کیا اس کا ایمان اور اسلام صحیح سلامت رہ سکتا ہے ! یا ایک شخص بعثت خاتم
لنبیین کے بعد اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کی جھوٹی نبوت پر ایک گروہ جمع ہو جاتا ہے، کیا جدید نبوت کا یہ پورا انسٹی ٹیوشن کفر وارتداد
کا ادارہ نہیں ہے، ایسے لوگوں کا ایمان واسلام اور ملت محمدیہ سے کیا واسطہ ؟ اتحاد ملت اسلامیہ کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس گروہ کے بارے میں ہمیشہ
اعلان کرتے رہنا چاہئے کہ یہ مصنوعی خود ساختہ اور جھوٹی نبوت ہے اور اس کے ماننے والے ملت اسلامیہ کے فرد نہیں ہیں۔

جناب محمد سرور صاحب مدیر مجلہ "فکر ونظر" ملت اسلامیہ کے باہم مربوط ومتحد ہونے کی دعوت دیتے ہوئے رقمطراز
ہیں ——————

"جہاں تک پوری ملت اسلامیہ کے باہم متحد ومربوط ہونے کی ضرورت کا سوال ہے، اس وقت دنیا جس
طرح بڑے بڑے نظریاتی اور سیاسی بلاکوں میں منقسم ہے، اسے دیکھتے ہوئے اس سوال کی اہمیت
کسی سے مخفی نہیں، روس کی کمیونزم ہو، یا چین کی یا امریکہ اور برطانیہ کی سرمایہ دارانہ جمہوریت، یہ سب
نظریات اور نظام ہائے حیات کے زبردست سیلاب ہیں، جن کے سامنے کوئی چیز جب تک وہ خود اپنی جگہ
محکم نہ ہو، ٹھہر نہیں سکتی، عالم اسلام کو اگر اس ہمہ جہتی اور ہمہ گیر سیلاب میں تہ آب نہیں ہونا چاہئے، تو اسے
اپنے نظریہ حیات اور نظام حیات ہر دو میں اتنا ہی منضبط ومتحد ہونا پڑے گا جتنی کہ یہ اوپر کی تحریکیں
ہیں، اور ظاہر ہے متحارب، متخاصم فرقوں میں بٹا ہوا اسلام اور تقلید وجمود اور فکر وعمل کی تنگی کی
زنجیروں میں مقید اسلام کا قانون ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا"

مسلمان فرقوں کے اتحاد کی دعوت کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں جامد تقلید، فرقہ وارانہ عصبیت اور فروعی مسائل میں نزاع، ان باتوں کے خلاف ہم "فاران"
میں لکھتے رہے ہیں مگر دنیا کا کوئی مکتبہ فکر اور ادارہ اور "ازم" ایسا نہیں ہے جس کے قانون ودستور میں پابندیاں نہ پائی جائیں، آپ چاہیں تو ان پابندیوں کو
"زنجیریں" کہہ لیجئے مگر ان "زنجیروں" سے مفر نہیں ! قرآن وسنت نے یعنی اللہ اور رسول نے معاشرے کی فلاح وبہبود کے لئے کچھ اخلاقی پابندیاں لگائی
ہیں، یہ پابندیاں دائمی اور ابدی ہیں، ان میں رد وبدل کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے، جو کوئی ان پابندیوں کو "زنجیریں" سمجھ کر توڑنے کی کوشش کرے گا
وہ اسلام کا نافرمان کہلائے گا ! مثلاً سرمایہ وتجارت میں اسلام نے سود پر پابندی لگائی ہے یہ پابندی ہمیشہ باقی رہنی چاہئے، عورت کی عصمت و
عفت کی خاطر اللہ تعالیٰ نے جلباب وخمار کے اہتمام کے ساتھ تبرج جاہلیت کے مظاہرہ پر پابندی عائد کی ہے ان پابندیوں کو نہیں توڑا جا سکتا، ہم روس
چین، امریکہ اور برطانیہ کے نظام ہائے حیات کا مقابلہ، اسلام کی ہیئت وسالمیت اور اس کے حدود کو باقی رکھ کر ہی کر سکتے ہیں، اگر اس وقت اور

مقابلہ میں اسلام کی حدود ہمارے ہاتھوں مجروح ہوگئیں اور وہ اخلاقی زنجیریں ٹوٹ گئیں جن کو اسلام باقی رکھنا چاہتا ہے ۔۔۔ تو یہ مقابلہ کہاں ہوا؟ یہ تو اپنی شکست کا اعتراف ہے ۔

اور سنئے :۔۔۔

"یہی احساس ہے جو مصر اور دوسرے مسلمان ملکوں کو مجبور کر رہا ہے کہ علوم اسلامی کے ارد گرد ماضی میں جو فرقہ وارانہ دیواریں بنا دی گئی ہیں وہ اُن کو ڈھائیں ۔"

مصر کا ذکر فرما کر، فاضل مدیر نے اپنی طبیعت کے میلان اور مزاج کی افتاد کا اظہار کر دیا! آج کا مصر عوام کا نہیں جمال ناصر کا نام ہے جس شخص نے اسلام کے مقابلہ میں عرب قومیت کا فتنہ کھڑا کر دیا ہو اور جو ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کا مذاق اڑاتا ہو جہاں ملت اسلامیہ کی توہین و تذلیل کے لئے ۔۔۔ نحن ابناء الفرعونا ۔۔۔ (ہم فرعونوں کی اولاد ہیں) ۔۔۔ کا نعرہ لگایا جا رہا ہو، کیا اُس ملک کے حالات کو ایک اچھے نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے :۔۔۔

"اسلام کا مطالعہ جزوی نہیں، بلکہ کلی نقطہ نظر سے کریں، اور اُس کے اصل سرچشموں تک پہونچ کر فرقوں کی موجودہ کثرت کو ایک بڑی وحدت کے اندر لے آئیں ۔"

لیکن ملت کی اس بدنصیبی کو کیا کہئے کہ ان فرقوں کے ہجوم میں، ایک جدید فرقہ مسلمانوں میں پیدا ہو چکا ہے جو دین کے افکار و نظریات کی اس انداز میں توجیہ اور تاویل کر رہا ہے کہ جس سے دین کے اصل سرچشمے مکدر ہوتے جا رہے ہیں! جو "مفکرین" ۔۔۔ "وقت کے تقاضوں" ۔۔۔ کو دین کا "اصل محور" اور "مرکزی نقطہ" سمجھتے ہوں اور جن کا یہ نظریہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے مطابق دینی احکام کو برتا تھا، ہمیں اپنے زمانہ کے لحاظ سے اُن کو برتنا ہے ۔۔۔ تو اس نظریہ کی روشنی میں سنتِ رسول کی جو دین کا ماخذ و اساس ہے کیا اہمیت اور افادیت باقی رہ جاتی ہے! اور اس طرح (بخاک بدہن گستاخ) حضور کا اسوۂ حسنہ ایک تقویم پارینہ یا زیادہ سے زیادہ ایک ایسا "مخطوطہ" بن کر رہ جاتا ہے، جسے قدیم یادگار کے طور پر میوزیم میں رکھا جا سکتا ہے! یعنی جو حضرات اتحادِ ملت کے داعی، نقیب اور مبلغ ہیں، وہ دین کے بعض مسلّمات کی ایسی توجیہ و تاویل فرمانے کی جرأت کر رہے ہیں، جو امت میں شدید اضطراب اور افتراق کا سبب بنتا جا رہا ہے ۔۔۔ ایک مسلمان اس انداز پر سوچ ہی نہیں سکتا کہ "سنتِ رسول، اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق ایک عمل تھا" !! معاذ اللہ! حالانکہ ۔۔۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مصر اور صدر ناصر کے ذکر سے اخوان المسلمون پر بھی تنقید ضروری تھی، اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے :۔۔۔

"۔۔۔۔۔ اخوان المسلمین کی صدر ناصر اور جو اُس سے پہلے تھے، ان حکومتوں سے ٹکر کی وجہ در اصل یہ تھی کہ اخوان المسلمین حکومت پر شریعت کو مقدم قرار دیتے تھے، ان کے نزدیک حکومت کو شریعت کا تابع ہونا چاہئے، لیکن اس کے ساتھ وہ اس پر بھی زور دیتے تھے کہ وہ شریعت کے ناطق ہیں، چنانچہ حکومت کے جس قانون کو وہ غیر اسلامی کہیں وہ مسترد سمجھا جائے، اسی بنا پر بھی ۔۔۔ اخوان المسلمین کا شاہ فاروق سے تصادم ہوا، وہ وفد پارٹی سے بھڑ گئے اور آخر میں صدر ناصر کو اس الٹی میٹم کا سامنا کرنا پڑا کوئی سیاسی ہیئتِ حاکمہ خواہ وہ کسی پارٹی کی ہو، کسی گروہ یا جماعت

کی، خواہ وہ علماء ہی کیوں نہ ہو، اس طرح ماتحتی قبول نہیں کر سکتی، ان حالات میں تصادم ناگزیر ہے؟

یعنی سارا قصور غریب اخوان المسلمون کا تھا کہ وہ حکومت کو شریعت کا تابع بنا دینا چاہتے تھے اور یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ مصر کی کوئی حکومت برداشت نہیں کر سکی۔ شاہ فاروق کے عہد نامسعود میں اخوان کے مرشد عام حضرت امام حسن البنا شہید کو بیچ چوراہے پر خاک و خون میں لٹایا گیا اور ناصر کے دور میں اخوان پر جو مظالم ہوئے ہیں ان کی نظیر عقوبتوں کی شدت اور تنوع کے اعتبار سے تاریخ کے کسی معلوم دور میں نہیں ملتی، عبدالقادر عودہ اور سید قطب جیسی عظیم شخصیتوں کو ناصر کی حکومت نے پھانسی پر لٹکا کر، ملت اور اسلام کے ساتھ جو ظلم عظیم کیا ہے اس پر خون کے آنسو بہا کر بھی تعزیت اور سوگواری کا حق ادا نہیں ہو سکتا! فاضل مضمون نگار ضبط و تحمل اور ظرف کے اعتبار سے شاید لوہے کا دل رکھتے ہیں کہ ان کے قلم سے دردمندی کا ایک حرف بھی اخوان کی مظلومیت کے لئے نہیں نکلا! بلکہ الٹا ان مظلوموں ہی کو قصور وار ٹھیرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان سرکشوں کے مطالبات ہی کچھ اس قسم کے تھے کہ ہر حکومت کو ان سے متصادم ہونا پڑتا۔

دنیا کی کوئی حکومت قانون سے بالاتر تو نہیں ہو سکتی کوئی نہ کوئی قانون اور دستور ضرور ہوتا ہے جس کا حکومت کو پابند ہونا پڑتا ہے۔ تو اخوان المسلمون کا یہ مطالبہ کہ حکومت کو شریعت کا پابند ہونا چاہئے، اس میں آخر کیا عقلی قباحت اور دینی مضرت ہے! ہر مسلمان کو فرداً فرداً اور معاشرے اور حکومت کو اجتماعی طور پر شریعت کی پابندی قبول کرنی ضروری ہے! مسلمان فرد کی حیثیت سے اور حکومت اجتماعی طور پر شریعت کی تابع نہ ہوگی تو کیا متبوع ہوگی! آخر اس مطالبہ میں، اس حقیقت میں اس تعامل میں جو ساڑھے تیرہ سو سال سے چلا آ رہا ہے کہ ہر مسلمان حاکم نے اپنی ذات اور شخصیت کو اور ساتھ ہی اپنی حکومت کو شریعت کا تابع سمجھا ہے، کیا بات "فکر و نظر" کے فاضل مدیر کو کھٹکتی ہے؟ اور وہ عقل و نقل اور روایت و درایت کی کس بنیاد پر شریعت کو حکومت کا تابع بننے کا مشورہ دیتے ہیں! اُن کا یہ طرز فکر غیر عقلی بھی ہے اور سو فیصدی غیر دینی بھی ہے یہ غیر اسلامی تصورات مسلمہ کی پوری تاریخ میں شاید مغلیہ بادشاہ جلال الدین اکبر نے قائم کیا تھا کہ وہ خود صاحب شریعت بن گیا تھا اس غلط فہمی حماقت اور جہالت میں مبتلا تھا کہ وہ شریعت کا تابع نہیں ہے، شریعت اس کی تابع ہے، اس جہالت اور بے دینی کا نتیجہ یہ نکلا ——— سود اور جوئے کی حلت کا فتویٰ دیا گیا ——— بدن کی قوت کے لئے شراب حلال ٹھیرائی گئی ——— غسل جنابت کو منسوخ کیا گیا ——— ہندوؤں کی تہذیب سے متاثر ہو کر چچازاد اور ماموں زاد بہن کے ساتھ نکاح کو حرام قرار دیا گیا۔ پردہ پر حکم امتناعی لگایا گیا ——— زنا اور فحاشی کو باقاعدہ رواج دیا گیا ——— اور عائلی قوانین میں اسی طرح ترمیم کی گئی جس کی جھلکیاں چار سو سال بعد ہمارے دور کے متجددین کے یہاں دکھائی دیتی ہیں ——— مردوں کے لئے سونا اور ریشم کا استعمال جائز ٹھیرا گیا ——— سور اور کتے کی نجاست کو محبوب و پسندیدہ سمجھا گیا، اکبر نے اپنے محل میں اس کا اہتمام کیا کہ سور اور کتے کا صبح سویرے دیدار گویا عبادت ہے۔! یہ ہے وہ خوفناک نتیجہ جو شریعت کو حکومت کا تابع بنا دینے کی صورت میں ظہور میں آیا ہے! کیا ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ارباب کار اس تاریخی المیہ کو پھر دہرائے جانے کے آرزومند ہیں!

اتاترک مصطفیٰ کمال نے محمد سرور صاحب مدیر "فکر و نظر" ہی کے رجحانات اور ذہن و فکر کے مطابق شریعت کی حدود کے ساتھ جو معاملہ سلوک کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے مثلاً عربی رسم الخط کو رومن رسم الخط سے بدل کر، ترکی زبان و ادب کا اور ترکی بولنے والے مسلمانوں کا عربی ادب دینی روایات اور اسلامی تمدن و تہذیب سے رشتہ ہی یکسر منقطع کر دیا، دین سے عناد و کد کی حد ہو گئی کہ عربی زبان میں مسنونہ اذان ممنوع قرار دے کر اُس کی جگہ ترکی زبان میں اذان دی جانے لگی اور "اللہ اکبر" جیسے منصوص، ماثور اور معمول بہ لفظوں کی بجائے "تنگری اُلغ در" کی خالص عجمی آوازیں ترکی کی مسجدوں کے میناروں سے بلند ہونے لگیں! یہی سلوک اسلامی شریعت اور فقہ کے ساتھ کیا گیا۔

؎ نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

یہ تصور، یہ رجحان، یہ مزاج اور اس قسم کا ذہن کہ "شریعت کو حکومت کا تابع ہونا چاہئے" سو فی صدی اُس آزادیٔ خیال اور تجدد کا

کی نمائندگی کرتا ہے جس کا مطمح نظر اور نصب العین دین کے مقابلہ میں لادینیت کو فروغ دینا ہے! ہم اس ذہن و فکر سے شدت کے ساتھ اپنی برأت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، جس ملک میں اس مزاج و فکر کے اہلِ قلم، اربابِ دانش اور لیسرچ اسکالر پائے جائیں گے وہاں اللہ تعالیٰ کے دین کو امتحان و آزمائش کے شدید مرحلوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اور جس ملک کے اربابِ حل و عقد اس قسم کے آزاد خیال مشیروں کے مشوروں کو اہمیت دیں گے اُن کا یہ طرزِ عمل دین کو لازمی طور پر نقصان پہونچا کر رہے گا۔

مجلہ "فکر و نظر" کے اس اداریہ میں اخوان المسلمون کا، اُن کی دعوت کا اور پھر مصری حکومتوں سے اُن کے تصادم اور ٹکراؤ کا ذکر فرمایا گیا اور اس ضمن میں "اخوان" پر یہ طنز کی گئی ہے کہ ——— " اس کے ساتھ ہی وہ اس پر بھی زور دیتے تھے کہ وہ شریعت کے ناطق ہیں ——— "

"اخوان" کو مصر کے کسی حکمراں سے ذاتی طور پر کسی قسم کا کوئی عناد اور پرخاش نہیں تھی، وہ ہر دور میں "اقامتِ دین" کی دعوت لے کر اُٹھے اور اُن کا پیغام، نصب العین، مطمح نظر اور ان کی تمام جد و جہد کا یہی مرکز و محور اور مقصود تھا کہ مصر کی حکومت اور وہاں کا معاشرہ "امر بالمعروف نہی عن المنکر" کی بنیادوں پر قائم اور استوار ہو جائے۔ شاہ فاروق کا عہدِ شاہی ہو یا جمال ناصر کا دورِ آمریت، اخوان اسی کی دعوت دیتے رہے۔ اُن کا مقصد حکومتوں سے تصادم نہیں بلکہ اُن کی اصلاح تھا، اور اس اصلاح کو مصری حکومتوں نے قبول نہیں کیا! اس دعوت کو مصری حکومتوں نے اپنے اقتدار کے لئے "الٹی میٹم" سمجھ کر اخوان کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا وہ انسانی تاریخ کا شدید ترین المیہ ہے! اس کشمکش میں قصور مصری حکومتوں کا تھا یا اخوان کا؟ قرآن کریم اس کا شاہد ہے کہ انبیاء کرام اور مصلحین عظام نے جب حق کی دعوت دی ہے، بھلائی کی طرف خدا کی مخلوق کو بلایا ہے برائیوں کے خلاف احتجاج کیا ہے تو حکمراں طبقہ نے اس دعوت اور اس پیغام کو اپنے اقتدار کے خلاف چیلنج اور الٹی میٹم سمجھا ہے، یہ کہ یہ داعیانِ حق حکومت اور اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں! آج بھی دعوتِ حق اور اقتدار کے درمیان یہی کشمکش پائی جاتی ہے!

"فکر و نظر" کے لائق مدیر جسے الٹی میٹم، ٹکراؤ اور تصادم کہتے ہیں اُس سے بچنے کی صرف یہی شکل ہو سکتی ہے کہ اربابِ اقتدار کی ہاں میں ہاں ملائی جاتے اُن کی ہر بات پر لبیک اور سمعنا و اطعنا کہا جاتے، ان کی کسی پالیسی، روش اور منصوبہ کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالا جائے مگر کوئی صاحبِ ضمیر انسان یا کوئی اصول پسند جماعت "تسلیم و رضا" اور "جی حضوری" کی اس روش پر کس طرح کاربند ہو سکتی ہے! انبیاء کرام کو اربابِ اقتدار کو معصوم کس طرح سمجھا سکتا ہے کہ جو کچھ اُن کی زبان سے نکل جاتے، وہی حق بلکہ عینِ حق ہے اور عوام کے کسی فرد یا جماعت کو اُس کے خلاف چون و چرا کرنے کا سرے سے حق ہی نہیں ہے! جو کوئی نطقِ ہمایونی پر رائے زنی کرے گا اُسے مفسد اور انتشار پسند ٹھیرایا جائیگا اس کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ وہ احتجاج و اصلاح کی آڑ میں حکومت کی کرسیوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے! اور فساد و انتشار کو حکومت گوارا نہیں کر سکتی، لہٰذا یہ نام نہاد مصلحین اسی کے مستحق ہیں کہ اُن کے زور کو توڑا جائے اور اُن کی طاقت کو کچل دیا جائے!

جن لوگوں کے سامنے صرف تن پروری کا مسئلہ ہو، جو اس دنیا میں چین کی بانسری بجانے ہی کو مقصدِ حیات سمجھے ہوئے ہوں، جن کے پیشِ نظر نہ کوئی اصول و عقیدہ ہو اور نہ ضمیر کا کوئی تقاضا اور کرماتہ وہ تو یہ کر سکتے کہ اربابِ اقتدار چاہے جس روش پر جا رہے ہوں کوئی حکومت کتنی ہی بڑی غلطی کا ارتکاب کیوں نہ کر رہی ہو، یہ بندگانِ شکم خاموش تماشائی بن کر سب کچھ دیکھتے رہیں، اُن کے منہ سے احتجاج کا ایک حرف بھی نکلے اُن کی پیشانیوں پر ناگواری کی کوئی شکن بھی نمودار نہ ہو سکے، بلکہ بعض اوقات تو سکوت کی بجائے ان برائیوں کی مدح و توصیف کرنے لگیں ——— مگر جو لوگ اصول و عقیدہ رکھتے ہوں، جو صاحبِ ضمیر ہوں، جن کے اندر خدا کا خوف اور محاسبۂ آخرت کا احساس پایا جاتا ہو وہ "منکرات" کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے، اُن کے اس احتجاج کو حکومت دبا کر کشمکش کی جو صورت پیدا کرتی ہے، اس کا ذمہ دار آخر کون ہے! اب رہی یہ بات کہ کوئی جماعت اپنے کو شریعت کی ناطق "سمجھتی ہے" تو فاضل مدیر نے یہ ایک ایسی خطرناک بحث چھیڑ دی ہے جس سے دین کے ہر مسئلہ میں الجھاؤ پیدا کیا جا سکتا ہے!

شریعت ہی پر کیا منحصر ہے، دنیا کے ہر مسئلہ میں کچھ لوگ جو اُس علم کے جاننے والے ہوتے ہیں، اپنی رائے کا اظہار کیا کرتے ہیں، اختلافات کی

صورت میں اس علم کے مآخذ کی کسوٹی پر اُن کی رائے کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے! اس علمی طریقہ اور تدبیر کو چھوڑ کر اُن کی رائے کو یہ کہہ کر رد کر دینا کہ ان حضرات کو فلاں علم کے ناطق ہونے کا منصب نہیں دیا جا سکتا ——— ایک غیر علمی طریقِ تنقید ہے، جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ مسلّمات میں شک و تذبذب پیدا کیا جائے اور اصولی باتوں کو اُلجھایا جائے! اس اصول کی بنا پر تو شعر و ادب کا ہر ناقد پر "شعرِ ناطق" کی، ہر مورخ پر "تاریخِ ناطق" کی اور ہر فلسفی پر "فلسفۂ ناطق" کی طنز کر کے ہر ہر مسئلہ اور اقرب الی الحق قول و رائے کو بے اعتبار ٹھہرایا جا سکتا ہے اور "شریعتِ ناطق" ہونے کی طنز سے وہ "حکومت" بھی نہیں بچ سکتی، جو کسی دینی مسئلہ میں اپنی رائے پر اصرار کرتی ہو!

حالانکہ سو فیصدی سچی، اصولی اور قابلِ عمل بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان جب کسی دینی مسئلہ میں نزاع پیدا ہو تو کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، اس طرح حق واضح ہو سکتا ہے ——— مگر وہ لوگ جو کتاب و سنت کی قطعیت کو "وقت کے تقاضوں" پر قربان کرنے میں دریغ نہ کرتے ہوں اُن کو کتاب و سنت کا فیصلہ کب مطمئن کر سکتا ہے۔

فاضل مدیر اربابِ اقتدار کی تائید اور حمایت و مدافعت میں اس حد تک پہونچ گئے ہیں کہ وہ شریعت کو حکومت کا فرمانبردار اور تابع فرمان بنانے کا نظریہ اور داعیہ رکھتے ہیں، اور وہ عیسائیوں کی طرح قیصر و کلیسا کی تقسیم کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"..... شیخ محمد بن عبد الوہاب کی اصلاحی تحریک کی سب سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ خود انہوں نے اپنی دعوتِ اصلاح کے آغاز میں ہی "تقسیمِ عمل" کا مسلک اپنایا، چنانچہ دعوت کی سیاسی قیادت سعود خاندان کے سپرد کی گئی اور اپنے لئے انہوں نے صرف دینی دعوت رکھی"

یہ تقسیم لادینی دماغوں کی پیداوار ہے کہ دین و سیاست کو دو خانوں میں بانٹ دیا جائے ——— یعنی دیندار طبقے بس دینی مسائل کی تبلیغ کرتے رہیں اور سیاست و حکومت سے کوئی سروکار نہ رکھیں ——— ! اسلام دوسرے مذہبوں کی طرح پرائیویٹ مذہب اور نجی مسلک نہیں ہے، اسلام "الدین" ہے اور "دین" زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے، سیاست و حکومت کو بھی دینی حدود سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا، شیخ محمد بن عبد الوہاب نے حکومت و سیاست کو اپنی دعوت کا ہدف و موضوع اس لئے نہیں بنایا کہ نجد کی حکومت جن ہاتھوں میں تھی، وہ خود شریعت کے تقاضوں کو پہچانتے تھے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر بڑی حد تک عامل تھے! آج بھی اگر کوئی مسلمان بادشاہ بلکہ مسلم ڈکٹیٹر "اقامتِ دین" کے لئے جد و جہد کر رہا ہو اور معروف کا قیام اور منکرات پر قدغن جس کے پروگرام میں شامل ہو، تو دیندار طبقہ ایسے فرمانروا سے نہ صرف تعاون کرے گا بلکہ اُس کے گھوڑے کی رکاب تھامنا اپنے لئے باعثِ خیر و ثواب سمجھے گا!

یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ ملک کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو عمامے باندھتے ہوں، عبائیں زیب تن کرتے ہوں اور ٹخنوں سے اونچے پاجامے پہنتے ہوں، کوٹ پتلون پہننے والے اور ٹائی لگانے والے بھی، حکومت کی کرسیوں پر متمکن ہو سکتے ہیں ——— بشرطیکہ وہ اقامتِ دین کا داعیہ اپنے اندر رکھتے ہوں، جن چیزوں کو اسلام "معروف" کہتا ہے اُنہیں قائم کریں، جو باتیں اسلام کی نگاہ میں "منکرات" ہیں، ان پر پابندیاں لگائیں! اس فکر و ذہن کے حکمرانوں میں تھوڑی بہت سی اخلاقی خامیاں پائی جائیں تو اُنہیں بھی "اقامتِ دین" کے عظیم مقصد کی خاطر برداشت کیا جا سکتا ہے! اس مزاج و فکر کے حکمرانوں اور دیندار طبقوں کے درمیان کشمکش کی نوبت نہیں آ سکتی ——— مگر معاملہ اس کے برعکس ہو ——— یہ کہ حکمران طبقہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو "اقامتِ دین" کی اُن نگاہ میں کوئی اہمیت نہ ہو۔ بھلائیاں جن کو قائم ہونا چاہیے وہ مجروح ہو رہی ہوں، برائیاں جن کو مٹنا چاہیے وہ رواج پا رہی ہوں ——— ایسی صورت میں دینی طبقہ خاموش تماشائی بن کر کس طرح رہ سکتے ہیں اگر وہ اس صورتِ حال کے خلاف احتجاج نہ کریں گے تو اس کوتاہی پر اللہ تعالیٰ کے یہاں شدید مواخذے اور محاسبے کے مستحق ہوں گے!

لہ اذا عمل فیھم بالمعاصی او لغیر الحق ثم لم یغیروہ یوشک ان یعمھم اللہ بعقاب منہ جب گناہ اور ناحق کام کئے جائیں اور (صالح لوگ) اس کو نہ بدلیں تو اللہ سب کو عذاب دیگا۔

اس مزاج و فکر کے حکمران اگر اصلاحِ حال کے لئے تیار نہ ہوں تو ان کو بدلنے کے لئے آئینی حدود میں رہ کر جدوجہد کی جاسکتی ہے ۔ جمہوریت پسند ملکوں میں رائے عامہ حکومت کی کرسیوں میں ردوبدل کا حق رکھتی ہے ! اگر حکومت میں انقلاب لانا کارِ بد ا۔ ۔ بات ہے تو پھر اُن اکابر کے بارے میں کیا کہا جائے گا جنہوں نے طاقت کے زور سے سابق حکمرانوں کو برطرف کر کے حکومت پر قبضہ کیا ہے ؟

رسالہ " فکر و نظر " کے ایڈیٹر نے عوام کو بھیڑ بکریوں کا گلہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ چرواہی کے حکم کی بے چون و چرا تعمیل کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتے ! جس ملک میں بھی عوام بالکل بے اختیار بن کر رہ جائیں، اُن کے لبوں پر مہرِ سکوت لگا دی گئی ہو، اور وہ جرأت کر کے اپنی آواز بلند بھی کریں تو ان کی آواز پریس، ریڈیو اور دوسرے ذرائع سے نہ پہونچنے دی جائے ــــــ وہاں کے دانشوروں کی ہمدردی عوام کے ساتھ ہونی چاہئے ! اور وہ اربابِ فکر اور اہلِ عالم جو اربابِ اقتدار سے وابستگی رکھتے ہیں اُن کا یہ فرض ہے کہ وہ شیخ سعدی کی زبان اور لہجہ میں حکمرانوں کو نصیحت کریں !

اور سُنئے ! آگے چل کر مدیر " فکر و نظر " فرماتے ہیں :ــــ

" باقی رہے وہ حضرات علماء جو حقیقت میں موجودہ مذہبی بحران کے باعث اور محرک ہیں اور باوجود کم تعداد میں ہونے کے، مادی ذرائع کی فراوانی نے انہیں نشر و اشاعت اور پبلسٹی کے وافر مواقع بہم پہونچا دئے ہیں، ان کو ہم یوں تقسیم کر سکتے ہیں، ان میں سے ایک جماعت تو وہ ہے جو خالص سیاسی ہے اور مسند اقتدار پر قابض ہونا، اس کی منزلِ مقصود ہے گو بظاہر اس نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور سیاسی عزائم کو وہ مذہبی ناموں کے جامے میں پیش کرتی ہے لیکن اب اس کا یہ مذہبی پردہ چاک ہو چکا ہے اور سب اسے ایک سیاسی جماعت سمجھتے ہیں۔ کاش ! یہ ممکن ہوتا کہ ہمارے ہاں ایسی موثر رائے عامہ موجود ہوتی جو اس طرح کی روش کے خلاف متحرک ہو سکتی تاکہ سیاسی اغراض کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنانے والے عوام کے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکتے ایک نہ ایک دن تو یہ ہونے والا ہے، مذہب زیادہ دیر تک " سیاسی طالع آزماؤں " کا کھلونا نہیں بنے گا۔ خدا کرے یہ جلد ہو "

اس تحریر میں جس جماعت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اُس جماعت کی تمام سرگرمیاں عوام کے سامنے ہیں اور ہزاروں صفحات میں اُس کا لٹریچر پھیلا ہوا ہے، یہ جماعت ہمیشہ سے اُس دین کی داعی اور منادی ہے، جس میں سیاست و حکومت بھی شامل ہیں، سیاست بے دین اور دین بے سیاست پر اس جماعت نے ہمیشہ تنقید کی ہے کہ یہ مسلک ان لوگوں کا نہیں ہو سکتا جو اللہ کے دین کی جامعیت پر ایمان رکھتے ہیں ! اس اعلان و اعتراف کے ہوتے ہوئے جماعت مذکورہ پر " مذہبی لبادہ اوڑھنے کی طنز " ذہن کے مرض اور شکست خوردہ ہونے کی غمازی کرتی ہے یہ جماعت اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کے لئے حکومت کو ایک موثر ذریعہ سمجھتی ہے اور چاہتی ہے کہ دنیا میں حکومت کی باگ ڈور صالحین کے ہاتھوں میں ہو اور ان خطوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، خلافتِ راشدہ کی بہارِ رفتہ پھر لوٹ کر آجائے ! اس قدر مقدس اور عظیم مقصد جن لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے، اُن کے بارے میں کوئی کہے بھی تو کیا کہے !

ادارۂ تحقیقات اسلامی کو جو تعلق بلکہ تقرب قصرِ ایوان میں حاصل ہے، اُس کی بنا پر طبقۂ اعلیٰ کے عزائم اور منصوبوں کا دوسروں کے مقابلہ میں اُسے زیادہ علم ہونا چاہئے، چنانچہ مندرجہ بالا اقتباس میں اس کی جھلکیاں موجود ہیں یعنی سرکاری کنونشن مسلم لیگ کے ذریعہ " موثر رائے عامہ " سے کیا کام لیا جانے والا ہے اور اس قدر زور شور کے ساتھ یہ بھرتی کس لئے ہو رہی ہے ! اور جمہوریت دوست اور اسلام پسند جماعتوں کو کس تصادم سے سابقہ پڑنے والا ہے !

"فکر و نظر" کے اس اداریہ کا اختتام ان لفظوں پر ہوتا ہے :۔

"اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ صدر ایوب کی حکومت کا کوئی علمی ادارہ ان بزرگوں سے تعاون کی درخواست کرے تو یہ اسے مسترد کر دیتے ہیں، لیکن صدر ناصر کی حکومت کے ادارہ کی دعوت پر یہ بار بار قاہرہ جاتے ہیں، حالانکہ جہاں تک دونوں صدروں کی حکومتوں کا تعلق ہے اُن میں کوئی زیادہ فرق نہیں، بلکہ صدر ناصر کی حکومت میں سیکولرزم اور سوشلزم زیادہ ہی ہے۔"

اگر یہ بات کسی دوسرے کے قلم و زبان سے نکل جاتی کہ :۔

"دونوں صدروں یعنی صدر ایوب اور صدر ناصر کی حکومتوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے"

تو

حکومت کا محکمہ احتساب نہ جانے وارننگ کی کس حد تک پہنچ جاتا، مگر وابستگانِ دامنِ دولت کو شاید سب کچھ کہنے کی چھٹی ملی ہوئی ہے! کوئی شک نہیں پاکستان میں جمہوریت اور اسلام کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ بڑی تکلیف دہ صورتِ حال ہے مگر ان تمام ناگواریوں کے باوجود ابھی تک تو صدر ایوب کی حکومت صدر ناصر کی حکومت کے مقابلہ میں رحمت نظر آتی ہے :۔

از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

مگر

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے علماء اور ان جیسے دوسرے حاشیہ نشینوں کے مشورے، منصوبے، معتقدات اور نظریئے اگر عملی طور پر متشکل ہونے لگے تو اس کا اندیشہ ہے کہ دونوں حکومتوں میں ابھی تک جو فرق پایا جاتا ہے وہ ممکن ہے کہ باقی نہ رہے! تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اس قسم کے مشیر اور مجی حضوری بادشاہوں اور حکمرانوں کو جبر و مطلق العنانی کی اُس انتہا تک لے گئے ہیں، جہاں انسانیت اور شرافت کی کوئی قدر بھی صحیح و سلامت نہیں رہی!

"فکر و نظر" کے اس اداریہ میں اسلام پسند جماعتوں کو دھمکیاں دی گئی ہیں کہ تم نے اپنی سرگرمیوں سے دست کشی اختیار نہ کی، تو تمہارا وہی حشر ہوگا، جو مصر، افغانستان اور ایران میں دینی جماعتوں کا ہو چکا ہے! اس مضمون میں اس نیم ملحدانہ نظریہ کو پیش کیا گیا ہے کہ شریعت کو حکومت کا تابع فرمانبردار ہونا چاہیے! اس تحریر میں آمریت، سوشلزم اور سیکولرزم کی تائید کی گئی ہے، اور صدر ناصر کی حکومت سے مماثلت کی طرف اشارہ کر کے، یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ پاکستان میں کن خطوط پر کام ہو رہا ہے اور آئندہ کیا منصوبہ اور نقشہ پیش نظر ہے۔

مگر

جن کو اپنا آرام و چین پیارا ہے، اور جو اسی مادّی اور فانی دنیا کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں، اُن کی خدمت میں عرض ہے ؎

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں — وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

لیکن جن کا اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر ایمان اور اعتماد ہے جن کے دل خشیتِ الٰہی سے معمور ہیں، جن کو آخرت کی زندگی کا یقین ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں، جن کے نزدیک لوگوں کے عزت و اکرام کا معیار دنیوی شان و شکوہ نہیں تقویٰ ہے — وہ اعلانِ حق کے فریضہ سے دست کش نہیں ہو سکتے اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے مشقت اور ہراساں ہونا ہی مقدر کر دیا گیا ہے تو یہ وہ سعادت ہے جس کے حاصل کرنے والوں کو "اولئک هم المفلحون" کی بشارت دی گئی ہے۔

ماہر القادری — ۲۵ محرم ۱۳۸۸ھ

مولانا محمد مصطفیٰ دعلی گڑھ م

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

الٓمّٓ ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنٰھم ینفقون والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ھم یوقنون اولٰئک علیٰ ھدی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون ہ

ربط - جب سرگشتگانِ بادیۂ محبت اور سرفروشانِ وادیٔ الفت نے بارگاہ احدیت میں استدعا کی بلکہ عاشقانِ الٰہی کی اسلامی جماعت یعنی امت اسلامیہ کے شیخ الطریقت امیر الطاہرا اور رئیس الفقراء امام المرسلین خاتم النبیین سیدنا و مولانا حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعلیم ربانی کے مطابق دعا کی ایاک نعبد و ایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم اے رب تو ہی ہمارا مستعان و مقصود ہے تیرے سوا ہم اپنا درد دل کس سے کہیں، وہ صاف ستھرا اور قریب ترین راستہ ہمیں دکھا دے جو تجھے پسند ہو اور جس سے ہم تیری دوامی رضامندی اور مقبولیت حاصل کر لیں،

ارشاد ہوا الٓمّٓ ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی (یہ کتاب کامل[1] جو میں تم کو دیتا ہوں یقیناً اس میں ہدایت ہے (یا یہ کتاب[2] کامل بے عیب و شک ہے اور عین ہدایت ہے) اس پر عمل کرو اور فلاح پاؤ میں اپنی نعمتوں سے تمہیں مالا مال کر دوں گا، تم پر میرا غضب نہیں ہونے کا۔ رحمت اُمڈے آجائیگی تم گمراہ نہیں ہونے کے، ہدایت مشعل دکھاتے گی نفس و شیطان اور تمام دشمنوں کے مقابلے میں میری نصرت تمہاری حامی اور میری معیت تمہاری مددگار رہے گی، اگر تم میرے وفادار بندے رہے تو تمہیں ایاز سے محمود بلکہ خود محمود کو تمہارا ایاز بنا دونگا - میں تمہارا تو یہ ساری خدائی تمہاری

ع یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں -

ہاں اس کتاب کے کامل اور الٰہی ہونے میں قطعاً شبہ نہیں، اس کی عبارت بھی اعجاز، اس کی اشارت بھی اعجاز اور اس کی ادا بھی اعجاز، یہ تناقض سے بھی پاک یہ معارضہ سے بھی محفوظ، جس انسان کامل پر جس نبی اُمی پر یہ کتاب نازل ہوئی وہ اگرچہ افصح العرب ہے ابلغ العجم ہے لیکن اس کا کلام بلاغت نظام بھی اس کتاب کا ہم وزن نہیں۔ جوہریانِ ادب نے تنقید کی کسوٹی پہ دونوں کو پرکھ کر فیصلہ کر دیا ہے کہ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو مخلوق اور خالق میں ہے ؎

نوشش می ہدنشاں زجمال وجلال یار　　　　نوشش می کند بیاں زعزّ و وقار دوست

انسان عاجز ہے اس کی شان کیا بیان ہو، یہ عقل کے لئے ہدایت علم کے لئے کفایت اور روح کے لئے سکینہ و حمایت، امراض انسانی

---

[1] یہاں حافظہ بہ جب فن قرأت کی اصطلاح میں مراقبہ بھی کہتے ہیں یعنی لاریب پر وقف کریں گے تو فیہ پر وقف نہیں ہوگا اور فیہ ھدی پڑھا جائیگا اور لاریب فیہ پر وقف ہوگا تو ھدی للمتقین علیحدہ ہے گا اس ترجمہ میں دونوں باتیں ملحوظ ہیں کامل کا اضافہ ال نے کیا ہے ذالک کتاب لاریب فیہ کا فی تفا دمنہ عفی عنہ

[2] شفا و رحمۃ للمومنین

من ربهم واولٰئك هم المفلحون یہی لوگ شہسوارانِ ہدایت ہیں،

{ اُس ہدایت پر قائم اور ثابت قدم جو اُن کو اپنے رب سے حاصل ہے } اور یہی لوگ صاحبانِ فوز و فلاح ہیں۔

مسائل و نکات :- ۱- الکتاب' معرف باللام لانے میں اشارہ ہے اس کمال کی طرف اور اس لئے کتاب یہ ناسخ ہے اور اس کا صاحب کتاب خاتم الانبیاء ہے -

۲- لاریب میں ہر قسم کے ریب و شک کی نفی ہے، معانی میں، مبانی میں، منزل من اللہ ہونے میں، حقائق و علوم میں، کسی میں شبہ تک کا احتمال نہیں -

۳- ھدی للمتقین اور ایک مقام پر فرمایا ھدی للناس جس سے حضور اکرم کی رسالت عامہ بھی ثابت ہوتی، یہاں متقین کے عنوان اختیار کرنے میں تقوی کی عظمت شان کا اظہار منظور ہے اور چونکہ انفعال و تاثر کے لئے استعداد کی ضرورت ہے، لہذا فرمایا گیا کہ طالبانِ ہدایت اور مستعدانِ ہدایت ہی دراصل اس سے فیض یاب ہوتے ہیں، اور وہ متقی ہی ہیں۔

۴- تقوی اوصاف جلیلہ میں سے ہے قرآن پاک میں ہے ان اولیاءہ الا المتقون (نہیں ہوتے اولیاء اللہ مگر متقی) اور ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ اللہ کے نزدیک تم میں مکرم تر وہ ہے جو متقی تر ہے (جتنا بڑا تقوی اتنا ہی بڑا رتبہ) اس لئے سب سے بڑے متقی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، آپ کی دعا ہے "اللھم آت نفسی تقواھا وزکّھا انت خیر من زکّٰھا انت ولیھا ومولاھا (اے اللہ میرے نفس کو تقوی و تزکیہ باطن عطا فرمائیے ....) معلوم ہوا کہ تقوی پر تمام خوبیوں کا مدار ہے پس بعض کا یہ کہنا کہ تقوی کچھ نہیں، عشق ہی سب کچھ ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ عاشقانِ الٰہی کے لئے تقوی ضروری نہیں بالکل غلط در غلط ہے، اصل یہ ہے کہ عشق بے تقوی کے حاصل ہی نہیں ہوتا، جس طرح اقلیدس کا دوسرا مقالہ پہلے مقالہ کے بغیر حل ہی نہیں ہوتا یا جس طرح انسان مراہق ہوئے بغیر بالغ ہی نہیں ہوتا، مولانا فرماتے ہیں ؎

علم و حکمت آید از لقمہ حلال — عشق و رقت زاید از لقمہ حلال

علوم میں حکمت کا مرتبہ رفیع ہے اور احوال میں عشق و وجد کا اور یہ دونوں اکل حلال سے جو نتیجہ ہے ورع کا پیدا ہوتے ہیں تقوی کا مقام تو ورع[1] سے بالاتر ہے، وہ بیکار کیونکر ہو سکتا ہے، مشائخ کے ملفوظات میں ہے اجل اولیاء اللہ الاتقیاء الاخفیاء اولیائے رحمن میں بزرگ ترین وہ لوگ ہیں جو مقام تقوی پر فائز ہیں اور جن کے خوارق ردائے تقوی سے پوشیدہ و مستور ہیں، سیدنا [illegible] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

التقوی مجانبۃ ما یبعدک عن اللہ تعالی تقوی یہ ہے کہ تو اُس شے سے پرہیز کرے جو تجھے عزوجل سے دور کرتی ہے۔

تقوی عذاب گناہ کے خوف سے ہوتا ہے اور یہ صالحین کا ہے اور اللہ کے جلال سے ہوتا ہے اور یہ صدیقین کا ہے اور حجاب اور فراق محبوب کے خوف سے ہوتا ہے اور یہ عارفین کا ہے پس گناہ سے اور حجاب سے اور غیر اللہ سے بچنا یہ سب تقوی ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جو شخص تقوی کے طور پر نیکی نہیں کرتا بلکہ غیر خدا کے لئے کرتا ہے وہ ریاکار یا مشرک و منافق ہے اور فیض قرآن سے محروم،

۵- الذین یؤمنون بالغیب ایمان بالغیب میں ذات و صفات و افعال الٰہی، فرشتے، نبوت، قیامت یہ سب داخل ہیں، اور یہ بھی

---

[1] ورع ممنوعات کا ترک ہے اور تقوی اس چیز کا ترک کرنا ہے جس کے عدم ترک سے اندیشہ ہو ارتکاب ممنوع کا، حدیث میں ہے لا یبلغ العبد درجۃ المتقین حتی یدع ما لا باس بہ حذرا مما بہ باس۔

کے لئے اکسیر اور معرفت الٰہی کے بخشنے میں کیمیا تاثیر ہے۔ تدبیر منزل کی دلربائی اس میں سیاست مدن کی جہاں کشائی اس میں غور و فکر کیجئے ذہن کے لئے ایک عالمگیر وسعت عمل فرمائیے تو بے شمار روحانی قوت۔ بے شک یہ نسخہ ہدایت ہے لاریب یہ عین ہدایت ہے عین شفا ہے ...
...... لیکن کس کے لئے؟

کیا اس مریض کے لئے جو دوا کو دیکھتے ہی منہ پھیرے جو بہت چڑا ہے جو نیند کھانے سے خواہ وہ مضر ہی کیوں نہ ہو پرہیز نہ کر سکے جو بہت حریص ہو، جو بہت ضدی ہو، جو اسباب ستہ ضروریہ سے یا جو اصول حفظان صحت سے کلیۃً بغاوت کرے جو طبیب کو دشمن جانے اور اس زندگی کو زندگی برائے زندگی تصور کرے، یعنی وہ جو جہل مرکب میں مبتلا ہو، جو بہت بے حیا ہو جس کو نہ خالق کا لحاظ نہ مخلوق کی شرم، حاشا وکلا، ایسا مریض قرآن حکیم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، فائدہ کیا خاک اٹھائے وہ تو اس کے روحانی مطب سے کوسوں دور بھاگتا ہے جس طرح دکھتی ہوئی آنکھیں آفتاب کی تابشی سے متنفر ہوتی ہیں وہ بھی اس عارض انوار کو دیکھنا نہیں چاہتا، اس لب جاں بخش سے مہجور رہتا ہے۔

ھدیً للمتقین اس کا فیض تو انہیں کے شامل حال ہے جو ڈرتے ہیں کہ کہیں روحانی موت نہ آ جائے جنہیں اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارا رب ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناراض نہ ہو جائے الذین یومنون بالغیب اس لئے وہ بالاعتبار، بطیب خاطر، اپنے رب پر ایمان لاتے ہیں اور ان تمام باتوں کی جن کی اطلاع ان کے رب کا فرستادہ ان کو دیتا ہے دل سے تصدیق کرتے ہیں۔ بے شک مریض کی سعادت مندی اسی میں ہے کہ اپنے طبیب مشفق کی بات مانے اور "عواقب" پر لحاظ کر کے دوا، غذا، اور پرہیز میں اس کی ہدایات پر عمل کرے ویقیمون الصلوٰۃ ایسے تمام احسان مندوں کا فرض ہے کہ دل سے، زبان سے، دست وپا بلکہ جسم کے رونگٹے رونگٹے سے اپنے محسن کا شکریہ ادا کریں قولاً فعلاً اور سراپا اطاعت بن کر اس کے حضور میں سر تسلیم خم کریں، اس لئے فرمایا کہ وہ حضرات ایسے ہیں جو غیبی امور پر ایمان لاتے ہیں، محض حواس کو اپنا "ہدایت" نہیں مانتے بلکہ عقل، وجدان اور سب سے زیادہ صادق ومصدوق فرستادہ کی خبر کو حرزِ جان بناتے ہیں، پھر وہ مستعدی و سرگرمی سے نماز میں مشغول ہوتے ہیں، خود پڑھتے ہیں پڑھاتے ہیں اور اس پر ثابت قدم بھی رہتے ہیں کیونکہ نماز ثنا وصفت، عجز و نیاز اور شکر و امتنان کا حسین جسم بھی ہے اور روح رواں بھی ومما رزقناھم ینفقون پھر یہی نہیں کہ وہ حضرات روحانی وجسمانی حسنات یا قلبی وقالبی عبادات، استحضار اسرار، استغراق ستر کی کیفیات پر اکتفا کریں، استغنا کی وجہ سے اپنے مستعار ملک مال کو اپنے محسن کے عیال پر خرچ کرتے ہیں، کیونکہ یہ علم کہ یہ ان کے رب ہی کا تو عطیہ ہے اور یہ علم کہ یہ خرچ کرنا ان کے رب کو محبوب ہے اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ محبوب اور پاک مال کو محبوب ترین اور پاک ترین رب پر، اس کی رضامندی پر نثار کر دیں، اس مال فانی کو اپنے سے جدا کر دیں اور اس خدائے باقی کو اپنا بنا لیں۔

بر در بوستاں باں بالیوان شاہ   بہ ملک سرہم ز بستان شاہ

داد دیجئے اس جذبہ کی، اور قربان جائیے اس تعلیم کے جو اس آیت میں دی گئی ہے۔

انفاق بھی انسان کے لئے بہت ضروری ہے، غذائیں، دوائیں، دیگر جائز یا واجب تدابیر، انامے، درمے، سخنے، قدمے، اس کے بعد فرمایا کہ یہ قرآن ہدایت ہے اہل کتاب کے لئے بھی جو اس پر اور دیگر کتب الٰہیہ پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت کے بارے میں وہ یقین رکھتے ہیں والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ھم یوقنون۔

اب ایسے متقی حضرات کو درگاہ اکرم الاکرمین سے ایک بشارت عظمیٰ، ایک سند اعلیٰ مرحمت فرمائی جاتی ہے اولٰئک علیٰ ھدی

؎ الخلق عیال اللہ علی الارض

معلوم ہوا کہ جب نزول عذاب یا عالم نزع میں بعض امور غیبیہ عیاں ہو جاتے ہیں تو اس وقت ایمان لانا معتبر نہیں کیونکہ اس وقت وہ ایمان بالغیب نہیں ہے۔

۶۔ ویقیمون الصلوٰۃ فرمایا، یصلون نہیں فرمایا کیونکہ اقامت کے محاورہ میں اہتمام، احتیاط اور کما حقہٗ ادائیگی سب داخل ہے اور اہتمام و دوام ہو نا سب آ جاتا ہے اور "یقرؤن الصلوٰۃ" بھی نہیں کہا کیونکہ محض قرأت ذکر نہیں اور نماز تو ذکر ہے (اقم الصلوٰۃ لذکری)

۷۔ ومما رزقناھم ینفقون میں "من" کو تبعیضیہ کہتے تو معنی یہ ہے کہ ہم یہ حکم نہیں دیتے کہ سب خرچ کر دو اپنے پاس کچھ نہ رکھو، تمہاری تنگی ہمیں گوارا نہیں۔

۸۔ یؤمنون، یقیمون، ینفقون، یوقنون یہ سب جو فعل مضارع ہیں صیغہ جمع مذکر غائب، استمرار و مداومت پر دلالت کرتے ہیں، پس دو چار بار ان کاموں کا ارتکاب اور اکثر ان کا ترک کرنا تقویٰ سے محروم رکھتا ہے اور یہ احکام مردوں ہی کے لئے نہیں عورتوں کے لئے بھی ہیں۔

۹۔ رزقناھم میں رزق کی نسبت اپنے وجود باجود کی جانب کرنے میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ہم ہی نے تو اُن کو دیا تو ہماری راہ میں خرچ کرنا نہ اُن پر گراں، نہ ہم پر احسان، بلکہ شوق کا تقاضا تو یہ ہے کہ عطا تیری تو ہے لقائے تو سے

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

۱۰۔ مما رزقناھم میں محض مطعومات یا غلے یا مشروبات و فواکہی داخل نہیں بلکہ ملبوسات و دیگر مملوکات حتیٰ کہ علوم و قوی اور مشاعر و حواس بھی آ جاتے ہیں،

۱۱۔ یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک سے بھی یہ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، اس لئے وما سینزل من بعدک نہیں فرمایا، حالانکہ تمام انبیاء کی نبوت پر ایمان لانا لازم ہے خواہ وہ متقدم ہوں یا متاخر،

۱۲۔ وبالآخرۃ ھم یوقنون آخرت پر بھی یقین ہی مطلوب و مفید ہے، شک و ظن مفید نہیں[1]

۱۳۔ تقدیم ایمان بالغیب کی نماز پر اور تقدیم نماز کی انفاق فی سبیل اللہ پر ظاہر ہے اور اس ترتیب میں اشارہ ہے الاہم فالاہم کی جانب یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ تمام امور متغائر ہیں اور اسی لئے واؤ عاطفہ سے معطوف ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح نماز عین انفاق نہیں اسی طرح ایمان عین نماز اور غیر انفاق نہیں۔ ہاں ایمان عین عمل نہیں اگرچہ ان میں روح و جسم کا سا رشتہ ہے (ایمان، عمل، روح، جسم)

۱۴۔ ایمان کی اعمال پر وجہ تقدیم تو بہت ظاہر ہے کیونکہ تمام نیکیوں کا مدار ایمان پر ہے، منکر اور باغی کیونکر دل سے اطاعت کرے گا اور جب دل مطیع نہیں تو اعضا جوارح کر تابع ہیں کیونکہ مطیع قرار دئے جا سکتے ہیں اور نماز کی انفاق پر وجہ تقدیم یہ ہے کہ نماز عین ذات عبد سے متعلق ہے، جسمانی اور روحانی طور پر اور وہ عبادت قولی و فعلی و عملی ہے اس میں لطیفۂ سترادہ تاس سب شریک ہیں اور عبادت انفاق زیادہ تر مال و ملک سے متعلق ہے اور مال خارج ذات ہوتا ہے (اگرچہ بعض انفاقات مثل تعلیم و تبلیغ و وعظ و ہدایت و تدبیر، تنبیہ ذات عبد کے داخل سے متعلق ہیں) اور اس لحاظ سے انفاق میں زکوٰۃ، صدقات واجبہ، صوم و فدیہ، قربانی و حج و

---

[1] عقائد میں "ظن" بھی ساقط الاعتبار ہوتا ہے۔

جہاد اصغر و اکبر سب داخل ہیں)

۱۵ - قرآنی تعلیم کی جامعیت ملاحظہ ہو، کہ ترغیب دی جارہی ہے اُن دو باتوں کی طرف جو اُمّ الفضائل ہیں - یعنی علم و عمل اور چونکہ علم کا مرتبہ و شرف معلوم و موضوع کے مرتبہ و شرف پر مبنی ہے اسمائے الٰہی ہی سب سے اشرف ہے بعدہٗ انبیاء و ملائکہ اس لئے علم الٰہی و علم توحید جو ان باتوں سے بحث کرتا ہے تمام علوم سے افضل و اشرف ہوا یُؤمنون بالغیب میں اس طرف صاف اشارہ ہے اسی طرح عمل تو دو نوع کا ہے -

۱- تعظیم خالق کی اور ۲- شفقت مخلوق پر، تمام عبادات و معاملات میں یہی دو باتیں جاری و ساری ہیں، لہٰذا یقیمون الصلوٰۃ سے پہلی بات کی بھرپور ادائیگی اور مما رزقناھم ینفقون سے دوسری بات کی انجام دہی منظور ہے،

۱۶ - " اولٰئک " سے متقین کو یاد فرمانے میں اُن کی عظمت مرتبت کی طرف اشارہ ہے -

۱۷ - علیٰ ھدًی من ربھم میں بیان ہے کہ ہدایت اُن کے اختیار میں نہیں بلکہ اُن کے رب[1] کے اختیار میں ہے،

۱۸ - " اولٰئک " کو مکرر لانے میں تاکید ہے اور " ھم " ضمیر فصل تاکید کو اکید کر رہی ہے اور اس کے ساتھ المفلحون کے معرف باللام ہونے نے قصر الصفۃ علی الموصوف کا فائدہ دیا، یعنی یہی لوگ اہل فلاح ہیں اور دوسرے لوگ ان کے خلاف خائب و خاسر جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر انسان خسارہ میں ہے بجز اہل ایمان کے جنہوں نے نیک عمل کئے اور باہمی وصیت کی حق کی اور صبر کی، انہیں حضرات کے " جیب و زیاں " میں " گوہر بہر سود " ہے کیونکہ جان عزیز بشیریں دے کر اس سے عزیز تر شئے یعنی " متاع دین " خرید لیتے ہیں -

۱۹ - قرآن حکیم نے ایک مقام پر مفلحین کے اوصاف مجملاً یہ بیان فرمائے ہیں قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربہ فصلی بے شک فلاح یاب ہوا وہ شخص جس نے تزکیہ کیا اور اپنے رب کا نام لیا پھر نماز پڑھی تزکیہ میں تطہیر عقائد باطلہ و فاسدہ و اخلاق ذمیمہ اور مالی زکوٰۃ داخل ہے اور سورۂ مومنون کے شروع میں اُن کی تفصیل یہ کی ہے (ا) نماز میں خشوع و عجز و انکسار (ب) لغویات یعنی محرمات و معاصی قولی سے اجتناب (ج) زکوٰۃ ادا کرنا (د) عفت و پاکدامنی (ہ) ایفائے عہد (و) امانت میں خیانت نہ کرنا (ز) نمازوں کی نگہداشت و حفاظت اور ان کے شرائط و ارکان کا لحاظ -

۲۰ - " اولٰئک " سے " مفلحون " تک دونوں جملے اسمیہ ہیں جو واو عاطفہ سے جڑے ہوئے ہیں، اور یہاں جملے فعلیہ استعمال نہیں کئے گئے تاکہ دلالت ہو کہ یہ ہدایت دائمی ہے جس کے لئے فلاح بھی لازمی ہے،

۲۱ - آیت کے مقطع اور مطلع پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ

(ا) ہدایت یافتہ فلاح یاب ہوتا ہے اور متقی ہدایت یافتہ ہے

لہٰذا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ متقی فلاح یاب ہے،

والحمد للّٰہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الخلق محمد و آلہ واصحابہ وعلینا معھم اجمعین -

---

[1] انک لا تھدی من احببت ولکن اللّٰہ یھدی من یشاء اس کی صریح دلیل ہے (مصطفٰے)
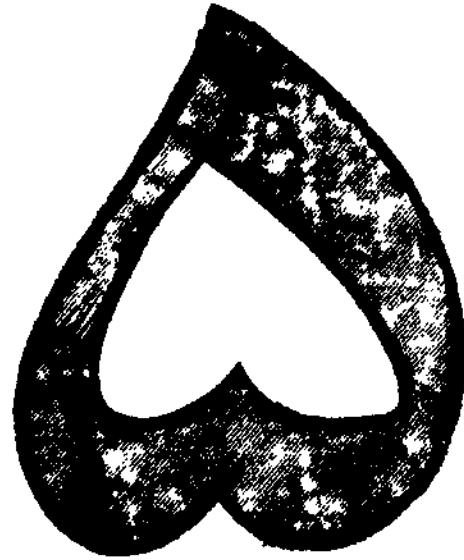
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انلجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Spotlit

محمد حفیظ اللہ پھلواری

فرمانروایانِ سلطنتِ بہمنیہ (دکن) کے دور میں علمی ترقیاں

دہلی کی مرکزی مسلم حکومت کمزور ہو جاتی تو اکثر صوبوں کے گورنر مرکزی حکومت سے علیحدہ ہو کر خود مختاری کا اعلان کر دیتے۔ ارضِ ہند و پاکستان میں متعدد خود مختار اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں۔ خود مختار اسلامی حکومتوں نے بھی دہلی کی مرکزی سلطنت سے علیحدہ ہو کر علوم و فنون کی بڑی خدمتیں انجام دیں بلکہ بعض خود مختار سلطنتیں تو اُس وقت کی مرکزی سلطنت سے شان و شوکت میں کہیں زیادہ تھیں۔ دکن میں بھی مسلمانوں کی متعدد حکومتیں قائم ہوئیں۔ ان سب حکومتوں کی بنیادی حکومت سلطنت بہمنیہ ہے اور اسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

دکن کے بادشاہ عموماً صاحبِ ذوق اور اہلِ علم کے قدردان تھے، اسی وجہ سے اطراف و اکناف سے اربابِ فن نے دور دراز مقامات سے ترکِ وطن کر کے دکن کو اپنا مستقر بنایا۔ ان اربابِ فن کا دامن آرزو شاہانِ دکن کی فیاضی سے مالا مال ہوتا تھا۔

ایک یوروپین مورخ فرگوسن FERGUSON لکھتا ہے:

> "اگر ہم بہمنی بادشاہوں کا مقابلہ ان کے انگلستانی ہم عصروں ایڈورڈ سوئم سے لے کر ہنری ہشتم تک نہیں کر سکتے ہیں تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے معیار کے مطابق ایک اعلیٰ درجہ کی تہذیب موجود تھی۔ عربی و فارسی کی تعلیم جہاں تک ممکن تھا دیہاتی مدارس تک پہونچ چکی تھی۔ جو مسجدوں سے متعلق تھے، اور ان کے مصارف کے لئے کافی اوقاف موجود تھے۔"

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے الفاظ میں اسی خاندان نے اس ملک کی تہذیب و معاشرت اور ادب و سیاست کی بنا ڈالی اور اپنے بعد ایسی مستقل یادگاریں چھوڑ گئے جو اس کے نام اور کام کو پائندہ رکھیں گی۔ ان یادگاروں میں سب سے اہم اردو زبان اور ادب ہے جو انہی کی سرپرستی میں پورے دکن میں یعنی بحیرۂ عرب سے لے کر خلیج بنگال تک رائج ہو گیا اور اس وسیع ملک میں جگہ جگہ اس کے مرکز قائم ہو گئے جن میں گلبرگہ، گولکنڈہ، قندھار، گوگی، احمد نگر، بیجاپور، کرنول، کڑپہ، ویلور، مدراس، بیدر، اور اورنگ آباد وغیرہ تاریخ ادبِ اردو میں اب تک یاد کئے جاتے ہیں۔ (دکن ادب کی تاریخ)

بہمنی خاندان کا بانی علاؤالدین حسن گانگو بہمنی تھا جس نے ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء میں اس سلطنت کی بنیاد رکھی اور سلطان علاؤالدین بہمنی شاہ اپنا لقب اختیار کیا اور گلبرگہ کو "حسن آباد" کے نام سے موسوم کر کے اس کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

اس خاندان نے ۹۳۳ھ مطابق ۱۵۲۶ء تک نہایت تزک و احتشام کے ساتھ حکومت کی۔ اس دوران میں علوم و فنون کی بڑی سرپرستی ہوئی، مدرسے قائم ہوئے عربی اور فارسی کے علاوہ اردو کی تعلیم کو فروغ ہوا۔ عرب و عجم کے بڑے بڑے علماء و شعراء اس خاندان کے زمانہ حکمرانی میں دکن آئے (فرشتہ)

اس خاندان کے مندرجہ ذیل فرماں روا خاص طور سے علم دوست تھے۔

(محمود شاہ ۷۸۰ - ۷۹۹ھ مطابق ۱۳۷۸ء - ۱۳۹۷ء)

محمود شاہ عربی اور فارسی خوب جانتا تھا اور آسانی سے ان زبانوں میں گفتگو کر سکتا تھا۔ فلسفہ و حکمت کا ماہر تھا، اچھا شاعر تھا۔ اس کے اشعار بہت پاکیزہ ہوتے تھے۔ فن خوشنویسی میں کافی مہارت تھی، علوم و فنون کا بڑا شائق تھا۔ بڑا علم دوست اور دین دار تھا۔ ارباب علم و فن کو انعامات سے سرفراز کرتا تھا۔ قوم نے محمود کو "ارسطو" کا خطاب دیا تھا۔ محمود محدثین کی بڑی عزت کرتا انہیں بڑی بڑی تنخواہیں دیتا تھا تاکہ وہ اطمینان قلب کے ساتھ علم حدیث کی اشاعت میں مصروف رہیں۔

فرشتہ کے بیان کے مطابق محمود کے زمانہ میں عرب و عجم کے نامی گرامی شعراء دکن آتے اور سیر چشم فرماں روا کے انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر خوش و خرم اپنے وطن کی راہ لیتے۔

محمود شاہ کا عام حکم تھا کہ عرب و عجم سے جو شاعر آئے اس کو پہلے قصیدہ پر ایک ہزار تنکہ جو ایک ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے تھے انعام میں دیے جائیں (شعر العجم ج ۲)

چنانچہ میر فیض اللہ انجو دکن آیا اور شاہی بارگاہ میں حاضر ہو کر ایک قصیدہ مدحیہ بادشاہ کی بارگاہ میں پیش کیا تو اسے ایک ہزار تنکہ انعام میں ملا اس کے علاوہ انجو جب وہ اپنے وطن کو واپس ہوا تو اس کے ساتھ چاندی سونے کے علاوہ بہت سے قیمتی تحائف بھی تھے۔

فرشتہ نے محمود کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی ہے۔

ملا داؤد بیدری نے اپنی کتاب "تحفۃ السلاطین" کو اسی بادشاہ کے نام معنون کیا۔

محمود شاہ نے فارسی کے مشہور و معروف شاعر خواجہ حافظ شیرازی کو دکن آنے پر آمادہ کر لیا تھا، لیکن بحری سفر سے خائف ہو کر انہوں نے آنے سے معذوری ظاہر کی اور ایک پر کیف غزل لکھ کر بھیج دی۔ قدر داں بادشاہ نے ازراہ قدر دانی ایک ہزار تنکہ طلائی محمد قاسم مشہدی کو دے کہ وہ اس رقم سے اس وضع کے تحائف خرید سے جو خواجہ کو مرغوب ہوں۔

محمود شاہ یتیموں کی خاص طور سے سرپرستی کرتا ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بقول فرشتہ ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مدرسے قائم کئے گئے تھے۔ گلبرگہ، بیدر، قندھار، ایلچپور، دولت آباد، جنیر، چول، دابل اور دوسرے بڑے بڑے قصبوں میں مدرسے قائم کئے گئے، معلمین کی تنخواہیں شاہی خزانہ سے ادا کی جاتیں، نیز اوقاف قائم کئے تاکہ ان مدارس کے مصارف پورے ہو سکیں۔ یتیموں کو سرکاری طرف سے کھانا کپڑا اور کتابیں دی جاتی تھیں۔ الشیخ الفاضل احمد قزوینی اس عہد کے مشہور اکابرین شمار کئے جاتے تھے۔

حضرت شیخ عین الدین گنج العلم دکن میں ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں آپ نے دکن میں سلطان علاؤ الدین حسن اور اس کے چار جانشینوں کا زمانہ دیکھا۔ سلطان محمود شاہ ثانی کے عہد میں انتقال فرمایا۔ آپ نے علوم متداولہ میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ تذکروں میں ان کی تعداد (۳) تحریر ہے (روضۃ الاولیا بیجاپور ص ۲۷ سلسلہ آصفیہ ج ہشتم ص ۵۶۸)

قاضی منہاج الدین جوزجانی کی طبقات ناصری کا تکملہ شیخ عین الدین نے لکھا اور اس میں اپنے زمانہ تک کے حالات قلمبند کئے۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں اسی سے مضامین اخذ کئے ہیں اور اس کا نام ملحقات طبقات ناصری لکھا ہے۔ (فرشتہ)

اطوار الابرار کے نام سے آپ کی ایک اور تصنیف مشہور ہے۔ (اردوئے قدیم)

فیروز شاہ بہمنی ۸۰۰ھ - ۸۲۵ھ مطابق ۱۳۹۷ء - ۱۴۲۲ء

یہی وہ بہمنی بادشاہ ہے جس کی علمی و تعلیمی سرگرمیاں اس کے ہمنام شہنشاہ دہلی کی علمی اور تعلیمی جدوجہد کے ہم پلہ ہیں وہ غالباً محمد بن تغلق سے زیادہ صاحب علم و فضل اور ماہر السنہ تھا (عہد اسلامی میں تعلیمی ترقی)

فیروز شاہ کو ہر علم سے عموماً اور تفسیر و اصول و حکمت طبعی اور نظری سے خصوصاً دلچسپی تھی۔ بادشاہ کو صوفیہ کی اصطلاحات سے بھی واقفیت تھی۔ ہفتہ میں تین بار بادشاہ خود طلبا کو درس دیا کرتا تھا۔ زاہدی اور شرح تذکرہ فن ریاضی میں اور شرح مقاصد کلام میں اقلیدس علم ہندسہ میں مطول علم معانی و بیان میں بادشاہ کے درس کی خاص کتابیں تھیں۔ اگر کبھی اتفاق سے بادشاہ کو فرصت نہ ملتی تو رات کو طالب علموں کو اپنے پاس بلاتا اور طلبا کو اپنے معلومات سے مستفید کرتا (فرشتہ)

فیروز شاہ شاعر بھی تھا "عروجی" اور "فیروزی" تخلص کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صاحب دیوان تھا۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ایک بار جو بات سن لیتا زندگی بھر نہ بھولتا۔ فیروز بہت سی زبانوں کا ماہر تھا، لیکن اسے عربی زبان سے بڑی محبت تھی اس کے دربار میں جس ملک کا سفیر آتا اسی زبان میں گفتگو کرتا۔ فیروز کے حرم میں عربی اور عجمی بیگمات کے علاوہ ترکی، فرنگی، خطائی، افغانی، راجپوت، بنگالی، گجراتی، تلنگی، کنڑی، اور مرہٹی بیگمات تھیں اور فیروز ان سے ان کی مادری زبان میں گفتگو کرتا۔

محمود عبرانی میں توریت پڑھ سکتا تھا اور یہ زبان اس نے ان یہودیوں سے سیکھی تھی جو ساحل مالابار پر مدت سے آباد تھے،

SCOTTS DECCAN ,VOL.1.P.74)

علماء، فضلاء اہل کمال اور شعرا کی منزلت اس کی نگاہ میں بہت تھی۔ ہر سال اسلامی ممالک میں جہاز بھیجتا اور وہاں کے ارباب علم و فن اپنے دربار میں آنے کی دعوت دیتا۔ دکن کے دو مشہور بندرگاہ گوا اور چول فیروز شاہ کی حکومت میں تھے جہاں سے جہاز بیرونی ممالک کو آیا کرتے تھے اس لئے دوسرے ممالک کے اہل علم و فضل کے آنے میں بڑی آسانی تھی اور فیروز شاہ کی عام اجازت تھی کہ وہ ان جہازوں سے دکن آئیں اس نے اپنے فرائض میں یہ داخل کر لیا تھا کہ قابل ترین علماء و فضلاء اس کے دربار میں موجود رہیں تاکہ وہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہو سکے ملا اسحق سرہندی جیسے نامور علماء اس کے دربار میں تھے،

حاجی قندھاری کا بیان ہے کہ فیروز شاہ روزانہ کلام پاک کا ایک چوتھائی پارہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ خدا کی عبادت کے بعد مخلوق کی پرسش احوال میں صرف کرتا تھا۔ ہر رات دو دو پہر مشائخ، شعراء، قصہ خوانوں، افسانہ گو، ندیموں اور خوش طبع لوگوں کی صحبت رہتی تھی۔ اس مجلس میں شاہی آداب کی رعایت نہ کی جاتی تھی، بلکہ بادشاہ ہر شخص سے دوستانہ اور برادرانہ سلوک کرتا تھا۔ (فرشتہ)

فیروز شاہ کو علم ہیئت سے بھی دلچسپی تھی۔ اس نے سنہ ۸۱۰ھ (۱۴۰۷ء) میں مولانا محمود گازرونی کو جو ہندسہ و ہیئت اور دوسرے فنون ریاضی میں ممتاز تھے، قریہ بالاکوٹ میں رصدگاہ تعمیر کرنے پر مامور کیا اور ان کی اعانت پر حسن گیلانی الحکیم کو تعینات کیا۔ حسن گیلانی منطق، فلسفہ وغیرہ جملہ علوم عقلیہ میں درک رکھتا تھا۔ (نزہت الخواطر)

سنہ ۸۱۵ھ میں سلطان فیروز کے عہد میں حضرت سید محمد گیسو دراز دہلی سے دولت آباد پہنچے تو اس نے وہاں کے گورنر غضنفر الملک کو حکم بھیجا کہ حضرت کو اظہار عقیدت کے طور پر نذر پیش کی جائے اور آپ سے گلبرگہ میں قیام کرنے کی درخواست کی جائے چنانچہ درخواست قبول ہو گئی جب حضرت گلبرگہ کے قریب پہونچے تو سلطان نے خود علماء اور اعیان دولت کے ساتھ آگے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا اور نہایت ادب اور احترام کے ساتھ گلبرگہ لے کر آیا۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بیان کے مطابق حضرت گیسو دراز نے بادشاہ کے مزاج اور رجحان کو دیکھ کر اردو میں تصنیف کا آغاز کیا ان کی ایک کتاب "معراج العاشقین" چھپ چکی ہے۔ ایک ہدایت نامہ بھی لکھا تھا، اور بہت سی نظمیں، راگ راگنیاں اور چکی نامہ وغیرہ منظوم کیے (دکنی ادب کی تاریخ) حضرت گیسو دراز کی تیس سے زیادہ تصانیف ہیں "ملتقط" نام کی قرآن پاک کی ایک تفسیر بھی ہے۔

یمن سے علامہ بدرالدین کے آنے کی خبر ملی تو سلطان خود تین کوس علامہ کے استقبال کے لئے گیا۔ علامہ شیخ محمد ابن یوسف حسین دولت آباد تشریف لائے تو سلطان فیروز شاہ نے گلبرگہ میں ۸۰۱ھ میں آپ کا استقبال کیا۔

مولانا تقی الدین محمد شیرازی کو فیروز شاہ نے وزیر مالیات مقرر کیا تھا۔ بادشاہ کے یہاں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔
(نزہۃ الخواطر)

الامیر فضل اللہ شیرازی صاحب ترجمہ بہت بڑے عالم ہیئت و ہندسہ کے علاوہ دیگر علوم حکمیہ میں ماہر تھے محمود شاہ نے آپ کو گلبرگہ کی صدارت تفویض کی اور زمانہ فیروز شاہ غالباً ۸۰۰ھ میں وکیل سلطنت کا منصب تفویض ہوا وہ بہادر سیاستداں اور مدبر بھی تھے۔ خطرات کے موقعوں پر پیش پیش رہتے۔ چوبیس مرتبہ کفار کے ساتھ جنگیں لڑیں اور ہر معرکہ میں کئی کئی شہر اور قلعے اپنی جرأت اور دلیری کی وجہ سے فتح کرلیتے (نزہت الخواطر)

احمد شاہ اول ۸۲۵ - ۸۳۸ھ مطابق ۱۴۲۲ - ۱۴۳۵ء

احمد شاہ نے ۸۲۵ھ میں دکن کی سلطنت کا نظام ہاتھ میں لیا اور ماتحتوں کو عدل و سخاوت کے ساتھ اپنا مطیع کرلیا۔ اس نے شیخ محمد بن یوسف حسینی کی بیعت کی ان کے مسترشدین کے لئے سربفلک محل اور قیام گاہیں تعمیر کرائیں اور ان کے لئے زرعی آراضی وقف کردی۔ . . .
اس نے مساجد اور مدارس بھی تعمیر کرائے۔ یہ بادشاہ نہایت عادل، فیاض، بہادر، بے باک اور خوش نصیب تھا اس نے ۸۳۲ھ میں بیدر آباد کرکے احمد آباد نام رکھا اور اسے دارالسلطنت بنایا اس شہر میں عالی شان محل تعمیر کرایا جس پر مشہور شاعر آذری اسفرائینی نے ایک قطعہ لکھا (نزہت الخواطر)

احمد شاہ کے دربار میں بڑے بڑے علماء و فضلاء کا اجتماع رہتا جس میں ملا عبدالغنی اور مفتی نجم الدین قابل ذکر ہیں۔ مرزا شاہ رخ کے دربار کا ملک الشعراء آذری حج بیت اللہ کے بعد دکن آیا اور احمد شاہ کے دربار میں رہا اس نے بادشاہ کی خواہش پر سلاطین بہمنیہ کے حالات منظوم کیے جس کا نام "بہمن نامہ" رکھا گیا۔ احمد شاہ کے زمانے تک کے حالات لکھنے کے بعد آذری نے اپنے وطن جانے کی خواہش ظاہر کی تو بادشاہ نے آپ سے چالیس ہزار تنکہ سفید عطا کئے۔ آذری نے کہا یہ عطیہ شاہی وزنی ہے اسے اٹھا نہیں سکتا تو احمد شاہ نے باربرداری کے لئے مزید بیس ہزار تنکہ اور پانچ غلام عطا کئے۔

احمد شاہ حضرت محمد گیسو دراز سے بے حد عقیدت رکھتا تھا اس نے آپ کی خانقاہ کے لئے جاگیریں وقف کیں اور آپ کے نام پر ایک عظیم الشان مدرسہ گلبرگہ کے قریب بنوایا۔ اسی عہد میں مولانا شیخ ابوالقاسم جرجانی دکن تشریف لائے اور اسے اپنا وطن ثانی بنالیا۔

علاؤالدین احمد شاہ ثانی (۸۳۸ھ - ۸۶۲ھ مطابق ۱۴۳۵ء - ۱۴۵۷ء)

علاؤالدین، فارسی بہت اچھی جانتا تھا۔ اس نے دوسرے علوم کی بھی فی الجملہ تحصیل کی تھی اسے علم طب سے بھی دلچسپی تھی۔ بڑا فصیح و بلیغ تھا کبھی کبھی جمعہ اور عیدین میں جامع مسجد جاتا اور منبر پر بیٹھ کر خطبہ پڑھتا۔ علاؤالدین علم دوست تھا اس کا دربار علماء و فضلاء سے بھرا ہوا تھا۔
سید محمد عبداللہ الحسینی اسی زمانہ میں گزرے ہیں آپ نے حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے رسالہ "نشاط العشق" کا دکھنی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کی شرح لکھی تھی (اردوئے قدیم - دکن میں اردو)

حضرت شیخ ابوالفیض احمد آباد بیدر تشریف لے گئے تو سلطان نے ان کا استقبال کیا اور انہیں ندی کی آراضی والے چند قطعات جاگیر میں دیئے۔ آپ نے وہیں سکونت اختیار کرلی (نزہت الخواطر)

احمد شاہ ثالث (نظام شاہ) (۸۶۵ - ۸۶۷ھ مطابق ۱۴۶۰ - ۱۴۶۲ء)

مشہور شاعر نظامی اس عہد میں درباری شاعر تھا اس کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے نام سے موسوم ہے یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔
(مختصر تاریخ ادب۔ دکن میں اردو)

محمد شاہ ثانی (۸۶۷ - ۸۸۷ھ مطابق ۱۴۶۳ - ۱۴۸۲ء)

محمد شاہ ثانی نے نو برس کی عمر میں تاج بہمنی سر پر رکھا۔ بادشاہ کو حیدر خاں شوستری کے، جا پنے زمانہ کا بڑا فاضل اور پرہیزگار تھا سپرد کیا۔ محمد شاہ تحصیل علم اور کسب و کمال میں مشغول ہوا اور تھوڑے ہی زمانہ میں اچھی قابلیت اور خوش خطی میں خوب مہارت حاصل کرلی۔ چنانچہ فیروز شاہ بہمنی کے بعد اس خاندان میں محمد شاہ جیسا صاحب علم و فضل فرماں روا نہیں ہوا۔ (فرشتہ)

اس عہد میں قاضی ابراہیم بن فتح اللہ ملتانی کا دکن کے قاضیوں میں بڑا مرتبہ تھا۔ آپ نے متعدد کتابیں لکھیں، ان میں عربی زبان میں معارف العلوم فی تعریف العلوم و فنون بھی ہے (نزہت الخواطر)

محمد شاہ فارسی علم و ادب کا بڑا مربی اور سرپرست تھا اپنے لائق وزیر خواجہ جہاں گیلانی (محمود گاواں) کی مدد سے بہت سے مفید کام انجام دیئے محمد شاہ کا وزیر محمود گاواں علماء و فضلاء کی سرپرستی اور امداد میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ اس کی داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ قریہ قریہ کے مشائخ اور اہل اللہ اس کے انعام و اکرام اور وظائف سے فیض یاب ہوتے۔ محمود گاواں نے شہر بیدر میں ایک عظیم الشان مدرسہ بنایا جو ۱۴۸۰ء میں مکمل ہوا، یہ اس زمانے میں اپنی قسم کا ایک ہی مدرسہ تھا جسے ہر اعتبار سے مکمل اور کامیاب کہا جا سکتا ہے (فرشتہ) یہ مدرسہ بقول میڈوز ٹیلر شاید اس عہد کی عظیم ترین عمارت تھی۔ جو طلب مدرسہ میں رہتے تھے ان کو کھانا، کپڑا اور کتابیں سرکار سے ملا کرتی تھیں معلمین ایران، بخارا اور سمرقند سے بلائے گئے تھے، (ریاض المآثر) محمود گاواں کے پاس ایک کتب خانہ تھا جس میں ۳۵ ہزار کتابیں مختلف علوم و فنون کی تھیں محمود گاواں ہر سال متعدد تحائف خراسان اور عراق کے علماء کو بھیجا کرتا تھا جس کے صلہ میں ان ممالک کے بادشاہ اسے اعزازات و خطابات سے سرفراز کرتے تھے مولانا عبدالرحمٰن جامی نے جو خطوط محمود گاواں کے نام بھیجے تھے وہ اس کی تصانیف میں شامل ہیں مولانا کو اس نے بیدر بلایا تھا لیکن انہوں نے آنے سے معذرت کی اور ایک مطول قصیدہ اس کی مدح میں بھیج دیا تھا جس کا ایک مصرع یہ ہے

مرحبا اے قاصد ملک معانی مرحبا

وزیر موصوف کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ ملا عبدالکریم سندھی نے اس کی سوانح عمری لکھی۔ (فرشتہ۔ سید شمس اللہ قادری)

محمد شاہ ثالث (۸۶۷ - ۸۸۷ھ)

محمد شاہ کے عہد میں محمد تقی نامی فارس کا ایک زبردست شاعر گذرا ہے اس کا تخلص نظیری تھا اس نے ملا آذری اسفرائینی کے بہمن نامہ کا تکملہ لکھا۔ (فرشتہ۔ خزانہ عامرہ) اور ہمایوں شاہ بہمنی کے مارے جانے پر جو تاریخ کہی ہے وہ بھی نہایت مشہور ہے جسے تمام مورخین نے نقل کیا ہے۔

اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا کیسی محفلیں، کس قسم کی علمی صحبتیں اور کس طرح کے باوقار جلسے تھے فرمانروا خود بھی صاحب علم اور اہل علم کے قدرشناس بھی اس چیز نے بادشاہوں کے درباروں کو "مجمع علمی" (اکیڈیمی) بنا دیا تھا!

س؎ گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

آگ ہی سے دھواں اٹھتا ہے......
..... لیکن جب آپ ہمارے سگریٹ سلگاتے ہیں تو جو دھواں اٹھتا ہے
اس سے کئی گھر روشن ہوتے ہیں، لوگوں کو روزی نصیب ہوتی ہے۔
ہمارے کاروبار سے ہزاروں آدمی کسی نہ کسی طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسان ہمارے
اچھے سگریٹوں کے لئے تمباکو پیدا کرتا ہے۔ اس کو اچھے دام ملتے ہیں۔
جب ہمارے سگریٹ پیک ہو کر تجارتی تقسیم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو
وسیع پیمانے پر تجارت اور معاشی ردعمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح
سارے ملک میں کئی ہزار لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔
مزید یہ کہ جب ہم ٹرکوں، کشتیوں یا ریل کے ذریعے اپنے سگریٹ بازاروں تک پہنچاتے ہیں
یا جب ہم سگریٹ کے پیکٹ کے لئے گتے، چھپے ہوئے پیکٹ یا لکڑی کے پیکنگ کیس
خریدتے ہیں تو تجارت اور معاشی سرگرمی کو اور فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جب
سگریٹوں کے لئے پیکنگ کا تمام تر سامان پاکستان ہی میں بننے لگے گا تو ملکی صنعت
اور زیادہ ترقی کرے گی۔
پاکستان ٹوبیکو کمپنی کو فخر ہے کہ وہ عوام کو خوشحال بنانے
میں مدد کرتی ہے اور یہ نہ صرف اپنے ہی دفتروں اور کارخانوں میں
بلکہ متعلقہ صنعتوں میں اور زراعت میں بھی روزگار کے مواقع
پیدا کرتی ہے۔
PTC
پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
پاکستان کی سگریٹ کی صنعت کے رہبر

محمد نواز (ایم اے)

اقبال کا حقیقی کارنامہ

(۲)

مثبت پروگرام :-

اقبال کے کلام کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک پیغام کے داعی تھے، وہ انسانوں کو پکار پکار کر اپنی طرف بلاتے ہیں۔ اسرار خودی میں کہتے ہیں کہ میں محض شاعر نہیں بلکہ ایک دعوت اور پیغام دے رہا ہوں۔ اس دعوت میں میرے دل میں ایسی شیفتگی اور اس درجہ کی تڑپ ہے کہ ہر دل میں اسے اتار دینا چاہتا ہوں۔ میں ایک ایسا عاشق ہوں کہ میری فریاد میرا ایمان ہے اور فریاد ہی کی یہ کیفیت ہے کہ ایک قیامت کا شور میرے آگے چلنے والوں میں ہے ؎

عاشقم فریاد ایمان من است   شور حشر پیش خیزان من است

اپنی اسی دعوت کے بارے میں کہتے ہیں ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں   مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

خودی :- اقبال کے پیغام کی اولین بنیاد خودی کے تصور پر ہے۔ خودی سے مراد خود آگاہی اور خودشناسی ہے لیکن خود آگاہی سے کیا مراد ہے؟ ہر شخص اپنے ظاہر اور باطن سے آگاہ ہے کون ہے جو اپنے سر، منہ، ہاتھ، پاؤں اور جسم کی ساخت سے ناواقف ہو، ہر شخص اپنے اندرونی حالات سے واقف ہوتا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتا ہے، غصہ ہو تو کسی سے جھگڑ لیتا ہے۔ عاشق زار ہو تو آہیں بھرنے لگتا ہے۔ ان ساری باتوں سے ہر شخص آگاہ ہے۔ لیکن وہ خودشناسی جسے اقبال "انسان سازی" کے عمل میں لازمی قرار دیتے ہیں وہ اس طرح کی خود آگاہی سے مختلف چیز ہے۔ اگر بالکل آسان اور سادہ انداز میں خودی کے مفہوم کو متعین کریں تو وہ صرف چار چیزیں ہیں جن کے جاننے اور جن کے بدل جان ماننے کو خودی کہتے ہیں اور وہ یہ ہیں :-

● اپنے نفس کی حقیقت کو جاننا یعنی یہ جاننا کہ آیا وہ حیوانی ہے یا روحانی یا ان دونوں کا مرکب۔ اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ نفس مطمئنہ، نفس لوامہ اور نفس امارہ کی حقیقت کیا ہے ان کا ایک دوسرے سے باہمی رشتہ کیا ہے۔ ان میں سے کونسا نفس کس حد تک کیوں مطلوب ہے؟ اور کس طرح کا ماحول کون سے نفس کے لئے مفید ہے؟

● اس بات کا جاننا کہ اس زمین پر انسان کا حقیقی مرتبہ، مقام اور منصب کیا ہے؟ اس کا اپنے خالق کے ساتھ کس نوع کا رشتہ ہے۔ اور مخلوق کے ساتھ اس کے تعلق کی کیا نوعیت ہے۔

● اس بات کا شعور حاصل کرنا کہ اس کا مقصد تخلیق کیا ہے اور اس کی بحیثیت انسان کیا ذمہ داریاں ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کا طریق کیا ہے؟ اور

● اس بات سے آگاہی حاصل کرنا کہ اس کے نفس کا آخری انجام کیا ہے۔ اس کی سعادت کا انحصار کن باتوں پر ہے اور اس کی شقاوت

چیزوں سے وابستہ ہے۔

ن چار باتوں کے جاننے کا نام خودی ہے اسی کو عرفان ذات کہتے ہیں اور یہ انسان کے سارے اعمال کا منبع ہے۔ معرفت کے اسی
رے میں فرمایا گیا ہے: من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ یہی وہ خودی کا تصور ہے جس کے بارے میں اقبالؒ کہتے ہیں کہ
ریت وجدانی کا روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات، جذبات اور محسوسات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ وہ "پراسرار شے" ہے جو
نی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہی وہ خودی یا انا یا "میں" (EGO) ہے جو اپنے عمل کی رو سے نمایاں
ہت کی رو سے نہاں ہے جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی۔
یہ متصوفین کے اُس تصور خودی سے مختلف ہے جسے تکبّر اور غرور کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے بلکہ یہ وہ خودی ہے جس سے خود
جود قائم ہے کائنات خودی کے ذوق نمو کی دلیل ہے سینکڑوں جہاں اس کی ذات میں موجود ہیں۔ یہ زندگی میں کشمکش اور رزم و
کرتی ہے۔ خودی کا شیوہ ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ پھول حاصل کرنے کی تمنا میں بہت سے گلکدوں اور باغیچوں کو روند ڈالتی ہے اور ایک
بیب بنے کے لئے سینکڑوں نالہ و شیون کرتی ہے اور ایک آسمان کی آرائش کے لئے ہزاروں نئے چاند ابھار دیتی ہے زمانے کی فراخی خودی
لاہ ہے اور آسمان اس کے ماتھے کی گرد و غبار ہے وہ سوتی ہے تو اس وقت کا نام رات ہے جاگتی ہے تو "دن" ہو جاتا ہے
ٹکڑے ہوتی ہے تو اجزاء کی شکل اختیار کر لیتی ہے، پھیلتی ہے تو صحرا کی صورت میں ڈھل جاتی ہے، سمٹ کر پیوستگی اختیار کرتی ہے
دل کی محبت کا نشان ہوتی ہے۔ وہ خاک کے ذرّے کو ہم دوش ثریا بنا دیتی ہے اور قطرے میں سمندر کی وسعت پیدا کر لیتی ہے۔

سہ خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ — خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

مزید تشریح اس طرح کرتے ہیں سہ

خودی روشن ز نور کبریائی است — رسائی ہائے او از نارسائی است

جدائی از مقامات وصالش — وصالش از مقامات جدائی است

دی کا شعور حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں سہ

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز — بناخن سینہ کاویدن بیاموز

اگر خواہی خدا را فاش بینی — خودی را فاش تر دیدن بیاموز

ی کی یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم دین و شریعت کی سادہ اصطلاح میں "ایمان" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اسی ایمان کے بارے میں ارشاد
ہے۔

انتم الاعلون ان کنتم مومنین ط

ال مرحوم قرآن حکیم کے اس جملے کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں سہ

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

بلوگ یہ کہتے ہیں کہ خودی کا تصور اقبالؒ نے مغرب سے لیا ہے وہ اقبالؒ کے ساتھ انصاف نہیں کرتے خودی کا یہ تصور حقیقتہً اسلامی لب

میں بہت پہلے موجود ہے ۔ امام غزالیؒ اور مولانا رومؒ نے اسے بالکل اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے ۔لیکن بعد کے متصوفین نے خودی کے تصور میں تحریف کی کوشش کی یا پھر اس کے ختم کرنے کے درپے ہو گئے اور کہنے لگے کہ خودی کو شیخ کی ذات میں گم کر دو یا فنا فی اللہ ہو جاؤ حالانکہ اللہ نے انسان سے اس کے جسم کی قربانی کا مطالبہ کیا ہے لیکن اس کی خودی اور روح کی قربانی کا ہرگز مطالبہ نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس اس کی حفاظت اور تربیت کا حکم فرمایا ہے ۔

خودی کی نمو اور ارتقاء کے لئے اقبال مقصد اور نصب العین کو ضروری خیال کرتے ہیں ۔مقصد کی لگن اور نصب العین کے حصول سے زندگی کی نیرنگیاں وابستہ ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

آرزو را در دل خود زندہ دار　　تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست　　فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
خودی از آرزو شمشیر گردد　　دم او رنگ را برّد زبولا

مقصد کی اہمیت اور صحیح نصب العین کے انتخاب پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز　　از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
مقصدے مثلِ سحر تابندۂ　　ماسوا را آتشِ سوزندۂ
مقصدے از آسماں بالاترے　　دلربائے دلستانے دلبرے
باطلِ دیرینہ را غارت گرے　　فتنہ در جیبے سراپا محشرے
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اقبال خودی کی تربیت اور اس کے تحفظ اور استحکام پر زور دیتے ہیں اور اس غرض کے لئے پورا لائحہ عمل مرتب کر دیتے ہیں۔

اقبال نے خودی کی تربیت کے لئے تین منزلیں بیان کی ہیں ۔پہلی منزل کا نام اطاعت، دوسری کا ضبطِ نفس اور تیسری کا نام نیابتِ الٰہی ہے ۔اقبال نے ان تینوں منزلوں کے لئے اونٹ کی مثال سامنے رکھی ہے ۔

پہلی منزل ۔ اطاعت :۔ پہلی منزل یعنی اطاعت سے مقصود یہ ہے کہ اس آئین، دستور اور شریعت کی پابندی کی جائے جو خدا کی مقرر کی ہوئی ہے ۔جس طرح اونٹ اطاعت، خدمت، محنت، صبر اور استقلال کا پیکر ہے اسی طرح انسان کو بھی خدا کے احکام کی پابندی میں محنت اور مشقت اور صبر اور استقلال کا مظاہرہ کرنا چاہئے ۔فرماتے ہیں ؎

تو ہم از بارِ فرائض سر متاب　　برخوری از عندہٗ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار　　می شود از جبر پیدا اختیار
ناکس از فرمان پذیری کس شود　　آتش ار باشد ز طغیاں خس شود

دوسری منزل ۔ ضبطِ نفس :۔ دوسری منزل ضبطِ نفس کی ہے ۔اس میں بھی اونٹ کی مثال دی گئی ہے ۔فرماتے ہیں جس طرح اونٹ خود پرور اور خود سر ہے نفسِ انسانی کی بھی بالکل یہی کیفیت ہے جب انسان کا ضبط کمال کو پہنچ جاتا ہے تو خزف کی بجائے گوہر بن جاتا ہے ۔جو انسان نفس کو قابو میں نہیں لا سکتا وہ اس کا محکوم بن جاتا ہے وہ یقیناً اغراض کا بندہ بنا رہے گا اور یہ حالت اسے دوسروں کا محکوم بنائے رکھے گی ۔انسان کی فطرت میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں۔ ایک محبت اور دوسری خوف !! اگر نفس پر قابو پا لیا تو محبت اور خوف دونوں کا مرجع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات رہ جائے گی باقی تمام محبتیں اور تمام خوف باطل ہو جائیں گے۔

ں مرحلے کی تشریح میں فرماتے ہیں ؎

نفس تو مثل شتر خود پرور است   خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمام او بکف   تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش روان   می شود فرماں پذیر از دیگراں

نزل۔ **نیابت الٰہی** :- اطاعت اور ضبطِ نفس کی منزلیں کامیابی سے طے کر چکنے کے بعد انسان تیسری منزل میں داخل ں میں اسے نیابت (خلافتِ الٰہی) کا منصب مل جاتا ہے اور اس ملک کا تاجدار بن جاتا ہے جسے کبھی زوال نہیں آتا۔ اس مرحلے نے خدا کے خلیفہ یا نائب ہونے کے جو اوصاف بتائے ہیں وہ دراصل رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ حمیدہ کا پرتو ہیں ہتے ہیں :-

؎ گر شتر بانی جہاں بانی کنی   زیب سر تاج سلیمانی کنی
تا جہاں باشد جہاں آرا شوی   تاجدار ملک لایبلیٰ شوی

؎ نائب حق در جہاں بودن خوش است   بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است   ہستی او ظل اسم اعظم است

تربیت کے اس آخری مرحلے کا حقیقی ہدف خدا کے احکام اور قوانین کو جاری اور نافذ کرنا ہوتا ہے جیسے کہ فرمایا ؎

از رموز جزو و کل آگہ بود   در جہاں قائم با مر اللہ بود

ق :- خودی کے استحکام اور اس کے عملی ظہور کے لئے ایک انسان کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے؟ اس کے بارے میں اقبالؔ نے تین ارتقائی مراحل بیان فرماتے ہیں ان میں پہلا مرحلہ عشق ہے ؎

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل   اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

سے مراد؟ مقصدِ حیات سے گہری لگن اور وابستگی، مقصدِ حیات کی صداقت پر بے انتہا یقین، اس کے حصول کی راہ میں فدائیت، بے خوفی اور والہانہ وارفتگی!! اقبالؔ کہتے ہیں کہ خودی عشق و محبت کی برکت سے زیادہ پائیدار، زیادہ زندہ، زیادہ جلا دالی اور زیادہ چمکیلی بن جاتی ہے۔ محبت ہی کی بدولت اس کے جوہر ابھرتے ہیں۔ قدرت نے خودی کے اندر جو پوشیدہ صلاحیتیں ہیں وہ محبت ہی کی بدولت نشوونما پاتی اور بلند تر ہوتی ہیں ؎

از محبت می شود پائندہ تر   زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
از محبت اشتعال جوہرش   ارتقاء ممکنات مضمرش
فطرت او آتش اندوزد ز عشق   عالم افروزی بیاموزد ز عشق

نق کی حقیقت اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ   عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو   عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق دم جبریل عشق دل مصطفیٰ   عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عقل دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق   عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

اقبالؔ کے نزدیک عشق اور جنون مترادف الفاظ ہیں ؎

ز رمز زندگی بیگانہ تر باد　　　کسے کو عشق را گوید جنون است

اس عشق کے اثرات اور خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

بباغاں باد فروردیں دہد عشق　　　براغاں غنچہ چوں پروین دہد عشق

شعاع مہر او قلزم شگاف است　　　بماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

اسی عشق کے حصول کی خاطر اقبالؔ یہ دعا کرتے ہیں ؎

عطا اسلام کا جذب دروں کر　　　شریک زمرۂ لا یحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　　مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

عشق کی ابتداء اور انتہا کیا ہے ؟ اس کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

ابتدائے عشق و مستی قاہری است　　　انتہائے عشق و مستی دلبری است

یہی وہ عشق ہے جس کے حاصل کرنے کی دعا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ارشاد فرمائی ہے ؎

اللّٰھم انی اسئلک حبک وحب من یحبک والعمل الذی یبلغنی حبک ۔ اللّٰھم اجعل حبک احب الی من نفسی واھلی ومن الماء البارد ۔

اس عشق کے حصول کا طریق کیا ہے ؟ علامہ اقبال اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ایک مسلمان کے لیے عشق کی اس منزل تک پہنچ صرف اور صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ محبت ، عقیدت اور اطاعت رویہ اختیار کرے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع سے وہ مقام حاصل کرنے کی کوشش کرے جو حضرت بایزید بسطامیؒ حاصل کیا تھا ۔ انہوں نے اپنی ساری عمر میں خربوزہ محض اس بنا پر نہ کھایا ، انہیں ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ پھل کھایا تھا یا نہیں اگر کھایا تھا تو کس طریق پر ــــــــــ اسی تقلید کامل کا نام عشق ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق　　　ہست ہم تقلید از اسمائے عشق

کامل بسطام در تقلید فرد　　　اجتناب از خوردن خربوزہ کرد

عاشقی ؟ محکم شو از تقلید یار　　　تا کمند تو شود یزداں شکار

یہی وہ بات ہے جو قرآن حکیم میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کی گئی ہے :۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

"کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا "

اس عشق کی آخری منزل "ہجرت" ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنی خواہشات سے دست کش ہو جانا چنانچہ اقبالؔ کہتے ہیں ؎

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن　　　ترک خود کن سوئے حق ہجرت گزیں

محکم از حق شو سوئے خود گام زن　　　لات و عزائے ہوس را سر شکن

لشکرے پیدا کن از سلطان عشق　　　جلوہ گر شو بر سر فاران عشق

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا　　　شرح انی جاعل سازد ترا

ہجرت کے مفہوم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:۔
"..... والمھاجر من ھجر ما نھی اللہ عنہ یعنی مہاجر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دے"
عشق دین وشریعت کی سادہ زبان میں "اسلام" کے مترادف ہے یعنی تسلیم و رضا کا وہ مقام جس کا نمونہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے پیش فرمایا تھا۔

فقر ۱۔ خودی کے عملی ظہور اور اس کے استحکام اور پختگی کے لئے اقبال نے دوسرا ذریعہ فقر کو قرار دیا ہے یہاں اس سے مراد وہ فقر نہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کاد الفقر ان یکون کفراً بلکہ یہ وہ فقر ہے جسے "الفقر فخری" کہا گیا ہے۔ اس فقر کی ایک صفت استغنا اور بے نیازی ہے۔ یعنی منزل عشق میں مادی وسائل کی موجودگی اور غیر موجودگی کا خیال تک نہ ہونا اگر اس راہ میں وسائل میسر ہوں تو بھی اور اگر میسر نہ ہوں تو بھی ہر دو صورتوں میں۔ فقر ان سے بے نیاز رہتا ہے۔ انہیں حاصل کرنے یا اگر حاصل ہوں تو ان کی حفاظت کے لئے عشق ومحبت کی اعلیٰ قدروں کو ہرگز قربان نہیں کرتا۔ فقر کی اس صفت کو واضح کرنے کے لئے اقبال فرماتے ہیں:

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ　　فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر　　جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا　　اللہ کی شان بے نیازی

فقر کی دوسری خصوصیت تسلیم و رضا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست　　ما امینیم این متاع مصطفےٰ است
فقر کار خویشتن سنجیدن است　　بر دو حرف لاالہ پیچیدن است

تسلیم و رضا کی اس صفت کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی میں بھی کیا گیا ہے ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا و رسولاً۔ فقر کی بڑی متاع یہ ہے کہ وہ اللہ کو رب سمجھ کر، اسلام کو دین کی حیثیت سے پاکر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت سے اپنا تعلق استوار کر کے راضی اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

چون فنا اندر رضائے حق شود　　بندۂ مومن قضائے حق شود
چار سوئے با فضائے نیلگوں　　از ضمیر پاک او آید بروں
در رضائے حق فنا شو چوں سلف　　گوہر خود را بروں آر از صدف

فقر کی تیسری صفت "عزم کی بلندی" یعنی عزیمت ہے اس کا کام کائنات کی تسخیر ہے۔ یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے حکومت و دبدبہ کا حامل ہے۔ محکومی اور مسکینی اس کے مسلک میں حرام ہے چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

فقر قرآں احتساب ہست و بود　　نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقر مومن چیست؟ تسخیر جہات　　بندہ از تاثیر او مولا صفات
فقر کافر خلوتِ دشت و در است　　فقر مومن لرزۂ بحر و بر است
فقر چوں عریاں شود زیر سپہر　　از نہیب او بلرزد ماہ و مہر

فقر کی چوتھی صفت غیرت، تصادم، کشمکش اور جہد مسلسل ہے وہ خدا کے علاوہ کسی کی ماتحتی قبول نہیں کرتا۔ ماسوی اللہ سے ٹکرانا اور ٹکراتے رہنا اس کی سرشت میں داخل ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

فقر بر کروبیاں شبخوں زند — بر نوامیس جہاں شبخوں زند
قلب او را قوت از جذب و سلوک — پیش سلطاں نعرۂ او لا ملوک
فقر عریاں گرمیِ بدر و حنین — فقر عریاں بانگِ تکبیر حسین

سکوں پرستیِ راہب سے فقر ہے بیزار — فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے — ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بیتابی سے — تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست — با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

دگرگوں کرد لادینی جہاں را — ز آثارِ بدن گفتند جاں را
ازاں فقرے کہ با صدیقؓ دادی — بشورے آور ایں آسودہ جاں را

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی — اے حلقۂ درویشاں وہ مرد خدا کیسا!
اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہاں گیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری — میراث مسلمانی سرمایۂ شبیری

فقر میں یہ خصوصیات جتنی زیادہ مستحکم ہونگی اتنی ہی یہ ناقابل تسخیر ہوگا کیونکہ ؎

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر — ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

خودی پر اس کے اثرات کا جو عالم ہوتا ہے اس کا اندازہ اس شعر سے کیجئے ؎

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

فقر کی ان خصوصیات کو جو چیز نقصان پہونچانے والی ہے وہ ہے دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنا اور اپنے وسائل رزق کے لئے مخلوق سے امیدیں وابستہ کرنا ہے علامہ اقبال فقر کو برباد کرنے والے اس پہلو کی مذمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

پھر فرماتے ہیں ؎

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر — بستۂ فتراک او سلطان و میر

اس کے بعد پیر رومی کے اشعار کی زبان سے نصیحت فرماتے ہیں۔

رزق از حق جو مجو از زید و عمر — مستی از حق جو مجو از بنگ و خمر
گل مخور گل را مخر گل را مجو — زانکہ گل خوار است دائم زرد رو
دل بجو تا جاوداں باشی جواں — از تجلی چہرہ ات چوں ارغواں

پھر اقبال خود کہتے ہیں ؎

شکوہ کم کن از سپہر لاجورد — جز بگرد آفتاب خود مگرد
از مقام ذوق شوق آگاہ شو — فتنہ ! صیاد مہر و ماہ شو
درگزر از رنگ و بوہائے کہن — پاک شو از آرزوہائے کہن
زندگی بر آرزو دارد اساس — خویش را از آرزوئے خود شناس
چشم و گوش و ہوش تیز از آرزو — مشت خاک لالہ خیز از آرزو
آرزو سرمایۂ سلطان و میر — آرزو جام جہاں بین فقیر

پھر فرماتے ہیں ؎

فقر خواہی از تہی دستی منال — عافیت در حال و نے در جاہ و مال
صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد — نے زر و سیم و قماش سرخ و زرد
بگذر از کاؤس و کے اے زندہ مرد — طوف خود کن گرد ایوانے مگرد
از مقام خویش دور افتادۂ — کرگسی کم کن کہ شاہیں زادۂ

فقر کی حقیقت سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں ؎

فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است — ایں تجلیہائے ذات مصطفیٰ است
خلافت فقر با تاج و سریر است — زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است
جواں بختا ! مدہ از دست ایں فقر — کہ بے او پادشاہی زود میر است

فقر کی ان خصوصیات کے بغیر ایک انسان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد گرامی ملاحظہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں :—

"جو شخص لوگوں سے عزّت کا طالب ہوتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے جو آدمی اپنے جیسے کسی بندے پر تکیہ کرتا ہے تو وہ ذلیل ہو جاتا ہے"
(بحوالہ غنیۃ الطالبین)

اس ارشاد کی تشریح میں اقبال کہتے ہیں ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک — اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

اقبال خودداری اور غیرت کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز — آبروئے ملت بیضا مریز
وائے بر منت پذیر خوان غیر — گردنش خم گشتۂ احسان غیر
خویش را از برق لطف غیر سوخت — با پشیزے مایۂ غیرت فروخت
اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب — می نخواہد از خضر یک جام آب
تر جبیں از خجلت سائل نشد — شکل آدم ماند و مشت گل نشد
زیر گردوں آں جوان ارجمند — می رود مثل صنوبر سربلند

درتہی دستی شود خود دار تر ـــــ بخت او خوابیدہ او بیدار تر
قلزم نہ نبیل سیل آتش است ـــــ گر ز دست خود رسد شبنم خوش است
چوں حباب از غیرت مردانہ باش ـــــ ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

یہ ہے وہ فقر جسے اقبالؒ خودی کے استحکام اور تحفظ کے لئے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں اس میں قہر و جلال بھی ہے اور حسن و جمال بھی اور یہ "حلقۂ یاراں" میں "ابریشم کی طرح نرم" بھی ہے اور رزم حق و باطل میں "صورت فولاد" ـــــ خیبر شکن بھی ہے۔
اقبال نے فقر کو قریب قریب انہی معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں لفظ تقوی استعمال کیا گیا ہے یعنی دنیا میں زندگی گذارنے کے لئے ایک طرز عمل اختیار کرنا جو دنیا کی آلودگیوں سے پاک ہو اور جس میں خوف اور محبت و خشیت کا مرجع صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو ـــــ گویا خودی کے عملی اظہار اور اس کے استحکام کا عشق کے بعد یہ دوسرا ذریعہ ہے۔

بے خودی

انسانی خودی کے استحکام اور اظہار کے ارتقائی مراحل میں آخری اور تکمیلی مرحلہ بے خودی ہے جیسا کہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

جہد کن در بے خودی خود را بیاب ـــــ زودتر واللہ اعلم بالصواب

بے خودی سے مراد نہ تو "فنائیت" کا وہ مقام ہے جسے متصوفین فنا فی الشیخ یا فنا فی اللہ کا نام دیتے ہیں اور نہ "سکر" کی وہ حالت ہے کہ جس میں گرفتار ہو کر انسان شریعت کی تکلیفات سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ بے خودی کو جس معنی میں استعمال کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان کی انفرادی خودی کو ایک آئین و ضابطہ کا پابند بنایا جائے انفرادی خودی کے نشوونما و ارتقاء کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ وہ کسی قانون اور ضابطے کی پابند ہو اور وہ اس قابل ہو کہ انسانی معاشرے کے دوسرے افراد کی انفرادی انا اور ملت کی اجتماعی خودی کے ساتھ منطبق ہو سکے۔ اس میں صرف "میں" کا احساس ہی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ "وہ" "تو" اور "وہ" کے ساتھ ٹکرانے کے بجائے ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔ یعنی "میں صرف "میں" ہی بن کر نہ رہے بلکہ اس کے اندر "تو" اور "وہ" کو اپنے اندر جذب کر کے "ہم" بننے کی خصوصیت اور صلاحیت بھی ہو اور یہ خودی کے ارتقاء کا ایک نہایت ہی اونچا مقام ہے یہ مقام بلند صرف ضابطہ اور قانون ہی کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔
اگر انفرادی خودی کسی آئین اور قانون کی پابند نہ ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ـــــ اس صورت میں اس کی "میں" نہ صرف غیر مفید اور لایعنی ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات فساد انگیز اور مضر بھی ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز نظم و ضبط قبول کرنے کے بعد ہی مفید اور کار آمد بنتی ہے۔ جنگل کی لکڑی جب کسی آئین اور ضابطہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہے تو پھر اس سے حسین اور دلآویز فرنیچر تیار ہوتا ہے، جو دانہ نظم و آئین باغبانی قبول کر کے خاک میں ملتا ہے تو پھر اس کا ذوق نمو یا اس کی انفرادی خودی ہی کئی گلشنوں کو آباد کرتی ہے پھول کی پتیاں اگر منتشر ہیں تو ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی لیکن جب جڑ کر رہنے کا ضابطہ قبول کرتی ہیں تو گلوں کے حسن کا نکھار بن جاتی ہیں۔ یہ بخارات جو سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، تالابوں اور گھر میں ابلنے والی دیگچیوں سے ہر آن اور ہر لمحہ اٹھ رہے ہیں اگر نظم و آئین قبول کر کے سحاب نہ بنیں اور بارش نہ برسے تو بزم عالم کی ساری رعنائیاں بے رونق ہو کر رہ جائیں، بجلی کی رو کے تموجات اگر تاروں میں بند رہنے سے انکار کر دیں تو ان کے بے ہنگم کوندے سے حیات انسانی کے نہ جانے کتنے خرمن خاکستر ہو جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ منتشر اور بکھری ہوئی اینٹوں کا یہ ڈھیر، جو راہگیروں کے لئے باعث تکلیف بنا ہوا ہے اگر نظم و ترتیب اور باہم پیوستگی کی رسم قبول نہ کرے تو تاج محل جیسے

(...)رت انگیز فنی شاہکار عالم وجود میں نہ آسکیں۔ غرض خودی وہی مفید اور کارآمد ہے جو کسی آئین اور ضابطہ کی پابند ہو اس لئے اقبال (...)ں بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر فرد کی انفرادی خودی ملت کی خودی کا حصہ بن کر رہے اور اس کے ساتھ اس طرح جڑ کر اور پیوست ہو کر (رہے) جیسے ایک دیوار کی اینٹیں باہم جڑی ہوتی ہیں اس لئے کہتے ہیں ؎

مسلمانی غم دل در خریدن | چوں سیماب از تپ یاراں تپیدن
حضور ملت از خود در گذشتن | دگر بانگ انا الملت کشیدن

"انا الملت" کا یہ مقام بلند اس وقت نصیب ہوتا ہے جب فرد ملت کے ساتھ وابستہ رہ کر اپنی ساری صلاحیتیں اس کی بہبود پر صرف کر دیتا ہے۔ ملت کا مقصد اس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے اپنی ساری قوتیں لگا دیتا ہے۔
انسانی خودی جب انا الملت کے قریباً تک پہونچ جاتی ہے تو وہ ناقابل تسخیر ہوتی ہے اور ایک ایسے "دشت جنوں" کی صورت میں ڈھل جاتی ہے جس میں "جبرئیل" اس کا ایک "صید زبوں" ہوتا ہے اور جس کی "ہمت مردانہ" "یزداں بہ کمند آور" جیسی صفت اور صلاحیت پیدا کر لیتی ہے۔

یہ خودی کا وہ مقام بلند ہے "جہاں خدا بندے سے خود پوچھتا ہے" کہ بتا تیری رضا کیا ہے" جب خودی یہ مقام حاصل کر لیتی ہے تو بندہ "احسان" کے اس مرتبہ پر پہونچ جاتا ہے جہاں وہ اپنے اندر یا تو خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے یا کم از کم یہ شعور پختہ ہو جاتا ہے کہ خدائے قادر و توانا اسے ہر آن ہر حال میں دیکھ رہا ہے اس مقام کے بارے میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں ؎

الله الله کن که الله می شوی | ایں سخن حق است بالله می شوی

اس شعر کے ظاہری مفہوم کو ہرگز اہمیت نہ دیجئے کیونکہ اس میں بظاہر "ہمہ اوست" کا سارا زہر بکھرا ہوا ہے یہ فی الحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی شرح ہے جس میں آپ فرماتے ہیں :-

"اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میرا بندہ نوافل کے ذریعے ہمیشہ میرا قرب ڈھونڈتا ہے یہاں تک میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی وہ سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور بینائی بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں اس کو پناہ دیتا ہوں"
یہی بات اس قول میں بھی موجود ہے "تخلقوا باخلاق اللہ" اسے اقبالؒ یوں بیان کرتے ہیں ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ | غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات | ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

انسانی خودی اپنی منزل کے ابتدائی مرحلے میں آزاد اور ناتربیت یافتہ ہوتی ہے لیکن جب اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کی منزلوں سے گزر کر عشق اور فقر کی صفات سے متصف ہو جاتی ہے تو اس کے اندر ملت کے ساتھ جڑ کر رہنے، اس کے مقاصد کی خاطر جان کھپانے اپنے انفرادی مفادات کو ملت کے اجتماعی مفادات پر قربان کر دینے اور ملت کے دوسرے افراد کی انفرادی "انا" اور "خودیوں" سے برسر پیکار ہونے کے بجائے ان سے توافق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ اس کی تکمیل کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی خودی خود اس کے لئے نہیں ہوتی بلکہ ملت کے لئے ہوتی ہے اور اس وقت اس کی زبان پر صرف ایک ہی نعرہ انا الملت ہی ہوتا ہے۔ وہ ساری دلچسپیاں چھوڑ کر کہتا ہے :-

انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض

اور اس کی زبان پر اگر کوئی بات ہوتی ہے تو وہ صرف یہ کہ :-

ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین

اقبال کے نزدیک فرد کی خودی کا آخری مقام "انا الملت" ہے لیکن ملت کی خودی کا نقطۂ عروج "انا الحق" ہے جیسا کہ کہتے ہیں:

انا الحق جز مقام کبریا نیست　　سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ　　اگر قومے بگوید ناروا نیست
بہ آں ملت انا الحق سازگار است　　کہ از خونش نم ہر شاخسار است
نہاں اندر جلالے او جمالے　　کہ او را نہ سپہر آئینہ دار است
میان امتاں والا مقام است　　کہ آں امت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کار آفرینش　　کہ خواب و خستگی بروے حرام است

ملت "انا الحق" کے اس مقام بلند پر دو سہاروں کی بنا پر فائز ہوتی ہے ایک توحید اور دوسری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت:

ع　ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ　　ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ اسرار ما　　رشتہ اش شیرازۂ افکار ما
حرفش از لب چوں بدل آید ہمی　　زندگی را قوت افزاید ہمی
نقش او گر سنگ گیرد دل شود　　دل گر از یادش نسوزد گل شود

رسالت کے بارے میں کہتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید　　وز رسالت در تن ما جاں دمید
حرف بے صوت اندریں عالم بدیم　　از رسالت مصرع موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوین ما　　از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است　　جزو ما از جزو ما لاینفک است
قوت قلب و جگر گردد نبی　　از خدا محبوب تر گردد نبی[۱]
قلب مومن را کتابش قوت است　　حکمتش حبل الورید ملت است
فرد از حق ملت از وے زندہ است　　از شعاع مہر او تابندہ است
ہست دین مصطفیٰ دین حیات　　شرع او تفسیر آئین حیات
غنچہ از شاخسار مصطفیٰ　　گل شو از باد بہار مصطفیٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت　　بہرہ از خلق او باید گرفت
مرشد رومی چہ خوش فرمودہ است　　آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است
"مگسل از ختم الرسل ایام خویش　　تکیہ کم کن بر فن و بر گام خویش"

۱؎ مگر یہ وہ مبالغہ ہے جو دین و شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ محبت کے لائق ذات اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی نہ ہونی چاہیے۔ (م۔ ق)

توحید اور رسالت کی ان دو بنیادی وجوہات کے ساتھ ساتھ ملت کے "انا الحق" ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ملت کا مبنی نہیں بلکہ زمان و مکان کی قیود اور بندھنوں سے آزاد ہے یعنی یہ نہ تو کسی خاص خطۂ زمین میں محدود ہے اور نہ اس کی زندگی عارضی ہے بلکہ یہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری ملت ہے اور رہتی دنیا تک صرف اسی کا وجود باقی رہے گا اس نقطے کو اس طرح بیان فرماتے ہیں ؎

رونق از ما محفل ایام را　　　او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمت ساقی گری با ما گذاشت　　　داد ما را آخرین جامے کہ داشت
لا نبی بعدی ز احسان خداست　　　پردۂ ناموس دین مصطفاست
قوم را سرمایۂ قوت ازو　　　حفظ سر وحدت ملت ازو
حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست　　　تا ابد اسلام را شیرازہ بست
دل ز غیر اللہ مسلمان برکند　　　نعرۂ لا قوم بعدی می زند

ملت کے "انا الحق" ہونے کی ایک آخری وجہ یہ بھی ہے کہ وہ شہادت حق اور اقامت دین کے اس نصب العین کی علمبردار ہے جس طرح انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے گئے تھے۔ ملت اس نصب العین کی راہ میں اس وقت تک ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی جب تک اس "انا الملت" کی منزل سامنے نہ رکھیں۔ جب ملت اپنے اس نصب العین کے حصول کی کوشش کرتی ہے تو اس وقت یہ "انا الحق" کہلانے کی مستحق ہوتی ہے اور اس صورت میں وہ "الجماعت" بن جاتی ہے۔ "الجماعت" کا صحیح اور کامل ترین نمونہ خلافت راشدہ تھی ؎

می ندانی آیۂ ام الکتاب　　　امت عادل ترا آمد خطاب
آب و تاب چہرۂ ایام تو　　　در جہاں شاہد علی الاقوام تو
نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ　　　از علوم امیے پیغام دہ
امیے پاک از ہوی گفتار او　　　شرح رمز ما غویٰ گفتار او
در جہاں وابستۂ دینش حیات　　　نیست ممکن جز بآئینش حیات
اے کہ می داری کتابش در بغل　　　تیز تر نہ پا بہ میدان عمل

اسی بنا پر اقبالؔ کہتے ہیں کہ افراد اپنی انفرادی خودیوں کو انا الملت کی اجتماعی خودی میں جذب کریں۔ اور شہادت حق کو اپنا مقصود حیات بنائیں۔ ملت کے مقصد کی تکمیل کے والہانہ عشق اور اس کے وجود سے وابستگی بلکہ پیوستگی ہی سے انفراد کی خودی مستحکم اور مضبوط ہوتی ہے۔ اقبالؔ کے مرد مومن یا "مرد کامل" کی رفعت اور بلندی کا یہی وہ نقطۂ کمال ہے۔ اس نقطہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

تو خودی از بیخودی نشناختی　　　خویش را اندر گماں انداختی
جوہر نوریست اندر خاک تو　　　یک شعاعش جلوۂ ادراک تو
واحدست و برنمی تابد دوئی　　　من ز تاب او من استم تو توئی
خویش دار و خویش باز و خویش ساز　　　نازہا می پرورد اندر نیاز
آتشے از سوز او گردد بلند　　　ایں شرر بر شعلہ اندازد کمند

چون ز خلوت خویش را بیرون دہد — پا بہ ہنگامۂ جلوت نہد
نقش گیرد اندر دلش "او" می شود — "من" ز ہم می ریزد "تو" می شود
ناز تا نازانہ است کم خیزد نیاز — ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز
در جماعت خود شکن گردد خودی — تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

ملت کے ساتھ وابستگی کے ہرگز یہ معنی نہ لیے جائیں کہ ایک انسان اپنی انفرادی خودی کو ملت کی اجتماعی خودی میں فنا کر دے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک فرد اپنی انفرادی خودی میں ملت کی اجتماعی خودی کو جذب کر کے "انا الملت" بن جائے، اس غرض کے لیے ملت کے آئین اور ضابطہ میں تین ایسے اصول تسلیم کیے گئے ہیں جو ایک فرد کی انفرادی خودی کو ملت کی اجتماعی خودی میں فنا ہونے سے بچاتے ہیں:-

انہی اصولوں میں سے پہلا یہ ہے کہ افراد ملت بلا امتیاز رنگ و نسل یا وطن اور زبان سارے کے سارے مساوی المرتبہ ہیں اس لیے ان سب کے حقوق برابر ہیں۔ ملت کا نظام مساوات کے اس اصول کی پوری نگہداشت کرتا ہے چنانچہ اقبال فرماتے ہیں:-

شعلہ ہا از مردہ خاکستر کشاد — کوہکن را پایۂ پرویز داد
اعتبار کار بندان را فزود — خواجگی از کار فرمایاں ربود
قوت او ہر کہن پیکر شکست — نوع انساں را حصار تازہ بست

دوسرا اصول یہ ہے کہ سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اگر مساوات کا تصور انسان کے بنیادی حقوق کا آئینہ دار تھا تو اخوت کے اس اصول نے اسے تمام اسلامی حقوق عطا کر دیئے اور تفوق و برتری کا معیار صرف "تقویٰ" کو قرار دیا جیسا کہ اقبال کہتے ہیں:-

کائنات از کیف او رنگیں شدہ — کعبہ با بت خانہ ہائے چیں شدہ
مرسلان و انبیاء آبائے او — اکرم او نزد حق اتقائے او
کل مومن اخوۃ اندر دلش — حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ — در نہاد او مساوات آمدہ
ہمچو سرو آزاد فرزندان او — پختہ از قالوا بلیٰ پیمان او

ایک فرد کی انفرادی خودی کو اجتماعی خودی میں فنا ہونے سے بچانے کے لیے تیسرا اصول حریت ہے، حریت سے مراد یہ ہے کہ انسان سوائے خدا کے اور کسی کی غلامی اور بندگی اختیار نہ کرے۔ ایک فرد کو حریت اور کامل حریت اس وقت نصیب ہوتی ہے جب ملت کا وجود صحیح معنوں میں "انا الحق" بن چکا ہوتا ہے یعنی "الجماعت" کا وہ نظام جس کا نمونہ خلافت راشدہ تھی، جب تک قائم نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی فرد ملت "حریت" کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ "خلافت راشدہ" کے طرز پر اگر ملت کا شیرازہ بندی نہ ہو اور وہ "الجماعت" نہ بنے تو دنیا کا کوئی دوسرا نظام خواہ وہ بظاہر کتنا ہی جاذب نظر کیوں نہ ہو فرد کو ماسوی اللہ کی غلامی سے ہرگز نجات نہیں دلا سکتا اس لیے حریت پسند افراد کا یہ کام ہے کہ وہ خلافت راشدہ کے علاوہ کسی نظام کو قبول نہ کریں اور جب تک خلافت راشدہ کے نمونے کی الجماعت وجود میں نہ آئے اس وقت تک ہر دوسرے نظام کو بدلنے اور اس سے ٹکرانے کی کوشش کرتے رہیں اس لیے اقبال کہتے ہیں:-

ملت از آئین حق گیرد نظام — از نظام محکمے خیزد دوام
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

تا نگیرد باطلہ کار از نظام | تا خلق بر کشورش آید حرام
سر این فرمان حق دانی کہ چیست | زیستن اندر خطر ہا زندگیست

توحید اور حریت کا یہی وہ راز ہے جس کو حضرت حسینؓ کی حق گوئی جرأت اور شہادت نے فاش کیا تھا ؎

در نوائے زندگی سوز از حسینؓ | اہل حق حریت آموز از حسینؓ
موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید | این دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری است | باطل آخر داغ حسرت میری است
خاست آن سر جلوۂ خیر الامم | چون سحاب قبلہ باران در قدم
بر زمین کربلا بارید و رفت | لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد | موج خون او چمن ایجاد کرد
بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است | پس بنائے لا الہ گردیدہ است
سر ابراہیم و اسمعیل بود | یعنی آن اجمال را تفصیل بود
ما سوی اللہ را مسلماں بندہ نیست | پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
تیغ بہر عزت دین است و بس | مقصد او حفظ آئین است و بس
رمز قرآن از حسینؓ آموختیم | ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

گویا ایک فرد کی انفرادی خودی اس وقت مستحکم ہوتی ہے جب اُسے حریت، مساوات اور اخوت کی فضا میسر ہو اور یہ فضا اس وقت میسر آتی ہے جب ملت کی شیرازہ بندی خلافتِ راشدہ کے خطوط پر ہو اگر کسی وقت ملت کا اجتماعی نظام خلافت راشدہ کے خطوط سے ہٹ جائے تو پھر حضرت حسینؓ کا اسوہ دلیل راہ ہوتا ہے!

یہ ہیں اقبالؒ کے اس عظیم نصب العین کی فکری بنیادیں جس کے لئے انہوں نے اپنے شعر و ادب اور فکر و خیال کی ساری توتیں صرف کی ہیں ان کا یہ نصب العین کوئی معمولی درجے کا نہیں تھا انہیں اس راہ کی مشکلات کا پورا شعور تھا اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسوۂ حسینؓ پر عمل کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اسی لئے فرماتے ہیں ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم | کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

حرفِ آخر۔

اقبالؒ کے "انسان سازی" کے پروگرام میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ ملت کا اجتماعی نظام خلافت راشدہ کے نمونے پر قائم ہو تاکہ ایک فرد کو اپنی شخصیت کی تکمیل میں آسانی ہو ـــــ اس نظام کے قائم ہونے کے لئے جہاں مسلمانوں میں تنظیم اور اتحاد کی ضرورت ہے وہاں ایک خطۂ زمین کی بھی ضرورت ہے چنانچہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

"اس ملک میں اسلام کا بحیثیت ایک تہذیبی قوت کے بقا بڑی حد تک اس امر پر منحصر ہے کہ یہ اپنے آپ کو مستقل خطہ میں مرکز کر لے۔"

چنانچہ اقبالؒ کے اس نظریئے نے ایک زبردست تحریک کی شکل اختیار کر لی اور بالآخر ایک ملک ـــــ پاکستان وجود میں آگیا لیکن پاکستان کا قائم ہو جانا ہرگز مقصد نہ تھا بلکہ ایک اعلیٰ نصب العین کے حصول کا ایک بہترین ذریعہ تھا اور وہ نصب العین

خلافتِ راشدہ جیسے نمونے کا نظام قائم کرنا تاکہ ایک طرف ملت اجتماعی طور پر الجماعت امۃ انا الحق کے مقام کو حاصل کر سکے اور دوسری طرف افرادِ ملت مساوات، اخوت اور حریت کی فضا میں اپنی خودی کی صحیح تربیت کر سکیں۔

پاکستان مل جانے کے باوجود ملت پاکستان نہ تو "انا الحق" کے مرتبہ تک پہونچ سکی اور نہ اس نے تہذیبی، سیاسی، ثقافتی اور فکری میدان میں اغیار کی دریوزہ گری ترک کی۔ اور نہ ملت کے افراد میں "انا الملت" کی وہ "بے خودی" پیدا ہوئی جس کی قوت سے انسان "یزداں شکار" بننے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔

نہ معلوم اس منزلِ مقصود سے ہم کب تک محروم رہیں گے اور نہ جانے ہم کب تک اس قابل ہو سکیں گے کہ اقبال مرحوم کی اس بیقرار روح کو اسلامی نظام کے قیام کا مژدۂ جانفزا سنا سکیں جو اپنے رب سے اب بھی مضطربانہ پوچھ رہی ہے ۔

نگاہِ تو عتاب آلود چند　　بتانِ حاضر و موجود تا چند
دریں بت خانہ اولادِ براہیم　　نمک پروردۂ نمرود تا چند

پی آئی اے کے بوئنگ طیارے
کراچی سے
جدّہ اور
نیروبی کیلئے

ہر بدھ اور اتوار کو

ساڑھے سات بجے صبح

روانہ ہوتے ہیں

We. Su.	Days			Th. Mo.
PK-745	Flight No.			PK-744
Boeing	Aircraft			Boeing
F/Y	Class			F/Y
07.30	Dep	Karachi	Arr	02.00 Tu. Mo.
09.30	Arr	Jeddah	Dep	20.25
10.30	Dep		Arr	19.25
13.55	Arr	Nairobi	Dep	16.00
				Wed. Sun.

مزید تفصیلات کیلئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا کسی پی آئی اے آفس سے رجوع فرمائیے

PIA پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز

ہر جگہ
اور ہمیشہ
قابلِ اعتماد
NTR
NATIONAL
نیشنل
سائیکل ٹائیر و ٹیوب

مولانا مودودی کا مکتوب گرامی

اچھرہ۔ لاہور
۱۰ رمئی ۱۹۶۶ء

برادرم ماہر صاحب ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مئی کے فاران میں تفہیم القرآن جلد چہارم پر آپ کا تبصرہ پڑھا۔ آپ نے پوری کتاب کو بغور پڑھ کر فی الواقع تبصرے کا حق ادا کر دیا ہے اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

چند امور جنہیں آپ نے دوسرے رُخ کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان کے بارے میں آپ کے غور و فکر کے لئے کچھ باتیں عرض کرتا ہوں۔

(۱) آیت لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کو اگر سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے ایک اصولی ارشاد کی حیثیت سے لیا جائے تو یقیناً اس کا ترجمہ یہی ہونا چاہئے کہ "تمہارے لئے اللہ کے رسول میں ایک اسوۂ حسنہ ہے"۔ لیکن جس سلسلۂ عبارت میں یہ فقرہ آیا ہے اس کے اندر رکھ کر اسے دیکھا جائے تو کان کا ترجمہ "ہے" کے بجائے "تھا" ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سورۂ احزاب کے دوسرے رکوع میں غزوۂ احزاب پر تبصرہ فرماتے ہوئے پہلے مدعیٔ ایمان منافقین کے رویئے پر گرفت فرمائی گئی ہے۔ پھر تیسرے رکوع میں مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ اس جنگ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل میں تمہارے لئے ایک قابل تقلید نمونہ تھا، اور اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ ایسا ہی قابل تقلید طرز عمل اُن لوگوں کا تھا جو سچے دل سے ایمان لائے تھے۔

(۲) ام لھم شرکٰؤا شرعوا لھم من الدین مالم یاذن بہ اللہ کی تشریح میں جو بات میں نے کہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ کسی جزئی مسئلے میں بھی جو شخص کسی غیر اسلامی فلسفے یا تہذیب یا قانون کی کوئی چیز اخذ کرے وہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ بلکہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ افکار، عقائد، نظریات اور فلسفے دوسروں سے لیں، انہی کی دی ہوئی قدروں کو مانیں انہی کے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کریں۔ اور اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں انہی کے قوانین اور طور طریقوں کی پیروی اختیار کریں، وہ درحقیقت شرک فی الحکم کے مرتکب ہیں کیونکہ "یہ ایک پورا دین ہے جو اللہ رب العالمین کی تشریع کے خلاف اور اس کے اذن کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے"

(۳) آپ نے میری اس عبارت پر اعتراض کیا ہے کہ "قضا اور تقدیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس نے ہماری طرح معاذ اللہ خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھی باندھ دئے ہوں اور دعا قبول کرنے کے اختیارات اس سے سلب ہو گئے ہوں۔ بندے تو بلاشبہ اللہ کے فیصلوں کو ٹالنے یا بدل دینے کی طاقت نہیں رکھتے مگر اللہ تعالیٰ خود یہ طاقت ضرور رکھتا ہے کہ کسی بندے کی دعائیں اور التجائیں سن کر اپنا فیصلہ بدل دے"۔ اس معاملہ میں آپ کی الجھن صرف اس وجہ سے ہے کہ آپ قضا کے لئے لفظ "فیصلہ" استعمال کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے اور آپ کے نزدیک "قضا کو ٹالنے" اور "فیصلہ بدل دینے" میں کوئی فرق ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قضا کے معنی فیصلہ ہی کے ہیں اور قضا کو ٹال دینے اور فیصلہ بدل دینے میں درحقیقت کوئی فرق نہیں ہے۔ حضور کا ارشاد لا یرد القضاء الا الدعاء (قضا کو کوئی چیز نہیں پھیرتی مگر دعا) کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو قضا دعا نہ کرنے کی صورت میں نافذ ہو جانے والی ہو وہ دعا کرنے سے پلٹ جاتی ہے یا نافذ ہونے سے رک جاتی ہے۔ اس کو اگر یوں بیان کیا جائے تو کیا قباحت ہے کہ دعا نہ کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا جو فیصلہ روبعمل ہونے والا ہوتا ہے اسے دعا کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے فضل سے بدل دیتا ہے۔ یہی بات سورۂ نوح میں اس طرح بیان فرمائی گئی ہے کہ اَنِ اعبدوا

الله واتقوه واطیعون یغفرلکم من ذنوبکم ویؤخرکم الی اجل مسمّی" یعنی حضرت نوح نے اپنی قوم سے فرمایا کہ "تم لوگ اللہ کی بندگی اور تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت قبول کر لو۔ اگر تم یہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور ایک وقت خاص تک تمہیں مہلت دے دیگا۔" اس آیت میں یُؤخِّرکُم کا لفظ صاف اشارہ کرتا ہے کہ کفر و شرک پر جمے رہنے کی صورت میں فیصلہ یہ تھا کہ اس قوم کو ہلاک کر دیا جائے لیکن اگر وہ بندگی و تقویٰ اور اطاعت رسول اختیار کرے تو وہ فیصلہ اس فیصلے سے بدل جائے گا کہ اسے مزید مہلت عمل دے دی جائے۔

اب چند کلمات زبان کے متعلق بھی عرض کرنا چاہتا ہوں مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ آپ "نہ ہی" اور "نہ بھی" کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھتے اور دونوں کو یکساں غلط قرار دیتے ہیں حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ انگریزی لفظ NOR کا ترجمہ آج کل بہت سے لوگ "نہ ہی" کرتے ہیں اور یہ قطعی غیر اردو طرز بیان ہے۔ اس کے برعکس اردو زبان میں یہ مفہوم چار مختلف طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے۔

(۱) نہ تمہاری وہ بات درست ہے نہ یہ۔ (۲) نہ تمہارا وہ قول درست ہے اور نہ یہ (۳) نہ وہ کام درست ہے اور نہ یہی درست کہ تم فلاں حرکت کرو (۴) تم نہ قوم کی کوئی خدمت کر رہے ہو نہ اپنا ہی کچھ بھلا کر رہے ہو۔

یہ چاروں طرز بیان خالص اردو ہیں اور ان میں سے کسی پر بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ کلچر کا لفظ آج کل کی اخباری زبان میں ہر جگہ مذکر لیا جا رہا ہے اور پنجاب کے اخبارات بھی اسے مذکر ہی لکھ رہے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک اس کو مذکر بولنا صحیح نہیں ہے۔ انگریزی الفاظ کی تذکیر و تانیث کا فیصلہ اہل زبان دو بنیادوں پر کرتے ہیں ایک یہ کہ اس کا ہم معنی اردو لفظ مذکر ہے یا مونث۔ دوسرے یہ کہ اس کی صوت (SOUND) ذوق اردو کے لحاظ سے تانیث کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے یا تذکیر کے ساتھ۔ کلچر، تہذیب، ثقافت کی ہم معنی ہے اور اس کی صوت بھی تذکیر کو مناسبت نہیں رکھتی۔ اس لئے کلچر اسی طرح مونث ہے۔ جس طرح ایگریکلچر، کیونکہ وہ زراعت کی ہم معنی ہے اور اس کی صوت بھی ذوق اردو کو مونثانہ محسوس ہوتی ہے۔

"مذہبی مراسم" پر بھی آپ نے اعتراض کیا ہے۔ لیکن یہ لفظ میں نے مراسم عبودیت کے معنی میں استعمال کیا ہے اور انہیں "رسوم عبودیت" کوئی نہیں لکھتا۔ مذہبی رسوم اور مذہبی مراسم میں ایک باریک فرق ہے جس کی طرف شاید آپ کی نگاہ نہیں گئی۔ مذہبی مراسم ان عبادات کو کہتے ہیں جو کسی مذہب میں رائج ہوں اور مذہبی رسم ان رسموں کو کہتے ہیں جنہیں کسی معاشرے میں مذہب کا رنگ دیدیا گیا ہو۔

میری جو عبارتیں آپ نے تبصرے کے دوران میں نقل کی ہیں ان میں بھی بعض مقامات پر میری زبان بدل گئی ہے معلوم نہیں کہ آپ نے صحیح کو غلط سمجھ کر اس کی اصلاح کی ہے یا یہ کتابت کی غلطی ہے۔ مثلاً یہ فقرہ کہ "تغذیہ کی بجائے تلذذ کا پہلو نمایاں ہے" "میں" کی بجائے "کبھی نہیں لکھتا بلکہ اسے غلط سمجھتا ہوں اردو زبان میں یہ مفہوم دو طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے۔ (۱) اس کے بجائے (۲) بجائے اس کے کہ۔ اگر "بجائے اس کی کہ" کہنا صحیح ہو، تو بلاشبہ "اس کی بجائے" کہنا بھی صحیح ہوگا۔ اسی طرح ایک جگہ یہ فقرہ میری نگاہ سے گزرا کہ "یہ چیزیں ان کے لئے فرحت کا موجب ہیں"۔ یہ میری زبان نہیں ہے میں فرحت کی موجب لکھتا ہوں ایسے مواقع پر حرف اضافت کی تذکیر و تانیث مضاف کے لحاظ سے نہیں بلکہ مضاف الیہ کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر "امر کی نشوونما کیلئے" لکھا گیا ہے میں نشوونما کو کبھی مونث نہیں لکھتا میرے نزدیک یہ لفظ مذکر ہے اور ثقات اہل علم کی زبان سے میں نے اسے مذکر ہی سنا ہے۔

اگرچہ مجھے زبان میں سند ہونے کا دعویٰ نہیں ہے لیکن اردو بولتے لکھتے سنتے اور پڑھتے تقریباً پچاس برس گذر چکے ہیں اور میں صحت زبان کے معاملہ میں ہمیشہ متشدد رہا ہوں میری زبان میں الفاظ کے ایسے استعمالات تو پائے جا سکتے ہیں جن میں اہل زبان کے درمیان اختلاف ہے لیکن زبان کی غلطی آپ میری زبان مشکل ہی سے پا سکتے ہیں پچھلے پچاس سال کے دوران میں زبان کے اندر جو تغیرات ہوئے ہیں ان کا عکس بھی آپ کو میری تحریروں میں نظر آئیگا کیونکہ الفاظ کے جو استعمالات متروک ہوتے گئے ہیں ان کو میں چھوڑتا گیا ہوں اور نئے استعمالات کو اختیار کرتا رہا ہوں لیکن خصوصیت کے ساتھ پچھلے بیس سال میں تقسیم کی بدولت اردو زبان و ادب میں جو شدید بحرانی کیفیت طاری ہوئی ہے اس میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ زبان کو بگڑنے سے بچایا جائے اور اس کے صحیح معیار کو برقرار رکھا جائے۔

اچھا ہو کہ میرے اس خط کو آپ فائدۂ عام کے لئے فاران میں شائع کر دیں۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

ہماری نظر میں

محدثینِ عظامؒ اور اُن کے علمی کارنامے

مولفہ :۔ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری (مجلد، گردپوش کے ساتھ)
قیمت چار روپے آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ :۔ ابوسعد اعظمی دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

اس کتاب پر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہٗ نے رائے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مقدمہ لکھا ہے جو اس تالیف کی ثقاہت اور افادیت کا سب سے بڑا صداقت نامہ ہے، کتاب کے سرنامہ پر یہ عبارت تحریر ہے :۔

"ائمہ اربعہ، ارباب صحاح ستہ، اور امام طحاویؒ کا تحقیقی تذکرہ تاریخ تدوین حدیث اور جمع حدیث کے لئے اُن کی کوششوں کا ذکر اُن کی تصنیفات پر مفصل و سیر حاصل تبصرہ"

پوری کتاب اسی اجمال کی شرح ہے —— چند اہم ابواب :—
حضرت عمرؓ کی کثرتِ روایت سے منع کرنے کی مصلحت —— اخبار آحاد کا درجہ —— دین میں حدیث و سنت کا مقام —— خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا احکام و ہدایات کا قلمبند کروانا —— صحابہ کرام اور کتابتِ حدیث . . . . !

اس کتاب میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام طحاوی (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے حالات اور فن حدیث میں ان بزرگوں کی خدمات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے !

محدثین عظام کی فہرست میں سب سے پہلے حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا نام لکھ کر اور ان کے حالات بیان کرکے، فاضل مولف نے حق پسندی اور دینی فراست کا ثبوت دیا ہے، کوئی شک نہیں حضرت امام اعظم محدثین کے شیخ اور امام ہیں اور احادیث کو جانچنے اور پرکھنے کی جیسی قابلیت اور صلاحیت ان میں پائی جاتی تھی وہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تفقہ فی الحدیث سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے۔

امام صاحب پر قلت حدیث کا طعن کیا جاتا ہے، اس "طعن" کو لائق مولف کی جرح نے بے بنیاد ثابت کیا ہے، فرماتے ہیں :۔

"امام صاحبؒ کے مجتہد مطلق ہونے پر اُمت کا اجماع ہے اس کے بعد ان پر قلت حدیث کا طعن نادانی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، اس لئے ہم ائمہ حدیث کے اقوال نقل کرتے ہیں تاکہ حقیقت آشکارا ہو جائے۔ حافظ ابن ذہبیؒ نے مسعر بن کدامؒ سے جو امام صاحب کے عہد طالب علمی کے رفیق رہ چکے ہیں۔ اُن کا بیان نقل کیا ہے۔ طلبت مع ابی حنیفۃ الحدیث فغلبنا واخذنا فی الزھد

نبرع علینا وطلبنا معہ الفقہ فجاء منہ ما ترون ـــ میں نے امام ابوحنیفہ نے ساتھ ساتھ علم حدیث حاصل کیا، تو وہ ہم پر غالب ہے اور زہد میں بھی ہم پر غالب رہے فقہ اُن کے ساتھ شروع کی تو تم (خود) دیکھتے ہو کہ کیا کمال، ان سے ظاہر ہوا ـــ یحییٰ بن سعید قطان جو جرح و تعدیل کے امام ہیں، وہ فرماتے ہیں :ـ انہ واللہ لاعلم ھذہ الامۃ بما جاء عن اللہ و رسولہ ـــ واللہ امام ابوحنیفہ، اس اُمت میں خدا و رسولؐ سے جو کچھ وارد ہوا ہے اُس کے سب سے بڑے عالم ہیں ......"

ب رحمۃ اللہ علیہ پر ایک اور بے بنیاد الزام کی تردید :ـــ

"امام صاحب نے قیاس و اجتہاد کی جو دقیق راہ کھولی تھی، اس کی بنا پر عوام محدثین جو ظاہر حدیث ہی کو پیش نظر رکھتے تھے اور جدید مسائل میں غور و خوض کو معیوب سمجھتے تھے، انہوں نے امام صاحب پر یہ الزام لگایا کہ امام صاحب قیاس کے مقابلے میں حدیث کو قبول نہیں کرتے (معاذ اللہ) مگر امام صاحب سے جو اقوال منقول ہیں وہ خود اس دعوے کی تکذیب کرتے ہیں امام صاحب کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ہر وہ بات جس کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہم نے سُنا ہو یا نہ سُنا ہو بسر و چشم قبول ہے، ہمارا اس پر ایمان ہے اور ہم شہادت دیتے ہیں کہ وہ ایسی ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے ؛"

"علامہ شعرانی نے میزان میں امام صاحب کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا، واللہ یہ جھوٹ اور افترا ہے کہ جو شخص یہ الزام لگاتا ہے کہ ہم نص پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں، کیا نص کے بعد بھی قیاس کی ضرورت ہوگی ۔

"علامہ ابن حزم اور حافظ ابن قیم ان دونوں نے امام صاحب کے مسلک پر بکثرت تنقیدیں کی ہیں مگر انہیں بھی اعتراف ہے کہ امام صاحب کے نزدیک حدیث ضعیف پر قیاس مقدم ہے، حدیث مرسل کو قبول کرنا اور قیاس و رائے پر مقدم کرنا، حنفیہ کا مشہور و معروف ضابطہ ہے حالانکہ امام شافعیؒ نے اس کو قبول کرنے کے لئے شرائط مقرر کئے ہیں اور محدثین کی ایک جماعت نے بالکل ہی ترک کر دیا"

بعض کتابوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ امام مالکؒ نے امام ابوحنیفہؒ پر جرح و تنقید کی تھی، اس کی تردید فاضل مصنف نے یوں کی ہے :ـــ

"خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام مالکؒ کے بہت سے اقوال جرح امام صاحب کے متعلق نقل کئے ہیں مگر شارح موطا ابوالولید باجی مالکی فرماتے ہیں کہ ان کا انتساب امام مالکؒ کی طرف صحیح نہیں :"

صحیح بخاری کے تراجم ابواب پر بعض ناقدین حدیث نے تنقید کی ہے، فاضل مولف نے اس قسم کے شبہات کا جواب دیا ہے فرماتے ہیں :ـــ

"... بخاری کا سارا کمال اُن کے تراجم میں ہے، علامہ کرمانی فرماتے ہیں امام صاحب نے اپنے تراجم ابواب میں جس دقت نظر کا مظاہرہ فرمایا ہے اس کو سمجھنے سے بڑے بڑے اہل علم قاصر رہے

اور

"تاہم اتنی ضخیم کتاب میں معمولی فروگذاشتوں اور تسامح کا ہونا نہ بعید ہے اور نہ اس کی عظمت
کے منافی ہے . . . . "

مولانا تقی الدین صاحب ندوی اس کتاب کی تالیف پر مبارکباد کے مستحق ہیں، انہوں نے جرح کے مقابلہ میں تعدیل کی راہ اختیار کی
ہے، ائمہ حدیث پر جو اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں اُن کو رفع کیا ہے یا اُن کی قابل قبول توجیہہ اور تاویل فرمائی ہے! کتاب بڑی عرق
ریزی اور دینی شغف کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، زبان و بیان میں بھی سادگی پائی جاتی ہے، اس کتاب سے اساتذہ اور طلبا، ہر
طبقہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سیرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ

از:- پروفیسر علامہ فضل احمد عارف (ایم اے) ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد) رنگین گردپوش، قیمت: تین روپے پچاس پیسے، ملنے کا پتہ:- اشرف بکڈپو گول چوک، اوکاڑہ

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۸ - ۲۶۱ ہجری) اکابر صوفیا اور اجل مشائخ طریقت میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اُردو
زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس تفصیل کے ساتھ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر آئی ہے! فاضل مصنف نے اپنی حد تک
خاصی تحقیق سے کام لیا ہے:-

"علامہ یاقوت حموی کی معجم البلدان اور انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "بسطام" کو بکسر
الباء (ب کی زیر کے ساتھ) لکھا گیا ہے اور مستشرق نکلسن بھی اپنے مقالے میں اسی طرح لکھتے ہیں،
جب کہ مشہور ماہر نسب سمعانی اور علامہ ابن خلکان نے اسے بفتح الباء (ب کے زبر کے ساتھ) لکھا ہے
مگر زیادہ صحیح اول الذکر ہے!"

حضرت موصوف کے احتیاط و تقویٰ کا ایک واقعہ:-

"خواجہ نظام الدین اولیاء بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت یحییٰ بن معاذ نے جو کی دو روٹیاں پکا کر
حضرت بایزید کو بھیجی تھیں اور کہلا بھیجا تھا کہ انہیں میں نے آب زمزم میں گوندھ کر پکایا ہے۔ لیکن حضرت
بایزید نے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا:-
"یہ تو کہہ دیا کہ آب زمزم سے گوندھ کر پکائی ہیں لیکن یہ تو نہیں بتایا کہ ان روٹیوں کا آٹا کہاں سے اور
کس ذریعہ سے آیا تھا"

حضرت بایزید پر یہ اعتراض بہت مشہور ہے کہ آپ نے "سبحانی ما اعظم شانی" کہہ دیا تھا۔ مگر اس کتاب میں اس اعتراض کو بڑے سلیقے کے ساتھ
رفع کیا گیا ہے:-

"کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت بایزید نے جو الفاظ کہے تھے وہ یہ تھے ــــ سبحانی من اعظم شانی۔"

لہ امام موصوف نے ان کے علاوہ مختلف مقامات کی خاک چھانی (ص ۱۴۴) "خاک چھانی" میں یہاں قدرے ذم کا پہلو نکلتا ہے! "مختلف
مقامات کی سیاحت کی" یا "مختلف مقامات کو طلب علم کی جولان گاہ بنایا" لکھنا تھا ــــ حسن ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے اس کا مقام بہت بلند
ہے بعض لوگوں نے اسے صحیح بخاری پر بھی اچھالا ہے" (ص ۱۵۵/۱۰۰) اسے صحیح بخاری سے بھی بڑھا دیا ہے یا صحیح بخاری پر ترجیح دی ہے۔
اس قسم کی عبارت کا محل تھا!

میرے خدا کی پاک ذات ہے جس نے میری شان کو بلند کیا ؟
درحقیقت سننے والے شخص سے قول کے الفاظ میں غلطی ہوئی ، جس سے غلط فہمی پیدا ہوگئی ، حالانکہ اصل الفاظ
میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ؟ (ص ۱۳۱)

اس کتاب میں لکھا ہے :-

(صفحہ ۲۵) " آپ حضرت امام جعفر صادق کے اویسی ہیں یعنی آپ نے ان سے غائبانہ طور پر فائدہ اٹھایا (سفینۃ الاولیا)
کسی معتبر اور مستند ماخذ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اویس قرنی نام کے کسی شخص کی غائبانہ تربیت فرمائی
س کی کوئی ضعیف سند ملتی بھی ہو تو اولیاء کرام اور بزرگانِ دین کا وفات پانے کے بعد عالم برزخ سے تربیت فرمانا ، کتاب و سنت یا آثار
، ثابت نہیں ہے ۔ تصوف کو اسی قسم کے لطائف نے مکدر اور غبار آلود بنا دیا ہے ہمارے زمانہ میں ایک کوہستانی پیر نے " اویسیت " کی
میں " ملفوظات " کو وجود دیا ہے ان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ ۔

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا یا سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا (ص ۸۳)

کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ مصرعہ ثانی میں " یا " کے اضافہ نے شعر کو ناموزوں بنا دیا ۔
اس کتاب میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے ہندوستان تشریف لانے کا ذکر نہیں ملا اس لئے چاٹگام (مشرقی پاکستان) میں
موصوف سے جس قبر ، چلہ یا مقام کو نسبت دی جاتی ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے ۔

مسیح علیہ السلام

از :- مولانا محمد مالک کاندھلوی ، ضخامت ۔ ۷۸ صفحات ، قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ :- ادارہ تبلیغ اسلام بیت الحمد ، منڈی والہ یار (مغربی پاکستان)

پاکستان میں عیسائیت کی روز افزوں تبلیغ اور مشنریوں کی سرگرمیوں کو دیکھ کر مولانا محمد مالک صاحب کاندھلوی نے یہ کتاب مرتب
ہے جس کے مطالعہ سے عیسائیوں کے دجل و فریب کی قلعی کھل جاتی ہے ، انہوں نے دلیلوں اور حوالوں کے ساتھ بتایا ہے کہ ۔۔ نبی آخر الزماں
مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کی بشارتیں انجیل مقدس میں خاصے اہتمام اور وضاحت کے ساتھ پائی جاتی ہیں ۔۔
، تثلیث و ابنیت والوہیت ، حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے ۔۔۔۔ اور خود انجیل عقیدہ تثلیث والوہیت مسیح
رہی ہے !

اسلام پر عیسائی پادری جو چلتے ہوئے فقرے کستے اور بازاری قسم کے الزام لگا دیتے ہیں اُن کے جوابات بھی اس کتاب میں دئے
ں لائق مصنف نے کتنی اچھی بات کہی ہے :-

" اگر حضرت مسیح عین خدا ہیں ، تو عبادت آخر وہ کس کی کرتے تھے ، کس کو پکارتے تھے
اور کس سے مانگتے تھے ؟ "

یہ کتاب عیسائیت کی رد میں بڑے کام کی کتاب ہے اور بروقت منظر عام پر آئی ہے اللہ تعالیٰ مصنف کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے (آمین)

اہم علمی تقریر

از :- علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ۔ ترجمہ ۔ مولانا سید سیاح الدین کاکاخیل ، ضخامت ۔ ۴۸ صفحات
ملنے کا پتہ :- مدرسہ اشاعت العلوم واقع جامع مسجد ، لائل پور

اس کتابچہ کا پیش لفظ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے :-
" علامہ سید رشید رضا مصری مصر کے مشہور فاضل تھے ، علامہ سید جمال الدین افغانی کے شاگرد خاص

مفتی محمد عبدہٗ کے تلمیذ رشید اور جانشین سمجھے جاتے تھے مشہور ماہنامہ "المنار" کے مالک و مدیر تھے ماہ اپریل ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ تھا، ارکان ندوۃ العلماء نے علامہ رشید رضا کو اس کی صدارت کی دعوت دی، چنانچہ وہ تشریف لائے اور جلسہ کی صدارت سے ۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء کو فارغ ہوتے، دارالعلوم دیوبند عالم اسلام کی ایک مشہور مرکزی درسگاہ ہے اس کی علمی شہرت کی بنا پر علامہ مرحوم کو خود بھی شوق تھا کہ اس معہد علمیہ کی زیارت سے مشرف ہوں اور دارالعلوم کے خیر خواہ حضرات مثلاً حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں مرحوم وغیرہ نے بھی توجہ دلائی، چنانچہ علامہ موصوف ۱۵ اپریل ۱۹۱۲ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کی صبح ۸ بجے کی گاڑی سے دیوبند تشریف لے آئے آپ کا استقبال مناسب شان مگر نہایت سادگی سے کیا گیا، . . . . . بعد نماز ظہر درسگاہ کلاں میں ایک جلسہ کیا گیا جس میں سب سے اول مدرسہ کی جانب سے ایک عربی تحریر میں آپ کا خیر مقدم اور شکریہ ادا کرنے کے بعد مدرسہ اور اس کے اصول اور طرز عمل و مقاصد بیان کئے گئے۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری مدرس دارالعلوم نے عربی میں مبسوط اور نہایت فصیح و بلیغ برجستہ تقریباً ایک گھنٹہ تک فرمائی . . . . ." (حضرت مولانا سید سراج الدین کاکاخیل)

اسی تقریر کو اصل عربی متن اور اردو ترجمہ کیساتھ کتابچہ ہذا میں درج کیا گیا ہے۔

اس تقریر میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ جماعت دیوبند کا اسناد دینی مسائل میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ سے متصل و مربوط ہے! پھر انہوں نے تحقیق مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط کی تعریف کی ہے اور اس کی مثالیں بھی دی ہیں! اس کے بعد علامہ مرحوم نے فن حدیث سے بحث کرتے ہوئے فرمایا:-

"ہمارے مشائخ کرام یعنی حضرات اساتذہ مدرسہ دیوبند اس بارے میں توسط و اعتدال سے کام لیتے ہیں نہ تو تشدد اور سختی سے کام لیتے ہیں اور نہ نرمی برتتے ہیں، اور احادیث متعارضہ کی ایسی ایسی معقول دل نشین توجیہات کرتے ہیں کہ جن کو ہر سمجھدار سننے والا خوش کر بدل و جان قبول کر لیتا ہے"

پوری تقریر علم و فضل دینی معاملات اور فقہی دیدہ وری کا شاہکار ہے اور ایک کوزہ میں دریا کو بند کر دیا گیا ہے یہ تقریر اس قابل ہے کہ عربی مدارس کے نصاب میں شامل کی جائے۔

شاعری اور تخیل

از:- محمد ہادی حسین، ضخامت ۲۱۲ صفحات دیدہ زیب ٹائپ، مجلد قیمت چھ روپے۔
ملنے کا پتہ:- مجلس ترقی ادب ۲ کلب روڈ، لاہور

جناب محمد ہادی حسین انگریزی دور حکومت کے آئی، سی، ایس میں جو پاکستان بننے کے بعد سی ایس، پی (C.S.P.) کہے جاتے ہیں صاحب موصوف حکومت پاکستان کے سکرٹری کے عہدہ جلیلہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہو کر علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہیں وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے انشا پردازوں میں انہوں نے انگریزی نظموں کے بھی اردو میں ترجمے کئے ہیں، انگریزی ادب میں ان کا مطالعہ اس قدر وسیع ہے جسے "غیر معمولی" کہہ سکتے ہیں۔

"شاعری اور تخیل" ـــــــ محمد ہادی حسین صاحب کی پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر خاصے اہتمام سے شائع ہوئی ہے، اس کے ابواب ـــــــ

۔اعری کا کارنامہ ــــ شاعری کا سرچشمہ ــ تخیل کی ماہیت ــــ شاعرانہ تخیل اور حقیقت ــــ شاعرانہ
۔بات ــــ شاعرانہ تخیل، علم اکتسابی اور تفکر ــــ شاعرانہ تخیل اور اخلاق ــــ تخیل اور بصیرت ــــ تخیل
۔کلنیک ــــ شاعرانہ تخیل اور زبان ــــ شاعرانہ تخیل اور مجاز ــــ

۔کتاب زبان، بیان، فکر و مطالعہ اور خیال و اظہار کے اعتبار سے اُردو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہے، اُردو ادب میں اس
۔تاب اب تک نہیں لکھی گئی، جس میں شاعری کو اس قدر دلنشین فلسفیانہ انداز میں مغربی ناقدین کی آرا کے حوالوں کے ساتھ
۔ہو، اور لطف یہ ہے کہ "فلسفہ" نے کتاب میں خشکی پیدا نہیں ہونے دی، فاضل مصنف کے قلم نے ہر صفحہ پر معانی و بیان کے
۔رد ئے ہیں ؟

سے خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

۔ر منظر !

انگریزی ادب کے اس قدر وسیع مطالعہ کے بعد ہادی حسین مذہب و اخلاق کے معاملہ میں خالص مشرقی اور دیندار نظر آتے ہیں!
۔صوف نے مذہب و اخلاق کی ضرورت اور تقدیس کی اپنی اس کتاب میں نہ صرف یہ کہ تشریح بلکہ تبلیغ کی ہے۔ اقبال کا ذکر کرتے
۔لکھتے ہیں :-

"اقبال کے الفاظ میں وہ "شرارِ زندگی" "عشق کی تیغ جگر دار" سوز و سازِ رومی، سرِ خلیل، یدِ بیضا
اور دستِ کلیم ہے اور اسی سے معجزۂ فن کی نمود ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اُس عشق کا مترادف ہے جو
"دمِ جبریل" "دلِ مصطفٰے" "خدا کا رسول" اور "خدا کا کلام" ہے۔" (ص ۳۰)

۔ر اقتباس :-

"مذہب اس مثالی دنیا کا جو نقشہ پیش کرتا ہے وہ کلامِ الٰہی کی صورت میں کسی برگزیدہ انسان
پر نازل ہوتا ہے، لیکن عرشِ معلٰی کی جس لوحِ محفوظ پر کلامِ الٰہی ثبت ہوتا ہے اُس کی ایک
چھوٹی سی عکسی تصویر ہر انسان کے سینے میں موجود ہے۔ کبھی کبھی عام انسانوں کو بھی یہ توفیق نصیب
ہو جاتی ہے کہ وہ اس عکسی تصویر کو دیکھ سکیں اور الفاظ کی مدد سے اُسے دوسرے لوگوں پہ
بے نقاب کر سکیں یہ لوگ وہ اہلِ بصیرت شعراء ہیں جو شاعری کی دنیا کے تاجدار ہیں ان کی شاعری
وہ ہے جسے ہم مثالی شاعری کہہ سکتے ہیں اور جو فنِ انسانی کا سدرۃ المنتہٰی ہے" (ص ۱۵ تا ۱۶)

۔شاعری کا سرچشمہ کیا تھا؟ اس کا آغاز کس طرح ہوا اور کن داعیات و محرکات کی بنا پر وجود میں آئی؟ کتاب کے دوسرے باب میں
۔فاضل ناقد نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، اُن کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جادو، جنتر منتر اور ٹونے ٹوٹکوں کے لئے زبان میں ــ
۔مزیت و اشارت سے کام لیا جاتا تھا، آگے شاعری میں اظہارِ خیال کے لئے شروع شروع میں استعمال کیا گیا فرماتے ہیں :-

"...... جادو کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ فطرت کی تمام اشیاء اور اس کے تمام مظاہر جیتی
جاگتی چیزیں ہیں جو انسانوں کی طرح احساسات و جذبات رکھتی ہیں، یہ چیزیں اپنی مرضی کی مالک
ہوتی ہیں تاہم اُن کے متاثر کرنے کے چند وسائل تھے جن میں جنتر منتر سب سے زیادہ اہمیت رکھتے
تھے، یہ جنتر منتر چند مقررہ الفاظ و اصوات، حرکات و سکنات کے مجموعے ہوتے تھے"

نطقِ انسانی کے وہ سب سے پہلے منظم طریقہ ہائے استعمال تھے، جو آئے دن کے کام کاج میل جول، لین دین کے علاوہ ایک اور مقصد کی خاطر، یعنی فطرت کی قوتوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے کے لئے اختیار کئے گئے" (ص ۱۷-۱۸)

اور

"نوعِ انسانی کے اردگرد شروع شروع میں منفرد اشیاء و مظاہر کا ایک ہنگامہ کثرت، ایک طوفانِ بدتمیزی تھا، لیکن اُس نے رفتہ رفتہ اُن میں ایک سلسلہ روابط دریافت کرنا شروع کیا۔ اس عمل کے پہلو بہ پہلو اُس کی زبان، جو ابتدا میں اصوات فطری کی نقل پر مشتمل منفرد اصوات کا ایک بے ربط مجموعہ تھی، استعاروں میں تبدیل ہوتی رہی" (ص ۱۹)

شاعری اور ماورائی حقائق سے عالمانہ انداز اور فلسفیانہ طرز پر بحث کرنے کے بعد فاضل مصنف لکھتے ہیں :-

"ہماری بحث کا موضوع اب تک ماورائی حقیقتیں تھیں، لیکن عام لوگوں کے ذہن میں حقیقت کا ایک اور پہلو بھی ہوتا ہے جو مستحق بحث ہے یعنی واقعات نگاری یا تاریخی صداقت! جن واقعات کو شاعر اپنا موضوع بناتا ہے، وہ تین قسموں کے ہو سکتے ہیں یعنی وہ جو خود اُس کو پیش آئے ہوں جو دوسرے لوگوں کو پیش آئے ہوں اور وہ جو اُس نے خیالی طور پر پیدا کئے ہوں، چاہے ان میں کردار افسانہ وہ خود ہو چاہے کوئی اور ــــ ان تینوں قسموں کے واقعات سے شاعر کو من حیث الشاعر جو دلچسپی ہوتی ہے وہ اس پر مرکوز ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے لئے کیا اہمیت رکھتے ہیں بالخصوص جذباتی نقطۂ نگاہ سے" (ص ۳۷-۴۰)

شاعری اور جذباتی کشمکش کا تنوع :-

"حقیقت تو یہ ہے کہ جذباتی کشمکش تنوع اور شدت دونوں اعتبار سے جتنی زیادہ ہوگی، اتنا ہی شاعر کا مرتبہ بلند ہوگا کیونکہ شاعر کو جتنا اپنے اندر ابتری اور پریشانی کا احساس ہوگا، اتنا ہی وہ اُس کے تدارک کے لئے اپنے کلام میں تنظیم، ترتیب اور خوش اسلوبی کو اہمیت دے گا، اعلیٰ پایہ کی شاعری زندگی کے تضادوں یا ہنگاموں سے انکار یا گریز نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس وہ اُن کا پورا پورا نقشہ پیش کرتی ہے، اس نقشہ کا پس منظر ایک ایسی تخیلی کائنات ہوتی ہے جس میں انسان کی جد و جہد بہت کم اہمیت رکھتی ہے، یہ تخیلی کائنات وہ خواب کمال ہے جو ہر بڑا شاعر دیکھتا اور دنیا کو دکھاتا ہے اس خواب کی کوئی تعبیر نہیں اور اسی میں اس کی قوت اور قدر و قیمت اور اس کی اہمیت ہے"

اور

"جہاں فلسفی اس مرئی دنیا پر جس کا ادراک ہم حواس کی مدد سے کرتے ہیں ایک مجرد فکری نظام عائد کر دیتا ہے جس میں وہ بزعم خود تمام تضادوں اور تخالفوں کو مٹا دیتا ہے وہاں شاعر جس کو اس امر کا عرفان ہوتا ہے، خیر و شر، خوشی و غم ایک واحد حقیقت کے دو رخ، ایک واحد تجربے کے دو پہلو ہوتے ہیں، اس زندگی کی کشاکشوں، تضادوں اور مخمصوں کو قبول کر لیتا ہے اور حسن کی زوال پذیری

جذبات کی تغیر پسندی، انسانی سیرت کی خامیاں اور زندگی کی ناتمامیاں۔ جن کے طوفان بدتمیزی سے گریز کر کے فلسفی مجردات کی ایک مصنوعی دنیا میں پناہ لیتا ہے، یہی چیزیں شاعر کی مشق سخن کے لئے دلچسپ موضوع مہیا کرتی ہیں۔ اگر زندگی میں مختلف عناصر کے ہنگامے اور دل انسانی میں متضاد جذبات کے معرکے نہ ہوتے تو شاعر کے فن میں یہ بوقلمونی، یہ رنگا رنگی نہ ہوتی" (ص ۸۵-۸۶)

فاضل ناقد کے قلم سے اس قسم کے نیم ربانی جملوں اور الہامی لفظوں کی بھی کہیں کہیں تراوش ہو گئی ہے، فرماتے ہیں:—

"...... شاعر کو شروع سے لے کر آخر تک تخیل کی قلم رو کے — رہنا چاہیے، وہاں وہ بادشاہ ہے اُس کے باہر وہ دریوزہ گر ہے، وہاں وہ ایک خلاق فن کار ہے اس کے باہر وہ محض ایک نقال ہے" (ص ۹۳)

اور

"ایک حقیقی شاعر کے افکار محض اُس کی کتاب حافظہ کے اوراق کی نقل یا اُس کی دماغ کاوی یا جودتِ طبع کے نتائج نہیں ہوتے، وہ اُس کے اعصاب کے تاروں کی جھنکاریں، اُس کے خون* کے جل ترنگ کے زمزمے اُس کے دل کی دھڑکنوں کی آوازیں اور یہ آوازوں سے شنائی دینے والی خاموشیاں صرف تخیل کے سنگیت میں جمع ہو سکتی ہیں اور یہ سنگیت صرف شاعر کی باطنی خلوت گاہ میں ممکن ہے جہاں وہ آپ اپنے حضور میں موجود رہتا ہے اور اُس کی شخصیت ایک دوسری شخصیت سے یہ کہتی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (ص ۹۷)

[عابد] حسین صاحب فلسفیانہ علوم میں کس قدر درک رکھتے ہیں اُس کا ایک نمونہ:—

"افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ میں مابہ الاشتراک یہ ہے کہ دونوں کلیات کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اُن میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ افلاطون کے نزدیک "امثال" ایک خارجی عالم حقیقی میں وجود رکھتی ہیں اور اس کے برخلاف ارسطو کے نزدیک امثال یا ہیئتیں تجربہ انسانی کے مادے کے اندر سے پیدا ہوتی ہیں کیونکہ کلیتوں اور وجوب و امکان کے قوانین کا ادراک نفس انسانی ہی کا کام ہے اس اعتبار سے ارسطو کے یہاں تخیل ایک زیادہ موثر قوت ہے......" (ص ۱۰۷)

اور

"شاعری کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ الفاظ و اشیاء کے درمیان اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑتی ہے یعنی وہ نفس انسانی کے اُن تجربوں کی تجدید کرتی ہے جن کی بدولت اشیاء اور الفاظ میں ابتداءً تعلق پیدا ہوا تھا۔ اور چونکہ یہ تجربے ایک طرف تو علم اشیاء کے حصول کے تجربے اور دوسری طرف اشیاء کے نام رکھنے کے تجربے تھے، اس لئے شاعری ان حقائق کو بے نقاب کرتی ہے جو اشیاء اور اشیاء کے باہمی روابط کی صورت میں نفس انسانی پہ اولاً جلوہ گر ہوتے تھے، اس کے معنی یہ نہیں کہ شاعری محض ابتائی انسانوں کے تجربے کی تجدید کرتی ہے اگر وہ صرف ایسا کرتی تو وہ ایک تقویم پارینہ ایک مجموعہ

---

* خون کی بجائے "لہو" لکھتا تھا۔

متروکات، ایک مطالعہ الطبیقات یا زیادہ سے زیادہ شعبۂ انسانیت بن کر رہ جاتی، امر واقعہ یہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاعری کا کام یہی ہے کہ اپنی سعد گاہ اس مقام پہنچائے جہاں نفس انسانی اور زندگی دونوں ابتدائی حالت میں ایک دوسرے سے دوچار ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ " (ص ۱۶۲-۱۶۳)

اس کتاب میں مغربی ناقدین اور ارباب فکر کی تحریروں کے ترجمے جگہ جگہ ملتے ہیں جابجا جگہ فن ترجمہ کا شاہکار ہیں ایک نمونہ :-

" ۔ ۔ ۔ ۔ خالص غنائی نظم اول تو تمام دوسرے اصناف سخن کے مقابلے میں خود مکتفی ہوتی ہے دوسرے تمام فنون لطیفہ میں یہ موسیقی سے قریب ترین مشابہت رکھتی ہے ایک تو اس لئے کہ اس کی ابتداء ہی گانے کی خاطر ہوتی، دوسرے اس لئے کہ اس امر کے باوصف کہ غنائیہ کلام میں شاعر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے، اس کا لب ولہجہ سراسر شخصی ہوتا ہے ۔ صحیح معنوں میں شاعر خود میلوڈیش ہو گیا ہے اور جس کے الفاظ خود بخود گا ئیں، گویا ساز زندہ ساز کو چھیڑ کر علیحدہ ہو گیا ہو اور ساز اپنے آپ بج رہا ہو اس کے الفاظ کے تار و پود میں ایک حریری ہمواری اور شفافی ہونی چاہئے اور اس کی جذباتی کیفیت میں مکمل وحدت اور تسلسل " (ص ۸۵)

دوسرا رخ :-

" کئی مرتبہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو جذبات شاعر کے لئے دراصل محرک ہوتے تھے " (ص ۹) " کئی مرتبہ " کی جگہ " بعض مرتبہ یا متعدد مرتبہ یا بارہا " لکھنا چاہئے تھا ——— " کیونکہ ابھی انسان نے حوادثِ فطرت کے بارے میں کوئی کلیہ دریافت نہیں کئے تھے " (ص ۱۹) " ایک بھی کلیہ یا تھوڑے بہت کلیے بھی دریافت نہیں کئے تھے " لکھنا تھا، اس جملہ میں کوئی " کھٹکتا ہے ——— " جب وہ عالم تجربے کے سارے رقبے کو ایک مثالی وحدت کا نقشہ نہ بنالے " (ص ۴۲) " تجربے " کا املا درست ہے، مگر جب اضافت کے ساتھ لکھیں گے تو " عالم تجربہ " لکھا جائے گا ۔

" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خوابوں کی صورت گری بھی ہے اور عالم بیداری کی ایک تشکیلی کارروائی بھی " (صفحہ ۴۹) " عمل تشکیل " یا اس قسم کی دوسری حسین ترکیب استعمال کرنی تھی ۔ " تشکیلی کارروائی " دفتروں اور کچہریوں کی زبان ہے ———

" یہاں فطرت اور ما فوق الفطرت کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور خدا اور انسان اور فطرت ایک ہو جاتے ہیں " (ص ۴۹) اسلامی توحید کے نقطہ نگاہ سے یہ فکر، انداز بیان اور عقیدہ سخت قابل اعتراض ہے ——— " نفس انسانی کے اس سلسلہ فعل وانفعال کو جس سے انسان کو حقیقت کا علم ہوتا ہے، دوسرے قوائے نفسانی کے معاملے میں زیادہ قابلیت کے ساتھ نبٹا سکتا ہے (ص ۶۹) " سلسلہ فعل وانفعال کو نبٹا سکتا ہے " یہ کیا بات ہوئی ؟ " نبٹا سکتا ہے " سے شاید یہ مراد ہو کہ " سلسلہ فعل وانفعال کی توجیہ کر سکتا ہے " یا اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے اگر " سلسلہ " کی جگہ " مسائل " ہوتا تو " نبٹا سکتا ہے " پڑھ کر ذہن کوئی الجھن محسوس نہ کرتا ۔

" ہماری شاعری کی مقبول ترین صنف غزل اس معاملے میں بنیادی طور پر ناقص ہے (ص ۸۰) غزل کسی جہت سے بھی ناقص نہیں ہے اس کا ایک شعر طرح کامیاب نظموں پر بھاری ہوتا ہے ؛ غزل ہماری شاعری کی جوانی، بہار اور آبرو ہے ۔ غزل کے بارے میں فاضل ناقد کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ۔

ایک طرف فاضل ناقد کو صنف غزل میں نقص نظر آتا ہے دوسری طرف غزل کے اس مطلع :-

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

…پاپی
…ند اشعار کی مثال میں موصوف پیش کرتے ہیں جو اُن کی نگاہ میں ـــــ فلسفیانہ نکتہ آفرینی کا عرقِ نایاب ہیں" ـــــ حالانکہ غالب
…شعر میں تکلف اور آورد کے سوا اور کیا دھرا ہے !

"اس ضمن میں ارسطو کا یہ نکتہ پہلے درجہ کی اہمیت رکھتا ہے" (ص ۱۰۷) پہلے درجہ میں توزم کا پہلو پایا جاتا ہے، یوں بولتے
…تے ہیں ـــــ "وہ پہلے درجہ کا بے وقوف ہے" "یہ محاورہ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا ـــــ" "وہ اپنے وقت کی صحیح آرزو ول
…ی حرکات کے نبض شناس ہوتے ہیں" (ص ۱۲۷) "صحیح ارزو تیں" کیا ہوتی ہیں ! ـــــ "اُن کا تکنیک ایک قسم کا تجربی عمل ہے" (ص
…م اُردو میں لفظ "تکنیک" مونث بولا جاتا ہے ! ـــــ

"وہ خیال اتنا اہم نہیں ہوتا بلکہ کئی مرتبہ تو خیال ہی نہیں ہوتا" (ص ۱۵۹) یہاں "کئی" کا نہیں "بعض" کا محل تھا ـــــ
…لی عام ہوتی جا رہی ہے۔ حیرت ہے ہادی حسن صاحب جیسا دیدہ ور اہل قلم بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا ـــــ "نئے نئے عقد بنانا"
(ص ۱۷۰) "عقد بنانا" اُردو کے لئے نامانوس اور اجنبی مصدری ترکیب ہے۔

اس کتاب میں بعض ایسی ترکیبیں بھی استعمال کی گئی ہیں، جو غالباً مصنف کی ایجاد معلوم ہوتی ہیں مگر حسین و پسندیدہ ہیں
…بول کئے جانے کے قابل ہیں، مثلاً ـــــ امہات النقوش، وسیلۂ قال، آمرانہ کلیے، اضطراری سیلان . . . . . !

"شاعری اور تخیل" کوئی شک نہیں اپنے موضوع پر کامیاب ترین ادبی پیشکش ہے! اس کتاب کے ذریعہ بیسیوں مغربی ارباب
…ر اور تنقید نگاروں کی شخصیتوں سے اور ساتھ ہی اُن کے افکار سے تعارف ہو جاتا ہے! جناب محمد ہادی حسن اپنی اس تصنیف پر
…ی اور ادبی دنیا کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تحسین و تشکر کے مستحق ہیں۔ حیرت ہے کہ پاکستان میں کتابوں پر انعام دینے والی کمیٹی کی نگاہ
…سے یہ شاہکار تصنیف کیسے چھپی رہی !

صبحِ صادق

از آغا صادق، ضخامت ۲۷۴ صفحات، قیمت پانچ روپے،
ملنے کا پتہ :- ۳۶/۸ شارع نجم الدین، کوئٹہ

جناب آغا صادق پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے ہیں اور برسوں سے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کی خدمت انجام دے رہے ہیں، صاحب موصوف
…پنی قوتِ بازو اور خداداد قابلیت کی بدولت شہرت و عزت کے مقام تک پہنچے ہیں !

آغا صادق کے کلام کے کئی مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں "صبحِ صادق" جو اس ہمارے سامنے ہے۔ اُس کے منتخب اشعار قارئین "نگاران"
…کے ذوق و وجدان کی تواضع کیلئے درج ذیل کئے جاتے ہیں ۔

عقل کہتی ہے کہ منزل پہ مقام اچھا ہے ـــ عشق کہتا ہے ٹھہرنا مجھے دشوار بھی ہے
عقل کہتی ہے ابھی ساز بجانے دے مجھے ـــ عشق کہتا ہے کہ تلوار کی جھنکار بھی ہے
عقل کہتی ہے کہ دولت جو نہیں کچھ بھی نہیں ـــ عشق کہتا ہے کہ دولت دلِ بیدار بھی ہے
عقل کہتی ہے کہ ہر چیز مری ہو جائے ـــ عشق کہتا ہے مگر جذبۂ ایثار بھی ہے
عقل کہتی ہے گل و لالہ سے دامن بھر لے ـــ عشق کہتا ہے کہ فطرت مری خوددار بھی ہے
عقل کہتی ہے تجھے تخت ملے تاج ملے ـــ عشق کہتا ہے رسن بھی ہے پیا دار بھی ہے
عقل کہتی ہے کہ گفتار حسیں ہے میری ـــ عشق کہتا ہے یہاں خوبیٔ کردار بھی ہے
عقل کہتی ہے کہیں جلوۂ محبوب نہیں ـــ عشق کہتا ہے کوئی طالبِ دیدار بھی ہے

عقل کہتی ہے کہ مذہب کی ضرورت کیا ہے　　عشق کہتا ہے کہ اخلاق کا معیار بھی ہے

(نظم: ترکِ شعر کا مشورہ)

کیا یہ ممکن ہے کہ انفاسِ صبا کو روک دوں　　تند رو دریا کے سیلِ برق پا کو روک دوں
گلبنِ دشت کی نشو و نما کو روک دوں　　اپنی تدبیروں سے تقدیرِ خدا کو روک دوں

منع کر دوں طائروں کو لذتِ پرواز سے
آہوانِ دشت کو مشقِ خرامِ ناز سے

جس طرح سورج کے چھپ جانے پہ آجاتی ہے شام　　محفلِ گردوں میں چلتی ہے شرابِ لالہ فام
جیسے مجبورِ فلک تابی ہے تاروں کا نظام　　دیدۂ واتے کہکشاں پہ نیند ہوتی ہے حرام

پھیلنے پر جیسے انجم کی ضیا مجبور ہے
شعر کہنے پر مری طبعِ رسا مجبور ہے

ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شاخ سے گل و ثمر　　جس طرح شبنم ٹپکتی ہے بہ ہنگامِ سحر
جاگتے ہیں جس طرح انگڑائیاں لے کر شجر　　چاندنی جس طرح بچھ جاتی ہے فرشِ خاک پہ

سینکڑوں مضمون نکل آتے ہیں آہوں کی طرح
شعر سرزد ہو ہی جاتے ہیں گناہوں کی طرح

(متشاعر)

سرد ہے سینہ ترا محفل کو گرمائے گا کیا　　خود نہیں بے تاب تو اوروں کو تڑپائے گا کیا
پہلے پیدا سیرتِ فرہاد تو کر کے دکھا　　ہم کو جوئے شیر کے قصوں سے بہلائے گا کیا
چشمِ بینا ہی نہیں جلوے نمایاں ہیں تو ہوں　　تو نے خود دیکھا نہیں اوروں کو دکھلائے گا کیا

(دوہے)

ساگر پر تو زور کی برکھا پیاسے ہیں میدان
بھرے پیٹ کو بھرنے والے میں تیرے قربان
ایسا جگ میں کال پڑا ہے بھول گئے ہم پریت
سونی ہیں سنگیت سبھائیں رہ گئے کال کے گیت

(غزلیں)

نہیں ایک حال پہ دل مرا کبھی ہنس دیا کبھی رو دیا
کبھی سیرِ برق و شرار ہے کبھی شوقِ ابرِ بہار ہے

دل کی آنکھیں کھل گئیں انجامِ دولت دیکھ کر　　ایک دولت ہے یہ عبرت کی نظر میرے لئے
دعوتِ عام ہے یہاں ظلمت و نور کے لئے　　حسنِ ازل کا نوشہ چیں سنگ بھی ہے شرار بھی
آج آمادۂ گلگشت ہے وہ جانِ بہار　　غنچے غنچے کی تمنا ہے کہ میں دل ہوتا

بنا بھی دے مری تصویر کھینچنے والے یہ کیا کہ دھندلا سا خاکہ بنا کے چھوڑ دیا
وہ یہ کہتے ہیں کبھی یاد بھی کرتے ہو مجھے میں یہ کہتا ہوں کہ میں آپ کو بھولا کب تھا

رشوت :—

نذرانہ کہہ کے لیں گے، شکرانہ کہہ کے لیں گے رشوت کا نام رکھ لیں، جو نام ہو گوارا
تنخواہ کم ہے تو کیا، یہ شکر ہے خدا کا فضلِ خدا پہ اپنا ہوتا ہے اب گزارا

تذبذب :—

بلوچستان میں بس جاؤں یا پنجاب کو لوٹوں ٹھہرنے کا ارادہ ہے، نہ جانے کا ارادہ ہے
مرے رہنے کے قابل ہے نہ یہ خطہ نہ وہ خطہ یہاں سردی زیادہ ہے وہاں گرمی زیادہ ہے

دوسرا رُخ :—

اقبال پھر یاد آگیا پھر روح کو تڑپا گیا
پھر زندگی کا راستہ کھویا ہوا تھا پا گیا
اقبال پھر یاد آگیا

اس قسم کے اشعار نومشقی کے زمانے میں کہے جاتے ہیں !

اک موڑ پہ گلی کے مستانہ آرہی تھی توبہ گلی نہ تھی وہ تھی جنت المعلے (ص ۸۶)

دونوں مصرعے الفاظ کے دروبست کے لحاظ سے خاصے کمزور ہیں ؛ مصرعہ ثانی میں "توبہ" خاص طور سے کھٹکتی ہے ۔

مری آرزو دو! مری آرزو دو! کہاں تک تمہاری کروں نوحہ خوانی (ص ۱۴۰)

اس انداز کے بھرتی کے شعر بھلا مجموعۂ کلام میں رکھنے کے قابل تھے ۔

ایک غزل کے یہ دو شعر کتنے اچھے ہیں ۔

آج آمادۂ گلگشت ہے وہ جانِ بہار غنچے غنچے کی تمنا ہے کہ میں دل ہوتا
خیر گزری کہ نہ پوچھا مرا افسانۂ دل پوچھ لیتے تو بتانا مجھے مشکل ہوتا (ص ۱۴۷)

"افسانۂ دل" کی جگہ "حالِ دل" ہونا چاہئے تھا !

جہانِ عشق کی بے اختیاری آہ کیا کہئے کسی کے ہاتھ میں اب اپنی جاں معلوم ہوتی ہے (ص ۱۴۲)

مصرعہ ثانی کس قدر پھسپھسا ہے ۔

آغا صادق کی شاعری میں خاصہ تنوع پایا جاتا ہے؛ انہوں نے بعض طبع زاد موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں ان کی نظموں میں یقین وایمان اور اخلاق کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں ۔ ان کے مجموعۂ کلام ——— صبح صادق ——— کی تابناکی سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ۔

تذکرہ مسلم شعرائے بہار مولفہ :— حکیم سید احمد اللہ ندوی ، ضخامت ۴۳۰ صفحات قیمت پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک ۔
ملنے کا پتہ :— پیر الٰہی بخش کالونی کوارٹر ع ۹۹۵ ، کراچی ع ۵ ۔

جناب مولانا حکیم سید احمد اللہ ندوی (ریڈر) نیر جامعہ طبیہ شرقیہ کراچی) نے صوبہ بہار کے مسلمان شعراء کا تذکرہ بڑی محنت اور محبت و عقیدت کے ساتھ مرتب فرمایا ہے ، یہ تذکرہ آبادؔ عظیم آبادی کے حالات سے شروع ہو کر محمد علی خاں حیرتی پر ختم ہوتا ہے ، تذکرہ کی ترتیب حروفِ تہجی

کی بنیاد پر رکھی گئی ہے، ڈھائی سو کے قریب شاعروں کے حالات اُن کے نمونہ کلام کے ساتھ اس تذکرہ کی زینت ہیں۔

منتخب اشعار :-

بہارِ باغ نے یوں تو ہزاروں گُل کھلائے ہیں ۔۔۔ وہی ہے پھول جس کو طرّۂ دستار تو کر لے
(آبادؔ عظیم آبادی)

بتوں کے ملنے جلنے پر نہ جانا اے دلِ ناداں ۔۔۔ بڑھا کر ربط کر دیتے ہیں کم ایسا بھی ہوتا ہے
(اثرؔ عظیم آبادی)

نہ طوطی ہمنوا میرا، نہ بلبل ہمزباں میری ۔۔۔ نواسنجانِ گلشن کیا اُڑائیں گے فغاں میری
(احسانؔ رسول پوری)

خندۂ گل پہ نہ خوش ہو باغباں ۔۔۔ ایسے ہنسنے پہ تو رونا چاہیے
(احقرؔ سہسرامی)

چاکِ دل، چاکِ جگر چاکِ گریباں ہونگے ۔۔۔ تیرے دیوانے ہیں لاکھوں میں نمایاں ہونگے
(اخترؔ تاردی)

تمتماہٹ گرمیِ مے کی، جوانی کا لہو ۔۔۔ اک چمن میں سو چمن تھے ایک گل میں سو گلاب (آزادؔ شاہو گھوی)

محرومیِ قسمت کا شکوہ کرتے تو ہیں انجمؔ آپ مگر ۔۔۔ کچھ غور کیا ہے اس پر بھی کس کی یہ شکایت ہوتی ہے
(انجمؔ کانپوری)

دل پہ ہر لحظہ گذرتی ہے نئی کیفیت ۔۔۔ صبر سے غم نہیں ہوتا ہے برا نا ہرگز
(مولانا برکات احمد بہاری ثم ٹونکی)

بہ قدرِ پیمانۂ تخیل سرورِ ہر دل میں ہے خودی کا ۔۔۔ اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا (تحسینؔ مظہری)

ہم کو تو ہر حجاب میں آتے ہو تم نظر ۔۔۔ دھوکا وہ کھائے جو تمہیں پہچانتا نہ ہو (حسنؔ عظیم آبادی)

حوادث کے تھپیڑے کھا کے اہلِ دل سنبھلتے ہیں ۔۔۔ عزائم کے دیئے طوفان کی زد پہ بھی جلتے ہیں (" ")

اے جوشِ جنوں چل گلشن کو سنتے ہیں کہ پھر آئی ہے بہار ۔۔۔ سبزہ ہے کہ نظرت نکلی ہے اوڑھے ہوئے چادر ریشم کی (" ")

دل آ گیا ہے مرا اک بتِ ستمگر پر ۔۔۔ الٰہی خیر! کہ شیشہ گرا ہے پتھر پر (بسملؔ سنسہاروی)

بچپن سے یہ مصرعہ سنتے آئے ہیں :-

چیختے چیختے بلبل کی زباں سوکھ گئی

اس تذکرہ سے پتہ چلا کہ یہ شعر بسملؔ سنسہاروی کا ہے۔

گوشِ گل تک کبھی فریاد نہ پہونچی افسوس ۔۔۔ چیختے چیختے[1] بلبل کی زباں سوکھ گئی

شعراء کے تذکروں میں اشعار کا عام طور پر انتخاب نہیں کیا جاتا، اور تذکرہ نگار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جتنے زیادہ سے زیادہ شعراء

---

[1] ہو سکتا ہے یہ مصرعہ کسی مشاعرے کا طرحی مصرعہ ہو۔

کلام کے نمونے مل سکیں، اُنہیں کتاب میں درج کر دیا جائے اس تذکرے میں بھی ہر درجے کے شعراء پائے جاتے ہیں، کسی کسی کا یہ رنگ بھی ہے،

بزمِ رنداں میں مری خوب قدردانی ہے (ص ۴۷)
تیری ہی آنکھوں ہم خوار ہیں زاہد ورنہ

آشنا پھلواری) کو اس کا پتہ نہیں کہ "قدر" کی "د" عزت، ابزرگی اور توقیر کے معنی میں ساکن ہے۔ "قدر" کی "د" پر فتح۔ تقدیرِ الٰہی کے معنی میں ہے! اور "قدر اندازہ" کی "د" پر بھی فتح ہے!" قدر" کو عزت و توقیر کے معنی میں اس طرح نظم کرنا چاہئے۔

زاہد و ہم سے پوچھو قدر اُن کی
بت ملے ہیں خدا خدا کر کے (امیر مینائی)

ی کے رسالوں میں بعض شاعروں کے ناموں کے ساتھ وطن کی نسبت سے بھیمڑوی بمبوری اور ملاٹری دیکھ کر سخت وحشت ہوتی تھی۔ بھی ـــــ اختر پروفیسر بھیرکھوری، آزاد شاہی بگھوری، الزمسوڈھوی، جادو کواٹھوی، جوہر پرنگھوری جیسے وحشت انگیز نام نظر شعراء کو الفاظ کی ثقالت اور نزاکت میں امتیاز کرنے کا دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ سلیقہ ہوتا ہے یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شاعر اپنے نام وطن کی نسبت کا دُم چھلا ضرور لگا دے، چاہے وہ نام کتنا ہی عجیب اور ثقیل کیوں نہ ہو۔

صوبہ بہار میں اردو شاعری کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس کی تفصیل کتاب کے دیباچہ میں ملے گی، فاضل مولف لکھتے ہیں۔

"صوبہ بہار میں اردو شاعری خانقاہ میں پیدا ہوئی، صوفیائے کرام کی گودوں میں پلی اور ہر دور میں اس صوبہ کی تمام خانقاہوں میں مقبول ہوتی گئی۔ پھر اس کی رعنائیوں اور حسین دلآویزیوں نے یہاں کے ہر طبقہ کے افراد کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اس کے دلدادوں نے اُسے اپنی دوش پر اُٹھائے صوبہ کے شہر شہر، قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں کی سیر کرائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں پورے صوبہ کے مسلمانوں کی اردو مادری زبان بن گئی۔ حضرت شاہ عماد الدین عماد پھلواروی بانی و سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ متولد ۱۰۶۵ھ (جو ولی دکنی کے ہمعصر تھے) اُن کا یہ شعر ہے:۔

آوے اپنے ہاتھ وہ مو کھ نہیں عماد اب اُس کی آس
اس کے کارن کون جتن ہم کیا جو نہیں آوے ہے

حضرت غلام نقشبند پھلواروی خلف حضرت عماد سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ (متولد ۱۱۱۶ھ) کا شعر ہے:۔

سما جائے سجاد ہے جن کے غم میں
وہ شکلیں نگاہوں میں کیوں آبتاں ہیں

س تذکرہ کے مولف مولانا حکیم سید احمد اللہ ندوی ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جو شریعت و طریقت کا سنگم ہے، علم و ادب ذوق موصوف کو ورثہ میں ملا ہے، ان کی یہ کتاب آنے والے ناقدین اور تذکرہ نگاروں کے لئے "رہنما" (ڈائرکٹری) کا کام دیگی۔

ناصوفی

از:۔ محمد غضنفر علی بی۔ اے علیگ صوفی ضخامت ۳۶۴ صفحات (مجلد)
ملنے کا پتہ:۔ سلطان حسین اینڈ سنز بک سیلر، بندر روڈ کراچی۔

یہ صاحب یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ۱۹۲۹ء میں پنشن لے کر الہ آباد میں خانہ نشین ہو گئے اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں وطن کو خیرباد کہہ کر پاکستان، اندھیرا آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اس زمانہ تک جب کہ ان کی عمر ساٹھ سال سے کیا کم ہوگی، انہوں نے ایک شعر بھی موزوں نہیں کیا

"۲۷ جولائی ۱۹۵۶ء کو حضرت غالب خواب میں نظر آئے علیک سلیک کے بعد میں نے اُن سے کلام سُنانے

کی فرمائش کی، استاد نے دو غزلیں :—

؎ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

ـــ الله ـــ

؎ ابن مریم ہوا کرے کوئی

سنائیں، یہ وہی غزلیں تھیں جو میں نے ۱۹۱۲ء میں میٹرک کلاس کے کورس میں پڑھی تھیں، کلام سنانے کے بعد غالبؔ نے مجھ سے کلام سنانے کی فرمائش کی، میں نے مجبوری ظاہر کی اور کہا حضرت میں نے تو کبھی تک بندی بھی نہیں کی، فرمایا "غزل گوئی" بیکاروں میں اچھا شغل ہے، جذبات ظاہر کرنے کا بہترین ذریعہ ہے کچھ کہا کرو، اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔"

اس واقعہ کے بعد سے محمد غضنفر علی صاحب شعر کہنے لگے، صوفی تخلص تجویز کیا۔ یہاں تک کہ غزلوں کا ایک مجموعہ چھپوا ڈالا۔ ال
ہونے کا یہ واقعہ ذہن میں رکھ کر اُن کے اشعار پڑھیے اور ...... !!؟! ـــ !

اسیرِ حسنِ گل کو کیا سکوں ہو ترکِ حسرت کا ۔۔۔ کہ تھا صیدِ قفس خیزاں بکوئے گلستاں برسوں
ذرا سی بات تھی اک کرم کا شمع سے جل جانا ۔۔۔ صبا سر پہ اُٹھاتے تھی مگر یہ داستاں برسوں

فٹ نوٹ میں داستاں کے معنی "خاکِ پروانہ" بیان کیے ہیں۔

اُمیدِ رسائی کی کیا عرض تمنا کو ۔۔۔ قاصد پہ گری بجلی در کوچۂ جانانہ
رفعتِ عرشِ تمنا و محاصل معلوم ۔۔۔ قیس پہونچے بھی تو سنگ در جانا نہ بنے
بھٹکتا پھر رہا تھا وادیٔ تسبیح میں زاہد ۔۔۔ بتائی کیا رہِ زنار پھر سرکارِ قاتل کی

وادیٔ تسبیح کے معنی ـــ دانوں کے بیچ کا جوف جس پر انگلی پڑتی ہے ـــ سرکارِ قاتل ـــ ٹریفک پولیس۔

زاہد تضیعِ وقت ہے مسجد کا اعتکاف ۔۔۔ یہ تو سمجھ کہ حربۂ عصیاں کہاں نہیں
یاس و غم کی جو شام ہو جائے ۔۔۔ زندگی میری رام ہو جائے

"رام ہو جانے" کے معنی ـــ خوش کن۔

کرنا ہم کو بھی ناز آتا ہے ۔۔۔ تم کہو کچھ نیاز آتا ہے
کیش ناقص جو آزمائش میں ۔۔۔ حجاتِ حضرتِ بلال نہ ہو
فلک کی چکیاں کس روز آخر کام آئیں گی ۔۔۔ مٹانے کو مرے تصریفِ دہر دآسماں کیوں ہو
جنونِ عشق بھی کیا منظرِ تفریح ہوتا ہے ۔۔۔ ہجومِ نازمیں کیوں باعثِ تفلیج ہوتا ہے
گرہ زنار کی انگشت پا سے بھی سلجھتی ہے ۔۔۔ مگر تسبیح کا عقدہ غمِ تفسیح ہوتا ہے
صوفی ہم اپنی گرمیٔ دل ہی سے بھن گئے ۔۔۔ کیوں جاتے بھیگنے کسی طورِ شرار میں

بھیگنے کی تشریح یوں فرمائی گئی ہے ـــ "ہماری سوزشِ دل کے مقابلہ میں شرارۂ طور پانی ہے"

پائے سلونے ہے اب تفنگ تری ۔۔۔ مسلم بیر تھا تو دلیا نے

مصرعہ اولیٰ میں جو تلمیح ہے اُس کی شرح سنئے ـــ جس وقت انگریز فوج نے لکھنؤ پر حملہ کیا، تو دسپاہیوں نے نواب سے

لئے سرکاری چڑیا خانہ کی بٹیریں بھیج دیں جائیں، وہ مار بھگائیں گی، یہ قصہ کسی ڈرامے میں ہے۔

مارزیست ہے جب بیخ کا وہ دشت پر صوفی — ترا مخزن طلائی کھتیاں ہوتا تو کیا ہوتا

صرف میمنا سرشت پلنگ — یہ معما جناب میں دیکھا

ہے تحیر سقوط آدم پہ — قہر کی حد منتہی نہ رہی ہو

زندگی اک انتظار موت ہے — نوح کی بھی انتظار موت ہے

دید جاناں کی ایک صورت تھی — بعض میت کا پرسا نہ ہوا

اس کی فطرت ہی ہرزہ گوئی ہے — عظم ملا کہیں بجا نہ رہا

، "عظمت" حاشیہ میں لکھے ہیں۔

مرغوب کیا ہے خون تمنا یہ تھا سوال — بولے سخن ہے پوچ نداء خدا کے بعد

اتم شرک جاہلاں کو باندھئے ملا کے سر — جس کی ہرزہ گوئیاں اغراض ایماں ہو گئیں

افرادیت کا تھا بڑا اژدھام آج — مسلم کھڑا تھا بیچ میں درگت لئے ہوئے

شعار دا ہم نے قارئین فاران کی خوش طبعی اور دل لگی کے لئے نقل کئے ہیں، ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دنیا میں بہ صحت لیسی کیسی عجیب مخلوق پائی جاتی ہے۔ اس قسم کی "تک بندیاں" پر تبصرہ شاعری کے ساتھ مذاق ہے، یہ تو کسی تبصرے اور تنقید کے ن میں ہیں اسی طرح پڑھنے اور لطف لینے کے قابل ہیں۔

ی صاحب دفتر "فاران" میں اپنا دیوان لے کر خود تشریف لاتے تھے، ان کے چہرے اور حلیہ کو دیکھ کر ہی ہم چونک پڑے، جب و معلوم ہوا کہ "درازی گوش" بھی ایک صفت ہے اس قماش کے لوگوں کی!

ر:- آغا صادق، ضخامت ۹۶ صفحات - قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:- آغا صادق منزل، شارع نجم الدین کوئٹہ۔

یہ کتاب جناب آغا صادق صاحب کی پنجسالہ (۱۹۳۰ - ۱۹۳۵ء) مشق سخن گوئی کا حاصل ہے۔ اس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی!

شعار:-

آہن گداز ہو نفس شعلہ بار سے — پتھر کو چیر دے وہ نظر چاہتا ہوں میں

کے شیدائی سے:-

ڈوبی ہوئی ہیں اس میں گناہوں کی مستیاں — لپٹے ہوئے برس رہی ہیں ندامت کی بستیاں

ترغیب جرم دیتی ہیں عشرت پرستیاں — شیشے میں ہیں چھپی ہوئی ذلت کی پستیاں

یہ رہنمائے فسق و فجور و گناہ ہے

منزل ہے جس کی قعر سقر یہ وہ راہ ہے

یہ وہ بلا ہے جب کسی بستی پہ چھا گئی — سب رنگ ڈھنگ دست قضا کا دکھا گئی

ناموس ننگ عزت و حرمت مٹا گئی — گھر بار سب اجاڑ کے دولت لٹا گئی

جو نیک نام تھے انہیں بدنام کر دیا

بدبخت و نامراد و بد انجام کر دیا

(غزلیں)

آپ اک بار تو دیکھیں مرا آئینۂ دل　　اس میں کچھ اور نہیں آپ کی صورت کے سوا
فرصت نہیں محاسبۂ نفس سے ابھی　　ہم تو کسی کے عیب و ہنر دیکھتے نہیں
بے قراری پہ مری مجھ کو ملامت نہ کرو　　اے اسیرانِ کہن! تازہ گرفتار ہوں میں
نالۂ صبحگاہی سے نہیں فرصت مجھے　　میں نشاطِ نغمۂ مرغِ سحر کو کیا کروں
کہنے لگے کہ اس کو تو اپنی خبر نہیں　　پردہ اٹھا دیا مجھے مستانہ دیکھ کر
اُن کی نگاہِ لطف[1]، خرابی پسند ہے　　آباد بھی کریں گے تو ویرانہ دیکھ کر
ساقی پلا کہ شوق مرا تیز ہو گیا　　پیمانہ میرے صبر کا لبریز ہو گیا
بگڑے تو حسن اور دلآویز ہو گیا　　غصہ سمندِ ناز پہ مہمیز ہو گیا
شکست خاطرِ ساقی کا تھا خیال مجھے　　شکستِ توبہ کا باعث فقط گھٹا ہی نہ تھی
چوٹ لگتی ہے جو دل پر تو فغاں کیوں نہ کروں　　سنگ بھی ضربتِ تیشہ سے صدا دیتا ہے

دوسرا رخ :—

وقف ہے مری ہستی تیری ذات کی خاطر　　تو بھی ایک دن کہہ دے میں بھی صرف تیرا ہوں　(ص ۵۲)

مصرعہ ثانی کس قدر سطحی اور بھرتی کا ہے۔

افسانۂ فضیلت اجداد سن چکے　　اپنا بھی کوئی قصہ رنگین سنائیے　(ص ۶۰)

"اجداد" کی بجائے "اسلاف" ہوتا تو بہتر تھا۔ مصرعہ ثانی میں "رنگین" حشو و زائد ہے۔

مرا ذوقِ تماشہ حرفِ باطل ہوتا جاتا ہے　　کرو آئینہ ارزاں جلوہ ہائے مہر آسا کو　(ص ۶۲)

ذوقِ تماشا کا حرفِ باطل ہونا ہی اول تو کھٹکتا ہے، پھر "جلوہ ہائے مہر آسا" نے شعر میں اور زیادہ خرابی پیدا کر دی۔

ہم آرزوئے دید کو سو بار رو چکے　　لیکن کبھی پیام تو بھیجا کرے کوئی　(ص ۶۶)

مصرعہ اولیٰ نے شعر میں خاصا ابہام اور ساتھ ہی سطحیت پیدا کر دی۔

اے دوست یہ نہیں نگہ واپسیں مری　　آنکھیں پلٹ پلٹ کے تجھے دیکھتا ہوں میں　(ص ۶۸)

یہ کیا شاعری ہے!!

نہ پوچھ قصہ بربادیٔ چمن ہمدم　　کہ ایک خس بھی مجھے بہر آشیاں نہ ملا　(ص ۷۳)

"خس" کیسا تھا ایک کون بولتا ہے "خس" کی جمع ہی نہیں آتی! شاعر "ایک تنکا" کہنا چاہتا تھا مگر جب لفظوں کو جوڑنے بیٹھا تو "ایک خس" نے مصرعہ کو موزوں کر دیا —— "خس" کوڑا کرکٹ، پھوس اور خاشاک کے معنی میں تو مذکر ہے مگر جس خوشبو دار گھاس کی ٹٹیاں بناتے ہیں وہ مونث ہے۔

جناب آغا صادق کی مشاقی اور خوش گوئی اپنی جگہ مسلم ہے کتاب کے آخر میں "چہ تارہ" (چار شعروں کا قطعہ بند سا) "تین تارہ" (تین شعروں کا مجموعہ) "دو تارا" (جس میں دو شعر ہیں) اور "اک تارا" (یعنی فرد) —— شاعر کی جدت پسندی کی دلیل ہیں۔

---

[1] "نگاہِ شوخ" کا محل تھا۔ دمگر "لطف" کے ساتھ "آباد" کی موزونیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔

اُردو ڈائجسٹ کا سالنامہ دسمبر ۱۹۶۶ء

مجلس ادارت :- ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، الطاف قریشی، ظفر اللہ خاں - مدیران معاون :- ضیا شاہد ایم۔اے، مقبول جہانگیر اور آباد شاہ پوری (ایم۔اے) قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ :- اُردو ڈائجسٹ، سمن آباد۔ لاہور

اُردو ڈائجسٹ پاکستان اور ہندوستان کا مقبول ترین ماہنامہ ہے، اس قلم زدہ دور میں اُس نے جس سنجیدہ اور باوقار ادب کو پیش کیا ہے اُس کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے، اس کی عام اشاعت ایک لاکھ کے قریب پہونچ چکی ہے اور سالنامہ اس سے بھی زیادہ تعداد میں شائع ہو کر مقبول ہوا ہے۔

سالنامہ دسمبر ۱۹۶۶ء کے مضامین متنوع بھی ہیں اور دلچسپ بھی! ساتھ ہی معلوم آفریں بھی! پھر سونے پر سہاگا اُس کا گیٹ اپ ہے! سالنامہ میں ذکرِ جہاد بھی ہے، شخصیات کے تراشے بھی ہیں، طنز و مزاح بھی ہے، افسانے، نظمیں، اور غزلیں بھی ہیں، شکایات، سائنس کے کمالات اور پراسرار کہانی بھی ہے! جناب الطاف حسن قریشی نے "تاریخ کا فیصلہ کن معرکہ" کے عنوان سے جو چند صفحے لکھے ہیں وہ افواج پاکستان کی جرأت، بہادری اور سرفروشی کی ولولہ انگیز داستان ہے۔

اب سے ۳۴ سال قبل رسالوں میں طاہرہ دیوی شیرازی کے افسانوں کی بڑی دھوم تھی، اتنے دنوں کے بعد اب معروف انشاء پرداز جناب نفضل حق قریشی نے اس مشہور مگر معنوی شخصیت کے چہرے سے پردہ اُٹھایا ہے کہ اس پردہ زنگاری میں خود وہ چھپے ہوئے تھے! اور اس طرح وہ "تماشائے اہلِ قلم" دیکھنا چاہتے تھے! اور یہ تماشا انہوں نے خود بھی دیکھا اور "پردہ اٹھتا ہے" کے اسٹیج سے سب کو دکھا بھی دیا! ہوا و ہوس اور شوق و جذبات کے اس حمام میں کیسے کیسے ثقہ ادیب اور انشاء پرداز برہنہ نظر آتے ہیں! مرد کی سب سے بڑی مردانگی بھی عورت ہے اور کمزوری بھی ——— !

نفضل حق قریشی صاحب کے ظرف و تحمل کو آفریں کہ وہ اتنے دن تک اس راز کو چھپائے بیٹھے رہے انہوں نے ادیبوں کے خطوط شائع فرما کر نفسیات کا جدید باب کھول دیا ہے۔ اور اہلِ قلم اور اربابِ شعر و سخن کو چوکنا کر دیا ہے کہ وہ اس قسم کے معاملات میں احتیاط برتیں! سالنامہ کا یہ مضمون سب سے زیادہ دلچسپ اور ساتھ ہی عبرت آموز ہے۔

سوان برانڈ صابن
SWAN
سوان
ZULFEKAR INDUSTRIES LTD.

والئن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
منگھا پیر روڈ
کراچی
ہر قسم کا سوتی اور اونی کپڑا
کورا اور دھلا لٹھا اور ہر قسم کا
دھاگا
تیار ہوتا ھے
باوانی والئن ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کا تیار شدہ کپڑا
ہر اعتبار سے
قابل اعتماد ہے پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی آپ کا
قومی فریضہ ہے

COTTON MILLS
ACM
آدم جی کاٹن ملز لانڈھی۔ کراچی

گرمیوں میں
بہار
کا لطف!
گرمی کی زحمت اور سختی سے بچنے کے لئے
روح افزا کی تازگی بخش تاثیر سے فائدہ اٹھایئے اور
اس موسم میں اس کا مسلسل استعمال رکھئے۔ یہ خوش ذائقہ
فرحت بخش مشروب ہر شخص کو بھاتا اور گرمی میں
بہار کا سماں پیدا کرتا ہے۔
کوئی اور مشروب اس کا مقابل نہیں۔
روح افزا
مشروب مشرق
ہمدرد فروٹ پروڈکٹس
لاہور - کراچی

جون سنہ ۱۹۶۷ء

جلد :- ۱۹
شمارہ :- ۳

ماہنامہ فاران کراچی

ایڈیٹر ——— ماہرالقادری

ترتیب

چندہ سالانہ :- سات روپے | پبلشر :- سرور حسین | قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

مقامِ اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی۔

باہتمام مستفیض احمد صدیقی، سرور حسین نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

"عرب ممالک اسرائیل سے شکست کھا گئے ــــــ بیت المقدس یہودیوں کے قبضہ میں آگیا" ــــــ کاش! ان منحوس
[ج]روں کے سننے سے پہلے موت آگئی ہوتی! مسلمانوں کی تاریخ کا المیہ اور کتنا دردناک المیہ! اگر عالم اسلام میں شب و روز مصیب
[ب]ھی رہے اور کروروں مسلمان خون کے آنسو روتے رہیں، تو بھی اس غم کے اظہار کا حق ادا نہیں ہو سکتا، عقل کسی طرح باو[ر]
[کر]نے کو تیار نہیں کہ ایسا ہوا ہوگا، اور دل، وہ تو اس خبر کے تصور سے اُس عالم میں پہونچ جاتا ہے جہاں سچ مچ ہاتھ کو ہاتھ
[سجھ]ائی نہیں دیتا، ایک تاریک ہولناک فضا! ایسے شدید غم سے جو اتنی بہت سی نزاکتیں، خراشیں اور جراحتیں رکھتا ہو
[کب]ھی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔ اور پھر سب سے بڑا غم اپنی بے غیرتی اور بے حمیتی کا ہے کہ زندگی کے عام معمولات میں
[کو]ئی خاص فرق واقع نہیں ہوا۔ اس بجھے ہوئے دل پر بھی وہی جمگھٹے، صحبتیں، مسکراہٹیں اور خوش فعلیاں ہیں، حالانکہ
اتنا سنگین غم تھا کہ مہینوں کے لئے آنکھوں سے نیند اور ہونٹوں سے مسکراہٹ رخصت ہو جاتی، جب اس سانحہ پر
[ش]دت غم سے نہ دل چاک ہوئے نہ کلیجے شق ہوئے، نہ دیوانگی کا عالم طاری ہوا تو پھر یوں کہنا چاہئے کہ دل و جگر کے
[ٹک]ڑے اُڑنے اور دیوانہ بن جانے کی یہ سب اصطلاحیں شاعرانہ اصطلاحیں ہیں۔

مگر

پھر بھی عام مسلمانوں کے چہروں پر غم کی ایسی دھندلاہٹ چھاگئی تھی، جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی گھر گھر میں
[س]وگ کی سی کیفیت، پیشانیوں پر حزن و ملال کی سلوٹیں اُبھری ہوئیں کون کس کو پُرسا دے اور کس کی تعزیت کرے،
[آ]نکھوں نے تنہائی میں اتنے آنسو شاید کبھی نہ بہائے ہوں! مسلمانوں کی بستیوں اور آبادیو[ں]
[می]ں سب کا ایک ہی جیسا عالم! سانس کی آواز، نبض کی جنبش اور دل کی دھڑکن، ہر چیز اپنی جگہ مضطر
[ہ]ر طرف غم کے سیاہ بادل چھائے ہوئے، ــــــ روم میں عیسائیوں نے اس سانحہ کو صلیبی جنگوں کے انتقام سے منسوب
[ا]س ستم کی خبروں نے اور نڈھال کر دیا کہ
[ک]یا، یہودی، ذلیل یہودی فتح کا جشن منا رہے ہیں اور بھارت کے مہاسبھائیوں اور جن سنگھیوں کے گھروں میں گھی
[کے] چراغ جل رہے ہیں۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

اس شعر کے پڑھنے اور اپنے رب کے حضور بہ تقاضائے بشریت شدت اضطراب میں شکوہ کرنے کا

یہ موزوں ترین موقع تھا ۔۔۔ مگر معاً خیال آیا کہ ہم ضابطہ و قانون کے اعتبار سے تو بے شک کلمہ گو ہیں، اور ہمارے نام مسلمانوں جیسے ہیں مگر مردِ مومن کی ایک بھی امتیازی صفت ہم میں باقی رہ گئی ہے؟ جو لوگ ایمان و اسلام سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور جن پر "کفر" کی تعریف صادق آتی ہے، وہ جس طرح دنیا کی لذتوں میں گرفتار ہیں کیا انھی کی طرح ہم مسلمان بھی دنیوی لذتوں میں ڈوبے نہیں ہیں، آخرت کا صرف زبان سے اقرار مگر اس سے یکسر غافل اور بے تعلق جیسے عذاب قبر، حشر و نشر، محاسبہ اعمال اور اس کے بعد اعمال کی جزا و سزا کے تمام عقاید معاذ اللہ خیالی باتیں ہیں! ہم میں کتنے ہیں جو دنیا کمانے میں حلال و حرام کا امتیاز کرتے ہیں، اپنی خواہشوں کے بتوں کے جس طرح کفار پجاری ہیں، اسی طرح ہم بھی ان کی پوجا کر رہے ہیں! اب رہے عرب جن کو ہم عجمیوں نے اسلام کی نسبت کے سبب اپنا سردار سمجھا ہے، ان کے حالات کی پستی کا یہ عالم کہ شراب کے بعد لحم خنزیر تک کو ان کے معاشرے میں قبول عام حاصل ہوتا جا رہا ہے! قاہرہ کے بعض حصے پیرس کے معصیت کدوں سے کم پر رونق نہیں ہیں، خاص طور سے فلسطینی مسلمانوں کے جو حالات سننے میں آئے ہیں، اس کے بعد تو اللہ تعالیٰ کی سنتِ عمل اور قانون مکافات پر یقین اور زیادہ راسخ ہو گیا کہ ذلت کے اس عذاب کو آنا ہی چاہئے تھا اور یہ المیہ وقوع میں نہ آتا تو کارکنان قضا و قدر کو حیرت ہوتی وہ جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا زبان سے اقرار کرتے ہوں مگر عملاً اللہ تعالیٰ کے باغی اور نافرمان ہوں ان کو نہ صرف نسبت اسلام کے نام پر کب تک ڈھیل دی جاتی ضرورت تھی ان کی تنبیہ کی گوشمالی کی ٹھوکر مار کر خواب غفلت سے بیدار کرنے کی اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ اور حکمت بالغہ نے اس فرض کو بھی پورا کر کے دکھا دیا ساری ملت اسلامیہ اور خاص طور سے عرب پوری طرح جھنجھوڑ دیئے گئے ۔ اب محسوس ہو رہا تھا کہ واقعیٔ عالم اسلام کی طنابیں کانپ کے ٹکڑوں کی کھنچ رہی ہیں اس "القارعہ" کے بعد بھی ملت اسلامیہ بیدار نہ ہوئی تو پھر . . . . . . !!! اس "تو پھر" کے بعد جو الفاظ سیاق و سباق عبارت کے لحاظ سے لکھے جا سکتے تھے، خدا کرے ان لفظوں کے لکھنے کی کبھی نوبت نہ آئے ہرگز نہ آئے۔

یہ ٹریجڈی یوں ہی اچانک ظہور میں نہیں آ گئی، اس المیہ کا مستقل تاریخی پس منظر ہے ۔۔۔! اس دنیا میں عمل اور جد و جہد کا قانون کام کر رہا ہے، کافر زمین میں بیج ڈالے گا اور کھیتی کو اپنے پسینہ سے سینچے گا تو تمام طبعی قوتیں اس کا ساتھ دیں گی اور مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا تو فرشتے اس کی زمین کو سینچنے کے لئے آسمان سے نہیں اتارے جائیں گے، یہاں تک کہ فصل آنے پر خرمن کا مالک کافر ہوگا، مسلمان کے حصہ میں ناداری اور بے حاصلی آئے گی! یہودی برسہا برس سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح بیت المقدس اور اس کا مضافاتی علاقہ ان کے قبضہ میں آجائے، اس مقصد کے حصول کے لئے پوری اسرائیلی قوم یک جان و یک دل ہو گئی اور مالی و دولت کا وقت کا اور دوسری نوع کی قربانی اس عالم اسباب میں جو ممکن و مہیا ہو سکتی تھی، اس سے دریغ نہیں کیا گیا ایک ایک یہودی نے اپنی پونجی اس مقصد عظیم میں لگا دی، عیسائیوں کو مسلمانوں سے جو عداوت ہے اس سے یہودیوں نے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔

ایک طرف یہ اتحاد و تنظیم یہ دور اندیشانہ منصوبہ بندی اور اپنے مقصد سے خلوص اور لگن ہے ۔۔۔ اور دوسری طرف انگریز نے عربوں میں قومیت کے تعصب کو ابھارا اور خود مختاری و آزادی کا لالچ دے کر، ترکی خلافت کے خلاف عرب ملکوں میں شدید بے چینی پیدا کر دی! ادھر یہودی ترکی کی دینی مرکزیت کو ختم کرنے کے درپے تھے اور خفیہ طور پر

عــلہ اسرائیلی حکومت کو کہاں تک پھیلا دینا چاہتے ہیں، یہود کا یہ ناپاک منصوبہ اب کوئی راز نہیں رہا۔

بیٹھ دوانیاں کر رہے تھے اُن کی یہ خواہش پوری ہو کر رہی، قسطنطنیہ جو تمام دنیا کے مسلمانوں کے دینی اور سیاسی تصورات کا مرکزی نقطہ تھا اُس کی مرکزیت کو باقی نہیں رہنے دیا گیا!

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

— تو —

جس شجر سے وابستگی کیا تھ اُمید بہار تھی، اُسی کی جڑیں سب سے پہلے کاٹ دی گئیں، خلافت کے کریا کرم اور تیئے پانچے سے فارغ ہو کر اتاترک مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں دین و شریعت پر جو آفت آئی ہے اُس نے دین کے احترام و تقدیس کی بساط ہی سرے سے الٹ دی! پھر انگریز کی شاطرانہ سیاست اور منافقانہ ڈپلومیسی نے ملّت کی جغرافیائی وحدت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ ایک کروڑ سے بھی کم آبادی کے خطہ میں تین حکومتیں ——— عراق، شام اور شرق اردن ——— قائم کی گئیں!

دوسری عالمی جنگ عظیم کے بعد برطانوی اقتدار کے آفتاب عالمتاب کو گہن لگنا شروع ہوا یہاں تک کہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد برطانیہ جس کے حدود شہنشاہی میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا طاقت و اقتدار کے اعتبار سے فرانس کی سطح پر آ گیا! بین الاقوامی سیاسیات کی بساط پر اقتدار کے اس خلا کو امریکہ کی طاقت نے پر کیا۔

امریکہ کی سیاسیات پر یہودی بہت دنوں سے چھائے ہوئے تھے، سود خواری اور بنیئے پن میں امریکہ اور یہودیت کا ایک ہی جیسا مزاج ہے! جہاں تک اسلام اور اُمت مسلمہ کی دشمنی کا تعلق ہے اس دشمنی میں یہود اور تمام سامراجی طاقتیں متحد الخیال ہیں اسلام ان سب کا مشترک دشمن ہے۔ اسی دشمنی نے اسرائیلی ریاست کو جنم دیا! عرب عزیمت و اتحاد سے کام لیتے اور مٹھی مٹھی بھر ریت بھی مل جل کر پھینکنے کی زحمت گوارا کرتے تو اسرائیل کی نوزائیدہ حکومت ریت کے اس طوفان میں دب کر رہ جاتی مگر عربوں میں خود پھوٹ پڑی ہوئی تھی، اور عرب ممالک طرح طرح کے داخلی اختلافات کا شکار تھے۔

عرب ممالک میں "اخوان المسلمون" ہی تنہا وہ دینی تنظیم تھی، جس سے یہود ڈرتے تھے، جنگی محاذوں پر اسرائیلی ان جوشیلے نوجوان کی قوت ایمانی کا تجربہ کر چکے تھے۔ یہودیوں کو پوری طرح اندازہ تھا کہ اخوان کا جب تک دم میں دم باقی ہے یہودی سازشیں اور اُنکے ناپاک منصوبے بروئے کار نہیں آ سکتے چنانچہ مصر میں اخوان کی تباہی اور قتل و غارت کا جو ڈرامہ اسٹیج کیا گیا ہے وہ یہود اور امریکہ کی تمناؤں کے عین مطابق تھا اخوان المسلمون کی جد و جہد کا مرکز و موضوع اللہ تعالیٰ کے دین کا قیام تھا اُنکے اس فخر و امتیاز کو غارت اور غیر مؤثر کرنے کیلئے اسلام کے مقابلہ میں عرب قومیت کا نعرہ اٹھایا گیا!

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" "لا الٰہ الا اللہ" اور "اللہ اکبر" ان تمام خالص دینی جامع کلمات کے توڑ پر "عرب قومیت" کی تکریم و عزت کے نعرے (SLOGANS) تراشے گئے! اسلام دشمنی کی حد ہو گئی کہ "نحن ابناء الفراعنۃ" کے نعروں کی گونج نے نعرۂ تکبیر کو دبا دیا ہے! قاہرہ کے چوراہوں پر فراعنہ کے مجسمے نصب کئے گئے اور ڈاک کے ٹکٹوں پر ان ملاعنہ کی تصویریں چھاپی گئیں یہ اسلام دشمنی پھر اس کفر تک پہونچ گئی۔ مصر کے اخباروں میں اس قسم کے مضامین چھپوائے گئے جن میں ڈنکے کی چوٹ کہا گیا کہ "ناصرازم" "محمد ازم" سے بہتر ہے (نقل کفر کفر نباشد، معاذ اللہ، استغفر اللہ، خاک بدہن گستاخ)!

اسلام سے عداوت و بیزاری کا جب یہ عالم ہو تو اسلام کا قبلہ اوّل جو اینٹوں اور پتھروں کا بنا ہوا ہے اور اُس سے جو دینی تقدس وابستہ ہے اُس کے تحفظ کی اہمیت کو وہ دماغ کس طرح محسوس کر سکتے ہیں جن میں قومیت اور وطنیت کے بُت براجمان ہوں اور اللہ تعالیٰ کے ملعون و مغضوب فراعنہ جن کے ہیرو بنے ہوئے ہوں۔!

اسرائیل اور عرب کی اس جنگ سے چند مہینہ قبل جمال ناصر کا نمائندہ خصوصی پاپائے روم سے جا کر ملتا ہے اور اس کے بعد اخبارات میں اس قسم کے بیانات آنے لگتے ہیں کہ بیت المقدس کو آزاد بین الاقوامی شہر قرار دیا جائے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عرب و یہود کی اس معرکہ آرائی میں مصری فوجیں محاذ جنگ سے مسلسل پسپا ہوتی دیکھی گئیں اور اُن کے جنرلوں نے جس انداز میں دستاویز شکست و اطاعت غنیم کی خدمت میں پیش کئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کاغذات پہلے سے لکھے لکھائے موجود تھے۔

فلسطین میں جمال ناصر کے ایجنٹ شقیری کے اس اعلان کو بھی پیش نظر رکھیے کہ "فلسطین کے مسئلہ کو نمٹانے سے پہلے ہمیں شرق اردن کا تختہ اُلٹنا ہے"، کوئی شک نہیں شرق اردن کی فوج عرب ممالک میں سب سے زیادہ منظم فوج تھی، اور یہ طاقت متحدہ جمہوریہ عرب کے سربراہوں کی نگاہ میں بُری طرح کھٹک رہی تھی، چنانچہ اسرائیلی فوج کا اصل نشانہ اُردن کی فوجیں ہی رہیں، جن کو تقریباً برباد کر دیا گیا۔

پھر یہ ڈرامہ بھی دُنیا نے دیکھ لیا کہ ناصر صاحب صدارت سے استعفا دیتے ہیں، اور دوسرے دن استعفا واپس بھی لے لیتے ہیں، اخبارات میں تصویریں چھپوائی گئیں کہ مصر کے عوام کے اصرار و التجا سے متاثر ہو کر بلکہ اُن کی گریہ و زاری پہ رحم کھا کر جمال ناصر نے عہدہ صدارت کو دوبارہ شرف بخشا اور مصر کی کونسل نے جمال ناصر کے اس "عظیم الشان کارنامے" کے صلہ میں تاحیات صدر رہنے کی منظوری دے دی، اس کے بعد خبر آئی کہ مصر کے چند جرنلوں کو برخاست کیا گیا اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ بھی جمال ناصر صاحب نے ازراہ ایثار و مروت خود ہی سنبھال لیا۔

کرداروں کا یہ تضاد بھی ذہن میں رکھیے کہ جب قبرص کے نہتے ترکوں پہ میکاریوس بہیمانہ مظالم کر رہا تھا تو جمال ناصر نے پیشکش کی کہ مصری فوجیں اور رضا کار میکاریوس کی مدد کے لئے تیار ہیں مگر عرب و اسرائیل کی جنگ میں ترکوں نے عرب ممالک کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کیا! اسی طرح پاکستان اور بھارت کے نزاعی مسائل میں جمال ناصر کی سیاسی روش سے بھارت ہی کو فائدہ پہونچا ہے، پاک و ہند کی جنگ میں جمال ناصر کے منہ سے ایک حرف بھی پاکستان کی تائید میں نکلا لیکن اس کے برخلاف عرب و اسرائیل کی جنگ میں حکومت پاکستان نے کس جرأت اور فراخدلی کے ساتھ عربوں کی حمایت کی اور پاکستان کے صدر محترم نے دریافت کیا کہ عرب ہم سے جس طرح کی امداد چاہیں اُس کے لئے ہم تیار ہیں۔

یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اسرائیلی حکومت کے قیام میں روس نے خاصے انہماک اور دلچسپی کا اظہار کیا تھا، اور اس معاملہ میں ملت اسلامیہ کو زک دینے کے لئے روس کی اشتراکیت اور یہود و امریکہ کی سرمایہ داری ہمنوا ہو گئی تھی! عرب و اسرائیل جنگ میں روس نے یہ رول ادا کیا کہ جنگی امداد کا وعدہ کر کے اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا، اس چیز نے بھی عرب طاقتوں کو خاصی مصیبت میں پھنسا دیا، ایک طرف امریکہ اور برطانیہ کی عملی اور واقعی ہمدردیاں دوسری طرف روس کی "لفظی دھمکیاں اور ہوائی باتیں"۔

کیوبا کے واقعہ کے بعد روس کی جنگی طاقت کا بھرم جاتا رہا ہے، اب وہ لفظوں کی شیشہ گری سے اپنی

ملے رکھنا چاہتا ہے! لوگوں کی نگاہ اس طرف کم پہونچتی ہے کہ یہودی، امریکہ، برطانیہ اور روس ان تمام
پروپیگنڈا ایک خاص موقف کی پردہ پوشی کر رہا ہے! خبریں اس احتیاط کے ساتھ پریس میں آ رہی ہیں کہ جمال ناصر
کس طرح مجروح اور مشتبہ نہ ہونے پائے! مگر یہ صورتِ حال شاید بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکے گی، یہ پردہ
ٹھ کر رہے گا اس وقت دنیا کو پتہ چلے گا کہ اس معرکہ آرائی کے پیچھے کس قسم کی سازشیں کام کر رہی تھیں کس کو گرانا
ٹانا مقصود تھا۔ اصل اسکیم کیا تھی؟ اس کا رخ بالکل متوازی نہ رہ سکا۔ یہ انکشاف جب بھی ہوگا تاریخ عالم کا
زیادہ اہم اور حیرت انگیز انکشاف ہوگا۔

الاعلون

کوئی شک نہیں عرب سیاسیات کا موقف انتہائی نازک اور تاریک ہے خطروں اور اندیشوں
کا ایک ہجوم ہے جس نے عرب ممالک کو گھیر رکھا ہے، مگر یہ وقت بدحواس ہونے کا نہیں ہوش
یم رکھنے کا وقت ہے، ایسے ہی موقعوں پر مرد مومن کی فراست و استقامت اپنا فرض ادا کرتی ہے! جنگوں میں فتح
حق و صداقت کا معیار نہیں ہوا کرتی۔ اُحد میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود ہوتے ہوئے، بعض
لطی کے سبب جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور کفارِ قریش کا وقتی طور پر پلہ بھاری ہو گیا، کسی قوم اور ملک کے حالات
ہی جیسے نہیں رہتے، ان میں اُتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ کوئی زندگی اجتماعی ہو یا انفرادی واقعات کے مد و جزر
راُس کا سابقہ پڑتا ہے، قضا و قدر کے آگے ہر انسان مجبور ہے، قدرت کے نوشتہ کا ایک شوشہ بھی نہیں
سکتا! ایسے نازک موقعوں پر مرد مومن کا کردار نا امیدی گھبراہٹ اور کفرانِ نعمت کا نہیں شکر و صبر اور عزیمت
مت کا کردار ہوتا ہے۔

یہودیت نے صرف عرب ملکوں ہی کو نہیں اسلام اور پوری ملت اسلامیہ کو چیلنج دے رکھا ہے، اس موقعہ پر تمام
سلمانوں کو متحد اور یک جان ہو کر اس یلغار کا مقابلہ کرنا ہے۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون اِن کُنتُم مُؤمِنِین۔

کی بشارت سے سرشار اور پُرامید ہو کر پہلے صحیح معنیٰ میں "اِن کُنتُم مُؤمِنِین" کا واقعی مصداق بن جایئے
الیٰ سے ہمارا جو رشتہ ہوا و ہوس کے ہجوم میں کمزور ہو گیا ہے بلکہ کسی کسی نوبت پر تو ٹوٹ سا گیا ہے، اُس کو پھر سے
رمضبوط کیجئے، اللہ تعالیٰ کے حضور زیادہ سے زیادہ جھکنے اور تضرع و ابتہال کی ضرورت ہے رات کی تنہائیوں میں
ہو کے سامنے رویئے گڑگڑایئے اپنے گناہوں سے توبہ کیجئے ہماری اصل قوت اللہ تعالیٰ کا سہارا ہے، اس سہارے
اد کو ایمان و یقین کو ذہن و فکر اور قلب و ضمیر میں پوری طرح سمو لیجئے! ہم سب اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں کہ کہاں
اللہ اور رسول کے احکام سے انحراف اور بغاوت پائی جاتی ہے، اس انحراف کو اسلام و اطاعت اور حنیفیت
ل دینے کی ضرورت ہے۔ ہماری زندگیوں کا یہی دینی انقلاب دراصل اس عظیم الشان انقلاب کی اساس قرار پائیگا
نیا کی مادی تدبیروں کے ساتھ ہمیں بروئے کار لانا ہے! مسرت کو اپنے اوپر حرام تو نہ کیجئے مگر اس خلش کو تو زندگی
نال کیجئے کہ یہودی کتوں سے ارض قدس کو پاک کرنا ہے اور اس مقصد کے لئے ہر طرح کی قربانی دینی ہے۔
ہم اُس خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو "حیّ و قیوم" ہے ـــــ پھر نا امیدی کیسی! مسلمان کو تو ہر عالم میں پُر امید رہنا
ے! وقتی طور پر حزن و ملال طبعی بات ہے ـــ مگر اس حزن و ملال میں اتنی شدت نہیں ہونی چاہئے کہ جد و جہد

سے طبیعت اُچاٹ ہو جائے، واقعات کے زخموں کو لئے ہوئے اور ان خراشوں کی ٹیس کو محسوس کرتے ہوئے کلمۂ حق کی سربلندی کے لئے میدانِ عمل میں آیئے اس کی فکر نہ کیجئے کہ کیا ہوگا؟ اس میں پوری قوت صرف کر دیجئے کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور پھر اپنا فرض ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے مستحق بن جایئے۔

ماہر القادری — ۲۸ فروری ۷۶ء

لاد احمدی

تاثرات

ہر کام کے کرتے وقت انسان کو سوچنا چاہیے کہ وہ یہ کام کس لیے، کس غرض اور مقصد سے اور کس نیت سے کر رہا ہے بلکہ "کس لئے" اور "کس غرض و مقصد سے" کی بجائے صرف "کس نیت سے" کہنا ہی کافی ہوگا۔ نیت میں "کس لئے" اور "کس غرض و مقصد سے" شامل ہے۔ نیت کا ذرا سا فرق اچھے کاموں کو برا کر دیتا ہے۔

جب حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکے سے یثرب (مدینہ) ہجرت کی ہے تو جن جن مسلمانوں نے اس وقت ہجرت میں حضور کا ساتھ دیا تھا۔ اُس کی ہجرت اللہ اور اللہ کے رسول کے نزدیک بے حد پسندیدہ تھی۔ لیکن ہجرت میں اگر اللہ کی خوشنودی اور رسول اللہ کی اتباع کے بجائے کچھ اور نیت مل جائے تو ہجرت کا ثواب ختم ہو جاتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب احادیث کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے شروع کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے حضور سے سنا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ ہر شخص کو اُس کی نیت کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ پس جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی غرض سے ہوگی، اُس کی ہجرت اللہ کی خوشنودی کے لئے نہیں مانی جائے گی۔

توبہ اللہ (بڑے بڑے گناہوں کی بھی) قبول فرما لیتا ہے، (مگر اُن کی) جو جہالت کی وجہ سے گناہ کر بیٹھیں اور (غلطی کا احساس ہونے کے بعد) جھٹ پٹ (جلد از جلد) تائب ہو جائیں (اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ دیں) ایسے لوگوں کو اللہ (اکثر) معاف کر دیتا ہے، اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ (اسے معلوم ہے کہ فلاں شخص نے واقعی محض جہالت اور نادانی سے گناہ کیا تھا اور اب وہ خلوص نیت سے توبہ کر رہا ہے۔ اللہ اسی توبہ کو قبول فرماتا ہے جس کا قبول کرنا قرین حکمت ہوتا ہے) ایسے لوگوں کی توبہ (توبہ) نہیں ہے جو (عادی مجرم ہیں) بُرے کام کئے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ موت اُن میں سے کسی کے سر پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ تب وہ کہتا ہے کہ میں (نادم ہوں اور) توبہ کرتا ہوں (اللہ بس اپنے فضل سے ایسے عادی مجرموں کی توبہ قبول کرلے تو کرلے ورنہ یہ معافی کے مستحق نہیں ہیں) اور نہ ایسوں کو توبہ سے کچھ حاصل جو سرے سے دین کے منکر ہیں اور مرتے دم تک آئے نہیں (لہٰذا وہ دوسرا عالم دیکھ کر توبہ کریں تب بے نتیجہ ہے۔) اُن کے واسطے تو ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

(سورہ ۴- آیات ۱۷ و ۱۸)

ہندو (آریہ) جب اس ملک میں پہنچے ہیں تو ان کا لباس صرف دھوتی تھا۔ عورت مرد، سب زیرِ کمر ستر پوشی کر لیتے تھے اوپر کا جسم نہیں ڈھانکتے تھے۔

مسلمان جب یہاں آئے تو وہاں رُکتے اور ٹھہرتے ہوئے آئے، جو ہندوؤں کا قدیم وطن تھا۔ وہاں دھوتی اب شلوار بن چکی تھی۔ دھوتی کی لانگ ذرا نیچی چھوڑ دیجیے تو شلوار ہو جاتی ہے چنانچہ مسلمان آئے تو شلوار پہنے آئے۔ اور اوپر کے جسم پر کئی کئی کپڑے تھے مسلمان ملکوں ملکوں کا لباس لے کر آئے تھے مگر ہندوؤں کی دھوتی بجا لہ باقی تھی اور آج تک باقی ہے۔ ہندوستان کے پہلے صدر راجندر پرشاد دھوتی کے رسیا تھے اور دوسرے صدر رادھا کرشنن کا بھی یہی حال ہے تاہم مسلمانوں کے ورود کے وقت ہندوؤں کا اوپر کا جسم کسی قدر ڈھک گیا تھا۔ عام ہندو تو نہیں، خاص خاص عورت مرد انگیا اور انگا پہننے لگے تھے۔ انگے کو مسلمانوں نے لمبا کر کے اور تراش خراش کر کے انگرکھے کی شکل دے دی۔ انگیا بدستور رہی۔

مسلمانوں کو دوسروں کا لباس اپنانے کا ہمیشہ شوق رہا ہے۔ عرب میں مسلمانوں کے پاس تہہ بند اور کرتے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پاجامہ اور قبا و عبا انھوں نے دیکھ ضرور لئے تھے، مگر پہنے کسی کسی نے تھے۔ مسلمان عرب سے نکلے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی ہی نہیں پیا، ہر جگہ کا لباس بھی اختیار کیا اور ہر جگہ کی دوسری چیزیں بھی قبول کیں۔ ہندوستان وارد ہوئے تو اُن کے پاس خدا جانے کیا کیا تھا۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے بس نہیں کیا۔ مردوں کے انگے کو انگرکھا بنایا اور عورتوں کی انگیا کے ساتھ کُرتی کو بڑھایا۔ اور پھر ہندوؤں سے ایسا میل جول رکھا کہ ترقی کرتے کرتے مغلوں کے دور میں تو ہندو مسلمانوں کا لباس ایک ہو گیا تھا۔ ہندوؤں نے ننگے سر رہنا چھوڑا۔ مسلمانوں کے سروں پر بھاری عمامے کے بدلے کم وزن کی پگڑی آ گئی۔ کم از کم دلی اور یو۔ پی کے ہندو مسلمانوں کا لباس بالکل یکساں تھا۔ دلی اور یو پی کیا سارے ملک کا لباس یکساں تھا۔ اورنگ زیب اور سیوا جی کی تصویریں دیکھ لیجئے۔ لباس اور وضع طرح کے اعتبار سے کتنی یکسانیت ہے۔ سر پر پگڑی۔ ٹانگوں میں ٹخنے کھلا تنگ مہری کا پاجامہ۔ بدن پر نیمہ اور جامہ۔ جامے کے اوپر کمر میں پٹکہ۔ پیروں میں ایڑی دار جوتی۔ نیمے کی آستینیں کہنیوں تک ہوتی تھیں۔ نیمہ جامے کے نیچے پہنا جاتا تھا۔ نیمے کو آدھی آستین کی قمیص سمجھئے اور جامے کو شیروانی۔ جامے نے قبا کی جگہ لی تھی۔ جامہ گھٹنوں تک لمبا ہوتا تھا۔ گھیر زیادہ اور گھیر میں چُنٹیں۔ جامے کی آستینیں انگرکھے جیسی ڈنڈوں پر پھنسی اور کلائی پر چاک دار۔ جامے کی تراش بدلتی رہی اور جامے سے بالابر اور بالابر سے اَچکن اور اَچکن سے شیروانی ہو گئی۔ نیمہ کرتے سے بدلا۔ ساٹھ ستر برس پہلے تمام ہندو مسلمان غرارے دار یا تنگ اور ڈھیلا پاجامہ۔ اور کرتہ زیب تن کرتے تھے۔ کرتے پر انگرکھا۔ پیروں میں سلیم شاہی جوتی۔ سر پر گول یا دو پلی ٹوپی۔ ٹوپیاں ان کے علاوہ بھی قسم قسم کی تھیں۔

بھارت اور پاکستان کا قومی لباس اب بھی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ یا شلوار ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل یہ بے شمار ہندو مسلمانوں کا لباس تھا۔ ہندوؤں نے ہندو مسلمان کی مشترک زبان اردو کا تو گلا گھونٹا۔ لیکن ہندو مسلمانوں کے مشترک لباس کی قدر ابھی بھارت میں بھی باقی ہے۔ اگرچہ انگرکھا بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں سے جا چکا۔ میں کبھی کبھی انگرکھا پہنتا ہوں تو لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں۔ شیروانی بھی عنقریب رخصت ہونے والی ہے۔ تنگ پتلونیں اور چُست فراکیں سینے والے درزی شیروانی کی تراش بھولتے جاتے ہیں۔

ساری دنیا یورپی اور امریکی لباس اور ہر یورپی اور امریکی چیز کی عاشق ہے اور اپنی چیزوں سے گھن کھاتی ہے اپنی چیزوں سے بیزار ہے۔ فقط عرب اور افریقی لباس اور زبان کے معاملے میں غیر فرنگی ہیں، مگر اور معاملوں میں فرنگیت

آن پر بھی چھا رہی ہے ۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

تمدن اچھی چیز ہے ۔ تمدن کو برا کون کہہ سکتا ہے لیکن کاش تمدن شائستگی اور تہذیب سے آگے قدم نہ بڑھاتا تمدن کی دو خرابیاں بڑی نمایاں ہیں ایک یہ کہ متمدن آدمی میں ایثار و قربانی کا مادہ گھٹ جاتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ بالادستی کا شوق بڑھ جاتا ہے ان دو خرابیوں نے ایسی تباہی مچا رکھی ہے کہ دل چاہتا ہے اولاد آدم کاش وحشی ہی رہتی ۔

آپ صحراؤں میں جائیے ۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ لوگ بالکل یکساں حالت اور حیثیت میں رہتے ہیں اُن کا سردار ہے، لیکن وہ سرداری کے مزے نہیں لوٹتا ۔ تمام قبیلے کے ساتھ باپ کی طرح زندگی بسر کرتا ہے ۔ آپ تکلیف اٹھا لیتا ہے، قبیلے پر آنچ نہیں آنے دیتا ۔

صحرا کے بعد گاؤں کا نمبر ہے ۔ گاؤں میں صحرا کی نسبت تھوڑا سا فرق ملے گا ۔ گاؤں میں تھوڑی سی اونچ نیچ ہے ۔ پھر قصبوں میں گاؤں سے زیادہ اور شہروں میں قصبوں سے زیادہ اسی اونچ نیچ اور اسی بالادستی اور زبردستی کا نام موجودہ تمدن ہے ۔ صحراؤں کے باشندے وحشی سمجھے جاتے ہیں ۔ گاؤں کے باشندے نیم وحشی، قصبوں کے قدرے متمدن اور شہروں کے پورے متمدن ۔

پھر شہروں شہروں کا مقابلہ ہے، ملکوں ملکوں کا مقابلہ ہے، براعظموں براعظموں کا مقابلہ ہے ۔ تمدن کی ترقی نے دنیا کی طنابیں کھینچ دی ہیں اور ساری دنیا کا سردار بننے کی دوڑ جاری ہے ۔

اب بالادستی حاصل کرنے کے کرشمے گاؤں، قصبوں، شہروں اور ملکوں میں محدود نہیں ہیں ۔ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں ۔ اب جنگ کا سرچشمہ وحشت کی بجائے تمدن ہے ۔ اب جنگ بہادری کی بجائے علم اور سائنس کے بل پر لڑی جاتی ہے ۔

شاید تمدن منتہائے کمال تک پہنچ چکا ہے اور اس کا زوال قریب ہے ۔ شاید قیامت اس کے زوال ہی کی صورت میں آنے والی ہو ۔ حیرت شملوی نے ٹھیک کہا تھا ؎

جس ترقی کا اس قدر غل ہے
وہ ترقی نہیں تنزل ہے
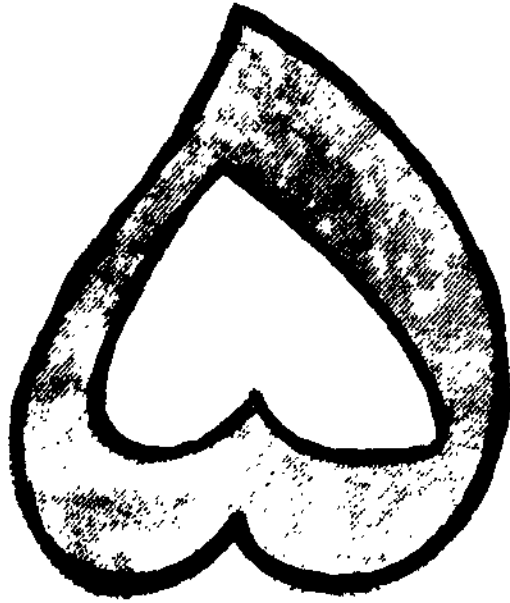
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
۵۱/۵۶

زکریا مائل"

دل شاعر کی نظر میں

دل وہی دل جس کا قصہ شاعروں کی نازک خیالی نے اس حد تک مختصر کر دیا کہ اس کی بساط خون کے ایک قطرہ کے برابر بھی نہ رہی ۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا

یا رہی بھی تو تنگ سرداماں بن کر رہ گئی ۔

دل کہ اک گوشۂ دامن میں ہے جس کے دنیا
قطرۂ خوں تھا کہ تنگ سرداماں نکلا [1]

جب شعرا کی ہمہ گیر جولانی فکر کی جولان گاہ بنا تو اس نے بے پناہ وسعتیں اختیار کرلیں ۔ آیئے اس صحبت میں ایک سرسری جائزہ لے کر دل کے چند شاعرانہ رخ نمایاں کرنے کی کوشش کریں ۔ اس موقع پر کسی جامع اور مرتب نوع کے مضمون کی توقع نہ رکھیئے کہ اس کے لئے بڑا وقت درکار ہے جو اس چند روزہ زندگی میں معدوم نہیں تو کمیاب ضرور ہے ۔ البتہ اس کی کوشش ضرور کی جائے گی کہ ایک موزوں حد تک مضمون موضوع کا ساتھ دے سکے ۔

اس ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دل سے متعلق عشقیہ خیال آرائیوں کو کم سے کم حد تک زیر قلم لایا اور جہاں تک ممکن ہو متصوفانہ اور حکیمانہ نقطۂ نظر کی ترجمانی کی جائے ۔

سب سے پہلے دل کی صوفیانہ ہمہ گیری سے متعلق حسن دہلوی اور خواجہ میر درد کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

انسان کا دل ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس کی اہمیت محسوس کی جا سکتی ہے بیان میں نہیں آسکتی ۔

نسخۂ دل کو سرسری مت دیکھ
سینکڑوں علم اس کتاب میں ہیں
(حسن)

اسی لیے علم کی صحیح تعبیریں کی گئی ہے۔ علم سینہ نہ در سفینہ۔ دل کیلیے روایاتی جام جہاں نما ہے۔ یا آئینہ سکندری

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار
اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

میر حسن نے دل کے اس پھیلاؤ کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

صورت نہ ہم نے دیکھی حرم کی نہ دیر کی
بیٹھے ہی بیٹھے دل میں دو عالم کی سیر کی

خواجہ میر درد فرماتے ہیں ؎

دل مرا باغ دل کشا ہے مجھے
دیدہ جام جہاں نما ہے مجھے

سخن دہلوی نے کم و بیش اس مرکزی خیال پر اس طرح طبع آزمائی کی ہے ؎

عالم کی دید کو تو مرا دل بھی کم نہیں
کچھ غم نہیں جو پاس مرے جام جم نہیں

دیکھئے سوز نے دل پر کس انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔

تجھے وہم ہے عرش پر ہے خدا
ترے دل سے تو عرش تک راہ ہے

متقدمین بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نظر نہیں آتے۔
سراج اورنگ آبادی کا شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

عیاں ہے آئینۂ دل پہ حالت کونین
ہمارے سامنے اب جام جم رہے نہ رہے

صابر دہلوی کا یہ شعر کتنا مزے دار ہے ؎

کی غور تو اسی میں ہے سارے جہاں کی سیر
دل اپنا آئینہ ہے طلسم خیال کا

مرزا غالب کے عاشقانہ انداز فکر سے بھی صرف نظر ممکن نہیں ؎

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

دل اور کعبۂ دل بھی ایک کشش انگیز موضوع سخن ہے۔ نواب فقیر محمد خاں گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کعبہ کی توجیہہ اس اچھوتے طرز سے کرتے ہیں ۔ ؎

بنایا کعبہ ابراہیم نے اس کا یہ باعث ہے
کہ خدا سمجھ [illegible]

دل اور کعبے کے تقابل کے لئے سوز کا یہ شعر دیکھیے ۔

بنیاد دل کی نور الٰہی سے ہے بنی
کعبہ اگر بنا تو بنا سنگ و خشت کا

حضرت ولی اورنگ آبادی یا گجراتی نے کس بے تکلفی سے دل پر خیال آرائی کی ہے اور دل کی کتنی پاکیزہ تصویر کھینچ دی ہے ۔

ہو

دل کو گر مرتبہ ہو درپن کا
مفت ہے دیکھنا سریجن کا

یہاں سریجن کو محبوب سمجھ لیجئے باقی شعر خود بخود آئینہ ہو جائے گا ۔

لوگ عموماً دل کو دنیوی آلام و افکار کی آماج گاہ بنا کر "حوالہ بہ تقدیری کنند" پر کاربند ہو جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس جیسی بے بہا چیز ایک جنس ناکارہ بن کر رہ جاتی ہے ۔ ولی جو صحیح معنوں میں صف اوّل کے اردو شاعر ہیں اس بات کو ...رتے ہیں اور اس دلکش انداز میں اہل دل کی رہنمائی کرتے ہیں ۔

اس نصیحت کوں گوش جاں سوں سن
دل کو اپنے مکان غم مت کر

ایک اور شعر میں دل کی افادیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے ۔

چراغ دل اگر گل ہے تو کر جیوں گل اُسے روشن
کہ یہ تحفہ ہے سالک کوں نزک حق کے لیجانے کا

فرماتے ہیں کہ دل کا چراغ اگر بجھ چکا ہے تو اسے گل کی طرح روشن کر اس میں سوز محبت و عرفان الٰہی کی تابناکی پیدا کر ...کہ سالک کے لئے یہی ایک ایسا تحفہ ہے جو حق کے نزدیک لے جانے کے لائق ہے سبحان اللہ کیا خوب شعر ہے ۔!

اسی سلسلے میں "دل کی نزاکت" پر بھی ایک نظر ہو جائے تو لطف سے خالی نہ ہوگی میر انیس کا یہ شعر اپنی نوعیت میں ...ر حیثیت رکھتا ہے ۔

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

جناب نظم طباطبائی نے کس بے ساختگی سے دل کی دردمندی کا اثر انگیز راگ سنایا ہے ۔

دل پردرد تو شیشے کی طرح ہے نازک
ہائے پھر صبر کی چھاتی پہ دھروں سل کیونکر

دل کی نزاکت کا ایک اور مضمون سوداؔ کے اس شعر میں دیکھئے اور اس شاعرانہ بانکپن کی داد دیجئے جو شعر کے لفظ لفظ سے ...یاں ہے ۔

اپنا ہنر دکھائیں گے ہم تجھ کو شیشہ گر
ٹوٹا ہوا کسی کا اگر ہم سے دل بنا

یوں تو انہیں تمام اقسام شعر میں مہارت تامہ اور ید طولیٰ حاصل تھا، لیکن مرثیہ گوئی میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں، اسی لئے اسد الغابہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

اجمع اهل العلم بالشعر انه لم تكن امرأة قبلها ولا بعدها اشعر منها[1]

علم شعر کے ماہرین نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ کوئی بھی عورت خنساء کے برابر شعر گوئی میں نہیں نہ اُن سے پہلے اور نہ بعد میں۔

لیلائے اخیلیہ اپنے وقت کی مشہور شاعرہ ہوئی ہے جس کو شعراء نے عورتوں کا سردار تسلیم کیا ہے مگر انہوں نے بھی خنساء کو مستثنیٰ رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں ابن قتیبہ کے الفاظ یہ ہیں۔

وهي اشعر النساء لا يقدم عليها غير خنساء[2]

اور لیلا اخیلیہ عورتوں میں سب سے بڑی شاعرہ ہے جس پر کسی کو تفوق حاصل نہیں سوائے خنساء کے۔

عہد جاہلیت کے دستور کے مطابق عکاظ میں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا جس میں تمام قبائل کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ مختلف قسم کی بزم بھی منعقد ہوتی تھیں، پورے عرب کے منتخب شعراء اس میں شرکت کرتے تھے۔ اس وقت آسمان شاعری پر نابغہ ذبیانی کا آفتاب قبولیت ضوفگن تھا تو عکاظ میں اس کے لئے سرخ خیمہ نصب کیا جاتا تھا، جو شاعری میں اس کے مسلم الثبوت استاد ہونے کی دلیل اور اس کی خصوصیت تھی۔

خنساء بھی اپنے بے نظیر مرثیوں کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ سوق عکاظ میں شعراء ان کے مراثی سننے کے متمنی رہا کرتے تھے ان کو بھی وہاں یہ مخصوص امتیاز حاصل تھا کہ ان کے خیمہ کے سامنے ایک علم نصب رہتا تھا جس پر "ارثی العرب" لکھا ہوتا۔

ایک سال جب معمول محفل شعر و سخن گرم تھی تمام شعراء اپنا اپنا کلام نابغہ ذبیانی کے سامنے سنا کر داد و تحسین حاصل کر رہے تھے اعشیٰ نے کلام سنایا اور پھر حسان بن ثابت نے اپنا کلام پیش کیا اور اس کے بعد خنساء نے اپنے خوش الحان لہجہ میں اور دلسوز انداز میں مرثیہ کے اشعار سنائے نابغہ بے ساختہ بول اٹھا۔

لولا ان ابا البصير انشدني آنفاً
لقلت انك اشعر الجن والانس[3]

اگر ابھی ابھی ابو البصیر (یعنی اعشیٰ) نے اپنے اشعار نہ سنائے ہوتے تو میں ضرور کہتا کہ تو جن و انس میں سب سے بڑی شاعرہ ہے۔

عہد بنی امیہ کا مشہور شاعر اخطل جو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں میں نابغہ کا ہم پلہ شمار کیا جاتا تھا، ایک مرتبہ خلیفہ عبد الملک بن مروان کے یہاں ایک مدحیہ قصیدہ پیش کرنے کی غرض سے گیا اور کہا کہ اے امیر المومنین! میں نے آپ کی شان میں کچھ مدحیہ اشعار کہے ہیں عبد الملک نے جواب دیا

ان كنت تشبهني بالحية والاسد فلا حاجة
لي بشعرك وان كنت قلت مثل ما قالت
اخت بن الشريد يعني الخنساء فهات[4]

اگر تم مجھے سانپ اور شیر سے تشبیہ دینا چاہتے ہو تو مجھے تمہارے اشعار کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر تم خنساء کے مثل اشعار پیش کر سکتے ہو تو پیش کرو۔

جب اسلام کا آفتاب عالمتاب افق مکہ پر طلوع ہوا تو جن کے دلوں میں قبول حق کی صلاحیت موجود تھی ان کی نگاہیں اس کی شعاعوں کی نورانیت سے منور ہو گئیں اور انہیں خوش نصیبوں میں خنساء بھی تھیں جو اپنے قبیلہ کے افراد کے ساتھ بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر نعمت اسلام سے بہرہ ور ہوئیں اس وقت کے چشم دید ساربان کا بیان ہے کہ :-

---

[1] اسد الغابہ ج ۵ ص ۴۴۱ و اصابہ ج ۸ ص ۶۶ [2] طبقات الشعراء ص ۳۰ [3] طبقات الشعراء الجاہلیین ص ۲۹ [4] طبقات الشعراء لابن [illegible]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے شعر سنتے تھے اور پسند کرتے تھے، وہ سناتی جاتی تھیں اور آپؐ کہتے
تھے شاباش اے خنساء"[1]

اسلام قبول کرنے کے بعد خنساء کا وہ غم کم نہ ہوا جو انہیں بھائیوں کی وفات سے پہونچا تھا اور وہ تمام جاہلانہ رسوم موجود تھیں جو اسلام میں ممنوع ہو چکی تھیں
ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہی ہیں اور سر پر سربند باندھے ہوئے ہیں جو جاہلیت میں غم والم کا نشان سمجھا جاتا تھا
آپؓ نے ان کو بلا کر نصیحت کی تو جواب دیا کہ کسی عورت پر میرے ایسے غم کا پہاڑ نہ ٹوٹا ہوگا۔ میں اسے کیسے برداشت کروں، حضرت عمرؓ نے انہیں دلاسا دیتے
ہوئے کہا "لوگوں کو اس سے بھی بڑے غم و مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے تم ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھو اور جس چیز کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے اس
کا اختیار کرنا گناہ کی بات ہے" یہ سن کر خنساء نے ان کے حکم کی تعمیل کی[2]
جنگ قادسیہ کے موقع پر اپنے بچوں کو لے کر شریک ہوئیں اور میدان جنگ میں جانے سے ایک شب قبل ان کے سامنے ایک مؤثر و پر جوش تقریر کی
صبح کو نونہالان اسلام اپنی ماں کی نصیحت کو یاد کرتے ہوئے رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑے اور تلوار کے جوہر دکھا کر جام شہادت
نوش کیا، جب خنساء کو ان کی شہادت کا علم ہوا تو وہ نالہ و فریاد کرنے کے بجائے بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہو گئیں، اور دعا کی ۔

الحمد للہ الذی شرفنی بقتلهم وارجو من	اس خدا کا شکر ہے جس نے ان کے قتل سے مجھے مشرف کیا اور مجھے
ربی ان یجمعنی بهم فی مستقر رحمته[3]	خدا سے امید ہے کہ ان کے ساتھ مجھے بھی جنت میں جمع کرے گا ۔

ان کی وفات ایک روایت کے مطابق جنگ قادسیہ کے سات سال کے بعد ہوئی اور دوسری روایت کے مطابق معاویہ بن سفیان کے زمانہ میں
۵۰ھ میں کسی بیابان میں ہوئی ۔
حضرت خنساء کا شمار طبقہ ثانیہ کے شعراء میں ہوتا ہے، جریر سے کسی نے پوچھا کہ لوگوں میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ جریر نے برجستہ جواب دیا
اگر خنساء نہ ہوتی تو میں اپنے کو کہتا[4]
بشار نے کہا "ہر عورت کے کلام میں کچھ نہ کچھ نقص ضرور ہوتا ہے" کسی نے کہا "کیا خنساء کے بھی" اس نے جواب دیا "وہ تو مردوں کو بھی مات کر گئی"[5]
حضرت خنساء کا ایک ضخیم دیوان ۱۸۸۸ء میں بیروت سے شائع ہوا ہے جس میں خنساء کے ساتھ ساتھ ان کی لڑکی عمرۃ کے بھی مرثیے شامل ہیں اس کے
علاوہ ان کے دیوان کی ایک شرح بھی انیس الجلساء کے نام سے ہوتی ہے جو ایک عیسائی الاب لویس الیسوعی نے لکھی ہے اور مطبع کاتھولیکیہ بیروت
سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی ہے یہ شرح دیوان خنساء کے ۶ قدیم قلمی نسخوں سے پوری صحت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے اس کے شروع میں ایک مبسوط اور
وقیع مقدمہ بھی ہے جس میں مختلف تاریخی کتب سے مواد جمع کر کے حضرت خنساء کی سوانح اور ان کی شاعرانہ خصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی
ہے، جو خود ایک خاصے کی چیز ہے ۔
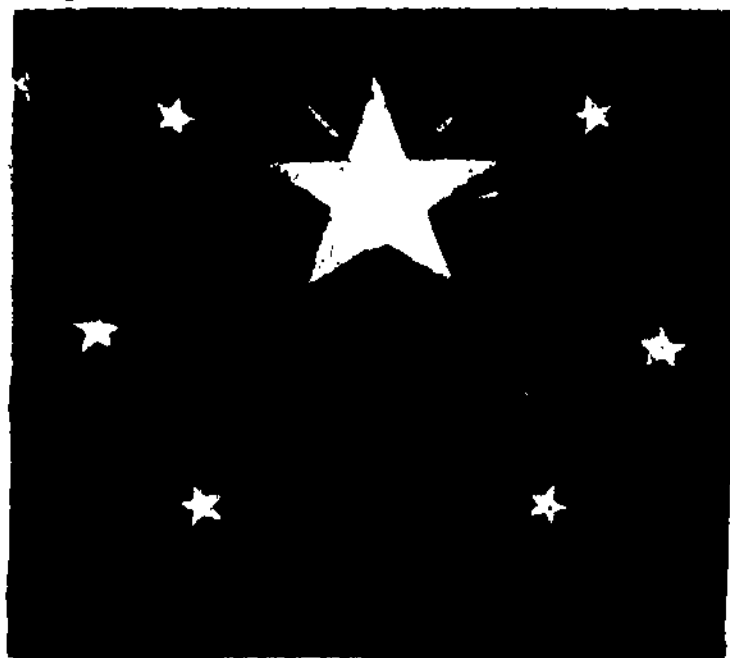
---

[1] اسد الغابہ ج ۵ ص ۴۴۱ و اصابہ ج ۸ ص ۶۶ [2] اسد الغابہ ج ۵ ص ۴۴۲ و اصابہ جلد ۔ ج ۸ ص ۶۷ [3] شہیرات النساء [4] مقدمہ
انیس الجلساء شرح دیوان الخنساء ص ۲۵ [5] ایضاً

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

شاہد احمد دہلوی مرحوم

میری شاعری اور مضمون نگاری کا آغاز اخباروں سے ہوا، اس کے بعد ماہنامہ عالمگیر (لاہور) اور ماہنامہ "پیشوا" (دہلی) میں میرے مضامین شائع ہونے لگے، یہ میری ادبی زندگی کا دور مراہقت تھا، پھر ۱۹۳۱ء کے بعد ماہنامہ "ساقی" میں میرے کلام اور مضامین کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، تو برسوں یہ رسم اور وضع جاری رہی، یہ میرے "بلوغ فکر" کا آغاز تھا، ایسا بھی ہوا کہ ایک دو بار میری نظمیں بعض دوسرے پرچوں میں نہ چھپ سکیں، میں نے "ساقی" میں اشاعت کیلئے بھیجیں تو وہ چھپ گئیں۔ شاہد احمد دہلوی سے یہی مضمون نگاری ذریعہ تعارف تھا، مرزا یاس و یگانہ لکھنوی کے رباعیوں کے مجموعے "ترانہ" پر میرا تقریباً تیس صفحے کا تنقیدی مضمون "ساقی" میں شائع ہوا۔ شاہد صاحب نے میرے کسی مضمون میں کبھی ذرا سا بھی ردوبدل نہیں فرمایا، میں جو کچھ لکھ کر بھیجتا وہ لفظ لفظ اسی طرح چھپ جاتا، اس چیز نے راقم الحروف میں خود اعتمادی پیدا کردی۔

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے، چھاجوں مینہ برس رہا تھا اور میں حیدرآباد دکن کے دفتر معتمدی فوج میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک صاحب دفتر کے دروازے سے داخل ہوئے۔ میں انہیں دیکھ کر چونکا، میرے استفسار سے پہلے وہ خود ہی بول اٹھے۔

"میں شاہد احمد دہلوی ہوں"

میں تعظیم و خیر مقدم کے لئے کھڑا ہوگیا، مصافحہ بلکہ معانقہ ہوا، فرمانے لگے۔

"میں پہلے نظامت ڈاک (پوسٹ ماسٹر جنرل کے آفس) پہونچا، وہاں معلوم ہوا کہ آپ کی اس دفتر میں بدلی ہوگئی ہے . . . . . ."

شاہد مرحوم کی اس محبت اور خلوص نوازش نے مجھے بدحواس سا کر دیا تھا کہ وہ اتنی شدید بارش میں مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہونچے! میں نے چپراسی کو اشارہ کیا اور تھوڑی سی دیر میں دو پلیٹ بالائی، دو کلیجے اور چائے کی دو پیالیاں ہوٹل سے آگئیں۔ اس تواضع پر میری خاموشی زبان حال سے عرض کر رہی تھی۔

؎ چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مشہور ادیب سید وزیر حسن صاحب کے یہاں شاہد صاحب نے قیام فرمایا۔ بازدید کے لیے میں وہاں گیا۔ یہ اُن سے میری ملاقات تھی! خط و کتابت کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔ انھوں نے مجھے اور میں نے انھیں سیکڑوں خط لکھے ہوں گے۔

غالباً ۱۹۳۵ء میں اُن کا کرم نامہ آیا جس طرح مشاعروں میں غزل کہنے کے لئے طرحی مصرعے شاعروں کو دیئے اسی انداز پر شاہد صاحب نے افسانہ کا ایک پلاٹ بھیجا اور دعوت دی کہ "آپ اس پر افسانہ لکھیں"! میں نے جواب دیا کہ افسانہ نگاری کی زیادہ مشق نہیں ہے، آپ نے جن مشاق اور مشہور افسانہ نگاروں کو اس "طرحی افسانہ" کے لیے منتخب کیا ہے، ان میں آپ کی نگاہ انتخاب اس ہیچمدان پر کس طرح پڑی؟ شاہد احمد مرحوم نے جواب میں لکھا کہ آپ اگر لکھ سکتے ہیں، آپ کو افسانہ لکھنا ہوگا۔ چنانچہ ان کی فرمائش اور اصرار پر میں نے افسانہ لکھا اور اُس دور کے مشاہیر افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ساتھ میرا افسانہ بھی "ساقی" میں شائع ہوا۔

اسی زمانہ (۱۹۳۶ء) کا ایک واقعہ ہے کہ جن دنوں حیدرآباد دکن میں میرا قیام تھا ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنی سائیکل پر چادر گھاٹ کے پل کے قریب سے گزر رہا تھا، حرماں خیرآبادی مرحوم سائیکل کے پیچھے ٹانگیں لٹکائے تھے، پولیس کے سپاہی نے ایک سائیکل پر دو آدمیوں کو سوار دیکھ کر ہاتھ کا اشارہ کیا، میں نے سائیکل روک لی اُس نے کہا کہ تم دونوں کو تھانے چلنا ہوگا۔ میں نے کہا بھئی! جیسی چاہے قسم لے لو ہمیں اس قانون کی خبر نہ تھی۔۔۔ کہ دو کا ایک سائیکل پر سوار ہونا جرم ہے۔ کانسٹبل نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کو کیا خود راقم الحروف کو اُس وقت مجموعہ تعزیرات کی اس پہلی دفعہ کا کہاں علم تھا۔ Ignorance of Law is no excuse

میں نے اور حرماں مرحوم نے سپاہی کی بہت کچھ خوشامد کی، مگر اُس کا دل کسی طرح نہ پسیجا، ہاں! اُس کی مٹھی گرم تو اس مصیبت سے ہمیں نجات مل جاتی مگر ہم دونوں شاعر قلاش تھے، دونوں کی جیبوں میں بہت سے بہت چند آنے ہوں گے خیر صاحب! وہ سپاہی ہم دونوں کو لئے ہوئے، چیچل گوڑہ کے پولیس اسٹیشن پہونچا، سب انسپکٹر صاحب کے سامنے ہمیں پیش کیا گیا، انھوں نے حکم دیا کہ چالان مرتب کیا جائے، تھانے کے دیوان نے ایک چھپا ہوا فارم پر کیا، ہم دونوں کے نام عمر اور پتے لکھے گئے، یہ چالان جب انہی صاحب پولیس (سب انسپکٹر) کے سامنے لایا گیا، تو وہ چونک کر بولے۔

"ایں . . . آپ ماہر القادری ہیں؟"

تم نے لجاجت آمیز انداز میں کہا —— "جی ہاں! . . . . ."

میرے منہ سے "ہاں" سنکر انھوں نے وہ چالان چاک کر دیا، اور فرمانے لگے۔

"آپ نے آتے ہی اپنا نام کیوں نہیں بتا دیا"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا۔ انہوں نے گفتگو کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر جوڑ دیا، بولے۔

"میرا نام مبشر ہے، میں شاہد احمد دہلوی کا بھائی ہوں۔ آپ کے مضامین "ساقی" میں پڑھتا رہتا ہوں . . . . اور . . . ."

شاہد احمد دہلوی اور اُن کے رسالہ "ساقی" کے اس تعارف نے بڑی کرامت دکھائی، ورنہ اس جرم میں جرمانہ دے کر پیچھا چھوٹتا، اور سب سے زیادہ پریشانی کی بات عدالت کی حاضری اور پیشی کا معاملہ تھا۔

۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء کے بعد "ساقی" سے قلمی تعلق قطع سا ہو گیا، اس کا سبب خود مجھے آج تک نہیں

معلوم نہ ہو سکا اور جہاں تک شاہد احمد کی ذات کا تعلق ہے اُن سے دلّی میں کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ــــ مگر

ع سبک ہم بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

پاکستان بننے کے بعد وہ بھی کراچی چلے آئے اور راقم الحروف نے بھی اسی شہر کا رُخ کیا۔ یہاں انجمن ادبی رسائل کی بدولت مرحوم سے جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اب سے چھ سات سال قبل لاہور میں اس انجمن کا سالانہ اجلاس تھا، اس میں شریک ہونے کے لئے ہم ممبروں کی پوری ٹیم نے ریل کے ایک ہی ڈبہ میں سفر کیا اور ایک ہی ہوٹل میں ٹھیرے۔ اس طرح کئی دن شاہد احمد مرحوم کا ساتھ رہا۔

کراچی کے "ساقی" میں میرے دو تین مضامین اور ایک دو غزلیں شائع ہوئیں۔ "جوش نمبر" کے مضمون کے لئے انھوں نے ٹیلی فون پر خود تقاضا کیا۔ دو چار مہینے کے بعد کسی نہ کسی تقریب میں اُن سے ملنا ہوتا رہتا، خاصے تپاک سے ملتے، کبھی کبھار ہنسی دل لگی کا کوئی ہلکا پھلکا فقرہ بھی اُن کی زبان سے سننے میں آتا، اُن کی کاٹھی اچھی تھی چہرے سے وہ ساٹھ سال کے نہیں لگتے تھے، دل کا دورہ پڑنے کے بعد وہ اچھے ہو گئے، چلنے پھرنے لگے، مگر ۲۷ اور ۲۸ مئی کی درمیانی شب میں کھانا کھانے کے بعد ریڈیو سنا، پھر وہ گھٹن اور بے آرامی محسوس کرنے لگے اسی دوران میں کھانسی آئی تھوڑی سی دیر میں حالت غیر ہو گئی ــــ اور پھر دُنیوی زندگی کا ڈراپ سین! اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

اُن کے دادا ڈپٹی نذیر احمد ریاست حیدرآباد دکن میں صوبیدار تھے اور اخراجات کے معاملے میں بڑے محتاط اور جُزرس! انھوں نے بہت کچھ دولت چھوڑی، اُن کے بعد اُن کے اکلوتے بیٹے اور شاہد مرحوم کے والد بشیر الدین احمد برسوں حیدرآباد میں اوّل تعلقدار (کلکٹر) رہے دو پشتوں کا اندوختہ اور ہزاروں کی سکنی جائداد اس خاندان کو ورثہ میں ملی شاہد صاحب نے دہلی میں بڑی بے فکری کی زندگی گزاری۔ مکانوں کا اتنا کرایہ مل جاتا تھا جو اُن کے اخراجات کے لئے کافی تھا۔ یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں رکھنے کے باوجود اُن کا خیال تک ملازمت کی طرف نہیں گیا، آزادرہ کر زبان و ادب کی خدمت انجام دی، کتنے بہت سے مشہور ادیب، افسانہ نگار، اور اہلِ قلم ہیں جن کو رسالہ "ساقی" نے چمکایا اور اسی اُفق سے اُن کی شہرت کا آفتاب طلوع ہوا۔

تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی بڑی بے سرو سامانی کے عالم میں آئے۔ یہ انہی کی ہمت اور دل گردہ تھا کہ اس قدر ناسازگار حالات میں "ساقی" یہاں سے نکالا، اور اس کے ساتھ معیار کو گرنے نہیں دیا۔

شاہد احمد دہلوی مرحوم کو زبان و ادب کے ساتھ موسیقی سے بھی غیر معمولی دلچسپی اور لگاؤ تھا برسوں اس فن میں ریاض کیا جہاں تک خالص فن کا تعلق ہے راگ راگنی کو اُن کی برابر جاننے والے پاکستان اور ہندوستان میں مشکل ہی سے چند لوگ نکلیں گے یہی فن جو انھوں نے پیشہ کے طور پر نہیں، شوقیہ سیکھا تھا پاکستان میں ان کی روزی کا خاصہ ذریعہ بن گیا ریڈیو پاکستان میں وہ شعبہ موسیقی کے ہدایت کار تھے چار سو یا پانسو ماہوار اس کا معاوضہ ملتا تھا۔ تھائی لینڈ میں اُن کو ایک ماہرِ فن کی حیثیت ہی سے بلایا گیا۔ فنی معلومات کے ساتھ آواز میں سوز گلے میں لوچ اور لہجہ میں دلکشی ہوتی تو کیا عجب تھا کہ عبدالکریم خاں اور بڑے غلام علی خاں جیسے نامور موسیقاروں کی صف میں اُن کا شمار ہوتا۔

تقسیم ہند سے قبل شاہد احمد مرحوم کے "ترجمے" تو ضرور شائع ہوئے ہیں مگر اُردو مضامین شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں اُن کی انشاء پردازی کے جوہر تو پاکستان میں آکر کھلے، ان کے قلم سے بڑی جاندار اور باوقار تحریریں نکلی ہیں

جن میں زبان کا رچاؤ، محاوروں کی برجستگی، بیان و اظہار کا حسن اور نفسیات و کردار کی عکاسی پائی جاتی ہے! ان کی ادبی شہرت اور شخصیت سے حکومت پاکستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، اُن کو صدارتی ایوارڈ ملا۔ ڈھائی سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا، زندہ رہتے تو اور زیادہ قدر افزائی ہوتی ـــــ مگر وہ جسے ــــ "بے فکری سے ہو، آسائش کہتے ہیں انھیں میسر نہ آسکی۔ اتنا مشہور ادیب کراچی کی سڑکوں پر بس کے انتظار میں پہروں کھڑا رہتا۔ ذاتی مکان بنوالیا تھا مگر وہ بس گزر بسر کے قابل تھا، اُن کا بچپن خاصے ناز و نعم میں بسر ہوا، تقسیم ہند سے قبل دلّی کی زندگی کا زمانہ بھی خوشحالی اور بے فکری میں گزرا، اگر پاکستان آنے کے بعد آذوقۂ حیات کے لئے انہیں خاصی جد و جہد کرنا پڑی۔ کثیر العیال بھی تھے لیکن ان کی قناعت اور خود داری کا یہ عالم تھا کہ اُن کے عزیزوں اور دوستوں تک کو اُن کے حالات کی خبر نہ ہوتی۔ حالات ساز گار ہوتے تو اُن کی بیگم صاحبہ کو کالج میں معلمی کی مشقت کاہے کو اٹھانی پڑتی۔

شعر کے معاملہ میں شاہد احمد دہلوی کا ذوق پکّے راگ سے ملتا جلتا تھا۔ اس لئے ساقی کا حصّۂ نظم، نثر کے مقابلہ میں کمزور رہا۔ لباس خالص مشرقی پہنتے، میں نے انہیں کبھی کوٹ پتلون میں نہیں دیکھا، جلسوں میں جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے نمایاں ہونے اور پیش پیش رہنے کی کوشش نہ کرتے، چہرے پر شگفتگی سے زیادہ فکرمندی کے آثار دکھائی دیتے تھے، وہ فطرتاً کم آمیز بھی تھے!

ان کے جنازے میں اہلِ قلم اور شاعروں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی، سب سوگوار اور غمزدہ تھے، مگر اس کو کیا کیجئے۔

سحر کاری تری اے عالمِ فانی دیکھی
گھر تک آئے اثر گورِ غریباں نہ رہا

مولانا شمس تبریز خاں

مولانا آزاد اور آزاد بلگرامی

متاخرین علمائے ہند میں جو یکتائے روزگار اور نادرۂ عصر ہستیاں تھیں، اُن میں آزاد بلگرامی (صاحب خزانۂ عامرہ و سرو آزاد) بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے، مولانا شبلیؒ نے اُن پر ایک معلوماتی مقالہ بھی لکھا، ہمارے عہد میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان سے بہت متاثر تھے اور ان کو خوب پڑھا تھا، اس لئے ان کی شخصیت پر اپنے اس ہمنام نامور کی گہری چھاپ نظر آتی ہے، خود تخلص "آزاد" گویا ان دو عظیم ہستیوں کے "قران السعدین" کا نتیجہ ہے۔ بڑی مشابہت وہاں دکھائی دیتی ہے جہاں ان دونوں نے اپنی "رونمائی" کی ہے ۔

علامہ بلگرامی نے اس طرح اپنی خود نوشت سوانح کا آغاز کیا تھا: "فقیر آزاد الحسینی الواسطی البلگرامی عفی اللہ عنہ ایں گستاخ کیست کہ باوصف کج مج زبانی پہلوئے شیرازی باناں می نشیند و باوجود تنگ سرمائگی خود بازار عالی دکانی می جستند شاید بدار فیاض، روح القدس را بتائید فرمودہ، در دست از غایت خاص براتہ او گشودہ، بلے قدرت بالغۂ الٰہی سرو آزاد را موزوں ساختہ، اگر آزاد را ہم موزوں نماید چہ جائے استعجاب؟ و قمری را مصرعۂ سرو ہم آموختہ اگر او را ہم سوشان مصرعہا تلقین نماید چہ محل استغراب؟ از ینکہ حضرت لسان الغیب قدس سرہٗ سی صد و پنجاہ سال تخمیناً پیش ازیں بنام و تخلص فقیر ایما فرمودہ، راہ از غایت بہ نہایت زبان عقیدت مند تکلم فرمودہ کہ ؎ فاش می گویم و از گفتۂ خود دل شادم ؛ بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم ! بندۂ عشق ترجمہ غلام علی ....
در رود فقیر از شبستان عدم در انجمن بست و پنجم صفر روز یکشنبہ ۱۱۱۶ھ مولد و محل سیداں پورہ واقع قصبۂ بلگرام تابع صوبۂ اودھ از سرزمین پورب نسب فقیر منتہی بعیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدینؓ و مے شود، می گویم ؎

گرچہ باشد موتم الاشبال عیسیٰ جد من ؛ عیسیٰ جاں بخش پسرانم بامداد نفس (خزانۂ عامرہ صـ۱۲۳)

مولانا آزاد اس طرح اپنی "چہرہ نمائی" کرتے ہیں! ...... یہ غریب الدیار، ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ حسرت کہ موسوم با حمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء میں ہستیٔ عدم سے اس عالم ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم (تذکرہ صـ۲۵) مولد و منشا طفولیت، "وادی غیر ذی زرع عند بیت اللہ المحرم" ہے یعنی مکہ معظمہ زاد اللہ شرفاً و کرامۃً محلہ قدوہ متصل باب السلام!

ان دونوں عبقری شخصیتوں نے ایک ہی افسانوی انداز اور اسلوب سے اپنا اپنا تعارف کرایا ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد کے بیان میں یہ رنگ کچھ گہرا ہو گیا ہے — ایک اور مشابہت یہ بھی ہے کہ دونوں کے اشعار سے استشہاد اور استنباط کا طریقہ بھی تقریباً ایک سا ہوتا ہے، آزاد بلگرامی کہتے ہیں "سالم کشمیری خالی خود فقیر می گوید" یا "گویا شوکت بخاری در زبان من می گوید" (خزانۂ عامرہ صـ۱۲۵) اسی طرح مولانا آزاد بھی غبار خاطر اور تذکرہ وغیرہ میں اشعار لاتے ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں ۔

ب کلیم نے چار مصرعوں میں پوری بھرا نع عمری لکھ دی" (تذکرہ ص ۲۸۵) مرزا بیدل نے میری زبانی کہا تھا الخ (غبار خاطر ص ۲۵) " شیخ
نے میری زبانی کہا تھا " (غبار خاطر ص ۲۵)

غبار خاطر کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد صرف آزاد بلگرامی سے نہیں بلکہ ان کے پورے خاندان اور بلگرام کے مراحل علم سے
رح واقف ہیں، دیباچہ میں لکھتے ہیں "میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصر و ہم وطن تھے اور جدی رشتہ سے قرابت
تے تھے۔ آزاد نے اپنے تذکروں میں جابجا ان کا تذکرہ لکھا ہے، عہد آزاد اور آنند رام مخلص کی تحریرات میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے
ر رسالہ غبار خاطر کے نام سے لکھا تھا میں یہ نام ان سے مستعار لیتا ہوں ؎

بپرس تا چہ نوشتست کلکِ قاصرِ ما　　خطِ غبارِ من است این غبارِ خاطرِ ما ! (غبار خاطر)

ن مولانا غلام علی آزاد اور ہمارے مولانا ابوالکلام آزاد دونوں ایک دوسرے کی نظیر ہیں وہ گو دہ اپنی آپ نظیر تھے مگر دونوں کی روحیں ایک دوسرے
عارف اور آشنا تھیں، والا مرواج بانود مجیند با ، دونوں عظیم شخصیتوں کا دل و دماغ، ذوق و مزاج تقریباً ایک ہی تھا! کیوں نہ ہو
خو لیشتن دارد ! اور یہ تو مشہور عام ہی ہے کہ " تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے "

مولانا آزاد ایک اور بلگرامی بزرگ کے بارے میں لکھتے ہیں جن سے اس علمی خانوادہ کیسا تھ ان کا ذہنی شغف معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں ۔
عبدالواحد بلگرامی شیر شاہی عہد کے ایک عالی قدر بزرگ تھے سلوک و تصوف میں ان کی کتاب "سنابل" مشہور ہو چکی ہے، بدایونی ان کے حالات
لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی میں نقش آرائیاں کرتے تھے اور وجد و حال کی مجلسیں ان سے گرم ہوتی تھیں " (غبار خاطر ص ۲۸۲)

آزاد بلگرامی کے ماموں علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی کا ذکر بھی مولانا آزاد نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ غبار خاطر میں رقمطراز ہیں " فرخ سیر اور
ہ کے عہد کی تر دماغیاں دراصل زاہد عالمگیری خشک مزاجیوں کا ردعمل تھیں ۔ سید عبدالجلیل محدث بلگرامی نے فرخ سیر کی تبریک میں جو مثنوی لکھی
ہے اس سے اس عہد کی عشرت مزاجیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے " (ص ۲۹۳) علامہ سید سلیمان ندوی علامہ آزاد بلگرامی کو ایک بلند پایہ سخن
کے علاوہ ہندوستان کا پہلا عربی شاعر کہتے تھے ۔ مولانا آزاد کی شعری تخلیقات بہت کم سامنے آئیں مگر ان جیسے شعر فہم و سخن سنج اس عہد میں
رہی تھے ۔ شعر و ادب کے معاملہ میں بھی علامہ بلگرامی و مولانا آزاد ہم ذوق و ہم مزاج واقع ہوئے تھے ۔ دونوں ہی ہر فرد علم و فضل ، ہنر و کمال میں
اپنے عہد میں بے نظیر تھے ۔ مگر شعر کی پرکھ ، اور بلند ادبی مزاج ، ذہن کی شعریت اور فکر کی ادبی لچک بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھی ۔ آخر میں
اختیار مولانا محمد حسین آزاد بھی یاد آتے ہیں اور ادب کے اقانیم ثلثہ کی صف میں بیٹھ جاتے ہیں اور ہماری حیرت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے کہ ان دونوں کی
یہ بھی شعر و ادب کے رسیا نظر آتے ہیں اور ان کا حاصل عمر ہی شعری فضا کی تخلیق ہے ۔

" آزاد" ان حضرات کا جہاں تخلص ہے وہاں ان کا تعارفی نام بھی ہے جو ان کی شخصیتوں کی ترجمانی بھی ہے اور ان کے فکر و عمل کا رخ بھی "

شوق امرتسری

اقبال کا فلسفہ خودی

(" مقام اقبال " ـــ زیر تصنیف کتاب کے چند ورق)

خودی یعنی، خودشناسی، خود آگہی، خودداری، یا عزت نفس کے مترادف ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جس سے ہر انسان اپنے عزو شرف شان و شوکت، مرتبہ و حیثیت کی شناخت و حفاظت کر سکتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں اس جذبہ خودی یا عزت نفس کے مقابل عزۃ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی (سیاق سباق کے لحاظ سے) غلبہ انسانی، حمیت و حیثیت وغیرہ ہیں جن کا مفہوم یہ ہے۔

"کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے"[1]

اسی ارشاد الٰہی نے مسلمانوں کو ایمان و یقین اور خودی کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہیں جا سکتی کیونکہ ہر باطل کے سامنے ہر مسلم کو اونچا رہنا چاہیئے۔

چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین اسی جذبہ خودی یا عزت نفس کے احساس سے سرشار رہا کرتے تھے ـــــ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس جذبۂ خودی کے تحت صلح کی شرائط پر لب تنقید وا کرنے پر مجبور ہو گئے ـــ حضور کی خدمت اقدس میں عرض کیا۔

یا رسول اللہ کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں۔ ارشاد ہوا۔ بے شک ایسا ہی ہے۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروق بولے۔ تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں۔

ارشاد ہوا۔ میں خدا کا رسول ہوں۔ اور اس کے (یعنی خدا کے) حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔

بے شک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس نظر اس سے آگے تھی یہ واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوۂ خندق میں رسالت مآب علیہ وصلوٰۃ و تسلیمات نے انصار مدینہ کے سر سے جنگ ٹالنے کے لئے قبیلہ غطفان کو اس شرط پر واپس کرانا کہ مدینے کی پیداوار کا چوتھا حصہ ہر سال دیا جائیگا لیکن جب انصار مدینہ کے سرداروں کو بلا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے

---

[1] امام رازی اور صاحب روح المعانی نے اس لفظ کی بھی تصریح و تشریح فرمائی ہے۔

انصار نے عرض کیا۔

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جب ہم بتوں کو پوجا کرتے تھے اور خدا سے بے خبر تھے تب تو ان کو ہم سے کچھ لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور اب جبکہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے تو کیا ہم ان کو یوں مال دینا منظور کر سکتے ہیں؟ خدا کی قسم ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں!

(سیرت ابن ہشام)

خلافت کے مبارک دور میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جب قیصر و کسریٰ کے مقابلے میں صف آرا ہوئے تو ان کی اسلامی عالم یہ تھا کہ معمولی سا معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک جا کر بڑی دلیری سے بادشاہ اور وزراء سے ہمکلام ہوتا تھا ان جب تک خودداری کا یہی خیال ان کی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کا باعث بنا رہا ہے بلکہ مسلمانوں کے کانوں میں قرآن کا خودداری کی آواز حق بنکر گونجتا رہا۔

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی سربراہی کے لئے ظہور میں لائی گئی ہے۔

(سورۂ آل عمران)

قرآن حکیم جو دستور حیات اور منشور زندگی ہے اس میں مسلمانوں کو باوقار اور خوددار بننے کی تعلیم دی گئی ہے۔ روحانی تطہیر کے علاوہ ظاہری صاف ستھرے اور پاک رہنے کے حکم میں یہی حکمت پوشیدہ ہے کہ مسلمان اپنی ظاہری ہیئت کذائی کے سبب کسی محترم کی نگاہ میں حقیر اور ہیچ دکھائی نہ دے کیونکہ غلیظ اور گندہ رہنے والے شخص سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک دفعہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کو دیکھا جس کے سر کے بال پریشان اور الجھے ہوئے تھے فرمایا۔

"کیا اس کے پاس بال سنوارنے کا سامان نہ تھا؟

اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا۔

"کیا اس کو کپڑے دھونے کے لئے پانی میسر نہ تھا؟"

ایک روز ایک باحیثیت مسلمان کم حیثیت کپڑے پہنکر آیا تو اس سے فرمایا۔

"تمہارے پاس کچھ مال ہے؟"

اس نے عرض کیا۔ "ہاں اونٹ۔ گھوڑے۔ غلام۔ بکریاں سب کچھ ہیں؟"

اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل و احسان کا اثر بھی تو تمہارے جسم سے ظاہر ہونا چاہئے۔"

(ابوداؤد، کتاب اللباس)

خودداری و خودی کا سب سے بڑا مظہر وقار اور متانت ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے مسلمانوں کو ہر حالت میں وقار قائم رکھنے کی تاکید کی ہے۔

نماز سے زیادہ اور کونسی عبادت ضروری ہو سکتی ہے اس کے متعلق ہادیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔

"جب تک اقامت سنو تو نماز کے لئے سکون اور وقار کے ساتھ چلو جلدی نہ کرو!"

اسی وقار و متانت کی نسبت ابوداؤد میں یہ حدیث ہے۔

نیک طور و طریق ۔ نیک انداز اور میانہ روی نبوت کے پچیس اجزا میں ایک جزو ہے۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے۔ (اردو ترجمہ)

> خیرات تو ان حاجتمندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے بیٹھے ہیں ملک میں
> کسی طرف کو نہیں جا سکتے۔ بے خبر ان کی خودداری (کی وجہ سے) ان کو غنی سمجھتا ہے (اگر
> ان کو دیکھے تو) ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ وہ محتاج ہیں)
> وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔

قرآن مجید کی ان آیات میں فقر وفاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ ان ہی آیات کے فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے۔

چنانچہ صاحب کشاف نے لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ۔

> وہ سوال تو کرتے ہیں لیکن لجاجت و اصرار کے ساتھ نہیں نرمی کے ساتھ کرتے ہیں

لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ اس لئے کہ۔

> جب خدا نے خود ہی بیان فرمایا کہ ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے
> ناواقف ہیں اور ان کو دولت مند سمجھتے ہیں۔ تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی!

اصحاب صفہ رضوان اللہ تعالیٰ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لئے سوال نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تنگ میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے۔ جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر وفاقہ کا اظہار کرتا ہے کی بھی خاموشی بلجاجت ایک طرح کا سوال ہے کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کے پاس حاجت کو پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لئے جب انسان کسی کی ایسی حالت دیکھتا ہے تو اس کے دل میں رحم کا جذبہ پید ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے؟

پس خداوند فرماتا ہے۔

> اصحاب صفہ لوگوں سے لجاجت کے ساتھ سوال نہیں کرتے اور اپنے خستہ حال ہونیکا
> بھی اظہار نہیں ہونے دیتے بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے
> ہیں تاکہ خدا کے سوا اپنے فقر وفاقہ پر کسی کو واقف نہ ہونے دیں۔

ایسی حالت میں یعنی فقر وفاقہ کی حالت میں عام لوگوں سے اعانت حاصل کرنیکی درخواست کرنا بھی مسلمانوں کی خودداری کے منا ہے جبکہ حضور نے فرمایا ہے۔

> جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج
> دور نہیں ہوتی۔ لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے ممکن ہے کہ خدا اس کو
> بے نیاز کر دے۔ خواہ مرگ ناگہانی کے ذریعہ یا خود مال عطا کرنے کے سبب۔

مسلمان فطرتاً خوددار اور باوقار ہوتا ہے اور اگر کسی مسلمان میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں تو اُسے اپنے اندر اسلامی

انہ نہیں رہنا چاہئے؟ اسلام نے مسلمان کو جو عزت و شرف بخشا ہے اُس کے آگے دُنیا کی ہر نعمت ہیچ ہے، اس لئے مسلمان کو فقر و فاقہ حالت اور تنگ دستی کے عالم میں بھی خوددار رہنا چاہئے۔ امارت و حکومت کا دبدبہ اور بادشاہوں اور فرمانرواؤں کا شان و شکوہ مسلمان ناز نہیں کرسکتا سادگی، تواضع، شرافت نفس کے ساتھ اسلام اور ایمان سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی ایک جھلک مندرجہ واقعہ میں نظر آسکتی ہے۔

بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ رومیوں سے بیت المقدس کی چابی لینے کے لئے ملک شام کا رہے تھے۔ جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار لشکر اسلام حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ مجاہدین اسلام کے ساتھ آپ کے استقبال کو نکلے۔ جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی جمع تھا۔ تو خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ناقہ سے نیچے اُترے پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لئے اور خود اپنے ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے اور اسی حالت میں اسلام کے یہ جانثار خلیفہ رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھے۔

آپ کی اس شان بے نیازی کو دیکھ کر سپہ سالار لشکر اسلام عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

یا امیر المومنین؟

> یہ آپ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اُتار کر اپنے کندھوں پر ڈال لئے۔ اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ اس کو پانی میں لئے چل رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایسا موقعہ ہے کہ سارا شہر آپ کو دیکھنے کے لئے اُمنڈ آیا ہے۔

اسپر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

> اے ابو عبیدہؓ؟ اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دیکر اُمت محمدیہ کے لئے نمونہ عبرت بناتا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں؟ کہ ہم سب سے ذلیل قوم تھے اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی۔ تو جو عزت خدا نے ہم کو دی اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ ہم اگر عزت چاہیں گے تو خدا ہم کو ذلیل کرے گا۔
>
> (مستدرک حاکم جلد اوّل)

یہ ہے خودی۔ یا مسلمانوں کی عزت نفس۔ لیکن بدقسمتی سے بعض مسلمانوں نے اس خودی کو غرور و تکبر کے مترادف سمجھا ہے حالانکہ خودی غرور یا تکبر نہیں، جیسا کہ حضرت ابوحفص سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

> خودداری (خودی) غرور سے الگ جذبہ ہے۔ وہ اس لئے کہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت جاننے اور اُس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور انکو اس کی جگہ سے اوپر لے جانے کو کہتے ہیں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔

" لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے۔

آپ نے فرمایا۔

غرور نہیں خودداری ہے۔ یہ اسلام کی وہ دولت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں۔
اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں اس کے بعد قرآن کریم کی سورہ
"منافقون" کی آیت العزۃ للہ تلاوت کی۔

غرضیکہ شریعت اسلام کے مطابق خودداری یا خودی ہی شریفانہ رکھ رکھاؤ کی خاطر قدم قدم پر ہر ایک بات پر نظر رکھنا پڑتی ہے کہ کسی بات میں غرور و نمائش کی جھلک پیدا نہ ہو جائے اور خودی یا اپنی عزت نفس میں دوسروں کی تحقیر کا کم سے کم جز بھی شامل نہ ہو۔ ترمذی میں حدیث ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔
اس ارشاد کو سنکر ایک شخص نے عرض کیا۔
مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا پسند ہے (مطلب یہ تھا کہ یہ غرور تو نہیں؟)
ارشاد ہوا کہ۔

خدا تو خود جمال کو پسند کرتا ہے غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور
لوگوں کی تحقیر کی جائے۔

اسلام مسلمانوں کو عزت نفس اور خودداری کی حفاظت کی تعلیم دیتا ہے مگر اہل ہنود "خودی" کو غرور کا مترادف سمجھتے تھے اس لئے اُن کی ویدانت کی یہ تعلیم تھی کہ خودی کو مٹانے اور فنا کرنے سے خدا مل سکتا ہے۔ جو مسلمان اس فلسفہ سے متاثر ہوئے انہوں نے بھی ویدانت کے اس فلسفہ کی لے میں لے ملادی!

خودی یا خودداری کے جذبہ سے متاثر ہو کر مسلمانوں کا یہ عالم بھی چشم فلک اور دیدۂ مہر و انجم نے دیکھا ہے۔
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سردارا
مگر پھر اس قوم پرستی اور زندطیت چھا گئی عجمی تصورات و عقاید کا غلبہ ہوگیا۔ اقبال نے کتنی سچی بات کہی ہے۔
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

یہ مسلمانوں کی غلامی کا دور تھا، ان کی مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی بدحالی انتہا کو پہونچ چکی تھی، حکومت سے محرومی کے ساتھ، دینی اقدار کی حفاظت سے بھی مسلمان عاری ہو چکے تھے یہی وہ زمانہ تھا کہ دوسری قومیں سمندروں میں نئے جزیرے تلاش کر رہی تھیں اور مسلم قوم "اسم" اعظم کی جستجو میں سرگرداں تھی کہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر چند لفظ پڑھے اور کامیابیوں نے قدم چوم لئے۔ "الف لیلے" کے "سم سم" کی تمنا۔

مسلمان قوم پستی کی طرف گرتی رہی، یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانان ہند کی حالت بد سے بدتر ہوگئی، تخت گیا تو گیا، مسلمانوں کے سجادے اور بوریئے بھی تو سلامت نہیں رہے علامہ اقبال نے اپنی تصنیف رموز بیخودی میں اس حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"مسلم از سرّ نبی بیگانہ شد باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

از منات و لات و عُزیٰ و ہُبل — ہر یکے دارد بُتے اندر بغل
شیخ ما از برہمن کافر تر است — زانکہ او را سومنات اندر سر است
رختِ ہستی از عرب برچیدہ — در خمستانِ عجم خوابیدہ

پہ عجم (یعنی مشرق) کی نسبت اقبالؒ کے تاثرات تھے۔ اسلامی ممالک کی انکی نظر میں یہ کیفیت تھی ؎

البلی در دشت خویش از راہ رفت — از دم او سوز الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گرداب نیل — سست رگ تورانیاں زندہ پیل
آل عثمان در شکنج روزگار — مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
عشق را آئین سلمانی نماند — خاک ایراں ماند ایرانی نماند
در مسلماں شان محبوبی نماند — خالدؓ و فاروقؓ - ایوبیؒ نماند

اپنے خیالات و جذبات کے مطابق اقبالؒ نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں غیرت ایمانی (جس کی تفصیل آپ ایمان اور عقل کے تحت آئندہ صفحات میں مطالعہ فرمائینگے) پیدا کرنے کے لئے اپنے فلسفہ خودی کی تلقین کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی — خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل — یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ — خودی کے سوز سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ — گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے — جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن — خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے — قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

خودی کیا ہے؟ راز درون حیات — خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک — من و تو سے پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی — دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی
سُبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں — یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں
اسے واسطہ کیا؟ کم و بیش سے — نشیب و فراز و پس و پیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے
خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اُس کی تاب
وہی ناں ہے اُس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم - یہ بُت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا - یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا جہاں اُس کا صید — زمیں اُس کی صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
اُسے فاشِ عالمِ خوب و زشت — تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ — حقیقت ہے آئینہ - گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس — مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

اسی طرح اقبال نے خودی کی تصریح خود اپنی تصنیف ارمغان حجاز میں کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے —
کہ وجودِ حق سے خودی کا وجود بھی ثابت ہے اور نمودِ حق سے خودی کی نمود ہوئی ہے۔
انسان کے سینے میں خودی کا جو گوہر روشن ہے - اگر دریا کی ہستی نہ ہوتی تو وہ گوہر کس جگہ رہتا گھر بناتا۔؟

قلب مومن جب مٹی کے ساتھ رہنا لام کرلیتا ہے تو
اس پر جمود اور خواب سا ہمیشہ طاری رہتا ہے
اگر من ۔ تن کا حاکم ہے تو من بھی بیدار ہے اور
اگر من محکوم ہوگیا تو تن پر مرگ دوام چھا جاتی ہے

وصل وہی ہے جو ہجر سے بہرہ ور ہو
یہ وہ نکتہ ہے جو اہل نظر کے سوز نظر سے حل ہوسکتا ہے
اگر گوہر، دریا کی گود میں گم ہو چکا ہو
تو اس قرب دریا کو گوہر نہیں کہا جاسکتا ہے

قوم جب محض گفتار کو چھوڑ کر گرم جستجو ہوتی ہے ۔ تو
اس کے جسم کی خاک سے نہال آرزو نمودار ہوتا ہے
یعنی آرزو سے ہی تیری خودی وہ تیغ حقیقت ہے ۔ جس کی
دھار ایک دم میں گل سے رنگ و بو کاٹ دیتی ہے

یہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی اپنی مختصر تصریح ہے جس پر اسلامی تعلیمات کے صدہا صفحات قلمبند کئے جاسکتے ہیں بہرحال اس زدی کو بچئے یا بلا ارادت خود مٹانے کی سب سے زیادہ مبتذل صورت سوال کی ہے ۔ اور سوال کی ذلیل صورت گداگری ہے جس کی اسلام نے نہایت سختی سے ممانعت کی ہے ۔ حدیث شریف میں آیا ہے ۔

"جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا
کہ اسکے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا ۔

یعنی یہ اسکی اس حالت کی تصویر ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت اور آبرو مٹا دی ۔
ایک روایت یہ بھی ہے کہ چند انصار رضؓ نے جو نہایت غریب تھے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے کچھ مانگا آپ نے دیدیا ۔
انہوں نے پھر سوال کیا آپ نے پھر دیا ۔ لیکن جب مال غنیمت ختم ہو چکا تو فرمایا ۔

"جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے ۔ خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور
جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص
صبر کرنا چاہتا ہے ۔ خدا اس کو صبر دیتا ہے خدا نے صبر سے بہتر عطیہ کسی کو نہیں دیا ۔

روزمرہ کے معمولی کاموں میں بھی اکثر لوگ اگرچہ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا برا نہیں سمجھتے ۔ لیکن خودداری خودی کا کمال یہ ہے کہ اس قسم کی اعانت ہیں میں بھی احتیاط رکھی جائے ۔ مثلاً اگر ایک شخص کسی سے یہ سوال کرے ۔ کہ وہ ٹوپی اٹھادو ۔ یا یہ کتاب میز پر رکھدو ۔ تو بظاہر ایسے سوالات اگرچہ خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتے لیکن اگر کوئی ناگواری کے [illegible] خودداری کو صدمہ پہنچ سکتا ہے ۔ اس لئے کمال خودی یہ ہے کہ ایسے سوالات بھی نہ کئے جائیں

چنانچہ ابوداؤد میں ایسی بہت سی احادیث ہیں جن میں ایسے سوالات نہ کرنے کی مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے۔ ایک حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ بھی تھی۔

"تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا"

انہی مسلمانوں میں سے بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اس حدیث کی اس شدت سے تعمیل کی کہ کسی سوار کا کوڑا زمین پر گر جاتا تھا تو کسی راہرو سے اسکے اٹھانے کی درخواست نہ کرتا بلکہ خود سواری سے اُتر کر اپنا کوڑا سے اٹھا کر پھر سوار ہو جاتا۔

"خودی" کی شرح کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ اس لفظ سے ملت اسلامیہ کی پوری تاریخ والستہ ہے، جب یہ معراج پر ہوتی ہے، تو خدا بندے سے پوچھتا ہے۔

بتا تیری رضا کیا ہے؟

باغ و بہار

شیر افضل جعفری

جو نہ مقبول ہو دُعا ہی نہیں — نہ سنے جو کبھی خدا ہی نہیں
قلب درویش کی خدائی میں — ما سوا اللہ کا پتا ہی نہیں
رزق خود اُس کو آکے ملتا ہے — فقر قسمت کو ڈھونڈتا ہی نہیں
طفل مکتب ہے وہ کہ جس نے ابھی — باب صبر و رضا پڑھا ہی نہیں

ہم ازل سے ملنگ ہیں افضل
قیصری اپنا مدعا ہی نہیں

راج بہار (امرتسر)

عشق میں سرفراز ہیں ہم لوگ — صاحب امتیاز ہیں ہم لوگ
پوچھنا کیا ہماری ہستی کا — تیری ہستی کا راز ہیں ہم لوگ
ہر مصیبت کو ناز ہے جن پر — وہ مصیبت نواز ہیں ہم لوگ
شمع روئی ہے دیکھ کر جن کو — وہ سراپا گداز ہیں ہم لوگ
معصیت اور تصور رحمت — کس قدر پاکباز ہیں ہم لوگ
نغمہ دار ہو کہ بزم وفا — ہر جگہ سرفراز ہیں ہم لوگ

کیوں نہ رنگیں ہو نغمہ اپنا بہار
بربطِ سوز و ساز ہیں ہم لوگ

وحید تابش

ہر نئے موڑ پہ اک زخم نیا دیتے ہیں — دوست کیا خوب وفاؤں کا صلہ دیتے ہیں
کیسے ممکن ہے دھواں بھی نہ اٹھے دل بھی جلے — چوٹ پڑتی ہے تو پتھر بھی صدا دیتے ہیں
تم سے تو خیر گھڑی بھر کی ملاقات رہی — لوگ برسوں کی رفاقت کو بھلا دیتے ہیں
کون ہوتا ہے، مصیبت میں کسی کا اے دوست — آگ لگتی ہے تو پتے بھی ہوا دیتے ہیں
اب تو دن میں بھی جو آتا ہے شب غم کا خیال — جوش وحشت میں چراغوں کو جلا دیتے ہیں

حسن پہ ہوتا ہے بہت دل کو بھروسا تابشؔ
وقت پڑنے پہ وہی لوگ دغا دیتے ہیں

زمزمہ نعت

علامہ محوی صدیقی لکھنوی

مرے دل میں ہے عکس روئے جانانہ محمدؐ کا
خدا آباد رکھے یہ جلو خانہ محمدؐ کا

نگاہیں اہل دل کی تاب نظارہ نہ لاتی تھیں
یہ تھا حسن ازل، یا حسن جانانہ محمدؐ کا

دکھائے کاش! پھر لے انقلاب دہر دنیا کو
جو تو نے تھا ٹھاٹھ دیکھا ہے فقیرانہ محمدؐ کا

الٹ دیں جس نے دم بھر میں صفیں ایران درِ روما کی
کبھی ایسا بھی تھا ایک ایک دیوانہ محمدؐ کا

نشاط دو جہاں کا میں اسے حاصل سمجھتا ہوں
قیامت تک رہے یارب یہ میخانہ محمدؐ کا

کہاں وہ طور کا جلوہ کہاں معراج کا عالم
وصالِ دوست تھا سب سے جداگانہ محمدؐ کا

وارث القادری

قسم خدا کی بہ عنوان فیض عام چلا
رسول پاک سے انسانیت کا نام چلا

زمیں کا نظم نہ افلاک کا نظام چلا
بغیر اُن کے کسی کا نہ کوئی کام چلا

یہ سلسلہ مری جانب سے صبح و شام چلا
صبا چلی کہ ادھر یہ سلام چلا

یہ راہ قدس ہے اس پر چلے تو سر سے چلے
وہ کیا چلا جو مدینے بقید گام چلا

خدا کی ساری خدائی کا پیشوا تو ہے
نظام خلق ترے زیر اہتمام چلا

ترے ہی رخ نے عطا کی دلوں کو تابانی
تری ہی زلف سے رنگِ سواد شام چلا

جہاں کو تو نے دیا درس دین و دانش کا
کسی کی کچھ نہ چلی جب ترا پیام چلا

زہے نصیب کہ وارث چلے تو لوگ کہیں
حضور سرور کونین کا غلام چلا

شفا گوالیاری

یہ دیکھا ہے جہاں تک نقش پائے ناز تھے اُن کے
وہیں تک آفتاب آیا وہیں تک ماہتاب آیا

ہمیشہ ہم نے ترتیب طلوع صبح یوں دیکھی
کہ پہلے وہ نظر آئے، نظر پھر آفتاب آیا

فانی بدایونی

دونوں جہان آئینہ دکھلا کے رہ گئے
لانا پڑا تمھی کو تمھاری مثال میں

ضیا احمد بدایونی

جمہوریت کی سچی جھلک

ب ہوا دورِ خلافت عمرِ ثانی کا — آئی اسلام کے پژمردہ گلستاں میں بہار

س جگہ جائیے تھا دینِ ہدیٰ کا چرچا — جس طرف دیکھئے تھی ذکرِ خدا کی تکرار

شحۂ فیض سے ہر ایک زمیں رشکِ بہشت — لمعۂ عدل سے ہر ایک گلی پُر انوار

ہ خلافت کہ ہے منہاجِ نبوت کا نشاں — اُس میں اس عہدِ خجستہ کا بھی ہوتا ہے شمار

ستِ حیدرؓ اُموی دور کی رسمِ مذموم — آپ نے ساری قلمرو سے اٹھا دی اک بار

رے احکام کہ جاگیروں کے فرماں لے کر — جمع ہوں مسجدِ جامع میں صغار و کبار

گئے سب تو یہ ارشاد کیا حضرت نے — ظلم و بیداد سے ہے خالقِ اکبر بیزار

بسکہ اولادِ اُمیہ نے شریعت کے خلاف — چھین کر حقِ عوام اپنے بھرے تھے گھر بار

اب یہ لازم ہے کہ حقداروں کو واپس ہو یہ مال — کہ مجھے حشر میں پکڑے نہ خدائے جبار

سب سے پہلے جو مرے نام کی ہے دستاویز — چاک کرتا ہوں کہ ہے اس سے مری رُوح پہ بار

پھر وہیں آپ نے اک اک کو طلب فرما کر — جتنے فرمان تھے سب چاک کئے آخرکار

رو درم اپنے لئے کر کے خزانے سے قبول — تازہ کی آپ نے اسلاف کی شانِ ایثار

فاطمہ نام جو تھیں آپکی خاتونِ حرم — آئے ملنے کے لئے اُن کے برادر اک بار

دیکھا تن پر ہے خلیفہ کے وہ ملبوس کثیف — مردِ بے مایہ کو بھی آئے پہن کر جسے عار

کہا ہمشیر سے تم کاش اسے دھو دیتیں — کہ یہ جامہ نہیں ان کیلئے شایاں زنہار

بولیں مجبور ہوں گھر میں نہیں کپڑا کوئی — تاکریں زیبِ بدن اُس کو جو دیں اِس کو اُتار

یہ وہ سیرت ہے کہ انصاف بھی ہو جس پہ فدا! — یہ وہ خصلت ہے کہ تہذیب بھی ہے جس پہ نثار

سے جھیلتے رہتے مگر انھیں حاکم و والی نہ بنایا جائے۔

اس انداز بیان سے کیا صریح طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ امارت و سیادت کا منصب کتنا خطرناک اور اخروی نقطۂ نظر سے کیسا سخت امتحان ہے۔ واضح لفظوں میں فرمادیا گیا کہ:-

کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ پھر حضورؐ نے خوب کھول کر یہ بھی فرمایا کہ:-

> پس سردار و حاکم اس پوری رعایا کے بارے میں مسئول ہے
> جس پر وہ سردار بنایا گیا ہے اور ہر اہل و عیال والا آدمی اپنے
> اہل بیت کے بارے میں مسئول ہے اور ہر عورت اپنے شوہر کے
> گھر اور اولاد کے بارے میں مسئول ہے اور ہر غلام اپنے مالک کے
> اموال و حقوق کے بارے میں مسئول ہے۔ (بخاری و مسلم)

اب سوچیئے کہ حشر کے دن اُس امام و امیر کا کیا حال ہوگا جس پر دس بیس سو پچاس کی نہیں کروڑوں افراد کی سرداری و سیادت کی ذمہ داری رہی ہو اور پھر اس سے سوال پر سوال کیا جائے کہ کہاں کس کس کے ساتھ تم نے انصاف کیا ہے یا ظلم؟ کون کون سے معاملے میں تم نے دیانت و حق شعاری کا رویہ اختیار کیا ہے یا خود غرضی و مفاد پرستی کا۔؟

یہی تو وہ عظیم ذمہ داری ہے جس کی بنا پر ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے جلیل القدر لوگ بارِ امامت اُٹھاتے وقت کانپ کانپ گئے تھے اور پھر ان کا پورا دورِ امامت ایک ایسے غلام کی حیثیت میں گذرا تھا جسے دن رات کام ہی کام ہو جس کے لئے چین عیش و راحت اور فراغت و سکون حرام ہوگیا ہو۔

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا۔ اِنَّھَا اَمَانَۃٌ۔ سرداری تو امانت ہے۔ پھر فرمایا۔ مَا مِنْ وَالٍ یَلِی رَعِیَّۃً مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَیَمُوْتُ وَھُوَ غَاشٌّ لَھُمْ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ۔ کوئی بھی والی و حاکم جسے مسلمانوں امیر بنادیا گیا ہو اگر اس امانت میں خیانت کرے گا تو اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ اس پر جنت کو حرام کردے گا۔

اور ایک موقعہ پر اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ:-

> وہ سردار جو ظلم روا رکھتا ہو قیامت کے دن اللہ کی نگاہ
> میں بدترین شخص ہوگا اور اسے شدید عذاب دیا جائے گا۔ (ترمذی)

خزانۂ حدیث سے یہ چند موتی ہم نے آپ کے سامنے رکھے تاکہ دنیا کی دھوم دھام میں کھویا ہوا دماغ اُس حقیقت کی طرف بھی توجہ دے سکے جو حقیقت کبریٰ ہے جس سے مفر نہیں ہے۔ جو اٹل ہے۔ جس سے بہت جلد سب کو دوچار ہونا ہے۔ اب ہم یہ بتلاتے ہیں کہ شدیداً نمائش کی اس پل صراط سے کامیاب گذر جانے کی توقع ہمیں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کیوں نہیں۔

یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اُن قوم پرستوں میں نہیں ہیں جنھوں نے اپنی قوم پرستی کو مستند بنانے کی خاطر دین و ایمان کے موتی حزف ریزوں کے مول بیچ دیئے۔ الحمدللہ ان کا ایمان و اسلام خاصا جاندار ہے ــــ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ صدر منتخب ہونے کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب سب سے پہلے گاندھی اور جواہر لال کی سمادھیوں پر حاضری دیتے ہیں اور

ایسے گیان دھیان کا مظاہرہ کرتے ہیں جسے خود ان کے اسلامی نقطۂ نظر سے ایک ناٹک کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا تو پھر بادل ناخواستہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ گاڑی ٹھوس قسم کے عدل و امانت اور دیانت و حق پرستی کی لائن پر چلنے والی نہیں ——— بلکہ اس نام نہاد قوم پرستی اور وطن دوستی کی پٹری پر چلنے والی ہے جو بے لاگ انصاف اور حق و صداقت کے کسی اسٹیشن سے نہیں گذرتی۔

آپ کہیں گے کہ جمہوریہ ہند کا صدر کسی اسلامی اسٹیٹ کا صدر نہیں جس کے سلسلے میں حق و صداقت جیسے مقدس اور مذہب کے رنگ میں رنگے ہوئے الفاظ کے استعمال کا جواز ہو وہ تو ایک سیکولر اسٹیٹ کا صدر ہے جو مذہب و ملت کے امتیازات سے بالاتر ہے۔

ہم جواب دیں گے کہ عزت مآب صدر جمہوریہ کا یہ ابتدائی عمل ہی عین اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اُس سیکولر ازم کی خدمت کا عزم نہیں رکھتے جس کا ڈنکا سارے زمانے میں پیٹا جا رہا ہے اور جس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ حکومت کو کسی بھی مذہب و ملت سے کوئی سروکار نہیں اور اس کے مختلف افراد ذاتی حیثیت میں خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں مگر ان کی حاکمانہ حیثیت مذہبی فرق و امتیاز سے بالاتر ہے۔ اس سیکولر ازم کی ایماندارانہ خدمت اگر پیش نظر ہوتی تو کوئی منطقی جواز گاندھی اور جواہر لال کی سمادھیوں پر حاضری اور مراقبے کا نہیں تھا۔ ایک صاحب علم مسلمان کی حیثیت میں عزت مآب ڈاکٹر صاحب خوب جانتے ہوں گے کہ کسی غیر مسلم کی سمادھی سے عقیدت مندانہ تعلق اور نیازمندانہ لگاؤ نہ صرف یہ کہ اسلام میں کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ اسلامی شریعت اسے مذموم قرار دیتی ہے پھر کونسی چیز تھی جو انہیں اس طرف لے گئی۔ آداب صدارت میں اگر باضابطہ یہ چیز شامل ہے کہ ہر نیا صدر اسی طرز عمل کا مظاہرہ کرے تو مذہبی غیر جانب داری کے دعوے لغو۔ یہ تو کھلی مذہبی جانبداری ہے کہ آداب صدارت میں ایک ایسا بھی عمل شامل کر لیا جائے جو ملک کے کروڑوں افراد کی نظر میں اکثریتی مذہب کے مطابق اور ان کے اپنے عقیدۂ خیال کے منافی ہو۔

اگر یہ چیز آداب ضروریہ میں شامل نہیں ہے بلکہ عزت مآب خود ہی اپنی خوشی سے اس پر عمل پیرا ہوئے تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ شعوری یا نیم شعوری طور پر صرف اسی سیکولر ازم کی خدمت کر سکیں گے جو اکثریتی طبقے کے مذہبی مطالبات کو قومی حقوق کہتا ہے مگر اقلیتی فرقے کے ہر احتجاج کو فرقہ واریت کا نام دیتا ہے یہ سیکولر ازم مفاد پرستانہ حکمت و سیاست سے عبارت ہے۔ اس میں بے لاگ عدل کو پہلا درجہ حاصل نہیں بلکہ پہلا درجہ عہدوں کی بقا، اکثریت کی رضا جوئی اور اعلیٰ درجے کی چرب زبانی یا مکمل تغافل اور استغنا، کو حاصل ہے۔

قلم کو حد ادب میں رہنا چاہیئے کہ اب ڈاکٹر صاحب ہم سب کے صدر بن چکے ہیں۔ مبارک۔ مرحبا۔ اکیلا اُردو ہی کا مسئلہ بتا دے گا کہ صدارت عظمیٰ کی قابل رشک نعمت ڈاکٹر صاحب کے حق میں واقعۃً بھی نعمت ہی ہے یا ایک ایسا خوبصورت انگارہ ہے جو نظروں کو تو بھلا لگ رہا ہے لیکن بہت جلد یہ سب کچھ جلا کر راکھ کر دے گا۔ اے اللہ۔ ہمارے نئے صدر کو دوزخ کی آگ سے بچانا اور اپنے فضلِ خاص سے حق و دیانت کی راہ چلنے کی توفیق دینا۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ مروجہ جمہوری نظامِ حکومت میں صدر کی حیثیت عملی اعتبار سے فرماں روا اور حاکم اعلیٰ کی نہیں ہوتی بلکہ وہ تو ایک اعزازی سربراہ ہوتا ہے جس سے رسمی و روایتی کارروائیوں کے علاوہ کسی بھی اقدام و عمل کی توقع نہیں کی جاتی اور جس کی پالیسیوں کے سانچے وزراء کی ٹیم تیار کرتی ہے یا زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اس کی اپنی کوئی

پالیسی نہیں ہوتی بلکہ بحیثیت عاملہ ہی کی پالیسیاں بطور ضابطہ اس کی طرف منسوب ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ایسے حقیقی اقتدار و اختیار کے نقطۂ نظر سے شاہ شطرنج تو کہہ سکتے ہیں امیر و تانا نہیں کہہ سکتے۔ پھر یہ کیونکر درست ہوگا کہ اُس پر اُن احادیث کو منطبق کیا جائے جن کا مصداق ایسے حکام و اُمرا ہو سکتے ہیں جنھیں واقعتہً اقتدار و اختیار حاصل ہو۔

ہم جواب دیں گے کہ دستور ہند پر نظر ڈالئے۔ اس میں واضح طور پر صدر کو عاملہ کا حاکم اوّل قرار دے کر تمام اختیارات کا مالک بنایا گیا ہے اور ایسی کوئی آئینی بندش اس پر نہیں لگائی گئی کہ وہ وزراء کی ٹیم سے اجازت لئے بغیر کچھ کر ہی نہ سکے لہٰذا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ وہ مختار و مقتدر نہیں ہے۔ اگر اب تک کا اسوہ یہی رہا ہو کہ صدر صاحبان دستخط اور تقریر کرنے کے سوا کچھ نہ کرتے ہوں تو اسے "کمزوری" تو کہا جا سکتا ہے آئین و قانون نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بحث نازک اور لطیف ہے ضروری نہیں کہ ہم تفصیل میں جائیں مستقبل خود ہی بتا دے گا کہ آج ہم نے جس پہلو کی نشاندہی کی ہے کل وہ کن تفصیلات کو سامنے لائیگا۔ و للہ عاقبۃ الامور۔

ہماری نظر میں

فکر تعمیر از :- جناب ملک خدا بخش ضخامت ۲۴۰ صفحات (رنگین سرورق) قیمت قسم اول دس روپے قسم دوم چھ روپے، ملنے کا پتہ ۔ مکتبۂ تعمیر فکر ۔ ۱۰ ۔ فرینڈز ۔ کالونی ملتان روڈ، لاہور ۔

اس کتاب میں جناب ملک خدا بخش وزیر خوراک و زراعت مغربی پاکستان کے مضامین و تقاریر کو یکجا کر کے شائع کیا گیا ہیں لفظ کی مندرجہ ذیل عبارت ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صاحب کتاب کے ذہن و فکر کس قدر دینی اور اخلاقی ہیں۔

"پاکستان اسلام کا حصار ہے، اور اگر ہمیں اسلام عزیز نہیں تو پاکستان سے محبت کی اساس کیا ہے؟ ہماری وطن دوستی کے نعرے کھوکھلے بودے اور بے معنیٰ ہیں ۔ توحید پرست اگر وطن کے بت کی پرستش کرنا شروع کر دیں، تو ان میں اور برہمنوں میں کیا فرق ہے، جن کروروں بتوں میں ایک بت وطن کا بھی ہے، پاکستان سے ہم اس لئے محبت کرتے ہیں کہ اسلام کا حصار ہے ۔"

اس کتاب کے تین ابواب ہیں ۔
تعلیم ــــ تاریخ و ثقافت ـــــ اور زراعت ! ان میں سے ہر موضوع پر جو مضمون اور تقریر اس مجموعے کی زینت ہے فکر و خیال اور ساتھ ہی زبان و ادب کے اعتبار سے خوب نہیں بہت خوب ہے ـــ چند اقتباسات ـــ

• ـــ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری ہستی اسلام کی بدولت قائم ہے، وہی ہماری تخلیق کے وقت ہمارے کام آیا اور وہی تکلیف کے وقت ہمارے کام آیا، پاکستان بنا ہی اسی کی برکت سے اور اب بچا بھی اس کے کرشمے سے۔ یہ معجزہ دوبار ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں ۔"

• ـــ سائنس اور ٹکنالوجی کے علوم انسان کو بے پناہ طبعی قوت تو فراہم کر دیتے ہیں، لیکن جب علوم و فنون ایمان کے تابع نہیں رہتے تو سراسر شیطنت اور انسان کی ہلاکت و بربادی کا سامان بن جاتے ہیں ۔

• ـــ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے تو اسلام کا ذکر بھی بار خاطر بن جائے اور دوسری طرف جسٹس کارنیلس جیسے پاک باطن انسان کی نظر ہمارے مرض کا علاج اسلام کی شفا بخش تاثیر میں ڈھونڈ لے !

لہـذا

میں اسلام کا بار بار ذکر کرنے میں نہ تو کوئی شرم محسوس کرتا ہوں اور نہ اس کے لئے معذرت پیش کرنے کی کوئی ضرورت سمجھتا ہوں، بلکہ صمیم قلب کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ ہماری قومی زندگی اسلام ہی سے قائم ہے، ہماری اجتماعی شاخ زیست اسلام ہی کے شجر شاداب سے پھوٹی ہے یہ کوئی عارضی جھلک، برق کی چشمک یا تبسم شرارہ نہ تھا، بلکہ دل و دماغ کی توانائیوں کی جولاں گاہ تھی یہی وہ منبع رشد و ہدایت تھا جہاں سے ہمیں روحانی فیوض و فضائل کے علاوہ قومیت کا اسلامی تصور اور شجر فطرت کا راسخ نظریہ ملا۔ اگر ہم اس شجر طیبہ سے کٹ گئے، تو اس سے نہ صرف ہمارے انفرادی اور قومی خد و خال دھندلا جائیں گے بلکہ وہ شجر بھی مجروح ہوگا جس کی آبیاری بہ حیثیت مسلمان ہمارا فرض ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ

● ــــ غیرت و شجاعت کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہمارے شیر دل عساکر کے شجاعانہ کارناموں کی وجوہ کیا تھیں، تو میں یقیناً ایک وجہ یہ ہی گنواؤں گا کہ ہمارے مسلمان نوجی جوان اور افسروں کا بے مثال جذبہ غیرت جو اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے تحفظ عصمت کے جذبہ کا نتیجہ تھا جس طور سے انھوں نے بے محابا و بے دریغ اپنی گردنیں کٹوائیں اور اپنا خون بہایا، کیا اس کا یہ تقاضا نہیں کہ قوم کی بہنیں اور بیٹیاں اپنے کردار و گفتار میں عصمت کی نگہبانی ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور اپنی نظر نیچی رکھیں ــــ غیر اسلامی بناؤ سنگھار سے احتراز کریں، شرم و حیا کو جو بقول رسولِ مقبول ایمان ہی کی ایک شاخ ہے بلکہ نصف الایمان ہے، شیوۂ زندگی بنائیں۔

● ــــ لیکن اگر ہماری تعلیم صرف یہی سکھلائے کہ حق و باطل کا معیار صرف وہی ہے، جو مغربی دانشوروں کی عقل پیمانہ جو نے قائم کر رکھا ہے، ہم اگر سوچیں تو برٹرنڈرسل اور ہکسلے کے ذہن سے اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے قرآن اور فرمان رسول کی بجائے کسی معروف مغربی شخصیت کا قول زیادہ معتبر نظر آئے معاشی نظریات کے لئے ہمیں مارکس اور اینجلز کی طرف رجوع کرنا پڑے اور اپنے نظام اخلاق کو فرائڈ اور میکڈگل ہی کے نظریات کی کسوٹی پر پرکھنا ناگزیر نظر آئے، تو ہمارے تمدن کی موت یقینی ہے۔

از فرنگی می خرد لات و منات

مومن و اندیشہ او سومنات

● ــــ میں اپنے ملک کے ان فاضل اساتذہ سے بھی جو اسلام کی سربلندی کے لئے کچھ کام کرنے کا جذبہ اور حوصلہ رکھتے ہیں، توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے اپنے مضامین کے نصاب پر اسلامی نقطہ نظر سے اپنے علمی تجربہ کی روشنی میں گہری تنقیدی نگاہ ڈال کر اس کی نظر ثانی کریں، اور ایسی نصابی کتب تیار کریں، جن سے علوم جدید کے علم و حکمت کو تو ہم اپنی گمشدہ میراث سمجھ کر اپنا لیں، لیکن تعلیم کی لائی ہوئی فراغت کے ساتھ الحاد و لادینیت ہمارے ہاں راہ نہ پا سکیں، بلکہ اس کی جگہ لوگوں میں اسلامی عقائد اسلام میں خواتین کی پختہ خیالی اور مضبوط اخلاق اس کے لئے بنیاد مہیا کرتے ہیں۔

● ــــ مغرب کا المیہ یہ ہے کہ وہاں علم تو ہے، لیکن علم کو رحمت بنانے والی روحانیت نہیں

زبی مفکر اور دانش ور اس کی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں!

ـــ اچھائیوں کے حصول کے ساتھ مغربی تہذیب کی برائیوں سے بھی ہمارے لئے بچنا لازمی ہے، مثال
رعریانی، ننگ انسانیت اور ننگ آدمیت ہے، مرد و زن کا آزادانہ اختلاط ہمارے لئے سخت مہلک
رح کو خوابیدہ اور جسم کو بیدار رکھنے کی کوشش ہرگز مستحسن نہیں ہو سکتی۔

ـــ بدقسمتی سے دین کے غلط تصور کی وجہ سے روح و مادہ، دین و دُنیا اور مذہب و سیاست
ی نے ہمارے یہاں دو مختلف تعلیمی نظام پیدا کر رکھے ہیں، جن سے دو متضاد قسم کی شخصیتیں
ر مولوی) تیار ہو کر نکلتی ہیں۔

ـــ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں ان ایمانی کیفیات کو دلوں میں واضح کرنے کا
رنا چاہیئے، کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہمارے دل ذکر الٰہی سے جھک جائیں اور ہم صبر و نماز
تعانت پکڑیں۔

ـــ میں اس موقع پر بھی اپنے اس عقیدے کا برملا اعلان اور فخریہ اظہار کرنے میں کوئی
حسوس نہیں کرتا کہ ادب میں ہماری آخری منزل اسلام ہے، میں آج تک اس بات کو نہیں
ا کہ بعض حلقوں کی طرف سے ادب کو سیکولر رکھنے پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے اور ہمارے
اور شاعر ادب کے معاملے میں اسلام کے نام سے اس قدر گریزاں کیوں ہیں؟ اگر ہمارے
ادر شاعر اپنے آپ کو مسلمان کہلانے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے اور اگر اُن کا اسلامی
ی کی برتری پر ایمان ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ وہ ادبی تخلیقات میں اپنے مسلمان کی جھلک نہ دکھائیں
امی اقدار کے اظہار میں شرم محسوس کریں۔

ـــ جب تک ہمارا آدرش، ہماری اقدار اور اسلامی روایات ادیب کے فنکارانہ وجود میں جڑ نہیں پکڑیں گی
دب کی فضا میں برگ و بار لانے کا موقع نہیں مل سکے گا، پھر انہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ اُن کا منصب
ی نہیں ہے کہ "ہست" (is) کو پیش کریں بلکہ انہیں "باید" (OUGHT) کو بھی پیش کرنا ہوتا ہے، اس
اس میں ہے کہ اُن کی ہر تحریر قاری کے دل میں "تخلقوا باخلاق اللہ" کے فرمان نبوی کو اپنانے
ب پیدا کرے۔"

ـــ چونکہ زراعت کا ایک انداز زیست بھی ہے اس لئے ایک کاشتکار کی سوچ اور فکر کے سوتے اسی
ے پھوٹتے ہیں اور اس کے نظریات کا تانا بانا یہیں سے تیار ہوتا ہے، اور زراعت چونکہ ایک ایسی صنعت ہے جس میں پیدائش سے لیکر موت تک ایک انسان کو اپنی زندگی ایک ایسی کھلی فضا میں گزارنی پڑتی ہے جہاں زمین و آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل
ان فطرت سے قریب تر ہونے کے سبب ہمیشہ خدا پرست ہوتا ہے۔

کتاب کا یہی رنگ ہے شروع سے آخر تک دین و دانش اور خیر و حکمت کی باتیں ملتی ہیں، اگر عزت مآب
صاحب کی طرح پاکستان کا اعلیٰ طبقہ اسی رنگ میں رنگ جائے اور سب کا زاویہ فکر و نظر [illegible]
جائے، تو عوام اور حکومت کے درمیان کامل ہم آہنگی پیدا ہو جائے اور اللہ کے دین کو پاکستان میں [illegible]

ملک صاحب موصوف ان مضامین و تقاریر پر دینی طبقوں کی طرف سے داد و ستائش کے مستحق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر۔

السہم الحدید بجواب نتائج التقلید
از:- مولانا سید امین الحق، خطیب جامع شیخو پورہ
ضخامت ۲۵۰ صفحات مطبوعہ استقلال پریس لاہور ۔

کوئی صاحب حکیم محمد اشرف سندھو ہیں، انھوں نے "نتائج التقلید" نام کی کتاب تصنیف کی ہے۔ یہ صاحب اہلِ حدیث مسلک رکھتے ہیں، تقلید کا رد کرتے ہوئے انھوں نے بعض اکابر دیوبند، یہاں تک کہ حضرت سیدنا ابوحنیفہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ہدف طنز بنانے سے گریز نہیں کیا اس کے جواب میں مولانا سید امین الحق صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے ۔

کتاب زیر تنقید میں فاضل مصنف نے حضرت امام اعظم کی مدافعت کا حق ادا کر دیا ہے ___ مثلاً حافظ دارقطنی نے امام ابوحنیفہ کی تضعیف کی ہے، مولانا سید امین الحق نے اس کے جواب میں نقلی و عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ۔

" حافظ دارقطنی شافعی المذہب ہیں اور مذہب کی حمایت میں صحیح اور سقیم روایت میں فرق نہیں کرتے ۔ . .
. . . ابن ابی لیلیٰ ایک راوی ہے، جب اس کی روایت کو اپنے مسلک کے موافق دیکھتے ہیں تو اس کی توثیق کرتے ہیں، اور جب اس کی روایت کو اپنے مسلک کے خلاف روایت کرتے ہیں تو اس کی تضعیف کی ہے اور سئی الحفظ اور کثیر الوہم بتایا ہے یہی زیادتی اور تعصب کی قسم ہے، کیا توقع ہو سکتی ہے کہ حافظ دارقطنی امام ابوحنیفہ کے بارے میں انصاف کریں گے "

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ صغیر میں بعض باتیں ایسی لکھی ہیں جن سے امام اعظم پر طنز و تعریض کا پہلو نکلتا ہے اس جرح کی تعدیل میں فاضل مصنف نے لکھا ہے ۔

" امام بخاری بال کی کھال نکالنے والے ہیں مگر صرف حمیدی اور نعیم کے اعتماد پر ابوحنیفہؒ کے بارے میں ایسی نقل کی ہیں جو اُن کے شایانِ شان نہ تھیں، حمیدی فقہاء عراق کے خلاف بُرے کلمات استعمال کرتے تھے . . . . !
اور ابوالفتح ازدی اور دولابی فرماتے ہیں کہ نعیم تقویت سنت کے لئے حدیث وضع کیا کرتے تھے اور ابو حنیفہ کے خلاف عیب لگانے میں جھوٹی حکایات گھڑا کرتے تھے ۔ (میزان الاعتدال)

اور

"بخاری کی شان تو بڑی ہے مگر بخاریؒ نے بھی نعیم جیسے جھوٹے کی جھوٹی حکایات کو تاریخ میں امام ابوحنیفہ کے خلاف روایت کر دیا ہے ۔
حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں ۔
لوگوں نے امام ابوحنیفہ کو بدنام کرنے اور ذلیل کرنے کے لئے ایسی باتیں ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کی ہیں، جو قطعاً جھوٹ ہیں۔ جیسے خنزیر بری وغیرہ مسائل، اور ابوحنیفہ کے علم میں فقہ میں اور فہم میں کوئی ایک آدمی بھی شک نہیں کر سکتا "

بعض لوگوں نے حضرت امام اعظم پر یہ تہمتیں بھی لگائیں کہ "وہ قرآن کو مخلوق بتلاتے تھے یا ابوحنیفہ سے دو مرتبہ کفر سے توبہ کرائی گئی" ! فاضل مصنف نے ان تہمتوں کو بے اصل ثابت کیا ہے ۔

اس کتاب میں اگلے پچھلے اکابر علماء کی رائیں کتابوں کے حوالوں کے ساتھ درج کی گئی ہیں جن سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی عظمت و جلالت اور امانت و تقوی ثابت ہوتی ہے۔

"نتائج التقلید" کے مصنف نے کیسی واہی تباہی باتیں لکھی ہیں۔

"کیونکہ یہ مسلّمہ امر اور آخری اور قطعی حیثیت ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نام کے ساتھ محدث یا امام فن حدیث کا لفظ برائے نام بھی کتب تاریخ و اسلام اور اسماء الرجال و طبقات میں نہیں ہے"

حالانکہ بعض دوسرے محدثین تو فن حدیث کے "عطار" ہیں اور ابوحنیفہ "طبیب حاذق" ہیں، احادیث کے جانچنے کی جیسی صلاحیت اُن کو تھی کم ہی اکابر کو ایسی صلاحیت میسر آئی ہے، وہ اہل حدیث بدنصیب اور کج فہم ہیں جو حنیفہ قدس سرہ پر جرح و طعن کو اہل حدیث کا مسلک سمجھے ہوئے ہیں۔

مولانا سید امین الحق خطیب نے بھی تحریر میں۔

کہ بہ شمشیر تواں داد جواب شمشیر

کا رنگ اختیار کیا ہے، اور کہیں اُن کا انداز بیان اس حد تک سخت ہو گیا ہے فرماتے ہیں۔

"غیر مقلدین کی بد زبانی کی شکایت سب کو ہے اور غیر مقلدین کی جماعت اور فرقہ کو اچھا نہیں جانتے اور اس کی بنیادی "کھوٹ" وہی ہے، جس کو رسالت مآب نے نفاق کی خصلتوں میں بیان فرمایا"

غیر مقلدین سے "نفاق" کی عام نسبت ایک طرح کی زیادتی ہے، جس طرح جمل و صفین کا اعادہ کوئی ثواب کوئی بات ہے اسی طرح اکابر کے درمیان جو علمی مشاجرت رہی ہے اس کی تجدید و احیاء بھی کوئی قابل تحسین فعل نہیں ہے۔ حضرت حنیفہ انسان تھے فرشتہ یا نبی نہیں تھے مگر اُن کی ذات اور اُن کے دینی کارنامے تنقید سے زیادہ توصیف کے مستحق ہیں

قرأت سیدنا عاصم کوفیؒ | از:- ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی ضخامت ۵۰ صفحات، قیمت پچاس پیسے، کوٹ ملنے کا پتہ:- قاری سید عبد الرحیم استاد دار القرآت و الدینیات بازار نور الامراء حیدرآباد دکن

جناب ڈاکٹر سید کلیم اللہ حسینی کی کئی کتابیں قرأت و تجوید پر آ چکی ہیں، اس کتابچہ میں انھوں نے امام شعبہ اور امام حفص قرأتوں کے اختلاف کی فہرست درج کی ہے ــــ مثلاً:-

امام شعبہ "زکریاء" کو ہمزہ کے اضافہ کے ساتھ قرأت کرتے تھے مگر امام حفص بغیر ہمزہ (زکریا) کے!

اور

امام شعبہؒ	امام حفص
رُضوان	رِضوان
بِیوتکم	بُیوتکم
تَلقَّفُ	تَلقَفُ
سُدًّا	سَدًّا

مگر عام شہرت حضرت حفص رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت کو حاصل ہوئی اور یہی سب سے آسان اور مروج و مقبول قرأت ہے۔

اہلبیت اور اہلسنت | از:- محمد سراج الحق مچھلی شہری، ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتہ:- مفتاحی بک ایجنسی ہٹونا تھ بھنجن اعظم گڈھ (یو-پی)

کتاب کے سرورق پر لکھا ہے :-
"جن میں اہل سنت کی اُن غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے* جو اُن سے اہلبیت رسول کے باب میں ہوئی اور ہوتی رہتی ہیں"

مثلاً (۱) صحابہؓ میں دولت باطنی کے لحاظ سے جو درجہ حضرت علیؓ کو حاصل ہے وہ نہ خلفائے ثلاثہؓ کو حاصل ہے نہ صحابہ کو"
(۲) حضور کی دولت روحانیت کو صوفیہ تک پہونچانے میں حضرت علیؓ ہی تنہا واسطہ ہیں - علی بابہا تماہی حاصل ہے"

فاضل مصنف نے ان باتوں کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ "انبیاء علیہم السلام کے بعد حضرت ابوبکرؓ سب سے افضل پھر عمرؓ کا پھر عثمانؓ کا اُن کے بعد علیؓ کا درجہ ہے"

اس کتاب میں "پنجتن" کے سلسلہ میں مصنف نے چیلنج کے طور پر لکھا ہے "آخر اُمت محمدیہ نے پنجتن کا تخیل لیا کہاں سے ہے ؟"

فاضل مصنف نے "بیت" اور "اہل" کے معنی کی علمی انداز میں تشریح کی ہے اور ثابت کیا ہے، اہل بیت کا صحیح تر مصداق تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ہیں۔

فصل چہارم میں "احادیث کساء" کا جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ ان احادیث کا صحیح مفہوم کیا ہے اور آیہ تطہیر کیا مراد ہے۔ فاضل مصنف کی نگاہ سے اگر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن جلد چہارم گزر جاتی تو ان مسائل میں ان کی دلیلیں اور زیادہ قوی اور مطمئن کن ہو جاتیں، اپنے موضوع پر یہ خاصی تحقیقی کتاب ہے۔

اسوۂ حسنہ | مرتبہ:- ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ:- نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدرآباد۔

اس کتابچہ میں احادیث نبوی سے "اسوۂ حسنہ" کو منتقل کیا گیا ہے، بعض احادیث کا جو موضوع و مفہوم ہے وہی "اسوۂ حسنہ" ہے، مثلاً۔

الکریم اذا وعد وفیٰ
(بزرگ و سخی وہ ہے کہ جب وہ وعدہ کرتے تو اُس کو پورا کرے)
اور حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم صادق الوعد اور الامین تھے۔

الحیاءُ شعبۃٌ من الایمان (مسلم)
(حیا ایمان کی شاخ ہے)

اور حضور باعصمت کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے اور حیادار تھے! یہ کتابچہ "بہ قامت کہتر اور بقیمت بہتر" کا صحیح مصداق ہے۔

اسلامی حکومت کے نقش و نگار | از:- مولانا ظفیر الدین مفتاحی، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے
ملنے کا پتہ:- مفتاحی اکیڈمی، مئو۔ اعظم گڈھ

یہ نہتے کام کی کتاب بروقت منظرِ عام پر آئی ہے اس میں تفصیل سے کتابوں کے حوالوں کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ اسلامی
کے نقش و نگار کیسے ہوتے ہیں؟ اور اسلامی حکومت کے سربراہوں اور ارباب اقتدار کی سیرت کس انداز کی ہونی چاہئے۔
ں میں زمام حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اُن حکومتوں کو اور وہاں کے طبقۂ اعلیٰ کو یہ کتاب اخلاق و معاشرت
دکھلاتی ہے، پاکستان کو خاص طور سے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے کہ یہ ملک اسلام کے لئے اور اسلام کے نام
، یہاں اسلامی اقدار و روایات سے گریز دردناک سانحہ ہے۔

خطبۂ شیطانی اور تلقین رحمانی | از:۔ عبدالحمید فرید ایڈوکیٹ، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت چار روپے پچاس پیسے، (مجلد، رنگین سرورق) ملنے کا پتہ۔ رضوان احمد، آرام باغ، رام تلاؤ روڈ ـــ کراچی۔

اس کتاب پر تعارف مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے لکھا ہے، اور تبصرہ کے عنوان سے جناب رفیق خاور نے
سل مقدمہ تحریر فرمایا ہے اس کے بعد "گزارش" اور "عرض حال" ـــ دو مضامین خود صاحب کتاب کے ہیں، جس
ں منظوم افسانہ کے اسباب تخلیق اور اس کے متعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا پہلا باب جو اس افسانہ کا آغاز ہے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک نوجوان (زید) شام کے وقت
سے گزرتے ہوئے ایک صوفی واعظ کا وعظ سنتا ہے، مگر واعظ کا حال یہ ہے کہ۔

نہ اس میں بلبل کا تھا ترنم نہ غنچۂ شوخ کا تبسم
ریاضِ دل میں وہ تخمِ دیں کو غلط طریقے سے بو رہا تھا

زید گھر آکر واعظ کی نصیحتوں پر غور کرتا ہے اتنے میں ابلیس زید کے گوشِ دل سے باتیں کرتا ہے۔ ابلیس کے
، اول" کے یہ شعر کتنے اچھے ہیں۔

حیات معمور ہے فغاں سے نہیں مفر مرگ ناگہاں سے
دو لحظہ مستانہ رقص خوشتر سکونِ بے کیف جاوداں سے
گزار وقت اپنا گلستاں میں کہ ہے دبستاں وہ عاشقی کا
جو ذوقِ بے رنگ و بو کا گل سے تو سوزِ دل مرغِ صبح خواں سے

اس بند کا یہ شعر ـــ

خطیب خود کام کی خطابت، بناخ نازی ہے فی الحقیقت
جو مضطرب ہو کے لطف اٹھائے شکار کے مغز استخواں سے

کس قدر کمزور ہے "بناخ نازی" کتنی ثقیل اور نامانوس ترکیب ہے۔ مصرعہ ثانی میں بھی آورد ہی آورد
ی جاتی ہے۔

وہ جلوۂ نورِ طور سینا ہوئے تھے بے ہوش جس سے موسیٰ
رگ دستی ابروں کی برق بن کر جبل پہ ٹوٹی تھی آسماں سے

"ابروں" وہ بان کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہے اُردو میں "ابر" کی جمع نہیں آتی!

"صبح خواں" بھی ترکیب شاعر نے وضع کی ہے جس کے معنی ہیں صبح کے وقت گانے والا، فارسی میں غزل خواں اور قصیدہ خواں کی ترکیب کے لحاظ سے "صبح خواں" [illegible]

تیسرا بند خوب نہیں بہت خوب ہے۔
فلاک پہ گرم سفر ہیں تارے، یہ کیسے تقدیر کے ہیں مارے
مجال کیا ہے کہ دو قدم بھی ہوں پیش رس اپنے کارواں سے
اگر تو چاہے کہ دل ہو روشن، سمجھ میں آئیں خدا کی باتیں
تو در کر اپنے وسوسوں کو، گزار سجدوں میں اپنی راتیں

زید ابلیس کے بہکانے میں آکر کسی محبوب کی تلاش میں نکلتا ہے اور آخر کار ایک صاحب جمال کو دیکھ کر اُس پر فریفتہ ہوجاتا ہے۔

جمال اک مشتری جبیں کا جو میں نے دیکھا تو دل میں جانا
کہ میری تقدیر کا ستارہ زمیں پہ اُترا ہے آسماں سے
اُتر سکے گا نہ عکس ہرگز، بتوں کا آئینہ سخن میں
شبیہ لیلیٰ نظر نہ آئی، کسی عبارت کے پیرہن میں

زید اضطراب کے عالم میں زندگی گزارتا ہے ــــــ یہاں تک کہ وہ خود آپ بیتی بیان کرتا ہے۔

مقابلہ یار کے دہن کا یہیں روز کرتا کلی کلی سے
دم سحر جا کے توڑ لاتا، تمام غنچوں کو گلستاں سے

اس شعر میں بیجا مبالغہ بھی پایا جاتا ہے اور اس میں جو واقعیت بیان کی گئی ہے وہ بھی نری بناوٹی ہے اول تو باغ میں جا کر وہاں کے تمام غنچوں کو ایک ایک کرکے توڑ لانا ہی مبالغہ آمیز بات ہے، پھر ایسا کون کرتا ہے کہ محبوب کے "دہن" سے مقابلہ کرنے کے لئے روزانہ صبح کے وقت ایک ایک کلی کا جائزہ لیا کرے یہ دیکھنے کے لئے کہ "دہن یار لطافت و تنگی میں بڑ کر ہے یا غنچے!

باب (۱۱) زید کی نگاہ میں تصویر جوانی۔

مگر زمانہ ہے برق جولاں، نگاہیں اس کی دونوں یکساں
حباب دریا کی خوش ادائی، شباب کی ہیئت کذائی

اسی بند کے ایک شعر میں "ثواب اور ناثواب" پڑھا پڑا یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، صحیح املاء "صواب وناصواب" ہے۔

ابلیس زید کو جو پٹی پڑھا دیتا ہے۔ اس کے مطابق وہ اپنا ہو کفاک مقصد حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے اور اس میں محبوب کے پائیں باغ کے باغباں سے اُس کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ باغباں سے خوشامدانہ انداز میں گفتگو کرتا ہے۔

غریب آدم کے نیک بچے عمل میں اچھے زباں کے سچے
خدا شناسی میں تھے نہ کچے، کبھی انھوں نے نہ کی گدائی
ہمیشہ باغات ہی سے زینت، رہی ہے دنیائے رنگ و بو میں

اگر نہ ہوں باغباں جہاں میں، تو کیا ہے ان میں خوشنمائی
دراز ہو تیری عمر مالی! کہ تو ہے اس گلستاں کا والی
تری رفاقت حیات اس کی، ممات اس کی تری جدائی

"ممات اس کی" کے بجائے "ہے موت اس کی" ہوتا تو مصرعہ میں زیادہ سادگی اور روانی پیدا ہو جاتی۔

پس اے نکوخواہ گلشن آرا، تو ہی ہے اک چارہ ساز میرا
تجھی سے اُمید رہنمائی، تجھی سے ہوگی گرہ کشائی

باغبان بڑا باتونی ہے، وہ زید کی خوشامدانہ گفتگو کے جواب میں زید کو نصیحت کرنے لگتا ہے ؟ —

سُنی یہ باتیں جو باغباں نے، تو پان اک ڈال کر دہاں میں
اُڑا کے پیک اُس کی ایک جانب، بیاں کی تمہید یوں اٹھائی

"پان اک ڈال کر دہاں میں" زبان و روزمرہ کے اعتبار سے کس قدر کمزور ٹکڑا ہے، مصرعہ ثانی کے شروع کے ٹکڑوں کا بھی یہی حال ہے۔

پری ہی بیگم ہے گرچہ گھر میں، نہیں وہ جچتی مگر نظر میں
یہ سیر گاہوں میں گھومتا ہے کہ کوئی بٹیا ملے پرائی

"کوئی بٹیا ملے پرائی" — مالی کی زبان اور لہجہ نے اس شعر کو کس قدر رنگین بنا دیا۔

اس نظم میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان یا گلزار نسیم کی طرح "کردار" سامنے نہیں آتے، نہ افسانہ و حکایت کا واقعاتی تسلسل اس میں ملتا ہے، شاعر فلسفیانہ افکار اور ساتھ ہی دینی معتقدات رکھتا ہے۔ اور ان افکار و معتقدات کی ترجمانی کرتا چلا جاتا ہے۔

زید جو اس منظوم افسانہ کا بنیادی کردار ہے، وہ باغباں کے جھونپڑے میں بیٹھ کر محبوب کی بزم نشاط کا منظر دیکھتا ہے عشق کے موضوع پر واعظ تقریر بھی کرتا ہے۔ واعظ اور زید کے محبوب کے درمیان جھڑپ بھی ہو جاتی ہے، ان واقعات و مناظر اور اس کشمکش کے بعد زید کے افکار کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

بشر نے جو زندگی بسر کی، نہ تو نے اس پر کبھی نظر کی
رہا وہ صحرائے جستجو میں، خبر نہ لی اس نے اپنے گھر کی
نہ پا سکے گا وہ چین جب تک نہ ہوگی تہذیب نفس کامل
رہے گی اقلیم دل میں جاری، یہ جنگ جذبات خیر و شر کی

پھر "الف" کی ندا آتی ہے، اور یہی باب اس ڈرامہ کا مقصد نگارش ہے۔

نگاہ میں اسوۂ محمدؐ، تو دل میں خلق عظیم اُن کا
یہ درس قرآں سے لے! کہ ہو وہ عمل اور ایمان کا ترانہ
جہاں کو معروف کا سبق دے، بدی کو منکر سے روکتا جا
یہ کام کر جو کوئی زمانہ! نہ مصلحت کا بتا بہانہ[1]

[1] "نہ مصلحت کو بتا بہانہ" کہنا چاہیئے تھا۔

اس منظوم کہانی کے چند منتخب اشعار۔

اے کہ ہے عام تیرا لطف و کرم
بحرِ رحمت میں تیرے جوش و خروش
چمن دہر میں پھلیں پھولیں
بادہ کش، بادہ ریز، بادہ فروش
ذوقِ عشرت اگر ہو پیشہ بیش
عیش و مستی عقب میں دوش بدوش

(متنبی کی روح سے واعظانہ خطاب)

اے سخن گستر کوئی متنبی حجاز
کوئی شعرائے عرب میں نہیں تیرا ہمسر
شوق سے محفل ارباب ادب نے لوٹے
تیرے خامے نے گرائے جو معانی کے گہر
اب کہاں بزم عرب میں تیرا اسلوب بیاں
فکر و الفاظ ترے شعر میں ہیں شیر و شکر

(واعظ کا مکتوب فرید کے نام)

آہ اے ملّتِ بیضا کے سیہ مست پسر
نخل اسلام ہوا خشک نہ برگ اس میں نہ بَر
جس کو اشکوں سے رسول عربی نے سینچا
آبیاری سے ہو محروم شجر وہ یکسر
مست بے جام و سبو رہتے تھے تیرے آبا
نانِ جو اُن کی غذا تھی، تو چٹائی بستر
زہد و تقویٰ ہو کہاں! ہو اگر پیش نظر
عظمت و ہیبت و جبروتِ خدائے اکبر

اس کتاب کا دوسرا حصہ "تلقین رحمانی" ہے، جو حکیمانہ معارف اور عالمانہ نکات سے لبریز ہے۔

بعض سرکش نے بجھا دی ہو اگر شمع خرد
تاکہ ہم رنگ نظر آئیں حلال اور حرام

اور

ملہ "بجھی" ہوتا تو شعر اور زیادہ حسین ہو جاتا۔

کر چکا عذر تو سُن پند دل آسائے فرید
اہل دل کے لئے ہے آب حیات اُس کا پیام

"پند دل آسائے فرید" ترکیب بھلی نہیں لگتی۔

اے مسلمان ہے اعجاز یہ قرآن ترا
ہاتھ ہے خالق کونین کا ایمان ترا

مصرعہ اولیٰ میں کس قدر ناپختگی پائی جاتی ہے، مصرعہ ثانی میں ایمان کو جو خالق کونین کا "ہاتھ" کہا گیا ہے، یہ بظاہر عجیب سا لگتا ہے، ممکن یہ کسی قول و روایت کا ترجمہ ہوا۔

تجھ میں طاقت ہے اگر، پھر درِ خیبر کو اکھاڑ
تجھ میں ہمت ہے تو بن خالدِ جانبازِ حجاز
وہ جہاں تاز جہاں گیر و شجاع و دلیر
اور تو بادہ کش و رقص کن و نغمہ نواز

یہ اشعار کس قدر جاندار ہیں اور جوش و ولولہ سے لبریز ہیں۔

جناب عبدالحمید فرید انگریزی اور فارسی کے ساتھ سنسکرت اور عربی بھی جانتے ہیں۔ اُن علوم و السنہ کی جھلکیاں اُن کے شعروں میں دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے ادھکار، چمتکار، بلیدان، درپن، پرنتو، شکست، واسنا بھرشٹ، اپمان، مریادا، درشٹی جیسے سنسکرت الفاظ نظم میں استعمال کئے ہیں۔

عشق بازی جس میں ہوسناکی لازماً شامل ہے، اُس کی تعریف صرف ایک شعر میں بیان کر دی۔

عیش دو دن کا، عمر بھر کا عذاب
عشق کی داستاں کا لب لباب

عربی دانی کے سبب وہ شعروں میں زہد کی بجائے "تزہد" اور "اتقا" اور تقویٰ کی جگہ۔ تقا (صفحہ ۱۷۷) لائے ہیں، جن کو ذوق صحیح مشکل ہی سے گوارا کرے گا۔

"کشمکش زندگی" کے یہ شعر خوب ہیں۔

وہ پایا جو نہ چاہا تھا، جو چاہا، وہ نہ ہاتھ آیا
پلٹ دی زندگی گر دشِ افلاک نے کایا
نہ عقدہ کھل سکا، نفس و خرد میں کشمکش کیوں ہے
میں طالب آشتی کا ان کی ناچاقی سے گھبرایا
تمنا کیا ہے اس کی ابتدا و انتہا کیا ہے
یہ راز انساں نہ سمجھا اے خدا تو ہی بتا کیا ہے

اپنی اس کتاب میں فرید صاحب نے علامہ اقبال کی خودی پر اعتراض وارد کیا ہے اور نثر کے کئی صفحے اپنے خیال کی تائید میں لکھے ہیں اُن کا کہنا یہ ہے کہ۔

"میرا اعتراض اقبال مرحوم کی تعلیم پر نہیں، بلکہ صرف لفظ "خودی" کے رواج دینے پر ہے جو "نفس" کا نہیں بلکہ ایگو (EGO) کا ترجمہ ہے، خودی ایک مکروہ کلمہ ہے۔"

مگر اس کو کیا کیجئے کہ اقبال کی شاعرانہ قوت نے "خودی" کو ایک حسین حقیقت بنا دیا۔!

: علم کی تعریف :۔

تو ہے وہ نور کا دریا، نہیں جس کو ساحل
نہ خلا اور نہ ملا راہ میں تیری حائل

کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "جس کا ساحل" کی جگہ "جس کو ساحل" چھپ گیا۔

"النظریۃ العقلیہ" (RATIONALISM) پر خوب خوب شعر کہے ہیں۔

پیاس اس سوختہ جاں کی تری مے سے نہ بجھی
جتنی سیری ہوئی، اتنی ہی بڑھی تشنہ لبی

"النظریۃ الشکیہ" (SCEPTICISM)

کس کو معلوم ہے ماہیت فکر و ادراک
دل کے کس گوشہ میں ہے نفس جفا کار مکیں
کیسے الفاظ میں ہوتے ہیں مبدل افکار
لاکھ سمجھائے کوئی، ہم کو نہ آئے گا یقیں
کوئی تحقیق نہیں شک و شبہ سے خالی
کوئی تصدیق نہیں جس سے ہو دل کو تسکین

اسی نظم کا ایک شعر ہے۔

غالب پاک قلم، شاعر اعجاز رقم
مات مبہوت ہے سن اس کی نوائے رنگیں

"پاک قلم کیا بات ہوئی، مصرعہ ثانی بہت کمزور ہے "مات" خاص طور سے کھٹکتا ہے۔

"النظریۃ التجربیہ" (EMPRICISM)

تجربے دیتے ہیں انسان کے مسائل کا جواب
روشنی ان کی لگاتی ہے حقایق کا سراغ

النظریہ اللاادریہ (AGNOSTICISM)

غیب کے راز ہیں ادراک سے بالا لیکن
کیوں نہ انسان کو ہو قدرت کے مظاہر کا یقیں
دیکھ انجم کی ضیا، دیکھ کواکب کی جلا
اپنے پرتو سے وہ کرتے ہیں فلک کی تزئین

مگر

یہ شعر:-

کعبۂ دل میں وہ آتا ہے ! وہ کیوں آتا ہے
راز سربستہ ہے، ماہیت ابلیس لعین

کمزور ہے "ماہیت" کی جگہ کوئی دوسرا موزوں تر لفظ ہونا چاہئے تھا۔

"جہل" (مذہب السلوکیہ BEHAVIORISM)

کفر اور شرک و معاصی سے ہیں آلام جہاں
فرض ہے ملت اسلام کا ان سب سے جہاد

اس قسم کے موزوں کلام میں "شعریت" نہیں ہوا کرتی! صفحہ ۲۲۵ پر حیرت ہے کہ "غیظ" کو "غیض" املا کیا گیا ہے، حالانکہ فرید صاحب عربی داں ہیں۔

"ہر زمانے میں اللہ کی سرزمین پر صد ہا جیسے ابن سینا، ابن رشد، ابن خلدون، خالد بن ولید، نیوٹن اور ایڈیسن وغیرہم کا دل و دماغ لے کر آتے ہیں" (صفحہ ۲۲۸)

جن فلسفیوں اور سائنس دانوں کا ذکر کیا گیا ہے اس سلسلہ میں خالد بن ولید کا نام عجیب لگتا ہے!

زندگی ہیچ ہے انسان کی بے علم و ہنر
مفت ہیں ان کے بغیر اس کے طبیعی جوہر

"مفت ہیں" اس شعر میں بے معنی ہے۔

بے سواری کے عواقب پہ ہے تیری نظر
جہل بے درد پسر راہزن شان پدر

"جہل بے درد پسر" اور "راہزن شان پدر" جیسی ترکیبیں شاعری کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہیں۔ اس کتاب کا اختتام جن شعروں پر ہوتا ہے، وہ کتنے ایمان افروز ہیں۔

اپنے ہی نفس کو جان، اور خدا کو پہچان
بس ہے تیرے لئے یہ علم فرید آزاد
اپنی ہی عقل سے لیتا ہے سبق تو دن رات
اُسے نادان کو نادان نے بنایا اُستاد
ڈھونڈ ظلمت کدۂ دہر میں نور ایمان
اس کے پرتو میں نظر آئیں گے تجھے سود و زیاں

"فرید صاحب کی شاعری کا مقصد بھی محض یہ ہے کہ حسن فکر اور جمال بیان سے کام لے کر انسانی زندگی کو پاکیزہ تر بنایا جائے اور ان اخلاق عالیہ کی تبلیغ کی جائے جو اسلام نے سکھائے ہیں۔

(عبد المجید سالک مرحوم)

سالک مرحوم کی اس رائے سے ہم اتفاق کرتے ہیں جس کی تائید خود شاعر کے کلام سے ہوتی ہے! جناب عم
نے اس مادہ پرست دور میں جن روحانی اور دینی اقدار و حقائق کی ترجمانی، شعر کی زبان میں کی ہے، اس کے لئے وہ
کے مستحق ہیں! اردو زبان میں اس انداز کا غالباً پہلا منظوم افسانہ منظر عام پر آیا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

تصحیح العقائد بابطال شواہد الشواہد

از ـــ مولانا رئیس احمد ندوی، ضخامت ۱۱۲ صفحات، قیمت، ایک رو
ملنے کا پتہ ـــ مولانا عبد الرؤف رحمانی، ناظم مدرسہ جھنڈا نگر۔ ڈ
کرشنا نگر، ضلع کپل دستو تولہوا (نیپال اسٹیٹ)

بریلیوں کا یہ عقیدہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر اور عالم الغیب ہیں مشرکانہ عقیدہ ہے ام
ـــ عقیدت جو کتاب و سنت کی صریحاً مخالف ہو قیامت کے دن ان لوگوں کے منہ پر مار دی جائے
کتاب میں ان غلط اور باطل عقاید کی مدلل تردید کی گئی ہے! اور مصنف "الشاہد" کی موشگافیوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی
کیسے عاشقان رسول ہیں کہ حضور کی اصل تعلیم ـــ توحید ـــ کو غبار آلود اور مجروح کرنے میں اسقدر بے باک ہیں

سونا مانجھی

از :ـ عزیز کرمانی، ضخامت ۸۰ صفحات (مجلد) قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔
ملنے کا پتہ :ـ سلطان حسین اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب، برنس روڈ۔ کراچی

اس کتابچہ میں "کشمیر اور جہلم کے ساحلوں پر" محبت اور جنگ کی کہانی کو منظوم کیا گیا ہے جس میں خاصی رد
جاتی ہے، شاعر کا جمالیاتی ذوق شدید بھی ہے اور رنگ برنگی بھی ہے، بعض مقامات پر شاعر نے ٹھوکریں بھی کھائی ہیں

سونا کی نظر پیکان لئے
چلی مست سجیلی پلکوں سے
آہستہ صدا زنجیری کی
آتی تھی فضائی لہروں سے

"سجیلی پلکیں" کیا ہوتی ہیں؟ پھر سونا کی نظر کا پیکان لئے ہوئے "مست سجیلی پلکوں سے چلنا کس قدر کمزور
بیان ہے۔

جھیلیں ہیں شراب کی وہ آنکھیں
جنت کے سیب کی ہیں پھانکیں (صفحہ ۳۲)

آنکھوں کو "شراب کی جھیلیں" کہنا بے ذوقی کی دلیل ہے۔

مانجھی کے حسین خیالوں میں
معصوم دعائیں جلتی ہیں

کیا حسین خیالات "بھٹی" یا "الاؤ" ہیں جن میں دعائیں جل رہی ہیں ـــ یہ کہا کہ جو الم غلم بات ذہن میں
آئے جھٹ سے نظم کر ڈالا۔

کبھی ندی پہ آیا مانجھی
مینوں کی پھبن لایا مانجھی (صفحہ ۵۶)

"غنچوں کی بھبن" لانے کی یاں کیا تُک تھی!

چھپ چھپ کر دردِ دل ملتے تھے
ارمانوں کے گل کھلتے تھے

مصرعِ ثانی یوں ہو سکتا تھا ـــــ اُمید کے غنچے کھلتے تھے۔

تا زیست مری نظروں میں رہو
اک نیک گھڑی میں بیاہ کرو

عزیز کرمانی صاحب کے یہاں اس قسم کے بہت سے اشعار ملتے ہیں، جو نو مشقی کے زمانے میں کہے جاتے ہیں اور جن کو کتابی صورت میں منظرِ عام پر لانے کی عاجلانہ جرأت نہیں کرنی چاہیئے۔

ماہنامہ "البلاغ" | سرپرست:۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ـــ مدیرِ اعلیٰ:۔ مولانا محمد تقی عثمانی
مدیر انتظامی ـــــ مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری۔ فی پرچہ - ۵۰ پیسے

سالانہ چھ روپے، ملنے کا پتہ:۔ البلاغ، دار العلوم کراچی ۱۴

اس نوطلوع مجلہ کے تین شمارے اب تک آچکے ہیں، سرورق جاذبِ نظر، کاغذ اور طباعت و کتابت دیدہ زیب مضامین میں تنوع، افکار صحیح و پاکیزہ، مقصد نیک ـــــ یہ کہ لوگوں میں دینی شعور اور اسلامی بصیرت پیدا ہو، اور مسلمانوں میں اسلاف و اکابر کی مقدس زندگیاں جھلکنے لگیں اور دل خشیتِ الٰہی سے معمور ہو جائیں! اس مبارک مقصد میں یہ رسالہ کامیاب ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی جوان صالح اور عالم باعمل ہیں "البلاغ" کی ترتیب میں اُن کے ذوق نے جو سلیقہ اور شائستگی پیدا کردی ہے وہ قابلِ داد اور اللہ تعالےٰ کی بارگاہ سے مستحق اجر و ثواب ہے۔

قلیل مدت میں اس رسالہ کو جو اشتہارات مل گئے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء اللہ العزیز "البلاغ" کو مالی مشکلات سے دوچار ہونا نہ پڑے گا، اور وہ بہت جلد خود کفیل ہو جائے گا!

"البلاغ" کی پالیسی یہ معلوم ہوتی ہے کہ سیاسیات کے خارزار سے دامن بچا کر دینِ حق کی تبلیغ کی جائے! مگر ہم "البلاغ" کو مقام عزیمت پر بھی فائز دیکھنے کے آرزومند ہیں! کہ حق و باطل کی رزمگاہ میں خطروں سے مفر محال ہے۔

"البلاغ" کا ہم دلی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس مجلّہ کو فوز و فلاح قبولِ عام اور ہر طرح کی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار فرمائے۔ (آمین)

والمن ٹیکسٹائل ملز لمیٹ
منگھا پیر
کرا
ہر قسم کا سوتی ا
کپڑا کورا اور دھلا لٹھا اور ہر قسم
دھاگا
تیار ہوتا
باوانی والمن ٹیکسٹائل
ملز لمیٹڈ کا تیار شدہ ک
ہر اعتبار سے
قابل اعتماد ہے پاکستان کی صنعت کی قدر اور حوصلہ افزائی آپ
قومی فریضہ ہے

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
COTTON MILLS
ACM

ماہ اگست ۱۷

ماہنامہ فاران کراچی

جلد
شمارہ

ایڈیٹر: ماہر القادری

چندہ سالانہ:- ۷ روپے | پبلشر:- مسعود حسین | قیمت فی پرچہ:- ۶۲
مقام اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے آرگن ماہنامہ "فکر و نظر" کے ماہ جون ۱۹۶۲ء کے شمارے میں ایک خط شائع ہوا ہے، جسے
یل کیا جاتا ہے :—

مکتوب مفتوح

صدرِ مملکت جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
کی خدمت میں

صدرِ گرامی قدر!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پچھلے چند برسوں سے آپ کی تقاریر و خطبات، ملتِ پاک کی ترقی و خوش حالی کے لئے آپ کا
صادق، ملتِ پاک کو دنیا کی زندہ اور ترقی یافتہ اقوام کی علمی، تہذیبی اور معاشی سطح پر بلند کرنے کے لئے آپ کی انتھک جد و جہد
ن پر پھیلی ہوئی مسلم اقوام کو باہم متحد کرنے اور ان کی زندگی میں اسلام کو ایک فعال (ACTIVE) اور زندہ عنصر کی حیثیت سے
کی بے پناہ آرزو اور اس عظیم نصب العین کو واقعیت میں بدلنے کے لئے آپ کی سیماب آسا تڑپ میرے مطالعہ کا خاص محور رہے ہیں۔
میں ایک عام آدمی ہوں اور عوام کے ہی قریب رہتا ہوں اس لئے ان کے دکھ درد، ان کی مشکلات اور ان کی آرزوؤں اور تمناؤں
واقفیت رکھتا ہوں۔ لہٰذا اس فکر و مطالعہ کی بنا پر آپ کی خدمت میں چند معروضات کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جیسا کہ میں نے پہلے
ا ہے کہ یہ معروضات ایک ایسے عام آدمی کے مشاہدہ و مطالعہ کا نتیجہ ہیں جس کے ذہن پر کسی مخصوص سیاسی مسلک کا اثر نہیں ہے اس
ا جا سکتا ہے کہ یہ مطالعہ قطعاً غیر جانبدار ہے جو شخص بھی عوام میں سادہ ذہن کے ساتھ گھومے پھرے گا، ان کے حالات کو دیکھے گا وہ
نتیجے پر پہنچے گا جسے میں پیش خدمت کر رہا ہوں۔
اگر یہ معروضات آپ کی توجہ کا باعث بن سکیں تو میرے لئے یہ سعادتِ دارین کے مترادف ہوگا۔
صدرِ محترم! سب سے پہلی بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ پاکستان اور مسلم قوم کو آپ جس بامِ عروج پر لے جانا چاہتے
اور اس میں جس طرح حقیقی اسلام کی روح پیدا کرنا چاہتے ہیں، آپ کی اس خواہش اور عمل کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس ملک کے
اندر ملائی نظام کا وجود ہے۔ یہ نظام اگرچہ تمام اسلامی ممالک میں پایا جاتا ہے مگر بیشتر مسلم ممالک میں وہاں کے مخصوص تاریخی

کی وجہ سے اس مُلّائی نظام پر کافی حد تک قابو پایا جا چکا ہے۔ مثلاً جدید ترکی میں مصطفےٰ کمال، ایران میں رضا شاہ پہلوی، نادر اور افغانستان میں ظاہر شاہ نے عوام کے ذہن سے مُلّائی تسلط کو کافی حد تک بے اثر کر دیا ہے یقیناً آپ پر یہ حقیقت مخفی نہیں کہ جدید یورپ اور اشتراکی ممالک میں سائنس، ٹیکنالوجی، معاشی اور عمرانی علوم کی موجودہ عظیم الشان عمارت اس وقت تک تعمیر نہیں ہو سکی جب تک کہ وہاں کی عوامی زندگی سے کلیسائی نظام کی ہمہ گیر دخل اندازی کو ختم نہیں کر دیا گیا۔ نشاۃِ ثانیہ کی عملی قوتوں اور کلیسائی نظام کی باہمی آویزش کی شدت کا اندازہ ڈاکٹر ڈریپر کی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ رومن کلیسا کی مجلس انکوئزیشن نے تین لاکھ انسانوں کو محض اس جرم میں یا تو انہیں زندہ جلا دیا یا انہیں سخت سزائیں دیں کہ وہ گلیلیو، برونو، کوپرنیکس اور نیوٹن کے خیالات کو قبول کر رہے تھے۔ چنانچہ جدید یورپ اور اشتراکی ممالک اس وقت تک ترقی کی شاہراہ پر قدم نہ رکھ سکے جب تک کہ انہوں نے اپنے ہاں کے کلیسائی نظام کے اقتدار کو چیلنج نہیں کیا۔ اس پر بھرپور وار کر کے ہمیشہ کے لئے اس کی کمر توڑ کر نہ رکھ دی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب کو ریاستی اداروں اور تعلیمی نظام سے اس طرح خارج کر دینے سے اس کی جگہ وہاں میکیاولیت (MACHIAVELLISM) نے لے لی، جس نے ریاست کو اجتماعی اخلاق کی قیود سے قطعاً آزاد کر دیا اور اس سے وہاں کی اقدار کو زبردست نقصان پہنچا مگر جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں مغرب کی جدید قوتوں سے اس غلطی کے سرزد ہونے کے چند اسباب ہیں، جن میں خود مذہب کی روایت پسندی اور علم دشمنی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے ان خامیوں کی وجہ سے مذہب کی بجائے اشتراکی نظریۂ حیات نے میکیاولیت پر بھرپور تنقید کی اور اس کے سماج دشمن اور مخرب اخلاق اثرات کا کافی حد تک ازالہ کیا مگر اپنی دہریت کی وجہ سے اشتراکیت بھی اس تاریخی فرض کو کما حقہ سر انجام نہ دے سکی۔

ان تاریخی واقعات و نظائر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب تک ہمارے ہاں سے مُلّائی نظام کے تسلط کو ختم نہیں کیا جاتا اور اسے اپنے ذاتی اور محدود گروہی مفاد کے لئے مذہب کو استعمال کرنے سے باز نہیں رکھا جاتا۔ آج اس دور میں کوئی قوم یا ملک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔

صدر مکرم! اس تاریخی استقراء کے پیش نظر آپ بھی جب تک یہاں کے مُلّائی نظام کی کمر نہیں توڑیں گے اور اُسے پست اور حوصلے سے اپنے ذاتی اور گروہی اقتدار اور مفاد کی خاطر اسلام کو استعمال کرنے اور عوام کے جذبات کے ساتھ کھیلنے سے محروم نہیں کریں گے پاکستان میں ترقی کی رفتار آپ کے حسب منشا تیز تر نہیں ہو سکتی۔

آپ جانتے ہیں ہمارے علماء، ائمہ اور خطباء کا عوام سے براہ راست تعلق ہے۔ بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے اور معمولی دیہات تک مساجد کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ ہر قریہ اور بستی اور اس کا ہر محلہ اس نظام سے وابستہ ہے۔ مساجد پر ان حضرات کا قبضہ ہے روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کے چھوٹے چھوٹے اجتماعوں سے لے کر جمعہ و عیدین کے عظیم الشان اجتماعات تک یہی حضرات عوام سے متعلق اور ان سے مخاطب رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے قائم کردہ اس مُلّائی نظام کی قوت میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے اگر ٹھیک الفاظ استعمال کئے جائیں تو یہ ایک حکومت در حکومت ہے۔

یہ لوگ آئے دن اپنی اس قوت و اقتدار کے بل بوتے پر حکومت کے ہر ضروری اور مفید پروگرام اور تجویز کو غیر شرعی اور غیر اسلامی قرار دے کر عوام کو اس کے خلاف اکساتے رہتے ہیں اور جیسا کہ آپ کو علم ہے انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی، عائلی قوانین اور کئی دیگر منصوبوں کو غیر شرعی قرار دے کر انہیں عوام میں نامقبول بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اگر یہ حضرات ان منصوبوں

ہ کے نام سے اور اپنے مذہبی اثر و نفوذ کا فائدہ اٹھا کر اس طرح مخالفت نہ کرتے تو حکومت کو کروڑہا روپیہ کی بچت ہو سکتی تھی اور
ن ہی معمولی سی کوشش اور خرچ سے اس کے ان فیصلوں کو عوام میں مقبول بنایا جا سکتا تھا۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ
ہم مذہب کے نام سے سیاست کرنے والی بعض جماعتوں کی تنظیم، اس کے پروپیگنڈا کی تکنیک اور شدت، عوام میں اسلام
م پر اس کے نفوذ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس حقیقت پر مطلع ہوتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں یہ ملائی نظام تسلط و اقتدار کا اتنا عادی
بکا ہے کہ اس نے سچ مچ مذہب کے نام پر ایک متشدد سیاسی تحریک شروع کر رکھی ہے جو بزعم خود جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی
یاں چھین کر ایک حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

صدر محترم! یہاں میں آپ کی توجہ اس طبقے کی طرف سے نکلنے والی ایک نئی کتاب "خلافت و ملوکیت" کی طرف مبذول کراتا ہوں
ں کتاب میں کھلم کھلا یہ درس دیا گیا ہے کہ کسی موزوں وقت پر، جب کامیابی کی پوری توقع ہو، ان مسلم حکومتوں کے خلاف بغاوت
دینا صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے، جو اس خیال میں "منہاج نبوت" پر قائم نہیں ہیں اور اپنے اس نظریہ خروج (REVOLT)
جواز زید بن علی اور نفس زکیہ کے خروج سے لیا ہے اور بقول اس کتاب کے اس خروج میں حضرت امام ابوحنیفہ نے بھرپور حصہ لیا تھا
ن کے نزدیک پاکستان کی موجودہ حکومت جاہلیت کی حکومت کے مترادف ہے، جس کے خلاف خروج (REVOLT) جائز ہی نہیں
واجب ہے۔ محض سازگار حالات کا انتظار کر لینا چاہئے۔

لہذا بغاوت کے حق میں اس فتویٰ کے بعد ہر اس صاحب اقتدار کا فرض ہو جاتا ہے جو اسلام کی عظیم اقدار کو اس ملک میں سرسبز
شاداب دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اس ملائی نظام کی قوت کو توڑنے کی بھرپور کوشش کرے۔ وہ اقدار جو انسان دوست اور علم پہ مبنی
ہیں اور مذہبی عقائد اور رنگ و نسل میں حریت و مساوات کی علمبردار ہیں اور جن کے جامع انسانیت کے تصور کی بنا پر اقوام عالم کو
ایک انسانی برادری میں تحویل کیا جا سکتا ہے اور اس کا نتیجہ کرۂ ارض پر دائمی امن کے دور دورہ، خوشحالی کے قیام اور حیات انسانی
کی مسلسل اخلاقی و روحانی نمو پذیری کی صورت میں عیاں ہوگا۔

صدر والا قدر! اس ملائی نظام کی گمراہ کن اور عوام دشمن قوت کو توڑنے کے لئے میں چند تجاویز آپ کی خدمت میں پیش کر رہا
ہوں۔ پہلی تجویز تو یہ ہے کہ تمام نجی مذہبی مدرسوں اور دارالعلوموں کو بند کر دیا جائے کیونکہ یہ مذہبی مدرسے اور دارالعلوم اس ملائی
نظام کی قوت و اقتدار کے مصدر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مذہبی درسگاہوں کے اندر جدید صنعتی عہد سے ایک ہزار برس قبل
کا مرتب کردہ ایک دقیانوسی، فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ نصاب تعلیم رائج ہے۔ جس کے تمام علوم قیاسی و ظنی ہیں۔
کیونکہ ان کی بنیاد ارسطو کی منطق استخراجیہ (DEDUCTIVE LOGIC) پر رکھی گئی ہے اور مسلم حکماء کے تحقیق کردہ
اصول استقرا (INDUCTIVE LOGIC) کو اس میں کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ جسے بعد میں یورپ نے اپنا کر جدید سائنسی علوم اور
ٹیکنالوجی کو تخلیق کیا اور اسے عظیم الشان ترقی دی۔ اس درس نظامی میں کائنات کا تصور حرکت و تغیر (CHANGE) پر مبنی نہیں
بلکہ سکون و جمود پر ہے، جس سے نئی اقدار کی تخلیق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اس نصاب میں قرآن حکیم کو
ایک زندہ اور رہنما کتاب کی حیثیت سے کوئی مقام نہیں دیا گیا۔ اس کا مطالعہ صرف چند فقہی اور لغوی موشگافیوں تک محدود رہتا ہے۔
طلبہ میں اس کتاب مقدس سے انسانی زندگی کے ارتقاء و تزکیہ کے لئے کسی لائحہ عمل کے اخذ کرنے کی اہلیت نہیں پیدا کی جاتی۔ اس
لئے مذہبی مدارس سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ وہ اپنے اس فرسودہ اور ذہنی لحاظ سے مفلس ماحول سے وقت کے جدید تقاضوں کو سمجھنے
والے بالغ نظر اور روشن دماغ عالم پیدا کر سکیں گے۔

ان مدارس کی جگہ حکومت کو چاہیے کہ محکمہ اوقاف کے زیر انتظام ایسے دارالعلوم قائم کرے جن میں عصر حاضر کے
قاضوں اور علوم سے باخبر مذہبی رہنما تیار کئے اس کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کو یونیورسٹی کے نصاب تعلیم
(CURRICULUM) میں شامل کیا جائے، جہاں فقہ، حدیث، تفسیر، تصوف وکلام اور تاریخ اسلام وغیرہ میں ایم اے کی
ڈگری حاصل کرنے کے انتظامات کئے جائیں۔ ایم اے کے بعد ان کو اسلامی علوم اور اسلام کی ممتاز شخصیتوں پر ڈاکٹریٹ کی تیاری کے
لئے بھی مواقع فراہم کئے جائیں۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ فقہ کو ایل ایل بی کا ایک حصہ بنا دیا جائے اور اس کی مدت تعلیم تین سال کر دی جائے
جس میں ایک سال صرف اسلامی فقہ پر صرف کیا جائے۔ محکمہ اوقاف کی زیر نگرانی جو دارالعلوم ہوں، ان سے فارغ التحصیل علماء
شہروں اور دیہات کی جامع مساجد میں بحیثیت خطیب اور امام ومعلم مقرر کیا جائے۔ اور ان کے مشاہروں اور معیار زندگی کو عصر
حاضر کے تقاضوں کے مطابق نئے سرے سے ترتیب دیا جائے۔

اسلامی علوم کو یونیورسٹیوں میں لے جانے سے ایک اہم فائدہ یہ ہوگا کہ امت اسلامیہ میں حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا درس
دینے والے سیاسی طالع آزماؤں کی تخلیق بند ہو جائے گی۔ اب تو حالت یہ ہے کہ ان حضرات میں سے جو شخص جدید زندگی کے
تقاضوں کے متعلق کچھ سوجھ بوجھ پیدا کر لیتا ہے وہ امام ومجتہد بن کر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگتا ہے تاکہ وہ بزعم
خویش اپنی حکومت الٰہیہ قائم کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلم عوام کی ذہنی اور جسمانی قوتیں ملک وملت کی تعمیر میں صرف ہونے کی
بجائے ان نام نہاد مجتہدین کی تائید ومخالفت میں ضائع ہونے لگتی ہیں۔

محکمہ اوقاف کے زیر انتظام دارالعلوموں میں داخلہ کی شرط میٹرک رکھی جائے اور ان میں مذہبی مضامین کے ساتھ ساتھ جدید
علوم کی بھی تعلیم دی جائے تاکہ ان دارالعلوموں سے فارغ ہونے والے حضرات مذہبی فرائض کے علاوہ آج کے قومی مسائل کو بھی
سمجھ سکیں اور ان میں عوام کی رہنمائی کر سکیں۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم کی تعلیم اور ان دارالعلوموں کے قیام کے ساتھ ساتھ موجودہ علماء،
خطباء اور ائمہ کے لئے جدید علوم پر مشتمل ایک ریفریشر کورس (REFRESHER COURSE) مرتب کیا جائے اور ملک کے
شہروں میں ایسے مراکز ہوں، جہاں یہ حضرات آئیں اور اس کورس کو مکمل کریں۔ ریفریشر کورس کرنے والوں کے لئے مناسب مواقع
فراہم کئے جائیں کہ وہ اوقاف میں نکلنے والے مناصب پر فائز ہو سکیں۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ خطبات جمعہ وعیدین عوام کے روزمرہ کے مسائل اور ان کے جدید تقاضوں کے مطابق حل پر مشتمل ہوں
علوم کے ماہرین مختلف موضوعات پر خطبات مرتب کریں، جن کی بنیاد پر مساجد کے امام اپنے خطبات کو تشکیل دیں۔ اس طرح ہمارے
عوام مذہبی اختلافات کو ہوا دینے والے، دنیوی زندگی سے نفرت دلانے والے اور وقت کے جدید تقاضوں کی مخالفت کرنے والے خطبات
کے زہر سے محفوظ ہو سکیں گے اور عوام کی ذہنی تربیت کے بہتر مواقع مہیا ہو سکیں گے اور ان کے درمیان مذہبی فرقہ بندی جیسی سماج
دشمن روایت کی اہمیت کم ہو کر قومی اتحاد وسالمیت اور زندگی کی بہتر تعمیر کا جذبہ پیدا ہوگا۔

چوتھی تجویز یہ ہے کہ قرون اولیٰ کی طرح "مسجد" کو دینی اور معاشرتی زندگی کا مرکز بنایا جائے، مساجد میں تعلیم بالغاں کا
انتظام ہو، ان میں پرائمری اسکول کھولے جائیں، مساجد سے ملحقہ کمروں میں دارالمطالعہ قائم کئے جائیں۔ وہاں دینی اور اصلاحی
اجتماع ہوں۔ اس طرح مسجد عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ اپنے علاقے کا ایک ایسا تہذیبی ادارہ بن جائے گی کہ سب اس کی طرف
رجوع کیا کریں گے۔

لراچی

پانچویں تجویز یہ ہے کہ مذہب کے نام پر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے اور حکومت کو "منہاجِ نبوت" پر استوار کرنے کے لئے نعرہ بازی کی بنیاد پر کسی شخص کو سیاسی تحریک چلانے کی سختی کے ساتھ ممانعت کر دی جائے بلکہ ایسی قائم شدہ تحریکوں کو خلافِ قانون قرار دیا جائے اور ان کی تنظیم پر بھرپور وار کیا جائے جس سے ان کی طاقت و قوت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے۔

صدرِ محترم! آج ملت میں جو ذہنی اور اجتماعی انتشار برپا ہے، اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ حضرات ہیں، جو اپنے مدرسوں میں ایسے علوم پڑھاتے ہیں، جن سے پڑھنے والوں کو نہ روحانی تسکین ملتی ہے اور نہ دنیوی فائدہ۔ پھر ان کے منبر اور وعظ و نعت میں عوام کو ہر اس چیز سے متنفر کرتے ہیں، جو صحیح معنوں میں قومی زندگی کو تعمیری راہوں پر ڈال سکتی ہے۔ حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ اس مُلّائی نظام کو توڑے بغیر جس کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے، پاکستان اس بیسویں صدی میں ترقی خواہ اور خوش حال ملک بن سکے۔

آخر میں میری یہ عرض ہے کہ اگر آپ نے اپنے دورِ اقتدار میں اس مسئلہ کا خاطر خواہ حل نہ کیا، تو پھر معلوم نہیں ملک کو سنجیدہ، دانش مند، محبِ وطن و قوم اور جدید قیادت کب نصیب ہو۔ اگر بدقسمتی سے یہ مسئلہ اسی طرح رہا تو اس ملک کا جو حشر ہوگا میں اس کے تصور سے کانپ جاتا ہوں۔ آج قومی بقا اس کی مقتضی ہے کہ ہم متحد ہوں اور ترقی کریں، لیکن مُلّائی نظام کی ساری ردد یہ ہے کہ فرقہ واریت پروان چڑھے۔ قوم فرقوں میں بٹی رہے اور ہر ترقی خواہ اقدام کی مخالفت ہو۔

آپ کا مخلص: الطاف جاوید

9/2 مارٹن روڈ کوارٹرز۔ کراچی ۵

اس خط کا لب و لہجہ دیکھئے، انداز فکر دیکھئے اور اس پر غور کیجئے کہ دین پسند طبقہ کے خلاف مکتوب نگار کس قدر شدید بغض و عناد و انتقام رکھتا ہے! پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ لکھنے والے نے یہ خط کس توقع کی بنا پر ہی لکھا ہے اور اس کی اشاعت کے لئے ماہنامہ "فکر و نظر" ہی کو منتخب کیا ہے۔

ادارہ "فکر و نظر" نے اس خط کو جوں کا توں چھاپ دیا! خط کے کسی جزو پر کوئی اختلافی یا وضاحتی نوٹ نہیں دیا گیا، جیسے "ادارہ" ان افکار و خیالات اور مشوروں کو قدر و استحسان کی نگاہ سے دیکھتا ہے! جس رسالہ کے ایڈیٹر صاحب اس عقیدہ کے علمبردار اور اس فکر کے موجد ہوں کہ شریعت کو ریاست (STATE) کے تابع اور اس کا حاشیہ بردار ہونا چاہئے، اتاترک مصطفےٰ کمال، اور صدر ناصر جن کے نزدیک اسلام کے ہیرو ہوں اور اسلامی نظام حکومت کے مقابلہ میں جو صاحب سیکولرزم اور سوشلزم کو پسند کرتے ہوں مندرجہ بالا مکتوب ان بزرگ کی تمناؤں اور منصوبوں کے عین مطابق اور ان کے افکار کا مظہر و ترجمان ہے۔

متحدہ ہندوستان میں جب پاکستان کی تحریک قائداعظم کی ممتاز قیادت میں رواں دواں تھی اس قسم کی کوئی یادداشت انہیں دیتا تو ایسی یادداشت، مکتوب اور مشورت نامہ کو اس کے منہ پر دے مارتے اگر خط لکھنے والا مسلم لیگ سے وابستہ ہوتا تو قائداعظم انتہائی سخت قسم کا نوٹس لیتے۔

اس تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کسی طرح اس کا پتہ چل جاتا کہ پاکستان بن جانے کے بعد یہاں نہ تو کسی "منکر" پر پابندی عائد کی جائے گی اور نہ کسی "معروف" کو قائم کیا جائے گا، شراب، قمار بازی، زنا، بدکاری، سود اور ایسی قسم کے منکرات اسی طرح چلتے رہیں گے، جس طرح انگریز کے دور میں چلتے تھے، بلکہ ترقی و آزادی کے نام پر جن حرکتوں کے ارتکاب کی انگریز جرأت نہ کر سکا تھا۔ مثلاً تعلیمی اداروں میں رقص و سرود کا رواج، عائلی قوانین میں ترمیم،

پاکستان بن جانے کے بعد مسلم اقتدار کے سائے میں یہ سب کچھ ہو کر رہے گا ـــــ تو خدا کی قسم قائدِ اعظم اور قائدِ ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں کی شخصیتوں کے اثر و نفوذ کے باوجود، مسلم لیگ کو نہ تو مسلمانوں میں قبولِ عام حاصل ہوتا اور نہ پاکستان کی تحریک کامیاب ہوتی! مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں کو کامیابی صرف اس لئے حاصل ہوئی کہ انہوں نے وعدہ کیا کہ پاکستان میں اسلام کا چلن ہوگا۔

متحدہ ہندوستان کے مسلمان اس خوش فہمی کا شکار ہو گئے کہ پاکستان میں خلافتِ راشدہ کی بہارِ رفتہ لوٹ آئے گی، اللہ کے دین و آئین کو یہاں سر بلندی اور غلبہ میسر آئے گا، یہاں کا معاشرہ کتاب و سنت کے اخلاق کی اساس پر اُستوار کیا جائے گا! اسی قسم کے پاکستان کے لئے جو اسلام کی پاکیزگی کا مظہر ہوگا، متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانی دی تھی! اُن کو اس کا اندازہ ہو جاتا کہ اخلاق و پاکیزگی تو ایک طرف رہے پاکستان میں اُردو بھی حکومت کی زبان نہ بن سکے گی، تو وہ پاکستان کے حق میں ووٹ نہ دیتے، اور اُن پر یہ بات کسی طرح ظاہر ہو جاتی کہ پاکستان کی تعلیمی درسگاہوں میں اُن کی لڑکیوں کو رقص و سرود کی ترغیب دلائی جائے گی تو وہ اس قسم کے پاکستان کی مخالفت کرتے! یہ اسلامی نظام کے قیام کی خوش فہمی تھی جس کے بل بوتے پر ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آ گیا!

یہ غلط اندیش مُشیر! فاضل مکتوب نگار جو سیاست و عمرانیات اور فلسفہ و منطق پر نگاہ رکھنے کے مدعی ہیں، جس کے حوالے اور اشارے اُن کے مکتوب میں ملتے ہیں ـــــ کیا اُنہیں پاکستان میں کوئی ایسی کوتاہی کمی یا خرابی نظر نہیں آتی جو اصلاح کی محتاج ہو! کیا وہ اسی میں اپنے علم و فضل اور دانش و آگہی کا کمال سمجھتے ہیں کہ تصویر کے دھندلے رُخ سے صرفِ نظر فرما کر، اہلِ اقتدار کی قصیدہ خوانی کریں اور پھر اُنہیں علماء کے زور توڑنے اور دینی مدارس کو ختم کرنے کا مشورہ دیں اور ملک میں اصلاح و ترقی کے لئے نمونہ کے طور پر کمال پاشا اور جمال ناصر کو سامنے لائیں کہ ان شخصیتوں نے اپنے ملکوں میں دین اور دیندار طبقہ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اسی کی تقلید پاکستان میں بھی کی جانی چاہیئے۔

دین و اخلاق کے تقاضوں کو تو اس مزاج کے لوگ کیا پہچانیں گے کہ اس تصور ہی سے اُن کے ذہن و فکر یکسر عاری ہیں مگر ہم مکتوب نگار صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ متحدہ ہندوستان بالغ رائے دہی کے تحت جمہوری طریقہ سے آزاد ہوا ہے اور پاکستان بھی جمہوریت کے ذریعہ وجود میں آیا ہے! انگریز کے دور میں جن لوگوں نے کامیابی کے ساتھ آزاد جمہوریت کا تجربہ کیا ہے اور جنہوں نے برسوں صوبوں میں حکومتیں کی ہیں اور انگریز کے آخر دور میں مرکزی حکومت جن کے دست تصرف میں رہی ہے، پاکستان بننے کے دس گیارہ سال بعد یہ لوگ جمہوری حقوق لینے اور انہیں استعمال کرنے کے اہل کیوں نہیں رہے! اُن کی یہ اہلیت اور قابلیت و استعداد آخر کس طرح سلب ہو گئی اور آزاد جمہوری نظامِ حکومت کے معاملے میں یہ بے چارے کس طرح کورے رہ گئے!

انگریز نے اب سے تقریباً ۵۰ سال قبل منٹو مارلے اسکیم کے تحت جمہوریت کی جو پہلی قسط دی تھی، جس کی رو سے میونسپلٹیاں تو قائم ہو گئیں مگر اُن کے چیرمین ضلع کے کلکٹر ہوا کرتے تھے! پاکستان میں بنیادی جمہوریت کا آغاز بھی انگریز کی دی ہوئی جمہوریت کی پہلی قسط سے ہوا ہے؟ ـــــ اس کو آخر کیا سمجھا جائے! انگریز کے دامِ غلامی سے آزاد ہو جانے کے بعد، آزاد جمہوریت کا ہر حق پاکستانی عوام کو ملنا چاہیئے تھا، مگر وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

لوٹ پیچھے کی طرف گردشِ ایام کچھ اور

عوام کو بھی بنیادی جمہوریت کے نسخہ کیمیا نے جمہوری حقوق کے معاملہ میں ساٹھ سال پیچھے لوٹا دیا۔ آخر یہ کیا ہوا، طرفہ تماشہ یہ ہے! اس طرف مکتوب نگار کی نگاہ نہیں گئی، توجہ اس طرف دلانی چاہئے تھی۔ لیکن اس کے برخلاف اور جمہوریت کے نام پہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ "ملاؤں" کے زور کو ختم کر دیا جائے اور دینی مدرسوں کو توڑ دیا جائے! ٹھیک اسی انداز پہ لازم مکتوب نگار نے سوچا ہے، بھارت میں بھی مسلمانوں کے دینی مدرسے اور مکتب توڑ دینے کی مرکز کو رپورٹ بھیل ہے! نگاہ میں کجی اور نیت میں فساد ہو تو بعض معاملات میں کافر اور مسلمان دونوں ایک ہی طرح کا رول ادا کرتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ اس قسم کے خوشامدی اور غلط اندیش مشیروں کی کارستانیوں کے مکروہ نقوش اپنے سینہ میں رکھتی ہے کہ سورج کے پجاریوں نے بے جا خوشامد کر کے اور غلط مشورے دے کر اچھے حاکموں اور خیر پسند وہ اندیش فرماں رواؤں کو ملک کا سامنے پہ زوال دیا ہے۔

یہ لوگ ارباب اقتدار کے مزاج شناس ہوتے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کرسی پر جو ایک بار آ جاتا ہے، وہ اپنے اقتدار کی سے زیادہ دراز عمر کی تمنا رکھتا ہے اور ہر وہ قوت جو ملک میں آبھرتی ہوتی ہے، اُسے خوف و اندیشہ کی نگاہ سے دیکھتا ہذا خوشامد پسند طبقہ اس انداز میں خود کو پیش کرتا ہے کہ یہ لوگ تو اقتدار کی حفاظت کے لئے سینہ سپر بنے ہوئے ہیں۔ مگر جو قوتیں ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتیں، وہ کچھ اور ارادے رکھتی ہیں، اس لئے یہ بدخواہان جاہ و دولت ان تحریکوں، انجمنوں اداروں کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان مفسدوں کا خداوند نعمت کو قلع قمع کر دینا چاہئے، ورنہ یہ آگے چل کر خطرناک فتنہ بن جائیں گے اسپرٹ اس مکتوب میں پائی جاتی ہے۔

ہم عرض کرتے ہیں جمہوری ملک اور ریاست میں اگر کوئی فرد جماعت برسر اقتدار آنے کا جذبہ رکھتی ہے اور آئینی حدود میں اس مقصد کے حصول کے لئے جد و جہد کرتی ہے —— یہ گناہ اور جرم تو کیا کوئی ناپسندیدہ بات بھی نہیں ہے۔

اس مکتوب میں اس دور کی مشہور کتاب "خلافت و ملوکیت" کے حوالہ سے بعض اشتعال انگیز باتیں کہی گئی ہیں! "خلافت و ملوکیت" ہی کے مصنف پر کیا منحصر ہے، جب بھی پہلی صدی اور دوسری صدی ہجری کے وسط کی تاریخ کوئی مورخ لکھے گا، وہ حضرت امام حسینؓ اور نفس زکیہؒ جیسے انقلابی مجاہدوں اور سرفروشوں کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اگر مورخ حق پسند ہے تو وہ ان بزرگانِ دین کے موقف کو جو انہوں نے غلط کار مسلم فرمانرواؤں کے مقابل اختیار کیا تھا، سراہے گا!

حضرت امام حسینؓ، نفس زکیہ اور حضرت امام ابوحنیفہ ہماری تاریخ کے ہیرو ہیں، ہم فخر کے ساتھ ان کے کارناموں کو بیان کرتے ہیں! انہوں نے اصلاح و انقلاب کے لئے بیشک ایک پیام، روشنی، خیال اور اصول دیا ہے! جن لوگوں کو بزرگوں کے کارناموں کے ذکر سے خوف لگتا ہے، اُن کو چاہئے کہ اپنی اصلاح کریں! یہ تو قیاس مع الفارق ہے کہ جو کوئی مفکر، مورخ اور اہل قلم ان بزرگوں کے موقف کی تائید و تصویب بلکہ تحسین کرتا ہے، وہ خروج و بغاوت کا داعیہ اپنے اندر رکھتا ہے! اب رہا قوت حاصل کر کے کسی ملک میں انقلاب پیدا کرنے کا سوال تو آج کی دنیا میں کتنے بہت سے فرمانروا ہیں، جو اسی طرح برسر اقتدار آئے ہیں! اور اُن کو لوگ صرف اس لئے بُرا نہیں سمجھتے کہ انہوں نے طاقت کے ذریعہ حکومت کیوں حاصل کی!

پاکستان میں اصلاح و انقلاب کے داعی واضح الفاظ میں اس کا بار بار اعلان کرتے رہتے ہیں کہ یہاں آئینی حدود میں رہ کر اصلاح و انقلاب کی جد و جہد جاری رہنی چاہئے، یہ راستہ طویل ہے مگر ملک کی خیر خواہی اور سلامتی اسی میں ہے کہ جمہوری اور آئینی

طریقوں سے اس مقصد کو حاصل کیا جاتا ہے! رائے عامہ کے مقابلہ میں کوئی مضبوط سے مضبوط حکومت زیادہ دن تک نہیں ٹھہر سکتی! ہم سب کے سامنے کی بات ہے کہ انگریز، جس کے حدود مملکت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، رائے عامہ کا مقابلہ نہ کرسکا! نفسیاتی طور پر یہ بات درست ہے کہ اصلاح و انقلاب اور حکومت کی تبدیلی کے الفاظ ارباب اقتدار پر انتہائی گراں گزرتے ہیں، وہ اس قسم کا ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے ——— لیکن اُن کی خوشی اور دل دہی کی خاطر اعلاء کلمتہ الحق کے فریضہ کو تو پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا! جو لوگ ملک و ملت کے بننے بگڑنے کا احساس رکھتے ہیں، جن کو اپنا ایمان عزیز ہے، جن کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے حضور اعمال کی جواب دہی کرنی ہے ——— وہ حق بات کہیں گے اور ڈنکے کی چوٹ کہیں گے، وہ انگلی رکھ کر بتائیں گے کہ ملک و حکومت کے فلاں شعبہ میں یہ یہ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، اور حکومت کی فلاں پالیسی اور منصوبہ بندی ان اسباب و وجوہ کی بنا پر مضرت رساں ہے، اس جائز و واقعی احتساب پر تخریب و فساد اور ملک دشمنی کا ٹھپہ لگا دینا، اپنی جگہ خود ایک طرح کا فساد ہے۔ اس قسم کی آئینی تنقید سے کوئی حکومت نہیں بچ سکتی۔

الزام اور مشورے مکتوب نگار نے یورپ کے کلیسائی نظام کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں گلیلیو اور کوپرنیکس کے نام لئے ہیں کہ ان کو سائنسی ایجادوں کے جرم میں کلیسا نے مجرم ٹھیرایا۔

——— مگر ———

پاکستان کے علماء اور دینی طبقہ کے ذکر کے ساتھ یہ تاریخی حوالے بالکل غیر متعلق ہیں، یہاں پاکستان میں کس عالم نے سائنس کی ایجاد کو مخالف دین قرار دیا ہے اور کس سائنسداں پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے! اس قسم کی اٹکل پے جوڑ باتوں سے آخر فائدہ! پاکستان میں کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ کے خرچ سے نہریں نکلی ہیں، عظیم الشان بند تعمیر ہوئے ہیں، شاندار عمارتیں بنی ہیں، پانی اور بجلی کے ذخیرے میں اضافے کئے گئے ہیں، کہاں اورینٹ ایرویز کے وہ چھکڑے کی قسم کے ہوائی جہاز اور کہاں پی، آئی، اے کے اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے ترقی یافتہ سیارے کہ ——— "پلک مارتے ہیں یہاں سے وہاں"! پاکستان کی ان مادی ترقیوں کو کس عالم نے ناجائز قرار دیا ہے۔ کس سائنس کی تجربہ گاہ، دواؤں کی لیبارٹری، اور جہاز سازی کے کارخانہ اور کل پرزے بننے کی فیکٹری پر علماء پاکستان نے کراہت تحریمی کا فتویٰ لگایا ہے۔ یہ بلاوجہ کا الزام ہے جو اُن بیچاروں پر "مُلّائیت" کی آڑ میں تھوپا جارہا ہے کہ یہ "قل آعوذیے" مادی ترقی کی راہ میں حائل ہیں اسلام کسی بڑی سے بڑی مادی ترقی کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنتا، ہاں! ایسی ترقی جس سے اخلاقی حدود ٹوٹتی ہوں، اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ ترقی ہے:

علامہ اقبال نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ دین دے کر اگر آزادی جیسی بیش بہا نعمت بھی ملتی ہو ——— تو

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

کسی بڑی سے بڑی مادی ترقی پر اسلامی اخلاق کی کوئی قدر قربان نہیں کی جاسکتی، اس فکر و عقیدہ کا نام اگر "ملائیت" ہے تو ہماری تاریخ کے تمام اکابر "ملا" تھے اور اسلام کا دوسرا نام "ملائیت" ہے۔

علماء کرام نے اپنی زندگی دین و شریعت کی تعلیم و تعلم اور درس و تدریس میں گزاری ہے، کتاب و سنت کے تقاضوں اور دین کے مزاج کو وہ ان لوگوں سے زیادہ پہچانتے ہیں، جنہوں نے نہ دین کو پڑھا ہے اور نہ دینی ماحول میں زندگی گزاری ہے۔ عائلی قوانین کی مخالفت پاکستانی علماء نے اس لئے کی تھی کہ اس کی متعدد دفعات شریعت کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں، انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ایسا قانون جو نکاح و طلاق کے معاملات میں تو مشکلیں اور دشواریاں پیدا کرتا ہو مگر زنا اور اس کے دواعی پر کوئی

نہیں لگاتا، اسلامی معاشرے کو راس نہیں آسکتا۔ تعدد ازدواج کی اجازت میں اللہ تعالیٰ نے جو مصلحت رکھی ہے اُسے
ختم کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے!

انگریز کے دور میں جب ہربلاس شاردا نے کمسنی کی شادی پر پابندی لگانے کا بل اسمبلی میں پیش کیا تھا تو رئیس الاحرار
محمد علی نے اُس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی تھی! مولانا محمد علی کو کون احمق "ملا" کہہ سکتا ہے، انہوں نے اُس زمانہ میں آکسفورڈ
سے بی۔ اے کیا تھا، جب متحدہ ہندوستان میں انٹرنس پاس کرنا بہت بڑی بات تھی، شہرہ آفاق انگریزی روزنامہ کامریڈ کے مدیرِ اعلیٰ!
انگریزی تحریریں پڑھ کر مغربی ادیب اور اہلِ قلم عش عش کرتے تھے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں صفِ اول کے مجاہد تھا!
یہ تھی کہ مولانا محمد علی میں دینی غیرت تھی، وہ شریعت کا احترام کرتے تھے، اس لئے شاردا ایکٹ کے خلاف انہوں نے پوری ایمانی
قوت کے ساتھ احتجاج کیا۔

بھارت کے نیتا بھی مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت کا ارادہ رکھتے ہیں، اُن کے اس ارادہ کے خلاف غیرت مند علماء کی
غالب اکثریت نے احتجاج شروع کر دیا ہے ان کے اس احتجاج اور عزیمت و استقامت کو دیکھ کر بھارتی حکومت ابھی تک اس
معاملہ میں مذبذب ہے۔

مکتوب نگار نے مصطفےٰ کمال، رضا شاہ پہلوی، صدر ناصر اور ظاہر شاہ کو مثال میں پیش کیا ہے کہ ان اکابر نے ــــــ
عوام کے ذہن سے مُلّائی تسلط کو کافی حد تک بے اثر کر دیا ہے "کوئی شک نہیں یہ لوگ دنیوی جاہ و اقتدار کے اعتبار سے بڑی
شخصیتیں ہیں مگر جہاں تک دینی مسائل کا تعلق ہے، ان میں سے کوئی "بڑا آدمی" بھی نہ ملت کے لئے نمونہ ہے اور نہ اُن میں سے کسی کا
قول و عمل دین میں نظیر اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ دینی طبقہ کے لئے بڑی مشکل ہے، ایران و افغانستان میں تجدد کا جو رنگ
ہے اگر اُس کی تفصیل بیان کی جائے تو کہا جاتا ہے کہ ایسی باتوں سے ان ممالک سے ہمارے دوستانہ تعلقات مجروح ہوتے ہیں، چنانچہ
پاکستان کے ایک دینی مجلہ نے ایران کے حالات پر مقالہ شائع کیا تو اسے ہماری حکومت نے کئی مہینہ تک کے لئے بند کر دیا۔

سامنے کی بات یہ ہے کہ اُن ملکوں میں "پردہ" اٹھتا جا رہا ہے اور مسلمان عورتیں نقاب و برقعہ سے آزاد ہوتی جا رہی ہیں!
مگر کسی ملک کے خواص اور عوام کسی ایسی بات کو ترقی کی ضمانت سمجھ لیں، جو اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے، تو ان کا یہ فعل امت کے لئے
نظیر تو نہیں بن سکتا، غلط بات غلط ہی رہے گی، چاہے اُسے ساری دنیا نے اختیار کر لیا ہو اور صحیح بات غلط نہیں ہو سکتی چاہے پوری
دنیا میں اُس پر عمل کرنے کے لئے ایک فرد بھی تیار نہ ہو۔

آج کا معصیت پرور دہ اور تجدد زدہ معاشرہ بیشک یہی کہتا ہے اور اس پر عمل پیرا بھی ہے کہ "پردہ" صنفِ نازک کی ترقی
کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور یہ اُس دور کی یادگار ہے جب دنیا تمدن و تہذیب سے آشنا نہ تھی! جو علماء اس فکر و خیال
کی مخالفت کرتے ہیں اُن پر "ملا" کی پھبتی چست کی جاتی ہے کہ یہ تنگ نظر ہیں اور زمانہ کے تقاضوں اور سائنس کی ترقیوں سے
بے خبر ہیں۔

مگر

علماء کیا کریں جب کہ قرآن پاک میں "جلباب و خمار" کے واضح الفاظ موجود ہیں اور امہات المومنین تک کو وقار کے ساتھ گھر کی
چار دیواری میں رہنے اور غیر مردوں سے پردے کی آڑ سے بات چیت کرنے کی تاکید کی گئی ہے! قرآن نے عورت کے لئے حجاب و حیا
کا جو معیار و اصول مقرر کیا ہے، اُس کی شرح و تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال میں ملتی ہے، حضور نے فرمایا

کہ جو عورت خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلتی ہے وہ زانیہ ہے ! ارشادِ نبوی کا مقصد واضح ہے ۔ یہ کہ نامحرم مردوں کے
عورت کے لباس کی خوشبو سے ہیجان پیدا ہوگا۔ اس طرح اُس عورت کا یہ فعل بدکاری اور ہوسناک جذبات کے ہیجان کی طرف
دماغ کو لے جائے گا ! عہدِ رسالت اور خلافت راشدہ کے دور کا معاشرہ اور اُس کی پوری تفصیل کتابوں میں موجود ہے، اس
زمانہ میں نامحرم مردوزن کے درمیان حجاب و حیا کی مقدس حدود حائل تھیں اور وہ آپس میں آزادانہ میل جول کو بہت بُرا
سمجھتے تھے ــــــ یہ احکام، اصول، مثالیں، نظیریں اور تاکید و احتیاط جب کتاب و سنت اور آثار و اخبار میں ملتی
تو علماء کیا کریں ! اُن "مسٹروں" کی پیروی کریں جنہوں نے ان حدود کو توڑ دیا ہے، یا خدا اور رسولؐ کے حکم کو سچا مانیں اور
عمل کر کے دکھائیں اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی نصیحت کریں، اس طرزِ فکر اور طریقِ کار کا نام اگر ملّائیت ہے، تو جو لوگ ملّا
کو مٹانے کا داعیہ رکھتے ہیں وہ دراصل اسلام کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں ۔

مردوزن کے بیباکانہ اختلاط نے سارے یورپ کو قحبہ خانہ بنا دیا ہے، اُن لوگوں کو کیا کہئے جنہوں نے آنکھوں پر ٹھیکرے
لئے ہیں ا ب ان کھلے ہوئے تجربوں سے کسی قسم کی کوئی عبرت نہیں ہوتی، ہوسناکی صرف چہروں کی بے حجابی اور لطف نظ
پر قناعت نہیں کرتی، ہر بے احتیاطی اور لذت کے بعد ہوس "ہل من مزید" کا مطالبہ کرتی ہے، یہاں تک کہ برہنگی اور فحاشی کی کوئی
انتہا باقی نہیں رہتی اور آدمی اُس پستی اور گراوٹ تک پہونچ جاتا ہے کہ جسے بندر اور سور بھی دیکھیں تو اُنگلیاں دانتوں میں دبالیں
اسکول اور کالج ہوں، دفاتر اور کارخانے ہوں، ہسپتال اور ہوٹل ہوں ــــ غرض جہاں بھی مردوزن کو میل جول
کا آزادانہ موقعہ ملتا ہے، وہاں اخلاقی خرابیاں لازمی طور پر پیدا ہو کر رہتی ہیں، کوئی چاہے تو اپنے کو اس فریب میں مبتلا رکھے
ہے کہ یہ مذہبی لوگوں کا نرا وہم ہے۔ حالانکہ یہ وہم نہیں حقیقت ہے، تجربہ و مشاہدہ ہے ــــ وہاں سب کچھ ہوتا ہ
یہ کلچرل شو، یہ گرلز گائیڈ، یہ مخلوط تعلیم، یہ درسگاہوں میں لڑکیوں کے ڈرامے اور رقص و سرود کے ہنگامے ــــ ع
ان پر ٹوکتے ہیں تو وہ اپنا دینی فرض ادا کرتے ہیں اگر فحاشی اور بے احتیاطی کی یہ باتیں ترقی و تہذیب کی نشانیاں ہیں تو لعنت،
ایسی ترقی پر اور تُف ہے اس تہذیب پر !

کوئی مسلمان جو اسلام کی ابجد سے بھی واقف ہے اور شریعت کا تھوڑا سا بھی علم رکھتا ہے ــــ کیا وہ اتاترک مصط
کمال کے "تجدد" کو قدر و استحسان کی نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے ــــ ساری دنیا جانتی ہے کہ مصطفےٰ کمال نے استنبول کی
تاریخی مسجد کو میوزیم میں تبدیل کر دیا، عربی زبان میں اذان دینا ممنوع قرار دے دیا، ترکی کا رسم الخط رومن رسم الخط سے بدل
اسلامی شریعت کو منسوخ کر کے مغربی قوانین ترکی میں نافذ کر دئے ــــ جو لوگ اتاترک مصطفےٰ کمال کی "دینی بے راہ روی" کو
"اسلام" سمجھتے ہیں اور اسی "تجدد زدہ اسلام" کو پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں، وہ پاکستان اور اسلام دونوں کے خیرخواہ نہیں ہیں
کے اس "کمالی ایڈیشن" کی مخالفت اور اُسے پاکستان میں درآمد ہونے سے روکنا، علماء کا سب سے بڑا فریضہ ہے ۔ جہاں تک اُن کے
میں دم ہے وہ اس قسم کے محرف اور مسخ شدہ اسلام کو پاکستان میں نہ آنے دیں گے !

مکتوب نگار نے اپنے مکتوب میں صدر ناصر کا نام بھی لیا ہے، اس سلسلہ میں ہم صرف ایک بات کہنا چاہتے ہیں کہ پاکستان کے صد
محترم فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے ہندوستان کے خلاف جہاد کا آغاز "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے مقدس کلمہ
سے کیا تھا اور عرب و اسرائیل کی جنگ میں صدر ناصر کی زبان سے اللہ اور رسول کا نام ہی نہیں نکلا، وہی عرب قومیت کی تکریم کے جاہلانہ نعر
ــــ تو کیا الطاف جاوید صاحب یہ چاہتے ہیں کہ پھر کبھی جہاد کا موقعہ آئے، تو پاکستان کے اکابر "نحن ابناء الفراعنہ" کی تقلید

جو ڈاکٹر کی اولاد ہیں؟ کے نعروں سے آغاز جہاد کریں، اور مکہ اور مدینہ کی تہذیب و تمدن پر فخر کرنے کی بجائے موہنجودڑو اور (ان) کی تہذیب پر فخر کیا کریں!

اس مکتوب میں صرف آمر کا ذکر کیوں؟ کیا مکتوب نگار محترم صدر پاکستان کو یہ مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ آپ بھی پاکستان میں آمر (کی) مثال قائم کر دیں۔ یہ مشورہ کتنا غلط اور گمراہ کن مشورہ ہے؟ اسی قسم کے مشیروں اور ہوا خواہوں نے نہ جانے کتنے بڑے آدمیوں کی دنیا کو غارت کیا ہے! اور طرح طرح کے پڑھاوے دے دے کر ناروا باتوں پر انہیں دلیر بنایا اور فخر کرنا سکھایا ہے۔

(ہ)اج نبوت اور حکومت الٰہیہ سے دشمنی۔

مکتوب نگار نے صدر محترم کو مشورہ دیا ہے کہ:۔

"تمام نجی مذہبی مدرسوں اور دارالعلوموں کو بند کر دیا جائے"

کس جرم میں؟ اس کی تشریح بھی صاحبِ مکتوب نے فرما دی ہے ——— یہ کہ ان مدارس میں "ایک دقیانوسی، فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ نصابِ تعلیم رائج ہے ———" اس نصاب میں قرآن حکیم کو ایک زندہ اور (ا)کتاب کی حیثیت سے مقام نہیں دیا گیا" ——— اور یہ مذہبی مدرسے اور دارالعلوم اس ملائی نظام کی قوت و اقتدار کے مصدر کی (پ)یثت رکھتے ہیں؟ ——— ——— !

اگر کسی درخت کی ایک دو شاخیں کمزور اور مرجھاتی ہوئی نظر آتیں، تو کیا اس درخت کو کاٹ دینا، کوئی دور اندیشی کی بات ہوگی!

(دی)نی مدرسوں میں جو درسِ اسلامی پڑھایا جاتا ہے وہ جزوی طور پر اصلاح و ترقی کا محتاج ہے، بعض دینی مدرسوں نے بہتر کتابیں نصاب میں (شام)ل بھی کر لی ہیں مگر پورے درسِ نظامی کو فرسودہ اور افلاس زدہ نصابِ تعلیم کہنا بے جا مبالغہ ہے! اسی درسِ نظامی نے ملت میں (ا)یسے متبحر الفکر اور متبحر علماء پیدا کئے ہیں، جن پر ہمیں فخر کرنا چاہئے، درسِ نظامی نہ کسی دنیوی ترقی سے روکتا ہے اور نہ دینی طور پر (ک)وئی خرابی پیدا کرتا ہے!

اصل چیز جو مکتوب نگار کو ناگوار ہے وہ یہ ہے کہ ان مذہبی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ذریعہ "ملائی نظام" قائم ہے لہٰذا "ملائیت" (م)ٹانا مقصود ہے تو اس کے "ذریعہ" پر سب سے پہلے ضرب لگا دو، ان مذہبی مراکز کو ختم کر دو، تاکہ یہ ملا در بدر ٹھوکریں کھاتے پھریں، ان کی طرف رجوع ہونے کا تصور ہی عوام مسلمانوں کے ذہن و فکر سے نکل جائے!

وہ رؤیت ہلال کا مسئلہ ہو یا دینی مدارس کی تنظیم کا سوال، کانٹے کی بات یہ ہے، عوام کے پاس کسی قسم کا کوئی اختیار نہ رہنے پائے، اُن کے ہر طبقہ کو بالکل بے اختیار اور بے دست و پا کر کے رکھ دیا جائے، یہاں تک کہ اُن میں کسی غلطی اور برائی کے خلاف احتجاج کرنے کی صلاحیت اور ہمت ہی باقی نہ رہے۔ حکومت کے ہر قانون، منصوبہ اور حکم و مشورہ پر "سمعنا و اطعنا" کے علاوہ اور کوئی لفظ زبان سے نہ نکلے۔

ہم مکتوب نگار سے دریافت کرتے ہیں کہ دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے نصاب میں تو انہیں خرابیاں نظر آگئیں مگر یہ یونیورسٹیاں کالج، ہائی اسکول اور نیچے درجہ کے مدرسے جو حکومت کے زیرِ اہتمام چل رہے ہیں اور حکومت نظامِ تعلیم کے سپید و سیاہ کی مالک ہے کیا اس نظامِ تعلیم میں کوئی خرابی اور کوتاہی موجود نہیں ہے، اگر ہے تو ان خرابیوں کی نشاندہی اس "مکتوب مفتوح" میں کیوں نہیں کی گئی! انگریز نے کلرک سازی کا جو کام متحدہ ہندوستان کے نظامِ تعلیم سے لیا تھا، کیا پاکستان میں وہی نظامِ تعلیم رائج نہیں ہے!

جو حکومت اردو زبان کو ذریعہ تعلیم نہ بنا سکی، اور انگریز کے چھوڑے ہوئے نظامِ تعلیم میں موثر تبدیلی پیدا نہ کر سکی، دینی مدرسے خدانخواستہ اس کے دستِ تصرف میں آگئے، تو ان کا کیا حشر ہوگا؟

• ادارہ "تحقیقاتِ اسلامی" کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے، دین میں تاویل بلکہ تحریف کا جو کارنامہ یہ ادارہ انجام دے رہا ہے

علماء دین اس کی نشاندہی کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں ——— اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دینی درسگاہوں اور دارالعلوموں کو قانونی طور پر بند کرنے کے بعد خود حکومت جو دینی مدرسے قائم کرے گی، وہ کس مزاج کے ہوں گے۔ اُن میں دین کو کس انداز سے پیش کیا جائیگا ان کے فارغ التحصیل طلبا کیا بن کر نکلیں گے ؟

اس مکتوب کا ایک اور اقتباس :-

"...... مذہب کے نام پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے اور حکومت کو "منہاج نبوت" پر استوار کرنے کے لئے جذباتی نعرہ بازی کی بنیاد پر کسی شخص کو تحریک چلانے کی سختی سے ممانعت کر دی جائے، بلکہ ایسی قائم شدہ تحریکوں کو خلافِ قانون قرار دیا جائے، اور ان کی تنظیم پر بھرپور وار کیا جائے جس سے ان کی طاقت و قوت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے"

یہ ملحدانہ فکر، یہ اشتراکی مزاج اور اس پر اصلاحِ ملت کا کیا دعویٰ اور طنطنہ ہے، کیا کسی صاحبِ ایمان کے قلم سے ایسے جملے نکل سکتے ہیں کہ مذہب کے نام پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے اور حکومت کو "منہاج نبوت" پر استوار کرنے کے لئے تحریک چلانا "قانوناً" ممنوع قرار دیا جائے ——؟ نبوت سے یہ دشمنی - حکومتِ الٰہیہ سے اس قدر بیر! اس انداز پر کوئی یہودی ہی سوچ سکتا ہے، یہ جذبات اور خیالات کسی مسلمان کے تو نہیں ہو سکتے، مکتوب نگار کو اصل دشمنی "حکومتِ الٰہیہ" اور "منہاج نبوت" سے ہے ! دل کی بات زبانِ خامہ سے ظاہر ہو گئی !

علماء کرام پاکستان میں منہاج نبوت کی اساس پر حکومتِ الٰہیہ کا قیام چاہتے ہیں ——— اور مکتوب نگار کو حکومت الٰہیہ ہی سے دشمنی ہے اور "منہاج نبوت" سے نفرت اور عداوت ہے (معاذ اللہ) اس لئے ملاؤں کے زور توڑنے اور دینی درسگاہوں کو بند کرنے کا مشورہ دیتے ہیں ! اس طرح پاکستان میں حکومتِ الٰہی کے قیام کی جد وجہد کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ رہے گا !

اس مکتوب میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس میں محترم مکتوب الیہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہو، خشیتِ الٰہی، کا ذکر ہو، آخرت کے محاسبہ کے لئے یاددہانی اور انتباہ ہو ! حکومتِ پاکستان میں آمدنی کے جو ذرائع ہیں اُن کے بارے میں کوئی اشارہ تک نہیں کہ ان ذرائع کو پاک اور حلال ہونا چاہئیے ——— مثلاً گھوڑ دوڑ کے قمار پر جو ٹیکس وصول ہوتا ہے وہ حلال آمدنی نہیں ہے ! معاشرے کی اخلاقی پستی کو درست کرنے کے لئے کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی ! سارا زور اس پر دیا گیا ہے کہ ان "ملاؤں" کا زور جس طرح ممکن ہو توڑ ڈالو اور ان کو کسی قابل نہ رہنے دو۔

حالات ناسازگار ہیں مگر ؟؟

ملت اسلامیہ اور اسلام پر ایسا سخت وقت شاید کبھی نہ آیا ہو، کھلے ہوئے دشمنوں ——— ابولہب اور ابوجہل ——— کے ساتھ نہ جانے کتنے "عبداللہ بن ابی" ہیں جو مسلمانوں میں مل کر اسلام کے خلاف سازش کر رہے ہیں ! دنیا کی جو مشہور اور باا‌ثر بین الاقوامی طاقتیں ہیں وہ کسی ایسے مسلمان کا برسرِ اقتدار آنا گوارا نہیں کر سکتیں جو عملاً اسلام کو قائم کرنا چاہتا ہو، یہ طاقتیں اُس فرد اور پارٹی کو " PROTECTION " دیں گی اور اس کی سرپرستی اور مدد کریں گی، جو حکومت و سیاست اور معاشرے میں اسلام سے گریز کی راہیں پیدا کرے اور اللہ کے دین کو غالب اور بر طاقت نہ بننے دے !

پاکستان میں ادارہ "طلوعِ اسلام" ہے، قادیانی ہیں، کمیونسٹ ہیں، مغرب زدہ متجددین ہیں اور پھر وہ ریسرچ اسکالرز ہیں جو "تحقیقات اسلامی" کے نام پر اسلام کی تحریف کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ——— یہ سب یہاں اسلامی نظام کے روکنے کے لئے

اتے ہوئے ہیں، ان کے درمیان فکر ونظر کے بعض اختلافات پائے جاتے ہیں مگر اسلامی نظام کے یہ سب متحدہ دشمن ہیں ! یہ حالات کوئی شک نہیں بڑے ہی دل شکن اور انتہائی تکلیف دہ ہیں !

مگر

مجھ کر ایمان لاتے ہیں کہ یہی اور صرف یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو زندگی کے ہر دکھ کا مداوا کر سکتا ہے، یہی وہ نظام ، و سیاست اور معاشرے کو متوازن، قابلِ عمل اور طاہر و پاکیزہ بنا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کے دین کو ہر مذہب فکر اور غالب آنا ہے، اسلام کے مقابلہ میں ہر دستور اور ہر قانون رد کر دینے کے قابل ہے، کتاب وسنت نے جو ضابطۂ اخلاق ملت انسانی معاشرے کو طہارت و پاکیزگی میسر آ سکتی ہے اور یہ خالص صرف اسلام ہے باقی سارے مذاہب فکر دار) کھوٹے سکے ہیں ـــــ جو اہل ایمان یہ یقین و فکر، عزیمت و استقامت اور داعیہ رکھتے ہیں، اُن کی ان کا وقت آن پہونچا ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا ہر کسی کا خوف دل سے نکال دیجیئے اور اسلام کی حفاظت کے لئے سینہ سلمان کا سر کٹ سکتا ہے مگر باطل کے آگے جھک نہیں سکتا ! کسی غیر اسلامی نظریہ اور "ازم" سے کوئی مصالحت نہیں ! ہیں ہے نہ عقیدہ کا نہ فکر و نظر کا اور نہ قول و عمل کا ! جنت یوں ہی ٹھنڈی چھاؤں میں کسی خلش کے بغیر مراقبہ کرنے اور ہاتھ نہیں آتی، اس کے لئے راحت و آرام اور جان و مال کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد انسان پہونچا ہے جب دین پر جمے رہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہاتھ میں دہکتا ہوا انگارہ پکڑے رہے !

حالات انتہائی ناساعد ہوں، قدم قدم پر رکاوٹیں ہوں، حق کی راہ میں کانٹے بکھرے اور انگارے بچھے ہوئے ہوں، زت و آبرو کے لئے طرح طرح کے خطرات ہوں ـــــ ایسے ماحول میں اللہ تعالیٰ کا دین عملاً برپا کرنے کے لئے جو ے گی اُس کے ثواب و جزا کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں !

ہم اقامتِ دین اور اسلامی نظام بولتے ہیں اور اُس سے جو کوئی فساد و بغاوت مراد دیتا ہے، تو خود اُس کے ذہن میں شر و ہ اسلام تو دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیام ہے، اگر دنیا میں آج اسلامی نظام قائم ہو جائے تو یہ دنیا جو درندوں کا جنگل ن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے ! اسلام رحمتِ الٰہی کی شبنم ہے، اسلام اللہ تعالیٰ کی شانِ کرم کا ظہور ہے، اسلام شجرِ جنت کا سلام انسانیت کے لئے امن کا پیغام ہے، اسلام سعادت و فلاح کا منشور ہے !

ی نظام کی دعا اگر کسی کی ہوسِ زر پر، جھوٹے اقتدار پر، ناجائز تعیش و طمطراق پر اور غلط نظام فکر پر پڑتی ہو تو ے کوئی معذرت پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اسلام کو بہر حال اپنا وہ فرض ادا کرنا ہے، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اہے ۔

بیدار طبقہ کا یہ مزاج نہیں ہے کہ وہ کسی کی ذاتی دشمنی اور تعصب میں اچھی باتوں اور مفید تجویزوں میں خرابیوں کے نکتے یہ سکھاتا ہے اور یہی حق پسندوں کا شعار ہونا چاہئے کہ حق بات کی چاہے وہ کسی کے منہ سے بلند ہو دہی ہو تائید کریں اور مدد کریں ! مثلاً پاکستان میں مرکز کے مضبوط و مستحکم ہونے کے سوال پر تمام علماء متفق اور یک زبان ہیں، ایسی صوبائی خود سے مرکز کمزور ہوتا ہے ۔ ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ ہے، ہاں ! صوبوں کو وہ اختیارات دے دینے چاہئیں، جن کے یہ مادہ جو علامہ اقبال نے فرمایا ہے ـــ

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

تو پاکستان میں شعبہ مرکز سے ہر صوبہ کی وابستگی ضروری ہے! جو لوگ صوبائی آزادی اور خود مختاری کو مرکز سے علیحدگی اور بے نیازی کی حد تک لے جانا چاہتے ہیں، وہ پاکستان کی سالمیت اور وحدت کے دشمن ہیں، پاکستانی علماء کا طبقہ اس رجحان و فکر کا مخالف ہے اور مخالف رہے گا!

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اصلاحِ حال کی توفیق عطا فرمائے! ہمارا جینا اور مرنا خالص خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، ہمارے قول و عمل میں وہ اخلاص پیدا ہو جائے، جس کی غایت رضائے الٰہی کے سوا اور کچھ نہ ہو!

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

ماہر القادری
۲۴ جولائی ۶۷

سید قطب

ترجمہ:- سید معروف شاہ شیرازی

نشانِ راہ

(ادارہ معارف اسلامی کی زیر طبع کتاب کے چند اوراق)

اس وقت انسانیت جہنم کے گڑھے کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ اس کے سر پر خوف اور ہلاکت کی تلوار لٹک رہی ہے ——— کیونکہ ——— یہ تو بیماری کا اثر اور نتیجہ ہے نہ کہ اصل بیماری ——— بلکہ اس لئے کہ وہ ان "اعلیٰ اقدار" کے میدان میں دیوالیہ ہو چکی ہے، جن کے سائے میں ہمیشہ انسانیت کو فطری نشوونما اور صحیح ترقی نصیب ہوا کرتی ہے۔ انسانیت کی خستہ حالی مغربی دنیا میں تو روز روشن کی طرح واضح ہے، جس کے پاس کوئی ایسا مصدر نہیں ہے جو اسے اعلیٰ اقدار عطا کر سکے۔ بلکہ اس کے پاس خود اپنے زندہ رہنے کے لئے بھی ایسی کوئی وجہ جواز نہیں ہے جس سے وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکے۔ جبکہ وہاں جمہوریت صداف اس تک پہونچ چکی ہے اور اس نے اب آہستہ آہستہ مشرقی بلاک سے اقدار حیات کی بھیک مانگنا شروع کر دی ہے خصوصاً سوشلزم کے نام سے اقتصادی معاملات میں ——— یہی حال خود مشرقی بلاک کا بھی ہے مشرق میں اجتماعی نظریات جن میں اشتراکیت پیش پیش ہے، اور جس نے مشرق میں پہلے پہل کافی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کیا ...... بلکہ مغرب میں بھی ...... یہ ایک ایسے مذہب کے نقطہ نظر سے جس پر عقیدے کا رنگ غالب ہو، واضح طور پر شکست کھا رہی ہے۔ فکری لحاظ سے وہ اپنے موقف سے ہٹ چکی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے یہ اشتراکیت آج ایک نظریہ کی بجائے ایک نظام حکومت ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نے اپنے بے شمار نظریاتی اصول ترک کر دئے ہیں۔ یہ عملاً انسانی فطرت کے تقاضوں سے ٹکراتی ہے اور ہمیشہ ایک شکست خوردہ معاشرہ میں پروان چڑھتی ہے یا ایسے معاشرہ میں جو ایک طویل عرصہ تک ڈکٹیٹرشپ سے مانوس ہو چکا ہے۔ بلکہ اب تو نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ ایسے معاشروں میں بھی اس کا مادی اور اقتصادی نظام مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے ——— حالانکہ یہ واحد پہلو ہے جس پر اسے بے حد فخر رہا ہے اور جس پر اس کی پوری عمارت قائم ہے۔ روس جو اشتراکی نظام رکھنے والے ممالک میں صف اول کا ملک ہے، اس کی حالت یہ ہے کہ وہاں غلے کی پیداوار مسلسل کم ہو رہی ہے جبکہ زار کے عہد میں بھی وہاں فاضل پیداوار ہوتی تھی۔ اب وقت وہ گندم اور دوسرا غذائی سامان برآمد کر رہا ہے تاکہ کھانا کھا سکے۔ اس سبب سے کہ وہاں اجتماعی زراعت مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے اور وہ نظام ناکام ہو چکا ہے جو انسانی فطرت سے متصادم ہوتا ہے۔

انسانیت کے لئے ایک نئی قیادت کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

اہل مغرب کو انسانیت کی قیادت کا جو منصب حاصل تھا اس کے خاتمے کا وقت قریب آگیا ہے اس لئے نہیں کہ مغربی تہذیب

مادی لحاظ سے مفلس ہو چکی ہے۔ اقتصادی و عسکری قوت کے لحاظ سے وہ کمزور ہو چکا ہے بلکہ اس لئے کہ مغربی نظام کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اور اب اس میں اقدار کی وہ قوت باقی نہیں رہی ہے جس کے بل بوتے پر وہ اپنی قیادت قائم رکھ سکے۔

اس وقت ایک ایسی قیادت کی اشد ضرورت ہے جو ایک وقت پوری اقوام کی ذہانت سے حاصل شدہ ترقیوں اور ایجادوں کو نشو و نما کر ترقی دے سکے اور اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کو بالکل نئے سرے سے اونچی اقدار حیات بھی عطا کر سکے۔ اس کا طریق کار حقیقی، ٹھوس اور مثبت ہو اور بہ طور بغیر کہ انسانیت کے موجودہ علم آگاہی کو مد نظر رکھتے ہوئے متعین کیا جائے۔

اسلام ——— اور صرف اسلام . . . . . ہی ایک ایسا نظام حیات ہے۔ جس کے پاس ایسی اعلیٰ اقدار حیات (VALUES OF LIFE) اور ایسا ہی واضح طریق کار اور نصب العین موجود ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ علمی نشاۃ ثانیہ اپنا پارٹ ادا کر چکی ہے۔ ترقی کا یہ دور جس کی صبح سولہویں صدی عیسوی میں نمودار ہوئی تھی اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بام عروج کو پہنچ چکا ہے اور اب اس تحریک کے پاس کوئی جدید پروگرام نہیں ہے جس کے بل بوتے پر وہ زندہ رہ سکے۔

بالکل اسی طرح "وطنیت" اور قومیت اور دوسرے علاقائی اجتماعی نظریات جو اس عرصے میں نمودار ہوئے اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں اور اب ان کے اندر زندگی کو سیراب کرنے کا کوئی سرچشمہ نہیں ہے۔

ان نظریات کے ساتھ تمام دوسرے انفرادی و اجتماعی نظریات اور زندگی کے تمام عملی نظام ناکام ہو چکے ہیں اور اب صرف اسلامی نظام کا دور ہے۔ "امت مسلمہ" کی قیادت کا یہ دور نہایت ہی پرحیرت و اضطراب اور پریشان کن حالات میں آرہا ہے ——— اب اسلام کا دور اس لئے ہے کہ اسلام اس کرۂ ارض پر مادی ایجادات کو ناپسند نہیں کرتا بلکہ وہ انہیں انسان کا اولین فرض قرار دیتا ہے اور یہ اس وقت سے فرض قرار دیتا ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر اپنے خلیفہ کے طور پر بھیجا ہے۔ اسلام ان تمام کاموں کو ——— چند شرائط کے تحت ——— اللہ کی عبادت اور وجود انسانی کی غرض و غایت قرار دیتا ہے۔

واذقال ربک للملائکۃ انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ (بقرۃ : ۳۰)	اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔

دوسری جگہ ہے۔

وما خلقت الجنّ والانس الا لیعبدون (ذاریات : ۵۶)	میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اب امت مسلمہ ، دور ——— اس لئے بھی ہے کہ وہ اس مقصد کو پورا کرے جس کے لئے اللہ نے اس کو برپا کیا تھا۔

کنتم خیر امۃٍ اُخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ۔ (آل عمران : ۱۱۰)	اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔
وکذالک جعلناکم امۃً وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو

علیکم شہیداً

(البقرہ : ۱۴۳)

یعنی انسانیت کے لئے نمونہ۔

لیکن اسلام اسوقت تک اپنا فرض ادا نہ کر سکے گا جب تک کہ وہ کسی معاشرہ یا کسی قوم میں عملاً رونما ہو کر ایک مثالی نہ قائم ہو۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ انسانیت ——— خصوصاً ہمارے دور میں ——— کسی ایسے مجرد عقیدہ اور نظریہ پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جس کا کوئی مصداق اور عملی نظام اس خارجی و حقیقی زندگی میں نظر نہ آتا ہو اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ خارج میں امت مسلمہ کا وجود عرصہ دراز سے ناپید ہے کیونکہ امت مسلمہ کسی سرزمین کا نام نہیں جس میں کسی وقت اسلام زندہ تھا نہ امت مسلمہ کسی قوم کا نام ہے۔ جن کے آباؤ اجداد تاریخ کے کسی دور میں اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے . . . . . . بلکہ امت مسلمہ ایک ایسی انسانی جماعت کا نام ہے۔ جس کی زندگی، جس کے تصورات جس کی زندگی کے حالات اور طور طریقے جس کی زندگی کی اجتماعی تنظیم اور جس کی اعلیٰ قدروں کے تمام سرچشمے اسلامی نظام حیات سے پھوٹتے ہیں ——— یہ امت ان صفات کے ساتھ ظاہر ہے کہ عرصہ دراز سے ناپید ہو چکی ہے جب سے اس پورے کرۂ ارض پر سے اسلامی قانون کی حکمرانی ختم ہوئی ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر ضروری ہے کہ اس امت مسلمہ کا دوبارہ احیاء کیا جائے تاکہ اسلام ——— دوبارہ اپنا صحیح پارٹ (ROLE) ادا کر سکے جس کا عرصے سے انسانیت کو انتظار ہے۔

اس وقت امت مسلمہ کو نسل پرستی کے بھاری ملبے، غلط تصورات کے تاریک پردوں، جدید کلچر کی رنگینیوں اور جاہلی نظام ہائے حیات کی دبیز تہوں نے چھپا رکھا ہے۔ اس کا اسلام سے نہ کوئی تعلق ہے نہ نظام اسلامی سے کوئی واسطہ۔ اگرچہ لوگ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ یہ چیزیں آج نام نہاد "عالم اسلامی" کی شکل میں موجود ہیں۔

میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ امت مسلمہ کی احیاء کی کوشش اور حصولِ قیادت کے درمیان بڑی طویل مسافت ہے کیونکہ ایک عرصہ دراز سے امت مسلمہ کا نہ وجود ہے اور نہ اس کی کوئی عملی مثال کہیں نظر آتی ہے۔ انسانیت کی راہنمائی کے منصب پر عرصہ دراز سے کچھ اور افکار، کچھ اور اقوام، کچھ دوسرے تصورات اور کچھ دوسرے طور طریقے چھا چکے ہیں۔ اس طویل عرصے میں یورپین ذہنیت نے علم و ثقافت کے میدان میں نظم و نسق اور مادی ایجادات کی پیداوار میں معتدبہ تخلیقات کی ہیں یہ بہت بڑی ترقی ہے جس کے نقطہ عروج پر اس وقت انسانیت پہونچ چکی ہے جس تہذیب نے انسانیت کو یہ ترقی دی ہے اس کے بارے میں یا اس تہذیب کی صلاحیت کے بارے میں لوگوں کو بڑی آسانی سے بدظن نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً اس صورت میں جس کو آپ "عالم اسلامی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس میں ان خوبیوں میں سے ایک خوبی بھی موجود نہیں ہے۔

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود احیائے اسلام نہایت ضروری ہے۔ تجدید احیائے دین کی کوششوں اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے درمیان ایک طویل فاصلہ کیوں نہ ہو بہر حال احیائے اسلام کی کوشش پہلا قدم ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں

لہ نئی مسلمان تو موجود ہیں مگر جس امت مسلمہ کو نگاہیں ڈھونڈتی ہیں جو دینی اقدار کی محافظ اور قرآنی اخلاق سے متصف ہو کر دنیا کی رہنمائی اور قیادت کر رہی ہو (ملان)

کیا جا سکتا۔

اس کام کو علیٰ وجہ البصیرت سرانجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم امت مسلمہ کی ان صلاحیتوں اور خصوصیات سے خوب واقف ہوں۔ جن کی وجہ سے وہ پوری انسانیت کی قیادت کے اہل ہو جاتی ہے۔ تاکہ احیائے امت کی کوششوں کے دوران ہم کہیں صحیح عناصر کو چھوڑ کر غلط عناصر کا انتخاب نہ کر بیٹھیں۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ امت مسلمہ اس وقت اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ انسانیت کے سامنے محیر العقول مادی ایجادات لا سکے (اور نہ یہ اس کا مقصد زندگی ہے) جس کی وجہ سے اقوام کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں اور اس نقطہ نظر سے اس کی عالمی قیادت مسلم ہو جائے۔ مغرب کی ترقی اس میدان میں بہت حد تک آگے بڑھ چکی ہے اور کئی صدیوں تک اس بات کا امکان نظر نہیں آتا کہ اس کے مقابلے میں اس میدان کے اندر برتری حاصل کی جا سکے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہم میں کچھ اور خوبیاں اور قابلیتیں ہوں۔ ایسی خوبیاں جو اس تہذیب میں موجود نہ ہوں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم مادی ترقی کو پس پشت ڈال دیں یہ بھی ہمارے فرائض میں سے ایک اہم فرض ہے کہ ہم اس میدان میں بھی پوری طاقت سے جدوجہد کریں لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ یہ ہماری وہ صفت ہے جس کی بنا پر ہم تاریخ کے موجودہ حصے میں انسانیت کی قیادت کے لئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ مادی ترقی ہمارے وجود کے لئے ایک لازمی ضرورت ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اسلام بذات خود مادی ترقی کو بھی ہمارے فرائض میں شمار کرتا ہے اس تصور حیات کے مطابق انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور چند خاص شرائط کے ساتھ مادی ترقی بھی اللہ کی عبادت بن جاتی ہے جبکہ یہ وجود انسانی کی غرض و غایت کو پورا کر رہی ہو۔

لہٰذا ...... مادی ترقی کے علاوہ ـــــ ہمارے لئے کسی دوسری قابلیت کی ضرورت ہے جس کے بل بوتے پر ہم انسانیت کو ایک نئی قیادت فراہم کر سکیں یہ قابلیت سوائے ایک ایسے نظریہ حیات اور ایک ایسے نئے "نظام حیات" کے اور کچھ نہیں ہے جو انسانیت کو موجودہ مادی ترقی کی ضمانت بھی دے سکے ...... بالکل ایک نئے زاویہ نگاہ سے ... اور جس طرح معاشی ترقی کی آواز پر لبیک کہتا ہو اسی طرح وہ انسان کی فطری آواز پر بھی لبیک کہتا ہو یہ "نظریہ حیات" اور یہ "نظام حیات" دونوں ایک انسانی معاشرہ میں عملاً قائم اور مجسم ہوں۔ یعنی وہ اسلامی معاشرہ میں جلوہ گر ہوں۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس وقت پوری دنیا جاہلیت کے زیر سایہ پل رہی ہے۔ ان اصول کے نقطہ نظر سے جن سے زندگی کی اعلیٰ قدریں اور زندگی کا کلی نظام پھوٹتا ہے، انسانیت اس جاہلیت کے بوجھ تلے اس قدر دبی ہوئی ہے، کہ ہمارے دور کی یہ حیران کن مادی سہولتیں اور یہ نہایت اونچے درجے کی مادی ترقیات بھی اس بوجھ میں معمولی سی کمی نہیں کر سکتیں۔

یہ جاہلیت اس کائنات پر اللہ کی حکومت کو چیلنج کئے ہوئے ہے اور الوہیت کی پہلی اور مخصوص ترین صفت یعنی حاکمیت پر اس نے دست درازی کی ہے ...... یہ حاکمیت کا حق انسان کو دیتی ہے۔ انسانوں میں سے بعض کو بعض دوسرے کا "رب" قرار دیتی ہے۔ حاکمیت کا یہ اختیار انسان کو دینا اس صورت سے بالکل مختلف ہے جس میں ابتدائی دور کی جاہلیت یہ حق انسان کو دیتی تھی۔ بلکہ یہ جاہلیت ان کو وضع عقائد، تصورات اعلیٰ اقدار کی تعبیرات، قواعد و قوانین کی تسوید اور عادات کے تعین اور زندگی کی پوری ہیئت اجتماعی کی تشکیل کا اختیار بھی دیتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اللہ کا تجویز کردہ نظام اس بارے میں کیا کہتا ہے بلکہ ان معاملات میں بھی جن میں اللہ نے کسی کو کوئی اختیار ہی نہیں دیا۔ اللہ کے اس حق کو نا

لینے کے بعد ان لوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں انسانی آزادی کا تصور ختم ہو جاتا ہے آپ دیکھیں کہ اشتراکی نظاموں میں ان کس قدر ذلیل بے بس ہوتا ہے ۔ ! سرمایہ دارانہ نظام میں افراد یا اقوام اپنے سرمایہ یا استعماری طاقت پر جو ظلم کرتی ہیں وہ محض اللہ کی حاکمیت پہ دست درازی کا ایک ادنیٰ نتیجہ ہے ۔ یہ دراصل اس شرف کا انکار ہے جس کو ٰالیٰ نے انسان کے لئے مخصوص کیا تھا ۔

اس زاویہ نگاہ سے اسلامی نظام ایک منفرد نظام ہے ۔ نظام اسلامی کے علاوہ تمام دوسرے نظاموں میں لوگ کسی نہ ورت میں ایک دوسرے کی غلامی سے نجات پاتے ہیں ۔ یہ اس صورت میں کہ اس نظام میں سب ایک اللہ کی غلامی کرتے ہیں صرف سرچشمہ ہی سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اور صرف ایک ہی خدا کے آگے جھکتے اور عاجزی پیش کرتے ہیں ۔

یہاں آ کر دوسرے لوگوں سے ہمارا راستہ جدا ہو جاتا ہے اور یہی وہ نیا تصور حیات ہے جسے ہم انسانیت کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔ یہی وہ تصور حیات ہے جس سے انسان کی عملی زندگی پہ گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ . . . یہی ہے وہ ٹھوس حقیقت جس سے بشریت تہی دامن ہے اس لئے کہ یہ چیز مغربی تہذیب کی پیداوار نہیں ہے اور نہ یورپ کی ترقیات کا نتیجہ ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے پاس ایک کامل اور نیا نظام حیات موجود ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے بشریت ناواقف ہے اور اس میں یہ قابلیت بھی نہیں ہے کہ وہ ایسا کوئی نظام لا سکے ۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ نظام حیات عملی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہو جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اس کے مطابق ایک قوم اپنی زندگی بسر کر رہی ہو لہٰذا اس کا تقاضا ہے ہم کسی ایک خطے میں اسلامی نظام حیات کا احیاء کریں ۔ اس احیاء کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قریب اور دور تمام ممالک میں یہ نظام ٰانی قیادت پہ قبضہ کر سکے گا ۔

پھر احیائے اسلام کا یہ کام کیسے شروع ہو ۔ !

اس کے لئے ایک ہراول دستہ کی ضرورت ہے جو اسلام کے احیاء کے لئے پختہ عزم کرے اور مسلسل منزل مقصود کی طرف بڑھتا چلا جائے ۔ اطراف عالم میں پھیلی ہوئی جاہلیت کو روندتا ہوا آگے بڑھے لیکن دوسری طرف وہ محیط جاہلی معاشرہ سے جڑا بھی رہے (TO BE INCONTACT)

ہر وہ گروہ جس نے اس قدر مشکل کام کو اپنے ذمہ لینے کا عزم صمیم کر لیا ہے ، اس کے لئے کچھ نشانات راہ کی اشد ضرورت ہے ایسے نشانات جن سے وہ اپنے دور کی طبیعت اور مزاج ، اس دور میں اس کے فرائض کی حقیقت اس کے حقیقی نصب العین اور اس کے نقطۂ آغاز کو اچھی طرح جان سکے ۔ . . . . نیز اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ کائنات پر چھائی ہوئی اس ہمہ گیر جاہلیت کے بالمقابل اس کا صحیح موقف کیا ہے ؟ وہ کہاں لوگوں سے ملے اور کہاں جدا ہو ؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں ؟ اور اردگرد پھیلی ہوئی جاہلیت کی خصوصیات کیا ہیں ؟ اور اہل جاہلیت کو اسلامی زبان سے کس طرح خطاب کرے اور کن موضوعات پر خطاب کرے ؟ اس کے بعد اسے معلوم ہو کہ وہ ان معاملات میں ہدایات کہاں سے اور کیسے حاصل کرے ۔

ہمیں چاہئے کہ یہ نشانات ہم اس نظریہ حیات کے مصدر اول کی روشنی میں متعین کریں ۔ . . . . . . یعنی قرآن کی روشنی میں . . . . اور اس کے اساسی تصورات کی روشنی میں ، اس تصور کی روشنی میں جو اس نے اس ممتاز اور پاکیزہ گروہ کے ذہنوں میں زندہ و تابندہ کر دیا تھا جس گروہ نے منشاء الٰہی کے مطابق دنیا میں وہ کارنامہ سرانجام دیا جس کا ہم تصور تک نہیں کر سکتے ۔ وہ گروہ جس نے کسی وقت تاریخ کے دھارے بدل دئے تھے اور تاریخ کا رخ پھیر دیا تھا

جمد پاللہ اس کو چلانا چاہتا تھا۔

میں یہ نشانات راہ ایسے ہی ہراول دستے کے لئے اُبھار رہا ہوں جس کا مجھے سخت انتظار ہے اور میں اس کے متعلق پر اُمید ہوں . . . . اس میں سے چار باب معمولی حذف و اضافہ کے ساتھ میں نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن سے لئے ہیں۔ اس مقدمہ کے علاوہ آٹھ باب ایسے ہیں جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، جب کبھی بھی مجھے "ربانی نظام زندگی" پر مسلسل غور و فکر کرنے کا موقع ملا جس کا مفصل نقشہ قرآن کریم میں موجود ہے۔ ان تمام مضامین کا ——— اختلاف کے باوجود ——— مابہ الاشتراک یہ ہے کہ یہ "نشانات راہ ہیں" جیسا کہ ہر راہ کے کچھ نشانات ہوا کرتے ہیں اپنی موجودہ شکل میں یہ نشانہائے راہ کا پہلا مجموعہ ہے اور مجھے توقع امید ہے کہ اس مجموعہ کے بعد اور مجموعے بھی شائع ہوں گے اگر کبھی اللہ نے ان نشانات پر پہنچنے کی توفیق عطا فرمائی . . . . وباللہ التوفیق

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انلجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal
Specit
51/65

محمد نعیم ندوی صدیقی
(اعظم گڑھ)

خانوادۂ شاہ ولی اللہ
اور
علم حدیث

ہندوستان[1] کی سرزمین تقریباً آغاز اسلام ہی سے آفتاب نبوت کی کرنوں سے منور اور ہر عصر و عہد میں علماء و صوفیا و بزرگان دین کی ایک بڑی تعداد سے معمور رہی، تاریخ کی ورق گردانی سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عہد فاروقی ہی میں سندھ میں قدم رکھ چکے تھے۔ اور تیسری صدی ہجری تک وہاں انہوں نے جہانبانی و سیاست دانی کے جوہر دکھائے تھے، بتکدۂ آذری میں مسلمانوں کے جس پہلے قافلہ نے صدائے حق بلند کی تھی اس میں ایک محدث اور تابعی کے وجود کا بھی پتہ ملتا ہے جن کا نام ربیع تھا اور جن کے متعلق شیخ حسن علی نے لکھا ہے کہ "وہ اسلام کی پہلی صاحب تصنیف شخصیت ہیں[3]"۔

عرب و ہند کے درمیان جو تعلقات تیسری صدی میں قائم ہو چکے تھے، رفتہ رفتہ وہ پروان چڑھ کر تنومند درخت کی شکل کر گئے، اس کے نتیجہ میں سندھ کی سرزمین جو کہ وارد دین کی پہلی منزل تھی، علماء و فضلاء کی سرگرمیوں کی جولانگاہ بنی ہوئی تھی چنانچہ چوتھی صدی ہجری میں جب بشاری مقدسی ہندوستان آیا تو اس نے محدثین کی ایک کثیر جماعت اس ملک میں دیکھی[4] لیکن علوم اسلامیہ کی اس ترقی کے باوجود اس کا اثر دور رس نتائج کا حامل نہ ہو سکا۔

یہ صحیح ہے کہ غزنوی فتوحات سے پہلے ہی سندھی فضلاء کی جد و جہد سے اسلامی علوم نشو و نما پا چکے تھے لیکن سلطان محمود کے حملہ ہندوستان کے بعد ایک باقاعدہ اور منظم شکل میں علمی و تمدنی ترقیات کا آغاز ہوا اور پھر غوریوں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے عہد سلطنت میں تو اسلامی علوم کے ہر گوشہ کو بہت ترقی ہوئی اور ماہرین فن نے ملک کے کونے کونے کو اپنی جد و جہد سے بیت العلم بنا دیا۔ چنانچہ بقول ضیاء الدین برنی اس وقت صرف دہلی میں ایسے علماء اور ماہرین فن موجود تھے جن کی نظیر بخارا، سمرقند اور بغداد میں بھی نہیں مل سکتی تھی[5]

مذکورہ بالا ادوار میں علمی و فنی ترقی کے اعتبار سے سب سے زیادہ تابناک دور خلجیوں کا ہے، اس میں اکابر فضلا اور یگانہ روزگار علماء نے ملک کے طول و عرض کو اپنی شعلہ نفسی سے گرم و فعال اور نواسنجیوں سے پرشور کر رکھا تھا، خلیق نظامی نے اس عہد کے فضلاء کی ایک طویل فہرست اپنی کتاب میں دی ہے[6]

---

[1] پورے مضمون میں جہاں جہاں ہندوستان کا لفظ آئیگا اس سے مراد غیر منقسم ہند ہے [2] معارف ج ۲۲ [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۳ [4] احسن ص ۴۸۱ [5] تاریخ فیروز شاہی بحوالہ جناب شیخ عبدالحق ص ۲۳ [6] دیکھو تذکرہ شیخ عبدالحق ص ۲۵۔

سب سے زیادہ نمایاں اور تابناک رخ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے دین حنیف کے ہر شعبہ میں اصلاح و تجدید کی عظیم الشان خدمت انجام دی اور دینی علوم کو از سر نو تازگی بخشی، اور اپنے بعد ایسی اولاد تربیت دے کر چھوڑ گئے جس نے ولی اللہی مشن کو عروج و کمال تک پہونچا کر چھوڑا، آج ہندوستان میں درس حدیث کے جتنے بھی سلاسل قائم ہیں سب کا مرجع بالواسطہ یہی خانوادہ عالیہ ہے۔ شاہ صاحب نے تقریباً پچیس سال مسند تعلیم ارشاد کو زینت و عزت بخشی پھر آپ کے سفر آخرت کے بعد چاروں بیٹوں نے اس علم و عمل کی رونق کو باقی رکھا۔

نواب صدیق حسن خاں اس خاندان عالی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"اس خاندان کا ہر ایک فرد اپنے اسلاف و اعمام کی طرح عالم دین، صاحب مرتبت، حکیم و فقیہ تھا۔ کیوں نہ ہوتا، یہ حضرات علم و عمل میں یکتائے زمانہ ہونے کے ساتھ نسب عالی فاروقی کے بھی حامل تھے . . . . اہا بیت العد کے تمام افراد جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل ہونے کے ساتھ مشائخ وقت بھی تھے، حتیٰ کہ ہندوستان بھر میں کوئی ایک گھرانا بھی اس کا مثیل اور ہم پلہ نہ ہو سکا[1]"

اسی طرح اتحاف میں نواب صاحب مرحوم لکھتے ہیں:۔

"اولاد و امجاد او (ای شاہ ولی اللہ) کہ ہر یکے از ایشاں بے نظیر وقت و فرید دہر و وحید عصر در علم و عمل و عقل و فہم و قوت تحریر و فصاحت تقریر و تقویٰ و دیانت و امانت و مراتب ولایت بود ہم چنیں اولاد اولاد"[2]

اور فی الحقیقت اسلامی ہند کی اتنی طویل تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کسی علمی خانوادہ نے تقریباً دو سو سال تک مسند درس و افتاء اور سجادہ علم و فضل کو بچھائے اور مرکز استفادہ بنائے رکھا ہو! اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے کہ ولی اللہی گھرانے کا ہر فرد اپنی جگہ ایک مستقل دبستان فکر و علم تھا اور ان چند چراغوں سے سینکڑوں چراغ روشن ہوتے چلے گئے!

امام شاہ ولی اللہ دہلوی

اس عالی خاندان کے چشم و چراغ اور بدر منیر شاہ ولی اللہ صاحب تھے، اور در اصل آپ ہی کے علمی تبحر اور فضل و کمال کی وجہ سے یہ معزز و بزرگ خاندان ساری دنیا میں روشناس ہوا۔

آپ نے ۴ر شوال ۱۱۱۴ھ میں اس عالم آب و گل میں زندگی کا پہلا سانس لیا[3] آپ کے نیز آپ کے خاندان کے تفصیلی احوال تذکروں میں ملتے ہیں۔ اس مبحث میں حضرت شاہ کی ان گرانقدر خدمات کا اجمالی جائزہ لینا چاہئے ہیں جو "علم حدیث" سے متعلق ہیں۔ شیخ رحیم بخش لکھتے ہیں:۔

"انصاف یہ ہے کہ علم حدیث میں جس اولیت کا تمغہ اس زمانہ کے مؤرخوں نے شیخ عبدالحق محدث کے لئے تجویز کیا ہے اس کے مستحق جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ہیں، چونکہ علم حدیث کی عمارت کے بانی اگرچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی تھے، لیکن انہوں نے اس عمارت کا نقشہ تیار کیا اور پھر اشاعت و رواج حدیث

---

[1] ابجد العلوم صـ ۹۱۲ [2] اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین صـ ۲۹۶ [3] تذکرہ علمائے ہند صـ ۲۵۱

کے مرتبوں سے اس کے دسود بیاد کو سچا یا وہ شاہ ولی اللہ صاحب ہیں[1]"

اس حیثیت سے یقیناً شاہ صاحب کو فضیلت حاصل ہے کہ ان کا کام بہ حیثیت شیخ عبدالحق کے زیادہ کامل اور مکمل شکل میں نمودار ہوا لیکن گیارہویں صدی میں علم حدیث کی تقریباً منتی ہوئی حیثیت کو سنبھالا دینا اور پھر اُسے حیاتِ نو سے ہمکنار کرنا وہ عظیم کارنامہ ہے جو شیخ عبدالحق کو اولیت کا مرتبہ دیتا ہے۔ شاہ صاحب نے شیخ کی کوششوں کی تکمیل کی۔ تالیف و تحریر کے ذریعہ کتب حدیث کو عام کیا حدیث کی اولین اور صحیح ترین کتاب مؤطا امام مالک کی عربی و فارسی میں مجتہدانہ شرحیں لکھیں[2]۔ عربی شرح کا نام مسوّی اور فارسی کا مصفّٰی ہے۔ صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی جو رسالہ فی شرح تراجم الابواب البخاری کے نام سے موسوم ہے علاوہ ازیں الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین ایک رسالہ تصنیف کیا اور فقہ و اسرار حدیث میں حجۃ اللہ البالغۃ تصنیف کی۔

شاہ صاحب نے ہندوستان میں حدیث کے درس و تدریس کے باقاعدہ حلقے قائم کئے اور ان کے بعد تلامذہ نے تمام ملک میں پھیل کر اس فیض کو عام کیا۔

آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم نے دہلی میں ایک مدرسہ حدیث نبوی کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا جو "مدرسہ رحیمیہ" کے نام سے معروف مشہور تھا، وہ زندگی بھر اس میں درس دیتے رہے اور ان کی وفات کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب نے حجاز مقدس سے واپسی پر مدرسہ کی مسند تدریس کو زینت دی اور کامل بارہ سال تک استغراق و انہماک کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ آپ کی قابلیت وصلاحیت کی شہرہ سُن سُن کر دور دراز ملکوں کے شوقین طلبہ بہت سے دشوار گذار مراحل طے کر کے حاضر ہوتے اور اس درسگاہ میں داخل ہونے کو سرمایۂ ناز و افتخار جانتے۔

مرحوم تذکرہ نویس شیخ رحیم بخش بہت ہی والہانہ اور ادیبانہ انداز میں شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

> "جب ہندوستان کے اقبال و بادری کا ستارہ چمکا تو فطرت نے جولانگاہ حدیث کے شہسوار کو پیدا کیا یعنی شاہ ولی اللہ صاحب اس سرزمین میں ظاہر ہوئے جن کے علم و فضل کی صدائیں ہندوستانی حدود سے نکل کر عرب و عجم میں پہونچیں، اور جن کی سیادی مقبولیت تمام بلادِ اسلامیہ میں پھیل گئی چونکہ آپ علم و عمل دونوں میں خاص طور سے مشہور تھے اور آپ کا علمی کمال اعلیٰ درجہ کی رفعت کے ساتھ لوگوں کے کانوں میں گونج رہا تھا، لہٰذا اطراف عالم کے لوگ بے اختیارانہ جوش کے ساتھ آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور آپ کے درس و تدریس کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا۔ آپ نے بڑی مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ علم نبوی کی اشاعت میں کوشش کی اور اپنی انتھک کوششوں سے علم نبوی کو اس قدر رواج دیا کہ اب شیخ محدث کی ڈالی ہوئی بنیادیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں[3]"

نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں کہ اگر شاہ ولی اللہ کا وجود مسعود گذشتہ زمانہ میں ہوتا تو ان کا شمار ائمہ کرام اور مجتہدین عظام میں کیا جاتا[4]۔

شاہ صاحب کی شہرۂ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کے متعلق موصوف مذکور لکھتے ہیں کہ "وہ اگرچہ علم حدیث میں نہیں ہے لیکن

---

[1] حیاتِ ولی ص۳۸۴ [2] معارف ج ۲۲ ع ۵ ص ۳۴۳ [3] حیاتِ ولی ص۴۱۵
[4] اتحاف النبلاء ص۴۳۱

احادیث کی شرحیں اور اس کے اسرار و حکم اس کتاب میں بکثرت موجود ہیں اور یہ کتاب اس پایہ کی ہے کہ عرب و عجم کے علماء نے اس کے مثل اب تک کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، [1]

حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی فرماتے تھے کہ اگر سرزمین ہند میں صرف شاہ ولی اللہ ہی پیدا ہوتے تو ہندوستان کے لئے یہ فخر کافی ہوتا [2]

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ :-

"اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو ان کی حسن نیت کا ثمرہ یہ دیا کہ ان کو ایسی لائق اولادیں عطا کیں جنہوں نے اپنے والد بزرگوار کے ناتمام کاموں کی پوری تکمیل کی اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو پیغام نبوی کے آوازہ سے معمور کر دیا [3] ۔۔۔"

۱۱۷۶ھ میں شمع حدیث نبوی کا یہ پروانہ اپنی حیات مستعار کے آخری سانس تک ملاء اعلیٰ سے سرگوشی کرتا ہوا ابدی نیند سو گیا [4] ۔ فرحمہ اللہ وجزاہ عن المسلمین کافۃ ۔

شاہ صاحب نے چار اولادیں اپنی یادگار چھوڑیں ، شاہ عبدالعزیز ، شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر ، شاہ عبدالغنی، ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر ماہ کامل تھا !

شاہ عبدالعزیز دہلوی

۱۱۵۹ھ میں ولادت باسعادت ہوئی تاریخی نام غلام حلیم تھا [5] ۔ تعلیم و تربیت کے مدارج والد کی زیر نگرانی طے کئے ، اور پندرہ سال کے سن ہی میں علوم دینی ۔ حدیث ، فقہ ، تفسیر وغیرہ سے فارغ ہو گئے ۔ ۱۷ سال کی عمر میں والد کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا ، چونکہ آپ تمام بھائیوں میں سن اور بڑے ہونے کے ساتھ علم میں بھی تفوق رکھتے تھے ۔ اس لئے ولی اللہی مسند خلافت آپ ہی کو تفویض ہوئی ۔ ہندوستان میں جس قدر محدثین ہیں سب کا سلسلہ شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کے واسطہ سے شاہ ولی اللہ پر منتہی ہوتا ہے [6]

شاہ عبدالعزیز نے اپنے والد کے شروع کئے ہوئے کاموں کو بہت آگے بڑھایا ، درس و تدریس کے سلسلہ کو علیٰ حالہ باقی رکھا ، علم حدیث کو فروغ دیا ، احیائے شریعت اور تجدید دین کی راہ میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے ، اہل تشیع کے رد میں تحفہ اثنا عشریہ تصنیف کی جو آج اس موضوع پر ایک مستند ترین ماخذ تصور کی جاتی ہے ۔

آپ کی درسگاہ سے فارغ ہو کر جو تلامذہ علم و ادب میں مشہور عام ہوئے ان کی شمار مشکل ہے ، ان حضرات نے اطراف ملک میں منتشر ہو کر " اخبرنا " اور " حدثنا " کا غلغلہ بلند کیا ، دہلی اور رامپور کے جتنے یگانۂ وقت محدثین گذرے ہیں وہ سب درحقیقت آپ ہی کے فیض یافتہ ہیں ۔

شاہ عبدالعزیز کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مستقل تصنیفات کی تعداد ۱۲ تک پہونچتی ہے ۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے رسالے وقت کے تقاضوں کے مطابق لکھے تھے ، جنہیں رحیم بخش صاحب نے قلمی مسودات کی شکل میں موجود بتایا ہے [7] ، قرآن کی تفسیر فارسی فتح العزیز کے نام سے لکھی ، محدثین اور کتب حدیث سے متعلق ایک مختصر کتاب بستان المحدثین تالیف کی ، اصول حدیث میں عجالہ نافعہ

---

[1] اتحاف النبلاء [2] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر [3] معارف ج ۲۲ ع ۵ ص ۳۴۳ [4] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵ [5] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۱ [6] حیات ولی ص ۵۸۶ [7] حیات ولی ص ۶۳۳

رسالہ ہے۔

شیخ حسن علی نے آپ کی تاریخ وفات کے متعلق مشہور شاعر مومن خاں مومن کا شعر نقل کیا ہے۔

بے سروپا گشتہ اند از دست بیداد اجل — عقل و دیں لطف و کرم فضل و ہنر علم و عمل

جس سے ۱۲۳۹ھ کی تاریخ نکلتی ہے[1]

رفیع الدین دہلوی

آپ عمر میں شاہ عبدالعزیز صاحب سے چھوٹے تھے، علم حدیث و تفسیر کی سند اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی، علوم دینیہ و عقلیہ میں مجتہدانہ کمال رکھتے تھے۔ گو شاہ ولی اللہ صاحب کے فیض کو سب سے شاہ عبدالعزیز صاحب نے عام کیا لیکن جب وہ مکفوف البصر اور ضعیف المزاج ہو جانے کی وجہ سے تعلیم و تدریس سے معذور ہو گئے وقت جس ذات نے ولی اللہی چشمہ فیض کو جاری رکھا۔ وہ شاہ رفیع الدین صاحب ہی تھے، ان کے درس کی شہرت سن سن کر دور دراز ت سے نہ صرف طلبہ بلکہ نامور فضلاء اور زبردست علماء بھی اکٹھا ہو گئے تھے اور اپنے فضل و کمال کے باوجود شاہ صاحب کی شان تبحر کو دیکھ کر دنگ اور ششدر رہ جاتے، ہندوستان کے تمام نامی اور مشہور فضلاء آپ ہی کے مستفیضوں اور خوشہ چینیوں میں شمار جاتے ہیں[2]

شاہ رفیع الدین صاحب کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے انہوں نے ایسے وقت میں قرآن پاک کا ملکی زبان اردو میں ترجمہ کیا اگر اس وقت خدمت انجام نہ پاتی تو پھر کسی کی ہمت نہ پڑتی، ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ آج بھی اس سے بہتر اور صحیح تر ترجمہ مشکل ہے، قرآنیات کا طالبعلم سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہوسکتا۔ بقول سید سلیمان ندوی، شاہ رفیع الدین کے اس شہرہ آفاق ترجمہ نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں دین وایمان کی راہ بتائی[3]

آپ کی تصنیفات میں مذکورہ ترجمہ قرآن کے علاوہ کتاب التکمیل، رسالہ دفع الباطل اور اسرار المحبتہ یادگار ہیں، ۱۲۴۹ھ میں م و عمل کی یہ شمع فروزاں گل ہوگئی۔

شاہ عبدالقادر دہلوی

آپ شاہ رفیع الدین سے چھوٹے تھے، دینیات وغیرہ علوم اسلامیہ کی تحصیل و تکمیل اپنے والد ماجد ہی سے کی تھی اور باطنی فیض دیگر اکابر دین اور اہل کمال سے حاصل کیا۔ فقہ، تفسیر اور حدیث میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ حدیث کا درس بھی جاری کیا، لیکن آپ کی فطرت میں استغنا اس حد تک تھا کہ دنیا کے جھمیلوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد عمر کا بیشتر حصہ مسجد اکبرآبادی میں بسر کیا، تحدیث و تدریس کی بھی خدمت انجام دیتے رہے۔ بقیہ وقت ذکر و فکر والٰہی میں گذارتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کو تصنیفات کی طرف توجہ دینے کی فرصت کم ملی، آپ کو جس چیز نے بقائے دوام بخشا وہ آپ کا ترجمہ قرآن ہے، جو سلیس و بامحاورہ اردو میں ہے اور جس کے متعلق صرف اتنا ہی لکھ دینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولیت میں اتنا اہم ہے کہ:—

"اگر اردو زبان میں قرآن مجید نازل ہوتا تو ان ہی محاورات کے لباس سے آراستہ ہوتا جن کی رعایت جناب مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے اس ترجمہ میں پیش نظر رکھی ہے[5]"

۱؎ تذکرہ علمائے ہند ص۱۳۳ ۲؎ تراجم علمائے اہل حدیث ص۹۳ ۳؎ حیات ولی ص۶۲۹ ۴؎ معارف ج ۲۲ ع ۵ ص ۳۴۴۔

۵؎ [illegible] ص۱۹۶

آپ بھی اپنے دیگر اپنے قابل فخر بھائیوں کی طرح علم و عمل کا مکمل نمونہ تھے، مشہور اساتذہ فن علامہ فضل حق خیرآبادی اور شاہ محمد اسحاق وغیرہم آپ ہی کے فیض یافتہ تھے۔ ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی۔

شاہ عبد الغنی دہلوی

شاہ ولی اللہ صاحب کے سب سے چھوٹے فرزند تھے، لیکن خدا کی قدرت سے ان فرزندان ولی اللہی میں وفات کی ترتیب قدرت نے الٹ دی، یہاں تک کہ شاہ عبد العزیز صاحب نے اپنے تینوں چھوٹے بھائیوں کی وفات کا غم اٹھایا، سب سے پہلے شاہ عبد الغنی صاحب فوت ہوئے۔

آپ نے علوم کی تکمیل کچھ اپنے والد سے کی اور کچھ برادر اکبر شاہ عبد العزیز صاحب سے علم و فضل اور باطنی فیض میں شہرت عامہ رکھتے تھے، زندگی بھر مشغلہ درس رہا، ظاہری وضع قطع میں شاہ ولی اللہ صاحب سے اس قدر مشابہت رکھتے تھے کہ ان کو دیکھ کر مرحوم شاہ صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، اولاد میں شاہ محمد اسماعیل کو یادگار چھوڑا، جنہوں نے خود بھی اپنے علم و فضل سے شہرت حاصل کی۔

شیخ رحیم بخش دہلوی مصنف "حیات ولی" نے سہو تفاہم اور سہو کی بنا پر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کو شاہ عبد الغنی دہلوی کا شاگرد بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مولانا نانوتوی کی ولادت شاہ عبد الغنی دہلوی کی وفات کے بعد ہوئی ہے۔ اس لئے ان سے تلمذ کا حصول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے استاد شاہ عبد الغنی مجددی ایک دوسرے بزرگ ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد میں ہیں، انہوں نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی تھی اور وہیں بقیع میں مدفون ہیں۔ یہ مغالطہ اکثر لوگوں کو ہوا ہے اور اب تک کی تحقیق بھی یہی تھی، لیکن جدید تحقیقات نے اس کو بے اصل قرار دے دیا ہے۔

شاہ اسماعیل شہید

آپ کی ذات خاندان عالی ولی اللہی کا تتمہ و تکملہ تھی، شاہ ولی اللہ صاحب نے جو چشمہ فیض جاری کیا تھا اس میں ان کے پوتے نے اپنے خونِ جگر کی آمیزش کر کے اس آب زلال کو آب حیات بنا دیا۔

شاہ شہید نے علوم کی تکمیل اپنے والد اور چچا شاہ عبد العزیز صاحب سے کی، علم حدیث میں انہیں خصوصی درک حاصل تھا اور اس میں اتنا کمال پیدا کر لیا تھا کہ بڑے بڑے صاحبان علم و فضل آپ کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کرنے کو باعث صد افتخار مانا سمجھتے تھے، آپ کے کارنامے مسند تدریس سے زیادہ میدان تجدید و احیائے شریعت میں ظاہر ہوئے! شاہ صاحب موصوف نے شرک و بدعت کے استیصال کا جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مستقل تاریخ ہے۔

مولانا آزاد رقمطراز ہیں:—

> "شاہ صاحب نے (ولی اللہ) اپنے جامع و کامل ہونے کے ساتھ جو کچھ کیا وہ تجدید، تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا اس سے آگے نہ بڑھ سکا ...... فعلی عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا، اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ مجدد شہید کے لئے مخصوص کر دیا تھا، خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا ..... خود شاہ صاحب بھی اگر اس وقت ہوتے تو انہیں کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے [۵]"

شاہ شہید کی دعوت عمل اور احیائے سنت کی جدوجہد سے ملک کی ساری فضا معمور ہو گئی، ان کی تصنیف "تقویۃ الایمان" نے سینکڑوں تاریک دلوں میں توحید و سنت کی شمع فروزاں کی اور لاکھوں گم کردہ راہوں کو منزل مقصود تک پہنچایا۔ شاہ شہید کی

---

۵ تذکرہ آزاد ص ۲۲۴

رکرآیا ہے کہ مقلدین اور اہل حدیث دونوں باہمی اختلاف کے باوجود ان کے گرویدہ اور مداح ہیں۔
علاوہ عبقات، صراط مستقیم، ایضاح الحق، رسالہ اصول فقہ، منصب امامت اور تنویر العینین وغیرہ
کار ہیں۔

دہ شاہ ولی اللہ کے مذکورہ بالا اجمالی حالات اور ان کی گرانقدر خدمات کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد
نطعی دو رایوں کی گنجائش نہیں رہتی کہ آج ہندوستان میں جہاں کہیں بھی قال اللہ وقال الرسول کی
ائی دیتی ہے وہ اسی خانوادۂ فضل و کمال کی جد و جہد کی صدائے بازگشت ہے اور اشاعت توحید و تبلیغ
کے بھی سلاسل نظر آتے ہیں ؎

یہ سب پودا انہیں کی لگائی ہوئی ہے

یں "حیات ولی" کا ذکر آیا ہے، اب سے ۳۰-۳۵ سال پہلے شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ کے حالات میں "حیات ولی"
چنانچہ اس موضوع پر لکھنے والوں کی تحقیقات اسی کے محور پر گھومتی تھیں لیکن بعد میں شاہ صاحب اور ان کے سلسلہ پر بہت کافی
نی چیزیں بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے لکھی گئی ہیں، جس سے اس موضوع کے بہت سے مخفی گوشے منصہ شہود پر آئے، گو اب جدید
نتیجہ میں "حیات ولی" میں بڑی کمیوں اور فروگذاشتوں کا احساس کیا جا رہا ہے، تاہم اس موضوع پر اولین تصنیف ہونے کی بنا پر
کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی۔

شفقت کاظمی :-

کیا کریں قصۂ غم بیاں آپ سے — بات کوئی نہیں جب نہاں آپ سے
درد کی غایت، انتہا ہی نہ تھی — کوئی کرتا کہاں تک بیاں آپ سے
ملتفت دیکھ کر بے سبب آپ کو — کیوں نہ ہوں دل جلے بدگماں آپ سے
یاد کرنے پہ بھی یاد آتا نہیں — کس گھڑی ہم ملے تھے کہاں آپ سے
دلنوازی کا ذمہ لیا ہے مگر — کیا اُٹھے گا یہ بارِ گراں آپ سے
اب کہاں آپ کے بعد اے کاظمی — تھا جو مخصوص رنگِ بیاں آپ سے

شوراج بہار دامر تسر) :-

داغِ دل کیوں نہ ہو عزیز مجھے — تیری بخشی ہوئی نشانی ہے
ہر مصیبت زدہ کا افسانہ — درحقیقت مری کہانی ہے

اکبر حمیدی :-

مجھ کو اس دور کی تاریخ نہیں بھولے گی — بادِ صرصر میں دیا میں نے جلا رکھا ہے
ایک پل کے لئے تھی جن کی جدائی دشوار — وقت نے برسوں مجھے ان سے جدا رکھا ہے

سید حسین نقوی محسن :-

ہم نے جو بے خودی میں کہہ ڈالی — بات وہ زیبِ داستاں ٹھیری
پھول مانگو تو زخم دیتے ہیں — اب یہی رسمِ داستاں ٹھیری

سردار اورنگ زیب آزندہ :-

خود طالب و مطلوب ہوں خود جلوہ نما ہوں — مجنوں ہوں مگر محمل لیلیٰ میں چھپا ہوں
اے شاہدِ مقصود! یہ تو جلوہ نما ہے — آئینہ تحقیق میں یا میں ہی کھڑا ہوں
تو عقدۂ مشکل تھا، الجھتا ہی رہا ہے — میں ناخنِ تدبیر تھا سو ٹوٹ چکا ہوں
آواز کی اک گونج ہوں احساس کی اک چیخ — تاریک سمندر میں کہیں ڈوب گیا ہوں
میں وقت کی آندھی میں اک اڑتا ہوا تنکا — کیا جانے کدھر آیا تھا کس سمت چلا ہوں
اُڑتے ہوئے ذروں کے سوا کچھ نہیں پایا — تا دور ہواؤں کے تعاقب میں گیا ہوں
معیارِ وفا پہ کوئی پورا نہیں اترا — ہر دور کے فرہاد کو میں دیکھ چکا ہوں
اُبھروں گا پھر اک بار نہ ہنس اے شبِ تاریک — مانا کہ میں ڈھلتے ہوئے سورج کی ضیا ہوں

ماہر القادری

مشہدِ اکبر

یہ قبلۂ اول پہ عجب وقت پڑا ہے　　　تکبیر کے نغمے، نہ مؤذن کی صدا ہے

تجوید، نہ تسبیح، نہ منبر پہ وہ خطبے　　　خاموش در و بام میں سنسان فضا ہے

سب عالمِ حیرت میں ہیں ہیکل ہو کہ صخرا　　　زیتون کی وادی ہے کہ گنجِ شہدا ہے

ہیں سوگ میں ڈوبے ہوئے نابلس و اریحا　　　القدس کے اطراف میں اک حشر بپا ہے

محرابِ حرم نالہ و فریاد سراپا　　　یہ مسجدِ اقصٰی ہے کہ اک بزمِ عزا ہے

اُردن ہے کہ ہے مشہدِ اکبر کا نمونہ　　　پانی کی طرح خون مسلماں کا بہا ہے

جس قوم پہ قرنوں سے ہے اللہ کی پھٹکار　　　اُس قوم کو اب فتح کا اعزاز ملا ہے

ہے ارضِ مقدس پہ یہودی متصرف　　　اے غیرتِ حق! حشر میں اب دیر ہی کیا ہے

یہ غم وہ قیامت کہ بیاں ہو نہیں سکتا　　　سوچا ہے تو الفاظ نے دم توڑ دیا ہے

فریاد ہے اے مصلحتِ کاتبِ تقدیر!　　　مسلم کا لہو دستِ یہودی کی حنا ہے

سب دشمنِ اسلام ہیں امریکہ و افرنگ　　　کافر نے مسلمان کا کب ساتھ دیا ہے

شیطان کی ایجنٹ نصاریٰ کی ہے ٹولی　　　اور روس بھی درپردہ شرارت پہ تلا ہے

فرعون کی اولاد سے اُمید یہی تھی　　　ناصر کی قیادت سے نہ شکوہ نہ گلہ ہے

ہم آج ہیں تاریخ کے خود رحم و کرم پر　　　ہم وہ تھے کہ تاریخ کا رُخ موڑ دیا ہے

بے عیب ہے اللہ کا قانونِ مکافات　　　جو کچھ بھی ہوا اپنے گناہوں کی سزا ہے

کب آئیں گے اللہ کی نصرت کے فرشتے
ہر ٹوٹے ہوئے دل کی یہ غمناک صدا ہے

ہماری نظر میں

تذکرۃ الموتیٰ والقبور

مولفہ :- حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ - مترجم :- مولانا اقبال الدین احمد ، ضخامت ۲۰۰ صفحات (سرورق رنگین) قیمت ۲ روپے
ملنے کا پتہ :- واحد بک ڈپو ، جونا مارکیٹ کراچی ۲

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ (۱۱۴۳ - ۱۲۲۵ء) نے فن حدیث میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے استفادہ کیا اور طریقت میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے فیض حاصل کیا ، قاضی صاحب موصوف "تفسیر مظہری" کے سبب علمی دنیا میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں ! اس کتاب میں انہوں نے اموات اور قبور کے بارے میں ہر طرح کی کچی پکی روایات جمع کر دی ہیں -

"... اسی طرح اولیاء اللہ بھی زمین و آسمان میں جہاں چاہے آمد و رفت کرتے ہیں ، اور دنیا و آخرت میں اپنے دوستوں اور معتقدوں کے مددگار رہیں گے اور دشمنوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں " (ص ۸۱)

اسی قسم کے مبالغہ آمیز ملفوظات اور غیر محتاط تحریروں نے مشرکانہ عقائد اور بدعات کو مسلمانوں میں مقبول و پسندیدہ بنایا ہے ! کم و بیش بلکہ بے اصل روایتوں کو اگلے اکابر نے نقل فرما دیا اور بعد کے آنے والوں نے فرط عقیدت کے سبب اُن کی تحقیق اور تنقید نہیں کی - اس طرح غلطیوں کے انبار لگتے چلے گئے ! اس کتاب میں ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں ، جو موت اور آخرت کو یاد دلاتی ہیں ، جن سے قلب میں گداز اور خشیت پیدا ہوتی ہے -

مشکوٰۃ الانوار

از :- امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ ، پیش لفظ :- مولانا عبدالقدوس ہاشمی - ترجمہ و حواشی :- مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی ، ضخامت ۱۰۴ صفحات (سرورق دیدہ زیب) قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ :- واحد بک ڈپو جونا مارکیٹ کراچی ۲

اس کتاب کے چند ابواب :-
اقسام انوار ، نور حق ، فرق مراتب ، حقیقت حقائق ، قطب و عدم مراتب ، ارواح بشریہ ، آیت کی مثالوں کا بیان -
حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ علم کلام اور فلسفہ اخلاق کے علاوہ محقق اور تصوف و طریقت کے بلند پایہ شیخ ہیں ، [illegible] نور کے مراتب و حقائق بیان فرماتے ہیں ! اور بڑے نازک و دقیق مسائل و نکات کی تشریح

کی ہے۔ مگر بعض مقامات پر خود فاضل مترجم نے امام غزالی کے خیالات سے اختلاف کیا ہے :۔

● اور ہر عقل اپنے سے بالاتر شے اور عقل کے مقابلہ میں ظلمات ہے، اگر اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے تو تمام یقینی امور ظنیات میں تبدیل ہو جائیں گے۔

● یہ روایت حدیث کی کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی، اور امام غزالی محدث نہیں ہیں، جو اُن کی روایت پر اعتماد کرلیا جائے۔

● اس تقریر سے خود عقل کا نقص ظاہر ہوگیا، حالانکہ مصنف نے اولاً اس کا دعویٰ کیا تھا کہ وہ نقائص سے پاک ہے۔

● یہ روایت قطعاً موضوع ہے۔

● اس سے یہ لازم آئے گا کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں، حالانکہ تمام امت کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء ملائکہ سے زیادہ افضل بھی ہیں اور ان سے زیادہ عالم بھی!

امام غزالی فرماتے ہیں :۔

"لا الہ الا اللہ عوام کی توحید ہے اور" لاھو الا ھو" (نہیں مگر وہی) خواص کی توحید ہے، کیونکہ وہ عام ہے اور یہ خاص، اور یہ زیادہ شامل، زیادہ لائق اور زیادہ دقیق ہے" (ص ۳۱)

اس پر فاضل مترجم نے بڑی جرأت کے ساتھ تنقید کی ہے، فرماتے ہیں :۔

" اول تو لا الہ الا اللہ کلام خداوندی ہے اور کلام خداوندی سے زیادہ دقیق اور زیادہ خاص کوئی کلام نہیں ہوسکتا، یہ کلام اللہ کی صریح توہین ہے، ثانیاً اللہ تعالیٰ نے خاص عام کی تفریق نہیں فرمائی ثالثاً لاھو الا ھو کا کلمہ شریعت سے نہ عوام کے لئے ثابت ہے اور نہ خواص کے لئے بلکہ اس کا شریعت میں وجود ہی نہیں یہ تو دین میں مداخلت اور اضافہ ہے"

وہ حقائق جن کے جاننے کا شریعت نے اہل ایمان کو مکلف نہیں بنایا اور جو " متشابہات " کا مزاج رکھتے ہیں، اُن کی جب بھی شرح و تفسیر کی جائے گی، اس قسم کے مزلات سے بچنا ممکن نہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی کی طرح ہر مترجم اور شارح نہ تو دقیق النظر ہوتا ہے اور نہ اُس میں اتنی جرأت ہوتی ہے کہ اکابر کی غلطیوں کی نشاندہی کرسکے۔

مخطوطات تاریخی

نوشتہ :۔ حکیم سید شمس اللہ قادری، ضخامت ۸۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ :۔ واحد بک ڈپو، جونا مارکیٹ کراچی ۲

حکیم سید شمس اللہ قادری مرحوم حیدرآباد دکن کے مشہور تاریخ داں، نہنگ تھے، اُن کی عمر کا زیادہ حصہ فن تاریخ کی تحقیق اور قدیم تاریخی مخطوطات کے مطالعہ میں گزرا۔ اس کتاب میں انھوں نے ۱۔ کتب خانہ حبیب گنج ۲۔ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۳۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۴۔ ملا فیروز لائبریری اور ۵۔ ذخیرہ آقائے داعی الاسلام کے نادر تاریخی مخطوطات کا تعارف کرایا ہے!

ان تمام کتب خانوں میں سید صاحب مرحوم نے خود تشریف لے جاکر، تاریخی مخطوطات کا مطالعہ کیا۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم کے کتب خانہ (حبیب گنج) میں انہیں امام قشیری (المتوفی ۴۶۵ھ) کی تفسیر " لطائف الاشارات " کے دو مخطوطے ملے۔ جو اگرچہ ناقص ہیں، لیکن نادر و کمیاب ہونے کے باعث عدیم النظیر ہیں۔ الامام شمس الدین محمد بن احمد الذہبی (المتوفی ۷۴۸ھ) کی " العبر فی خبر من غبر " کی نادر و کمیاب تصنیف کا مخطوطہ بھی

ی کتب خانہ میں آن کی نگاہ سے گزرا، اسی طرح دوسرے کتب خانوں کے بیسیوں نادر و کمیاب مخطوطات کا تعارف
ی کتاب میں ملتا ہے جس سے اہلِ علم اور خاص طور سے ریسرچ اسکالروں کو تحقیقی کاموں میں مدد مل سکتی ہے۔

ترکانِ عثمان

از۔ ڈاکٹر محمد صابر استاد تاریخ اسلام و زبان ترکی، (کراچی یونیورسٹی) ضخامت ۲۷۰ صفحات ۔ (سرورق دیدہ زیب) قیمت دس روپے۔

ملنے کا پتہ:- فہیماد پرنٹرز ملا رمضان علی بلڈنگ بانامی اسٹریٹ، لارنس روڈ کراچی ۔

"عرضِ حال" جو اس کتاب کا دیباچہ ہے، اُس کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے۔

"اردو زبان میں ترکانِ عثمانی کی تاریخ پر ترکی ماخذ کی بنیاد پر شاید ہی کوئی کتاب لکھی گئی ہو، اکثر و بیشتر عثمانی تاریخیں یا تو انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں یا انگریزی کتابوں کو بنیادی ماخذ سمجھ کر لکھی گئی ہیں، ان کتابوں میں تنقیدی روح کے فقدان کے علاوہ کتابت، سنہ، ترکی نام وغیرہ کی بے شمار غلطیوں کی وجہ سے قارئین کو بڑی مشکلات پیش آتی ہیں اور وہ کسی تحقیقی مقصد کے لئے اُن کا استعمال نہیں کر سکتے۔"

ڈاکٹر محمد صابر صاحب نے ان غلطیوں کے ازالہ اور اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اصل ترکی کتابوں سے استفادہ کیا اور خاصی محنت، تحقیق اور مطالعہ و جستجو کے بعد یہ کتاب مرتب فرمائی جو اُردو جاننے والوں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

ترکی قوم کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس کا جواب فاضل مورخ کی زبان سے سنئے:۔

"ترکوں کو مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے چنانچہ کہیں ہون (HUN) اور کہیں کُشان (KUSHAN) کہا گیا ہے، بعض کتابوں میں انہیں یوچی (YUCHI) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ چینی تواریخ میں ترکوں کے لئے ہیانگ نو (HIYANG NO) اور توکیو (TUKIYO) کے الفاظ موجود ہیں، ہندوؤں نے قبل از اسلام اور بعد از اسلام عام طور سے انہیں ترشکا (TURUSHKA) کہا ہے۔ غرضکہ یہ بہادر اور عظیم قوم بہت سے ناموں سے نوازی گئی ہے۔ لیکن صریحی طور پر لفظ ترک (TURK) آٹھویں صدی عیسوی کے ترکی کتبوں میں تقریباً نوے بار استعمال ہوا ہے"

اور

"عثمانی ترکوں کا تعلق مشہور ترکی قبیلے اوغوز (OGHUZ) سے ہے جس کی ابتدا، قہرمان نامغلوب اوغوز قان سے ہوتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر ہے، اسی ہیرو کی نسبت سے اس کی اولاد کو اوغوز ترک یا قوم اوغوز کہا گیا ہے، اوغوز ترکوں کی ایک شاخ ترکمان (TURKMAN) بھی ہے۔ اوغوز ترکوں نے دنیا میں عظیم الشان حکومتیں قائم کیں، سلجوقی عثمانی، قراقویونلو (کالی بھیڑوں والے ترک) آق قویونلو (سفید بھیڑوں والے ترک) صفوی اور ہندوستان کے قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان اسی اوغوز یا ترکمان ترکوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

ان اقتباسات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فاضل مورخ نے کس قدر تحقیق اور مطالعہ کے بعد اس تاریخ کو مرتب کیا ہے۔

سلیمان شاہ کے دور کے بعد عثمانی حکومت کا آغاز ہوتا ہے، اس حکومت کے بانی امیر عثمان غازی (۱۲۹۹ء۔۱۳۲۶ء) کے حالات، اس کے بعد امیر اورخان غازی (۱۳۲۶ء۔۱۳۶۰ء) پھر امیر مراد خداوندگار شہید (۱۳۶۰۔۱۳۸۹ء) اور آخر میں سلطان یلدرم بایزید خاں (۱۳۸۹ء۔۱۴۰۲ء) کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے! آخر میں عثمانیوں کے نظام سلطنت یعنی ــــ مرکزی، صوبائی، دینی اور فوجی نظام وغیرہ کی تفصیل دی گئی ہے، پوری کتاب معلومات سے لبریز ہے اور تحقیقی جدوجہد کا گرانقدر ثمرہ ہے! زبان بھی سادہ اور سلیس ہے کاش! فاضل مورخ کو علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کا قلم میسر آ سکتا۔

مقالات سرسید حصہ چہارم

مرتبہ :- محمد اسمٰعیل پانی پتی، ضخامت ۵۳۶ (جلی ٹائپ)، قیمت ۵ روپے ۲۵ پیسے،
ملنے کا پتہ :- مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور

سرسید احمد خاں مرحوم کے تمام مضامین مجلس ترقی ادب لاہور نے ایڈٹ کر کے متعدد جلدوں میں شائع کئے ہیں، چوتھی جلد جو اس وقت ہمارے سامنے ہے اُس کے چند اہم ابواب حسب ذیل ہیں :-

دنیا کب بنی اور کتنی مدت میں اور مذہب اسلام سے اُس کی مطابقت ــــ کیا دنیا و مافیہا چھ دن میں بن گئی؟ ــــ انسان کی پیدائش قرآن مجید کی رو سے ــــ علوم طبیعیہ کی تحقیقات جدیدہ ــــ سورج کی گردش زمین کے گرد قرآن سے ثابت نہیں ــــ اصحاب کہف اور اُن کی حقیقت ــــ ازواج مطہرات رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ــــ غلامی ــــ تناسخ . . . . "

سرسید احمد خاں اپنے دل میں ملّت اسلامیہ کا درد رکھتے تھے، ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کرنے میں انہوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اُن کو کسی عنوان فراموش نہیں کیا جا سکتا! اُن کے قلم نے اسلام کی مدافعت کا فرض بھی انجام دیا ہے اور متعصب مستشرقین کے اعتراضات کو دلائل سے رد بھی کیا ہے مگر ان تمام خوبیوں کے باوجود دینی مسائل میں اُن کی فکر کو پوری طرح بلوغ حاصل نہ ہو سکا، وہ یورپ کی تہذیب اور علوم سے خاصے متاثر اور مرعوب تھے، علم کلام میں اُن کا مسلک معتزلہ کا مسلک تھا۔ جو دینی مسائل میں فکر و تعقل کو اُس حد تک کام میں لاتے ہیں جہاں عقل وحی الٰہی کی تابع نہیں رہتی۔ اس لئے سرسید کے قلم نے بھی دینی مسائل کی تشریح و تعبیر میں جگہ جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں!

اس کتاب میں بھی اُن کے بعض خیالات قلب مومن میں خاص کھٹک پیدا کرتے ہیں، مثلاً :-

"ہم تسلیم کرتے ہیں اور تسلیم بھی کرنا چاہئے کہ وہ حیوان جب انسان کی صورت میں آیا تھا تو اُس میں ایک بے انتہا ذہنی ترقی کا مادہ موجود تھا" (ص ۵۶)

حالانکہ قرآن کریم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان ایک دور میں حیوان بھی رہ چکا ہے، قرآن کریم میں تخلیق آدم کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُس سے سرسید کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔

غلامی کے مسئلہ میں بھی سرسید احمد خاں کے خیالات میں ضرورت سے زیادہ آزادیٔ فکر پائی جاتی ہے! اسلام میں جب تک فریضۂ جہاد باقی ہے، غلاموں اور کنیزوں کی ضرورت اور امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سرسید احمد خاں اُردو نثر نگاری میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں مگر کہیں کہیں زبان و قواعد کی غلطیاں بھی ان سے سرزد

لے [illegible] کو غلطی سے کتابت کیا گیا ہے۔

ہوگئی ہیں :— مولوی صاحب قبلہ تو خوب غور کرنے و کان لگا کر سننے کے
"جو رستہ تو دیکھنے و برتنے میں آتے ہیں" (ص ۱۷۸)
بعد یہ فرماتے ہیں: (ص ۳۱۷) دونوں جملوں میں "واؤ" (عطف) غلط استعمال ہوا ہے "اور" کا محل تھا ——
"مشرق تمہارے دائیں ہاتھ کو ہوگی" (ص ۱۸۴) دلّی میں مشرق کو مونث بولتے تھے یا اب بھی بولتے ہیں۔ تو "فکر" کی تذکیر
کی طرح "اس کا فکر اچھا ہے" اس سے بھی ذوق و وجدان کو ناگواری اور وحشت لاحق ہوتی ہے۔
"اگر کفاروں کے قصے ہیں ..." (ص ۲۲۱) "کافروں" یا "کفار" لکھنا تھا —— اسی طرح صفحہ ۳۱۰ پر "ارواح"
یا "روحوں" کی بجائے "ارواحوں" لکھا ہے —— اس کے بعد صفحہ ۳۴۹ پر بھی اسی قسم کی غلطی کی ہے کہ "اسباب" کی
جگہ "اسبابوں" استعمال فرمایا —— "اس لئے پرتگیز والوں نے" (ص ۳۶۸) یا تو "پرتگیز" لکھنا تھا، یا
"پرتگال والوں" —— "جس ٹکڑۂ زمین پر" (ص ۳۷۱) فارسی لفظ "زمین" کے ساتھ ہندی (یا اردو) لفظ "ٹکڑہ"
کی اضافت —— کتنی وحشت انگیز ہے۔

قدیم نثر نگاروں اور شاعروں سے زبان و بیان کی جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، اُن کو جو کوئی نظیر اور مثال
بنائے گا، وہ "بناء فاسد علی الفاسد" کا مرتکب ہوگا۔

جدید غزل

از:— پروفیسر رشید احمد صدیقی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت دو روپیہ ۷۵ پیسے
ملنے کا پتہ :— سرسید بک ڈپو، علی گڑھ ۲

حرفِ آغاز میں سید بشیر الدین صاحب مہتمم توسیعی خطبات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے لکھا ہے :—
"پروفیسر رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کا یہ مقالہ اس سلسلے کی ایک کڑی
ہے جسے موصوف نے پروفیسری کے منصب پر فائز ہونے کے بعد علی گڑھ کے ایک ادبی اجتماع
میں ۲۶ اگست ۱۹۵۵ء کو پڑھا تھا"

اس کے بعد "مابعد" کے عنوان سے خود فاضل مقالہ نگار رقم طراز ہیں :—
"بارہ سال ہوتے یہ مقالہ عجلت میں لکھا گیا اور سرسری میں شائع ہوا، اس لئے اس کے نقائص
نہ محتاج بیان ہیں، نہ قابل تردید، دوسری طرف یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ بارہ سال کے بعد
بھی اس کے دن نہ پھرے! آج بھی اسی اہتمام سے ناظرین کے سامنے آ رہا ہے ......"

جناب رشید احمد صدیقی طنز و مزاح میں آپ ہی اپنا جواب ہیں، اس کے ساتھ صاحب موصوف بلند پایہ تنقید نگار بھی،
"باقیاتِ فانی" جناب سے چالیس سال قبل انہوں نے بڑے معرکہ کا مقدمہ لکھا تھا، جس نے ادبی حلقوں میں ہلچل سی پیدا کردی
اتنی مدت میں مطالعہ، مشق اور تجربہ نے اُن کے شاعرانہ ذوق اور تنقیدی صلاحیتوں کو اور زیادہ نکھار دیا۔
"جدید غزل" میں رشید احمد صدیقی نے غزل کی جس شان سے اور مبصرانہ انداز میں حمایت و مدافعت کی ہے اور اس کو
کا اُجاگر کیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے! صدیقی صاحب ادیب اور طنز نگار ہونے کے علاوہ مفکر اور فلسفی بھی ہیں، اُن کی مزاحیہ تحریروں
میں بھی فلسفہ کی خاصی جھلکیاں ملتی ہیں، اس کتاب میں اُن کی فلسفیانہ فکر نے خوب جوہر دکھائے ہیں! اُن کی دلیلیں کتنی منطقی اور

---

[1] الفت کی "ڈسپلن" (ص ۲۱۷، ۲۱۲) "ڈسپلن" تو مستند طبیب نکر پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔

کس قدر سلجھا ہوا اور دل نشین ہے، نقد و نظر کی یہ بلندی ہر ناقد کو میسر نہیں آتی، ساتھ ہی وہ تعمق بھی، جس سے تنقید صحیفۂ ادب بن جاتی ہے۔

غزل نے اُردو کو مقبول بنانے میں جو کارنامہ انجام دیا ہے اُس کا اعتراف فاضل ناقد نے ان لفظوں میں کیا ہے۔

"کہنا صرف اتنا ہے کہ زبان ہو، ادب ہو، تہذیب و معاشرت ہو ان کی توانا اور صحت مند صلاحیتوں اور امکانات کو ان کی تقدیر سے ہم کنار کرنے میں اُردو کا بڑا دخل ہے اور اُردو کو ہندوستان گیر بنایا غزل نے"

مولانا حسرت موہانی کی شاعری کی ایک خصوصیت :-

"حسرت کی شاعری اور عاشقی کی طرح، حسرت کی زبان بھی بڑی معصوم، بے ساختہ دل نشین اور منجھی ہوئی ہے، ایسی کہ معلوم نہیں ہوتا کہ مانجی گئی ہے، زبان و بیان کی تازگی اور روانی کا جو لطف حسرت کے یہاں ملتا ہے، دوسرے کے یہاں تقریباً نہیں ملتا"

ترقی پسند شاعری پر تنقید :-

"ترقی پسند شاعری اور ادب کی ابتدا، اصلاحی یا ادبی نہ تھی سیاسی اور اشتراکی تھی۔ اس کی عمر ہندوستان میں ۳۰-۳۵ سال سے زیادہ نہیں ہے سیاسی اور اشتراکی اعتبار سے اُسے چاہے جتنی ترقی ہوئی ہو اصلاحی اور ادبی اعتبار سے اُس کو کامیابی نہیں ہوئی"

اور

"جدید غزل میں واقعیت کی جو فضا ملنے لگی ہے، وہ اشتراکیت کی نہیں اقبال کی دی ہوئی ہے"

فراق کے بارے میں :-

"فراق کے یہاں ہم جس چیز کو برہنگی اور فحاشی قرار دیتے ہیں، وہ دراصل ان کے تحت الشعور میں مذہبی تقدس کا رنگ رکھتی ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ کہیں کہیں راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ جہاں عورت کا پیچ ہو وہاں بھٹکنا تعجب کی بات نہیں"

اس کتاب کا ایک اور اقتباس :-

"تہذیب اور تاریخ کا پورا سوادِ اعظم حالی نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے دیکھا تھا اس کے کھنڈر پر حالی بے پایاں انسانی دردمندی اور غیرت قومی کے ساتھ کھڑے اپنے ساتھیوں کی غفلت اور خفیف الحرکاتی پہ آنسو بہاتے ہیں، سوادِ رومۃ الکبریٰ میں اقبال، حالی ہی کی صدائے بازگشت ہیں، شاعری کا اتنا بڑا کینوس حالی اور اقبال ہی کے بس کا تھا، ہر بڑی تہذیب کے کھنڈر پر کوئی نہ کوئی حالی یا اقبال ضرور نمودار ہوتا ہے۔

"شاعری نوحہ والوں کی پکار نہیں ہوتی، انسانیت کے خاصانِ بارگاہ کی فغانِ نیم شبی اور گریہ سحری ہوتی ہے، حالی اور اقبال کی شاعری اسی پایہ کی ہے، حالی غزل کے سارے لوازم برتتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو ...

بھی قابو میں نہیں آئے، انہوں نے ہمیشہ غزل کو اپنے قابو میں رکھا اور یہ بات معمولی نہیں ہے، جس
شاعر پر فن یا موضوع قبضہ پالے میں اُسے بڑا شاعر نہیں سمجھتا، بڑا شاعر وہ ہے، جو فن اور
موضوع کو اپنے قبضہ میں رکھے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک خود کو اپنے قابو میں نہ رکھ سکے۔"

اس کتاب میں ایک بات بہت زیادہ کھٹکی ——— وہ یہ کہ رشید احمد صدیقی جیسا مفکر ادیب و ناقد بھی ان "سُرخوں" کے
پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر فیض کا ذکر غالب اور اقبال کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ شعر گریگی شعر و ادب کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔

آیاتِ جمال از :- بابا ذہین شاہ تاجی، ضخامت ۵۲۸ صفحات (کتابت و طباعت دیدہ زیب، جلد پائیدار اور
خوشنما) ملنے کا پتہ :- مکتبہ ماہنامہ تاج تیسری روڈ بہار کالونی، کراچی ملا

"آیاتِ جمال" جناب ذہین شاہ تاجی کی اُردو غزلوں کا دلکش مجموعہ ہے! پاکستان بننے سے قبل شاہ صاحب موصوف کی
زندگی جذب و وجد کے گوشہ گمنامی اور سادہ یہ کم آمیزی کی زندگی تھی، شیخ طریقت اور شاعر کی حیثیت سے اُن کا تعارف جے پور
ٹونک اور اجمیر تک محدود تھا، پاکستان بننے کے بعد شاہ صاحب کی شخصیت اتنی نمایاں ہوئی کہ یہ "عالم صغیر" رفتہ رفتہ
"عالم کبیر" بنتا چلا گیا، اُن کے معتقدین میں عوام کے ساتھ خواص بھی شامل ہیں ——— یونیورسٹی اور کالجوں کے پروفیسر، کارخانوں
اور تجارتی کمپنیوں کے مالک، شعراء اور اہلِ قلم غرض ہر طبقہ کے افراد جن میں خواتین بھی شامل ہیں اُن کے روبرو زانوئے ارادت
طے کرتے ہیں اور بہت سوں کو دست بوسی کا شرف بھی حاصل ہو جاتا ہے، راقم الحروف نے ایک مجلس میں اپنے کانوں سے ایک
ملک کی بیگم ——— ہرہائی نس ——— کو ذہین شاہ صاحب سے "سرکار" کے لقب کے ساتھ خطاب کرتے سُنا ہے، پیروں
یہاں عقیدت مندی کا یہ سیلاب اپنے ساتھ خوشحالی بھی لاتا ہے، اس خوشحالی کی جھلک "آیاتِ جمال" کے خوش نما گیٹ اپ
دکھائی دیتی ہے : لوگ کہتے ہیں شاہ صاحب کو "عمل حب" آتا ہے، میں کہتا ہوں اُن کی شخصیت کی مقناطیسیت
یہ سب کر سکتی ہے۔

جناب ذہین شاہ پیری مریدی، عرس و فاتحہ اور اُن کے غیر شرعی لوازم و رسوم میں اس حد تک بہو نچے ہوئے ہیں کہ خود
ان کے ایوان میں اُن کے دادا پیر کی نیم قدِ آدم تصویر آویزاں ہے، اور یہ بڑی سے بڑی بدعت اُن کے مشرب میں "حسنہ" بنی ہوئی
ہے، "فاران" کے صفحات میں شاہ صاحب موصوف پر راقم الحروف کا قلم بڑی سخت گرفت کر چکا ہے ——— مگر اُن کی وسعتِ
ظرف کا یہ عالم ہے کہ اس خاکنشین سے خاص تعلقِ خاطر رکھتے ہیں، اور میرے "گریز" کے باوجود اپنے جذبِ محبت کی روش
میں فرق نہیں آنے دیتے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیری اور تکدر و انقباض سے انہوں نے اپنے آئینہ دل کو بے غبار بنا لیا ہے، اور لوگوں
سے ملنے جلنے میں اُن کا یہ مسلک ہے کہ :-

میں محبت ہی محبت ہوں، محبت کی قسم

محبت اپنی جگہ خود "کرامت" ہے !

مولانا محمد اسمٰعیل خاں رنذی جے پوری نے "آیاتِ جمال" پر جو مقدمہ لکھا ہے وہ اپنی جگہ تنقیدِ شعر و ادب کا شاہکار ہے !
مولانا رنذی شرافت و مروت اور وضعداری میں اپنی آپ ہی مثال ہیں، اُن کی پوری زندگی علم و ادب کی تحقیق و ریاضت میں گذری ہے
بصارت کی پیدائشی کمزوری کے باوجود اُن کا مطالعہ غیر معمولی وسیع ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل کی آنکھوں کو روشن کر دیا ہے، خود
شاعر ہیں اور شعر و ادب کے قدر شناس و دوست بھی ہیں، اچھا شعر سُن کر اُن پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات

محفلوں میں اُن کے اس انداز پہ لوگوں کو مسکراتے اور اشارے کرتے بھی دیکھا ہے! مولانا نذری دل سے نگاہ تک مومن ہیں، عشقِ رسولؐ اُن کی زندگی کا حاصل اور اُن کی سب سے زیادہ گرانقدر متاع ہے، نعتیہ اشعار سُن کر اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے ہیں! وہ چار ابروؤں کا صفایا نہیں کرتے اس وضع کو انہوں نے ریش و بروت تک محدود رکھا اس لئے پورے قلندر نہیں، نیم قلندر ہیں۔

"آیاتِ جمال" پر اُن کا عالمانہ مقدمہ پڑھ کر اس طرف خیال گیا کہ نذری صاحب تنقید نگاری اور انشاء پردازی پر پوری توجہ دیتے، رسالوں میں اُن کے مضامین چھپتے اور اُن کی تصانیف منظرِ عام پر آتیں تو اُن کا شمار صفِ اول کے اہلِ قلم میں ہوتا اور ان کو بیکراں شہرت میسر آتی! اس قناعت و انکسار کی بدولت نہ جانے کتنی عظیم شخصیتیں گمنام ہو کر رہ گئی ہیں! نہ جانا، کسی نے نہ جانا اور جس نے جانا وہ بھی شخصیت کے جوہرِ کمال کا بس اُوپری مطالعہ کر کے رہ گیا!

اس دور کے ترقی پسند تنقید نگاروں کی تنقیدیں عام طور پر الجھی ہوئی ہیں، شعر میں سب سے پہلی چیز یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ عناصر جن سے شعر ترکیب پاتا ہے اُن میں کس قدر حُسن و توازن پایا جاتا ہے۔ زبان کی صحت، لفظوں کے دروبست، خیال و اظہار کی ہم آہنگی کا کیا رنگ ہے، کیا شاعر کا مافی الضمیر شعر میں پوری طرح ادا ہو گیا؟ اور ادا ہوا ہے، تو کس حُسن کے ساتھ ہوا ہے! شعر کی حقیقی خوبیوں پر گفتگو کرنے کی بجائے یہ نام نہاد ترقی پسند "سماج" "آویزش" "ماحول" کے نقطۂ نظر سے شعر کا مطالعہ فرماتے ہیں اور وہ وہ نکتے تراشتے ہیں جو بے چارے شاعر کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہوتے! شعر کے اصل تانے بانے پر اُن کی نگاہ ہی نہیں جاتی، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہ حضرات ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح سے قریب قریب محروم ہیں، وہ تو دیکھتے ہیں کہ اس میں "سماج" کہاں جھانک رہا ہے ——— اور "زندگی" اس میں کراہ رہی ہے یا واہ واہ کر رہی ہے۔

مولانا نذری نے اپنے اس مقدمہ میں صاحبِ "آیاتِ جمال" کے اشعار کا جس انداز میں تجزیہ کیا ہے وہ اُن کی سخن شناسی، شعر فہمی اور صحتِ ذوق کی ناطق شہادت ہے! اُن کی نگاہ شعر کے معاملہ میں کتنی باریک بیں اور اُن کی طبیعت کس قدر نزاکت رس ہے! اور پھر کمال یہ ہے کہ اس تجزیہ و تحلیل کے باوجود شعر کے گلدستے بکھرنے نہیں پاتے اور ان جالیوں کو ناقد نے اس احتیاط اور نرمی کے ساتھ چھوا ہے کہ وہ ٹوٹنے نہیں، ثابت رہے۔

فاضل مقدمہ نگار نے خیال و معنی اور شعر کی باطنی خوبیوں سے جہاں بحث کی ہے، وہاں وہ ایک دیدہ ور ناقد اور عالم نظر آتے ہیں، کتنے علمی اور فلسفیانہ نکتے ہیں، جو وہ باتوں باتوں میں بیان کر گئے ہیں۔

اس مقدمہ کی بعض باتوں میں وجدان نے کھٹک بھی محسوس کی، مثلاً نذری صاحب لکھتے ہیں:—

"مرزا عبدالقادر بیدل نے فرمایا تھا:—

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش

اقبال نے اس اغلاق کو یوں دور کیا:—

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے" (ص ۱۰۴)

حیرت ہے نذری صاحب کو بیدل کے شعر میں اغلاق نظر آیا، حالانکہ بیدل کا شعر مفہوم کے اعتبار سے بالکل صاف اور

اور اس میں نہ کوئی اشکال ہے، نہ اغلاق ہے، اور نہ ایسا کوئی نکتہ ہے، جس تک پہنچنے کے لیے فکر کو دشواری اُٹھانی پڑے۔

بے دلی سے تم نے معبودِ جان و دل تو کیا   اس خدائی سے تو اپنی بندگی اچھی رہی

ماہر زیدی نے جناب بیکش اکبرآبادی کا یہ شعر اس اعتراف و مدح کے ساتھ نقل فرمایا ہے:۔

"میکش اپنے مشاہدات و واردات کو تہ در تہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سوائے اہلِ حال کے ان کے کلام کا بنیادی نقطہ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔"

کسی شعر کی یہ تعریف کہ اُسے اہلِ حال ہی سمجھ سکتے ہیں، بڑے جھگڑے کی بات ہے، جس شعر میں بھی اغلاق و ابہام بلکہ اہمال پایا جائے اُس کے عیوب پر یہ کہہ کر پردہ ڈالا جا سکتا ہے کہ "یہ تو اہلِ حال کے سمجھنے کا شعر ہے"۔ میکش کا یہ شعر حقیقت میں صریحی طور پر اللہ تعالیٰ پر طنز ہے، اور تصوف اگر دین سے خارج کوئی شے نہیں ہے، تو وہ اس طنز کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ پھر "بے دلی سے تم رہے۔۔۔" میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے، شاعر نہ جانے کیا کہنا چاہتا ہے — کیا بندوں نے اللہ تعالیٰ کو معبودِ جان و دل "مانا" تو مگر بے دلی سے مانا — یا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ ہی بندوں کے جان و دل کا معبود بنا رہا (معاذ اللہ) پھر شعر میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی "خدائی" سے بندوں کی بندگی کیوں اور کس طرح اچھی رہی!!

ذہین شاہ صاحب تاجی کا ایک شعر زیدی صاحب نے نقل کیا ہے:۔

وہ جدھر جھومتے چلے آئیں   خود بخود مستی ہوئی شراب آتے   (ص ۲۶)

اس میں "چلے آئیں" کی جگہ "چلے جائیں" ہوتا تو "آئیں" اور "آتے" کی تکرار کا جو خفیف سا نقص پایا جاتا ہے وہ بھی دور ہو جاتا اور شعر میں صنعت (تضاد) — جائیں اور آتے — بھی کسی آورد و تکلف کے بغیر آپ ہی آپ پیدا ہو جاتی۔

مجھ کو تو صبر تھا ستم گاہ گاہ پر   یہ بھی اگر برا ہے تو اچھا نہ کیجئے

ذہین شاہ کے اس شعر میں "یہ بھی اگر برا ہے" کا ٹکڑا کھٹکتا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "یہ بھی آپ پر گراں گزرتا ہے" یا "ایسا کرنے میں آپ کو زحمت ہوتی ہے" یا "آپ کو گوارا نہیں ہے" تو — اچھا ستم گاہ گاہ بھی نہ کیجئے۔

سہل ممتنع کے تحت ذہین شاہ صاحب کے اشعار کی جو مثالیں دی ہیں، اُن میں بعض مثالیں کمزور ہیں مثلاً:۔

کیوں نہیں ہے زباں پہ دل کی بات
اس قدر راز داریاں کیوں ہیں؟

اس شعر کو "سہل ممتنع" کون کہہ سکتا ہے!

"توریت کی آیت ہے جس کا اُردو ترجمہ یہ پایا جاتا ہے کہ "خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا" اور اسی مضمون کی ایک حدیث بھی ہے۔

"ان اللہ خلق آدم علی صورتہ"   (ص ۴۴)

عام طور پر اس حدیث کا وہی ترجمہ کیا جاتا ہے جو توریت کی آیت کا مفہوم ہے۔ مگر محتاط علماء نے اس حدیث کا یہ ترجمہ بھی کیا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے آدم کو خود اُس کی صورت پر پیدا کیا"

یعنی کہ جو صورت اُن کے لیے مناسب تھی اور جو اُن کی فطرت کی مانگ تھی، اُس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اُنہیں خلق فرمایا! اور یہ کہ اللہ تعالیٰ

تصورات وجہت اور مکانیت سے پاک ہے! اور عربی گرامر کے اعتبار سے بھی "صورتہٖ" میں "ہٖ" کی ضمیر آدم سے قریب واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کا مرجع "آدم" مان لینے سے عربی قواعد کی ترتیب بھی باقی رہتی ہے!

۔ صاحب آیاتِ جمال کے اس شعر میں :—

نفع عذرِ مستی نے پائی عذرِ شرعی پر
کر سکا نہ سنّی حیلہ و حوالۂ شیخ (ص ۵۱)

حیرت ہے کہ سنّی صاحب کو کسی قسم کا نقص محسوس نہیں ہوا! محاورہ "حیلہ و حوالہ" نہیں "حیلہ حوالہ" ہے ان لفظوں کے درمیان عطف نہیں آتا، امیر مینائی فرماتے ہیں —

اچھا ہے صاف کہہ دو نہ آئیں گے ہم کبھی
حیلہ حوالہ خوب نہیں بار بار کا

"..... آخر عمر میں اکثر و بیشتر شعراء کا دم نکل جاتا ہے، جگر کی مثال ہمارے سامنے ہے" (ص ۶۳)

یہ بات "اکثر و بیشتر" صحیح نہیں ہے کہ شعراء کا آخر عمر میں دم نکل جاتا ہے یعنی اُن کی شاعری میں جان باقی نہیں رہتی —— اور جگر مرادآبادی کے بارے میں تو بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ جگر کے کلام میں آخر عمر تک پستی یا کمزوری پیدا نہیں ہوئی اور اُن کی شاعری کے حسن و خوبی زورِ بیان اور لطف تاثیر میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، اُن کے آخری دور کی غزل کے تین شعر درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

یہ میخانہ ہے بزمِ جم نہیں ہے
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

شکستِ دل، شکستِ غم نہیں ہے
مجھے اتنا سہارا کم نہیں ہے

ارے او! شکوۂ سنجِ عمرِ فانی
یہ فانی زندگی بھی کم نہیں ہے

ان شعروں میں جگر کس قدر توانا دم نظر آتے ہیں! مرنے سے کچھ دن پہلے انہوں نے جو غزل کہی، اُس کا مطلع کس قیامت کا ہے۔

مست ہوں جو اُس شوخ کا دیدار ہوا ہے
تا دیر سنبھلنا مجھے دشوار ہوا ہے

اس قسم کے چند تسامحات کے باوجود "آیاتِ جمال" کا مقدمہ اپنی جگہ تنقید کا شاہکار ہے، یہ اس قابل ہے کہ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی طرح علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا جائے، تاکہ اس کے مطالعہ سے لوگوں میں شعر سمجھنے کی صحیح فہم و بصیرت پیدا ہو، "آیاتِ جمال" کی اشاعت کی یہ افادیت ہی کیا کم ہے کہ اس کی بدولت اتنی عالمانہ تنقید اُردو زبان و ادب کو میسر آگئی! شاعر اور ناقد دونوں قابلِ مبارک باد ہیں!

"مقدمہ کے بعد جناب ذہین شاہ صاحب نے "تعارف" کے عنوان سے اپنی زندگی کے مختصر حالات لکھے ہیں، جو دلچسپ ہیں اور ستھرے انداز بیان میں ادبی چٹخارہ پایا جاتا ہے، اپنی شاعری کے بارے میں شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں —

"میں نے اپنی شاعری میں حقائق کو لباسِ مجاز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، رد و قبول دونوں ہی مطمحِ نظر نہیں . . . . . میں مجاز اور حقیقت دونوں ہی سے اس عالم کو آباد دیکھتا ہوں جس میں میری سکونت ہے، مجاز بے حقیقت کی طرح، حقیقت بے مجاز بھی کوئی معنی نہیں رکھتا"

اس کے بعد شاعرِ انقلاب جناب جوش ملیح آبادی کا مقالہ ہے، جس کا عنوان ہے "ابتدائیہ ہم آغوشی"! عام طور پر کتابوں پر پیش لفظ اور دیباچے نہ میرا کچھ خوشی اور شوق سے نہیں لکھے بلکہ اُن سے گھبراتے جاتے ہیں، مصنفین اور شاعروں کا اصرار مجھ

پر لکھنے پر نہیں مجبور کر دیتا ہے، اس قسم کی تحریروں میں لکھنے والے کی "بے دلی" نمایاں طور پر جھلکتی ہے مگر جوش صاحب کے "پیش لفظ" میں بڑی "آمد" اور شگفتگی پائی جاتی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر انقلاب نے اپنے شوق سے یہ مضمون لکھا ہے، انتہائی شگفتہ اور جاندار تحریر :! جوش صاحب لکھتے ہیں۔

"پہلی بار میں نے ذہین شاہ کا چہرہ دیکھا تو میرا دل موہ لیا"

کاش! جوش صاحب کو اس پر غور کرنے کی بھی توفیق نصیب ہوتی کہ یہ ایمان و یقین کی جھلکیاں ہیں جو ذہین شاہ صاحب کے چہرے میں نظر آتی ہیں۔ مگر جوش صاحب اس سے محروم ہیں اور ستم یہ ہے کہ اس محرومی پر ندامت و تاسف کی بجائے، الٹا فخر کرتے ہیں! اس مقالہ میں اس عقیدے کے ظاہر کرنے کا کہ جوش صاحب "منکر خدا" ہیں کوئی محل نہ تھا، مگر جوش صاحب کی فطرت کو انکار وجدانی کی تکرار اور اصرار نے عجیب بنا دیا ہے کہ اس "پیش لفظ" میں بھی انہوں نے اپنی بے دینی، بے یقینی اور انکار خدا کا اظہار کر ہی دیا۔

ذہین شاہ صاحب کی شخصیت کے بارے میں ہم شرح صدر کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ رسمی شاعر یا متشاعر نہیں بلکہ حقیقی شاعر ہیں، اُن کی فطرت "متغزل" واقع ہوئی ہے اور یہ "بالقوہ جوہر" جب "بالفعل" کا روپ دھارتا ہے تو سحر حلال بن جاتا ہے۔ ذہین شاہ صاحب کی غزلیں حقیقت و مجاز کا سنگم ہیں۔ اُن کی غزلیں اس کی غمازی کرتی ہیں کہ وہ عشق مجازی کی منزلوں سے بھی گزرے ہیں اور انہوں نے کوئے بتاں کی بھی سیر کی ہے، اس قسم کے اشعار :-

میرے اک ہاتھ میں سورج مرے اک ہاتھ میں چاند   تیری گردن میں حمائل ہیں جو باہیں مری
وہ جب نگاہ کریں، ہم بھی ایک آہ کریں   جو تیر کھائیں نہ کیوں تیر مارتے جائیں
تمہارا بھی کیا حال میرا سا ہو گا   محبت کہیں راس آتی تو ہوگی

وہی شاعر کہہ سکتا ہے جس کا دل عشق مجازی کی چوٹ کھایا ہوا ہو! یہ اپنی اپنی یافت ہے کہ یہی ہوس ناک عشق "قنطرۃ الحقیقت" بن جائے ——

تصوف نے ذہین شاہ کی غزلوں میں خاصہ نکھار پیدا کر دیا ہے، اور اُن کی شاعری شباب کی منزلوں سے گزر کر دور نشیب تک پاکیزہ تر ہوتی چلی گئی ہے، مولانا رزی کی اس رائے سے ہمیں اتفاق ہے ——

"ذہین صاحب کے کلام کی جامعیت ان کو تمام صوفی اور غزل گو شعراء میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے"

منتخب اشعار :-

وہ بہاریں کہ ترے ساتھ مجھے دیکھ گئیں   کیا کہیں گی اگر آ کر مجھے تنہا دیکھا
سب سے مل کر بھی کم آمیز ہے تمکین جمال   تجھ کو دیکھا تو بھری بزم میں تنہا دیکھا
میں نے مانگا تھا بن، مجھ کو بستی ملی   میں نے بستی جو مانگی مجھے بن دیا

لہ راقم الحروف کا یہ شعر جناب ذہین شاہ صاحب کے اس خیال سے متوارد ہو گیا۔

رہ وفا میں ہوس کو بھی رائگاں نہ سمجھ
مجاز اپنی جگہ، خود بھی اک حقیقت ہے

وہ آئینہ کبھی منہ دیکھتے تھے جس میں تم اپنا
لئے بیٹھا ہے آغوشِ تہی میں عکس گم اپنا

بدل جاتی ہے جب نسبت بدل جاتی ہے ہستی بھی
وہ خود اپنا نہیں رہتا جسے کہتے ہو تم اپنا

چین تھا اُس کی حضوری میں نہ دوری میں سکوں
عمر بھر اس کی محبت میں تڑپنا ہوگا

حرم میں دیر میں دنیا و دیں میں
تمہیں تم ہو، یہاں کیا ہے وہاں کیا

ممکن نہیں، کہ تجھ سے رہا ہو وہ باخبر
جو اپنے آپ سے کبھی غافل نہیں رہا

ہمیشہ خاک نشینانِ میکدہ ہیں ذہینؔ
ہزار مہر بدامن، ہزار ماہ بجیب

ان کو مجھ سے، مجھ کو اُن سے ہے حجاب
دیکھئے پہلے اُٹھے کس کا نقاب

وہ دل میں آگئے کہ وہاں دل چلا گیا
آئی کہاں سے دل میں تجلئ بامِ دوست

جہاں کل چھاؤنی چھائی تھی دل نے
بہت آتے ہیں وہ دیوار و در یاد

بچھائے جہاں سجدے نظر نے
نہ آئے کیوں وہ خاکِ رہگزر یاد

ذہینؔ ترکِ محبت کرے، خدا نہ کرے
یہ جبرئیل کہیں، تو بھی اعتبار نہ کر

سب اہلِ چمن، ذکرِ چمن میں ہیں مگر دوست!
پھولوں کی زباں اور ہے کانٹوں کی زباں اور

ملتا نہیں ہے دہر میں کوئی اداشناس
مومن ہے بت شناس نہ کافر خداشناس

ہر وقت میرے ساتھ ہے ہر لحظہ میرے پاس
کیوں دور دور قربِ خدا کی رہی تلاش

ہوتا کہیں وہ گم تو اُسے ڈھونڈتے ذہینؔ
وہ خود ہی گم ہیں، جن کو خدا کی رہی تلاش

پاس کے پاس اور دور کے دور
دل میں موجود آنکھ سے روپوش

مصیبت میں دینے تسلی وہ آئیں
تو پھر اکتسابِ مصیبت ہے فرض

آسماں پہ ماہِ نو، کعبے میں محرابِ حرم
یہ اشارے ہیں، خمِ ابروئے جاناں کی طرف

معصوم گناہوں سے ذہینؔ، اہلِ جنوں ہیں
یہ بات پہونچ جائے نہ اربابِ خرد تک

تیرے در کے فقیر ہیں ہم لوگ
کیا امیر و کبیر ہیں ہم لوگ

دل میں رکھتے ہیں چاند سی صورت
کیا ہی روشن ضمیر ہیں ہم لوگ

دل و نگاہ میں ہے اک رقیق ایک قریب
میں دل کے ساتھ رہوں یا نظر کے ساتھ رہوں

یہ آسماں یہ مہ و مہر یہ ستارے ہیں
ہمارے ہاتھ نہ آئیں، تو کیا ہمارے ہیں

کہیں نقاب نہ اُٹھے، خوشی کے چہرے سے
یہاں جو خوش نظر آتے ہیں غم کے مارے ہیں

محبت کی دنیا میں یہ فاقہ مستی
نہ آنسو کہ پی لیں، نہ غم ہے کہ کھائیں

تمہیں ملی مری کھوئی ہوئی نگاہ کہیں
وہی نگہ کہیں جلوہ تھی جلوہ گاہ کہیں

خلوصِ عشق جزا و سزا سے مستغنی
نہ ہو ثواب کی امید بھی گناہ کہیں

جس انجمن میں دلوں کے چراغ جلتے ہیں
اُس انجمن میں چراغوں کی روشنی ہیں ہم

محبت ہم کو کس منزل میں لے آئی خدا جانے
تسلّا دے رہے ہیں آپ ہم گھبرائے جاتے ہیں،

یہ کہہ کر ذہینؔ اپنے دلِ مضطر کو ٹھیرایا
خطاب اوروں سے اس انداز میں ہے
جب ایک ذرے کے رُخ سے نقاب اُٹھتا ہے
حیاتِ خلد بھی شاید بدل نہ ہو اُن کا
قفس کا در ہمارے پر کتر کر کھولنے والو!
زندگی کیا ہے سفر، پیہم سفر
دوست عنقا ہیں، تو دشمن ہی سہی
چاہتا ہوں، میں انہیں لیکن ذہینؔ
زلف و رخسار بہ یک وقت نظر میں ہیں ذہینؔ
دل میں اگر ہے عشق تو مخلص ہے بت پرست
نہیں کوئی شے درمیاں توبہ توبہ
کبھی خوفِ عقبیٰ، کبھی فکرِ بخشش
کس نے دیکھی تری منزل کہ ابھی دیر و حرم
تمہارے عارض و گیسو کے بعد نظروں سے
وہ پوچھتے ہیں مرا حال ہائے کیا کیجے
عام ہو کر بھی غمِ عشق یہاں عام نہیں
وہ نظر ہے جو مشرف ہے رُخِ ساقی سے
خاک ہوں پاک ہوں ادنیٰ بھی ہوں اعلیٰ بھی ذہینؔ
تا ابد فرصتِ مستی ہے بہت کم ساقی
حق تری غم کی امانت کا ادا کر نہ سکے
ملی جلی سی فنا و بقا کی لذت ہے
ہزار شکر کہ مجھ کو عطا ہوا ہے ذہینؔ
بے نیازی انہیں زیبا ہے تو اے اہلِ نیاز
ذہینؔ چاہے نظر سے نظر ملے نہ ملے
بُت خانے سے کعبہ میں ذہینؔ آئے ہیں جب سے
یہ راز جانتے ہیں آپ کے نگاہ شناس
خاک سے لالہ و گل، سنبل و ریحاں نکلے
شیخ میخانے میں آنے کو مسلمان آیا
حُسن کی ایک تجلی کے ہیں دو نام ذہینؔ

وہ آنے کو ہیں وہ آتے ہی ہوں گے، آئے جاتے ہیں
وہ جیسے مجھ سے کچھ فرما رہے ہیں
مری نگاہ سے ہفت آسماں گزرتے ہیں
ترے بغیر جو دن رائیگاں گزرتے ہیں
پروں کو ہم پریشاں چھوڑ کر، آخر کہاں جائیں
پھر سفر میں کیا تمنائے سکوں
کوئی تو ہو جس کو اپنا کہہ سکوں
یہ مجھے خود بھی نہیں معلوم کیوں
اب کوئی فرق یہاں غیب و شہادت میں نہیں
ایمان بھی لیا ہے جو ہو بے دلی کے ساتھ
مگر ہم کہاں، وہ کہاں توبہ توبہ
خدا سے ہیں ہم بدگماں توبہ توبہ
دیکھتے پھرتے ہیں، دیکھی ہوئی راہیں میری
نہ روشنی کبھی گزری، نہ تیرگی گزری
اک آہ پہ تھا بھروسا، سو آہ بھی نہ ہوئی
جس کو سو درد دیئے، رُخصت یک آہ ملی
وہ خیر ہے جو درِ پیرِ مغاں سے آئی
خود پہونچ جائے گی جو چیز جہاں سے آئی
چل یہاں سے بھی کہیں دور چلیں ہم ساقی
نالۂ نیم شبی، آہ و فغانِ سحری
تری نگاہ نے مارا کہ زندگی بخشی
وہ فقر جس نے گداؤں کو خسروی بخشی
سجدہ آساں ہے وشوار پذیرائی ہے
مگر ملی ہوئی دونوں دلوں کی دھڑکن ہے
بت ڈھونڈ رہے ہیں وہ مسلمان کہاں ہے
غم و خوشی کی حقیقت کچھ ایک ہی سی ہے
تم بھی پردے سے نکل آؤ کہ ارماں نکلے
کاش! میخانے سے نکلے، تو مسلماں نکلے
شمع بن جاتی ہے، پروانہ بنا دیتی ہے

اکثر تمہارے ساتھ، تمہارے خیال میں
ہم عالمِ خیال سے باہر نکل گئے

تری محفل میں، تیری ہی محبت کھینچ لاتی ہے
مرا ذوقِ نظر تیرا ہی شوقِ خود نمائی ہے

خیر دل کی، نہ اماں جان کی ممکن ہے یہاں
جس کو پیارے ہوں دل و جاں محبت نہ کرے

غرض مٹنا ہے خود مٹ جائیں یا کوئی مٹا ڈالے
ہم اپنے دوست کب ہیں جو ہمارا کوئی دشمن ہو

اِدھر آئے وہ اُدھر گردشِ ایام گئی
وہ اُدھر جائیں، اِدھر گردشِ ایام آئے

ترے مصحفِ رُخ کو قرآن جانیں
بس اتنا ہی کافی ہے علمِ کتابی

اپنی صورت دیکھ کر، تیری حقیقت دیکھ لیں
اب یہی اک شکلِ ادراکِ معانی رہ گئی

تمہیں تم ہو، نہیں کچھ بھی کہیں اور
کہاں تشبیہ؟ کیسے استعارے!

عمر کیوں کشمکشِ سود و زیاں میں گزرے
جو گزرنی ہے نہ کیوں عشقِ بتاں میں گزرے

عمر ۔ دو روزہ بہرحال گزر جاتی ہے
وہ خوشی میں نہ سہی، آہ و فغاں میں گزرے

یاد ہے کیا تھی حقیقت حسن کی
جب مجھے ذوقِ تماشا ہی نہ تھا

طلب کی کامیابی نے نظر کی بے حجابی نے
وہی پایا ہوا پایا، وہی دیکھا ہوا دیکھا

مجھے ہنسنے میں بھی اب تو کوئی لذت نہیں ملتی
وہ کیا دن تھے کہ میں روتا تھا اور اک لطف آتا تھا

مجھ سے میری حکایتیں سنئے
آپ سے آپ کی شکایت کیا

دلِ بے رنگ پھر ہے منکرِ نیرنگِ نظارہ
شبِ تنزیہ کعبہ! صبحِ تشبیہ کلیسا آ

ہے تجلی سے زینتِ دیر و حرم
تو نہیں تو کفر کیا اسلام کیا!

جز آرزوئے مرگ کرے کیا بہار میں
بے پر، اسیرِ کنجِ قفس، آشیاں سے دور

ذروں کی انجمن ہو کہ تاروں کی جلوہ گاہ
تم تو یہاں سے دور نہ تم ہو وہاں سے دور

ایسی اٹھی نظر کہ نہ دیکھا کسی کو پھر
ایسی جھکی جبیں کہ کہیں پھر جھکی نہیں

عالم تمام، عالمِ ذوقِ نگاہ ہے
جلوہ کسے کہوں میں کسے جلوہ گر کہوں

تمہارا نام کیا لکھا ہوا ہے میری صورت پر
جو مجھ کو دیکھتا ہے کیوں تمہارا نام لیتا ہے

کیا آنکھ بند رکھنا، آدابِ بزم میں ہے
تجھ کو ہی ہم نہ دیکھیں تیری ہی انجمن میں

کھوئی ہوئی سی ہر شے معلوم ہو رہی ہے
کیا چیز بھول آیا، میں تیری انجمن میں

میں دیکھتا ہوں ہر اک شے خدا کی حمد میں ہے
صنم کدے میں کوئی بے نماز ہو تو کہوں

آ دیکھ اپنے حسن کو میری نگاہ سے
تجھ سے زیادہ میری محبت حسین ہے

کوئی حاجت روا نہیں ہوتی
پھر بھی ہیں آپ قبلۂ حاجات

آہ کو صبر کی تعلیم رسا ہونے تک
درد کو ضبط کی تلقین دوا ہونے تک

کوئے جاناں کے سوا اور ٹھکانا ہے کہاں
وہ یہ کہتے ہیں کہ جاؤ تو کہاں جائیں ہم

تجلی پردہ دارِ حسن بھی ہے پردہ در بھی ہے
وہ جتنے چھپتے جاتے ہیں، نمایاں ہوتے جاتے ہیں

دیکھ آتا ہے نظر جلوۂ جاناں دل میں   اُن کے دیدار کی حسرت میں بھی کیا کم ہے مزا

ابھی حقیقت یک ذرہ منکشف نہ ہوئی   ابھی جہان کو انجان جانتا ہوں میں

جنہیں غرور ہے اس بے ثبات ہستی پر   اُنہیں کو بے سروسامان جانتا ہوں میں

نہ ہوں میں قابلِ گلشن نہ ہیں شایانِ محفل ہوں   میں اک پژمردہ غنچہ ہوں میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

مل گئے آپ تو کیا معذرتِ جور و ستم   اتفاقات کچھ ایسے بھی ہوا کرتے ہیں

شکر ہے بعد مرے یاد ہے میری باقی   بزمِ امروز میں اک تذکرۂ دوش ہوں میں

بیقراری تھی محبت کا سفر   دل جہاں ٹھہرا وہ منزل ہوگئی

دل کی کیا بات ہے، تم ہی دل ہو   دل سے کیا بات چھپاؤں دل کی

ہے بس اُمید پہ دنیائے محبت قائم   وہ بھی وعدہ کوئی وعدہ ہے جو پورا ہو جائے

ہاں ! کیوں رہے شریکِ عبادت خیالِ غیر   کیا میں نہیں رہا ہوں کہ سجدہ کروں تجھے

کون ہے اب اس دلِ غم دوست کا   تم جفاؤں پہ بھی پچھتانے لگے

اب تو اے سوزِ دروں ! کچھ بھی پتہ چلتا نہیں   میرے پہلو میں مرا دل ہے کہ اک انگارہ ہے

مرے اُٹھتے ہی سب اُٹھ جائیں گے پردے جدائی کے   مری ہستی حجابِ درمیاں معلوم ہوتی ہے

یہ ہے آغاز تو انجامِ شبِ غم معلوم   دلِ سرِ شام چراغِ سحری ہوتا ہے

ایک ہی منزل پہ جا کر مل گئے دونوں ذہین
وہ چلے سوئے حرم، ہم کوئے جاناں کی طرف

دوسرا رُخ :-

کتنا پیچیدہ ہے بیانِ عشق   کوئی یہ داستاں سمجھ نہ سکا   (ص ۳۰)

اس شعر میں سطحیت کے سوا اور کیا رکھا ہے !

کون یوسف ہے کارواں کے ساتھ   خاک بھی کارواں سمجھ نہ سکا

اس شعر کا بھی یہی رنگ ہے۔

تھا اندھیروں میں روپوش ہونا اگر   کیوں مجھے آپ نے قلبِ روشن دیا   (ص ۳۸)

آخر یہ بات کیا ہوئی ؟ "اندھیروں" نے شعر کی معنویت و مفہوم کو مجروح کر دیا۔ مجاز ہو یا حقیقت "اندھیروں" کا استعمال کھٹکتا ہے ! "حجابوں" کہتے تو اک بات تھی۔

تری زلف و رخسار کے دھوپ سائے   مجھے یاد آتے ہیں دن رات کیا کیا   (ص ۳۹)

شعر اچھا ہے مگر لفظی دروبست کے اعتبار سے عبارت کا تقاضا ہے کہ "دھوپ اور سائے" ہوتا !

---

[1] نصیبی ہروی کا شعر ہے :-

خارِ ترم کہ تازہ ز باغم ربودہ اند   محرومِ بوستانم و مردودِ آتشم

سلام آیا نہ کچھ پیغام آیا   تغافل اُن کا میرے کام آیا   (ص ۴۱)

مصرعہ ثانی میں شدید قسم کا ابہام پایا جاتا ہے۔

حکیم عصر کو مستی میں آکر   علاجِ گردشِ ایام آیا

"آورد" اور ناگوار قسم کی "آورد"! نہ جانے حکیم عصر سے کون مُراد ہے! اُس حکیم عصر کا "مستی میں آنا" اور زیادہ

عالم ہوش ہو یا جلوہ گہ جاں ہو ذہین   میں خود آیا نہیں کوئی مجھے لایا ہوگا   (ص ۴۴)

"عالم ہوش" کے مقابل "عالم بیخودی یا جہان بےخبری" لانا تھا "جلوہ گہ جاں" کی ترکیب نے ابہام پیدا کر دیا، شاید مراد عالمِ ارواح ہو۔

تغیر سے بری حسن و محبت کی گل افشانی   گراں گزری زمانے پر زمانہ سرگراں بدلا   (ص

اس قسم کے اشعار انتخاب میں چھانٹ دینے چاہیے تھے! "زمانہ سرگراں بدلا" یہ آخر کیا اندازِ بیان ہے!

جب عشق میں گم اطراف ہوئیں، جب سوز میں محو جہات ہوئیں

جو شمع تھی وہ پروانہ تھا، وہ شمع تھی جو پروانہ تھا   (ص ۴۶)

مصرعہ ثانی عجیب سا ہے! "جہات کا سوز میں محو ہونا" زبان و بیان اور مفہوم کے اعتبار سے وجدان کو بری طرح کھٹکتا ہے کی جگہ "حُسن" ہوتا تو "محویت" سے ایک طرح کی مناسبت تو پیدا ہو جاتی۔

دیکھے ہیں دل نے گیسوئے برہم ہزار بار   تم ایک بار بھی دلِ برہم نہ دیکھنا   (ص ۴۸)

اوّل تو دل کا گیسوئے برہم کو دیکھنا ہی محل غور ہے، پھر مصرعہ ثانی میں "دل برہم نہ دیکھنا" زبان کے اعتبار سے ناقص ٹکڑا ہے "دل برہم کو نہ دیکھنا" کہنا چاہیے تھا۔ گیسوئے پریشاں یا زلف بےترتیب کے معنی میں "گیسوئے برہم" صحیح ہے، مگر برہم سُن کر ذہن پریشانی کی بجائے "خفگی" کی طرف جاتا ہے، "دلِ برہم" وہ دل جو کسی سے خفا ہو۔

طوفانِ اضطراب میں گم ہو گئیں جہات   اب امتیازِ بسمل و قاتل نہیں رہا   (ص ۵۱)

اگر یہ شعر "مجاز" میں ہے تو مصرعہ اولیٰ بےمعنیٰ ہے ——— اور "حقیقت" میں ہے یعنی تصوف کا ترجمان ہے تو پھر اللہ کو "قاتل" کہنا سوء ادب ہے۔ اور قاتل و بسمل یعنی خالق و مخلوق کا امتیاز اُٹھ جانا   اسلامی تصوف نہیں ہے۔

اس نام سے شراب میں آتی ہیں مستیاں   پروردگارِ بادہ پرستی ہے نام دوست   (ص ۵۹

"مستی" کا محل تھا اس کی جمع (مستیاں) شعر کا وزن پورا کرنے کے لیے لائی گئی ہے، مصرعہ ثانی آورد اور تکلف سے لبریز۔ "پروردگارِ بادہ" یا "پروردگارِ مستی" کی ترکیب تو گوارا کی جاسکتی تھی مگر "پروردگارِ بادہ پرستی" لغو ترکیب ہے۔

دل کا بیڑا پار اُترا   بےکشتی و بے زورق   (ص ۹۱)

"بیڑا" تو کشتیوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں، اس صورت میں "بےکشتی و بےزورق" حشو و زاید ہے۔ "دل کا مسافر" کہتے تو بات بن جاتی۔

ترے منہ پہ کھلتا ہے بس مُسکرانا   کہاں منہ ہے جو مسکرائیں بہاریں   (ص ۱۲۱

دوسرا مصرعہ لفظوں کے دروبست اور اندازِ بیان کے اعتبار سے چُست نہیں ہے بلکہ خاصہ کمزور ہے۔

تازہ صنم تراش کر، تازہ خدا تلاش کر   کام نئی نظر سے لے دل کی نئی حیات میں   (ص ۱۲۲

ہیں اہل تصوف صفحے کے صفحے سیاہ کر سکتے ہیں ۔ مگر اس قسم کے شعر "تصوف زدگی" کے سبب "معزز
رہتے ہیں !

ہمارا باغ گلستانِ سرمدی ہم ہیں — خدا کے ساتھ ہیں دائم وہ آدمی ہم ہیں (ص ۱۲۵)

اور قدیم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ، مخلوق کا چاہے وہ انسان ہی کیوں نہ ہو ، اللہ تعالیٰ کے وجود کی طرح
اِ نگاہ سے درست نہیں ! بعض مسلمان فلاسفر بھی قدمِ عالم کے قایل تھے ، اس لئے امام غزالی کو اُن کے اس
کرنی پڑی ۔

نقش سجود ہر طرف نام کو نقش پا نہیں — منزلِ عشق سر ہوئی ، ایک قدم چلا نہیں (ص ۱۲۴)

دل میں بُری طرح اُلجھ کر رہ گیا ۔

لا کر مجھ کو وہ خود رو رہے ہیں — ہزاروں شعر موزوں ہو رہے ہیں (ص ۱۳۳)

کے لئے نشاط و کیف اور جمال و شباب کا منظر ہونا چاہئے ، محب اور محبوب کے آنسوؤں کو "شعر موزوں ہو رہے
علیم پہ گراں گزرتا ہے ! عاشق کو محبوب نے جو رُلایا اور پھر خود رونے لگا ، اس کا کوئی قرینہ یا سبب شعر میں نہیں ملتا ۔

س رہے ہوں گے پری پیکر گلوں کی آڑ میں — بیکھڑی کی اوٹ میں ہوگا پرستاں کچھ نہیں (ص ۱۴۰)

ب ہو سکا ، ردیف "کچھ نہیں" اس شعر میں بیکار جا رہی ہے ۔

عصائے خضر گزرگاہِ عشق میں مستی — کہ بے خودی کا سہارا لئے خودی گزری (ص ۱۶۲)

اُلجھا ہوا شعر !! پھر "عصا" کی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تو ایک تاریخی حقیقت رکھتی ہے مگر حضرت خضر
نسبت غیر متعلق سی بات ہے ۔

محبت ، سب خلش کہتے ہیں جس کو — مجھے آرام ہوتی جا رہی ہے (ص ۱۸۰)

"آیاتِ جمال" کے چہرۂ حسین و تابناک پر بھلے نہیں لگتے ۔

اے جذبِ عشق تعالی اللہ ۔ تاثیرِ محبت کیا کہنا
آ مجھ سے مجھ کو بھی لے لے ، با خود ہوں تو بیخود کر دے (ص ۲۳۱)

— ایسی پستی ! ایسے شعر نو مشقی کے زمانہ میں کہے جاتے ہیں اور چاک کر دئے جاتے ہیں ۔

نگاہوں کی دعا نے مجھ کو دیکھا — نظر نا آشنا نے مجھ کو دیکھا (ص ۲۳۶)

"دعا" کیا بات ہوئی ؟ مصرعہ ثانی اور زیادہ مبہم ہے ۔

داد ہے زاہد ! ترے طرزِ بیاں نے ہی کی — جیسے میخانے میں جا کر ہوشیار آ ہی گیا (ص ۲۴۸)

ابہام ! ؟

آؤ کہ ایک لمحہ ہم تم بھی ساتھ بیٹھیں — دم لینے رُک گیا ہے چلتا ہوا زمانہ (ص ۲۵۰)

ی بجائے "چند لمحے" یا تھوڑی دیر کہنا چاہئے تھا پھر "دم لینے رک گیا ہے" میں "کے لئے" کا حذف ہو جانا بُری
ا ہے ! ان خامیوں کے علاوہ چلتے ہوئے زمانہ کا دم لینے کے لئے رُک جانے کا — کوئی سبب یا قرینہ شعر میں
ملتا !

اس بے رُخی کا آہ ہوا مجھ پہ یہ اثر　　　انجام کار یاس پہ مجبور ہو گیا　(ص ۲۵۶)

ناموں، مشاق اور خوش گو شعراء، اس قسم کے بھرتی کے شعروں کو اپنے سے منسوب کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں!

تری ادائیں نہ چھیڑیں، تری نظر نہ لگائے　　　میں ایک نغمۂ آسودہ خواب ساز میں ہوں　(ص ۲۸۷)

"تری نظر نہ لگائے" سے نہ جانے کس مفہوم کی ترجمانی مقصود ہے۔

تجھ میں مجھ میں حجاب تھا ہی نہیں　　　تھا اگر کامیاب تھا ہی نہیں　(ص ۲۹۰)

غزل کا ایسا مطلع جو وجدان و ذوق کے لئے تکلیف دہ ہو۔

مسجودِ تجلیات، پرستیدۂ خیال　　　کیا تیری جلوہ گاہ مری بے خودی نہیں　(ص ۲۹۲)

مفہوم عنقا اور اندازِ بیان فارسی اور عربی کی ترکیبوں سے بوجھل۔

وہ اپنا کام کرتے جاتے ہیں اچھا　　　ہم اپنا کام کرتے جا رہے ہیں　(ص ۳۰۴)

شعر میں ذم بھی سطحیت بھی، اور مصرعۂ اولیٰ میں تعقید بھی!

اُن کی سانسوں کی خوشبو ہم سونگھیں اپنی سانسوں سے
حُسن و محبت دونوں کو آزاد رکھیں، آزاد کریں　(ص ۳۱۲)

مصرعۂ اولیٰ میں شاعر جس قسم کی خواہش کر رہا ہے! اُس کے بارے میں ہم کہیں بھی تو کیا کہیں! مصرعۂ ثانی مہمل ہے۔

میری اُمید نکلی نہ جو تیرے لب سے بات　　　میرا نصیب جو تری نیچی نگاہ ہے　(ص ۳۵۳)

مفہوم و معنیٰ، اندازِ بیان اور واقعیت ——— غرض ہر اعتبار سے شعر کمزور اور پھسپھسا ہے۔

ہیں دیکھنے والے بھی یہاں دیکھنے کی چیز　　　محفل میں کوئی دیکھنے والا ہی نہیں ہے　(ص ۳۵۴)

یعنی ———!؟ "دیکھنے کی چیز" صوتی اعتبار سے نطق و سماعت پر گراں گزرتا ہے۔

مجھ سا فریب خوردۂ مہر و وفا نہیں　　　میری نظر میں تیری جفا بھی جفا نہیں　(ص ۳۷۱)

مطلع میں "وفا" اور "جفا" قافیوں کے بعد، غزل کے دوسرے شعروں کے قافئے بھی "خفا" اور "صفا" ہوتے تو بہتر تھا۔ مگر مدعا ——— حیا ——— دوسرا، قافئے لائے گئے ہیں، یہ احتیاط کے خلاف ہے۔

میری تابشوں میں گم میری زندگانی ہے　　　برقِ بے تکلف ہوں، صورِ بے محابا ہوں　(ص ۳۷۳)

شعر ہر اعتبار سے کچھ بھی نہیں ہے، ——— پھر مصرعۂ اولیٰ میں "صورِ بے محابا" غیر متعلق ٹکڑا ہے، جو شعر کی معنویت سے دور کا بھی کوئی ربط نہیں رکھتا۔

دل دیر و حرم بیتاب میں سجدہ فشانی کو　　　سمجھتے ہیں خدا گبر و مسلماں اس جوانی کو　(ص ۳۹۲)

تکلف ہی تکلف اور آورد ہی آورد!

کہانی حُسن کی رازِ حقیقت ہوتی جاتی ہے　　　مجھے بزمِ دو عالم تیری خلوت ہوتی جاتی ہے　(ص ۴۱۲)

مصرعۂ اولیٰ الجھا ہوا ہے۔

کیا نزع کا عالم بھی ہنگام تماشا ہے　　　دیکھو لگہ آخر جاتی ہوئی دنیا ہے　(ص ۴۱۳)

رہی ابہام اور اہمال:

غم یہ ہے کم نہ غم سوز تمنا ہو جائے　　کہیں آتشکدۂ حسن نہ ٹھنڈا ہو جائے　(ص ۱۴۲)

وزتمنا" کیا چیز ہے؟ پھر مصرعہ ثانی میں قافیہ (ٹھنڈا) کتنا کھُردرا لگتا ہے۔

یہ کہتا کون ہے تو چارہ سازِ دل نہیں ہوتا　　یہ رونا ہے کہ تیرا علم کیوں دردِ نہاں تک ہے　(ص ۲۲۴)

لے پلے تو کچھ پڑا نہیں !!

جسے سنتے ہی سنتے کوئی سو جائے　　وہ افسانہ کہو اپنی نظر سے　(ص ۲۵۸)

ہے افسانہ کہنے کا یہاں کیا محل تھا!

غزلوں کی ترتیب یوں ہونی چاہئے تھی کہ سب سے پہلے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۴ء تک کا کلام، اس کے بعد ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کی غزلیں اور سب سے آخر میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء تک کا انتخاب ہوتا، تاکہ تدریجاً خوب سے خوب تر منظر قاری نظر کے سامنے آتا جاتا مگر "آیاتِ جمال" میں اس ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے ــــــ کتاب کا اختتام ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۴ء کی غزلوں پر ہوتا ہے اور اس طرح قاری کو بلندی سے پستی کی طرف آنا پڑتا ہے!

افسوس ہے کہ کلام کے انتخاب میں دقتِ نظر سے کام نہیں لیا گیا۔ کوشش یہ رہی کہ کمیت کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ مجموعہ میں شامل ہو سکے حالانکہ "پیشِ نظر کیفیت" (۲۷ ، ۵۵) رہنی چاہئے تھی؛ کاش! لالہ و گل کے ساتھ جھاڑ جھنکار نہ ہوتے!

مجموعی طور پر "آیاتِ جمال" ایک دلکش و حسین شعری پیشکش ہے، جس نے غزل کی صنف میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

پھر ایک کارواں لُٹا

از: نعیم صدیقی، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت قسم اعلیٰ (آرٹ کاغذ پر) پانچ روپے، قسم اول (سفید کاغذ پر) چار روپے، ملنے کا پتہ: ادارۂ مطبوعات طلبہ ۴/۶، ۲ لسبیلہ مارکیٹ، کراچی

ادارۂ مطبوعات طلبا نے متعدد کتابیں شائع کی ہیں، ظاہری دیدہ زیبی اور خوشنمائی کے ساتھ یہ کتابیں دینی اور اخلاقی اعتبار سے بھی مستحقِ تحسین ہیں! اب اس ادارے نے مشہور مفکر ادیب و شاعر جناب نعیم صدیقی کی پندرہ نظمیں بڑے اہتمام سے شائع کی ہیں، سرورق رنگین اور دیدہ زیب ہے، کتابت اور طباعت حسین اور ہر صفحہ پر رنگین حاشیہ نے پوری کتاب کو نظر افروز مرقع بنا دیا ہے۔

شروع میں نعیم صدیقی کا لکھا ہوا "پیش لفظ" ہے، جو اس قدر اثر انگیز، جاندار، حقائق سے لبریز اور سوز و درد میں ڈوبا ہوا اور اخلاص کی خوشبو سے مہکا ہوا ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کاش! یہی اندازِ بیان شعر کے قالب میں ڈھل جاتا۔

پہلی نظم "پھر ایک کارواں لٹا" ہے جس میں "وادیٔ نیل" کے غمناک حادثات کو شعر کی زبان میں پیش کیا گیا ہے، دوسری نظم کا عنوان ہے "درندوں کے درمیان" اس کے یہ اشعار کتنے درد انگیز ہیں۔

ترے چمن کو کیا مالیوں نے خود تاراج
ہزاروں ابن ہبیرہ ہیں نت نئے حجاج
ہم اپنے تیروں کی بوچھاڑ کا ہیں خود آماج
کتاب پاک کے اوراق خون آلودہ
چراغ کعبہ کا ہے طاق خون آلودہ

ترے پیام کی مشعل جلے تو کیسے جلے
ترا نظام مقدس چلے تو کیسے چلے

"کیا بنایا گیا" کا یہ شعر اس نظم کا سب سے اچھا شعر ہے۔

ظلم کی تیغ کی دھار خود مڑ گئی
صبر کو ڈھال جب بھی بنایا گیا"

"نقشِ ۔۔۔۔ بلیغ درس ہے، جس میں اسلامی تاریخ کے ان نامور اکابر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہوں نے حق کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں پیش کی ہیں اور بادشاہوں کا جبروت اور جاہ و جلال جن کو کلمہ حق بلند کرنے سے باز نہیں رکھ سکا ۔۔۔۔ اس میں ر۔۔۔

"صلیب گہ (صفحہ ۷۵) کی ترکیب نامانوس ہے۔

بہم دگر سب لپٹ رہے ہیں
سرور و کیف اس کا پانا ہوگا
سمیٹ لے جاؤ دولتِ دل، خزانہ ہائے خودی اٹھاؤ
خدا بہ صد شوق بن کے رہیے، زرا ابھی تغیر اب نہ ہوگی
وہ شیخ بنا کہ بتا پیارا
نہ شیخ بنا ٹلا تھا حق سے، نہ قطب تارا کبھی ٹلے گا

نظم کے یہ ٹکڑے خاصے کمزور ہیں!

نظم ۔۔۔ "کل اس لہو کا جواب دوگے" ۔۔۔۔ دورِ حاضر کے ظالموں کو چیلنج ہے، انتباہ ہے، خطرے کی آخری گھنٹی ہے، اس میں وہ گھن گرج ہے کہ تخت چرچرانے لگیں اور کجکلاہی کو پسینہ آ جائے ۔۔۔ مگر جہاں یہ رنگ پیدا ہوگیا:

بہ عالمِ اضطراب دوگے
بیاں بہ بزمِ گلاب دوگے
وہ دورِ کفِ انقلاب دوگے
تم اپنے دل کے کباب دوگے
کل اس لہو کا حساب دوگے

وہاں وجدان وحشت محسوس کرتا ہے۔

"حضور" جو اس مجموعہ کی آخری نظم ہے، اپنے آہنگ کے اعتبار سے چونکا دینے والی نظم ہے:۔

حضور آپ سے اک ساز عرض کرنا ہے
حضور! آپ کو بھی ایک روز مرنا ہے
ادھر توجہ عالی نہ جا سکی ہوگی
حضور کی بڑی مصروف زندگی ہوگی

کب آنے والی گھڑی سامنے رہی ہوگی
کسی نے کم ہی یہ بات آپ سے کہی ہوگی

وہی اجل کہ جو رقصاں ہے جھونپڑوں کی طرف
اسی کو شیش محل سے بھی آگزرنا ہے

اسی بند کے اس شعر میں :۔

یہ آرزوؤں کی کھیتی جو لہلہاتی ہے
قضا کو توڑ کے ہر باڑ اس کو چرنا ہے

دسرا مصرعہ کتنا عجیب ہے، ممکن ہے اس میں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہوں ، اور یہ مصرعہ یوں ہو :۔

قضا کو توڑ کے ہر بار اس کو چرنا ہے

مگر اب بھی یہ مصرعہ بہت کمزور ہے اور زبان وبیان کے اعتبار سے خاصہ قابل غور ہے ۔

وہاں مگر یہ یہ شمشیر بھی نہیں ہوگی ۔

" یہ " نہیں " میں کا محل تھا ۔

حضور! آپ سے اک راز عرض کرنا ہے
حساب عمر کسی جگہ جا نبٹنا ہے

حساب کے لئے " نبٹنا " کون بولتا ہے ؟ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ زندگی کے حساب کی کہیں نہ کہیں تو جانچ پڑتال ہوگی ؛ اس کا اظہار موزوں الفاظ میں نہ ہوسکا ۔

جناب نعیم صدیقی " ترقی پسند شاعروں " سے خاصے متاثر ہیں ۔ اس لئے جہاں جہاں اُن کی شاعری پر نام نہاد ترقی پسند شاعری کا سایہ پڑ جاتا ہے ۔ وہیں اُن کی شاعری میں جھول پیدا ہو جاتا ہے ۔

" اے نیل کی موجو ! " کے کئی بند اپنے اندر بڑی تاثیر اور سوز و درد رکھتے ہیں ——— یقین ہے کہ نعیم صدیقی کی نظموں کا یہ مجموعہ نوجوانوں کو نیا ولولہ ، تازہ جوش اور صحیح فکر دے گا ۔

انوارِ اقبال

مرتبہ : بشیر احمد ڈار ، ضخامت ۳۰۴ صفحات ، دیدہ زیب گرد پوش ، قیمت بارہ روپے
ملنے کا پتہ :— اقبال اکاڈمی ۔ پاکستان کراچی

اس کتاب پر پیش لفظ جناب ممتاز حسن نے لکھا ہے ، اس کے بعد جناب بشیر احمد ڈار کا " عرضِ حال " ہے جس میں وہ لکھتے ہیں

" اقبال کے اُردو خطوط ، متفرق تحریروں اور کمیاب منظومات کے کئی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں ۔ ان مجموعوں کے علاوہ اقبال کے بہت سے خطوط ، تحریریں ، تقریظیں ، آراء اور تبصرے مختلف رسائل واخبارات میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں ، یہ بکھرا ہوا قیمتی مواد آج تک کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکا ، لیکن رینہ رینہ چن کر اب تمام منتشر نادر تحریروں ، نظموں اور خطوط کو زیر نظر کتاب میں جمع کردیا گیا ہے . . . . . "

" ان کے علاوہ اقبال کے چند ایسے اہم مضامین ، بیانات اور تقاریر بھی شامل کتاب ہیں جو اس

سے پہلے کسی مجموعے میں موجود نہیں ۔"

کوئی شک نہیں اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط، تحریروں، تقریظوں اور تبصروں کا یہ مجموعہ "اقبالیات" میں گرانقدر اضافہ ہے! علامہ اقبال کی اصل تحریروں کے جا بجا عکس بھی کتاب کی زینت ہیں!

اقبال کے دو مضامین (۱) حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعہ کی دعوت اور (۲) معارف علیہ —— علم ظاہر و باطن ۔ "انوار اقبال" کی جان ہیں!

"اقبال کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد مرحوم کا ایک خط" (ص ۹)

اقبال کے بڑے بھائی، مرزا غلام احمد (علیہ ما علیہ) کو نبی مان کر، مرتد ہوگئے، اس لئے اُن کے نام کے ساتھ "آنجہانی" لکھا تھا، "مرحوم" وفات پاتے ہوئے مسلمانوں کے نام کے ساتھ لکھا جاتا ہے، کافروں اور مرتدوں کو "مرحوم" نہ کہتے ہیں اور نہ لکھتے ہیں —— خود علامہ اقبال نے اس مدعی نبوت کو کاذب لکھا ہے اور علامہ کی یہ تحریر اس کتاب میں شامل ہے، فرماتے ہیں :—

"ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعوی کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں، یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے، اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے ۔"

صفحہ ۶۲ پر حاشیہ ہے :—

"اصل نام ملا بدخشی ہے، جو داراشکوہ کا استاد اور میاں میر صاحب کا مرید تھا، ملا شاہ بدخشی کا مختصر حال "دبستان المذاہب" میں مل سکتا ہے ۔"

اسی ملا بدخشی کے اس شعر :—

پنجہ در پنجہ خدا دارم — من چہ پروائے مصطفیٰ دارم

کے بارے میں علامہ اقبال مولوی محمد الدین فوق کو لکھتے ہیں :—

"تعجب ہے کہ شیخ ملا کے ملحدانہ و زندیقانہ شعر "من چہ پروائے مصطفیٰ دارم" کو آپ اس کتاب میں جگہ دیتے ہیں اور پھر ملا کی تشریح کس قدر بیہودہ ہے، یہی وہ وحدت الوجود ہے جس پہ خواجہ حسن نظامی اور اہل طریقت کو ناز ہے؟ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پہ رحم کرے اور ہم غریب مسلمانوں کو ان کے فتنوں سے محفوظ رکھے" (ص ۶۲)

اس مکتوب اور حاشیہ کو پڑھ کر غلط فہمی دور ہوگئی اور حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ شعر حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کا نہیں ہے، بعض لوگ اس شعر کو حضرت مجدد سے منسوب کرتے ہیں، یہ غلط اور جعلی نسبت ہے! دوسری بات یہ سامنے آئی کہ داراشکوہ جس استاد (ملا شاہ بدخشانی) کا شاگرد تھا، وہ اس قسم کے ملحدانہ شعر کہتا تھا، ظاہر ہے کہ استاد کی تعلیم و تربیت کا اثر شاگرد (داراشکوہ) میں بھی آیا ہوگا! اگر شاہ جہاں کے بعد داراشکوہ بادشاہ ہو جاتا تو ہندوستان میں اسلام کو جلال الدین اکبر کے منحوس زمانہ کی طرح شدید مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ۔

علامہ اقبال نے غیر اسلامی تصوف پر جس جرأت ایمانی کے ساتھ چوٹ کی ہے، اُس سے اُن کی اصابت فکر اور عقیدہ کی صحت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

"انوارِ اقبال" کی ترتیب و تالیف پر جناب بشیر احمد ڈار علمی دنیا کی طرف سے تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

شاعر کرشن چندر نمبر

ادارہ :- اعجاز صدیقی، سہند ناتھ،
ضخامت ۴۱۰ صفحات، قیمت دس روپے
ملنے کا پتہ :- ماہنامہ شاعر، قصر الادب بمبئی نمبر ۸ (بی۔ سی)

ماہنامہ "شاعر" اڑتیس سال سے زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے، مولانا سیماب اکبرآبادی مرحوم اس کے بانی ہیں، انہی کی زندگی ہی میں اُن کے خلفِ رشید جناب اعجاز صدیقی نے "شاعر" کی ادارت کو سنبھال لیا تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ بمبئی چلے آئے اور انتہائی نامساعد حالات میں "شاعر" کو جاری رکھا! اس استقامت، ایثار اور خلوص کا پھل انہیں مل کر رہا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے "شاعر" کے حالات اچھے ہیں!

"شاعر" کے بہت سے خاص نمبر اور سالنامے منظرِ عام پر آ چکے ہیں مگر "کرشن چندر نمبر" سب پر فوقیت لے گیا، مضامین کتنے متنوع ہیں اور اُن کو کس سلیقہ کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ لکھائی، چھپائی دیدہ زیب، سرورق حسین و پُرکشش، کرشن چندر کی زندگی اور اُن کے فن کا اس "شمارہ خاص" میں بڑے حسن و خوبی کے ساتھ تجزیہ اور احاطہ کیا گیا ہے، کرشن چندر پر نظمیں البتہ نثری مضامین کے مقابلہ میں کمزور رہیں! "کرشن چندر نمبر" میں اُن کے افسانے پڑھنے کے قابل ہیں؛ وہ ہندوستان جہاں اُردو کی جان کے لالے پڑے ہیں "کرشن چندر نمبر" کی اشاعت اس عالمگیر زبان کی زندگی دوام اور قبولِ عام کی دلیل ہے۔

ہر جگہ
اور ہمیشہ
قابلِ اعتماد
NTR
NATIONAL
نیشنل
سائیکل ٹائیر و ٹیوب

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
ACM
آدم جی کاٹن ملز۔ لانڈھی کراچی

ہیمورائڈ' بواسیر کی تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک بہترین مرہم ہے۔ یہ بواسیری مسّوں پر تسکین دہ اور دافع عفونت اثر کرتا ہے اور انہیں سکیڑ کر ختم کر دیتا ہے۔ 'ہیمورائڈ' کے چند ٹیوب استعمال کرنے سے بواسیری خون، ورم، درد اور خارش کو قطعی افاقہ ہوتا ہے۔

ماہنامہ فاران کراچی

ستمبر ۱۹۶۷ء
جلد :- ۱۹
شمارہ :- ۶

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ترتیب

چندہ سالانہ ۷ روپے | پبلشر :- مسرور حسین | قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

مقام اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مستفیض احمد صدیقی - پبلشر مسرور حسین نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقشِ اوّل

یہ وہ حقیقت ہے، جو سب کے نزدیک مسلّم ہے، اور ایسا واقعہ ہے جو کسی دلیل و ثبوت کا محتاج نہیں ہے کہ اُردو دنیا کی تمام زبانوں کے مقابلہ میں ہے مگر جہاں تک اُردو زبان کی وسعت و مقبولیت اور اُس کے ادب کی گیرائی، رفعت و عظمت اور ثروت کا تعلق ہے، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی زبان سے وہ کمتر اور ہیچ نہیں ہے، حال ہی میں بین الاقوامی سطح پر دنیا کی زبانوں کا جو جائزہ لیا گیا ہے اور اُن کی سروے کی گئی ہے اُس کے نتیجہ میں اُردو کو دنیا کی تیسری زبان قرار دیا گیا ہے ۔ اُردو زبان میں ہر خیال و فکر اور تصور و عقیدہ اور علم و فن کے اظہار اور ترجمانی کی پوری صلاحیت اور کامل استعداد پائی جاتی ہے ۔

اُردو زبان کی دلکشی، جاذبیت، ہمہ گیری اور مقبولِ خاص و عام بلکہ بین الاقوامی زبان ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اُردو میں انگریز دانشوروں نے شاعری کی ہے اور غزلیں کہی ہیں ۔ متحدہ ہندوستان میں تقریباً تین سو سال سے مغربی قوموں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ فرانسیسی ہوں، پرتگالی ہوں یا انگریز، اُن سب نے اُردو زبان کو متحدہ ہندوستان کی لنگوا فرینکا سمجھا ہے ! چنانچہ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے قائم ہوا ۔ متحدہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان کو یہ حیثیت اور اہمیت نہیں دی گئی ، ملکہ وکٹوریہ قیصرہ ہند نے ہندوستان کی تمام زبانوں میں صرف اُردو کو انگلستان کے دانشوروں کے مشورہ سے پڑھنے اور سیکھنے کے قابل سمجھا ، چنانچہ آگرہ کے ایک مسلمان اتالیق کی خدمات اس مقصد کے لئے حاصل کی گئیں اور بکنگھم پیلس میں ملکہ وکٹوریہ نے اُردو داں اتالیق کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کیا ——— اب سے ایک سو چالیس سال قبل فرانس کے روزنامہ نے لکھا کہ ہندوستانی (یعنی اُردو) ہندوستان کی لنگوا فرینکا ہے ۔

مغربی دانشوروں کو اُردو سے یہ تعلق اور شغف صرف اس وجہ سے تھا ——— وہ اس کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں جو زبان ہر خطہ میں سمجھی جاتی ہے وہ اُردو اور صرف اُردو ہے، لہٰذا ہندوستان کی اس مشترک زبان ہی کو اُنہوں نے تجارت و سیاست اور حکومت کے مقاصد کے لئے ذریعہ اظہار سمجھا اور درمیانی واسطہ بنایا ۔

جو حضرات دوسرے ممالک میں گئے ہیں، زبانوں کے بارے میں اُن کے اپنے تجربے ہوں گے ، راقم الحروف نے ۱۹۳۲ء میں عراق کا سفر کیا اور وہاں ایک اُردو داں کی حیثیت سے اپنے کو اجنبی نہیں پایا ، حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا خانوادہ جو بغداد شریف کا سب سے زیادہ معزز گھرانا ہے، اُس خانوادہ نقبا میں اُردو سیکھنے کے لئے اُردو داں اتالیق ملازم رکھے جاتے تھے ، اور اُن کو "لالہ" کے لقب سے پکارتے تھے، پھر ۱۹۵۲ء میں زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کی اور مکہ مکرمہ ، مدینہ منورہ ، جدہ ، رابغ اور مسجد وغیرہ شہروں میں اُردو زبان کو مانوس زبان پایا ۔

حکومت حیدرآباد دکن، جس کی آبادی، شرقِ اردن ، شام اور عراق ۔ ان تینوں ملکوں کی آبادی کے برابر تھی اور ریاست کا اپنا سکہ

اپنا محکمہ ڈاک اور ریل تھا! اس حکومت میں سرکاری زبان اُردو تھی اور ابتدائی مدرسوں سے لے کر یونیورسٹی تک ذریعہ تعلیم اُردو تھا شاہی فرمان جن کو حکومت کا دستور اساسی اور مرکز تنظیم کہا جا سکتا ہے اُردو زبان میں لکھے جاتے تھے! یہاں تک کہ ہائی کورٹ (عدالت عالیہ) کے فیصلوں کی زبان اُردو تھی! سر شیخ عبدالقادر مسٹر اور دانٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو جیسے بلند پایہ ماہرین قانون نے اس کا اعتراف کیا تھا کہ حیدرآباد ہائی کورٹ کے ججوں کے فیصلے، لاہور اور الہ آباد ہائی کورٹ کے ججوں کے فیصلوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔

حکومت حیدرآباد دکن کے چند عہدوں اور اداروں کے نام :-

پرائم منسٹر — صدر اعظم — منسٹر — مدار المہام — سکریٹری — معتمد — جوائنٹ سکریٹری — شریک معتمد ڈائرکٹر — ناظم — اکاؤنٹنٹ جنرل — صدر محاسب — سپرنٹنڈنٹ — مہتمم — انسپکٹر — امین — یونیورسٹی — جامعہ — کالج — کلیہ — رجسٹرار — مہتمم — کوآپریٹو سوسائٹی — امداد باہمی — سنٹرل گورنمنٹ — باب حکومت — کلرک — اہل کار — اسسٹنٹ — صیغہ دار — آفس سپرنٹنڈنٹ — منتظم —

انگریزی زبان کے ان عہدوں کے اُردو ناموں میں کس قدر سادگی، سلاست اور موزونیت پائی جاتی ہے۔ تمام ناموں کا تجزیہ و تقابل کیا جائے تو مضمون خاصہ طویل ہو جائے گا۔ صرف ایک عہدہ سکریٹری کی جانب قارئین کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس انگریزی عہدے (SECRETARY) کے مقابلے میں "معتمد" زیادہ جامع لفظ ہے۔

حکومت حیدرآباد دکن کے علاوہ بہاولپور، خیرپور، رامپور، مالیرکوٹلہ، بھوپال وغیرہ مسلمان ریاستوں کی زبان اُردو تھی، متحدہ ہندوستان کی کشمیر اسٹیٹ کو بھی اس کا فخر بلکہ سعادت حاصل تھی کہ وہاں دفتروں میں اُردو کا چلن تھا۔ ریاست جے پور کے علاوہ بعض ہندو ریاستوں کی سرکاری زبان اُردو ہی تھی، مگر بعد میں چل کر مہاسبھائی اثرات کے تحت اُردو کو ہندی سے بدل دیا گیا لیکن اس جبری انقلاب کے باوجود عدالتوں اور دفتروں پر اُردو چھائی رہی! تعزیرات ہند کا ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد نے اُردو ہی میں کیا! یو۔ پی کے اضلاع کی عدالتوں اور پولیس کے تھانوں میں، اُردو ہی کا رواج تھا ———— وکیل، مختار، مدعی، مدعا علیہ، دعویٰ، جواب دعویٰ، اظہار بیان، جرح، حاکم پرگنہ، تحصیل، تحصیلدار، نائب تحصیلدار منصرم، امین، پیشکار، واصلباقی نویس، اہلمد، محرر، خزانچی، آبپاشی، آبیانہ، مالگزاری، ہرجانہ، تمسک، دستاویز، بیع، راہن، رہن، مرتہن، وراثت . . . . . . اس قسم کی بے شمار اصطلاحیں عدالتوں میں رائج تھیں ———— محتاط اندازے کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں کم از کم دس کروڑ آبادی عدالتی، دفتری اور سرکاری حیثیت سے اُردو زبان کا غلبہ تھا۔

متحدہ ہندوستان میں انگریزوں سے ۱۸۵۷ء میں جو جنگ آزادی لڑی گئی، اُس کی نشر و اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ اُردو زبان تھی پھر اُس کے تقریباً چالیس سال بعد مسز اینی بسنٹ کی تحریک ہوم رول کا آغاز ہوا، جس پر سب سے پہلے جس نے لبیک کہی وہ اُردو ہی کا شاعر تھا پنڈت برج نرائن چکبست فرماتے ہیں۔

طلب فضول ہے، کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اس کے بعد خدام کعبہ، خلافت، کانگریس اور مسلم لیگ کی تحریکوں کو متحدہ ہندوستان میں جو کامیابی اور نفوذ و اثر حاصل ہوا ہے، اُس کا سب سے بڑا ذریعہ اُردو زبان تھی، پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ متحدہ ہندوستان کو آزادی اُردو زبان کے طفیل ہی حاصل ہوئی ہے! سرحد کے لیڈر جن کی مادری زبان پشتو تھی، بنگال میں جا کر تقریریں اُردو میں کرتے تھے اور بنگال کے ہند

سرحد کے عوام سے اُردو زبان میں خطاب فرماتے تھے، یہی حال دوسرے صوبوں کے لیڈروں کا تھا۔ قائدِاعظم مسٹر محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی دونوں کی مادری زبان اُردو نہ تھی مگر ان رہنماؤں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ جہاں کہیں جائیں اُردو میں خطاب کریں کہ اُردو ہی متحدہ ہندوستان کی مشترکہ زبان تھی۔ گلگت سے لے کر رنگون تک اور چاٹگام سے رنگا پٹم تک اُردو ہی وہ زبان تھی جو ہر جگہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے ہر قومی رہنما اُردو کو ذریعہ اظہار بنانے پر مجبور تھا۔ اُردو کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ متحدہ ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی جی نے اُردو زبان میں بولنا ہی نہیں لکھنا بھی سیکھا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کو انہوں نے اُردو میں خط لکھے ہیں جن کے عکس رسالوں اور اخباروں میں چھپ چکے ہیں۔

اُردو زبان کا پاکستان اور ہندوستان کے باشندوں پر احسان ہے کہ اسی زبان نے انہیں آزادی دلائی ہے، وہ مسلمان ہو یا ہندو جو کوئی اُردو زبان سے بیر رکھتا ہے وہ احسان فراموش بلکہ نمک حرام ہے! تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اُردو کے ساتھ جو نامنصفانہ سلوک کیا گیا، وہ کسی ثبوت التشریح کا محتاج نہیں ہے، مگر بیس سال تک مسلسل اُردو کو نظر انداز کرنے کے بعد بھی بھارت میں جو اخبار چھپتے ہیں ان میں نشر و اشاعت کے لئے اُردو لٹریچر، ہندی لٹریچر سے بھی بازی لے گیا۔

اُردو سب کی زبان

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اُردو ادب کی ترقی میں مسلمانوں کے ساتھ متحدہ بھارت کے ہندوؤں اور سکھوں کا بھی حصہ رہا ہے، کتنے بلند پایہ غیر مسلم شاعر، افسانہ نویس، مترجم اور تنقید نگار ہیں جنہوں نے اُردو کو ثروت عطا کی ہے مگر متحدہ ہندوستان میں ایک ایسا دور بھی آیا کہ ودیا مندر اسکیم کے مقابلہ میں اُردو زبان کی مدافعت کے لئے گاندھی جی کی اقامت گاہ ——— واردھا ——— سے چالیس میل کے فاصلہ پر ناگپور میں مسلمانوں کو مورچہ لگانا پڑا تھا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق ناگپور کو جاگ پور کہا کرتے تھے کہ اس شہر میں اُردو زبان کو حملوں سے بچانے کے لئے بڑی بیداری پائی جاتی تھی، نواب صدیق علی خاں صاحب کو اسی تحریک کی رہنمائی کے جرم میں جیل جانا پڑا۔

متحدہ ہندوستان میں مہاسبھائی ذہنیت اُردو پر جو وار کرتی تھی اس کے توڑ کے لئے مولوی عبدالحق کی قیادت میں انجمن ترقی اُردو موجود تھی، انجمن کے مرکزی دفتر دہلی میں گاندھی جی کو دعوت دی گئی اور بابائے اُردو نے انہیں بتایا کہ اُردو کے ساتھ کیسی زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ کانگریس کی تحریک آزادی کی طرح مسلم لیگ کی تحریک پاکستان پر بھی اُردو زبان کا احسان ہے، مسلم لیگ کے رہنما بھی متحدہ ہندوستان کے ہر خطہ میں اُردو زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے! ۱۹۴۵ء میں جب ہندوستان کی مرکزی حکومت کانگریس کے قبضہ میں آئی تو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے محکمہ اطلاعات کا قلمدان وزارت سنبھالتے ہی اُردو زبان کو نشانہ بنایا اس پر مسلم لیگ نے شدید احتجاج کیا!

یہ بات سب کے نزدیک مسلّم تھی کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں اسلام نظام نافذ ہوگا اور اُردو زبان قومی اور سرکاری زبان قرار پائے گی چنانچہ قائداعظم نے مملکت پاکستان کے سربراہ کی حیثیت سے ڈھاکہ میں اس کا اعلان فرمایا کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی! قائداعظم کی زبان سے یہ اس حقیقت کا دوٹوک لفظوں میں اعلان تھا کہ پاکستان کی لنگوا فرینکا ہونے کی حیثیت اُردو زبان کو حاصل اور اسلام کے بعد پاکستان کے تمام خطوں اور صوبوں کے اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ اُردو زبان ہے۔

قائداعظم نہ تو یو۔پی اور بہار کے رہنے والے تھے، نہ آپ کی مادری زبان اُردو تھی مگر وہ کانگریس سے وابستگی اور اس کے بعد مسلم لیگ کی قیادت کا طویل تجربہ رکھتے تھے، جس نے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ متحدہ ہندوستان کی طرح پاکستان میں جو زبان سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے وہ صرف اُردو ہے اور انگریز کے رخصت ہو جانے کے بعد اسی مشترکہ زبان کو انگریزی کی جگہ ملنی چاہیے۔

——— مگر ———

افسوس کہ حکومتوں کی بے تدبیریوں اور جاہ و منصب اور حکومت و اقتدار کی معرکہ آرائیوں کے سبب پاکستان میں نہ تو اسلامی نظام ہی قائم ہو سکا اور نہ اُردو کو اُس کا جائز مقام مل سکا !

اُردو زبان پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ رومن رسم الخط کے مسئلے نے اُس کے لئے موت و حیات کی کشمکش پیدا کر دی، یہ خطرہ خدا خدا کر کے ٹلا تو پاکستان کی وحدت کو اس المیہ سے دوچار ہونا پڑا کہ پاکستان کے دستور میں ملک کی دو زبانیں تسلیم کر لی گئیں، اس پر بھی صبر کیا گیا، دستور مرتب اور منظور ہو جانے کے بعد اس کا یقین تھا کہ کم سے کم مغربی پاکستان کے سرکاری دفتروں، محکموں اور تعلیمی اداروں میں تو اُردو کا چلن ہو ہی جائے گا ـــــ مگر اس عالم انتظار کو ایک عجیب و غریب کشمکش سے دوچار ہونا پڑا، وہ یہ کہ پاکستان ریڈیو پر بیس سال سے جو اُردو بولی جا رہی تھی اُس کی مرمت شروع ہو گئی ۔

ع خواستم پیکاں برآرم از جگر نشتر شکست

اصول اور زبان، زبان کے سلسلہ میں دو اصولی باتیں ہمیں عرض کرنی ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ زبان خود رو سبزے کی طرح اُگتی اور نشو و نما پاتی ہے، کسی حکومت ادارے یا انجمن نے کسی زبان کو نہیں بنایا، ہاں! ہر زبان کے "ادب" کو افراد اور جماعتیں ترقی دیتی ہیں اور حکومتوں کی آزادانہ سرپرستی ہیں بھی ادب کو فروغ ہوتا ہے، زبانوں میں تراش خراش خود بخود ہوتی رہتی ہے، عوام کی پسند اور ناپسند پر رد و قبول کا انحصار ہے، زبان میں لفظوں کا رد و قبول کسی نظریہ یا سوچی ہوئی اسکیم کے تحت نہیں ہوا کرتا، ضرورت اور ذوق و وجدان کے تحت الفاظ زبانوں پر چڑھ کر روزمرہ میں شامل ہوتے رہتے ہیں ۔

اس کی زندہ مثال تقسیم ہند کے بعد کا انقلاب ہے، کروڑوں آدمیوں کا ادھر سے اُدھر تبادلہ ہوا، متحدہ ہندوستان کے کس کس خطہ اور صوبہ کے لوگ پاکستان میں آکر آباد ہو گئے ان مختلف اللسان لوگوں کے اجتماع اور میل جول کے باوجود بیس سال کی مدت گزرنے کے بعد بھی کوئی نئی زبان وجود میں نہ آسکی، اور نہ پاکستان کی مشترکہ زبان "اُردو" کو کسی تبدیلی سے دوچار ہونا پڑا، پاکستان بننے سے قبل جو زبان عوام و خواص میں رائج تھی، اُسی زبان کا آج بھی چلن ہے، صرف چند الفاظ مثلاً جھگی، رڈیرہ، الاٹمنٹ، پگڑی، وغیرہ اُردو میں شامل ہو گئے ہیں گیہوں کے معنی میں "کنک" بھی ممکن ہے آگے چل کر، اُردو زبان میں شامل ہو جائے، اُردو میں یہ الفاظ کسی فرد کی کوشش یا کسی اکیڈمی کے منصوبہ کے تحت شامل نہیں ہوئے بلکہ یہ الفاظ عوام کی زبان پر خود بخود چڑھتے چلے گئے، یہاں تک غیر زبانوں کے لفظوں ـــــ گودام اور بالٹی اور انگریزی لالٹین، بٹن اور سائیکل کی طرح اُردو زبان میں جذب ہو گئے۔ وہ جو مشہور ضرب المثل ہے ـــــ ہر چیز کہ در کان نمک رفت نمک شد ـــــ اُردو زبان کا بھی یہی حال ہے، غیر زبانوں کے جو الفاظ کسی کوشش کے بغیر آپ ہی آپ اُردو بولنے والوں کی زبانوں پر چڑھ گئے ہیں، وہ خالص "اُردو" بن کر رہ گئے ہیں! اُردو زبان کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس نے دوسری زبانوں کے لفظوں کے معنی تک تبدیل کر دیئے ہیں مثلاً عربی میں حجام پچھنے لگانے والے کو کہتے ہیں مگر اُردو میں عربی کے حلاق (بال بنانے والا) کی جگہ "حجام" بولا جاتا ہے انگریزی میں "ریل" (RAIL) کے معنی پٹری کے ہیں مگر اُردو میں "ٹرین" کو ریل کہتے ہیں اور ریل ٹرین سے زیادہ فصیح اور سلیس ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے ریل اور ریل گاڑی دونوں لفظ اپنی نظموں میں استعمال کئے ہیں۔

ع وہ دیکھو آ گرے سے آتی ہے ریل گاڑی

اور

ع ریل ہوں برق ہوں چھلاوا ہوں
بلکہ میں ریل کا بھی باوا ہوں

اس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ ہر زبان کے بولنے والے غیر زبانوں کے جن الفاظ کو خود بخود قبول کر لیتے ہیں وہ اُس زبان میں شامل ہو جاتے ہیں، مثلاً انگریزی زبان میں اُردو لفظ "پکّا" داخل ہو گیا، انگریز پختہ سڑک کو "PAKKA ROAD" کہا کرتے تھے، اور یہ لفظ انہیں اس لئے اختیار کرنا پڑا کہ انگلستان میں ہر روڈ پکی ہی ہوتی تھی، کچی سڑکیں وہاں سرے سے ناپید تھیں! چپراسی، دفعہ دار، جمعدار، تحصیلدار اس قسم کے الفاظ بھی انگریز بولنے لگے! ایسا نہیں ہوا کرتا کہ معاشرتی یا سیاسی مقصد کے تحت کسی زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ ٹھونس دیئے جاتے، یا کسی خطہ کی دل دہی اور تالیفِ قلب کے لئے اُس خطہ کی زبان کے الفاظ کسی دوسری زبان پر مسلط کرنے کی تدبیریں اختیار کی جاتیں! کسی زبان پر اس قسم کا جبر اُس بے چاری زبان کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دے گا —— اور نہ مختلف اللسان عوام و خواص میں اس قسم کا کبھی کوئی سمجھوتہ ہوا ہے کہ لاؤ ہم تمہاری زبان کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کر لیں، تم ہماری زبان کے الفاظ اپنی زبان میں شامل کر لو! اس قسم کا لین دین زبانوں کے درمیان نہیں ہوا کرتا۔

اب سے تقریباً چالیس سال قبل یورپ میں ایک ایسی ہی آسان، عوامی اور بین الاقوامی زبان بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسپرنٹو اس زبان کا نام رکھا گیا۔ لاکھوں پونڈ اس زبان کی نشر و اشاعت پر صرف کئے گئے، بنیادی اور ابتدائی کتابچے (BASIC - READRS) لکھے گئے مگر چونکہ یہ مصنوعی اور غیر فطری زبان تھی، اس لئے ایک دن بھی نہ چل سکی۔ یورپ کے بعض ضرورت سے زیادہ عقلمندوں کی یہ جدت نامدا جس نے وقت توانائی اور دولت کو ضائع کیا، آنے والے مصلحین اور دانشوروں کے لئے درسِ عبرت بن جانی چاہئے کہ زبانیں حکومتوں کی کوششوں سے نہ آسان بنائی جا سکتی ہیں۔ اور مختلف زبانوں کے الفاظ میں رد و بدل کر کے نہ کوئی ملی جلی زبان وجود میں آ سکتی ہے۔

پاکستان ریڈیو کے ذریعہ اُردو زبان کو آسان اور زیادہ عام فہم بنانے کی جس جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے وہ جدوجہد اُردو زبان کے حسن و دلکشی کو اور سلاست و روانی کو غارت کر دے گی، ملک کے دو صوبوں یا تمام خطوں کے درمیان اس قسم کی بگڑی ہوئی زبان کے ذریعہ اتحاد و میل ملاپ کی کوشش مصنوعی کوشش ہوگی، اس طرح الجھنیں دور ہونے کی بجائے اور بڑھیں گی اور ایک زبردست ذہنی خلفشار اور دماغی اضطراب پیدا ہو جائے گا!

دوسری اصولی بات یہ ہے کہ اُردو زبان مختلف فطری مراحل گزرنے کے بعد جس مقام پر پہنچ چکی ہے وہ معیاری زبان ہے، ایسی زبان جس کو عوام و خواص سب سمجھتے ہیں اور اہلِ قلم اور اہلِ دانش زبانداں کا بھی یہی زبان ذریعہ اظہار اور وسیلہ ابلاغ ہے۔ معیاری زبان کو آسان بنانے کی کوشش غیر اصولی کوشش ہے جس کی نہ تحسین کی جا سکتی ہے اور نہ تائید! یہی زبان اُردو پریس اور ریڈیو کی زبان ہے! بیس سال کی مدت تھوڑی نہیں ہوتی، اس مدت میں ایک بچہ جوان ہو کر صاحب اولاد ہو جاتا ہے، اتنی مدت تک ریڈیو پر جو زبان نشر کی جاتی رہی ہے، اور جس سے سب مانوس ہو چکے ہیں، اُس کو آسان بنانے کا داعیہ آخر کس لئے پیدا ہوا؟ بیٹھے بٹھائے ملک میں ایک نیا نزاعی مسئلہ کھڑا کر دیا گیا۔ آج تک کسی اخبار اور رسالہ میں، عوامی جلسہ اور عام نشستوں میں یہ بات پڑھنے اور سننے میں نہیں آئی کہ ریڈیو سے جو اُردو زبان نشر کی جاتی ہے وہ مشکل زبان ہے عام فہم نہیں ہے، اُسے آسان بنایا جائے! یہ بلاوجہ کی چھیڑ آخر کیوں؟

مشرق و مغرب ایسے الفاظ نہیں ہیں جسے مشرقی پاکستان کے باشندے نہ سمجھتے ہوں، اس خطہ کی غالب اکثریت قرآن کریم میں —— "رب المشرقین والمغربین" کی تلاوت کرتی ہے اس لئے ان لفظوں سے وہ پوری طرح مانوس ہے! اُردو میں پورب سے "پوربو" نہیں "پوربی" بنتا ہے، اس طرح کی تبدیلیوں سے تو اُردو گرامر مسخ ہو کر رہ جائے گی! "مشرق وسطیٰ" کا ترجمہ کیا کیجئے گا —— شاید "پوربو بیچ"! علامہ اقبال کی کتاب "پیام مشرق" کو کیا اب سے "پوربو سندیسہ" کہا کریں! صدر کو تو "پریذیڈنٹ" سے بدل دیا مگر اس خبر کو کہ پاکستان کے محترم صدر نے جلسہ کی صدارت کی! کیا ان لفظوں میں نشر کیا جائے گا کہ "محترم پریذیڈنٹ نے جلسہ کو پریزائیڈ کیا"

اُردو میں فارسی اور عربی الفاظ شیر و شکر کی طرح گھل مل گئے ہیں، اُردو کے ساتھ اُن کا تعلق گوشت اور ناخن جیسا ہے، اور ناخنوں کو گوشت سے جدا کرنے کا کارنامہ کوئی بے دردی انجام دے سکتا ہے۔ ایک بچہ جب پانچ چھ سال کی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھتا ہے تو اُس کی تعلیم کی ابتدا جس کتاب سے ہوتی ہے اُسے "قاعدہ" کہا جاتا ہے، جو عربی لفظ ہے۔ پھر حرف، لفظ، معنیٰ، دائرہ، شوشہ، سطر، قلم تختی، سیاہی، روشنائی، زیر، زبر، پیش یہ تمام الفاظ عربی اور فارسی ہیں۔ اُردو شاعری کی تمام اصناف و اقسام، عروض اور صنعتیں عربی ہیں، غزل، مطلع، مقطع، قصیدہ، رباعی، مسدس، مستزاد، مثنوی، بیت، قطعہ اور اسی قسم کی دوسری اصطلاحوں کا بدل پاکستان کی کس علاقائی زبان سے لیا جائے گا، مثنوی اور رباعی کو کن آسان لفظوں سے بدلئے گا! فلسفہ، منطق، علم کلام، تصوف، طب وغیرہ علوم کی اکثر و بیشتر اصطلاحات عربی ہیں! ایک مریض طبیب کو "ناڑی" نہیں نبض دکھاتا ہے، طبیب نبض دیکھ کر "نسخہ" لکھتا ہے جس کا سرنامہ "ھوالشافی" ہوتا ہے! نسخہ کی پہلی دوا "گل بنفشہ" ہے! گل بنفشہ کا ترجمہ کیا "ٹیسو کے پھول" کیا جائے گا! معجون، خمیرہ، شربت، جوشاندہ، جوارش اور کشتہ کا بدل کیا ہو گا؟

اُردو زبان کا خاص مزاج ہے جو کسی دوسری زبان کو نصیب نہیں، ہمارا طبیب، ڈاکٹر کی طرح مریض سے یہ نہیں کہتا کہ اپنا "URINE" کل لیتے آنا وہ اس لفظ کی بجائے "قارورہ" بولتا ہے۔ چراغ بجھانے اور دسترخوان اٹھانے کے لئے "اردو" میں بڑھانا استعمال ہوتا ہے۔ ان لفظوں سے "خوش فالی" وابستہ ہے! حمل و زچگی کی ترجمانی پردے کے الفاظ سے کی جاتی ہے، مثلاً یوں ــــ اُس کی بیوی اُمید سے ہے، فلاں شخص کے یہاں خوشی ہونے والی ہے! جن لوگوں کو پیشہ کی بنا پر ذلیل اور کمین سمجھا جاتا ہے اُردو نے اُن کو احترام کے لقب عطا کئے ہیں، جُلاہے کو نوربافــ، سقہ کو بہشتی، حجام کو خلیفہ، بھنگی کو مہتر، جمعدار اور حلال خور کہتے ہیں!

اس سلسلہ کو طول دیا جائے تو یہ مضمون ایک دفتر بن سکتا ہے، صرف ایک لفظ "میاں" کو لیجئے یہ کتنا پہلو دار ہے ــــ "اللہ میاں" ــــ "بڑے میاں" ــــ ننھے میاں ــــ ہمارے میاں (والد) ــــ وہ اُس عورت کا میاں (شوہر) ہے ــــ میاں صاحبزادے! "میاں" پیر کو بھی کہتے ہیں اور "میاں جی" معلّم کو!

اردو زبان سچ مچ کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان ہے، اس زبان میں کتنی شیرینی، سلاست، سادگی، روانی، اور نغمگی ہے! اس کو عجم کا حسن طبیعت بھی میسر ہے اور عرب کا سوز دروں بھی! یہ قلعہ معلیٰ سے لے کر جھونپڑیوں تک کے تمدن و تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے، بھاشا کے میٹھے ہلکے پھلکے بولوں نے بھی اُردو زبان کو نازک اور کومل بنایا ہے! ہمارے بچپن میں نیچی ذات کی ہندو عورتیں پردیس میں اپنے مردوں کو خط لکھوایا کرتی تھیں، دیس میں کوئی بیمار ہے، پردیس سے کسی کو بلانا مقصود ہے تو وہ کہتیں کہ ــــ

"میاں! ہمارے بیٹے گردھاری کو لکھ دو کہ تمہاری ماں بہت دکھالی (بیمار) ہے جلدی آؤ، روٹی وہاں کھاؤ، تو پانی یہاں پیو"

"روٹی وہاں کھاؤ، پانی یہاں پیو" میں جو لطف ہے اور تاکید و عجلت کا پہلو پنہاں ہے وہ انگریزی کے "لفظ" "INSTANTANEOUS" میں کہاں پایا جاتا ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ چھپّر، پوپ، آم تا اور دکھ اُسی بولی کے الفاظ ہیں، مشکل کی جگہ کٹھن، حسن و جمال کی بجائے رنگ روپ، معاشرے کی جگہ سماج، زلزلہ کی بجائے بھونچال۔ افاقتہ الموت کی جگہ سنبھالا، اور نبض کی جگہ کپٹ بھی بول سکتے ہیں اور بولتے ہی ہیں! جو ہوا مشرق کی سمت سے چلتی ہے اُسے مشرقی ہوا نہیں "پروائی" کہا جاتا ہے، جیسے شکرہ آبادی فرماتے ہیں ــــ

ٹھنڈی آہیں بھی گئیں گیسووں والوں کے ساتھ
نہ وہ پروائی کے جھونکے، نہ وہ برسات کی رات

[...]ہ تر لکھنے والوں اور بولنے والوں کے ذوق و وجدان اور اُن کے حُسنِ انتخاب پر موقوف ہے کہ وہ لکھنے اور بولنے میں کن لفظوں کا [انت]خاب کرتے ہیں ۔

" معاشرے کی تعمیر و اصلاح کے لئے ہم سب کو متحد ہو کر کام کرنا ہے "

اور

" سماج کو سدھارنے کے لئے ہم سب کو مل جل کر کام کرنا ہے "

[...] دونوں جملے اُردو ہی کے ہیں !

— مگر —

[...]گڑے کی بات اور بنائے نزاع و اختلاف یہ ہے کہ مشرق کو " پوربو " مغربی کو " پچھمی " اور صدر کو " پریزیڈنٹ " کہنا لازمی قرار دے دیا جائے [اس ق]سم کی پابندی اُردو زبان پر ناروا پابندی ہے ۔ عربی اور فارسی لفظوں سے یہ گریز کیوں ؟ اس پابندی کے ساتھ اور اس داعیہ کے ساتھ کہ اُردو [زبا]ن کو آسان بنانا ہے کسی اہلِ قلم کو ایک صفحہ لکھنا بھی مشکل ہو جائے گا اور اس کی تمام ادبی صلاحیتیں سکڑ کر اور بھینچ کر رہ جائیں گی ، اس پابندی [کے ب]عد قلم کو شدید کشمکش سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ سوچ سوچ کر انتخاب کی بجائے چناؤ ، صحافت کی جگہ " جرنلزم " تخریب کی جگہ بگاڑ ، بارشش [کی] بجائے مینہ ، خیمہ اور ڈیرے کی بجائے ٹینٹ ، قرارداد کی جگہ ریزولیوشن ، اور معائنہ کی بجائے انسپکشن لکھنا کتنا دشوار ہو گا اس طرح تحریر [م]یں آمد کی بجائے آورد پیدا ہو جائے گی ——— انگریزی الفاظ کی جگہ جو اُردو الفاظ عام ہو چکے ہیں ، انہیں دیس نکالا کیوں دیا جا رہا ہے ؟

عربی زبان سے ہمارا لسانی رشتہ ہی نہیں معاشرتی اور دینی رابطہ بھی ہے ، اس رشتہ اور رابطہ کو کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر ذرا سی [ب]ھی گزند پہونچی تو یہ بہت بڑے خسارے کا سودا ہو گا ۔

اُردو زبان دینی علوم کا خزانہ ہے ، پاکستان کی کسی علاقائی اور صوبائی زبان میں دینی علوم کی مقدار ، اُردو زبان کے مقابلہ میں عشرِ عشیر [ب]ھی نہیں ہے ! اس خصوصیت کے پیشِ نظر بھی ، اردو زبان پاکستان کی حکومت اور یہاں کے خواص و عوام کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور [عم]لی دلچسپی کی مستحق ہے ۔ اس زبان کو زیادہ سے زیادہ عام اور ہر شعبۂ حیات میں ہونے کی ضرورت ہے تاکہ دین سے ہمارا رشتہ قوی سے [قو]ی تر ہے اور اس رشتہ میں کسی قسم کی فرقت ، خلا ، کمزوری اور کھنڈت پیدا نہ ہونے پائے ۔

اُردو زبان کے رسم الخط اور عربی و فارسی الفاظ کی کثرت کے سبب ایران و کابل اور عرب ممالک سے ہمارا رشتہ قائم ہے اور ایک [ا]ردو داں پاکستانی ان ملکوں میں اپنے کو اجنبی محسوس نہیں کرتا ۔ ان ملکوں کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ سے خاصی مطلب برآری ہو جاتی ہے ۔

اُردو زبان میں ردوبدل کا مسئلہ لسانی مسئلہ ہے مگر کہا جاتا ہے کہ اس تبدیلی کا تعلق معاشرت سے ہے اور مشرقی پاکستان [او]ر مغربی پاکستان میں ربط قائم رکھنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی ہے ۔

پاکستان کے دونوں حصوں کو جو چیز اب تک ملائے ہوئے ہے اور آئندہ بھی جس کے سبب ان شاء اللہ ربط و اتحاد قائم رہے گا ۔ وہ " اسلام " ہے ! اسلام ہی وہ قدر ہے جو پاکستان کے مشرق اور مغرب میں مشترک ہے اس قدر کی نہ صرف یہ کہ حفاظت کی جانی چاہئے بلکہ اس [ک]و زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے ! پاکستان کا معاشرہ اسلام کی اخلاقی قدروں پر استوار ہو گا تو صوبائی اور علاقائی عصبیتیں اپنی [مو]ت آپ مر جائیں گی ۔ اور جو لوگ مرکز کو کمزور کر کے ، صوبوں کی مستقل خود مختاری چاہتے ہیں ، جس کا نتیجہ علیحدگی کے علاوہ اور کچھ ہو نہیں سکتا ۔ [ا]ن کے عزائم کو وحدتِ اسلامی ہی شکست دے سکتی ہے ۔

اسلام کے بعد جو چیز مشرقی اور مغربی پاکستان کو جوڑ سکتی ہے وہ اُردو زبان ہے ، اُردو کے خلاف وہاں نفرت و بیزاری کی فضا

کمیونسٹوں اور ہندوؤں نے پیدا کی ہے، تدبیر سے کام لیا جائے تو اس کا توڑ ممکن ہے! مشرقی پاکستان میں ہزاروں علماء دیوبند، سہارنپور، دہلی، بدایوں، کانپور، پھلواری اور لکھنؤ کے پڑھے ہوئے آج بھی موجود ہیں، ان علماء کے شاگردوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے، یہ سب کے سب اُردو سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ نماز کے بعد اُردو میں دعائیں مانگتے ہیں، روزے اور نماز کے نظام الاوقات وہاں اُردو میں چھپتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے عوام کو عربی الفاظ سے نفرت ہوتی تو اُن کے نام ــــ نور الامین ــ مجیب الرحمٰن ــــ عبد المنعم ــ مسیح الدین ــــ فرید احمد ــــ غلام اعظم ــــ فضل الحق ــــ ناظم الدین اور خیر الدین نہ ہوتے! آج بھی اس مکدر فضا کے باوجود مشرقی پاکستان کے علماء اور لیڈر صاحبان مغربی پاکستان میں جلسوں اور اجتماعوں سے خطاب اُردو زبان میں کرتے ہیں، اور مغربی پاکستان کے علماء اور رہنما مشرقی پاکستان کے جلسوں میں بنگلہ نہیں اُردو بولتے ہیں کہ یہ زبان وہاں سمجھی جاتی ہے۔ یہی سامنے کی بات اس کی دلیل ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کی لنگوا فرینکا صرف اُردو زبان ہے۔

ضرورت اس کی تھی کہ پیار محبت، صلح و آشتی اور شرافت و نرمی کے ساتھ مشرقی پاکستان کو اُردو سے مانوس بنایا جاتا اور وہاں کے علماء دین، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ طبقہ اور کلکتہ اور اس کے اطراف کے بنگالی نما مسلمانوں کی تائید و معاونت حاصل کی جاتی، ان روشن امکانات کو نظر انداز کر کے اُردو زبان کی اصلاح اور مرمت کا آغاز کر دیا گیا ہے ــ یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے!

سوچیے!

بنگلہ ہو، پنجابی ہو، گجراتی، سندھی، پشتو یا بلوچی اور سرائیکی ہو یہ سب زبانیں باقی رہنی چاہئیں اور باقی رہیں گی، ہمیں نہ کسی خطّے سے کد ہے اور نہ کسی زبان سے بیزاری ہے! ہم اس واقعہ اور حقیقت کی طرف اربابِ فکر اور اہلِ دانش کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ تقسیم ہند سے قبل متحدہ ہندوستان میں انجمن ترقی اُردو کے علاوہ کسی دوسری زبان کی کوئی ایسی مرکزی انجمن نہ تھی جس کو تمام مسلمانوں کی تائید و معاونت حاصل ہو، ہر خطّے کے رہنے والے اور دوسری زبانیں بولنے والے مسلمان صرف اُردو کو مرکزی اور مشترک زبان سمجھتے تھے، بنگال کے مولوی فضل الحق مرحوم اور پنجاب کے میاں بشیر احمد اس انجمن کے انتظامی ارکان میں شامل تھے، اُس دور میں کسی نے اس کا مطالبہ نہیں کیا کہ انجمن ترقی اُردو کے ساتھ بنگلہ اور پنجابی کی بھی ایک مرکزی انجمن دلّی، کلکتہ، یا لاہور میں قائم کی جائے! اُس وقت اُردو تمام مسلمانوں کی محبوب زبان تھی، اپنی زبانوں کے مقابلہ میں سب مسلمان اُردو زبان کی برتری اور اس کے مشترک زبان ہونے کے قائل تھے اُردو کا نقصان وہ اپنا نقصان اور اُردو کی ترقی وہ اپنی ترقی سمجھتے تھے! متحدہ ہندوستان کے کسی مقام پر بھی اُردو زبان کے مشاعرہ کے مقابلہ میں کسی دوسری زبان کا مشاعرہ مسلمانوں نے منعقد نہیں کیا، ہاں! ہندوؤں نے "کوی سمیلن" شروع کر دئے تھے، مگر مشاعروں کے آگے "کوی سمیلنوں" کا چراغ نہ جل سکا۔

تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے تمام صوبوں میں ایسی درسگاہیں موجود تھیں جہاں اُردو پڑھائی جاتی تھی مگر اس زمانہ میں نہ یہ کہ دوسری زبانیں بولنے والے مسلمانوں بلکہ ہندوؤں تک نے اس کا مطالبہ نہیں کیا کہ لکھنؤ میں بنگلہ کا اسکول قائم ہونا چاہیے، دلّی میں پنجابی پڑھائی جانی چاہیے، آگرے میں پشتو، الٰہ آباد میں سندھی، پٹنہ میں بلوچی اور بنارس میں گجراتی کو اُس کا مقام اور حصہ ملنا چاہیے! اور جب ہم اپنی زبانوں کے ساتھ اُردو بھی بولتے ہیں تو اُردو بولنے والوں کو ہماری زبانیں بھی بولنی چاہئیں ــــ اُردو کے مقابلہ میں اس قسم کے تصورات ذہن و فکر میں سرے سے موجود ہی نہ تھے،

اُردو کے خلاف آج پاکستان میں جہاں سے بھی آواز اُٹھ رہی ہے اور اُردو سے بیزاری پائی جاتی ہے، سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں صوبائی عصبیت اپنا کام کر رہی ہے، اس فتنہ کی روک تھام حکومت ہی کر سکتی ہے، اُس کے قبضہ میں ریڈیو ہے، پولیس ہے اور دوسرے ذرائع اور وسائل ہیں! مگر یہ کام اُسی وقت ہو سکتا ہے، جب حکومت پوری طرح مطمئن ہو جائے کہ اُردو زبان پاکستان کی لنگوا فرینکا ہے

صرف یہی وہ زبان ہے جو ملک کے تمام خطوں میں سمجھی جاتی ہے اور اس کے ذریعہ ملک کی وحدت اور سالمیت کو طاقت اور استحکام میسر
سکتا ہے! اس اطمینان اور اعتراف کے بعد حکومت اردو زبان کی ترویج و توسیع کے لئے سب کچھ کر سکتی ہے! حکومت جب اپنی طاقت
سے ایسی اسکیموں کو چلا سکتی ہے، جن کو عوام کی تائید و رضامندی حاصل نہیں ہوتی۔ تو حکومت کے لئے اردو زبان کا نفاذ و رواج کیا مشکل
ہے جب کہ اس کے لاکھوں شیدائی اور کروڑوں اردو سمجھنے والے پاکستان میں موجود ہیں۔
جو حکومت فیملی پلاننگ جیسی عجیب و نامانوس اسکیم کو مقبول بنانے کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کر سکتی ہے وہ اردو جیسی بین الاقوامی
عظیم دلپسند زبان کے لئے کیا کچھ نہیں کر سکتی! جس کا سرکاری طور پہ نفاذ، چلن اور رواج ملک کی سالمیت اور وحدت کو بہت
کچھ تقویت پہنچا سکتا ہے۔
مگر ——— سہ اُن کا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

ریڈیو اور اخبارات

ملک کے اخبارات جو لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور کروڑوں آدمی انہیں پڑھتے ہیں، اُن کی زبان عوام کی
زبان سمجھی جاتی ہے، ہم نے کراچی ہی نہیں دوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی مزدوروں، قلیوں، ٹھیلے والوں
اور مزدوروں کو اردو اخبارات پڑھتے دیکھا ہے، کوئی احمق ہی ہوگا جو اخبار خرید کر پڑھتا ہو اور اُسے سمجھتا نہ ہو! ——— تو جو عوام
اردو اخبارات کو پڑھ سکتے ہیں وہ ریڈیو کی اردو زبان کو بھی سمجھ سکتے ہیں، اب رہے بے لکھے پڑھے لوگ، تو حکومت کو چاہیے کہ وہ اُن
کو خواندہ بنائے، یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ ریڈیو کی زبان کی سطح کو اُن کی جہالت کی سطح کے قریب کر دیا جائے۔ عدالت کے فیصلے ناخواندہ
لوگوں کی سمجھ میں کہاں آتے ہیں ——— مگر ایسے بے لکھے پڑھے لوگوں کی خاطر عدالتوں کی زبان کو آسان نہیں بنایا جاتا۔ جہاں علم و
خواندگی ہے وہاں ناخواندہ لوگوں کو کسی نہ کسی حد تک دشواری ضرور پیش آتی ہے، ان کی جہالت کی خاطر علم و خواندگی اور زبان و ادب
کی سطح کو تو پست نہیں کیا جا سکتا!

اخبارات اور ریڈیو کی زبان ایک ہی جیسی ہونی چاہیے۔ پاکستان ریڈیو کی خوا د پر اردو زبان کی جو مرمت کی جا رہی ہے وہ زبان،
اخبارات کی زبان سے مختلف ہوتی تو یہ "دوعملی" کتنی عجیب ہوگی، جس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہ مل سکے گی! پاکستان ریڈیو
کہے گا "پوربو پاکستان" اور اخبارات میں لکھا جائے گا "مشرقی پاکستان"! اور اگر حکومت نے اخبارات پر پابندی لگا دی کہ ریڈیو سے
جو اردو نشر کی جاتی ہے وہی زبان اخبارات میں بھی استعمال ہونی چاہیے، تو اس "جبر" کے لئے لغت میں نئی اصطلاح وضع کرنی ہوگی:
معاملہ چند لفظوں کی تبدیلی کا نہیں ہے، موثق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اسی قسم کے کم و بیش تین ہزار الفاظ
نیا ہی ——— اس کے بعد سوچئے کہ اردو کیا بن کر رہ جائے گی!

؟

ہمیں کسی بھی علاقائی اور صوبائی زبان سے کد نہیں ہے، ہر زبان کو پھلنا پھولنا چاہیے ——— مگر اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے
جب اردو زبان کے جائز حق پر دست درازی کی جاتی ہے اور اس کی ترقی اور مسلمہ حیثیت کو پست بنایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک ذمہ دار دی
نے بیان کیا کہ راولپنڈی کے ٹیلی ویژن پر دس منٹ بنگلہ زبان کو اور تین منٹ اردو زبان کو دئے جاتے ہیں۔ ڈھاکہ کے ایک بڑے محلہ (محمد پورہ)
میں جہاں کم و بیش پچاس ہزار اردو بولنے والے رہتے ہیں وہاں اردو کا ایک اسکول قائم نہیں ہونے دیا جاتا، پاکستان کا مرکز جو اپنی قوت بالا
دستی اور برتری کا دعویدار ہے، اس مسئلہ میں مداخلت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ——— مشرقی پاکستان میں کمیونسٹ اور ہندوؤں کی سازشوں
سے اردو کے خلاف جو افسوسناک صورت حال پیدا ہو چکی ہے اُسے غذا دینے کی ضرورت ہے یا اُس کی روک تھام کرنی چاہیے!
اسکولوں کے نصاب کی اردو ریڈریں جو اب چھپ کر آ رہی ہیں، اُن کے صفحات پر اردو کی بجائے انگریزی ہندسے لکھے گئے ہیں! آخر یہ

کیا ہو رہا ہے، اور کیوں ہو رہا ہے! اُردو پر یہ "نوازش بے جا" کیوں؟

اسلام اور اُردو، پاکستان میں "اجنبی" بن کر رہ گئے، تو ملک کی وحدت کو شدید قسم کے افتراق اور طرح طرح کی عصبیت سے دوچار ہونا پڑے گا اور پاکستان کی سالمیت میں رخنے پیدا ہو جائیں گے! اللہ تعالیٰ پاکستان کو ہر طرح کے خطرے اور تخریب د ز سے محفوظ رکھے! (آمین) اور ہم سب مل جل کر اور مضبوط دیوار بن کر رہیں، جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کے لئے سہارا ہوتی ہے۔

ماہر القادری
۲۰ اگست ۶۷ء

محمد ایوب قادری (ایم اے)

خواجہ محمد معصومؒ اور اورنگ زیب عالمگیر کے تعلقات پر ایک نظر

خواجہ محمد معصوم، حضرت مجدد الف ثانی کے تیسرے صاحبزادے تھے، وہ ۱۱ شوال ۱۰۰۷ھ کو بمقام بستی متصل سرہند پیدا ہوئے تحصیل علم اپنے بڑے بھائی خواجہ محمد صادق، والد ماجد حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ محمد طاہر لاہوری سے کی سولہ سال کی عمر میں علوم معقول و منقول سے فراغ حاصل کرلیا، تین ماہ میں حفظ قرآن فرمایا اور اپنے والد ماجد حضرت مجدد الف ثانی کے وصال ۱۰۳۴ھ کے بعد مسند ارشاد پر متمکن ہوئے ان کی جانشینی کے فرائض انجام دینے لگے۔ رشد و ہدایت اور درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، تفسیر بیضاوی، مشکوٰۃ شریف، ہدایہ، عضدی اور تلویح طلبا کو پڑھایا کرتے تھے ان کا سلسلہ بیعت و ارشاد بہت وسیع تھا، مغلیہ دور کے بڑے بڑے امراء اور ذی حیثیت اشخاص ان کے سلسلۂ ارادت میں منسلک تھے۔ بہتر سال کی عمر میں ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ کو خواجہ محمد معصوم کا انتقال ہوا مشہور شاعر ناصر علی سرہندی نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے۔

چراغ خاندانِ نقشبنداں فروغ دینِ احمد خواجہ معصومؒ
بسوئے گلشن عقبیٰ قدم زد ازیں ویرانہ آباد کہن بوم
ز دل پرسیدم از سال وفاتش ندا آمد ز عالم رفت معصوم
۱۰۷۹ھ

خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات تین جلدوں میں ہیں اور یہ خطوط علوم و معارف کا گنجینہ ہیں ان میں عقائد کلام، عبادات و معاملات مقام احسان و تقویٰ، تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال سے متعلق ارشادات و تفصیلات ملتی ہیں۔ مکتوبات معصومیہ کی پہلی جلد ان کے صاحبزادے خواجہ عبید اللہ سرہندی نے جمع کی ہے اور یہ کتاب مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوئی ہے دوسری جلد "وسیلۃ السعادۃ" کے نام سے موسوم ہے اس کے مرتب میر شرف حسین بن میر عماد الدین ہروی ہیں۔ یہ جلد خواجہ معصوم کے صاحبزادے خواجہ سیف الدین کی فرمائش و تحریک پر مرتب ہوئی ہے یہ کتاب لدھیانہ پریس میں طبع ہوئی ہے تیسری جلد خواجہ محمد معصوم بخاری کی ترتیب دی ہوئی ہے یہ جلد امرتسر سے شائع ہوئی ہے۔

خواجہ محمد معصوم کے یہ خطوط جن لوگوں کے نام ہیں ان میں اکثر بڑی بڑی شخصیتیں ہیں ان میں عالمگیری دور کے نامور امراء

اور پردہ نشین خواتین بھی ہیں۔ یہ امراء، حکام اور اعلیٰ منصب دار جن کے نام خطوط ہیں ان کے متعلق اگرچہ صراحت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سب امراء و حکام خواجہ محمد معصومؒ کے حلقۂ ارادت میں منسلک تھے، مگر ان میں سے بعض تو یقیناً مرید تھے۔ ان ہی میں سے کئی خط شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے نام بھی ہیں۔ جن سے عالمگیر اور خواجہ محمد معصوم کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض تذکروں میں تو صراحت سے اورنگ زیب کا مرید ہونا لکھا ہے خزینۃ الاصفیاء (جلد اول ص ۴۰۶) میں مندرج ہے:

> محمد دارا شکوہ خلف شاہجہاں بادشاہ مرید حضرت ملا شاہ قادری بود و عالمگیر اورنگ زیب مرید حضرت معصوم سرہندی، فیما بین ہر دو برادران تنازع و عداوت واقع ازیں سبب دارا شکوہ را با عزیزان سرہند ہم کدورتے و نقاضے بود،

اگرچہ نقشبندی سلسلہ کے تذکروں میں بڑی تفصیل ملتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ مشائخ نقشبندیہ سے اورنگ زیب عالمگیر کو تعلق خاطر ضرور تھا۔ خواجہ محمد معصوم کے مکاتیب میں ایک مکتوب اورنگ زیب عالمگیر کے نام ہے یہ ایک طویل مکتوب ہے اس سے جانبین کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے اس مکتوب میں خواجہ معصوم نے جہاد کی فضیلت، ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے اور بادشاہ کو خاص طور سے ترغیب دی ہے ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں[1]

> "یہ حدیث دلیل ہے اس امر کی کہ اللہ تعالیٰ حاکم کے اعمال نامے میں ان اعمال حسنہ کے مثل لکھتے ہیں جو اس علاقہ میں لوگ امن کے ساتھ اس کی حمایت و حفاظت میں انجام دے رہے ہیں یہ فضل عظیم کس قدر عالی شان ہے۔ افسوس! کہ یہ درماندۂ کار (خواجہ معصوم) اس نعمت خوشگوار سے بہ حسن ظاہر محروم ہے اور بعض عوائق و موانع کی وجہ سے اس قسم کی "فی سبیل اللہی" جدوجہد سے مہجور ہے ۔۔۔ یا لیتنی کنت معہم فافوز فوزاً عظیما (کاش میں ان کے ساتھ ہوتا اور بڑی کامیابی پر فائز ہوتا) لیکن از روئے باطن اپنے ساتھ ہی جانتا اور دعا و توجہ کی راہ سے ممد و معاون تصور کرتا ہے۔ ہم فقراء کا سرمایہ بازار الملک یہی دعا اور توجہ ہے۔ اگر گوشہ نشین فقراء سالہا سال ریاضت کریں اور چلے کھینچیں اس عمل کو نہیں پہونچ سکتے (جو آپ کر رہے ہیں) وہ طاعات و عبادات جو "جدوجہد دینی" کے راستہ میں ہوتی ہیں، طاعات عزلت پر ان کا درجہ کہیں زیادہ ہے"

خواجہ محمد معصوم ایک دوسرے مکتوب میں اورنگ زیب عالمگیر کو لکھتے ہیں[2]

> "کمترین دعاگویان نیازمند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نعمت امن و امان رونق اسلام اور قوت شعائر اسلام کے ظہور پر شکر و ثنا کرتا ہوں آپ کے لئے درازی عمر شوکت و ظفر اور نصرت کی دعاء اپنے زاویۂ نامرادی اور گوشہ شکستگی میں درویشوں کے ساتھ کرتا رہتا ہے چونکہ یہ دعا خلوص دل سے ہے اور پس پشت ہے اس لئے اُمید ہے آفرین قبولیت ہوگی"

خواجہ محمد معصومؒ ایک دوسرے مکتوب میں اورنگ زیب عالمگیر کو لکھتے ہیں[3]

[1] مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی مرتبہ مولانا نسیم احمد امروہی ص ۱۸۵ - ۱۸۶ (دہلی ۱۹۶۰ء) [2] یہ الفاظ خاص طور سے غور طلب ہیں اس سے ارادت و عقیدت کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے [3] مکتوبات خواجہ محمد معصوم ص ۲۰۰

"آنجناب کی "جمعیت باطن" "اخلاص" "امر جلیل القدر" کے "تقید" کے بارے میں لکھا تھا (اس کو پڑھ کر) شکر خداوندی بجا لایا کہ باوجود ان "اشغال صوریہ" کے آپ کے دل حقیقت بین کو مطلوب حقیقی کے ساتھ ایک خاص تعلق اور مقصود تحقیقی کے ساتھ ایک مخصوص شوق ہے۔ امید کہ یہ تعلق روز بروز زیادہ ہوگا اور آتش شوق قوت پذیر ہوگی۔ حق کو ذکر سے مذکور، دال سے مدلول اور لفظ سے معنی تک معاملہ پہونچ جائے گا۔

خواجہ محمد معصومؒ ایک اور خط میں بادشاہ عالمگیر کو مخاطب فرماتے ہیں:—

"آپ نے دعا و توجہ غائبانہ کی طلب اس "شکستہ" سے کی ہے ہر چند پہلے بھی اکثر دعا کرتا تھا اور توجہ میں مشغول رہتا تھا لیکن اس وقت جبکہ اس قسم کی مہربانیاں اور خصوصیات درمیان میں آگئی ہیں "جمع ہمت" کے ساتھ سلسلہ علیہ نقشبند کے طریق معہود پر ترقی باطن ازدیاد کیفیت استقامت نیز نصرت ظاہر کے لئے دعا کرتا ہوں اور کسی طرح کوتاہی پر راضی نہیں ہوں — آپ نے "بار گران جہانداری" اور حسن خاتمہ کے متعلق بھی اظہار کیا تھا — چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے آپ کو اس بارہ میں خوف عنایت فرمایا ہے اس لئے بہت کچھ (اچھی) امیدیں ہیں۔ یہ خوف کارہائے مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔

خواجہ محمد معصومؒ کے صاحبزادے سیف الدین (۱۰۹۶ھ) جو کہ گوشہ نشین تھے عالمگیر کی تربیت کے لئے اس کے پاس گئے اس خط میں مذکور ہے [1]

"فقیر زادہ (سیف الدین) جو کہ صاحب کمالات صوری و معنوی ہے عزلت اور عدم اختلاط کی عادت رکھتا تھا چند آدمیوں میں بھی بیٹھنے کی اس کو عادت نہ تھی لیکن محض خیر خواہی نے اس کو اس بات پہ آمادہ کیا ہے کہ آپ کے پاس گیا) مربی حقیقی اللہ تعالیٰ ہے وہ خود درد و طلب دیتا ہے اور اپنی طلب میں دوڑاتا ہے"

اور صاحبزادہ سیف الدین کی صحبت کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ خواجہ معصوم لکھتے ہیں [2]

"الحمد للہ والمنۃ کہ فقیر زادہ (شیخ سیف الدین سرہندی) "منظور نظر قبول" ہو گیا ہے اور اس کی صحبت موثر ثابت ہوتی ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو کہ فقیر زادے کا شیوہ ہے، اس پر آپ نے اظہار شکر و رضامندی کیا ہے اس عطیے (اظہار شکر) پر شکر خداوندی بجا لایا"

ان مکاتیب کے طرز نگارش اور انداز بیان سے عالمگیر اور محمد معصوم کے تعلقات ارادت کا اندازہ ہوتا ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے بہت سے امراء و حکام کو بھی محمد معصومؒ نے خطوط لکھے ہیں ان میں شمشیر خاں، میر غضنفر (ف رمضان ۱۰۹۱ھ) محمد باقر فتح آبادی، (ف ۱۰۹۲ھ) محمد عاشور بخاری، میر محمد خافی، تربیت خاں (ف ۱۰۵۳ھ) معین الدین، شیخ عبد اللطیف، لشکر خاں، اسلام خاں (ف ۱۰۷۴ھ) مرزا ابو المعالی (ف ۱۰۷۴ھ) سید محمد بیگ بلخی (ف ۱۰۷۳ھ) اور میر محمد یعقوب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ میر کے معین الدین (ف ۱۰۹۵ھ) کو ایک مکتوب میں خواجہ معصوم لکھتے ہیں [3]

"نجات کو اتباع سنت و اجتناب از بدعت میں یقین کرو — اہل بدعت اور ملا حدہ سے تعلق

[1] مکتوبات خواجہ معصوم ص ۲۸۳ [2] ایضاً [3] مکتوبات خواجہ محمد معصوم ص ۵۱

صحبت نہ رکھنا، اس لیے کہ یہ لوگ دین کے چور ہیں جو فقیر شرعی وضع پر نہیں اور سنت نبوی سے آراستہ نہیں، اس کو اپنی مجلس میں راہ نہ دینا"

محمد عاشور بخاری کو لکھتے ہیں[۱]

"کتب شرعیہ اور احادیث نبویہ علی وجہ الکمال، تہذیب[*] اخلاق کی ضامن ہیں بمقتضائے شریعت غرا عمل کرو اور سنن مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تمام امور میں پیشوا قرار دو۔ نجات اخروی اور درجات قرب الٰہی کا وصول اسی سے وابستہ ہے ..... "امر معروف[*] اور نہی منکر[*] کو اچھی طرح انجام دو"

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے، خواجہ محمد معصوم شریعت کی پابندی کے سلسلہ میں برابر امرا کو لکھتے رہتے تھے طوالت کے خوف سے مزید اقتباسات نہیں دیے گئے۔

خواجہ محمد معصوم کے منجھلے صاحبزادے حجۃ اللہ محمد نقشبند ثانی بھی بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے پاس رہے[۲] اور بادشاہ کو رشد و ہدایت فرماتی خواجہ محمد نقشبند ۱۰۳۴ھ میں سرہند میں پیدا ہوئے حفظ قرآن کے بعد اپنے چچا خواجہ محمد سعید سے علوم متداولہ کی تحصیل کی اور پھر اپنے والد خواجہ محمد معصوم سے علوم باطنی کی تکمیل فرمائی، خواجہ نقشبند ثانی کا ۹ محرم ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں انتقال ہوا ان کے خطوط دو جلدوں میں طبع ہوئے ہیں ان خطوط کا تاریخی نام وسیلۃ القبول الی اللہ والرسول (۱۱۱۵ھ) ہے اس میں نو خط اورنگ زیب عالمگیر کے نام ہیں اور متعدد خطوط امرار و عمائد سلطنت قاضی شیخ الاسلام، بادشاہ زادی شائستہ خاں، عاقل خاں سیف خاں، بختاور خاں، مکرم خاں، مصطفےٰ خاں اور مرزا میرک گرز بردار وغیرہ کے نام ہیں۔

ان خطوط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ بزرگانِ دین وقت کے حاکموں اور امیروں کی دینی تربیت کا کتنا خیال رکھتے تھے اور اس دور کے فرمانروا اور ارباب جاہ و دولت بھی ہدایت و نصیحت کی باتوں کو خوش دلی کے ساتھ سنتے تھے۔

[۱] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ ص ۱۵۵ [۲] وسیلۃ القبول الی اللہ والرسول (مکتوبات محمد نقشبند ثانی) حصہ اول (مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں) ص ۳۹، (حیدرآباد ۱۹۶۳ء)

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انلجین
سردرد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

علامہ معین الدین اجمیریؒ

علامہ اقبال کی مصلحانہ شاعری

(حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ خیرآبادی سلسلہ علم وفضل کے خاتم تھے۔ رأس العلماء حضرت مولانا برکات احمد ٹونکی قدس سرہٗ کے قابلِ فخر تلمیذ رشید! معقولات کے امام اور تفسیر و فقہ و حدیث کے متبحر عالم! آن کی ذات معقولات و منقولات کا سنگم تھی! جس موضوع پر قلم اٹھایا اور تقریر کی، اُس کا حق ادا کر دیا۔ انگریزی دور میں حق گوئی کے جرم میں کئی بار جیل بھی گئے! ساری عمر فقر و فاقہ میں گزاری اور بوریئے پر بیٹھ کر علم و فضل کے جواہر لٹاتے رہے۔

مولانا نجم الحسن رضوی نے خیرآباد ضلع سیتاپور سے حضرت مولانا موصوف کا یہ شہ پارہ جو اُن کے پاس حسنِ اتفاق سے محفوظ تھا، ہمارے کرم فرما جناب حکیم نصیر الدین ندوی، (فاضل طب والادب مالک نظامی دواخانہ کراچی) کے پاس بھیجا اور حکیم صاحب نے راقم الحروف کی درخواست پر "فاران" کے لئے عنایت فرمایا ——— (م۔ ق)

اس میں شک نہیں کہ جناب اقبال کی شخصیت متعدد صفات کی حامل تھی۔ لیکن دنیا میں جس چیز نے ان کو نمایاں کیا ہے وہ ان ری ہے۔ اسی وجہ سے فقیر نے وہ مضمون اختیار کیا ہے جو ان کی شاعری کے متعلق ہے۔ اس عہد میں جناب اقبال ہندوستان کے شعراء سے ہوتے ہیں ان کا کمال شاعری زیادہ تر اس زبان میں ظاہر ہوا ہے جو اب ہندوستان میں مردہ ہو چکی ہے یا حالت نزع یعنی فارسی زبان باوصف اس کے ان کی عام مقبولیت اس کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ نہایت قادر الکلام شاعر تھے کہ ناآشنایان زبان سے بھی انہوں نے خراج تحسین حاصل کر لیا۔ ان کا کلام اردو بھی اعلیٰ پیمانہ پر ہے اور اس میں بھی جو اُن کے اشعار یا بعض غزلیں ہیں ہندوستان میں ہمت و جوش کی ایک لہر پیدا کر دی ہے اور وہ بے حد مقبول و مشہور ہوئی ہیں نہ صرف یہ کہ وہ لوگوں کی زبان بلکہ فونوگراف کے ریکارڈ تک پر انہوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

کلام میں جوش فردوسی و فیضی و عرفی کا خاصہ تسلیم کیا جاتا ہے اس کے ساتھ اختصار ہو تو کیا کہنے ہیں۔ اختصار سے یہاں مقصد یہ کہ ایک وسیع مضمون کو مختصر الفاظ میں ادا کر دینا اس طرح پر کہ مضمون میں کوئی اغلاق پیدا نہ ہو، پیرایہ مختصر اور مضمون خوب دلنشین تے باوصف اس کے جوش و سلاست کلام باقی رہے۔ مولانا نظامی گنجوی فخریہ خوب کہتے ہیں اور اس میں وہ مستثنیٰ ہیں۔ لیکن فردوسی فخریہ سب پہ بھاری ہے۔ شاہنامہ کی مدح میں کہتا ہے جو کامل تیس سال میں تصنیف کی ہے ؎

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی

پورا دفتر لکھا جاتا لیکن یہ مضمون فخریہ اس ایک شعر میں ادا ہوگیا ہے۔ شاید دفتر طویل سے ادا ہو سکے۔ فیضی کا بھی ایک فخریہ ملاحظہ ہو اس میں جوش کے ساتھ کس قدر روانی و سلاست ہے ؎

آں روز کہ فیض عام کردند | مارا ملک الکلام کردند
از بہر عروج فکرت من | آرائش ہفت بام کردند
مارا بہ تمام در ربودند | تا کار سخن تمام کردند

وہ سرزمین اندلس جس پر کئی صدی تک خاندان بنی امیہ حکمران رہا ہے پہلے محض ایک غیر آباد ملک تھا۔ بنی امیہ کا جب قدم وہاں پہونچا ہے اور ان کا اس پر تسلط ہوا ہے تو وہی خاک نشین گلزار بن گئی اور جہاں عام جھونپڑے بھی کم نظر آتے تھے وہاں صدہا بلکہ ہزارہا سر بفلک عمارتیں نظر آنے لگیں۔ جامع قرطبہ جو دنیا کی ممتاز عمارتوں میں سے ایک عمارت تھی اس کا بانی یہی خاندان تھا۔ دوسرے ان کے ان مسلمان بادشاہوں نے جو انصاف و رواداری اور رعایتیں کی تھیں اور علمی دنیا کو چار چاند لگا دیے تھے اس کی شاہد مخالفین تک کی ہوئی تاریخ کے اوراق ہیں۔

پھر جس طرح نہایت شاندار کامیابیوں کے ساتھ وہاں مسلمانوں کو عروج ہوا ہے اور ان کے اقبال و جاہ و جلال سے دنیا پر لرزہ گیا ہے اسی طرح ان کا تنزل ہوا ہے اور وہ وقت زمانہ نے دکھایا کہ اب اس ملک میں مسلمان اگر ملیں بھی تو شاید نیچی قوم میں اور نہایت حال میں۔ تاریخ اس حسرت بھری داستان سے لبریز ہے اور اس پر دفتر کے دفتر لکھے گئے ہیں جن سے مسلمانوں کی رواداری اور انصاف پسندی پر روشنی پڑتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اقبال کے اس ایک شعر نے ذوق صحیح کے نزدیک جو حسرت و رقت کا نقشہ کھینچا ہے وہ اس طویل دفتر نہ کھینچ سکا ؎

اے گلستان اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو | تھا تیری ڈالیوں پر جب آشیاں ہمارا

شعراء کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں بعض غزل بہت اعلیٰ پیمانہ پر کہتے ہیں قصیدہ جو شوکت الفاظ چاہتا ہے وہ اس پیمانہ پر نہیں ہوتا جس پیمانہ پر ان کی غزل ہوتی ہے۔ قصیدہ میں جو مشہور اور ماہر شعراء ہوتے ہیں ان کی غزلیں عموماً پھیکی ہوتی ہیں۔ اسی طرح بعض شعر مضمون بزم و جنگ کا خوب نقشہ کھینچتے ہیں لیکن مضمون بزم و صلح کے ادا کرنے میں صفر محض ہوتے ہیں جس طرح طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اسی طرح ان کے جذبات میں قدرتی طور پر اختلاف ہوتا ہے۔ شاعر اسی جذبہ کو خوب ادا کر سکتا ہے جو اس کی طبیعت کے مناسب ہو یہی وجہ ہے کہ فردوسی کی مثنوی یوسف زلیخا اس پایہ کی نہیں ہے جس پایہ کا شاہنامہ ہے بلکہ اس کا درجہ مولانا جامی کی یوسف زلیخا سے بھی بہت پست ہے۔ کہ عشق و محبت کا مضمون لطیف اور کہاں کا رزار و شجاعت کا پر شوکت مضمون۔ اس اختلاف طبائع کا نتیجہ ہے کہ شیخ ابراہیم ذوق کا قصیدہ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا ہے جس کی بدولت ان کو خاقانی ہند کا خطاب ملا اور حکیم مومن خاں غزل گوئی میں اپنے عہد کے شعراء میں ممتاز تھے۔ حسرت و اندوہ جیسے مضامین میں و نیز مضمون شوخی میں مرزا غالب اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

اس عہد میں اقبال کا میلان خفتہ قوائے عملی کے بیدار اور برانگیختہ کرنے کی طرف تھا کچھ تقاضائے طبیعت کے ساتھ زمانہ کا تقاضا بھی یہی تھا۔ کہ ہندوستانیوں کو آزادی کا سبق دیا جائے جن کے قوائے عملی ایک عرصہ دراز سے غلام رہتے رہتے بالکل مردہ ہو چکے ہیں غلامی کی زندگی نے غیرت و حمیت کا احساس ان سے زائل کر دیا ہے پورا ملک و قوم اس مغالطہ میں ہے کہ آزادی کے لئے دوڑ دھوپ مذہبی بات نہیں ہے بلکہ یہ سیاسیات میں سے ہے جو سیاسیات میں حصہ لیتا ہے اس کو مذہبی نہیں سمجھتے۔ مذہبی انسان ان کے نزدیک صرف وہ ہے جو کسی سے سروکار نہ رکھے اور آرام سے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر کچھ عبادت بھی کر لیا کرے اس سے اس کو بحث نہ ہو کہ ملک و قوم کس مصیبت

البتہ اس مصیبت کو زائل کرنے کی فکر ہو۔ تمام ملک و قوم پر غلامی کی وجہ سے تنزل و ادبار کی گھٹائیں چھائیں اس کی بلا سے
نے ملک و قوم کے حق میں صدائے احتجاج بلند کی تو ہر چہار طرف سے غل ہونے لگا کہ یہ سیاسی آدمی ہے۔ خالص مذہبی نہیں۔ خالص
ہے جو اسلام کے ساتھ اپنی خیر مناتا رہے۔ دوسروں کے بالکل کام نہ آئے حالانکہ مذہب اسلام سب کی امداد کے لئے دنیا میں آیا ہے۔ اپنے
دنیا میں اس نے امن و امان قائم کیا ہے۔ تمام مخلوق پر رحم کرنا اس نے سکھایا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ
من فی الارض یرحمکم من فی السماء (ترجمہ) جو زمین پر بسنے والا ہے اس پر رحم کرو حق تعالیٰ جو آسمان پر ہے (جس کی شان
مناسب بلندی ہے) وہ تم پر رحم کرے گا۔ اس سے بڑھ کر رحم کی کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔ دشمنوں کے حملوں کی مدافعت کے لئے اور
حاصل کرنے کے لئے جو حرکت و اقدام ہو اس کو بہترین عبادت قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ حق تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے
سے کام لو ان کو برباد نہ کرو۔ البتہ اپنے محل میں ان کا استعمال ہونا چاہئے یہ نیکی نہیں ہے کہ قوت غضب بالکل زائل کر دو۔
خودداری کی حفاظت میں دشمن کے مقابلہ میں صرف کرو۔ اسی طرح قوت شہوت ضائع مت کرو کہ یہ نسل انسانی کی افزائش کا باعث ہے
محل میں کہ جو منکوحہ ہے اس کا استعمال کرو۔ ان قوتوں کو نیکی کی خاطر ضائع کر دینا دین فطرت نہیں ہے بلکہ مذہب رہبانیت ہے۔
اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے غرض اسلام کا کام تو اسے تملیہ کو برانگیختہ کرنا تھا۔ اب مذہب اس کا نام ہو گیا ہے کہ آزادی کا یا ہمدردی کا
بھی کوئی اقدام و حرکت کرے۔ اقدام و حرکت کرنا سیاست ہے اور سیاست بدترین فعل ہے جمود و دنائت کا نام قناعت اور کسر نفسی
۔ خودداری و عزت نفس کو تکبر کہنے لگے ہیں۔ حالانکہ ان کی حقیقتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے گو بظاہر کسی جگہ یکساں نظر
بس آرام طلب حضرات کو یہ موقع مل گیا اور دین فطرت کو چھوڑ کر کہ جو اسلام ہے اور جس کی نسبت ارشاد ہے کہ یہی دین فطرت
مذہب رہبانیت اختیار کر لیا اور ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کہ یہی خالص مذہب اسلام ہے۔ اس طرح تمام ملک کے قوائے
فنا طاری ہو گئی اور خودی کو تکبر سمجھ کر غلامی و بے عزتی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا۔ توکل کا نام لے کر تمام جد و جہد کا (جو حصول
میں ہو سکتی تھی) خاتمہ کر دیا حالانکہ جد و جہد تمام معاملات میں خواہ آزادی کی راہ میں ہو یا معیشت کے حصول میں توکل کے منافی نہیں
جناب مولانا روم کا مشہور قول ہے کہ ؎

گر توکل میکنی در کار کن
کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

نے اپنے عہد میں جب عام جمود اور دنائت کا احساس کیا تو اس کے زائل کرنے کے لئے انہوں نے علم جہاد بلند کیا اور خودی و عزت نفس
اور اپنے لطیف پر مغز اشعار کے ذریعہ سب کو آگاہ کرنے کا تہیہ کیا اور انسانی قوتوں کو (جو مردہ اور خفتہ ہو گئی تھیں) بیدار کرنے
انتھک کوشش کی اور اس عام غلط فہمی کو دور کیا کہ اپنی قوتوں کو فنا کر دینا عین مذہب ہے انہوں نے مختلف پیرایوں میں اپنی قادر الکلامی
پیرایہ بیانی سے ثابت کر دیا کہ انسان تمام قوتوں کا جامع ہے اس سے اگر کام لے تو انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ انسان اپنی قوتوں کے اسرار
سمجھتا ورنہ اس قدر ناکارہ ہو کر کبھی غلامی و درماندگی کا طوق اپنی گردن میں نہ ڈالتا۔ اپنی ذات میں انسان نظر ڈالے تو اس کو
بڑی کائنات کا جلوہ نظر آئے گا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اپنے صاحبزادے حضرت زین العابدین کو وصیت شہادت کے وقت فرمائی ہے وہ اسی
اشارہ کرتی ہے فرماتے ہیں انت جرم صغیر وفیک عالم کبیر دنکی لک فیک یکفیک (ترجمہ) تمہارا جسم چھوٹا ہے لیکن
بڑا جہان تمہاری ذات میں (پنہاں) ہے (صرف) اسی میں غور و فکر کرنا تمہارے لئے کافی ہے۔ حقیقت میں یہ امام عالیمقام نے دریا کو
میں بند کر دیا ہے اور ایک جملہ میں وہ مضمون ادا کر دیا جو اپنی بے پایاں وسعت کے لحاظ سے ایک دفتر طویل میں بھی نہیں سما سکتا۔ جو وہ

فلسفہ ہے جس کی نشرواشاعت اقبال نے کی ہے کہ اپنے نفس پر اگر انسان غور کرے تو تمام کائنات کا جلوہ اس میں نظر آئے گا اسی بحر کو حضرت مولانا روم اور حکیم سنائی رحمتہ اللہ علیہ پہلے سمجھا گئے ہیں۔ اقبال کو اس کا اعتراف ہے کہ وہ اس بارے میں ان حضرات کے مقلد ہیں۔ مثنوی اسرار خودی میں کہتے ہیں ؎

پیر رومی خاک را اکسیر کرد　　از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
موجم و در بحر او منزل کنم　　تا در تابندۂ حاصل کنم

اقبال ان کو اکسیر اور دریا کہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اپنے کو غبار اور موج قرار دیتے ہیں۔ بہرحال اقبال کی اس مصلحانہ شاعری سے ملک میں عزت نفس اور حریت کا ایک ہیجان تو پیدا ہو گیا اور یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے اس میں شک نہیں کہ اقبال مصلحانہ شاعری کے لحاظ سے انہیں حضرات کا عکس اور پرتو ہیں۔ اسی ایک مضمون کو انہوں نے صدہا پیرایہ میں ادا کیا ہے اور ہر ایک کا اسلوب بیان دوسرے سے جدا ہے اس سے ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے اس مضمون کے متعلق اگر ان کے تمام یا اکثر اشعار پیش کئے جائیں تو یہ مختصر تحریر ایک ضخیم کتاب بن جائے اس لئے بطور نمونہ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

خود فرود آ از شتر مثل عمرؓ　　الحذر از منت غیر الحذر

یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اونٹ پر سوار تھے ان کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا تو اسے زمین پر سے اٹھانے کے لئے آپ اونٹ سے خود اترے اور اس معمولی کام کے لئے بھی کسی کا احسان گوارا نہ فرمایا۔ اس طرف اشارہ کر کے اقبال کہتے ہیں کہ غیر کے احسان سے خدا کی پناہ یہ ہے وہ غیرت و خودی جس کی اقبال تعلیم دیتے ہیں اور اسی مرض پستی و ذلت کا علاج بتا رہے ہیں جس میں قوم مبتلا ہے کہ اگر اس مرض سے نجات پانا ہے تو حضرت عمرؓ کی طرح باہمت اور غیرت دار ہو جاؤ اور کسی کا سہارا نہ طلب کرو اس کے بعد کہتے ہیں ؎

فطرتے کو بر فلک بندد نظر　　پست میگردد ز احسان دگر

یعنی جس کی فطرت اس قدر بلند ہے کہ آسمان پر اس کی نظر رہتی ہے یعنی پیدائشی وہ خوددار اور غیرت والا بلند ہمت ہے وہ بھی دوسرے کے احسان سے پست ہو جاتا ہے۔ اپنی بدحالی پر بھی اقبال فخر کرتے ہیں ؎

ذرہ ام مہر منیر آن من است　　صد سحر اندر گریبان من است

تو خاک کا ایک ذرہ ہوں لیکن خصلت وہ رکھتا ہوں جو آفتاب کی ہے (جب یہ ہے تو کیا پروا) ہیں تو وہ ہوں کہ سینکڑوں صبح کے نور و روشنی میرے گریبان میں ہیں اپنی آن بان کی وجہ سے کسی پر رشک نہیں ہے کوئی اچھا ہو گا تو اپنے لئے۔ میری ذات میں بھی اللہ تعالیٰ نے وہ خوبیاں رکھی ہیں جو دوسرے میں نہیں کہتے ہیں ؎ قلزم بایاں چو شبنم بے خروش　　شبنم من مثل یم طوفاں بدوش

استغنا و بے پروائی کو اس شعر میں اس کی حد تک پہونچا دیا ہے۔ یعنی بایں ہمہ کہ اگر دریا بھی ہے تو وہ شبنم کی طرح خاموش ہے اور میری شبنم بھی ایک طوفان برپا کر رہی ہے کس قدر بلند نظری اور بے نیازی ہے اس مضمون کو عرفی شیرازی نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

بے برگیٔ من داغ نہد بر دل ساماں　　بے مہریٔ من زرد کند روئے درم را

میری بے سامانی ایسی ہے کہ ساماں کو بھی اس پر رشک و حسد ہے اور اس وجہ سے اس کے دل پر داغ پڑ گیا ہے میری بے پروائی اور بے مہری کو دیکھ کر درم (حالانکہ تمام دنیا اس سے محبت کرتی ہے) اشرفی کا چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ دونوں کے پیرایہ میں جو فرق ہے اس کو ہم اہل ذوق پر چھوڑتے ہیں اس شعر کو لکھ کر تو اقبال نے قلم توڑ دیا ہے ؎

مشرق و مغرب آزاد ما نخچیر کرد　　خشت ما سرمایۂ تعمیر کرد

ملا واحدی

تأثرات

آپ نے کسی کے کان میں بھنگا گھسنے دیکھا ہے۔ ذرا سا کیڑا بہادر سے بہادر انسان کو تڑپا دیتا ہے۔ جب تک گرم تیل ڈال کر نکالا نہ جائے، چین نہیں آتا۔ اس تجربے کے بعد تعجب کی کیا بات ہے اگر اللہ تعالیٰ نے سرکش نمرود کو مچھر جیسا حقیر جانور ناک میں گھسا کر مارا تھا اور مغرور ابرہہ کو اور اُس کے لشکر کو اور اس کے ہاتھیوں کو ابابیلوں سے کنکریاں برسوا کر تہس نہس کر دیا تھا۔

بھنگے، مچھر، اور ابابیل تو پھر کوئی چیز ہیں اللہ چاہتا ہے تو اُن جراثیم کے ذریعہ انسان کی جان لے لیتا ہے جنہیں آپ معمولی خوردبینوں کی مدد سے نہیں دیکھ سکتے، اُنہیں دیکھنے کے لئے خاص خوردبینیں درکار ہوتی ہیں۔

خود بیماری کون سی کم اہم شے ہے۔ اللہ جس بیماری کو چاہے مہلک بنا دے۔ انسان میں ہر بیماری سے مقابلہ کرنے کی طاقت ہے اور ہر مخلوق سے ٹکرا جانے کا زور ہے لیکن چھوٹی سے چھوٹی بیماری اور ادنیٰ مخلوق انسان پر غلبہ بھی پا لیتی ہے۔ انسان جب بے آپے ہو جاتا ہے تو اُسے چھوٹی بیماری اور ادنیٰ مخلوق کے ہاتھوں ہی سے سزا ملتی ہے۔ مچھر ہر شخص کی ناک میں نہیں گھستے اور ابابیلیں بھی ہمیشہ کا شکار نہیں کرتیں "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں سے کیا کیا تھا۔ کیا اللہ نے اُن کے سب منصوبے خاک نہیں رکھ دیئے تھے۔ (اور کتنے محیر العقول طریقے سے اُنہیں ناکام کیا تھا) اُن پر غول در غول پرندے بھیجے جو اُنہیں کنکریاں پھینک پھینک کر مار تے تھے۔ اُنہوں نے (ہاتھیوں کو اور) ہاتھی والوں کو چبایا ہوا بھس بنا دیا تھا" (سورہ ۱۰۵ آیات ۱ تا ۵)

شاہ جہان کی دلّی سے تین چار میل باہر اور انگریزی دلّی کی حدود میں ایک طرف ہمایوں کا مقبرہ ہے اور دوسری طرف ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کا مقبرہ۔ درمیان میں سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمتہ اللہ کی درگاہ ہے۔

ہمایوں کا مقبرہ آگرے کے تاج محل کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا لیکن ہندوستان و پاکستان کی کسی دوسری عمارت سے کم نہیں ہے۔ منصور کا مقبرہ ہمایوں کے مقبرے کی نقل ہے۔ ہمایوں کے مقبرے میں قیمتی پتھر لگائے گئے ہیں۔ منصور کے مقبرے میں چونے گچ زیادہ ہے تاہم حسن اور شان کا وہ بھی نمونہ ہے۔

دونوں مقبروں کے گرد وسیع سبزہ زار ہیں جن میں کبھی پانی کی نہریں بہتی تھیں۔ مقبروں اور سبزہ زاروں کو ایسی چار دیواری سے محفوظ کیا گیا ہے کہ چار دیواری بھی سیرگاہ ہے۔ دونوں مقبرے دورِ مغلیہ کے آغاز، عروج اور ابتدائے زوال کی یادگار ہیں۔ لوگ بارہ مہینے ان میں سیر کرنے آتے ہیں اور برسات کے موسم کی تو یہ جان ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ آنے والا کوئی ہمایوں اور منصور کی قبروں پر فاتحہ نہیں پڑھتا، یا بس کوئی کوئی ہی پڑھتا ہے۔

منصور کا تفصیلی حال معلوم نہیں۔ ہمایوں کی بابت تاریخ میں ہے کہ مرنے کے بعد مدتوں اس کی قبر کے گرد سو (۱۰۰) حافظ بیٹھے قرآن خوانی کرتے رہے تھے۔ ہمایوں نیک بادشاہ تھا۔ مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے چلا۔ اذان کی آواز سن کر زینے میں رک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر گھبرا کر بڑھا اور پاؤں پھسلنے سے گرا اور مر گیا۔ ہمایوں کی اچھائیاں سنی ہیں۔ برائیاں نہیں سنیں عمر بھر جھٹکے کھاتا رہا۔ ابھی بادشاہ، ابھی قلاش۔ مدد دینے والے شیخ سے وعدہ کر لیا کہ ڈیڑھ دن کے لیے بادشاہت مجھ سے لے اس وعدے کو ایفا کیا۔ اس سے اور اس کے باپ سے قبل ہی تو ایسے بادشاہ ہندوستان میں تھے جن کے دلوں پر نقش تھا اور جن کی عمارتوں پر آج تک لکھا ہوا موجود ہے کہ الحکم للّٰہ۔ اس قسم کے بادشاہ کی روح اس جرم میں کہ بادشاہ تھا فاتحہ سے محروم ہے اور حضرت سلطان المشائخؒ کے ہاں ہر شخص اسی ارادے سے پہونچتا ہے کہ فاتحہ خوانی کروں گا۔ فاتحہ درگاہ سلطان المشائخ میں اور سیر مقبرہ ہمایوں اور مقبرہ منصور میں اسی کو خلقت نے دستور بنا لیا ہے۔

نہ جانے کن کن بادشاہوں نے درگاہ سلطان المشائخؒ کی حاضری کو سعادت جانا۔ عیسائی بادشاہ بھی ہندوستان آئے تو اس درگاہ میں سلام پیش کیے بغیر وطن واپس نہ گئے اور ہندو بادشاہ بھی اس درگاہ کے سامنے سر ہی جھکاتے ہیں۔

حضرت سلطان المشائخ کے زیر سایہ دفن ہونے والی شہزادی جہاں آرا بنت شاہجہاں کی قبر پر فاتحہ کے لیے بے اختیار ہاتھ اٹھ جاتے ہیں۔ وہی شہزادی جہاں آرا جس نے وصیت کی تھی کہ میری قبر پر یہ شعر لکھا جائے ـــ

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

حضرت سلطان المشائخ کو ہمایوں سے دوگنا زمانہ گزر گیا ہے اور منصور سے سہ گنا اس کے باوجود حضرت سلطان المشائخ کی قدر و منزلت باقی ہے اور نامی گرامی بادشاہوں کے نام و نشان مٹتے چلے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ مضمون بار بار دہرایا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو فرماتا ہے۔ ہو۔ اور وہ ہو جاتا" اس پر حکمائے منکرین معترض ہیں کہ "ہو" کا مخاطب کون ہے؟ معدوم یا موجود؟ اگر معدوم ہے تو معدوم سے خطاب کیا، اور موجود ہے تو موجود کو موجودگی کا حکم دینا بے معنی اور تحصیل حاصل ہے۔ مسلمانوں نے انہیں جواب دیا ہے کہ خطاب دو قسم کا ہوتا ہے، خطاب تکلیفی، دوسرا خطاب تکوینی۔ خطاب تکلیفی تو امر و نہی ہے اور خطاب تکوینی یہی "کُن" ہے۔

اشیا کی بھی دو قسمیں ہیں ایک با اثر اور دوسری بے اثر۔ با اثر جیسے آدمی، گھوڑا، مٹی، آگ، اور بے اثر ان کے سائے۔ ایک طرف آگ روشن ہے دوسری طرف آئینے میں اس کا عکس پڑ رہا ہے۔ بظاہر دونوں کی حالت مختلف نہیں ہوگی۔ وہی لپٹیں ادھر، وہی لپٹیں اور دھواں ادھر۔ لیکن ایک با اثر اور دوسری بالکل بے اثر اور بے کار۔ ایک سے کچھ پکاؤ تو پک جائے گا اور جلاؤ تو جل جائے گا۔ دوسری کسی مصرف کی نہیں۔ تو اشیا بہ شان بے اثری اللہ کے تصور میں ہیں اور خطاب ان سے کیا جاتا ہے کہ تصور سے تحقق میں آؤ۔

یہ حکمائے اسلام کے جواب تھے، یہ چند کلمے بطور شرح عرض کرتا ہوں۔ کسی نے جامع مسجد دہلی یا تاج محل آگرہ کو نہ دیکھا ہو آپ اسے ان کی عظمت کیونکر سمجھائیں گے۔ اس طرح کہ اس کی نگاہ میں جو عظیم الشان اور خوشنما عمارتیں ہیں۔ ان سے جامع مسجد اور تاج کو نسبت دیں گے۔ دستور تو یہ ہے کہ ادنیٰ کی تعریف اعلیٰ سے تشبیہ دے کر کی جاتی ہے۔ لیکن علم و شعور کرانے کی خاطر کبھی کبھی اعلیٰ

مانا پڑتا ہے۔ بالکل ایسی ہی صورت یہاں ہے۔ مثلاً فرشتہ نے حضرت مریم کو اللہ کی بشارت پہونچائی کہ تمہارے
ا ہے جس میں یہ یہ وصف پائے جائیں گے۔ حضرت مریم گھبرا کر بولیں۔ میرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ مجھے تو مرد نے ہاتھ بھی
اب ملا، اللہ ظاہری اسباب کے بغیر تخلیق پر قادر ہے۔ وہ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو فرماتا ہے "ہو" کام ہو جاتا ہے۔
نعوذ باللہ خدا کے تخت پر جا بیٹھیں اور خدائی کیا کریں تو آپ کو اس عمل کا ادراک ہو سکتا ہے ورنہ سمجھانے اور علم و
سطے آپ کی عقل کا خیال رکھ کر ہی اس کا بیان کیا جائے گا۔ ارے میاں! عمل تخلیق کو فرض کرو جامع مسجد، اور تم اہم
ہے سمجھانے والا تم جلد سے جلد کام کرنے کا انتہائی مبالغے کے ساتھ یوں ذکر کرتے ہو کہ صاحب اس نے اسے پلک
ڈالا، حالانکہ پلک جھپکانے میں کوئی الف نی کام ہوا نہیں کرتا اور پھر پلک جھپکانے میں بھی کچھ نہ کچھ وقت لگتا ہے۔
ال حصہ سہی، لیکن اللہ کو ایجاد و تخلیق میں اتنے کی بھی احتیاج نہیں ہے چنانچہ اسی کو وہ پلک جھپکانے سے زیادہ سرعت
تا ہے کہ میں نے کہا "ہو" اور وہ ہو گیا۔

لو فائے دیتے ہیں، کڑوے قارے پلاتے ہیں پھر ضعف دور کرنے کی فکر کی جاتی ہے۔ غرض درجہ بدرجہ احتیاط، دوا
نازل سے گزر کر مریض صحت و تندرستی کی جانب لوٹتا ہے تاہم علاج کے اختتام کا تصور کیجئے۔ اختتام کے وقت یک
علاج اور صحت میں فرق نہیں رہتا۔ علت اور معلول مل کر پکارتے ہیں۔

من تو شدم تو من شدی

ال پہلے کی بات ہے جب رسالہ مولوی کے ایڈیٹر عبد الحمید خاں زندہ تھے، اس وقت رسالہ مولوی نے کمیونسٹوں کے اعداد
تھے اور لکھا تھا کہ دنیا کی ننانوے فی صدی آبادی ابھی کمیونسٹ نہیں ہے لیکن آبادی کا ایک فی صد کمیونسٹ اس قدر متحرک
ننانوے فی صد پر چھایا چلا جاتا ہے۔ چین جو روس کے بعد سب سے بڑا کمیونسٹ مشہور ہے وہاں کمیونسٹ پارٹی کے ممبر صرف
گروہ اٹھانوے فی صد پر غالب ہیں۔ خود روس میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبر چار فی صد ہیں۔ لیکن کبھی تصور بھی نہیں ہوتا کہ
اشندہ غیر کمیونسٹ ہوگا۔ چار فیصد کا اتنا غلبہ ہے۔ جو ممالک روس سے متاثر ہیں اُن میں کمیونزم روس سے زیادہ کامیاب
یوسلاویہ، رومانیہ، مشرقی جرمنی وغیرہ۔ اور کمیونزم کو جتنی کامیابی مسلمان ملک انڈونیشیا میں ہوئی ہے اُتنی ایشیا بھر میں
میں نہیں ہوئی۔ مسلمان اُس قوم کا نام ہے جس کا قول اور موٹو کبھی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا تھا، لیکن اب یہ قوم نہ سمعنا کو جانتی
ہے نہ اطعنا کو۔ اس قوم کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ اور انتہا درجہ مفلوک الحال ہے اور عیسائی مشنریوں اور کمیونسٹوں کے واسطے
سے جیسے بہ آسانی نگلا جا سکتا ہے۔

رسرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "کسی بستی میں فرد واحد بھی اگر (معاشرے کی خرابی کی وجہ سے) بھوکا سوتا ہے
تا ہے تو ایسی بستی پر سے اللہ حفاظت کی ذمہ داری ہٹا لیتا ہے" مسلمانوں میں بھوکا سونے اور بھوکا اٹھنے والوں کی
مسلمانوں کی دینی نادانفیت عالم مسلمانوں کے افلاس سے بدتر ہے۔ دیہات کے بہت سے مسلمانوں کو اپنے رسول تک کا نام
پوچھو تو زمیندار یا پیر کا نام بتا دیں گے۔ اللہ ہی جانتا ہے افلاس میں مبتلا رکھنے والے امرا۔ اور جہل میں مبتلا رکھنے والے
ح کا کیا حشر ہوتا ہے۔ شہری مسلمانوں نے بھی بس کلمہ پڑھنا کافی سمجھ رکھا ہے اور نماز روزہ ادا کر دینا تو اُن کے نزدیک
بلیک مارکیٹ، ذخیرہ اندوزی، اسمگلنگ، سود، رشوت، سب چیزیں جائز ہو جاتی ہیں۔
سلمانوں کی تعداد دنیا میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں سے تقریباً بیس گنی زیادہ ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر دنیا میں کل

ساڑھے تین کروڑ ہیں اور مسلمان ستر کروڑ سے اوپر۔ لیکن ایک فی صد والے ذہنی اور اقتصادی دونوں انقلاب لانے کی فکر میں ہیں اور بیس فیصد والوں کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ وجہ ایک ہی ہے کہ کمیونسٹوں کا اپنے دین ناحق پر ایمان ہے اور ایمان کے مطابق عمل ہے اور مسلمانوں کا اپنے دین حق کے ساتھ یہ معاملہ نہیں رہا اور جب تک مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی قوانین نہیں نافذ ہوں گے یہی حال رہے گا ؎

میں جو کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

ماہر القادری

دین کے نام پر!
شرک وبدعت کی تبلیغ

رئیس الاحرار مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ حسن نظامی مرحوم کے درمیان اب سے تقریباً بیالیس قبل جو قلمی جنگ ہوئی اُس زمانہ میں خواجہ صاحب کے "منادی" کو خاصی شہرت حاصل ہوئی اس کے جواب میں دلی ہی سے "منادی" نکلا! اور اسی نے منادی" کا ترکی بہ ترکی جواب دیا! خواجہ صاحب نامور اہل قلم اور انشاء پرداز ہونے کے علاوہ پیر بھی تھے، اور اُس "عجمی تصوف" کے نمائندہ تھے، جو دینی نقطۂ نگاہ سے سخت قابل اعتراض ہے! خواجہ صاحب کے تصوف کے بارے میں علامہ اقبال کی رائے سنیئے! :-

- تعجب ہے کہ شیخ ملا کے ملحدانہ و زندیقانہ "شعر" — من چہ پروائے مصطفیٰ دارم — کو آپ اُس
کتاب میں جگہ دیتے ہیں، اور پھر ملا کی تشریح کس قدر بیہودہ ہے یہی وحدت الوجود ہے جس پر خواجہ
حسن نظامی اور اہل طریقت کو ناز ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر رحم کرے اور ہم غریب مسلمانوں کو ان کے
فتنوں سے محفوظ رکھے (انوار اقبال ص۶۲ علامہ اقبال کا خط، مولوی محمد الدین فوق کے نام)

افسوس ہے مسلمان ان فتنوں سے محفوظ نہ رہ سکے! ان فتنوں نے ایک مستقل "انسٹی ٹیوشن" کی صورت اختیار کرلی! مشرکانہ عقائد اور بدعات کو دین کی بہت بڑی خدمت کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے اور ان خرافات کی کار ثواب سمجھ کر تبلیغ ہو رہی ہے۔

ماہنامہ منادی" جو خدمت انجام دے رہا ہے اُس کے سرنامہ پر خواجہ حسن نظامی کے نام پر "رضہ" لکھا ہے جو "رضی اللہ عنہ" کا مخفف ہے اور لقب امام المشائخ! اردو ادب میں عام طور پر "رضی اللہ عنہ" صحابہ کرام کے ناموں کے ساتھ لکھا جاتا ہے مگر غلو عقیدت نے خواجہ حسن نظامی کو "رضی اللہ عنہ" بنا دیا۔

خواجہ حسن نظامی کی زندگی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے وہ پیر کم اور تاجر زیادہ تھے۔ پروپیگنڈا اُن کا خاص فن تھا، حالانکہ ارباب تصوف کے نزدیک شہرت کی تمنا وہ "ریا" ہے جس پر شرک کا اطلاق ہوتا ہے! اُن کے روزنامچہ کا ہر صفحہ اُن کے اس مزاج وفکر اور اس ذہنیت کا آئینہ دار ہے! مولانا محمد علی مرحوم جن کا اخلاص اور دینی خیر خواہی سب کے نزدیک مسلم ہے، انہوں نے خواجہ صاحب کی زندگی کے ایک دو گوشے بے نقاب کئے تھے، اُن کا یہ شعر —

کی مخبری نظام کی تو نے ۔۔۔۔۔۔!
دنیا میں پھر بھی تیرا نظامی ہی نام ہے

اس پردہ کشائی کا ایک رُخ پیش کرتا ہے! ہفتہ وار ریاست کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتون سے نواب صاحب رام پور کی ہمشیرہ کی

سفارش کے سلسلہ میں روپیہ پیسہ پر خواجہ صاحب کی جو نزاع ہوئی تھی، وہ "ریاست" کے فائل میں محفوظ ہے، سردار جی نے خواجہ صاحب کے خط کا عکس تک اپنے اخبار میں چھاپ دیا! ریاست جے پور کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے وقت گولی چلنے کا جو دردناک سانحہ پیش آیا خواجہ حسن نظامی وہاں موجود تھے، اس سلسلہ میں آپکی جو قلمی روش رہی اُس سے جے پور کے مظلوم مسلمانوں کو شکوہ رہا۔ اور کیریکٹر اور مزاج کا آدمی اگر "امام المشائخ" اور "رضی اللہ عنہ" ہوسکتا ہے تو پھر.......!

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

انہی باتوں نے اور مشتبہ شخصیتوں نے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملت کے اکابر کے بارے میں بدگمانی کا موقعہ فراہم کیا ہے، اگر عقیدتمندوں نے ان حضرات کے بارے میں بھی اسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہوگا۔

خواجہ حسن نظامی کی گدی کو اُن کے بیٹے خواجہ حسن ثانی نظامی نے سنبھالا ہے اور ان رسوم وعقائد کی جن میں شرک وبدعت کی آمیزش ہے تبلیغ کر رہے ہیں!

کہا جاتا ہے کہ بعض مشائخ چشت کے یہاں "سجدہ تعظیمی" کا رواج تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے اس غلط رسم کی تائید میں مضامین لکھے اور یہ نہ سوچا، شریعت محمدی میں سجدہ تعظیمی قطعاً حرام ہے۔ اگر سجدہ تعظیمی میں اباحت کا کوئی شائبہ تک ہوتا تو صحابہ کرام، رسول اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم "سجدہ" کے ساتھ کرتے! یہی وہ غلو عقیدت ہے جس کی دین میں شدید ممانعت آئی ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم میرے درجہ سے مجھے نہ بڑھاؤ"! یہی وہ لوگ ہیں جو دین وشریعت کے مقابلہ میں اپنے مشائخ اور پیروں کے طریقہ اور رسم ورواج کو ترجیح دیتے ہیں! اور اس طرح اپنے اسلاف اور پیروں کو "الٰہ" بنا لیتے ہیں، جس طرح یہودیوں اور نصرانیوں نے رہبانوں اور پادریوں کو "الٰہ" بنا لیا تھا، یعنی شریعت کے حکم کو پس پشت ڈال کر اپنے مشائخ کے طریقہ کی پیروی کرتے تھے، اور اس غلط روی کو دینداری سمجھتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب کے صاحبزادے حسن ثانی نظامی نے روداد "حج وزیارت" ماہنامہ "منادی" میں شائع کی ہے اُس میں وہ لکھتے ہیں:-

"ہمارے بزرگوں میں سے بہت کم نے حج کیا ہے، لیکن ان کے معاملات کو ہم اپنے اوپر قیاس نہیں کرسکتے! یہ حضرات زمان ومکان کی قید سے آزاد تھے۔ چنانچہ روایت میں ہے کہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی حیات ظاہری میں کسی شخص نے مکہ معظمہ کے ایک خدارسیدہ ملنگ سے پوچھا کہ سلطان المشائخ اس وقت مقتدائے عالم ہیں اور ہر طرف ان کا شہرہ ہے پھر کیا وجہ ہے کہ وہ حج کرنے نہیں آتے؟ ان ملنگ نے کہا میاں! تم حج کی بات کرتے ہو، حرم شریف میں روزانہ فجر کی نماز وہ ہمارے ساتھ پڑھتے ہیں۔ دوسری طرف خود سلطان المشائخ کا بیان ہے کہ جب مجھے حج کا اشتیاق ہوا تو پہلا اپنے پیر حضرت بابا صاحب کے ہاں حاضر ہوا اور وہیں میرا مقصد پورا ہوگیا۔ اس کے بعد پھر حج کا ارادہ ہوا اور پہلے بابا صاحب کے ہاں حاضری دی اور مقصد حاصل کرلیا۔"

ان دونوں بیانوں میں سمجھنے والوں کے لئے بہت کچھ ہے چاہے وہ خیال کریں کہ زمان ومکان کے حدود ٹوٹنے کے بعد وہ جب چاہتے تھے حج کرآتے تھے، چاہے حضرت امیر حسن علاء سنجری کے اس شعر پر یقین کریں کہ ؎

گفتی رسید موسم حج ایں سخن بداں
مارا حج چہار رسم جو کعبہ بما رسید

مگر ایک چیز اس سے واضح ہوتی ہے کہ یہ باتیں عوام اور خواص کی نہیں بلکہ خاص الخاص لوگوں کی ہیں، عام و
خاص کے لئے تو یہی مناسب ہے کہ جس طرح رسول اللہ نے عالم ظاہر میں حج کیا اور حج کرنے کو بتایا، اسی طرح
حج کریں، خود حضرت محبوب پاک نے اپنے کسی مرید اور خلیفہ کو حج سے منع نہیں کیا، چنانچہ حضرت کے بہت سے
مرید اور خلیفہ حج کرنے گئے" (منادی - ۱۹۶۷ء - چھٹا شمارہ صفحہ ۲۰)

عبارت کا پہلا جملہ یہ ہے :-

"ہمارے بزرگوں میں سے بہت کم نے حج کیا ہے"

...م استطاعت رکھتے تھے اور پھر بھی فریضہ حج کی ادائگی سے محروم رہے تو اللہ تعالیٰ ان کی اس کوتاہی سے درگزر فرمائے۔
...پر اُن سے بازپرس ضرور کی جائے گی - اور ان کا یہ فعل نہ قابل تحسین ہے اور نہ لائق تقلید ہے۔
...ان و مکان کی قید سے کسی بزرگ کا آزاد ہو جانا ـــــ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ ہاں! جب کبھی اللہ تعالیٰ چاہے ایسی صورت
...، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واقعہ اسراء پیش آیا، شب معراج میں یہ عروج منزلت حضور کے لئے مخصوص
...جب مکہ سے ہجرت فرماتے ہیں، تو مدینہ منورہ تک اونٹنی پہ ایک ایک منزل کی مسافت طے فرماتے ہیں! اسی طرح حضور کا ہونا
...اس سفر میں بھی زمین کی مسافت طے کرنے میں خرق عادت واقع نہیں ہوتا، مدینہ منورہ سے مکہ حج کرنے کے لئے تشریف
...مسافروں کی طرح سفر کے حالات سے گزرتے ہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صحابی کے بارے میں کوئی ایسی روایت
...ینہ میں رہتے ہوئے، سفر کے ظاہری اسباب کے بغیر کسی وقت کی بھی نماز بیت اللہ میں ادا کی ہو اور نہ تابعین اور تبع تابعین کے
...میں ایسے واقعات ملتے ہیں! اولیاء اللہ کا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جانا ــــ یہ نہ واقعہ ہے نہ ان کے لئے ایسی کرامت
...اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی ولی کے لئے بہ شکل کرامت ایسی صورت پیش آجائے تو دوسری بات ہے مگر یہ روایت کہ حضرت سلطان المشائخ
...نماز حرم شریف میں پڑھتے تھے۔ روایت کی رو سے درست نہیں معلوم ہوتی! سوال یہ ہے کہ جب روزانہ فجر کی نماز حضرت محبوب الٰہی
...حرم کعبہ میں پڑھتے تھے تو اُن کی خانقاہ کی مسجد میں نماز فجر کی جماعت سے انہیں روزانہ غائب پاکر، مریدوں میں چرچے ہونے چاہئے
...جماعت کی پابندی نہیں فرماتے۔ اس قسم کا کوئی ذکر حضرت موصوف کے حالات میں نہیں ملتا۔ یا پھر اس واقعہ کی یہ توجیہہ کی جائے
...واحد میں دلی اور مکہ دونوں مقامات پر فجر کی نماز ادا فرماتے تھے ـــــ یہ توجیہہ بھی بداہتہً غلط ہے۔
...حضرت سلطان المشائخ سے جو یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ "جب مجھے حج کا اشتیاق ہوا تو پہلے اپنے پیر حضرت بابا صاحب
...ہوا میرا مقصد پورا ہو گیا - اس کے بعد پھر حج کا ارادہ ہوا اور پہلے بابا صاحب کے یہاں حاضری دی اور مقصد حاصل کر لیا"۔
...راوی نے اپنے ذوق کی رعایت کے سبب یہ لطیفہ حضرت سلطان جی صاحب سے منسوب کر دیا ہو یا پھر حضرت موصوف حج
...رکھتے ہوں مگر صاحب استطاعت نہ ہوں ـــــ اور اگر ہمارے یہ دونوں قیاسات غلط ہیں روایت کا انتساب بھی درست
...موصوف صاحب استطاعت بھی تھے، تو انہیں اس فریضہ کو ضرور ادا کرنا چاہئے تھا۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ
...یہاں کی حاضری اس مقصد کو ہرگز ہرگز پورا نہیں کر سکتی تھی! فریضہ حج تو سفر کر کے حجاز جانے اور ارکان حج ادا کرنے ہی سے
...! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بابرکت اور مقدس کون ولی اللہ یا پیر ہو سکتا ہے کسی ایک صحابی کا بھی ایسا واقعہ

احادیث و آثار میں نہیں ملتا کہ صحابی نے حضورؐ کی زیارت، دیدار اور توجہ کے بعد یہ سمجھ لیا ہو کہ اس طرح حج کا مقصد پورا ہو گیا، صحابہ کرام حضور کی زندگی ہی میں مدینہ منورہ سے حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ جاتے تھے، اور ان کے حاشیہ خیال میں بھی یہ نکتہ نہیں آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر یا حضور کی روحانی توجہ سے مستفید ہو کر، حج کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ حضور کی وفات کے بعد کوئی صحابیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کو، حج بیت اللہ کا قائم مقام نہیں سمجھتا تھا۔

حضرت حسن سجزیؒ کا جو شعر حسن ثانی نظامی صاحب نے نقل کیا ہے، وہ دین و شریعت میں ذرہ برابر کوئی حیثیت نہیں رکھتا، کعبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں گیا، تو اور کس کے پاس جانے لگا! یہ تمام شاعرانہ لطائف اور نکتہ سنجیاں ہیں جن سے دین میں کوئی سند نہیں لی جا سکتی! کتنے شعراء ہیں، جن میں بعض اہل تصوف بھی ہیں۔ جنہوں نے خود کو "کافر" کہا ہے، اسلام پر کفر کو ترجیح دی ہے، دیر و حرم کو ایک ہی سطح پر رکھا ہے، تسبیح کے ساتھ زنار کی بھی تعریف کی ہے۔ — اس قسم کے اشعار کو جو کوئی کسی دینی بحث کے سلسلہ میں پیش کرتا ہے وہ دین پر ظلم کرتا ہے اور شاعری پر بھی!

دین کے احکام عوام و خواص سب کے لئے یکساں ہیں، خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بڑھ کر دین دار و "خاص الخاص" اور کون ہو سکتا ہے، مگر یہ نفوس قدسیہ دین کے ایک ایک جزئی حکم کی پابندی کرتے تھے، اور انہوں نے شریعت کے حکم سے اپنے کو مستثنیٰ نہیں سمجھا۔

ان خیالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حلقۂ نظامیہ کا یہ آرگن — منادی — دین کے معاملات میں کیسی کیسی خلاف شرع باتوں کی تبلیغ کر رہا ہے اور مشرکانہ عقائد و رسوم اور بدعات کی نشر و اشاعت اس کے پروگرام میں شامل ہے!

اسی رسالہ کے شمارہ ۵ (جلد ۴۱) میں صاحبزادہ میکش اکبرآبادی کا ایک مضمون "توحید اور شرک" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:—

"خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں بعض عقیدوں میں اختلاف تھا"

حیرت ہے کہ اتنی غلط اور خلافِ واقعہ بات اُن کے قلم سے کس طرح نکل گئی! صحابہ کرام میں فقہ کے فروعی اختلافات تو ضرور پائے جاتے مگر عقائد کا اختلاف اُن میں نہیں ملتا، خاص طور سے توحید اور شرک کے معاملہ میں اُن کے اندر رتی برابر اختلاف نہیں پایا جاتا تھا! یعنی کچھ صحابہ تو اس کے قائل ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "عالم الغیب" تھے۔ اور کچھ صحابہ اس عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھتے یا بعض صحابہ کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقبول بندوں کو کائنات کی مشکل کشائی اور حاجت روائی کی قوت عطا کر دی۔ وفات پانے کے بعد عالم برزخ سے روحیں کائنات میں تصرف کرتی ہیں اور بعض صحابہ اس عقیدے کے قائل نہ ہوں! اس قسم کے اختلاف کا سرے سے کوئی وجود ہی صحابہ کرام کے یہاں نہیں ملتا!

اسی طرح صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) اور ان کے بعد تابعین تبع تابعین اور ائمہ فقہ و حدیث (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے یہاں کوئی ایسی "رسم" نہیں ملتی، جو مختلف فیہ ہو! مثلاً یہ کہ بعض بزرگ "عرس خیانہ" کے قائل ہوں، اور بعض نہ ہوں کے یہاں "میلاد و قیام" ہوتا ہو اور بعض کے یہاں نہ ہوتا ہو، اس قسم کا کوئی اختلاف ان اکابر کے یہاں نہیں ملتا۔ وہ اس طرح کی رسموں سے واقف ہی نہیں تھے اور بدعات سے شدید اجتناب فرماتے تھے۔

استعانت واستغاثہ

اس کے بعد میکش صاحب لکھتے ہیں:—

"خدا جس کو چاہتا ہے، وہ مختار ہے اس نے اپنے بندوں کو بہت سی طاقتیں عطا

ہیں، ظاہری طاقتیں بھی اسی کی دی ہوئی ہیں۔ اور باطنی طاقتیں بھی خدا کی دی ہوئی ہیں، جسے چاہے
مارنے کی طاقت دیدے، جسے چاہے زندہ کرنے کی طاقت دیدے، جسے چاہے بیٹا دینے کی طاقت
ہے، جیسا کہ آگے چل کر قرآن و حدیث سے معلوم ہوگا، جس طرح ایک بیمار حکیم سے دوا لاتا ہے ایک شخص
سے ملازمت طلب کرتا ہے، اپنے گھر والوں سے کھانا مانگتا ہے اور یہ شرک نہیں ہے کیونکہ وہ سمجھتا
حکیم خدا ہی کے حکم سے شفا دیتے ہیں، خدا ہی نے دوا میں تاثیر دی ہے۔ ملازمت اور روزی دینے کی
قت خدا ہی نے ان لوگوں کو دی ہے اسی طرح وہ سمجھتا ہے کہ زندہ کرنے کی طاقت، بیٹا دینے کی طاقت
علم غیب خدا ہی نے اپنے برگزیدہ بندوں کو عطا کیا ہے تو یہ شرک نہیں ہے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے
خدا کی دی ہوئی طاقت سے کوئی چاند کے دو ٹکڑے کر سکتا ہے تو وہ مشرک نہیں ہے۔" (ص ۱۷-۱۸)

اور احمق نے یہ کہا تھا کہ کسی حاکم سے ملازمت کی درخواست، کسی طبیب سے مرض کے لئے نسخہ کی طلب، کسی ملازم سے گھریلو
عانت شرک ہے! قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس طبیب کو نبض دکھائی جاتی ہے اور نبض دیکھنے کے بعد وہ نسخہ لکھتا ہے اس
علم ہو جاتی ہے، کیا اس طبیب کے بارے میں یہ عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ وہ طبیب دنیا کے تمام مریضوں کے حالات کی خبر
کو جو کوئی مریض دور و نزدیک جہاں سے بھی پکارے گا وہ ہر مریض کی فریاد سن لے گا، اسی طرح جو حاکم ملازمت عطا کر
متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ حاکم مذکور ہر بے روزگار کے حالات کی خبر رکھتا ہے اور دنیا میں جو بھی پریشان حال
کی دستگیری یہ حاکم کرتا ہے اور کر سکتا ہے ——— اس قسم کے تصورات باطل ہیں بلکہ مشرکانہ ہیں!
عالیٰ نے کسی انسان کو بھی اپنے اختیارات تفویض نہیں فرما دئے ——— یہ کہ کائنات کا کوئی ذرہ اس انسان کی نگاہ سے
نیا کے ہر جاندار کی چوٹی اس کے ہاتھ میں ہو، ماضی، حال اور مستقبل کا تمام علم اسے حاصل ہو، کھیتی کو وہ نشو و نما دیتا ہو،
نظام کو وہ تھامے ہوئے ہو، ہر جاندار کو رزق، اولاد، خوشحالی، صحت، مرض، غم اور خوشی وہ عطا کرتا ہو، ہر انسان
جانتا ہو، پانی اس کے حکم سے برستا ہو، پھول اس کے اشارے سے کھلتے ہوں، چشمے اس کی جنبشِ کرم سے بہتے ہوں
وعلم جراً)

قسم کے اختیارات اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو دئے ہیں، تو اس کا نام بتایا جائے، "قرآن کریم ہم سب کے سامنے ہے اس میں
طور سے نبیِ آخر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے آپ کو اس قسم کے اختیارات عطا فرما
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا دعویٰ کیا کہ میں کائنات کا مختار و مالک ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں اس دنیا
ات کا کارخانہ چلا رہا ہوں، اور ہر فریادرس جہاں کہیں سے مجھے پکارے میں اس کی فریاد سن لیتا ہوں! اور میرے وفات
مجھے مشکل کشائی کے لئے پکارا کرنا میں تمہاری مشکل کشائی کیا کروں گا . . . . ! اس قسم کا ایک لفظ بھی نہ قرآن میں آیا ہے بلکہ
بلکہ اس کے برخلاف قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے یہ کہلوایا گیا ہے۔

قل لا املک لنفسی ضرًّا ولا نفعاً الا ما شاء اللّٰہ

"کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے برے کا بھلے کا مگر جو اللہ چاہے"

اور

قل ما کنت بدعاً من الرسل وما ادری ما یفعل بی ولا بکم

تو کہہ میں نیا رسول نہیں ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے
اور تمہارے ساتھ بھی (کیا ہونے والا ہے)

اور

انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء وھو اعلم بالمھتدین

(تو راہ پر نہیں لاتا جس کو تو چاہے، بلکہ اللہ راہ پر لاتا ہے جس کو وہ چاہے اور وہی (یعنی اللہ تعالیٰ) خوب جانتا ہے کہ کون راہ پر آئیں گے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے لئے اجابت منتظر رہتی تھی، اللہ تعالیٰ مجیب الدعوات ہے اور حضور مستجاب الدعوات تھے اس شرف و اعتبار کے باوجود قرآن یہ بھی کہتا ہے۔

استغفر لھم او لا تستغفر لھم ط ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم (التوبہ)

(اے نبی! تم ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی ان کے معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا)

قرآن کریم کی ان محکم اور واضح آیات کے ہوتے کوئی مسلمان اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ کس طرح رکھ سکتا ہے کہ وہ وفات پانے کے بعد ساری دنیا کی مشکل کشائی کر رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سب کچھ اختیار دیدیا ہے!

قرآن کریم میں حضور کو رحمۃ اللعلمین اور سراج منیر کہا گیا ہے۔ حضور کے اسوہ حسنہ کو انسانیت کے لئے معیار ٹھیرایا گیا ہے سرکار کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے، حضور خاتم النبیین اور شفیع المذنبین ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اعزاز و اکرام کی اس عطا کے ساتھ یہ نہیں کہا کہ ہم نے آپ کو کائنات کے تمام اختیارات سونپ دئے ہیں اور آپ ہمارے حکم و عطا سے تمام دنیا کا نظام اور کارخانہ چلا رہے ہیں!

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بار بار اس کا اعلان فرمایا ہے کہ میرے سوا کسی بے کس کی پکار کو بھلا کون پہونچ سکتا ہے اور کون میرے سوا ہر کسی کی مصیبت کو دور کر سکتا ہے۔

امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء

اللہ تعالیٰ مشرکین کو چیلنج دے رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرح دوسروں کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہیں، ایسا مشکل کشا جو ہر وقت ہر شخص کی پکار، دور و نزدیک سے سن کر (اللہ تعالیٰ کی عطا کی بنا پر) لوگوں کی مشکل کشائی کر سکے۔

جو کام اللہ تعالیٰ کر سکتا ہے وہی کام اس کے مقبول بندے بھی کر سکتے ہیں، بس فرق ذات اور عطا کا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ "ذاتی خدا" نے بے شمار "عطائی خدا" اور "مستقل رب" نے بہت سے "غیر مستقل رب" بنا دئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم و عطا کی بنا پر وہ کام انجام دیتے ہیں جو صرف ربوبیت الٰہی کے لئے خاص ہیں! ـــــ یہ عقیدہ مشرکانہ عقیدہ ہے، اللہ تعالیٰ عقیدہ کے اس فساد سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے (آمین)

عرب کے مشرکین خدا کے وجود کے منکر نہ تھے، وہ اللہ تعالیٰ کو خالق بھی مانتے تھے مگر وہ بتوں کو اللہ کے دربار میں، سفارشی سمجھ کر ان کے ساتھ وہ معاملہ کرتے تھے، جو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے، یعنی بتوں کے روبرو سجدہ ریزی، ان کی دہائی دینا، ان سے مدد چاہنا ان کو کائنات میں متصرف اور دخیل سمجھنا، ان مشرکانہ حرکات و عقائد کے ساتھ ان کا "خدا کو ماننا" اللہ کے یہاں مقبول نہ ہو سکا اور ان کو

باگیا!
مکہ اُن بتوں کو "خدا" نہیں کہتے تھے، ہاں! خدا کا مظہر جانتے تھے یعنی یہ کہ خدا نے یہ صفات ان کو عطا کی ہیں ۔
ن صاحب اکبر آبادی کے عقیدہ کے مطابق تو کے ان لوگوں کو "مشرک" نہیں "احمق" کہنا چاہیے تھا کہ وہ پتھر اور لکڑی سے
سے اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں اور مختار ہستیوں کی طرح سلوک کرتے تھے! اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غیر اللہ سے اس
استغاثہ و استعانت بھی شرک ہے تو اسے اللہ تعالیٰ نے کائنات میں ہر طرح کے تصرف کے اختیارات عطا فرما دیئے ہیں وہ عالم
عالم کو چلا رہا ہے اور اللہ کی طرح دُور و نزدیک سے سب کی پکار سنتا ہے اور وہ کام انجام دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے

ں بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ بُت جن کی کفارِ قریش پرستش کرتے تھے، اور اُن سے مرادیں مانگتے تھے اور جن ناموں کے
ے، ان کے بارے میں حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کی روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین نے
کے ناموں ود، سواع، یغوث، نسر، اساف، اور نائلہ پر بتوں کے نام رکھ لیتے تھے، البدایہ والنہایہ میں علامہ
۱۰۶ پر راویوں کے ناموں کے ساتھ روایت نقل کی ہے۔

وراً رجلاً صالحاً وکان محببہ فی قومہ فقد مات عکفوا حول قبرہ

یک مرد صالح تھا، یہ اپنی قوم میں محبوب تھا، جب وہ مرگیا تو لوگ اس کی قبر کے ارد گرد گھومنے لگے)

اف بھی مشرکانہ رسم ہے؛
ے چل کر علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:—

ومقتضی ھذا السیاق ان کل صنم عندہ عبدۃ طائفۃ من الناس

سیاق سے یہ عبارت نکلتی ہے کہ اس طرح کے تمام بت انسانوں کے گروہوں ہی سے تھے)

ہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عین تمنا تھی کہ بیت المقدس کی بجائے مکہ کا "کعبہ" امت مسلمہ کا قبلہ قرار دیا جائے
اپ کی اس تمنا اور آرزو کو پورا فرما دیا مگر اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا قیاس مع الفارق ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ
نا کا پابند تھا، بندے جن میں انبیاء، اور اولیاء بھی شامل ہیں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے پابند ہیں اللہ تعالیٰ کسی کی رضا اور تمنا کا
اور نہ اس پر کسی کا کوئی دباؤ اور حق ہے۔

لفون لکم لترضوا عنہم ج فان ترضوا عنہم فان اللہ لا یرضی عن القوم الفسقین (التوبہ)
لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ ایسے
سقوں سے ہرگز راضی نہ ہوگا)

رت ہے کہ قرآن کریم کی ایسی محکم آیات ان اہل بدعت کو نظر نہیں آتیں اور قرآن کی پیش کی ہوئی "توحید" کو نظر انداز کر کے،
ری، یہودیوں، اور نصاریٰ کی نام نہاد "توحید" یا یوں کہئے "غبار آلود" توحید کو اپنانے کی طرف مائل ہیں اور اس کی تبلیغ
کارنامہ سمجھے ہوتے ہیں۔
سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "عمرین" یعنی عمر ابن الخطاب اور ابوجہل (جس کا نام بھی عمر تھا) کے ایمان لانے کی دعا کی، اللہ
رت عمر کے بارے میں حضور کی دعا قبول فرما لی مگر ابوجہل ایمان نہیں لایا اور بدستور کافر رہا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسے واقعات کا ذکر فرمایا ہے کہ انبیاء کرام تک پریشانی، غم اور مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے فریاد اور دعا کی ہے، حضرت یونس علیہ السلام غم کے اندھیروں میں فریاد کرتے ہیں ۔

فنادیٰ فی الظلمٰت ان لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

(سو پکارا ان اندھیروں میں (یونس) کوئی الٰہ (حاکم) نہیں سوائے تیرے تو پاک (بے عیب) ہے اور میں خطا کاروں میں سے تھا)

جب انبیاء کرام تک کو مصائب و پریشانی اور حزن و ملال کے واقعات پیش آئے ہیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مصیبت میں پکارا ہے تو پھر جو مسلمان قرآن کریم پر نگاہ رکھتا ہے، اُسے بھی مصیبت میں کسی نبی اور ولی کی دُہائی دینے کی بجائے اللہ تعالیٰ ہی کو پکارنا چاہیئے ایسا نہیں ہوا کہ بعد کے نبی نے اپنے سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں اور نبیوں سے استعانت چاہی ہو! اگر انبیاء کرام کو دنیا والوں کی ہر طرح کی مصیبت دور کرنے کے اختیارات اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیئے ہوتے، تو خود ان کو کوئی مصیبت پیش نہ آتی اور قرآن کریم میں کوئی ایک آیت تو ایسی ملتی، جس میں اس کا ذکر یا اشارہ ہوتا کہ فلاں زمانہ میں مصائب و آلام دور کرنے کے لئے لوگوں نے وفات پائے ہوئے نبیوں کی ارواح سے استغاثہ کیا تھا۔ قرآن کریم کے بعد جب احادیث نبویؐ کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں بھی اس قسم کی کوئی ہدایت، اجازت یا اشارہ نہیں پایا جاتا، اُن کے بعد صحابہ کرام کے حالات میں تابعین کی زندگیوں میں ائمہ فقہ و حدیث کے اقوال اور اجتہادات میں وہاں بھی غیر اللہ سے استعانت کا کوئی تصور نہیں ملتا ۔

قرآن کریم میں جتنی دعائیں ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ہیں، یہاں تک کہ اُن میں کسی دعا کے ساتھ "بجاہ، بحق یا بوسیلہ" تک نہیں آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سینکڑوں دعائیں منقول ہیں، اُن میں "توسل" کی تعلیم نہیں دی گئی[1]؛ صحابہ کرام کا دعاؤں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دوسرے نبی کے وسیلہ کے ساتھ دعا مانگنے تک کا معمول نہیں رہا، چہ جائیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا جاتا؛ صحابہ کرام سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتب و اختیارات سے اور کون واقف ہو سکتا ہے، مگر اُن کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کا مالک و مختار بنا دیا ہے ۔

انبیاء کرام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں، مگر ان سے یہ بات کس منطق اور فلسفہ کی مدد سے ثابت ہوتی ہے کہ جس نبی کو معجزہ اور جس ولی کو کرامت دی جاتی ہے اُس کو اللہ تعالیٰ نے کائنات میں رزق و اولاد عطا کرنے، دلوں کے حالات جاننے اور ہر شخص کی فریاد و التجا سننے کے اختیارات بھی عطا فرما دیئے ہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے شق القمر کا معجزہ عطا فرمایا، ایسا بھی ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے تو آپ کی دعا اور برکت سے بعض، کھانے، غذا اور دودھ کی قلیل مقدار کثیر ہو گئی، طشت میں انگشتان مبارک سے پانی کی دھاریں بھی نکلتی ہوئی صحابہ کرام نے مشاہدہ کی ہیں، اس قسم کے اور دوسرے معجزے بھی ہیں جو صحیح اور برحق ہیں: مگر ان معجزات کو دیکھ کر، صحابہ کرام نے یہ عمل نہیں کیا کہ حضورؐ کی حیاتِ مقدسہ میں آپ کو دور دراز مقامات سے پکارا کریں اور نہ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں، صحابہ کرام نے حضورؐ کی وفات کے بعد مصیبت کے موقعوں پر آپ کو نہیں پکارا، انہوں نے اپنا درد و غم اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا ۔

کتاب و سنت، آثار صحابہ اور ائمہ فقہ و حدیث کے اقوال، ان سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ استغاثہ اللہ تعالیٰ ہی سے کیا جاتا ہے وہی حلال مشکلات اور مجیب الدعوات ہے؛ کئی صدی کے بعد کے شعراء اور عجمی تصوف سے بعض متاثر صوفیاء نے یہ اعتقاد کی راہ کھولی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفات پائے ہوئے بزرگوں سے استغاثہ کیا ہے یہ لوگ ان میں سے کوئی شخص دین میں حجت نہیں ہے اور اللہ اور

---

[1] حضورؐ کی حیات میں ایک دو روایتیں ملتی ہیں جن میں توسل کا ذکر ہے، مگر وفات کے بعد کسی صحابی سے ایسی کوئی روایت نہیں ملتی ۔

ولی کے مقابلہ میں ان کا کوئی قول و عمل رائی کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔

معجزات اور کرامات کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے، یہ "خوارق" ظہور میں آتے ہیں! غزوہ خیبر میں حضرت سیدنا علی رضی اللہ وجہہ کی آنکھوں میں آشوب تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب دہن کے لگانے سے دکھتی آنکھیں بالکل اچھی ہو گئیں، اس کے خلاف یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ آپ پر جادو کا اثر بھی ہو جاتا ہے اور آپ اُسے دور نہیں فرما سکتے، حضورؐ ایک صحابی کو درخت کی شاخ ایک ذرہ میں عطا فرما دیتے ہیں تو وہ شاخ تلوار کا کام کرتی ہے دوسری طرف تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ غزوہ احد میں ابن قمیہ کی تلوار آپ کو بھی زخمی کر دیتی ہے، ایک صحابی کا زخم حضورؐ خود اپنے دستِ مبارک سے داغتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں تھا، وہ زخم اچھا نہیں ہوتا اور اسی صدمہ سے صحابی کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

حضرت سیدنا یعقوب علیہ السلام برسوں تک شدید حزن و غم میں مبتلا رہتے ہیں، یہاں تک کہ چہیتے فرزند (حضرت) یوسف کے غم میں روتے روتے آنکھیں سفید ہو جاتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی اور مشیت و حکمت اپنے مقرب بندے اور برگزیدہ نبی کے اس اضطراب و اندوہ کی پروا نہیں کرتی، یہ حزن و ملال اُس وقت دور ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی مشیت کو منظور ہوتا ہے۔ جب انبیاء کرام تک رضاء الٰہی کے مقابلہ میں اتنے بے اختیار ہوں، تو وہ کون ایسا ولی اللہ کا پیارا اور پہنچا ہوا بزرگ ہے جس کے اشارے پر مشیتِ الٰہی چلتی ہے (معاذ اللہ) اور اُس کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تکوین کے تمام اختیارات سونپ دیے ہیں اور دنیا کے سپید و سیاہ کا مالک بنا دیا ہے۔

قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے تین مقاصد بیان کرتا ہے —— (۱) آیاتِ قرآنی کی تلاوت (۲) قرآن اور حکمت کی تعلیم اور (۳) اہل ایمان کا تزکیۂ نفس! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکوینی امور میں ہر طرح کے تصرف اور دنیا کے کارخانہ کے چلانے کا انتظام بھی سپرد کر دیا گیا ہوتا، تو ان آیات میں اُن کا ذکر آنا چاہیے تھا! کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ حضورؐ جن مشرکانہ عقائد و توہمات کو مٹانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے تھے، اُنہی مشرکانہ عقائد کو بعض مسلمانوں نے دین کا لازمی جزو بنا لیا، اور اپنی غیر دینی حرکات پر وہ شرمانے کی بجائے فخر و ناز کرتے ہیں، اور توحید خالص کی طرف دعوت دینے والوں پر آئے دن پھبتیاں کستے ہیں اور انہیں "دینا دشمن" بتاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں یہ واقعات ملتے ہیں کہ کوئی سائل حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کرتا تھا تو حضورؐ کے پاس ہوتا تھا تو عطا فرما دیتے تھے، نہیں ہوتا تھا تو سائل کو صحابہ کے پاس بھیج دیتے تھے! پھر ایک بات اور قابل غور ہے، وہ یہ کہ میں اپنے ملازم سے یہ نہیں کہتا کہ تم پانی پلانے کے لئے خدا سے دعا کرو، میں جانتا ہوں کہ پانی موجود ہے اور ملازم پانی پلانے کی استطاعت رکھتا ہے تو میں اُس سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے پانی پلا دو۔ کوئی امیدوار کسی حاکم سے نوکری کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی درخواست نہیں کرتا، وہ جانتا ہے کہ ملازمت کا دینا حاکم کے اختیار میں ہے، اس لئے وہ عرض کرتا ہے کہ فلاں پوسٹ پر میرا تقرر فرما دیا جائے!

اگر ——

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دے گئے ہوتے تو صحابہ کرام آپ سے کسی بھی کام کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرنے کی التجا کیوں کرتے —— بلکہ آپ کو یوں کہنا چاہیے تھا —— کہ اے اللہ کے رسول! تم کو اللہ تعالیٰ نے سب اختیارات سونپ دیے ہیں —— تم مینہ برسا دو —— قحط سالی دور کر دو —— بے اولادوں کو اولاد دے دو —— ہماری بیماریاں اچھا کر دو —— ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کے لئے صحابہ کا درخواست کرنا، اس کی دلیل ہے کہ جن چیزوں کے لئے دعا کی جاتی تھی وہ حضور کے دستِ قدرت و اختیار میں نہ تھیں۔

بالکل سامنے کی بات یہ ہے کہ راقم الحروف نے بہت سے پیروں، صاحبان سجادہ طریقت اور اہل اللہ کو دیکھا ہے کی صحبت سے استفادہ کیا ہے، مبکش صاحب اکبرآبادی کو بھی ایسے مواقع ضرور میسرآئے ہوں گے، اور حسن ثانی نظامی نے اپنے خواجہ حسن نظامی صاحب کو دیکھا ہوگا، ان تمام بزرگوں کا یہ حال رہا ہے کہ کسی کی بینائی کمزور ہوگئی ہے تو وہ عینک کے بغیر پڑھ سکتے، بیمار ہوتے ہیں تو کمزوری کے سبب دوسروں کے سہارے دو چار قدم مشکل سے چل سکتے ہیں، اُن کے مرید انہیں خط لکھ بھیجتے ہیں تو مریدوں کے حالات کی انہیں خبر ہوتی ہے، یہ بزرگ پردیس میں ہیں اور گھر سے خط آنے میں دیر ہو جاتی ہے تو وہ مضطرب ہوتے ہیں، اس اضطراب کے عالم میں اپنے گھر والوں کو تار بھیجتے ہیں، اور جب تک وہاں سے خیریت کا تار نہیں آجاتا اضطراب کم نہیں ہوتا۔ وہ جن مکانوں میں رہتے ہیں، اُن کے برابر والے مکان کے حالات کی انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی، گھڑی دیکھے کا صحیح اندازہ انہیں نہیں ہو سکتا، جس طرح عام لوگ ایک خاص دوری کی آواز سن سکتے ہیں، اسی طرح وہ بھی اس سے زیادہ دور کی آواز نہیں سن سکتے، اُن کی گریہ وزاری اور دعاؤں کے باوجود، عدالت کے مقدمات اُن کے خلاف فیصل ہو جاتے ہیں۔

پوری زندگی احتیاج اور بے اختیاری کی زندگی ——— .. !

——— لیکن ———

ہم نے دیکھا ہے کہ ان بزرگوں کے وفات پاتے ہی، اُن کے مرید اُن کی قبروں پر جاکر منتیں مانگ رہے ہیں، اور اُن سے استغاثہ کر رہے اور قوالیوں میں اس قسم کے اشعار گائے جا رہے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ — اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر طرح کا اختیار دے دیا تم کائنات کے والی اور شاہنشاہ ہو، ہماری دستگیری فرمائیے اور ہماری مشکل حل کر دیجئے ——— خدا کے لئے بتائیے کہ غالی مریدوں کا یہ عقیدہ اور عمل کسی طرح بھی عقل و مذہب کے مطابق ہے۔ یہ قرآن کی کس آیت اور کس حدیث سے ثابت ہے زندگی میں تو یہ حضرات بے اختیار ہوتے ہیں اور وفات پاتے ہی کائنات کے مالک و مختار اور مشکل کشا بن جاتے ہیں —

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا —

"میرے مرتبہ کو نہ گھٹانا"

اس لئے کہ پچھلی امتوں نے بعض انبیاء کے مرتبہ کو گھٹایا نہیں بڑھایا تھا، عقیدت کا غلو بڑی چیز ہے لہٰذا حضور نے ارشاد فرمایا۔

انی لا ارید ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنیھا اللہ تعالیٰ انا محمد بن عبد اللہ ورسولہ

(بیشک میں نہیں چاہتا کہ بڑھاؤ، تم مجھ کو زیادہ اس رتبہ سے جو اللہ نے مجھے بخشا ہے میں تو وہی محمد ہوں بیٹا عبداللہ کا، اللہ کا بندہ اور رسول)

اس حدیث پر غور و فکر کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد تمام مخلوق میں سب سے بڑا رتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ——— اس صورت میں کوئی امتی حضور کی شانِ مرتبت میں غلو کرے گا، تو اس کے سوا اور کیا چیز ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ صفات وابستہ کردے، جو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں! اور آپ کو "عطائی الٰہ" بنا دے جس غلو عقیدت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو روکا تھا۔ افسوس ہے کہ کتنے بہت سے امتی اسی ناپسندیدہ غلو میں مبتلا ہوگئے، اور جس چیز کی حضور نے فرمائی ہے اسی میں ملوث ہونے پر وہ فخر کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس طرح ہم حضور کی عقیدت اور محبت کا حق ادا کر رہے حالانکہ اس قسم کی عقیدت ان لوگوں کے منہ پر ماردی جائے گی! عشق و محبت اور عقیدت وہی معتبر ہے جو کتاب و سنت کے ہو، دینی حدود جس محبت و عقیدت سے ٹوٹتے ہوں، ایسی محبت ایمان و اسلام کے لئے وبال ہے۔

خود نبی کی زبان وحی ترجمان سے اللہ تعالیٰ نے یہ کہلوایا ہے :—

"قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ....!"

(تو کہہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے (دیے ہوئے) خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں)

بحث نے "ذاتی" اور "عطائی" کا جو فرق پیدا کیا تھا اور نکتہ تراشا تھا، جس پر اُن کے عقیدہ کی بنیاد ہے، قرآن کی اس آیت نے اس دی کو ڈھا دیا، اور واضح لفظوں میں فرما دیا —— "کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے (دیے ہوئے) خزانے بھی نہیں ہیں"

میکش صاحب نے برگزیدہ بندوں کے لئے علم غیب ثابت کرنے کا ذکر بھی چھیڑا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں بار بار اس عقیدہ کرار کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو علم غیب نہیں ہے۔

"قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ ...."

(کہہ کہ نہیں جانتے وہ جو ہیں آسمانوں اور زمینوں میں، غیب کو مگر اللہ)

انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے غیب کی اطلاع دی ہے، جس کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے۔ اسی اطلاع کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ م نے بہت سی پیش گوئیاں کیں، جو حرف بہ حرف پوری ہو کر رہیں اور قیامت وغیرہ کے حالات جو حضور نے بیان فرمائے ہیں وہ ی طرح واقع ہوں گے!

—— مگر ——

یہ "غیب" کی اطلاع تھی، اور اطلاع کے بعد "غیب" غیب نہیں رہتا کیونکہ حضور نے غیب کی اطلاعیں اُمت کو بھی دیں اس طرح کیا ساری اُمت "عالم الغیب" ہو گئی؟ غیب کی تعریف یہ ہے کہ خود بخود ہو، کسی کی اطلاع کا اُس میں دخل نہ ہو اور وہ "بعض" نہ ہو، "کل" ہو، اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کی ہے، اسی لئے قرآن کریم میں انبیاء کرام کو غیب کی اطلاع دینے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے "عالم الغیب" کا لقب صرف اپنے لئے استعمال فرمایا، کسی نبی کے لئے استعمال نہیں کیا۔

پھر کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "ما کان وما یکون" کا علم دیا گیا تھا۔ قرآن کریم کی آیات کے صریحی خلاف ہے؟

قرآن کہتا ہے —

"وممن حولکم من الاعراب منفقون ط ومن اھل المدینہ (قف) مردوا علی النفاق (قف)
لا تعلمھم نحن نعلمھم —"

(تمہارے آس پاس کے بادیہ نشینوں میں منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پہ اڑے ہوئے ہیں، انہیں تو نہیں جانتا، ہم انہیں جانتے ہیں)

—— اور ——

"واتینا داؤد زبوراً ورسلاً قد قصصنٰھم علیک من قبل ورسلاً لم نقصصھم علیک (النساء)

(یعنی ہم نے داؤد کو زبور دی، ہم نے ان رسولوں پر وحی نازل کی جن کا ذکر اس سے پہلے تم کر چکے تھے، اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا (یعنی تمہیں جن کے احوال کی اطلاع نہیں دی)

اللہ تعالیٰ یہ فرما کر کہ اے نبی! آپ بعض منافقوں کو نہیں جانتے اور بعض انبیا کے احوال بھی ہم نے آپ کو نہیں بتائے —— کیا معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کرنا چاہتا ہے؟ اور آپ کو ما کان وما یکون کا علم دے کر پھر اس کی نفی کرتا ہے

—— نہیں یہ بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے کلام میں تضاد نہیں ہوتا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قدر شناس اللہ
سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا ہے۔

اصل غلطی یہ ہے کہ جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنا دیا ہے اور جو کوئی حضرت عیسیٰ کو "ابن اللہ" نہیں
اُن کے بارے میں اُن کا یہ خیال ہے کہ وہ شخص حضرت عیسیٰ کی توہین کرتا اور اُن کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے حالانکہ حضرت عیسیٰ کے "ا
ہونے کی نفی حضرت عیسیٰ کی منقصت ہرگز نہیں ہے" ابن اللہ" کا عقیدہ تو عیسائیوں کا اپنا گھڑا ہوا ہے، یہ نفی اُن کے خود ساختہ
کی ہے" اسی طرح بہت سے مسلمانوں نے انبیاء اور اولیاء کے بارے میں کچھ عقائد گھڑ لیے ہیں، ان عقائد کے اثبات کے لئے کتا
سنت میں کوئی دلیل نہیں ملتی —— مثلاً علم "غیب" کائنات کا مالک و مختار ہونا، دور و نزدیک سے ہرکسی کی آواز سن کر عالم
سے حل مشکل اور دستگیری کرنا —— جو کوئی خدا کا نیک بندہ اور کتاب و سنت کا جاننے والا ان اہل بدعت کے خود سا
عقائد کی تردید کرتا ہے، اس پر وہ انبیاء اور اولیاء کی توہین اور منقصت کی طنز کرتے ہیں! حالانکہ یہ تردید اہل بدعت کے
ساختہ عقائد کی ہے، انبیاء اور اولیاء کے کسی رتبہ کی جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا ہے، نفی ہرگز نہیں ہے۔

سامنے کی بات ہے کہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ جن کو "امام الاولیا" کہا جاتا ہے، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ
برسوں جنگ کرتے رہے، مگر حضرت علی کی تمام مجاہدانہ کوششوں، تمناؤں اور دعاؤں کے باوجود حضرت امیر معاویہ کی حکو
قائم رہی اور اس معاملہ میں اُن کی نہ کوئی کوشش کارگر ہوسکی اور نہ دُعا! کیوں! اس لئے اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا (اگرچہ "حق" حضرت
علیؓ کے ساتھ تھا)

حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو آپ کے قاصد حضرت مسلم بن عقیل کوفہ سے اطلاع دیتے ہیں کہ یہاں کے لوگ سب آپ
عقیدت مند اور جاں نثار ہیں، یہ اطلاع پاکر حضرت حسین کوفہ کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں مگر پھر حالات بدل جاتے ہیں، یہاں
کہ حضرت مسلم کی شہادت واقع ہوجاتی ہے، ان تمام واقعات سے حضرت حسین بے خبر رہتے ہیں۔

غزوہ احد کا واقعہ ہے :—

> "بدحواسی میں اگلی صفیں، پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں، اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی، حضرت حذیفہ
> کے والد (یمان) اس کش مکش میں آگئے، اُن پر تلواریں برس پڑیں، حضرت حذیفہ چلاتے ہی رہے کہ
> میرے باپ ہیں، لیکن کون سنتا تھا، غرض وہ شہید ہوگئے، حضرت حذیفہ نے ایثار کے لہجہ میں کہا
> مسلمانو! خدا تم کو بخش دے (صحیح بخاری بحوالہ سیرۃ النبی جلد اول)

یہ صحابہ کرام ہیں، حضور کے تربیت یافتہ، خود حضورؐ موقعہ واردات پر موجود ہیں، مگر صحابہ کرام کی بے خبری اور لاعلمی کے
ایک مسلمان کی شہادت واقع ہوجاتی ہے۔ حضورؐ بھی صحابہ کرام کو متنبہ نہیں فرماتے کہ کیا کر رہے ہو! اگر حضورؐ کو اس کش مکش کا علم
تو صحابہ کو روکنا اور ٹوکنا آپ پر فرض ہوجاتا، جب صحابہ کرام جو انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں، ان کا یہ عالم ہو کہ نظروں کے سا
اپنے آدمی کو کش مکش میں نہ پہچان سکیں، تو ہم کسی قطب، غوث، اور ابدال کے بارے میں یہ حسن ظن کس طرح قائم کرلیں، کہ اس
ساری دنیا کے احوال و کوائف ہمہ وقت منکشف رہتے ہیں اور اُس کو جہاں سے بھی پکارا جائے وہ پکارنے والے کی پکار سن لیتا
اور اس کی مصیبت کو دُور کردیتا ہے۔

معجزہ اور کرامت اپنی جگہ حق ہے، ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص مکہ میں شورت کرتا ہے اور مدینہ میں اللہ تعالیٰ حضور کو اُس

ے مطلع فرما دیتا ہے مگر اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ دنیا میں جہاں بھی کوئی واقعہ پیش آتا ہے حضورؐ اس
ہوتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات بھی سیرت میں ملتے ہیں کہ ایک خاتون جو مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھیں، رات کو انتقال کر
ابہ نے راتوں رات آن کا کفن دفن کر دیا، صبح کو جب صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کو بیان کیا تو آپ
اطلاع ہوئی اور آپ نے فرمایا تم نے اس کے انتقال کی خبر رات ہی میں مجھے کیوں نہیں دے دی تھی (حدیث کی ترجمانی)
واقعہ افک ہے جو نبی اور صحابہ کے "عالم غیب" ہونے کی تردید کرتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جنگل میں
ی سو گئیں اور صحابہ یہ سمجھے کہ حضرت ام المومنین ہودج میں آکر بیٹھ گئی ہیں اور وہ اس ہودج کو لیکر اور حضرت عائشہ کو جنگل
چھوڑ کر چل دئے؛ حضورؐ اس واقعہ سے باخبر ہوتے تو بھلا ایسا کر سکتے تھے کہ اپنی شریک حیات کو جنگل بیابان میں
چھوڑ دیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک انگشتری، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے کنویں میں گر گئی۔ حضرت عثمانؓ
یے اجل صحابہ نے بہت ڈھونڈا، مگر انگشتری نہیں ملی ــــ اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جو قدر و قضا کے سامنے
م تک کے مجبور و بے اختیار ہونے کی شہادت دے رہے ہیں، اگر ہر ولی کو تمام کائنات ہتھیلی کی طرح دکھائی دیتی ہے
کرام سے بڑھ کر اور ولی کون ہو سکتا ہے، اُن کو کنویں میں انگوٹھی نظر کیوں نہیں آئی؟
خود قرآن پاک میں اولیاء اللہ کی یہ تعریف کی گئی ہے ــــ

ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا یحزنون

(یاد رکھو! جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے)

ت میں اس طرف کہیں دور کا اشارہ تک نہیں ہے کہ اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ نے اہل دنیا کی دستگیری، مشکل کشائی اور فریاد رسی
یار دے دیا ہے اور وہ کائنات میں جس طرح چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اذن سے تصرف کرتے ہیں۔
کتنے ہی صحابہ کرام ایسے تھے جن کو پورا قرآن شریف حفظ نہیں تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام کی تمام احادیث
ب صحابی کو بھی زبانی یاد نہ تھیں، بے شمار اولیاء اللہ ایسے گذرے ہیں جو حافظ قرآن و حدیث نہ تھے اور نہ فقہ کی تمام کتابیں ان
تھیں اور جو کچھ انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا نہ وہ اُن کے حافظہ میں تمام و کمال محفوظ تھا جب حافظہ اور یادداشت کی یہ
ن ہو تو کس ولی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُسے اللہ تعالیٰ نے علم غیب عطا کیا ہے اور اُس کا علم ساری کائنات کا احاطہ
رئے ہے!
اکابر محدثین، مفسرین اور ائمہ فقہ کے اولیاء اللہ ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، اگر اُن کو علم غیب تھا تو ان کے درمیان
ث، تفسیر اور فقہ کے اختلافات ہی نہ پائے جاتے سب کی رائے ایک ہی ہوتی! حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ ایک مفسر ایک روایت
تفسیر میں صحیح سمجھ کر نقل کرتا ہے اور دوسرا مفسر اس کو غیر صحیح بتاتا ہے! کتنے بہت سے راویان حدیث ہیں جو محدثین
ہاں مختلف فیہ ہیں کسی کے نزدیک ثقہ، کسی کے یہاں وضاع اور کاذب! ایک محدث کے نزدیک ایک روایت سند عالی رکھتی ہے۔
ے کی تحقیق کی بنا پر اُس کی سند پست ہے! یہی حال فقہی مسائل کا ہے جن میں حلت و حرمت تک کا اختلاف پایا جاتا ہے!
زالی کتنے بڑے پایہ کے صوفی اور عالم گذرے ہیں آن کے نام کے ساتھ "حجۃ الاسلام" لکھا جاتا ہے مگر وہ اپنی کتابوں میں ضعیف
بعض اوقات موضوع حدیثیں تک ترغیب و ترہیب کے لئے نقل کر دیتے ہیں، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اولیاء اللہ عالم الغیب

نہیں ہوتے !

انسان اشرف المخلوقات ہے مگر وہ پرندوں کی طرح ہوا میں اُڑ نہیں سکتا، مچھلی کی طرح پانی میں زندگی نہیں گزار۔ انسان میں ان صفات کا نہ پایا جانا اُس کی کمتری کی دلیل نہیں ہے! اس لئے کہ ہوا میں اُڑنے اور پانی میں رہنے کے امور انسان سے متعلق نہیں کئے گئے! ایک ذرا سی پھانس بھی کسی کے بدن میں چبھ جائے تو وہ بے چین ہو جائے گا، مگر جانوروں کے جسموں پر کانٹے چبھے ہوتے ہیں اور مزے کے ساتھ جگالی کرتے ہوتے ہیں۔ تو انبیاء و اولیاء کو کائنات کے کارخانہ کو چلانے اور تمام دستگیری اور فریاد رسی کا اختیار نہ ملنا، اُن کی کمتری کی دلیل نہیں ہے کہ یہ امور اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں سب عاجز و بےکس اور کمتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق ہے اور وہی اس کا حقیقی مدبر اور رب ہے، وہ اس کار کسی کی شرکت کے بغیر چلا رہا ہے، ملائکہ سے جو وظائف (FUNCTION) متعلق ہیں اُن کا حال چاند اور سورج کی طرح کہ جس کام پہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو لگا دیا ہے وہ بے چون و چرا کئے جاتے ہیں! انبیاء کرام دنیا میں اس لئے مبعوث نہیں کئے گئے کہ شمسی میں کوئی فرق آ گیا تھا، یا زمین اپنے محور سے ہٹ گئی تھی، یا پودوں اور درختوں کی روئیدگی کی قوت ختم ہو گئی تھی یا گائے بانجھ ہو گئی تھیں اس قسم کے کسی نقص یا مصیبت کو دور کرنے کے لئے انبیاء کرام کو مبعوث نہیں فرمایا گیا! اس لئے ان کے بارے میں عقیدہ اور تصور قائم کرنا کہ انبیاء یا اولیاء کائنات کے نظام کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چلا رہے ہیں اور دنیا کو رزق، اولاد، صحت، توانائی یا خوشحالی دے رہے ہیں قطعاً غلط ہے، نقل اور عقل دونوں اس عقیدہ کو غلط ٹھہراتی ہیں۔

رشیوں اور منیوں کے روپ میں اللہ کا متشکل یعنی اوتار ہونا، دیویوں اور دیوتاؤں سے مرادیں مانگنا، غیر اللہ کو مشکل حاجت روا سمجھنا، کرشن اور رام چندر کی "جے" کے نعرے اس عقیدے کے ساتھ کہ وہ ان نعروں کو سن کر آشیرباد دے رہے ہیں، وفات شدہ بزرگوں کے بارے میں یہ عقیدہ کہ وہ دنیا پر مصیبت بھی لا سکتے ہیں اور دنیا کو مسرت و خوشحالی بھی دے سکتے ہیں، حضرت عزیرؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کو خدا کا شریک ماننے ہوئے، موحد ہونے کا بھی دعویٰ۔ اس قسم کے تمام عقیدے تصورات اور توہمات ہندوؤں، یہود، عیسائیوں اور مجوسیوں سے لئے گئے ہیں! عبداللہ ابن سبا نے اس عقیدے کو سب سے پہلے پھیلایا کہ حضرت علیؓ "معبود" ہیں اور وہ شہید نہیں ہوئے ہیں، ابن ملجم نے تو ایک شیطان کو قتل کیا تھا۔ جس نے آپ کی شکل میں روپ دھارا تھا، حضرت علیؓ بادلوں میں پوشیدہ ہیں، بادل کی گرج کی آواز ہے اور بجلی کی کڑک آپ کا کوڑا ہے!

یہ مجوسیت جس نے باطنیت اور قرامطیت کا قالب اختیار کر لیا، بہت سے چور دروازوں سے عجمی تصوف میں داخل ہو گئی! "متشابہات" جن کے پیچھے پڑنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا تھا رفتہ رفتہ عجمی تصوف کی زبان بن گئی اور دین میں مشرکانہ عقائد اور بدعات کا رواج ہوتا گیا۔ میکش اکبر آبادی اور حسن ثانی نظامی صاحب اسی مسلک کے ترجمان اور مبلغ ہیں۔

میکش صاحب نے اپنے مسلک کی تائید میں جو آیاتِ قرآنی اور احادیث پیش کی ہیں اُن کا تجزیہ ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں کیا جائے گا، اس پہلی قسط میں ہم نے اُن کے "علم کلام" کو عقلی اور نقلی دلیلوں سے بےاصل ثابت کیا ہے! کاش! ان حضرات کو حق پسندی اور حق بینی کی توفیق میسر آ سکے!

از مصطفیٰ نورانی

(دُعا)

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ	در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ

یارب میرے سینے میں ایسا دل دے جو باخبر ہو (بیدار ہو) جو کبھی تیری یاد سے غافل نہ رہتا ہو اور ہمہ وقت تیری ہی یاد میں تیرے ہی ذکر میں مشغول رہتا ہو اور تیرے احکام کا مطیع اور پابند ہو۔

ایں بندہ را کہ بانفسِ دیگراں نزیست	یک آہ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ

یہ تیرا بندہ دوسروں کے سہارے زندہ نہیں ہے تیرے ہی رحم وکرم کے سہارے زندہ ہے اور تیرے ہی رحم وکرم کا طالب ہے تو اپنے اس غلام کو صبح کی طرح آہِ خانہ زاد عنایت فرما۔

سیلم مرا بجوئے تنک مایہ مپیچ	جولانگہ بوادیٔ کوہ وکمر بدہ

میں ایک سیلاب ہوں مجھے چھوٹی نہر میں نہ ملا۔ بلکہ میری جولانگہ وادی اور پہاڑوں کے دامن میں ہونی چاہیے ——

سازی اگر حریفِ یمِ بیکراں مرا	با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ

تو نے اگر مجھے بحرِ بیکراں کا مقابل بنایا ہے تو مجھے موج کے اضطراب کے ساتھ گہر کا سکون بھی عطا فرما ——

شاہینِ من بصید پلنگاں گذاشتی	ہمت بلند وچنگل ازیں تیز تر بدہ

میں نے اپنے شاہین کو چیتوں کے شکار کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ تو میرے شاہین کو بلند ہمت اور تیز تر چنگل عطا فرما

رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار	تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ

میں طائرانِ حرم کے شکار کے لیے روانہ ہو چکا ہوں۔ وہ تیر جو ابھی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ کاش! کارگر ہو جاتے

خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد برفروز	ہر ذرۂ مرا پر وبالِ شرر بدہ

میری مٹی کو داؤدی نغموں کے نور سے سرفراز کر دے۔ اور میرے ہر ذرہ کو چنگاری کے بال وپر عنایت فرما

غزل (۱)

درون سینۂ ما سوزِ آرزو ز کجاست — سبو ز ماست و لے بادہ در سبو ز کجاست

ہمارے سینہ کے اندر آرزو اور خواہش کی آگ کہاں سے آئی ہے۔ صراحی تو ہماری ہے لیکن اس میں شراب کہاں سے آئی۔

گرفتم ایں کہ جہاں خاک و ما کفِ خاکیم — بہ ذرہ ذرۂ ما درد جستجو ز کجاست

میں اس بات کو مانتا ہوں کہ دنیا خاک کا ایک تودہ ہے اور ہماری حیثیت ایک مشتِ خاک کی سی ہے۔ لیکن ہما ذرہ میں اس قدر تلاش و جستجو کا اضطراب کہاں سے آیا ہے۔

نگاہِ ما بگریبانِ کہکشاں افتد — جنون ما ز کجا شور ہا و ہوز کجاست

ہماری نظر کہکشاں کے گریبان پر پڑتی ہے۔ ہماری یہ دیوانگی کہاں سے ہے اور اس طرح کا شور ناؤ ہو کہاں سے آیا ہے

غزل (۲)

غزل سرا و نواہائے رفتہ باز آور — بایں فسردہ دلاں حرف دلنواز آور

اپنی غزل سرائی سے گزشتہ نواؤں کو پھر سے دہرا۔ اور ان بجھے ہوئے دلوں کو حرف دل نواز سنا

کنشت و کعبہ و بتخانہ و کلیسا را — ہزار فتنہ ازاں چشم نیم باز آور

کنشت و کعبہ، بتخانہ و کلیسا میں اپنی نیم باز آنکھوں سے ہزاروں فتنے جگا دے۔

ز بادۂ کہ بخاکِ من آتشے آمیخت — پیالۂ بجوانانِ نو نیاز آور

وہ شراب جس نے میری مٹی میں آگ لگا دی ہے ان نئے عشق کرنے والوں کو اس شراب کا ایک پیالہ عطا کر

نئے کہ دل ز نوائش بسینہ می رقصد — مئے کہ شیشۂ جاں را دہد گداز آور

وہ بانسری کہ جس کی آواز سے دل سینے کے اندر رقص کرتے ہیں عطا کر اور وہ شراب دے جو روح کے شیشے کو پگھلا دے۔

بہ نیستانِ عجم بادِ صبحدم تیز است — شرارۂ کہ فرو می چکد ز ساز آور

عجم کے نیستاں میں صبح کے وقت کی ہوا تیز چل رہی ہے۔ میرے ساز کو ایسی لے بخش کہ جس کی آواز سے چنگاری ٹپک پڑے۔

غزل (۳)

اے کہ ز من فزودۂ گرمیِ آہ و نالہ را — زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را

اے گرمی بخشنے والے میرے نالوں اور آہوں کو اس قدر گرمی عطا کر کہ میری آواز کی گرمی سے ہزاروں سال کی خاک زندہ ہو

بادلِ ما چہا کنی تو کہ بہ بادۂ حیات — مستی و شوق می دہی آب و گِلِ پیالہ را

ہمارے دل کے ساتھ تو نے یہ کیا کیا کہ زندگی کی شراب سے پیالہ کے آب و گل کو بھی شوق و مستی دے دی ———

غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے — تازہ کن از نسیمِ من داغِ درونِ لالہ را

غنچۂ دل گرفتہ (زندہ غنچہ) کو میری آہ سے گرہ کشا کر دے۔ اور میری نسیم سے لالہ کے داغِ دروں کو تازہ کر دے

گزرہ وخیال من از مہ و مہر و مشتری   تو بہ کمین چہ خفتہ صید کن ایں غزالہ را

رہ مشتری کے حدود سے آگے نکل جاتا ہے۔ تو اپنے کمین گاہ میں کیا سویا ہوا ہے اٹھ! اور اس غزال کا شکار کر

جہ من نگاہ دار آبروئے گدائے خویش   آنکہ ز جوئے دیگراں پر نکند پیالہ را

اپنے اس گدا کی لاج رکھیو۔ وہ گدا جو دوسروں کی نہر سے اپنا پیالہ نہیں بھرتا بلکہ صرف تیرے ہی در پہ کاسۂ گدائی لئے کھڑا

رحمت کا امیدوار ہے۔

غزل (۴)

شتِ غبارِ ما صد نالہ برانگیزی   نزدیک تر از جانی با خوئے کم آمیزی

مشتِ خاک سے تونے سینکڑوں نالے پیدا کئے۔ کم کم ملنے کے باوجود تو ہماری شہ رگ کے بہت قریب ہے

موج صبا پنہاں دزدیدہ بباغ آئی   در بوئے گل آمیزی با غنچہ در آویزی

کی موج میں چھپ چھپ کر چوری چھپے باغ میں تو آتا ہے پھولوں کی خوشبو سے تو ملتا ہے اور غنچوں سے بغلگیر ہوتا ہے۔

رب ز تو بیگانہ مشرق ہمہ افسانہ   وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

بیگانہ ہے اور مشرق میں چاروں طرف تیرے ہی افسانے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ تو دنیا میں کوئی دوسرا نقش پیش کرے۔

لس کہ بسر دارد سودائے جہانگیری   تسکین جنونش کن با نشترِ چنگیزی

نفس جو اپنے سر میں جہاں گیری کا سودا رکھتا ہے اس کے جنون کی تسکین چنگیزی نشتر سے ہونی چاہیئے۔

بندہ بے قیدم شاید کہ گریزم باز   ایں طرۂ پیچاں را در گردنم آویزی

ایک بندۂ بے قید ہوں۔ شاید کہ تجھ سے بھاگ جاؤں اس لئے تو اپنی زلف پیچاں کو میری گردن میں ڈال دے تاکہ میں

پاؤں۔

نالہ نمی دانم گویند غزل خوانم   ایں چیست کہ چوں شبنم بر سینۂ من ریزی

ہے کہ میں آہ و فغاں کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہیں لوگ کہتے ہیں کہ میں غزل کہتا ہوں۔ اور یہ کیا چیز ہے جو شبنم کی طرح میرے

لی ہے۔ شاید اسی القا کا نام لوگوں نے میری غزل گوئی رکھ دیا ہے اور مجھے غزل گو کہہ رہے ہیں۔

غزل (۵)

اگرچہ تیرہ خاکم دل کہ ہست برگ و سازم   بنظارۂ جمالے چو ستارہ دیدہ بازم

مادۂ خاکی سے گوندھا گیا ہے اور میری حیثیت ایک مشتِ خاک ہے لیکن میرا سرمایۂ حیات دل ہی ہے۔ مگر تیرے جمال کے

لئے میری آنکھ ستارہ کی طرح کھلی ہوئی ہے۔

برائے زخمۂ تو ہمہ نالۂ خموشم   تو بایں گماں کہ شاید ز نوا فتادہ سازم

جم کھانے کی خواہش میں میں سراپا نالۂ خموش بنا ہوا ہوں۔ شاید تو سمجھ رہا ہے کہ میں آواز سے خالی پڑا ہوا ساز ہوں۔

ہمہ آں چناں کن کہ ز شعلۂ نوائے   دل خاکیاں فروزم دل نوریاں گدازم

آواز میں وہ بات پیدا کر کہ میں اپنی آواز کے شعلوں سے انسانوں کے دلوں کو گرما دوں اور روشن کردوں اور فرشتوں کے دلوں کو پگھلا دوں

تب و تابِ فطرتِ من ز نیاز مندیٔ من　　　تو خدائے بے نیازی نہ رسی بہ سوز و سازم

میری فطرت میں جو تڑپ ہے وہ میری نیاز مندی کی وجہ سے ہے۔ تو تو خدائے بے نیاز ہے اس لئے "نہ رسی بہ سوز و سازم"۔

بکسے عیاں نکردم نہ کسے نہاں نکردم　　　غزلؔ آں چناں سرودم کہ بروں فتادہ رازم

نہ میں نے کسی پر کچھ ظاہر کیا اور نہ کسی سے کچھ چھپایا۔ البتہ اتنی بات ضرور ہوئی کہ میں نے غزل کچھ اس انداز سے پڑھی کہ راز افشا ہو گیا۔

غزل (۶)

بہ صدائے دردمندی بنوائے دل پذیری　　　خمِ زندگی کشادم بہ جہانِ تشنہ میری

میں نے دردمندی کی صداؤں سے اور دل میں اترنے والے نغموں سے متاثر ہو کر پیاس سے مرنے والی دنیا کے لئے زندگی کی صراحی کا منہ کھول دیا۔

تو بہ روئے بے نوائی درِ آں جہاں کشادی　　　کہ ہنوز آرزویش نہ دمیدہ در ضمیری

تو نے ایک ایسے بے نوا کے سامنے دنیا کا دروازہ کھول دیا ہے کہ دنیا کی آرزو بھی ابھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

ز نگاہِ سرمہ سائے بدل و جگر رسیدی　　　چہ نگاہِ سرمہ سائے دو لشانہ زد بہ تیری

تیری نگاہِ سرگیں میرے دل و جگر تک پہونچ گئی اور ان دونوں کو زخمی کر دیا۔ واہ کیا سرگیں نگاہ ہے کہ ایک تیر سے دو نشانے لگاتی ہے۔

بہ نگاہِ نارسائیم چہ بہار جلوہ دادی　　　کہ بہ باغ و راغ نالم چو تذرو نو صفیری

میری نگاہِ نارسا کو تو نے اپنے جلووں کی بہار عطا کی ہے۔ جو باغ اور جنگل میں نئے آنے والے چکور کی طرح چہچہاتا پھرتا ہے۔

چہ عجب اگر دو سلطاں بہ ولایتے نگنجد　　　عجب ایں کہ می نگنجد بدو عالمِ فقیری

کیا تعجب ہے اگر ایک سلطنت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ ایک فقیر دونوں عالم میں نہیں سما سکتا۔

آگ ہی سے دھواں اٹھتا ہے .....
..... لیکن جب آپ ہمارے سگریٹ سلگاتے ہیں تو جو دھواں اٹھتا ہے
اس سے کئی گھر روشن ہوتے ہیں ۔ لوگوں کو روزی نصیب ہوتی ہے۔
جسم ڈھکتے ہیں اور بہت سے خاندانوں کو گھر میسر آتا ہے۔
ہمارے کاروبار سے ہزاروں آدمی کسی نہ کسی طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسان ہمارے
اعلیٰ سگریٹوں کے لئے تمباکو پیدا کرتا ہے۔ اس کو اچھے دام ملتے ہیں۔
جب ہمارے سگریٹ پیک ہو کر تجارتی تقسیم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو
وسیع پیمانہ پر تجارت اور معاشی رد و عمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح
سارے ملک میں کئی ہزار لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔
مزید یہ کہ جب ہم ٹرکوں، کشتیوں یا ریل کے ذریعے اپنے سگریٹ بازاروں تک پہنچاتے ہیں
یا جب ہم سگریٹ کی پیکنگ کے لئے گتہ، چھپے ہوئے پیکٹ یا گوند، پیکنگ کیس
خریدتے ہیں تو تجارت اور معاشی سرگرمی کو اور فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جب
سگریٹوں کے لئے پیکنگ کا تمام سامان پاکستان میں بننے لگے گا تو ملکی صنعت
اور زیادہ ترقی کرے گی۔
پاکستان ٹوبیکو کمپنی کو فخر ہے کہ وہ عوام کو خوشحال بنانے
میں مدد کرتی ہے اور وہ صرف اپنے ہی دفتروں اور کارخانوں میں
نہیں بلکہ دوسری صنعتوں میں اور زراعت میں بھی روزگار کے مواقع
پیدا کرتی ہے۔
PAKISTAN TOBACCO
PTC
COMPANY LIMITED
پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
پاکستان کی سگریٹ کی صنعت کے رہبر

محمد حفیظ اللہ پھلواری

فرمانروایانِ سلطنت مالوہ کے دور میں علمی ترقیاں

مالوہ کے حاکم دلاور خاں غوری نے ناصرالدین محمد شاہ تغلق کے مرنے کے بعد سنہ ۸۰۴ھ/ ۱۴۰۱ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا سلطنت
وہ تقریباً ڈھائی سو سال قائم رہی۔

جس زمانہ میں مالوہ میں خود مختار اسلامی ریاست قائم تھی۔ وہ علوم وفنون کے لئے دور دور تک مشہور تھی۔ شاہان مالوہ کا دارالحکومت
ادی آباد مانڈو علم وفن کا مرکز تھا۔ بڑے بڑے علماء وفلاسفر بیرون ممالک سے آتے اور خود قلمرو مالوہ کے مدرسوں سے بھی بے شمار فارغ التحصیل
کر نکلے و ثقافت میں سلطنت مالوہ کے بعض تاجداروں نے علم وفضل کی سرپرستی کی، ان کا دارالحکومت "مانڈو" شیراز وسمرقند کا ہمسر بنا۔
دکئی صدیوں تک اس کی علمی روشنی جزیرہ نما ہند کے ہر گوشہ کو منور کرتی رہی انہوں نے محلات، مساجد اور دیگر عمارات پر اس قدر دولت
رف کی کہ مدت تک اس اجڑے ہوتے دارالریاست کے نقش ونگار ہند وپاکستان میں بے مثل سمجھے گئے۔ اکبر کے عہد میں یہاں کے عالیشان محل
ہند اور دہلی کے مسافروں کو شرمندہ کرتے تھے۔ (شاہانِ مالوہ از مولوی امیر احمد)

ہوشنگ غوری۔ (۸۰۸ - ۸۳۷ھ) بڑا علم دولت اور درویش پرست تھا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے علماء وفضلاء اور اہل کمال
تھے۔ اس نے مانڈو میں ایک شاندار مسجد بنوائی اور مدرسہ قائم کیا۔ مشرق کے ایک بزرگ مخدوم قاضی برہان الدین مانڈو تشریف لائے، سلطان
ہوشنگ آپ کا مرید ہوگیا۔ بادشاہ کا عدل وانصاف پہلے ہی شہرت پا چکا تھا۔ اب اس کی عدل وعلم دوستی بھی مشہور ہوئی اور علماء وفضلا گروہ درگروہ
دارالسلطنت مانڈو میں آکر بسنے لگے۔

سلسلہ قلندریہ کے سرگروہ حضرت سید نجم الدین غوث الدہر حج وزیارت سے فارغ ہوکر ہندوپاکستان واپس آئے تو مانڈو میں گزر
ہا۔ منصف بادشاہ کی درویش دوستی ونیاز مندی نے قدم پکڑے۔ قلعہ شاہی سے پانچ میل فاصلہ پر قصبہ نالچہ میں آپ نے سکونت اختیار کی۔
آپ کی شہرت سن کر دور دور سے فقراء آکر مانڈو میں جمع ہوگئے۔ (شاہان مالوہ)

محمود خلجی (۸۳۹ - ۸۷۳ھ) بڑا علم پرور فرماں روا تھا۔ وہ عنفوان شباب سے فقیروں کا نیازمند اور علماء وفضلا کا خادم تھا۔
ب خود مختار ہوا تو سلطان ہوشنگ کی جمع کی ہوئی دولت جو اس نے کرلا، جوش بھیم وغیرہ کی فتوحات میں اکٹھا کی تھی۔ فقرا اور علماء کی خاطر ومدارات
میں بے دریغ صرف ہونے لگی۔ بادشاہ نے علوم وفنون کی قدر دانی کی تو تمام اراکین سلطنت علم دوست ہوگئے (شاہان مالوہ)

محمود نے اپنے عہد حکومت میں علماء، فضلا اور ارباب علم کی اس قدر حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی مالوہ ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ اس نے کثرت سے مدارس اور دار العلوم قائم کئے۔ مانڈو کے دار العلوم کی شہرت سارے ہندو پاکستان میں تھی۔ بڑے بڑے علماء فضلا اس کے عہد میں موجود تھے۔ سلطان ان کی اور طلبا کی سرپرستی کرتا۔

محمود کا عہد حکومت شاعری اور موسیقی میں بھی مشہور تھا۔ جس مقام سے کسی اہل کمال کی خبر اس کے گوش زد ہوتی، بادشاہ فوراً روپیہ ارسال کرکے اس کو طلب کرلیتا تھا۔ سلطان محمود نے اپنی مملکت میں مدرسے قائم کرکے علماء، فضلاء و طلباء کے وظائف مقرر کئے اور درس و تدریس کے جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ سلطان محمود خلجی کے ایام حکومت میں مالوہ رشک شیراز و سمرقند بن گیا۔

وہ علم و ہنر کا قدر شناس، تعلیم کا ترقی دینے والا، طلباء کا دستگیر و معاون، علماء و فضلاء کی عزت کرنے والا شخص تھا۔

(راجستھان جلد اول)

محمود خلجی کی عظمت و شوکت کا چرچا ہند و پاکستان سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک کے سلمانوں تک پہونچ گیا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے:-

"خواجہ جمال الدین الہ آبادی از جانب سلطان ابوسعید مرزا باگزیں ارمغان (قیمتی تحفوں) پیش آورد بار"

یعنی تیمور کے پوتے نے دربار مانڈو میں اپنی سفارت بھیجی تھی۔ ہند و پاکستان کی اس نئی طاقت و حکومت کا شہرہ سن کر حسب دستور مختلف بلاد و امصار سے لوگ شادی آباد کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، علماء اور صلحاء کو اپنے شہر میں لاکر بسانے اور اپنے ملک میں آباد کرنے کا محمود کو خاص شوق بھی تھا۔ مآثر رحیمی میں محمود خلجی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"چوں سلطنت با وقار گرفت و ترتیب علماء و فضلاء کوشیدہ مدارس ساخت"

اس نے صرف یہ نہیں کیا تھا بلکہ

"زر بہ اطراف واکناف عالم فرستادہ مستعدان را طلب داشت"

اس کتاب میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے اس عجیب و غریب ذوق و شغف کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں مالوہ کے جنگلوں کے بیچ یہ شہر...... "در زمان او یونان ثانی گشت"

اطراف واکناف عالم میں روپے بھیج بھیج کر جن اہل علم و کمال کو محمود خلجی نے بلایا تھا۔ ان میں حضرت امام محمد بن حسن الشیبانی صاحب ابی حنیفۃ الامام کے خاندان کے ایک بزرگ بھی تھے، جنہیں بادشاہ نے "تاج الافاضل" کا خطاب دیا تھا۔

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت)

محمود خلجی نے کا بنایا ہوا ایک مدرسہ سارنگ پور میں بھی تھا (ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں) چتوڑ پر حملہ کرنے کی غرض سے گیا تو محمود نے راستے میں بہت سے مدارس اور مساجد تعمیر کی تھیں۔

المختصر یہ زمانہ سلطنت مانڈو کا عہد زرین تھا، علماء، حکماء، فقراء، صوفیاء کرام کا مجمع تھا۔ دولت کی افراط تھی۔ ہر سال مال غنیمت میں کروڑوں روپیہ آتا اور مستحق لوگوں کو حسب قدر مراتب تقسیم ہوتا تھا۔ شاعری اور موسیقی کی بھی گرم بازاری تھی۔ یوں کہنا چاہئے کہ اس وقت مانڈو گڑھ، جہانگیر اور شاہجہاں کی دہلی کا نقش اول تھا۔

نریندرا ناتھ لکھتا ہے کہ مالوے کے شاہی خاندان میں سلطان محمود خلجی نے علم و ادب کو بہت فروغ دیا۔ اس نے تیس سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ ———— اس طویل عرصے کے دوران وہ ہمیشہ علماء و فضلا کی قدر کرتا رہا جس کا

یہ تھا کہ مالوہ اہل علم کا ملجا و ماوا بن گیا۔ اور ـــــ بہت سے ممتاز فلسفی اور علما غیر ممالک سے مالوہ پہونچے۔

بہت سی درسگاہوں میں سے جنہیں سلطان محمود نے قائم کیا تھا ایک مانڈو میں سلطان ہوشنگ کی مسجد کے بالمقابل واقع تھی
درسگاہ کے بالمقابل اس نے ایک خوبصورت سات منزلہ بلند ستون بنوایا تھا۔ یہ ستون چتوڑ کے رانا کنبھ سے ایک مقابلہ ــ کے بعد
واپس آکر تعمیر کرایا تھا۔ (فرشتہ)

مالوے میں اس زمانہ کا بہت بڑا عالم شیخ چاند تھا۔ محمود علمی مذاق رکھتا تھا وہ اپنی فرصت کے اوقات کتب تاریخ اور دنیا
بادشاہوں کے حالات سننے میں صرف کرتا تھا۔ اب سلطان مالوہ کا آفتاب نقطۂ نصف النہار پر پہونچ چکا تھا۔ تمام ہندوستان میں
فوجی قوت مالوہ کے مدمقابل نہ تھی۔ خلیفۂ عباسی نے اس کو "محافظ المسلمین" تسلیم کرلیا تھا۔ مانڈو کے کالجوں اور مدارس کا پورے
ملک میں شہرہ تھا۔ بڑے بڑے زاہد اور علما اس خطہ کو دارالامن سمجھ کر یہاں وارد ہوتے تھے۔ شیخ علاؤالدین علمائے وقت کے سردار تھے
جب تشریف لاتے تو سلطان بذات خود ان کے استقبال کو گیا اور ان کے علم و فضل کی بزرگی کے پیش نظر ان کو سواری سے اترنے نہ دیا بلکہ
گھوڑے کی پیٹھ پر بغلگیر ہوتے۔

فرقہ نوربخشی کے بانی سید محمد نوربخش کے نائب مولانا عمادالدین سلطان کے لئے اپنے پیر کا خرقہ بطور تبرک لائے۔ سلطان نے اس تحفہ کو
نعمت کبریٰ سمجھ کر علما اور مشائخ کی دعوت کی اور نہایت مسرت و عقیدت کے ساتھ خرقہ زیب تن فرمایا۔

شیخ عزیزاللہ چشتی جو اپنے عصر میں المتوکل علی اللہ کے لقب سے مشہور تھے، مالوہ کی امن و عافیت کا آوازہ سن کر اسی نواح میں وارد ہوئے
شہر کے قریب پہونچے تو سلطان محمود کے پاس پیام بھیجا کہ میں اس شرط سے دارالسلطنت میں آؤں گا کہ بادشاہ استقبال نہ کرے نہ ملنے آئے
نہ کچھ ہدیہ بھیجے۔ سلطان نے یہ شرائط منظور کیں اور آپ کے قدم سے شہر مانڈو کو رونق حاصل ہوئی (ماخوذ از شاہان مالوہ)

غیاث الدین خلجی (۱۴۶۹ء-۱۵۰۰ء) کو تعلیم نسواں سے انتہائی دلچسپی تھی۔ اس نے عورتوں کو فوجی تعلیم دلوائی تھی۔ مورخ فرشتہ
کے بیان کے مطابق اس کے محل سرا میں ایک ہزار عورتیں حافظ قرآن تھیں۔ محل سرا میں مدرس، فقیہہ، مفتی، منجم، غرض ہر قسم کی عورتیں تھیں۔ ایسی
عورتیں بھی تھیں جو فن زرگری، آہن گری وغیرہ میں بھی ماہر تھیں۔ حکومت کی جانب سے بہت سی استانیاں مقرر کی گئی تھیں، جو شہر کے مسلم گھرانوں
کی پردہ نشین عورتوں کو تعلیم دیا کرتی تھیں۔ سلطان غیاث الدین خلجی نے ایک مدرسہ ظفرآباد نعلچہ میں تعمیر کرایا تھا، جو سلطان محمود ثانی کے عہد
حکومت تک قائم تھا۔

"مراۃ احمدی" کے مصنف کا بیان ہے کہ ہر طالب علم کو اس کے استاد کی سفارش پر امداد دی جاتی۔ یہ سفارش استصواب کی غرض سے صوبہ
کے صدر کے پاس بھیجی جاتی اور پھر صوبائی خزانے ہی سے امداد تقسیم کی جاتی۔

تعلیم کے لئے بعض جاگیریں دی جاتی تھیں جو نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس مد میں حکومت کی طرف سے ذیل کی امداد
دی جاتی تھیں۔ (۱) ایک کروڑ بیس لاکھ دام زمین کے محاصل (۲) پچاس ہزار بیگھہ زمین (۳) ایک سو تین دیہات (۴) ایک لاکھ چالیس ہزار
روپے نقد خزانہ عامرہ سے۔ جو امداد منصب دار خود اپنے خزانے سے دیتے تھے، وہ اس کے علاوہ تھی۔

سلطان غیاث الدین نماز پنج وقتہ کا سخت پابند تھا۔ ایک پہر رات رہے سے بیدار ہو کر درگاہ بے نیاز میں گڑگڑانا شروع کرتا۔
اہل حرم کو تاکید تھی کہ نماز تہجد کے لئے اس کو ضرور بیدار کریں اور اگر وہ نہ اٹھے تو اس کے چہرہ پر پانی چھڑک کر ہوشیار کریں اور ہاتھ پکڑ کر
بستر سے کھینچ لیں۔

یہ بادشاہ تیس برس مسند ریاست پر متمکن رہا لیکن نہ تو ملک میں کوئی بغاوت ہوئی اور نہ مالوہ کے کسی حصہ پر کوئی دشمن متصرف ہو سکا

اس کا تمام عہد حکومت امن و عافیت میں بسر ہوا۔ علوم و فنون اور صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی نصیب ہوئی۔

شیخ عبداللہ شطاری اسی عہد میں مانڈو کو مالا مال بنائے ہوئے تھے ..... ان کی تالیفات سے ایک رسالہ لطائف غیبیہ سلطان غیاث الدین کے نام سے معنون تھا۔ اس میں اسرار توحید و حقائق الہیٰ شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں۔

مولانا علم الدین شرف جہاں جنہوں نے حرمین شریفین میں مشائخ حدیث سے سند حاصل کی تھی۔ اس امن و عافیت کے زمانہ میں دارلسلام کی رونق بڑھاتے ہوئے تھے ...... شیخ سعداللہ لاری جن کو فرشتہ نے "شیخ المحدثین والمفسرین" کے لقب سے یاد کیا ہے اس دور میں مانڈو کو رشک سمرقند و نیشاپور بنائے ہوئے تھے۔

صوبہ مالوہ کی اسلامی تعلیمی یادگاروں میں اجین کا مدرسہ بھی قابل ذکر ہے جس کے بانی کی تصریح نہیں مل سکی۔ اس مدرسہ کی شکستہ عمارت گذشتہ صدی تک باقی تھی۔ مصنف تزک افغانی اس کی نسبت لکھتا ہے:—

"یہاں ایک مدرسہ عالی شان بادشاہی تھا، اس کے حجرے اب تک باقی ہیں ...... (آثار خیر)

ہائے! کیا زمانہ تھا، ہر طرف امن و امان! علم و فضل کی ترقی کے لئے کشادہ میدان، شرافت و نیکی کا دور دورہ! دین و شریعت کی حدود کی نگہداشت!

سلہ کوئی عہد رفتہ کو آواز دینا

جناب شورش کاشمیری

روحِ انتخاب

خلافت و ملوکیت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک ایسی تصنیف ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اپنے ...ت کی بہترین تصنیف ہے۔ پاکستان میں علم کا دینی سرمایہ اس کتاب پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ غالباً کیا؟ یقیناً اس سے پہلے ...پر کسی مصنف اور مفکر نے اس جامعیت کے ساتھ قلم نہیں اٹھایا۔

خلافت و ملوکیت
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرۂ آفاق تصنیف

...ہر ہے کہ مولانا کو اپنے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں لیکن حقیقت ...اعتماد، یقین، استدلال، علم، گہرائی، حسن اور گیرائی کے ساتھ ...ذکار پر قلم اٹھاتے اور دین حق کی نمائندگی کرتے ہیں معلوم ہوتا ...دماغ پاکستان میں قدرت کا عطیہ ہے۔ ...اس زمانے میں کسی شخص کو اسلام کے عنوان سے تحریر پر اتنی قدرت ...ولانا کو ہے وہ دقیق سے دقیق مسئلے اور نازک سے نازک نکتہ کو ...سے ادا کرتے ہیں کہ انسان اس میں ڈوب جاتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ...دماغوں کی پرستش کی بجائے پرستش کی طرف لے جاتے ہیں اور ...حق کی منزل پہ پہنچا کر دم لیتے ہیں۔

۲۔ قدرت نے انہیں علیم و بصیر دل اور فہیم اور زیرک دماغ بخشا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر فہم دین کی راہیں کھول دی ہیں۔

۳۔ انہوں نے دین کو فرقی تیکدوں سے نکال کر عوامی شاہراہوں پر اس کی عظمت اور اس کی وجاہت کے ساتھ اس طرح پیش کیا ...اس و عوام دونوں کے لئے آسان ہو گیا ہے۔

ان کی بدولت پاکستان میں دین محض **تلاوت** کی چیز نہیں رہا **دعوت** ہو گیا ہے لوگ اس کو محض ثواب کے لئے نہیں پڑھتے بلکہ ...نقلاب کے لئے سوچتے ہیں۔

۴۔ جہاں تک اسلام اور اس کی دعوت کا تعلق ہے ساری دنیائے اسلام میں ایک شخص بھی مولانا کے ساتھ شانہ ملا کر کھڑا نہیں ہو سکتا ...س کی ایک متحرک تصویر ہیں ان سے کسی رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن دین کے معاملہ میں ان کی دیانت پر حرف گیری کرنے کی جسارت ...کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی حیثیت عرفی پر غور و فکر کی زحمت ہی گوارا نہیں فرمائی ہے۔

خلافت و ملوکیت کا موضوع بحث مولانا کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:-

"اسلام میں خلافت کا حقیقی تصور کیا ہے؟ کن اصولوں پر وہ صدر اول میں قائم ہوئی تھی؟ کن اسباب سے وہ ملوکیت میں تبدیل ہوئی، کیا نتائج اس تبدیلی سے رونما ہوئے، اور جب وہ رونما ہوئے تو ان پر امت کا ردِ عمل کیا تھا۔"

۳۵۱ صفحہ کی اس کتاب میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ ان سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، کوئی لفظ فالتو نہیں، کوئی حوالہ غیر ثقہ نہیں۔ الفاظ کی مینا کاری سے کامل اجتناب برتا ہے جوابات کا لب و لہجہ انتہائی شگفتہ اور مستدل ہے۔ ساری تحریر طبی نسخہ کی طرح ہے ایک لفظ اٹھا کر ادھر اُدھر کر دیں تو پورا نسخہ بے کار ہو جاتا ہے۔ انسانی اعضاء کی طرح کتاب کے اعضاء استوار ہو گئے ہیں ہم کسی باب کو الگ کر کے موضوع و مبحث کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ کتاب کے ۹ باب ہیں۔ آخر میں کوئی ۵۲ صفحوں کا ضمیمہ ہے جس میں ان سوالات و اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو اس کتاب کے بارے میں بعض دماغوں میں اصلیت معلوم کرنے کے پیدا ہوئے یا پھر جن اعتراضات کو ان لوگوں نے وضع کیا جن کے نان نفقہ کا انحصار مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے معاندت پر ہے لیکن ان کے "شور و شغب" سے کمتر درجے کے دماغ متاثر ہوتے ہیں۔ جن سوالوں یا اعتراضات سے بغض جھلکتا ہو، اُن کا جواب دینے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور نہ شروع سے آج تک ان لوگوں کو ان اکابر نے کبھی منہ لگایا ہے جن کی فکر و نظر کی شعبدہ تاریخ کے محرابوں میں صدیوں سے گردش چلی آ رہی ہیں۔

باب اوّل میں قرآن کی سیاسی تعلیمات کو بکمال و تمام پیش کیا گیا، یہ مولانا کے قرآن سے شغف کا معجزہ ہے کہ انہوں نے سیاسی تعلیم کے متعلق تمام آیات کو یکجا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے کسی نے بھی اس ترتیب سے آیاتِ ربانی کو جمع نہیں کیا اور نہ اُن کے مطالب و معانی کی اس طرح سے تشریح کی ہے۔

دوسرا باب اسلام کے اصولِ حکمرانی سے متعلق ہے تیسرے باب میں خلافتِ راشدہ اور اس کی خصوصیات کا جائزہ لیا اور اس سے حکیمانہ نتائج اخذ کئے ہیں۔ چوتھا باب "خلافتِ راشدہ سے ملوکیت تک" کے زیرِ عنوان ہے بڑا جامع باب ہے، مولانا نے اپنی تاریخی بصیرت کے نوادر پیش کئے ہیں۔ پانچواں باب خلافت اور ملوکیت کا فرق کے عنوان سے ہے اس کے مطالعہ سے نہ صرف دماغی آلودگیاں صاف ہوتیں بلکہ کوتاہ بینوں کے اعتراضات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ مزید برآں تحقیق و انتقاد کو کئی راہیں ملتی ہیں۔

باب ششم مسلمانوں میں مذہبی اختلافات کی ابتداء اور اس کے اسباب پر ہے۔ باب ہفتم میں امام ابوحنیفہؒ کے آثار و افکار اور اجتہاد و تفقہ کا مسئلہ زیرِ بحث کے ضمن میں جائزہ لیا ہے باب ہشتم میں خلافت اور اس کے متعلق مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر روشنی ڈالی ہے تاکہ موضوع کے تشنہ گوشے واضح ہو جائیں۔ باب نہم میں امام ابویوسف اور اُن کے کام کی صراحت کے بعد اصل موضوع میں وزن پیدا کیا گیا ہے۔

ان تمام اوراق کو پڑھنے کے بعد کسی صفحہ سے یہ معلوم یا مترشح نہیں ہوتا کہ

۱۔ مولانا نے کسی خلیفہ راشد کے متعلق سوءِ ادب کا ارتکاب کیا ہے جو کچھ لکھا حوالے اور مستند الیوں کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔

۲۔ مولانا کی گرفت تاریخ پر ہے صحابہؓ پر نہیں اور نہ کبھی اپنے قلم سے اس لغزش کے مرتکب ہوتے ہیں۔

۳۔ اللہ اور رسولؐ کے سوا کسی بڑے سے بڑے انسان کا فعل یا قول حجت نہیں۔ اختلاف فکر و نظر کے معاملہ میں ہو تو جرم نہیں بلکہ فکر و نظر کے عقدوں تک رسائی حاصل کرنے کا معروف ذریعہ ہے۔

۴۔ معترضین نے اس کتاب پر جو اعتراض جس انداز میں وارد کئے ہیں وہ خود ہی اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اُن کا منشا مقصود کیا ہے ــــ مخلص ہوں تو اصل ماخذ اُن کے سامنے ہیں یہ لوگ آن کے بارے میں ارشاد فرمائیں؟ یا پھر ان اکابر امت کی آراء کے متعلق فرمائیں جن کے اسی بحث میں حوالے موجود ہیں۔

مولانا نے اُن کی روایتوں، اُن کے نظریوں اور ان کے اجتہاد کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ اپنی بحث کے مختلف زاویوں میں شریک کیا ہے۔

۵۔ کتاب علمی اور موضوع سیاسی ہے لیکن جو لوگ جذبہ ہو رہے ہیں وہ ذاتیات کے گنبد میں سیاسی گماشتے ہیں۔ اُن کے سامنے کتاب سے زیادہ مصنف اور عشقِ عثمانؓ کی بہ نسبت بغض مودودی ہے۔

موضوع کی بنیادی بحث اس پر ہے کہ (بہ الفاظِ مصنف)

۱۔ قرآن وسنت کی رو سے اسلامی ریاست کے قواعد اسلام کے اصولِ حکمرانی کیا ہیں ؟

۲۔ خلافتِ راشدہ کی وہ اصل خصوصیات کیا ہیں جن کی بنا پر وہ خلافت علیٰ منہاج النبوت قرار دی جاتی ہے ؟

۳۔ اس خلافت کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آئی یا نہیں ؟

۴۔ اگر آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ ملوکیت نہیں آئی تو کیا بعد کی حکومتوں میں علیٰ منہاج النبوۃ کی خصوصیات موجود تھیں ۔

۵۔ اگر آپ مانتے ہیں کہ ملوکیت آگئی تو وہ کن اسباب سے کس طرح آئی ؟

۶۔ کس مرحلے پر آپ یہ کہیں گے کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی ؟

۷۔ خلافتِ راشدہ اور اس ملوکیت میں وجوہِ امتیاز کیا ہیں اور ایک کی جگہ دوسری کے آنے سے فی الواقع فرق کیا واقع ہوا ؟

۸۔ کیا اسلام میں خلافت اور ملوکیت دونوں یکساں ہیں ؟ یا ان میں سے ایک نظام اس کی نگاہ میں مطلوب ہے اور دوسرا نظام صرف ...میں قابلِ برداشت ہے جبکہ اس کو تبدیل کرنے کی کوشش زیادہ بڑے فتنے کی موجب نظر آتی ہو ؟

فرمایئے یہ سوالات موجود نہیں ؟ اور اس کا جواب اس سے مختلف کیا ہے جو خلافت و ملوکیت میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم سے نکلا ہے

کیں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حاصلِ مطالعہ

...فت و ملوکیت کے مطالعہ سے ان لوگوں کے لئے تاریخی شعور کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں جو ذہنی طور پر مسلمان ہیں لیکن سیاسی طور پر محسوس کرتے ہیں ...ام عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔

...کتاب کے مطالعہ سے ان حقیقتوں کی نشاندہی ہوتی ہے جن پر منبر ومحراب کے برہمنوں نے پردہ ڈال رکھا ہے ۔

...کتاب سے مسلمانوں کی نئی پود کے ذہنی کانٹے صاف ہو جاتے ہیں ۔

...کتاب کا مطالعہ ہم میں ان " دانشوروں " سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے جو فی زمانہ اسلام کو ماضی کی ایک طاقت لیکن حال کے ...ترکہ میراث قرار دیتے ہیں ۔

...کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کوئی جامد شئے نہیں کہ ہم اس کے نقوش دتاثرات احوال و مظاہر اور سوانح و وقائع کا جائزہ نہ لے سکیں ۔

...کتاب سے اس امر کی حدود متعین ہو جاتی ہیں کہ ادب احترام اور تنقید و تاریخ میں فرق کیا ہے ادب احترام کے مسلمات تنقید و تاریخ کی سان ...پنج کر بھی قائم رہتے بلکہ اجاگر ہوتے ہیں ۔

...کتاب ہمیں ان سوالات کا جواب دیتی ہے جو اس زمانہ کے علوم کی شدتوں نے نوجوان دماغوں میں پیدا کئے اور سلسل مچا دیا ہے اور جس کا جواب ...سے منبر ومحراب کی ایک خاص مخلوق عاجز ہے بلکہ اس کے بس سے باہر ہے ۔

...کتاب اپنے موضوع کے دائرے میں دین کی سمجھ، تاریخ سے آشنائی، تنقید کا شائستہ لہجہ اور استدلال کا زور مہیا کرتی ہے ۔

...کتاب کے مطالعہ سے قرآن پر غور وفکر کی عادت پیدا ہوتی، تاریخ کا مذاق ابھرتا اور بزرگوں کی بشریت کے محاسن کا احساس ہوتا ہے ۔

...کتاب ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو اسلام سے رزق تو ڈھونڈتے ہیں لیکن اسلام پر سوچتے نہیں ہیں ۔

...علم اور فراست کو ہر زمانہ میں ایک خاص گروہ کا سامنا رہا ہے مثلاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اہل کوفہ کی بابت فرمایا تھا کہ

"ان لوگوں نے بہرحال اعراض و انکار کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ مجھے ان لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جن میں بوڑھوں کی ہمت، عورتوں کی عقل اور بچوں کی ضد رچ بس گئی ہے۔"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے تشریحی نکتہ چینیوں میں جو لوگ پیش پیش ہیں اور جن کے "فقہی دیوان خانے" سے اس کتاب کی نصابا کا مطالبہ ہوا ہے اُن کی تصویر بھی ہو بہو یہی ہے۔ یہ لوگ بگلے کی طرح گھات میں رہتے، شیر کی طرح غراتے، بھیڑیے کی طرح جھپٹتے اور خرگوش کی رفتار سے بھاگتے ہیں۔

…زیدی

دل کے معاملات کا شکوہ فضول ہے
شکوہ پھر اُن کی بات کا شکوہ فضول ہے

کس کی خطا پہ کس کو سزا یہ نہ دیکھیے
ترتیبِ واقعات کا شکوہ فضول ہے

غم کو دوام ہے نہ مسرت ہے جاوداں
دنیائے بے ثبات کا شکوہ فضول ہے

ہمت شکن ہیں گردشیں لیل و نہار کی
دن کا گلہ نہ رات کا شکوہ فضول ہے

بارِ حیا سے اُن کی نگاہیں نہ اُٹھ سکیں
اس تازہ واردات کا شکوہ فضول ہے

غم اور حیات لازم و ملزوم ہیں عروج
یعنی غمِ حیات کا شکوہ فضول ہے

…ارث القادری

کیا مطمئن ہوں عشرتِ عمرِ رواں سے ہم
جانا وہیں ہے آئے ہیں اے دل جہاں سے ہم

ناصح! تجھے پڑی ہے نشیب و فراز کی
آگے نکل گئے حدِ سود و زیاں سے ہم

منہ دیکھ کر جو بانٹ رہا ہو چمن میں پھول
باز آئے ایسے تنگ نظر باغباں سے ہم

وارث پھر آج گم ہے زمانہ کی روشنی
کیوں کام لیں نہ اپنے ہی سوزِ نہاں سے ہم

فطرت ہے یہ بشر کی دنیا میں آ کے روئے
یا رو کے مسکرائے یا مسکرا کے روئے

فریاد جب چمن میں ٹھہری صدا بہ صحرا
دیوانگانِ الفت صحرا میں جا کے روئے

زندگی اور بڑھے، عیش کرے شاد رہے
جس نے برباد کیا ہم کو وہ آباد رہے

مجھ سا دیوانہ بھی مشکل سے نظر آئے گا
کہ ستم بھول گیا اور کرم یاد رہے

ایسے گلشن سے تو ویرانہ ہی بہتر ہے جہاں
اک نشیمن کو لگے آگ اک آباد رہے

محمد خاں نشتر

وہ بات بات پہ پہلی سی برہمی نہ رہی
ہمارے بعد کسی سے وہ بے رخی نہ رہی

یہ انقلاب زمانہ بھی ہم نے دیکھ لیا
کہ خواجگی تو رہی بندہ پروری نہ رہی

سحر نے قافلہ کہکشاں کو لوٹ لیا
"پھر اس کے بعد ستاروں میں روشنی نہ رہی"

تلاشِ زیست میں برسوں بھٹکنے والوں کو
ملا جو چشمۂ حیواں تو تشنگی نہ رہی

ہماری نظر میں

قرآن محکم از:- حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی، ضخامت ۱۲۰ صفحات (مجلد، دیدہ زیب سرورق) قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:- مجلس معارف القرآن دارالعلوم دیوبند۔

دارالعلوم دیوبند میں "مجلس معارف القرآن" قائم ہوئی ہے، جس کا مقصد مجلس کے منشور میں یہ بتایا گیا ہے:-

"اردو، عربی اور انگریزی زبانوں میں حقائق کتاب وسنت اور اسلاف واکابر کے نقوش علم وحکمت کو بنیاد قرار دے کر عصر حاضر کے نو پید "لسانی تقاضوں" اور "نو خیز فکری مسائل" پر ملت اسلامیہ کے لئے قلمی رہنمائی مہیا کی جائے۔"

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب متعنا اللہ المسلمین لطول حیاتہ اس قرآنی اکیڈمی کے سرپرست ہیں، اسی مجلس نے اس کو کتابت وطباعت کے خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، مولانا قاری محمد طیب صاحب نے "کلمات طیبات" کے عنوان سے پیش لفظ مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

جناب مولانا محمد عبدالصمد رحمانی دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن اور نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ ہیں۔ مولانا موصوف کے فضل وکمال کا اعتراف قاری محمد طیب صاحب نے اپنے پیش لفظ میں کیا ہے۔

قرآن کریم میں نسخ ہے یا نہیں؟ —— نسخ ہے تو کس قسم کا نسخ ہے؟ —— نسخ سے مراد کیا ہے؟ اس پر قرآنی علوم کے جاننے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے، متقدمین علماء میں جو حضرات نسخ کے قائل ہیں اس معاملہ میں اُن کی فراخدلی کا یہ عالم ہے کہ قرآن کریم کی پانسو سے آیتوں کو منسوخ قرار دیا ہے، دوسری طرف متاخرین علماء ہیں جو کم وبیش پانچ آیتوں میں نسخ تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی تحقیق میں منسوخ آیتوں کی تعداد کئی سو آیتوں کے مقابلہ میں صرف انیس رہ جاتی ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ:-

"اُن انیس آیتوں میں سے بھی چودہ آیتوں کی تطبیق دے کر دنیا پر احسان عظیم کر گئے (فجزاہ اللہ خیرالجزا) رہیں پانچ آیتیں تو اُن کی تطبیق بھی علمائے سلف وخلف کے اقوال میں ملے گی، جس سے فیصلہ ہو جائے گا کہ واقعتہً قرآن مجید کی کسی آیت میں نسخ نہیں ہے" (ص۱۳)

فاضل مصنف نے ان پانچ آیتوں کی تطبیق دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن کریم میں ایسا نسخ موجود نہیں ہے کہ حکم تو منسوخ ہو گیا اور وہ آیت تبرک کے طور پر قرآن میں موجود ہو۔ صفحہ ۱۹ پر صاحب موصوف لکھتے ہیں:-

"اس رسالہ کا موضوع "امکانِ نسخ" کا انکار نہیں ہے بلکہ "وقوعِ نسخ" کا یعنی قرآن شریف میں ناسخ و

منسوخ آیات نہیں :

اس موضوع پر مولانا عبد الصمد رحمانی صاحب نے جن عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ بحث فرمائی ہے سچ تو یہ ہے کہ اس موضوع و بحث کا حق ادا کر دیا ہے! مولانا موصوف نے مثبتین نسخ کے دلائل کا بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ رد کیا ہے۔ اور یہ ثابت فرما دیا ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت بھی منسوخ نہیں ہے۔

راقم الحروف بھی قرآنی آیات کے نسخ کی بحث کتابوں میں پڑھ کر سخت خلجان محسوس کرتا تھا اور دل چاہتا تھا کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جن پانچ آیتوں سے نسخ منسوب کیا ہے، کوئی خدا کا بندہ ان میں بھی تطبیق دے کر، قرآن کریم میں وقوعِ نسخ کیلئے گنجائش باقی نہ رہنے دے! "قرآن محکم" کو پڑھ کر راقم الحروف کے دل کی تمنا برآئی اور مصنف کے لئے دل سے دعائے خیر نکلی۔

جناب مولانا عبد الصمد رحمانی نے "قرآن محکم" لکھ کر، دین کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے اور بہت بڑے ذہنی خلجان کو دور فرمایا ہے کاش! اُن کو مولانا مودودی جیسا اندازِ نگارش میسر آجاتا، تو اُن کی تحریریں اور زیادہ دل نشین ہو جاتیں۔

حجۃ الاسلام

از :- حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، ضخامت ۷۶ صفحات (بڑا سائز) قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- مجلس معارف القرآن، دار العلوم دیوبند۔

اب سے نوے (۹۰) سال قبل ۱۸۷۶ء میں پادری نولس اور منشی پیارے لال نے موضع چاندا پور ضلع شاہجہان پور میں مذہبی مناظرے کا اہتمام کیا، جس کا نام "میلہ خدا شناسی" رکھا گیا، اس میلہ کا مقصد یہ تھا کہ ہر مذہب کے علماء اس میں شرکت فرما کر اپنے مذاہب کی حقانیت پر دلائل پیش کریں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے بالکل آخر وقت میں جب کہ میلہ کی تاریخ سر پر آگئی، ایک جامع تحریر مرتب فرمائی حضرت موصوف نے اس میلہ میں اسلام کی حقانیت پر ایسی جامع تقریر کی کہ میدان آپ ہی کے ہاتھ رہا، اس تحریر کے سنانے کی نوبت ہی نہیں آئی تحریر مذکور کئی بار کتابی صورت میں شائع ہوئی! اب اسے بہت دنوں کے بعد، مجلس معارف القرآن دیوبند نے گیٹ اپ کی تمام خوبیوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کتاب پر "عروسِ جمیل در لباسِ حریر" کی ضرب المثل صادق آتی ہے!

"حجۃ الاسلام" پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کا مقدمہ، مولانا اشتیاق احمد صاحب کا تعارف اور حضرت مولانا فخر الحسن مرحوم کا دیباچہ ہے! مولانا اشتیاق احمد صاحب نے مقدمہ لکھنے کے علاوہ اصل تحریر کی تشریح و تسہیل کا فرض بھی انجام دیا ہے۔

"حجۃ الاسلام" کے بعض عنوانات کی ایک جھلک :—

نجات دینِ محمدی پر منحصر ہے — اثباتِ وحدانیت — ذاتِ خداوندی تمام عیوب سے منزہ ہے — سچے عیسائی ہم محمدی ہیں — نماز کے اسرار — ضرورتِ رسالت — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سب سے اعلیٰ تھے — معجزات عملیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء سے افضل ہیں — اہلِ کتاب کی بے انصافی — گوشت کھانا انسان کے لئے طبعی ہے —!

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ استدلال میں جو فلسفیانہ انداز اختیار فرماتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ حضرت موصوف کی نگاہ انتہائی باریک بین واقع ہوئی تھی اور ذہانت تو اُن کی کنیز تھی!

کتاب میں کہیں کہیں کھٹک بھی محسوس ہوئی، مثلاً :—

"خدا وہ ہے جس کا وجود خانہ زاد ہو" (ص ۷) اللہ تعالیٰ کے لئے "زادہ یا زائیدہ" کی نسبت مناسب نہیں "خانہ زاد" میں ذم کا پہلو بھی نکلتا ہے "خانہ زاد" کی بجائے "قائم بالذات" لکھنا تھا — "خدائے عالم نور سے زیادہ لطیف ہے، اسی وجہ سے آج تک کسی کو دکھائی نہیں دیا" (صفحہ ۹۳) اللہ تعالیٰ نے جانچنے لئے "لطیف و خبیر" کے اسماء استعمال فرمائے ہیں، تو "لطیف" کی

زیادہ صحیح تعریف یہ ہے کہ ـــــ وہ ذات جو مخلوق سے مخفی باتوں کی خبر رکھتی ہو" اس تعریف سے "حس" "لطافت" کا ہوتا، جس کا تعلق خوشبو، روشنی اور برق و باد کی لطافت سے ہے۔ (سبحان اللہ عما یصفون)

● ـــــ الغرض معجزات نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دو انبیاء) سب سے زیادہ ہیں، کیونکہ کلام ربانی اور کہ نہیں ہوا" (صفحہ ۱۰۵) حالانکہ قرآن کریم کہتا ہے ـــ

" والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک "

اور وحی الٰہی کے اس نزول میں "کلام" اور "کتاب" جیسی کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ انبیاء کرام کے درمیان اس قسم کی تفریق نہیں کہ دوسرے انبیاء پر تو وحی الٰہی "کتاب" کی صورت میں نازل ہوئی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر "کلام" نازل ہوا تھا مدارج کا امتیاز تو ہے ... (... فضلنا بعضھم علیٰ بعض) مگر نبوت کی ماہیت وحقیقت اور وحی کے اعتبار سے کوئی (لا نفرق بین احد من رسلہ)

● ـــــ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام مراتب کمال ایسی طرح ختم ہو گئے، جیسے بادشاہ پر مراتب ختم اس لئے جیسے بادشاہ کو خاتم الحکام کہہ سکتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الکاملین اور خاتم النبیین کہہ سکتے ہیں د حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو کوئی شک نہیں "ختم نبوت" کے قائل تھے یعنی اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی قیامت تک نہیں آئے گا، اور جو نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ کاذب اور مکذب و مفتری ہوگا؛ مگر حضرت موصوف کی وابہام سے قادیانیوں نے اپنے مسلک ضلال کی تائید کے لئے نکتے پیدا کئے ہیں؛ مندرجہ بالا عبارت بھی خاصی کھٹک رکھتی ہے "خاتم الحکام" ہوتا ہے، اس کے بعد دوسرا بادشاہ پیدا ہو سکتا ہے۔ "خاتم الحکام" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اب اس بادشاہ کو خاتم الحکام کہا گیا ہے، دوسرا بادشاہ ہی سرے سے پیدا نہیں ہوگا؛ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو "خاتم ا گیا ہے" اس سے صرف یہ مراد نہیں لینی چاہیے کہ حضور کی ذات پر روحانی کمالات اور دینی منزلت کے سب عہدے ختم ہو گئے اور آپ انبیاء میں سب سے افضل ہیں، ان تمام کمالات کے ساتھ حضور کی ذات پر نبوت کو بھی ختم کر دیا گیا اور آپ کے بعد کوئی جدید نبی نہیں آئے گا، بادشاہ کو جو "خاتم الحکام" کہا جاتا ہے، یہ مثال "خاتم النبیین" کے سلسلہ میں نہیں دینی چاہیے کہ اس سے التباس پیدا ہو

"حجۃ الاسلام" کوئی شک نہیں بڑے معرکہ کی کتاب ہے، اس میں اس "علم کلام" کو صرف کیا گیا ہے، جس سے دین متین ہوتی ہے اور دوسرے مذاہب اسلام کے مقابلہ میں تقویم پارینہ اور حق و باطل کا ملغوبہ نظر آتے ہیں ـــ دینِ حق اسلام اور صرف ا

تفسیر المعوذتین از: حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، ضخامت ۵۲ صفحات، (دبیزہ زیب ٹائپ) ہدیہ ایک ملنے کا پتہ: مجلس معارف القرآن دیوبند ـ

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی عربی تفسیر ـــ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حقائق و حقیقت رقم ہے! اور عربی انشاء پردازی کا قابل قدر نمونہ! آیات قرآنی کی ایسی شرح و تفسیر جو ایمان افروز ہے! مولانا محمد سالم القاسمی نے عربی اخلاص و وفا" اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے "کلمۃ التعریف" لکھا ہے! جس میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ کے مناقب کئے ہیں ـ

اس کتابچہ میں صفحہ ۱۳ پر اپنے بارے میں حضرت مولانا نانوتوی نے " ... اشعر بان جسمی نتیفل کالجبل " کے بعد رسول اللہ علیہ وسلم کے نزول وحی اور حضرت زید بن حارثہ کے واقعہ کا جو ذکر کیا ہے، وہ ادنیٰ مشابہت کے باوجود کھٹکتا ہے ـ

"تفہیم المعوذتین" ـــــ کا علمی دانی حلقہ میں قدردستائش کے ساتھ خیرمقدم کیا جانا چاہئے۔

اسلام کا تہذیبی نظام

از:- مولانا سید یحییٰ ندوی، ضخامت ۴۴ صفحات، قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ:- پاک اکیڈمی، بہار کالونی، مسجد روڈ کراچی ۲

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کسے کہتے ہیں؟ اس کی پہلی بنیاد کیا تھی؟ اسلامی تہذیب کے بنیادی اصول اور اس کی فکری اساس کیا ہے؟ ـــــ ان تمام سوالات کے جوابات جس دلنشین انداز میں دئے ہیں اور صحیح دینی فکر کو جس طرح اجاگر کیا ہے وہ فاضل مصنف ہی کا حصہ ہے! ان مباحث کے بعد کے چند عنوانات:-
نفس کے حقوق ـــــ تقویٰ ـــــ ذکر ـــــ اسلام کا عائلی نظام ـــــ ماں باپ اور اولاد کے فرائض منصبی ـــــ والدین کے حقوق ـــــ حقوق زوجین!

پوری کتاب اسلامی فکر کی ترجمان اور دینی غیرت کی آئینہ دار ہے! "ثقافت" کے نام پر پاکستان میں جس فاسقانہ کلچر اور کافرانہ تہذیب کو فروغ دیا جارہا ہے، اُس کے خلاف یہ کتاب "شدید احتجاج" ہے اور وہ "کلمہ حق" ہے جسے افضل الجہاد کہا گیا ہے۔
یہ کتاب تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اسلامی تہذیب کے نقش ونگار کیا ہیں! اور فاسقانہ تہذیب اور اسلام کی اخلاقی تہذیب میں حدِ امتیاز کیا ہے؟ اس کتاب میں عزیمت اور فراستِ ایمانی کے وہ اعلیٰ نمونے ملتے ہیں جو ہمارے اسلاف کا مقدس ورثہ ہیں! باطل کے مقابلہ میں اسی جرأت وغیرت کی ضرورت ہے، جب تک مولانا سید یحییٰ ندوی جیسے حق گو اور حق شناس ملت میں موجود ہیں، حق کی آواز بلند ہی ہوتی رہے گی! اس قسم کی کتابیں اُن دلوں کی ڈھارس بندھاتی ہیں، جو فسق وفجور کا غلبہ دیکھ کر محزون وشکستہ ہو جاتے ہیں۔

اہل فارس اور سلمان فارسیؓ

از:- محمد سلطان نظامی، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:- شرکت ادبیہ پنجاب، شاہی محلہ، لاہور

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بڑے رتبہ کے صحابی ہیں، مگر یہ کتاب بتاتی ہے کہ شیعہ صاحبان نے اُن کے بارے میں بڑا غلو کیا ہے، مثلاً ان کی عمر کو چھ سو سال بتانا یہ بات اپنی جگہ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ پھر حضرت سلمان کو اول المسلمین کہنا یہ بھی صحیح نہیں ہے اور یہ بات تو سو فیصد غلط اور فسادِ قلب وضمیر کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مقداد، ابوذر اور سلمان (رضی اللہ عنہم) کے علاوہ تمام صحابہ مرتد ہو گئے (بخاک بدہن گستاخ)
اس کتاب میں اسی قسم کی خرافات کی تردید کی گئی ہے ـــــ مگر غزوہ خندق میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خندق کھودنے کا جو مشورہ دیا تھا اس کی تردید کی آخر کیا ضرورت محسوس ہوئی! اس واقعہ اور رائے کو "علم نبیؐ" کے مقابلہ میں مرجح سمجھنا اپنی جگہ خود نقد ونظر کی غلطی ہے! "تابیرنخل" کے سلسلہ میں جو حضور نے فرمایا تھا کہ امور دنیا تم بہتر جانتے ہو" اس سے علم رسول کی تنقیص ہرگز نہیں ہوتی۔
بحث ونزاع اور تردید وتائید میں عدل وانصاف کے حدود کا لحاظ رکھنا ضروری ہے مگر یہ سعادت کم ہی اہل قلم کے حصہ میں آتی ہے۔

التحقیق الضروری فی القضاء العمری

از:- مولانا محمد یوسف (مفتی دار العلوم جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک) ۴۴ صفحات - قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ملنے کا پتہ:- دار العلوم اکوڑہ خٹک تحصیل نوشہرہ، ضلع پشاور

اس کتاب میں "قضاء عمری" کی تحقیق کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "متعارف قضاء عمری" کا جواز شریعت میں نہیں پایا جاتا، فاضل مصنف نے "قضاء عمری" کے قائلین کی دلیلوں کو رد کیا ہے، آخر میں موصوف لکھتے ہیں! ـــــ
"حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جس شخص سے نیند یا نسیان کی وجہ سے نماز فوت ہو گئی، تو جب بھی اُسے یاد آجائے اسی وقت

آس کو پڑھے، اس کے لئے بجز پڑھ لینے کے اور کوئی کفارہ نہیں ہے؟ — پس اس بات کا اعتقاد رکھنا کہ رمضان وغیرہ جیسے مخصوص اوقات میں بعض فوت شدہ نمازوں کی قضا سال بھر یا دو کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ یا اس سے تمام عمر کی فوت شدہ نمازوں کا کفارہ ہو جاتا ہے اصول شریعت سے صریح طور پر متصادم ہے اور ایسے اعتقاد رکھنے والے پر کفر کا خطرہ ہے ؟

اس عبارت کے آخری جملہ میں بے جا شدت پائی جاتی ہے۔

زندگی کے دو اہم واقعات

از :- الحاج قاری محمد بشیر الدین پنڈت، ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- مصنف سے، بہادر گنج شاہجہاں پور (یو۔ پی۔ انڈیا)

قاری محمد بشیر الدین پنڈت (ایم۔ اے علیگ) ایک غریب خاندان کے فرد ہیں، انہوں نے غربت و ناداری کے باوجود تعلیم کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں اور طالب علمی کے زمانہ میں محنت اور جفاکشی کا ریکارڈ قائم کر دیا، پنڈت بشیر الدین فن تجوید و قرأت سے بھی واقف ہیں سنسکرت بھی اُن کا خاص مضمون رہا ہے، کالج کی ملازمت کے دوران میں موصوف نے فن تاریخ میں کئی کتابیں بھی لکھیں جن کو علمی حلقوں میں پسند کیا گیا، وہ بدو شعور ہی سے مذہبی رہے ہیں، اور علم و شعور کی ترقی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مذہبی رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔

اس کتاب میں پنڈت بشیر الدین صاحب نے اپنی زندگی کے دو اہم واقعات لکھے ہیں، ایک واقعہ اجنّہ کا ہے، جو موصوف کے گھر پر سنگباری کیا کرتے تھے، اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے تجربہ اور مشاہدہ کو قلمبند کیا ہے یہ واقعات سائنسی دنیا کے لئے کوئی شک نہیں حیرت انگیز ہیں مگر حیرت کسی واقعہ کی تکذیب تو نہیں کر سکتی، "اجنّہ" کا وجود قرآن کریم سے ثابت ہے یہ مخلوق انسانوں کو نظر نہیں آتی ! ریاست حیدرآباد دکن میں بھی ایک مسلمان ڈسٹرکٹ جج جو مولانا حسرت موہانی مرحوم کے عزیز ہوتے تھے اُن کے یہاں سے کپڑوں میں آگ لگ جایا کرتی تھی اور اُن کے گھر والوں کو بہول جنوں نے پریشان کیا ہے اس قسم کے واقعات سرسید احمد خاں مرحوم کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں "اجنّہ" سے مراد کوئی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے "اجنّہ" گنوار اور اُجڈ انسانوں کو کہتے ہیں۔

دوسرا واقعہ حکومت ہند کی طرف سے نیشنل ایوارڈ ملنے کا ہے اس سلسلہ میں قاری بشیر الدین پنڈت کو دلی میں کن شاہانہ تقاریب و رسوم سے سابقہ پڑا۔ عوام و خواص میں اُن کی کس قدر پذیرائی ہوئی، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے۔

جناب نہال الدین نے اس کتاب پر پیش لفظ لکھا ہے، موصوف پروفیسر محمد حبیب صاحب کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں —

"قاری صاحب کے مورثِ اعلیٰ محمد شیر ... جالندھر کے چوہان راجہ کے سپہ سالار تھے ......"

قاری صاحب کے خاندان کے بارے میں یہ حیرت انگیز انکشاف ہے! بہرحال قاری صاحب موصوف کے علم و فضل اور خوش حالی نے اُن کے خاندان کو چار چاند لگا دیئے۔

ساتھی کے نام

از :- اسعد گیلانی، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ :- ادارہ ادب اسلامی، سرگودھا۔

اس کتاب میں جناب اسعد گیلانی کے وہ خطوط یکجا کئے گئے ہیں، جو انہوں نے اپنے رفقاء اور دوستوں کو لکھے ہیں، ہر مکتوب ایک مقصد رکھتا ہے اور اقامتِ دین کی تحریک اس میں جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے بانیازِ تحریر کی کے خطوں کا بہت شہرہ ہے لیکن وہ بے مقصد خطوط ہیں مکتوب نگار نے اپنے تخیل کے زور سے لفظ و معنیٰ کے قلعے کھڑے کر دیئے ہیں — مگر جناب اسعد گیلانی نے ایک ایک لفظ حقائق کی روشنی میں لکھا ہے اور یہ بات اُن کے پیشِ نظر رہی ہے کہ جس کو وہ خط لکھ رہے ہیں، اُس کے دل و دماغ خط پڑھ کر اُس کا درد و سوز، اخلاص و صدق

پ سے معمور ہو جاتیں، جو اسعد صاحب کی زندگی کا موضوع بلکہ مقصود و ماحصل ہے ۔

"۔۔۔س نفی کے نام" ایک ایمان افروز ادبی پیشکش ہے۔ ان خطوط میں ملت کے لئے پیام ہے اور دعوتِ فکر و عمل بھی!

انشائیے

از: فضل احمد صدیقی - مقدمہ:- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی - تعارف: سید الطاف علی بریلوی، ضخامت ۱۹۲ صفحات (مجلد) قیمت چار روپے، ملنے کا پتہ:- اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، ایجوکیشنل کانفرنس، پہلی چورنگی، ناظم آباد کراچی

جناب فضل احمد صدیقی ایک مشاق انشاء پرداز اور بلند پایہ طنز نگار ہیں، اُن کی تحریروں میں زبان کا چٹخارہ، اظہار و بیان کا لطف اور خیال و فکر کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ فکرِ معاش سے بے نیاز ہو کر علم و انشاء پردازی کی آزاد فضا میں اگر صاحب موصوف کو کام کرنے کا موقع ملتا تو اُن کا قلم اُردو کے دامن کو ادب کے پھولوں سے بھر دیتا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ کے ہاتھوں اُن کی ادبی صلاحیتیں گھٹ کر رہ گئیں اور پاکستان بننے کے بعد وہ گمنام سے ہو گئے،

اس کتاب میں فاضل مصنف کے پندرہ مضامین ہیں جو بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں! "انشائیہ نگاری" کی صنف میں صاحبِ موصوف پوری رکھتے ہیں! وہ چٹکیاں بھی لیتے ہیں اور گدگدیاں بھی کرتے ہیں۔ اور باتوں باتوں میں نفسیاتی تحلیل اور کردار کا تجزیہ کرتے جاتے ہیں اُن کی تحریر کے چند اقتباسات :—

● سینما گاہ میں بندر تو نہیں، لیکن انسانوں اور بندریوں کے ٹھٹ لگے ہیں ۔۔۔ چشمِ تماشا کو عیشِ نظارہ حاصل ہے تماشائی تماشا بنے ہوئے ہیں، پاؤں رکھتے کہیں ہیں، پڑتا کہیں ہے ۔۔۔

● اگر ساز اپنے قابو کا ہو تو راگنی کو باندھتے کیا دیر لگتی ہے ایک تار بھی باقی ہے تو کافی ہے، اصل نغمہ رقاصِ ۔۔۔ سرِ انگشت میں پنہاں ہوتا ہے ۔

● کلرک کو سیاست و ریاست سے مس نہیں ہوتا، وہ اس معاملہ میں کورا لبرل ہے، یعنی جس کا کھائے اُسی کا گائے!

● آج کل ہم جیسا کہ ظاہر ہے، اخباری دنیا میں رہتے ہیں، ہم کتاب تو مارے باندھے کو اور اخبار بلاناغہ پڑھتے ہیں اور مرتے دم تک پڑھتے جاتے ہیں بلکہ بس چلے تو اپنے مرنے کی خبر پڑھ کر مریں ۔

● یہاں جامہ زیبی بھی ہے، جامہ دری بھی ہے، اقبال کے شعر کے مطابق یہاں ہر آدمی بندہ کا شاعر و صورت گر و افسانہ نویس معلوم ہوتا ہے جن کے اعصاب پر جنس ضعیف غالب ہے یہاں (بمبئی میں) جام چھلکتے ہیں، قشقہ ڈھلتے ہیں، سجادہ نمرانِ گرو رکھا جاتا ہے اور خود فریبی سے خودکشی تک رومان ہی رومان ہے ۔

دوسرا رُخ : —

"بمبئی ایک نرالی بستی ہے جس کی صرف ایک گھونٹ کھلی ہے (صفحہ ۱۹) "گھونٹ" مونث نہیں مذکر ہے —" آپ نے ایک چلبلی ہوتی نگاہ ٹھہر ڈالی" (صفحہ ۲۴) اور جو ہیں "چپلنی نگاہ" لکھنے اور بولنے لگے ہیں مگر ثقہ اہلِ قلم ایسے موقعوں پر طائرانہ نگاہ، سرسری نگاہ، اُچٹتی نگاہ لکھتے ہیں۔ "سڑکوں پر مخشریوں کا ایک ناقلہ حیران و پریشان ہر وقت نظر آئے گا (ص ۲۵) "مخشریوں" سمجھ میں نہیں آیا، — "بین الاقوامی کانفرنس قسم کی چیز کا جھمیلا کھڑا کر اوں" (ص ۱۰۹) جھمیلے کے ساتھ "کھڑا ہونا یا کھڑا کرنا" نہیں بولتے — اس صورت سوال اور نکہت چاکری (ص ۱۴۲) صحیح املا "نکہت" ہے ۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ تحقیق و اکتشاف نے "انشائیے" کو چھاپ کر، زبان و ادب کی قابلِ ذکر خدمت انجام دی ہے —

مخطوطات پیرس
اُردو، فارسی، سندھی، پنجابی

مرتبہ :- آغا افتخار حسین ، پیش لفظ :- ممتاز حسن
ضخامت ۶۵ صفحات (بڑا سائز) ٹائپ پر، قیمت پانچ روپے
ملنے کا پتہ :- ترقیِ اُردو بورڈ، کراچی

جناب آغا افتخار حسین صاحب کو حکومتِ پاکستان نے فرانس بھیجا تھا، مقصد یہ کہ موصوف وہاں کی سول سروس کے بارے میں اپنے ذاتی مطالعہ و مشاہدہ سے واقفیت پیدا کریں۔ آغا صاحب اہلِ علم ہیں اور ساتھ ہی اہلِ قلم ہیں، انہوں نے اپنا فرضِ منصبی ادا کرکے علاوہ پیرس کی (BIBLIOTHEQUE NATIONALE) میں متعدد بار تشریف لے جاکر وہاں کے مخطوطات کو دیکھا، اُن میں ضروری اور مفید معلومات فراہم کیں ــــ یہ کتاب اُن کے اس سفر (۱۹۶۲ء ــ ۱۹۶۴ء) کا حاصل ہے۔

اس کتاب میں انگریزی اور اُردو زبان میں اُن مخطوطات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ جو آغا افتخار حسین صاحب کی نگاہ سے گزرے۔ آغا صاحب موصوف "اردو زبان کی قدیم ترین لغت" کی قسم تک نہ آئے ہیں، جسے کسی اُردو محقق اور انشا پرداز نے اُن کے علاوہ نہیں۔ اس لغت کا مصنف فرانس کا مارما دو تور پانڈیچری کے مشنری کتب خانے میں کام کرتا تھا اور غالباً اسی زمانہ (۱۶۸۰ء) میں اس نے یہ لغت مرتب کی تھی۔

آغا صاحب نے اپنے دیباچہ میں پیرس کے ایک مقبول روزنامہ کے اداریہ کا اقتباس دیا ہے جس میں اس کا اعتراف کیا گیا کہ اُردو زبان ہندوستان کی لنگوا فرینکا ہے۔ یہ ڈیڑھ سو سال قبل کا وہ اعتراف ہے جو اُردو زبان کے بین الاقوامی زبان ہونے کی شہادت دیتا ہے ــــ مگر پاکستان میں اُردو کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ کس قدر افسوسناک ہے!

صفحہ ۱۱ پر مثنوی سحرالبیان کی تاریخ تصنیف ۱۸۶۴ء دی گئی ہے یہ ٹائپ کی غلطی ہے ــــ اسی طرح صفحہ ۱۹ پر میر کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کا نام "معراج الدین" چھپ گیا۔

اس کتاب کی اشاعت پر مصنف اور ناشر (ترقیِ اُردو بورڈ) دونوں تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

ادارۂ صحت و تحقیقاتِ طبیہ (انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ) کی تکمیل ملک کی بہت بڑی خدمت ہو گی!

پاکستان کے اہلِ خیر سے حکیم محمد سعید کی اپیل

ہمدرد ٹرسٹ کے چیئرمین حکیم محمد سعید دہلوی نے قوم سے اپیل کی ہے کہ وہ ادارہ صحت و تحقیقاتِ طبیہ کے عظیم منصوبے کی تکمیل میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ یہ مرکز جس کا سنگِ بنیاد گزشتہ دنوں صدر ایوب نے کراچی میں رکھا تھا خلقِ خدا کی صحت و امراض کے ازالے کے لیے تعمیر کیا جا رہا ہے۔ حکیم محمد سعید نے اپنی اپیل میں کہا ہے کہ ہر اس شخص کو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کا کچھ قرض اپنے ذمہ سمجھتا ہے، اس کارِ خیر کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ادا کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ وہ پندرہ لاکھ مریض جن کی بے لوث خدمت اور علاج پر انھوں نے اپنی زندگی کا ایک تہائی حصہ صرف کیا ہے، اگر کم از کم پانچ روپے فی کس بھی دیں تو یہ کام بہت جلد پورا کیا جا سکتا ہے۔

حکیم صاحب کی اپیل کا مکمل متن درج ذیل ہے

میرا خطاب اپنے ان مریضوں سے ہے جن کو میں نے گزشتہ ۱۹ برس میں اپنی پوری توجہ دینے کی کوشش کی میری زندگی کے کل اوقات کا ایک تہائی حصہ مریضوں کو دیکھنے اور ان کے دکھ درد کو سمجھنے میں صرف ہوا یہ ایک سعادت تھی جو مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نصیب ہوئی میں اس کے لئے اس کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں۔ ایسے مریضوں کی مجموعی تعداد جن کی خدمت کا شرف مجھے حاصل ہوا آج کی تاریخ تک ۱۵ لاکھ ہوتی ہے ان میں اکابرینِ دس سربراہانِ مملکت سے لے کر ہر طبقے ہر فرقے اور ہر پیشے کے اعلیٰ و ادنیٰ افراد شامل ہیں۔

بیماریوں کے ہاتھوں انسانی تکلیف اور مصیبت کا جس قدر مشاہدہ میری آنکھوں نے کیا ہے شاید ہی کسی اور شخص کو اس کا موقع ملا ہو۔ ادارۂ صحت و تحقیقاتِ طبیہ (انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ) کے عظیم مرکز کا مجوزہ منصوبہ میرے انھیں مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ خلقِ خدا کی صحت میرا مقصود اور امراض کا ازالہ میری زندگی کا مشن ہے یہ مقصد ہر اس شخص کو عزیز ہونا چاہیے جو خدا کا خوف دل میں رکھتا ہو۔ اس وقت میں خصوصاً اپنے ان مریضوں سے جن کے علاج کی مجھے توفیق ہوئی انسانیت اور خدا ترسی کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس عظیم مقصد کی تکمیل میں اپنے اہلِ قوم کا ہاتھ بٹائیں۔ ادارۂ صحت و تحقیقاتِ طبیہ (انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ) کی بنیاد ہمارے صدرِ مملکت کے ہاتھوں رکھی جا چکی ہے میں اس کی تکمیل میں دل و جان سے شریک ہوں گا مگر اس کی تعمیر دراصل قوم ہی کے ہاتھ میں ہے

اگر آپ کبھی میرے زیرِ علاج رہے ہیں تو آپ جانتے ہوں گے کہ میں نے کبھی کسی سے کوئی فیس نہیں لی۔ شاید میں آپ کو دیکھنے کے لیے آپ کے گھر پر بھی حاضر ہوا ہوں جیسا کہ ایسے لوگ ہیں جن پر میں نے ان کی دوا کا بار بھی پڑنے نہیں دیا پھر بھی میرا آپ پر کچھ قرض نہیں لیکن اگر آپ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کا کچھ قرض اپنے ذمے سمجھتے ہیں تو اس میں سے کچھ قدرِ قلیل اس کارِ خیر کے لیے ضرور ادا کیجیے۔ اگر میرے سب مریض ۵ روپے فی کس بھی دیں تو یہ کام بہت جلد پورا کیا جا سکتا ہے۔

عطیات کی ترسیل براہِ راست نہ کریں بلکہ تمام [illegible] نیشنل بینک لمیٹڈ، حبیب بینک لمیٹڈ اور نیشنل بینک [illegible] کی برانچوں میں جمع کرائیں۔

(عطیات کی رقوم انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔)

ماہنامہ فاران کراچی

اکتوبر سنہ ۱۹۶۷ء

جلد :- ۱۹

شمارہ :- ۷

ایڈیٹر ——— ماہر القادری

ترتیب

چندہ سالانہ :- ۷ روپے | پبلشر :- سرور حسین | قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے

مقام اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

باہتمام مستفیض احمد صدیقی۔ پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی علا سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے مابین سخت کشمکش، تلخی اور انتہائی بدمزگی کی فضا میں پاکستان وجود میں
(آیا) پھر اس کے بعد جو مار دھاڑ اور خونریزی اور تباہی ہوئی ہے وہ انسانی تاریخ کا دردناک المیہ ہے، اس ظلم کی ابتدا کس طرف سے ہوئی، کس نے
(ظلم) وشقاوت میں کتنا حصہ لیا، اس کا فیصلہ ہم انسانی ضمیر پر چھوڑتے ہیں!

اس واقعہ کو بیس سال ہونے کو آئے اتنی طویل مدت کے بعد بھی فضا کا تکدر اور ماحول کا غبار دور نہیں ہوا بلکہ کچھ دنوں سے تو یہ اور زیادہ
اور تاریک ہو گیا ہے! پاکستان اور ہندوستان دو ہمسایہ ملک ہیں، ان دونوں ملکوں اور قوموں نے انگریز کے خلاف دوش بدوش آزادی کی
لڑائی ہے، علامہ اقبال کی یہ مشہور نظم ـــ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

بھائی چارے اور میل ملاپ کے جذبہ کی ترجمان ہے! ہم خود بھی دو ہمسایہ ملکوں اور قوموں کی کشمکش اور نزاع و فساد کو پسند نہیں کرتے، انسانی
بھائی چارے کے ساتھ ہمسائیگی کے بھی تو کچھ حقوق، آداب اور دستور ہیں! انسان کو قدرت نے قوتِ غضب خونریزی، عصمت دری، آتش زنی، مار
دھاڑ اور توڑ پھوڑ کے لئے نہیں دی! اس قوت کا صحیح استعمال یا تو مدافعت کے لئے ہے یا ظلم و فساد کو روکنے اور شر کو دفع کرنے کے لئے اس قوت سے
کام لیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان نہ کسی پر ظلم کر رہے ہیں اور نہ فساد پھیلا رہے ہیں، پاکستان بن جانے کے بعد اُن کی مظلومیت اور بے کسی کی کوئی حد
باقی نہیں رہی، معیشت اور روزگار کی راہیں ان پر بند کی گئی ہیں اور پیٹ کی مار ماری جارہی ہے تاکہ وہ فقر و فاقہ کی اس حالت میں پہنچ جائیں جو
بعض اوقات ایک صاحبِ ایمان کو کفر کے قریب کر دیتی ہے، حکومت ہند کے محکمہ تعلیمات نے طلباء کے لئے ایک نصاب مرتب کیا ہے، جو اسلام اور اسلام
(کے) حاملوں کا برپا ایک طرح کی طنز ہے، اس کے پڑھنے سے مسلم طلبہ کے دل و دماغ اور ذہن و فکر کسی نہ کسی حد تک متاثر ہونے سے بچ نہیں سکتے اور بچ بھی گئے تو
اسلام کے بارے میں اُن کی عقیدت میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا۔

گائے کی قربانی کے نام پر، ہندو لڑکی کے اغوا کے بہانے، پاکستان کی حمایت کی تہمت لگا کر، ہندوستان کے مسلمانوں پر آئے دن ظلم و ستم کے
پہاڑ ٹوٹتے رہتے ہیں! چند مہینوں کے وقفہ سے کوئی نہ کوئی جبل پور، رڑکیلا اور جمشید پور خونیں ڈرامے کی شکل میں اسٹیج کیا جاتا ہے ان خون ریز
ہنگاموں میں مسجدیں جلائی جاتی ہیں، قرآن کریم کی توہین کی جاتی ہے اور مال و جائداد کے نقصان سے کر قتل و غارت گری اور پردہ نشینوں کی

عصمت دری تک کے ہولناک واقعات اور دردانگیز سانحے ظہور میں آتے رہتے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ لٹیروں اور قاتلوں سے باز پرس تک نہیں کی جاتی، مظلوم مسلمان ہی الٹے پکڑے جاتے ہیں اور انہی کو حوالات اور جیل خانہ کی مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اگر ہندو قاتلوں اور غارت گروں کو گرفتار کیا جاتا ہے تو وہ عام طور پر عدالتوں سے بری کر دئے جاتے ہیں۔ ایسے مقدمات میں پولیس مستغیث ہوتی ہے اور جب پولیس ہی قاتلوں اور لٹیروں کی طرفدار ہو تو کسی تعزیری جرم کا اثبات بہت دشوار ہو جاتا ہے! اس صورت حال نے جن سنگھی غنڈوں کو اور زیادہ جری اور دلیر بنا دیا ہے اور ایسے سانحے تو اکثر و بیشتر ہوتے رہتے ہیں کہ کسی مسلمان پھل والے یا پھیری لگانے والے کو ہندو طالب علموں نے لوٹ لیا، کسی مسلمان عورت کو دن دہاڑے اس کے گھر سے اٹھا لے گئے، کسی مسلمان یکہ اور تانگہ والے کو کرایہ نہیں دیا، اس نے مانگا تو اس غریب کی الٹی پٹائی کر دی، پولیس کے تھانوں میں ان واقعات کی رپٹ تک درج نہیں کی جاتی، خود پولیس والے مظلوم مسلمانوں کو دھمکاتے ہیں کہ تم نے رپٹ لکھوانے کے لئے زیادہ اصرار کیا تو تم پریشانی میں مبتلا ہو جاؤ گے اور تمہیں دھر لیا جائے گا۔

حال ہی میں رانچی میں اردو زبان کے مسئلہ پر مسلمانوں کے لہو سے ہولی کھیلی گئی ہے اور غنڈہ گردی اور وحشت و درندگی کے جو واقعات ظہور میں آئے ہیں اس نے گزشتہ سانحوں کو ظلم و ستم میں منزلوں پیچھے چھوڑ دیا۔ سینکڑوں مسلمانوں کو جن میں طلباء بھی شامل ہیں بے دردی کے ساتھ ہلاک کیا گیا، خود پولیس نے یہ کیا ہے کہ حفاظت و پناہ کے لئے مسلم طلبہ کو بس میں بٹھایا اور پھر اس بس میں بیٹھنے والوں کا پتہ ہی نہیں چلا کہ انہیں آسمان نے اچک لیا یا زمین کھا گئی، آزاد ہائی اسکول کی عمارت اور مسجد کو توڑ پھوڑ کے برباد کیا گیا، مسلمانوں کی دکانیں لوٹی گئیں، پولیس ہندو غنڈوں کو بڑھاوے دے رہی تھی اور انہیں اکسا رہی تھی کہ ہماری ڈھیل اور چشم پوشی سے تم پوری طرح فائدہ کیوں نہیں اٹھا رہے ہو، یہاں تک کہ مستانی فوج نے بھی وہ افسوسناک رول ادا کیا، جس سے قاتلوں اور لٹیروں کی جرأتیں بڑھیں اور حالات کی نزاکت اور ابتری سنگین تر ہو گئی۔

ایسا نظر آتا ہے کہ اسرائیلی اور جن سنگھی جیسے ایک ہی پروگرام اور منصوبہ کے تحت مسلمانوں کی ہلاکت و تباہی پر تلے ہوئے ہیں اور رانچی سے فلسطین تک ہندو کی بندوق اور یہودی کی مشین گن ایک ہی جیسا کارنامہ انجام دے رہی ہیں، مسلمانوں کی تذلیل، مظلومیت اور قتل و غارت گری جن سنگھیوں اور یہودیوں کا مشترک محبوب شغل ہے اور اسی درندگی کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح اور کامیابی سمجھتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک طرف معیشت و روزگار کی راہیں تنگ اور بند کی جا رہی ہیں دوسری طرف ان کے مال، جان اور عزت و آبرو پر یلغار ہو رہی ہے، پولیس اور فوج جس سے حفاظت و پناہ کی توقع ہو سکتی تھی، وہ مظلوموں سے بیر رکھتی ہے اور ظالموں کی ساتھی ہے، بھارت کی انتظامیہ اور عدلیہ جن سنگھیوں سے بری طرح مرعوب ہیں، یہ حالات اسی طرح چلتے رہے تو سوچئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا!

بھارت میں شریف اور انسانیت دوست ہندو بھی ہیں مگر ان میں کتنے ایسے ہیں، جو مظلوموں کی خاطر گاندھی جی کی طرح اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں! بھارت میں تیزی کے ساتھ مہا سبھائیوں اور جن سنگھیوں کا زور بڑھ رہا ہے اور اب تو کانگریس کی "اہنسا" تک مسلمانوں کے مرچ خون کے نظارے سے لطف لیتی ہے، جن کے دھرم میں جیو ہتیا پاپ ہے، وہ مسلمانوں کی قتل و بربادی کے معاملہ میں "رام چندر سے" راون اور دھرماتما سے راکشش بن گئے ہیں!

بیس سال کی مدت میں پہلی بار بھارت کے ہندو پریس نے رانچی کے خونیں واقعات کو چھاپا ہے اور بعض اخبارات نے اس المیہ پر اظہار افسوس بھی کیا ہے ——— مگر حیرت ہے کہ پاکستان میں خبروں پر کس کا کنٹرول ہے اور یہ کیا پالیسی ہے کہ یہاں کے اخبارات میں رانچی کی اس قیامت صغریٰ کو برائے نام پبلسٹی ملی ہے!

متحدہ ہندوستان میں جب ہم غلام تھے، تو جہاں کہیں سے بھی مسلمانوں کی پریشانی و اضطراب کی خبر آتی تھی، ہم بے چین ہو جاتے تھے اور ان کے لئے حکومتی اور سیاسی سطح پر احتجاج بھی کرتے تھے اور اس کی امکانی تدبیر اور غور و فکر بھی کہ ان کلمہ گو بھائی بندوں کو پریشانی سے کس طرح

ستان بننے کے بعد ہم کمزور ہو گئے ہیں یا طاقتور ہو گئے ہیں، حکومت نے ہماری طاقت اور وسائل و ذرائع میں اضافہ کیا ہے یا
ـــــ وہ جو پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان اقلیتوں کی حفاظت کا معاہدہ ہوا تھا آخر اس کا کیا حشر ہوا ؟
بارے میں فرمایا گیا تھا کہ اس کے نتائج بڑے دور رس ہیں، اس کے بعد سے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی مظلومیت پر احتجاج
ں نہیں آیا ۔
کے مسلمانوں کو پاکستان بنوانے کے جرم میں تباہ و برباد کیا جا رہا ہے اُن کے لئے ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے کی
ہیں وسیع ہو گئی ہیں یا تنگ ؟ ہماری اس آرام طلبی اور دینی بھائیوں کے حالات سے بے تعلقی کی کیا قیامت کے دن پوچھ گچھ
اخوت اور دینی وحدت کے تقاضے کیا یکسر فراموش کر دئے گئے !
یشہ اسی دنیا میں نہیں رہنا ہے ہمارا ایمان ہے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے ہماری پیشی ہوگی ــــ اور ہم سے پوچھا جائے گا
ں بھائیوں پر جب ظلم و ستم کے پہاڑ ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے اُن کی مدد کے لئے تم نے کیا کیا ؟ جس کو جتنا اختیار اور طاقت
حتساب اور باز پرس اُتنی ہی سخت ہوگی !
ن کے مسلمانوں کو ہزار آفریں کہ وہ اپنی مظلومیت اور حالات کی انتہائی تنگی اور ناسازگاری کے باوجود فلسطین کے مسلمانوں کے
ہے ہیں ! یہ مسئلہ دینی غیرت اور اسلامی حمیت کا ہے ! اور غیرت مصلحت ساز نہیں ہوتی وہ دفعۃً حرکت میں آجاتی ہے !
ان کے مسلمانوں کے لئے خطروں اور اندیشوں میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، جن سنگھ جو بھارت کی سب سے زیادہ
، اور جس کے اثرات روز بروز بڑھتے اور پھیلتے ہی جا رہے ہیں، یہی حالات رہے تو کیا عجب ہے کچھ دنوں کے بعد حکومت کی
ر میں آجائے ـــــ اس پارٹی کا پروگرام اور نصب العین ہی یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان یا تو ہندوؤں میں ضم ہو کر رہ جائیں
باد کر دیا جائے ـــــ کیا یہ صورتِ حال ہمارے غور و فکر کی محتاج نہیں ہے، سات کروڑ مسلمانوں کی موت و حیات اور
مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اُس کے لئے ہم میں شدید بے چینی پائی جانی چاہئے، ہر منصوبہ سے بڑھ کر اس مسئلہ کی اہمیت ہے اور اس
دگی میں کوئی جشنِ شادمانی اور تقریبِ مسرت ہمیں زیب نہیں دیتی ۔

ماہر القادری

۲۴ ستمبر ۱۹۶۷ء

اس عظیم منصوبہ کی تعمیر دراصل آپ ہی کے ہاتھ میں ہے

ادارۂ صحت وتحقیقات طبیہ

(انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اینڈ طبی ریسرچ)

ہمدرد (وقف) نے اس ادارے کی عمارت کے لئے
۲۸,۰۰,۰۰۰ روپے سے زیادہ
مالیت کی زمین بطور عطیہ دی ہے
لیکن اس کی تعمیر کے لئے کل ۵,۰۰,۰۰,۰۰۰
روپیہ فراہم کرنا ہے جو صرف
آپ کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔

صدر محترم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان
نے کراچی میں ۳؍ دسمبر ۱۹۶۶ء کو اس ادارہ کا سنگ بنیاد
رکھا اور ۲۵,۰۰۰ روپے کا پہلا عطیہ بھی مرحمت فرمایا
اس عظیم مقصد کے لئے اپنے عظیم رہنما کی پیروی کیجئے
اور اس کارِ خیر میں فراخ دلی سے حصہ لیجئے۔

---

۵ روپے یا اس سے زیادہ کے تمام عطیات سارے ملک میں مندرجہ ذیل بینکوں کی کسی بھی شاخ میں جمع کرائے جا سکتے ہیں۔

نیشنل بینک آف پاکستان

حبیب بینک لمیٹڈ

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

کامرس بینک لمیٹڈ

یہ تمام بینک عطیات کی وصولیابی کے سلسلے میں آپ سے مکمل تعاون کریں گے اور جمع شدہ رقم کی رسید بھی دیں گے۔ عطیات کی رقوم انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

ادارۂ صحت وتحقیقات طبیہ تمام عطیات کی رسیدیں شکریہ کے ساتھ فرداً فرداً ہر شخص کو روانہ کرے گا۔ عطیات دینے والوں کے نام ہر ماہ ہمدرد صحت (ڈائجسٹ) میں شائع کئے جائیں گے

قومی صحت کے اس عظیم منصوبے کی تعمیر میں دل کھول کر حصہ لیجئے

تعمیراتی پروگرام:- انسٹیٹیوٹ ... بستر کا اسپتال، لائبریری، کالج آف میڈیسن، نرسنگ، ریسرچ سنٹر، نیشنل ہیلتھ سنٹر، ہیلتھ اینڈ میڈیکل میوزیم وغیرہ وغیرہ۔

ماہر القادری

دین کے نام پر شرک وبدعت کی تبلیغ

(۲)

ماہ نومبر ۱۹۶۵ء کے شمارے میں اس مضمون کی پہلی قسط شائع ہو چکی ہے، جس میں ہم تفصیل کے ساتھ ملک صاحب اکبرآبادی کے دلائل کا جائزہ لے چکے ہیں! کوئی مسلمان بہ صحت ہوش و حواس یہ نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور اولیاء عظام کو جو شرف و مقام عطا کیا ہے اُس کا انکار کرے!

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سب سے افضل و اشرف "انسان" کو بنایا ہے اور انسانوں میں سب سے زیادہ ممتاز، محترم اور عزت والے انبیاءؑ ہیں۔ رسالت و نبوت سے بڑا کوئی شرف نہیں! حضرت سیدنا محمد ابن عبداللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول بنایا۔ آپ کی ذات پر نبوت کو ختم کر دیا، تمام رسولوں اور نبیوں میں آپ افضل اور اولین و آخرین کے سردار ہیں، صراط مستقیم وہی ہے جہاں حضور کے نقش قدم نظر آتے ہیں، سرکار کی ذات گرامی سعادت و ہدایت کا سرچشمہ ہے، آپ کی رسالت کے اقرار کے بغیر توحید کا اقرار نامکمل رہتا ہے، وہی موحد کامل ہے جو لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ "محمد رسول اللہ" پر بھی ایمان رکھتا ہے۔ دین و دنیا کی سعادت، ہدایت اور نجات حضورؐ کے اتباع سے وابستہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات بیان فرمائی ہیں ——— صاحب کوثر، سراج منیر، شاہد، رحمۃ اللعالمین، بشیر، رؤف و رحیم ——— ! جہاں بھی خطاب فرمایا ہے، آپ کی صفت و نسبت کے ساتھ فرمایا ہے ——— یا ایہا المزمل، یا ایہا المدثر ——— ! اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو بزم رسالت میں حاضری کے آداب سکھائے ہیں! جس دل میں حضورؐ کی محبت اور ادب و احترام نہیں وہ دل کافر کی سے بدتر ہے، جس میں ایمان کی کسی دھندلی سے دھندلی کرن کا بھی گزر نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ جس نے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات و فضائل بیان فرمائے ہیں، اُن میں کہیں اس کا اشارہ تک نہیں کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات چلانے کے لئے مبعوث فرمایا ہے اور زمین و آسمان کا انتظام اور اُس کی دیکھ بھال آپ کو سپرد فرما دی ہے! اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارے میں فرمایا کہ میں مشکل کشا اور حاجت روا ہوں۔ اور مجھے اللہ تعالیٰ نے کائنات کا مختار بنا کر بھیجا ہے! نہ صحابہ کرام کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم دنیا کے پردے پر جہاں بھی ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حالات سے باخبر ہیں، حضورؐ کی حیات دنیوی میں اور نہ آپ کی وفات کے بعد آپ کو مصیبت کے وقت دور دراز کی مسافت سے صحابہ پکارتے تھے، اور نہ حضورؐ کی قبر مبارک پہ جا کر مرادیں مانگتے تھے!

نبوت و رسالت سے عظمت و احترام اور عصمت و تقدیس وابستہ ہے۔ بعض پچھلی اُمتوں نے عقیدت و احترام کے نام پر انبیاء کرام کے بارے میں بڑا غلو کیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں خاص طور سے انبیاء کرام کے ایسے حالات بیان کئے ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قضا و قدر کے آگے وہ بھی مجبور و محکوم نظر آتے ہیں، کائنات کا مالک و مختار، مخلوق کا نگہبان و محافظ، مشکل کشا اور حاجت روا، ہر کسی کی فریاد کو سننے والا اور تمام کائنات کا رب اور کھوالا وہی اللہ ہو سکتا ہے، جو لم یلد ولم یولد ہے، جسے نہ نیند آتی ہے اور نہ اونگھ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، والامر بیدہٖ، ھو یفعل ما یشاء، یکشف السوء، یرزق الخلق، یحیی و یمیت، غافر الذنب و قابل التوب، لیس کمثلہٖ شیٔ، فعال لما یرید، وعلیٰ کل شیٔ قدیر۔

جن لوگوں نے عقیدت و احترام کے نام پر انبیاء اور اولیاء سے وہ صفات منسوب کی ہیں جو خاص اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، انہوں نے ایک طرف توحید خالص کو غبار آلود بلکہ مجروح بنایا ہے دوسری طرف ان بزرگوں کی پوزیشن کو خطرے میں ڈال دیا ہے، وہ مسلمان جن کا مطالعہ مثنوی یوسف زلیخا، جنگ نامہ علیؓ، داستان امیر حمزہؓ، میلاد اکبر، مولود شہیدی اور اسی قسم کی دوسری کتابوں تک محدود ہے یا اس قسم کا ذوق رکھتے ہیں وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان بزرگوں کی عقیدت و محبت کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان صفات الٰہی کا مظہر نہ سمجھیں جو انہیں عطا کی گئی ہیں، اور ان بزرگوں کی خوشنودی اسی اظہار عقیدت اور اعتراف صفات کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے! حالانکہ اللہ اور رسول کے نزدیک اس قسم کا غلو عقیدت نامقبول و ناپسندیدہ بلکہ مردود ہے! جس طرح قیامت کے دن حضرت عیسٰی علیہ السلام عیسائیوں کے مشرکانہ عقیدہ سے اپنی برأت کا اظہار فرمائیں گے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین بھی اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کریں گے کہ ہم نے اس قسم کے گمراہ کن عقائد کی تعلیم نہیں دی تھی، یہ باتیں انہوں نے اپنے جی سے گھڑ لی ہیں! جو کوئی پیر، شیخ یا بزرگ عقیدت مندوں کے اس قسم کے غلو عقیدت سے خوش ہوا ہو گا اُسے انہی عقیدت مندوں کی صف میں کھڑا کیا جائے گا! سچی بات تو یہ ہے کہ جو کوئی شخص مشرکانہ رسوم و عقائد اور بدعتوں کو پسند کرتا ہے، ان عقائد و بدعات میں اُس کی بزرگی کا ذرہ برابر لحاظ نہیں کیا جائے گا، اس کے قول و عمل کی تردید ہی کی جائے گی! اللہ کا دین ہر شخصیت سے بلند و بالاتر ہے۔

معجزے اور کرامتیں حق ہیں، مگر ان سے یہ نتیجہ نکالنا اور سمجھنا کہ بدترین قسم کا قیاس مع الفارق ہے، کہ جن سے معجزے اور کرامتیں ظہور میں آتی ہیں وہ کائنات میں باذن اللہ ہر طرح کے تصرف کی قدرت رکھتے ہیں۔

ہم نے اس مضمون کی ابتدائی قسط میں "توسل" کا ذکر چھیڑا تھا، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ وسیلہ کے ساتھ دعا مانگنا ناجائز نہیں ہے مگر صحابہ کرام کا یہ معمول نہیں رہا اور نہ قرآن کریم کی کسی دعا میں اس قسم کا کوئی (بحرمت، بجاہ، بحق فلاں) لفظ آیا ہے ——— قرآنی "آیت" — وابتغوا الیہ الوسیلۃ، میں "وسیلہ" سے مراد اعمال خیر ہیں، کسی کی شخصیت اور ذات مراد نہیں ہے۔ تمام مفسرین نے اپنی تفاسیر میں "الوسیلہ" سے طاعات اور اعمال خیر ہی مراد لئے ہیں۔

فکر عجیب

جناب میکش اکبرآبادی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں :—

"وہ کام جو صرف خدا کے لئے مخصوص سمجھے جاتے ہیں لیکن خدا نے ان کی نسبت اپنے بندوں کی طرف کی، اس لئے یہ شرک نہیں ہے، کیونکہ خدا شرک نہیں کر سکتا۔"

اس کے جواب میں عرض ہے کہ دین میں اصل اعتبار اللہ اور رسول کے حکم و قول اور عمل کا ہے! مثلاً کعبۃ اللہ کا طواف منصوص مسنون اور ماثور ہے، لیکن دوسری عمارت، قبر، تابوت، ضریح، یا مکان کا طواف، کعبہ کے طواف پر قیاس کر کے، نہیں کیا جا سکتا! اگر کوئی شخص کسی دیوار، چٹان یا پتھر پر کنکریاں مارتا ہوا دیکھا جائے تو لوگ اُسے خبط الحواس اور دیوانہ کہیں گے، مگر منیٰ میں رمی جمار ارکان حج میں داخل

ـــــــمخصوص ہیں مگر عید الفطر کو روزہ رکھنا حرام ہے : اس تفصیل سے یہ بات اُبھر کر خود سامنے آتی ہے کہ اللہ اور رسولؐ

ہیں وہ عین دین ہے ۔
علیہ السلام گارے سے پرندوں کی شکل بنا کر اُن کے اندر پھونک مارتے تھے اور وہ پرندے بن جاتے تھے ، اور خدا کے حکم سے
بیمار اور کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے تھے ، اور مُردوں کو باذن اللہ زندہ فرما دیتے تھے ۔ اس کے لئے قرآن شریف میں بیشک ا ـ
خلق ـــــــ تا نفخ ـــــــ اُبرئ ـــــــ اور احی الموتیٰ " کے کلمات آتے ہیں اور یہ کلمات حضرت عیسیٰ
سے کہے ہیں ، اس لئے ان میں ذرہ برابر قباحت نہیں ہے ! ہم عرض کرتے ہیں (بہ فرضِ محال اور بر سبیل تنزل) اگر اللہ تعالیٰ
ے دیتا کہ تم لوگوں سے یوں کہو کہ " میں تمہارا الٰہ ہوں " تو وحی کے ان الفاظ کا امت تک پہنچانا نبی پر فرض ہو جاتا ۔ اور نبی کی زبان
ل کی اُمتی تلاوت کرتے ! یہ اس لئے سچ ہے کہ اُسے اللہ اور رسول نے سچ کہا ہے ، جھوٹ اس لئے جھوٹ ہے کہ اُس پر اللہ
کا حکم لگایا ہے ، میاں بیوی کے درمیان نزاع ہو جائے تو اُن کی نزاع کو دور کرانے کے لئے اگر کوئی شخص اپنے دل سے گھڑ کر کچھ
دے جس سے اُن کے دلوں کا تکدر دور ہو جائے تو یہ فعل " جھوٹ " نہیں ہے ! کیوں جھوٹ نہیں ہے ! اس لئے کہ رسول اللہ
نے اسے " جھوٹ " نہیں کہا ۔
قرآن کریم کی یہ آیت ـــــــ

" قل یتوفٰکم ملک الموت الذی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "
(کہہ دو وفات دیتا ہے تم کو موت کا فرشتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔)

ـــــــ اور ـــــــ

فرشتے کا یہ کہنا ـــــــ
" انما انا رسول ربک لاھب لک غلاماً زکیا "
(فرشتے نے کہا ، میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا ہوں ، تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں)
اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا گیا ہے ، اس لئے حق ہے ، عین صداقت ہے ! اللہ تعالیٰ جب کسی کو حکم دے اور وحی فرمائے کہ تم " یوں یوں
بلاغ و تلاوت مہبط وحی پر فرض ہو جاتا ہے ! اس کی سامنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے کسی اہلکار ، قاصد یا وزیر کو حکم
سے کہو کہ ـــــــ
" میں بادشاہ سلامت کے حکم سے تمہارا فلاں ٹیکس معاف کرتا ہوں ـــــــ یا میں فلاں شخص کو فلاں خطاب یا
جاگیر دیتا ہوں "
ہ کے حکم سے ہوا ہے اس لئے یہ کہہ دینے سے اہلکار ، قاصد یا وزیر یا بادشاہ کے اقتدار و اختیار میں شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ،
ت عیسیٰ علیہ السلام کو مُردوں کو زندہ اور بیماروں کو اچھا کرنے کا جو معجزہ دیا گیا تھا اُس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حضرت عیسیٰ
رہے تو سارے جہان کے بیماروں کو اچھا کرنے کی خدمت آپ سے متعلق تھی یا آپ کو ساری دنیا کے بیماروں کے حالات کی خبر رہتی
مرے اور ہر مرنے والے کو آپ جانتے تھے ، اور پھر آپ کے آسمان پر اُٹھا لئے جانے کے بعد بھی یہ کام آپ انجام دیتے رہے ہیں ! کسی
تابعی نے بلکہ کسی عام مسلمان نے بھی حضرت مسیح علیہ السلام کو مدد کے لئے نہیں پکارا اور آپ سے استغاثہ نہیں کیا کہ اے خدا کے نبی
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیماروں کو اچھا کرنے کا معجزہ دیا ہے ۔ اور آپ پر دوسروں کی طرح موت بھی طاری نہیں ہوئی آپ آسمان پر زندہ

ہیں، آپ ہمارے امراض کو دور کر دیجئے! انبیاء ہر حیثیت سے اولیاء اللہ سے افضل و برتر ہیں، جب وہ مرے انبیاء کرام سے مسلمان فریاد و استغاثہ نہیں کرتے اور آن کے ناموں کی دہائی نہیں دیتے تو اولیاء اللہ امامت محمدی کے وفات پائے ہوئے بزرگوں سے کس دینی سند کی بنیاد پر استغاثہ کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ بزرگ عالم برزخ سے ہماری مدد فرما سکتے ہیں۔

جس فرشتہ نے حضرت مریمؑ سے یہ کہا تھا ـــــ

...... لاھب لک غلاماً زکیا

اس فرشتہ کو بے اولاد مرد یا بانجھ عورتیں اولاد دینے کے لئے نہیں پکارتیں اور اس قسم کے استغاثہ کا اللہ اور رسول نے حکم دیا ہے۔

ان آیات کے بعد میکش صاحب لکھتے ہیں !ـــ

" وہ عبادت جو خدا کے لئے مخصوص ہے مگر خدا نے دوسروں کے لئے بجا لانے کا حکم دیا، اگر یہ شرک ہوتا تو خدا شرک کا حکم نہ دیتا۔

واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس (اور جب وقت ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدے میں گر جاؤ آدمؑ کے سامنے، سو سب سجدے میں گر پڑے)

اللہ تعالیٰ جس کام کا حکم دے اس میں شرک و بدعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ اور کسی نبی کو کسی فرشتہ نے سجدہ نہیں کیا! یہ سجدہ دراصل اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں تھا، اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں!

اس کے بعد میکش صاحب تحریر فرماتے ہیں !ـــ

"پیغمبروں نے کبھی بھی شرک نہیں کیا، نہ وہ شرک کر سکتے تھے، مگر حضرت یعقوب اور اُن کے خاندان نے اپنے بیٹے اور بھائی حضرت یوسفؑ کو سجدہ کیا، اگر بغیر نیت کے سجدہ کرنا عبادت ہوتی تو حضرت یعقوبؑ کبھی سوائے خدا کے کسی کو سجدہ نہ کرتے"

" ورفع ابویہ علی العرش وخروا لہ سجداً "

(اور اپنے والدین کو تخت شاہی پر اونچا بٹھایا اور سب کے سب یوسفؑ کے آگے سجدے میں گر گئے ہم (علیہ السلام) کا فعل خود اس پر دلیل ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم ہو اس میں کسی قسم کی کوئی قباحت ہو ہی نہیں سکتی!

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ "سجدہ" سے مراد ہر جگہ یہی اصطلاحی سجدہ نہیں ہے بلکہ بیشتر قوموں ایک متعارف طریقہ اظہار تعظیم کا تھا، جس طرح عبرانی آداب و تہذیب میں "زمین بوس" ہونا اور جھکنا (Jewish B. To) داخل تھا۔

قد لیسمی التواضع سجوداً وکان المراد ھھنا التواضع (تفسیر کبیر)

(کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تواضع کا نام سجدہ رکھا جاتا ہے اور یہاں مراد تواضع ہی سے ہے)

ان تحیۃ الناس یومئذ السجود ولم یرد بالسجود وضع الجباہ علی الارض انما ھو الانحناء والتواضع (معالم التنزیل)

(اور اس وقت لوگوں کا سلام ہی سجدہ تھا، اور سجدے سے پیشانی کا زمین پر رکھنا مراد نہ لیا جاتا تھا، بلکہ سجدہ سے انحناء و تواضع کا نام تھا)

سجود انحناء لا وضع جبھۃ وکان تحیتھم فی ذالک الزمان قبل ما کانت الا انحناء ولا تعفیر الجباہ (مدارک)

(پیشانی زمین پر رکھنا مراد نہیں بلکہ سجدہ انحناء (تواضع) مراد ہے، اور اس زمانہ میں آن کا سلام بھی یہی تھا، یہ بھی

کہا گیا ہے کہ سجدہ صرف انحنا کا نام ہے، پیشانی زمین پر رکھنے کا نام نہیں)

" خر والہ" میں "ل" کے معنیٰ لاجل کے بھی لئے گئے ہیں، گویا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت یوسف کو پا کر اس خوشی میں ان سب نے اللہ کو سجدہ شکر ادا کیا ـــــ وہ ھو قول ابن عباس فی روایة عطاء وان المراد بھذہ الآیة انھم خروا لہ ای لاجل وجدانہ سجدوا للہ تعالیٰ (کبیر)

(حضرت عبداللہ ابن عباس کی روایت، حضرت عطاء ابن ابی رباح سے منقول ہے کہ اس آیت سے مراد . . . انھم . . یہ ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف کو پانے کی وجہ سے خوشی میں اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ کیا (تفسیر ماجدی)

جو کوئی توحید خالص سے شغف رکھتا ہوگا، وہ مفسرین کی اس تفسیر کو ترجیح دے گا ـــ

ــــ یہ اپنے اپنے ذوق طبیعت کی بات ہے

حضرت آدم علیہ السلام کی جو اولاد ہوئی تو اُس دور میں یا یوں کہئے اُس دور کی شریعت میں حقیقی بہن اور حقیقی بھائی کے درمیان شادی [illegible] تھا، مگر پھر اس کو حرام قرار دیدیا گیا ، کیا اس واقعہ کو شریعت محمدی کے لئے سند یا نظیر کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ جس چیز [illegible] یا حلال قرار دیدے، پھر اُس شے کی حرمت اور حلت پر کوئی کا فر اور ملحد ہی تنقید اور طنز کی جرأت کر سکتا ہے! شریعت محمدی میں سجدہ تعظیمی کو [illegible] دیدیا گیا، کسی صحابی نے تعظیم و تکریم کی نیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ نہیں کیا ـ اس صریح ممانعت کے بعد جو لوگ حضرت آدم [illegible] رت یوسف کے دربار " سجدہ کرنے " کا ذکر کرکے جس قسم کا تاثر پیش کرنا چاہتے ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم نہی کے مقابلہ [illegible] ی گمراہ کن جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں۔

صاحب مقالہ نے لکھا ہے :ـــ

" بخاری، مسلم اور تمام حدیثوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ سے کسی بات کو دریافت فرماتے تو صحابہ عرض کرتے کہ اللہ ورسولہ اعلم ـــ اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتا ہے ـ اگر اللہ کے ساتھ علم میں رسول کا نام شریک کرنا جائز ہوتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور صحابہ کو روکتے اور منع فرماتے یہ جملہ اس حدیث میں بھی ہے، جس میں حضورؐ نے شرک سے منع فرمایا ہے۔ (مرقاۃ ۸۴)

اس میں شرک کی کیا بات ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم بہر نوع صحابہ کے علم سے وسیع تر تھا کیونکہ حضور مہبط وحی الٰہی تھے! اللہ کے بعد تمام مخلوقات میں ہر فضل و کمال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل و اعلیٰ ہیں! حضورؐ صحابہ کرام سے جب کوئی بات دریافت فرماتے تو وہ استفہام دراصل " استفہام تبلیغی " ہوتا تھا، یعنی اس پیرایہ میں حضورؐ صحابہ کرام کو کسی ماضی یا مستقبل کے واقعہ کی خبر دینا چاہتے تھے کوئی دینی مسئلہ بتانا مقصود ہوتا تھا۔ جس عبارت میں شرک کا اشتباہ ہو سکتا تھا، اُس طرز گفتگو سے آپ نے صحابہ کرام کو ممانعت فرما دی تھی۔

اخرج فی شرح السنہ عن حذیفة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تقولوا ما شاء اللہ وشاء محمد وقولوا ما شاء اللہ وحدہ (مشکوٰة، باب الاسامی)

حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **یوں نہ بولا کرو " جو چاہے اللہ اور جو چاہے محمدؐ " یوں کہا کرو کہ جو اللہ تعالیٰ تنہا چاہے "**

ـــــ اور ـــــ

اخرج مسلم " عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یقولن احدکم عبدی و

"امتی کلکم عبید اللہ وکل نساءکم اماء اللہ ولا یقل العبد سیدی مولائی" فان مولاکم اللہ

مسلم نے ذکر کیا کہ ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یوں نہ بولے "میرا بندہ اور میری بندی" تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری عورتیں سب اللہ کی بندی ہیں، اور غلام بھی اپنے آقاؤں کو میرا مولا (مالک) نہ کہے، کیونکہ تم سب کا "مولا" (مالک) اللہ ہے!"

غلط استدلال

میکش اکبرآبادی لکھتے ہیں :—

"اللہ کے سوا کسی سے مدد مانگنا اور فریاد کرنا شرک نہیں ہے"

فاستغاثہ الذی من شیعتہ علی الذی من عدوہ (القرآن)

(سو وہ جو اُن کی برادری کا تھا، اس نے موسیٰ سے اُس کے مقابلے میں جو اُن کے مخالفین تھا مدد چاہی)

کون احمق یہ بات کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں ہم جو ایک دوسرے سے مدد چاہتے ہیں اور مدد کے لئے پکارتے ہیں —— یہ شرک ہے! شرک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اُسے جب بھی جہاں سے پکارا جائے، وہ ہماری آواز سُن کر ہماری مصیبت کو دُور کر سکتا ہے وہ حاضر و ناظر ہے! ساری دنیا کے رتی رتی بھر حال سے باخبر ہے، دنیا والوں کے غم و مصیبت دُور کرنا، اولاد و رزق دینے کا کام اللہ تعالیٰ نے اُسے سونپ دیا ہے! حضرت موسیٰ کو آپ کی زندگی میں اُس شخص نے مدد کے لئے اسی طرح پکارا تھا جس طرح ہم سب ایک دوسرے کو کسی کام کے لئے پکارتے اور آواز دیا کرتے ہیں! اس واقعہ سے یہ کس منطق کی رُو سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی زندگی میں دنیا کے پردے پر ہر پکارنے والے کی پکار سُن لیا کرتے تھے، یا آپ کے اُمتی آپ کو خبیر و علیم اور عالم الغیب سمجھ کر دور و دراز کی مسافت سے آپ سے استغاثہ کیا کرتے تھے۔

اور قرآن میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا :—

فلما احس عیسیٰ منھم الکفر قال من انصاری الی اللہ قال الحواریون نحن انصار اللہ

(سو جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے انکار دیکھا تو آپ نے فرمایا کوئی ایسے بھی ہیں جو میرے مددگار رہیں، اللہ کے واسطے، حواریین بولے ہم ہیں مددگار اللہ کے دین کے)

حضرت مولانا تھانوی نے "نحن انصار اللہ" کا ترجمہ "ہم ہیں مددگار اللہ کے دین کے" کیا ہے اور یہ صحیح ہے! کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کی مدد و نصرت سے بے نیاز ہے، ہر چیز اُس کی مدد اور سہارے کی محتاج ہے! مگر قرآن کریم میں :—

"نحن انصار اللہ"

آیا ہے، جس کا ترجمہ —— "ہم اللہ کے مددگار ہیں" —— ہے! یہ اللہ کا خاص احسان، کرم و عطا اور ذرہ نوازی اور قدر شناسی ہے کہ وہ اُن بندوں کو جو دین کے کام میں مدد دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ "انصار اللہ" کے لقب سے نوازتا ہے۔

اس آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام تک کو اپنے صحابیوں اور حواریوں کی مدد کی ضرورت لاحق ہوئی! دین و دنیا کے کسی کام میں لوگوں کو مدد کے لئے پکارنا، اور ان سے معاونت کی توقع رکھنا، اس سے آخر میکش صاحب کیا بات ثابت کرنا چاہتے ہیں!

"تعاونوا علی البر والتقویٰ"

(ایک دوسرے کی مدد کرو نیکی و تقویٰ پر)

—— اور ——

" فالذین آمنوا بہ وعزروہ ونصروہ "

(سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں، اور اُن کی حمایت کرتے ہیں اور اُن کی مدد کرتے ہیں)

ان آیات کے پیش کرنے سے میکش اکبرآبادی صاحب کے عقیدہ اور موقف کو آخر کیا تقویت پہونچی، اس غلط مبحث سے آخر وہ کیا فائدہ
نا اور کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ ہمیں اس بات کو پھر دہرانا پڑتا ہے کہ کون احمق یہ بات کہتا ہے کہ دنیا میں ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکارنا
چاہنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا شرک ہے! اس قسم کی پکار، تعاون، ضرورت اور احتیاج تو ایک فطری بات ہے! قرآن کریم کی ان آیتوں
فطری عمل رواج اور چلن بیان کیا گیا ہے، جو انسانوں کے درمیان پیش آیا کرتا ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی دینی قباحت نہیں ہے ——
بت اور کھلی ہوئی دینی قباحت اس عقیدہ میں ہے کہ کوئی شخص کسی زندہ یا وفات پائے ہوئے بزرگ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ اس
کی نگاہ سے ارض وسما کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، وہ عالم الغیب ہے، ہر کسی کے حالات سے باخبر ہے اللہ نے اسے دنیا کی معیت
کرنے اور ہر کسی کی فریاد دور و نزدیک سے سننے کا اختیار دیا ہے —— یہ عقیدہ مشرکانہ ہے کیونکہ یہ امور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے لئے
ص ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے اختیارات کسی نبی اور ولی کو نہیں دئے!

بیشک قرآن کریم سے انہی لوگوں کو گمراہی ملتی ہے جو اپنے فاسد عقائد یا مفاد نفس کے لئے قرآن کریم سے غلط استدلال کرتے ہیں اور
گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔

قرآن کریم سے اس قسم کے غلط استدلال اور قیاس مع الفارق استنباط کے بعد، میکش صاحب کا احادیث کے ساتھ سلوک ملاحظہ فرمایئے

" اللہ کے علاوہ دوسرے نقصان بھی پہونچا سکتے ہیں اور نفع بھی "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنگ اسود کو بوسہ دیتے وقت فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے نہ تو نقصان
پہونچا سکتا ہے اور نہ نفع —— تو حضرت علی نے فرمایا کہ یہ نفع بھی پہونچا سکتا ہے اور نقصان بھی! اور
پھر قرآن کی آیت پڑھی واذ اخذ ...... الی آخرہ! تو حضرت عمرؓ نے فرمایا میں اللہ سے پناہ مانگتا
ہوں ایسی قوم سے جس میں اے ابوالحسن آپ نہ ہوں (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری جزء رابع ص۶۰۶)

ہم نے جب میکش صاحب کا یہ مضمون پڑھا تو سخت خلجان ہوا کہ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس قول صحیح کی حضرت سیدنا علی کرم اللہ
وجہہ تردید کس طرح فرما سکتے ہیں، پھر جس آیت کو دلیل میں پیش کرنا، حضرت علی سے منسوب کیا گیا ہے اس آیت کا "نفع نقصان" پہونچانے کے مبحث
سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے آیت یہ ہے -

واذ اخذ ربک من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست
بربکم، قالوا بلیٰ ؕ شهدنا ......

(اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے اُن کی اولاد کو اور اقرار کرایا اُن سے اُن کی جانوں
پر، کیا میں نہیں ہوں، تمہارا رب بولے ہاں! ہم اقرار کرتے ہیں)

اس آیت میں ایسا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا جس سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہو یہ آیت اس
موضوع اور مبحث سے بالکل غیر متعلق ہے! ہم نے اصل کتاب کو دیکھا تو پتہ چلا کہ اس روایت کے آخر میں خود عمدۃ القاری میں ابو ہارون بن
جوین کو ضعیف لکھا ہے اور تہذیب التہذیب میں علامہ ابن حجر عسقلانی نے تفصیل سے بتایا ہے ابن جوین جو اس روایت کا اصل راوی ہے

اُس کو مشاہیر ائمہ جرح و تعدیل میں سے کوئی اُسے ضعیف، کوئی غیر ثقہ، کوئی متروک الحدیث، کوئی شیعی کہتا ہے، یہاں تک کہ بعض نے اس کو وضّاع اور کذاب تک کہا ہے! اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ ایسے راوی کی روایت حضرت عمرؓ کے قول کی تردید کے لئے کیا دلیل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے؟ حضرت عمرؓ کا یہ قول نہ صرف روایت بلکہ درایت کے اعتبار سے بھی غلط اور ناقابل اعتبار ہے!

اسی طرح میکش صاحب نے "بہجۃ الاسرار" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا ہے ــــ "جو کوئی مصیبت کے وقت مجھ سے فریاد کرے اس کی مصیبت دور کر دی جاتی ہے اور جو کوئی شدت کے وقت میرا نام لے کر مجھے پکارتا ہے تو اس کی پریشانی دور کر دی جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے اس قول کی نسبت درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ یہ قول کتاب و سنت سے متصادم اور کتاب و سنت کی مخالف، کوئی روایت اور کسی کا بھی قول دین میں قبول نہیں کیا جا سکتا! خود بہجۃ الاسرار کا کیا درجہ اور حیثیت ہے اس کے متعلق کشف الظنون میں لکھا ہے ــــ وذکر ابن الوردی فی تاریخہ ان فی البہجۃ اموراً لا تصح ومبالغات فی شان الشیخ عبدالقادر لا تلیق الا بالربوبیۃ ــــ ابن وردی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ کتاب "بہجۃ الاسرار" میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو صحیح نہیں اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے بارے میں ایسے مبالغے ہیں جو ربوبیت کے علاوہ اور کسی کے شایانِ شان نہیں! یہی بات ابن حجر عسقلانی نے بھی کہی ہے۔

اہل بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے مسلکِ ضلال کی تائید کے لئے کتاب اللہ سے وہ وہ نکتے تراشتے ہیں جو خود کتاب اللہ کی بنیادی تعلیم کے مخالف ہوتے ہیں اور ساتھ ہی آیاتِ قرآن سے غیر متعلق بھی! اسی قسم کا برتاؤ وہ احادیث رسول کے ساتھ کرتے ہیں! مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عمل سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضورؐ نے اور صحابہ نے کھانا، غلہ یا جنس وغیرہ سامنے رکھ کر اور ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی ہو اور اس کا ثواب کسی مردے کی روح کو پہنچایا ہو مگر اہل بدعت اس حدیث کو اپنی تائید میں پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں، بلکہ لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے تکثیرِ مقدار کے لئے غلہ، پھل یا کھانے پر ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی! اس حدیث میں یہ کہیں نہیں ملتا، کہ حضورؐ نے کسی کی روح کو اُس غلہ یا کھانے کا ثواب پہنچایا تھا! بات کچھ ہوتی ہے اور یہ لوگ اُس سے مطلب کچھ اور نکالتے ہیں!

قبروں پر ہار پھول چڑھانے کا مسلمانوں میں دستور نہیں رہا، حضورؐ نے کسی مسلمان کی قبر پر پھول نہیں چڑھائے اور نہ صحابہ کرامؓ نے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک پر پھولوں کی نذر پیش کی۔ یہ بدعتیں تو صدیوں کے بعد مسلمانوں میں رواج پائی ہیں ــــ ایک حدیث ہے اور صحیح روایت ہے کہ حضورؐ کہیں سے گزر رہے تھے، دو قبروں پر آپ نے درخت کی ہری شاخیں گاڑ دیں اور فرمایا ان قبروں پر عذاب ہو رہا تھا، شاخیں جب تک رہیں گی، اہل قبر کے لئے دعائے مغفرت کرتی رہیں گی۔ مگر اس حدیث سے یہ بات کسی عنوان بھی ثابت نہیں ہوتی کہ قبروں پر ہار پھول چڑھانا جائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبروں پر تکریم و عقیدت کے ساتھ پھول کب چڑھائے تھے، درخت کی شاخیں نصب فرمائی تھیں اور اس فعل کا مقصد تخفیف عذاب تھا! بزرگانِ دین کی قبروں پر اس نیت سے کون پھول چڑھاتا ہے کہ صاحبِ قبر پر عذاب ہو رہا ہے ان پھولوں کے سبب عذاب میں تخفیف ہو جائے گی۔

اہل بدعت اس قسم کی روایتوں سے جو استدلال کرتے ہیں وہ مضحکہ خیز ہوتا ہے! ان مولود خوانوں کا ماخذ مواہب لدنیہ[1] اور اسی قسم کی پانچویں درجہ کی کتابیں ہیں، جن میں نہ صرف ضعیف بلکہ موضوع روایتیں تک ملتی ہیں، جو مسلمان عربی نہیں جانتے اور نہ ان کا خاص دینی

[1] مواہب لدنیہ مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے اس کے مصنف قسطلانی ہیں جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم رتبہ تھے یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں (سیرت النبی جلد اول، علامہ شبلی نعمانی)

وہ عربی کی عبارتیں سن کر مرعوب ہو جاتے ہیں۔

وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ (الانفال)

اہل بدعت شاعرانہ انداز میں کیا کیا نکتے نکال لیتے اور کیسے کیسے حاشیے چڑھاتے ہیں،

یہ ہے کہ غزوہ بدر میں جب مسلمانوں سے کافروں کا مقابلہ ہوا تو حضورؐ نے اپنی مٹھی میں ریت لے کر شاہت الوجوہ پڑھا اور ریت پھینک دی اور وہ کنکریاں اور ذرے کافروں کی آنکھوں میں جا پڑے ـــــ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے خرق العادۃ بیان فرما رہا ہے کہ ہم نے تم میں یہ قوت پیدا کر دی تھی، ورنہ تم اپنے کسب اختیار سے یہ کام نہیں کر سکتے تھے! یہ آیت "توحید" نہایت روشن دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے بدر میں چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ریت کے ذرے پھنکوا دیے ل کو بدحواس اور پریشان کرنے میں مؤثر کام سرانجام دیا، دوسری طرف اُحد میں اللہ نے نہ چاہا تو حضورؐ سے کسی معجزہ اور ں کا صدور نہ ہو سکا، یہاں تک کہ آپ زخمی ہو گئے! یہ آیت اس لئے نازل کی گئی تھی کہ "شاہت الوجوہ" پڑھ کر ریت پھینکنے و کے سبب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی الوہی اور خلاقی تصرف کہیں منسوب نہ کریں، اس آیت کا پہلا جزیہ ہے۔

فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم

ں صحابہ کرام کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی، ساز و سامان اور اسلحہ کی قلت تھی مگر پھر بھی مسلمان اللہ تعالیٰ کے فضل سے آئے، یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ مجاہدین صحابہ کو مخاطب کر کے اپنا احسان جتا رہا ہے۔ کہ

"تم نے انہیں (یعنی کافروں کو) قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے قتل کیا"

صحابہ کے اختیار و قدرت کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی حکمت، مشیت اور قدرت کا اظہار فرما رہا ہے۔

عرب کے درمیان جو شدید مخالفتیں صدیوں سے چلی آ رہی تھیں، وہ بعثت نبوی کے بعد ختم ہو گئیں، خاص طور سے اوس بینہ عداوتوں کا خاتمہ ہو گیا، اور وہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے، اس "تالیف قلوب" اور "دلوں کے جوڑ دینے" ان لفظوں میں ظاہر فرماتا ہے۔

والف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبھم
ولکن اللہ الف بینھم (الانفال)

(اور الفت ڈال دی ان کے دلوں میں، اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارے کا سارا
تو نہ الفت ڈال سکتا، ان کے دلوں میں، لیکن اللہ نے الفت ڈال دی)

ت ہے کہ لوگ قرآن کریم میں اس قسم کی محکم آیتوں کو پڑھتے ہیں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ نبیوں، ولیوں، پیروں اور امات میں متصرف سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ بزرگانِ دین عالم برزخ سے ساری دنیا کے حالات کا مشاہدہ کرتے فریاد سنتے ہیں اور ان کی دستگیری فرماتے ہیں ـــــ یہ عقیدہ کتاب و سنت کے صریحاً مخالف ہے۔

میکش اکبر آبادی نے مرقاۃ کے حوالہ سے لکھا ہے ـــ

"لوگ شفا اور مقاصد حاصل کرنے کے لئے پانی لاتے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اپنا دست مبارک ڈبو دیتے"۔

یقیناً اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت کچھ خیر و برکت عطا فرمائی تھی! اس حقیقت سے کون مسلمان انکار کر

حاصل کر سکتا ہے، لباس، برتن، عصا، چٹائی اور دوسری چیزیں جو حضور کے جسم مبارک سے چھو جاتی تھیں وہ بابرکت تھیں مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں حیات تھے تو سارے جہان کو شفا آپ ہی عطا فرماتے تھے، اور اب عالم برزخ سے اس کام کو انجام دے رہے ہیں، صحابہ کرام کا آپ کی خدمت میں دعا اور شفا کی غرض سے حاضر ہونا خود اس کی دلیل ہے کہ جب صحابہ اپنے حالات آپ سے عرض کرتے تھے، تو آپ کو ان کی خبر ہوتی تھی! دنیا سے حضور کے تشریف لے جانے کے بعد۔ اب اس کا امکان کہاں رہا ہے کہ کوئی امتی آپ کی خدمت میں پانی لے کر جائے اور حضور اس میں اپنا دست مبارک ڈبو دیں اور وہ پانی برکت و شفا کا باعث بن جائے!

مشکوٰۃ کے حوالہ سے ایک اور روایت میکش صاحب نے لکھی ہے:—

"ربیعہ بن کعب سے روایت ہے کہ میں رات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا، پس میں حضور کے وضو کا برتن اور ضرورت کی چیزیں لایا، تو حضور نے مجھ سے فرمایا، مانگ تو میں نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ جنت میں آپ کے ساتھ رہوں، تو حضور نے فرمایا کہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی، میں نے عرض کیا کہ بس یہی مانگتا ہوں، تو فرمایا اچھا کثرت سجود اختیار کر، روایت کیا اس کو مسلم نے"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کبھی اعلان نہیں فرمایا کہ میں کونین کی ہر چیز دینے کا اختیار رکھتا ہوں، اس لئے اے میرے امتی تم مجھ سے سوال کیا کرو اور اپنی تمام حاجتیں میرے پاس لے کر آیا کرو! اور نہ صحابہ کرام کا یہ معمول تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجیب الدعوات اور قاضی الحاجات جان کر حضور سے ہر چیز مانگا کرتے تھے، ہاں! وہ حضور سے دعا کی درخواست کیا کرتے تھے! اس روایت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس صحابی کے دل کی حالت دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کس چیز کی طلب رکھتا ہے چنانچہ حضرت ربیعہ نے جنت میں آپ کی معیت کی تمنا ظاہر کی! اور دوبارہ سوال کرنے پر بھی انہوں نے یہی کہا اس پر آپ نے اس تمنا کے پوری ہونے کے لئے "کثرت سجود" کی شرط لگا دی! وہ صحابی دنیا کی کوئی نعمت مانگتے تو حضور کی دعا سے وہ بھی مل سکتی تھی اور معجزانہ طور پر تمام اسباب ظاہری مہیا ہو سکتے تھے۔ مگر صحابی نے آخرت کو دنیوی نعمت پر ترجیح دی۔

اللہ تعالیٰ جو کائنات کا خالق، مالک و مختار اور رب ہے، قرآن کریم میں جگہ جگہ بار بار فرماتا ہے کہ مجھ سے مانگو میں ہر کسی کی دعا کو سنتا ہوں اور سب کی مصیبتیں دور کرتا ہوں، میں ہی علیٰ کل شیءٍ قدیر ہوں، خبیر و علیم ہوں، جو چاہتا ہوں کرتا ہوں، میرے علاوہ کوئی بھی تمام جہان کی مصیبتیں دور نہیں کر سکتا، سب میرے محتاج ہیں، میں قیوم ہوں، صمد ہوں، مالک الملک ہوں، عزت اور ذلت صرف میرے ہاتھ میں ہے.....

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تمام اختیارات دیئے ہوتے، اور باذن اللہ سب کچھ حضور کے دست قدرت میں ہوتا تو واضح الفاظ میں اس قسم کا اعلان قرآن کریم کے ذریعہ کیا جاتا اور خود حضور کی زبان وحی ترجمان سے بھی بار بار سننے میں آتا — یا نہ صحابہ کرام کا یہ دستور رہا کہ وہ دور و نزدیک سے حضور کی دنیوی حیات میں اور وصال کے بعد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی دہائی دیتے ہوں اور آپ سے استغاثہ کرتے ہوں! اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے اختیار و قدرت کا بار بار اظہار فرمایا ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دئے ہوئے اور عطا کئے ہوئے اختیارات کا بھی اعلان فرما سکتا تھا۔

قرآن کریم میں حضور کو رحمۃ اللعالمین کہا گیا، اور رؤف و رحیم بھی، مگر نہ قرآن نے اس کا اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حکم سے دنیا کو رزق دیتے ہیں، اور ساری کائنات کی خبرگیری اور نگہبانی فرماتے ہیں اور نہ حضور نے اس طرح کا کوئی دعویٰ کیا! صحابہ کرام کو حضور کی وفات کے بعد کافروں سے کیسی کیسی جنگیں کرنا پڑی ہیں، اور کیسے کیسے نازک وقت آئے ہیں، حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو تو روضہ رسول کے متصل ہی مکان میں بلوائیوں نے گھیر لیا تھا، مگر خلیفہ سوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ نہیں کیا، حضرت علی شیر خدا ان حالات سے بہت

تھے آپ نے حضرات حسنینؓ کو حضرت عثمانؓ کے بچاؤ کے لئے بھیج دیا تھا مگر اجل صحابہ کی کوششوں، تمناؤں اور دعاؤں کے
جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے! جب یہ حالات ہوں تو ہم کس ولی، قطب، غوث اور قلندر کی مدح
ور حاجت روائی چاہیں اور اُن کے ناموں کی دُہائی دیں۔

یے چومنے کا کوئی مبہم سا اشارہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول میں نہیں ملتا اور نہ صحابہ کرام کا یہ عمل ملتا کہ وہ حضورؐ کی
لتے ہوں! مگر میکش صاحب قبر پرستوں کے مسلک سے الفت، وابستگی اور قربت رکھتے ہیں۔ انہوں نے عمدۃ القاری شرح بخاری
ھونڈ نکالی ہے ——

"محب طبری نے کہا ہے حجر اسود کے چومنے اور ارکان کے استلام سے یہ بات جائز ثابت کی جاسکتی ہے
کہ ہر وہ چیز چومی جاسکتی ہے، جس کے چومنے میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہو، کیونکہ اس بارے میں کوئی چیز
اگر استحباب ثابت کرنے کے لئے نہیں وارد ہوتی ہے تو اباحت ثابت کرنے کے بارے میں بھی کوئی چیز وارد نہیں
ہوتی ہے اور فرمایا کہ میں نے اپنے جد محمد بن ابی بکر کی تفسیر میں امام ابو عبداللہ محمد بن ابی الصیف
سے روایت دیکھی ہے کہ وہ لوگ جب قرآن کو دیکھتے تو اسے بوسہ دیتے جب حدیث کو دیکھتے تو اُسے بوسہ
دیتے اور جب صالحین کی قبروں کو دیکھتے تو انہیں بوسہ دیتے۔"

ب وسنت میں جب قبروں کے چومنے کی اجازت نہیں ملتی اور صحابہ کرام قبر رسولؐ کو بوسہ نہیں دیا کرتے تھے —— اس صورت میں ابو
ابی الصیف کی روایت دین میں کیا درجہ رکھتی ہے کہ کچھ لوگ ایسا کیا کرتے تھے! اصل روایت میں "بعضھم" آیا ہے —— بعض
ں کو کرنا دین میں سند و حجت تو نہیں بن سکتا۔ ایسی مجہول روایتیں دین میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، پھر جو بات اس روایت
دہ یہ ہے کہ —— "ہر وہ چیز چومی جاسکتی ہے، جس کے چومنے میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہو" قبروں کے چومنے سے اللہ تعالیٰ کی
تو ہے چومنے کی جو [illegible] اور غایت اس روایت میں بیان کی گئی ہے اُس کے اعتبار سے قبروں کو چومنا درست نہیں کہ قبر کی تعظیم
ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

ین اطاعت اور تسلیم و رضا کا نام ہے، اٹکل پچو قیاس آرائی کا نام نہیں ہے، خود کعبۃ اللہ میں، حجر اسود کے علاوہ کسی اور مقام کے
ہیں دیا گیا، اس لئے رکن یمانی ہو یا مقام ابراہیم یا ملتزم اُن کا چومنا درست نہیں۔
سنتِ نبوی اور عہدِ صحابہ کے چند صدیوں کے بعد مسلمانوں نے کچھ طریقے نکال لئے ہوں اور بعض بزرگ کسی مسئلہ کے بارے میں یہ
اس میں کیا حرج ہے! —— تو یہ عمل اور قول دین میں حجت و سند نہیں بن سکتے! دینی مسائل میں کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ کی سند و مثال
ہے!

اہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تفسیر کا ایک اقتباس اس مضمون میں دیا گیا ہے: ——

"اس موقع پر جان لینا چاہیے کہ اگر خدا کے علاوہ کسی غیر خدا پر بھروسا کر لیا جائے اور اُسے خدا کی مدد کا مظہر
نہ سمجھا جائے تو اس سے مدد مانگنا حرام ہے اور اگر التفات خدا کی جانب ہو اور غیر خدا کو خدا کی مدد کا مظہر
سمجھا جائے اور اسبابِ حکمت کے کارخانے پر نظر رکھتے ہوئے خدا کے سوا کسی سے ظاہری مدد مانگی جائے تو یہ بات
عرفان سے دور نہیں ہے اور شریعت میں جائز ہے، پیغمبروں اور اولیاء اللہ نے غیر خدا سے اس قسم کی مدد مانگی
ہے درحقیقت یہ مدد غیر سے نہیں ہے بلکہ خدا ہی سے ہے۔"

شاہ صاحب پہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، آن کی اس تحریر سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولیاء اللہ اور انبیاء کرام تک کو غیر خدا کی پڑی ہے مثلاً کوئی ولی یا نبی بیمار ہوگیا ہے، ضعف کے سبب چل نہیں سکتا، تو اس نے چلنے میں دوسروں کی مدد لی ہے اسی طرح نبی یا ولی نے بچوں کی حفاظت و نگرانی کے لئے کسی دوسرے آدمی کو مقرر کیا ہے یہ بھی ایک طرح کی مدد ہے۔ اس عبارت سے تو اولیاء اور انبیاء کا احتیاج ہوتا ہے!

قرآن کریم میں جو ـــــ ایاک نعبد وایاک نستعین ـــــ آیا ہے اس کی شرح و تفسیر میں حضرت شاہ عبدالعزیز نے یہ، ہے کہ ہم سب ایک دوسرے سے دنیوی کاموں میں جو مدد مانگتے ہیں، یہ جائز ہے کیونکہ ہم یہ سمجھ کر مدد مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو یہ قدرت دی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت کی بنا پر ہماری مدد کر رہا ہے۔ یعنی میں اپنے ملازم کو پانی پلانے کے لئے پکارتا ہوں تو یہ اور مدد کے لئے اُسے بلانا "ایاک نستعین" کے اصول کے منافی نہیں ہے، میرا یہ عقیدہ ہے کہ نوکر کو پانی پلانے اور چلنے پھرنے کی طاقت اُسے عطا کی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت کی بنا پر مجھے پانی پلا سکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی اس تفسیر میں یہ کہاں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور اولیاء کو اپنے تمام اختیارات سونپ دیئے ہیں تم ان سے مانگا کرو اور دور و نزدیک سے اُن کے ناموں کی دہائی دیا کرو۔ اور انہوں نے اگر کہیں ایسا لکھا ہے تو کتاب و سنت کے مقابلہ میں اُن کے قول کو نہیں کیا جائے گا۔

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں اپنے گھر میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دفن ہیں، داخل ہوتی تھی اور کپڑے پہننے میں احتیاط نہ کرتی اور یہ کہتی تھی کہ یہ میرے شوہر ہیں اور یہ میرے باپ (ابوبکر صدیق) ہیں، لیکن جب عمرؓ اُن کے پاس دفن کر دیئے گئے تو قسم خدا کی میں نہ جب بھی گئی تو اچھی طرح کپڑا اوڑھ کر گئی، کیونکہ مجھے عمرؓ سے شرم آتی، روایت کیا ہے اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے" (ترجمہ مشکوٰۃ شریف)

روایت اپنی جگہ صحیح ہے، اس سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی فرط شرم و حیا ثابت ہوتی ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب غسل خانہ نہاتے تھے تو اُس وقت بھی برہنہ نہیں ہوتے تھے، یہ آن کی شدت حیا تھی، مگر اُن کی یہ شدتِ حیا غسل کے مسائل میں قانون نہیں بن سکی!

فاضل مضمون نگار کا یہ لکھنا کہ لوگوں نے یہ کیا ـــــ لوگوں نے وہ کیا ـــــ فلاں قبر (امام بخاری) پہ جا کر لوگ روئے اور بارش کی اور اللہ نے پانی برسا دیا ـــــ دین میں حجت نہیں ہو سکتا، اگر یہ لوگ "صحابہ" ہوتے تو ان کا فعل دین میں نظیر بن سکتا تھا، بعد کچھ لوگ کوئی عمل کرنے لگیں اور وہ عمل فائدہ مند ثابت ہو جائے، تو ایسا عمل شریعت میں نظیر تو نہیں بن سکتا! ہم سے تعزیہ بنانے والے کہ تعزیہ داری کی برکت ـــــ سے ہمارے دلدّر دور ہو گئے! لوگوں کے تجربوں اور مشاہدوں سے چاہے وہ اہل اللہ ہی کیوں ہوں دین و شریعت کے کسی مسئلہ کی تشکیل نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت پہ لوگوں کا تجربہ اور مشاہدہ اثر انداز نہیں ہو سکتا ـــــ کسی ولی کے قول و عمل اور تجربہ و مشاہدہ سے دین کے کسی مسئلہ میں نہ اضافہ ممکن ہے اور نہ ترمیم! دین کے معاملہ میں کتاب و سنت کی دلیل اور صحابہ کی نظیر چاہئے!

اس مضمون میں متعدد روایتیں نقل کی گئی ہیں کہ مُردے سنتے ہیں، مردہ قبر میں زندگی رکھتا ہے، مردہ سلام کا جواب دیتا ہے ـــــ مگر روایتوں میں یہ کہیں نہیں آیا کہ یہ مُردے جو قبروں میں سنتے اور سلام کا جواب دیتے ہیں ان سے تم مرادیں مانگا کرنا اور یہ تمہاری حاجت روائی کیا

قرآن کریم میں اولیاء اللہ کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے ـــ

الا ! ان اولیاء اللّٰہ لا خوفٌ علیھم ولا یحزنون

ـ یہ کہا گیا ہے کہ اولیاء اللّٰہ پہ نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ـــــ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اولیاء اللّٰہ عالم برزخ
کے غم اور پریشانیوں کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ اس آیت میں اُن کی کسی دوسری قدرت و اختیار کا بیان کیا گیا ہے اگر
م کا کوئی اختیار اللّٰہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہوتا تو اُس کے تذکرے کا یہ بہترین محل اور موزوں ترین موقعہ تھا۔

" حجۃ الاسلام امام غزالی نے فرمایا ہے کہ ہر وہ شخص جس سے اُس کی زندگی میں مدد مانگی جا سکتی ہے اُس کی موت
کے بعد بھی اس سے مدد مانگنی چاہیے"

ش صاحب نے امام غزالی کا یہ قول اُن کی کس کتاب سے لیا ہے؟ اس کا حوالہ نہیں دیا ! جب کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ میں کوئی قول نہیں
ے مُردوں سے مدد مانگی جا سکتی ہے، تو امام غزالی کا قول نقل فرما دیا !
راس قول کی نسبت امام غزالی رحمۃ اللّٰہ علیہ سے صحیح ہے تو یہ قول عقل و روایت کی رُو سے نادرست اور غلط ہے ! میرا ایک ملازم جو میرے
یں میری مدد کیا کرتا ہے وہ فوت ہو جاتا ہے، میں اُس کی قبر پہ جا کر کیا اُس سے اس قسم کی مدد مانگ سکتا ہوں کہ مجھے پانی پلا دے؟ بستر بچھا دے
ر ترکاری لا دے ! ایک اہل اللّٰہ ہیں جو مجھے قرضِ حسنہ دیا کرتے ہیں اُن کا انتقال ہو جاتا ہے کیا میں ان بزرگ کی قبر پہ جا کر اُن سے یہ
ر سکتا ہوں کہ آپ مجھے قرضِ حسنہ عنایت فرما دیجیے ـــــ یہ اہل بدعت کتنے کمزور اقوال اور کیسی ضعیف بلکہ بعض اوقات واہی
ے مسلک کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے خود صاحب قبر کی مغفرت کی دُعا کے لیے تلقین کی ہے اور زیارت قبر کی غایت یہ بتائی ہے کہ ـــــ

فانھا تزھد فی الدنیا وتذکر الآخرۃ

(یہ چیز (یعنی زیارت قبر) دنیا سے بے رغبت کرتی ہے اور آخرت کی یاد دلاتی ہے)

نہیں فرمایا کہ صاحب قبر سے مدد چاہا کرو یا اس سے اپنے لیے اللّٰہ تعالیٰ کے دربار میں دعا کرنے کی درخواست کیا کرو، نہ اس کا حکم دیا کہ دین و
ی کے لیے اولیاء اللّٰہ کی قبروں پہ جا کر دعا مانگا کرو کہ وہ قبولیت دُعا کے مقامات ہیں ـــــ زیارتِ قبر کا کیا مقصد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ
ن فرمایا تھا اور امتیوں نے اُس "مقصد" ہی کو اُلٹ کر رکھ دیا۔

سیکش صاحب کے مضمون میں یہ عبارت نقل کی گئی ہے :ـــــ

" اس (یعنی روایت ربیعہ بن کعب کی روایت کی) شرح میں ملّا علی قاری فرماتے ہیں "سوال کرنے کا مطلب
یہ ہے کہ مجھ سے اپنی حاجت طلب کر، ابن حجر نے کہا ہے کہ یعنی میں تجھے تحفہ دیتا ہوں، تیری خدمت کے
مقابلہ میں کیونکہ کریم کی شان یہی ہے اور حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی کریم نہیں ہے" اور سوال کا حکم مطلق
طور سے لانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے اپنے خزانوں میں سے جو بھی حضور چاہیں، اس سے بخشنے
اور دوسروں کو دینے کا اختیار دے دیا تھا۔ اسی لئے ہمارے اماموں نے حضور کی خصوصیات میں بیان کیا ہے
کہ وہ جو چاہیں اور جس کو چاہیں دے سکتے ہیں جیسے کہ حضورؐ نے خزیمہ ابن ثابت کی ایک گواہی کو دو گواہی کے
برابر قرار دے دیا جیسے بخاری نے روایت کیا ہے اور اسی طرح ام عطیہ کو نوحہ کرنے کی اجازت دے دی"
جیسے مسلم نے روایت کیا ہے (مرقاۃ)

اس روایت کا ماحصل کیا ہے ! یہ کہ حضور کو اللّٰہ تعالیٰ نے نبی اور رسول بنا کر بھیجا تھا۔ اور حضور وحی جلی (قرآن کریم) کے علاوہ وحی خفی کی

بنا پر بھی دین و شریعت میں احکام دیتے تھے، اور کسی کسی صحابی کے لئے عموم میں تخصیص بھی فرما دیتے تھے — چنانچہ حضور نے حضرت خز[یمہ] کو دو گواہیوں کے مماثل قرار دے دیا اور اُم عطیہ کو نوحہ کرنے کی اجازت دے دی، اس روایت میں اولاد رزق اور سوال و دولت کہیں ذکر نہیں ہے، اس میں رخصت و تخصیص کا ذکر ہے اس کا حضور کو اختیار دیا گیا تھا۔

ایک اور روایت :—

"اور جب سواری کا جانور بھاگ جاتے تو چاہیے کہ پکارے اے اللہ کے بندو میری مدد کرو، اس حدیث کو بزار نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اور ابن السنی نے حضرت ابن مسعودؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی سواری کا جانور چٹیل میدان میں بھاگ جائے، تو پکارو، اے عباد اللہ! اسے پکڑ دو، تو اللہ کے خاص بندے زمین پر ہیں، جو اُسے پکڑ لیں گے ...... روایت کیا ہے اسے طبرانی نے زید بن علی سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ جب تمہاری کوئی چیز کھو جائے، یا تم مدد مانگنا چاہو، اور تم ایسی جگہ ہو، جہاں کوئی انیس نہ ہو تو چاہیے کہو یا عباد اللہ! میری مدد کرو، یو نہی دو بار، اس لئے کہ اللہ کے ایسے خاص بندے ہیں جن کو تم نہیں دیکھتے ...... " (حصن حصین)

ظفر جلیل، حصن حصین کی شرح ہے، اس میں لکھا ہے :—

"یہاں اس حدیث کے بیان میں کچھ تحقیق لکھی جاتی ہے کہ حقیقت اس حدیث کی واذا اراد عونا — کے ظاہر ہو اس لئے کہ جن لوگوں کے دلوں میں استمداد یعنی مدد غیر خدا سے چاہنی سما گئی اور طبیعتوں میں رچ گئی ہے وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور حجت پکڑ کے گمراہ ہوتے ہیں، پس جاننا چاہیے کہ غیر خدا جل شانہ سے مدد چاہنے میں اس حدیث سے استدلال کرنے، خواہ اموات ہوں، تو اصلاً جائز اور درست نہیں اور ممکن نہیں کئی وجہوں سے اول وجہ یہ کہ اس حدیث کی سند میں ابن حسان راوی ہے جو اہل حدیث کے نزدیک ضعیف ہے، جیسا کہ کہا ہے ہیثمی نے، اور ایک راوی اور، اس حدیث کے راویوں میں — عتبہ بن غزوان — مجہول الحال ہے — پس اس سبب سے ایک راوی اس حدیث کا ضعیف اور ایک مجہول الحال ہے یہ حدیث اعتماد کے قابل اور احتجاج کے لائق نہ رہی اور مراد عباد اللہ سے ملائکہ ہیں کہ حفاظت و نگرانی کے واسطے مقرر ہیں نہ کہ اموات اور مردے ......

مسئلہ — جیسے کہ لوگ کہتے ہیں یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ یا جیسے کہ جاہل کہتے ہیں یا خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی، یہ جائز نہیں ہے۔"

کتاب و سنت کے بے شمار واضح احکام و شواہد کے مقابلہ میں :—

"یا عباد اللہ! اعینونی"

والی تنہا روایت، "حجت" کس طرح بن سکتی ہے، جب کہ یہ روایت صحت کے درجہ کو بھی نہیں پہونچتی، اور اس میں علتیں اور کمزوریاں پائی جا[تی ہیں] صحت سے گری ہوئی ایک روایت جس سے قرآن کی متعدد آیتوں اور سینکڑوں حدیثوں کی مخالفت ہوتی ہو کس طرح قبول کی جا سکتی ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں پس جب میں اُس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی سماعت ہو جاتا ہوں

جس سے وہ سُنتا ہے اور میں اس کی نظر ہو جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اُس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اُس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اُس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے"

اس کے بعد میکش صاحب لکھتے ہیں :۔

"خدا جس بندے کے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں ہو جائے کون سا کام ہے جو وہ نہیں کر سکے گا، ایسے اولیاء سے مدد مانگنا کس طرح حرام ہو سکتا ہے، مولانا روم نے ایسے ہی بندوں کے لئے کہا ہے ۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ   تیر جستہ باز گرداند ز راہ

حدیث کا اگر یہی مفہوم لیا جائے جو میکش اکبرآبادی نے بیان کیا ہے تو اس سے عقیدہ "حلول" کو تقویت پہونچتی ہے جو گمراہی کا عقیدہ ہے اللہ انسانی اجسام میں حلول نہیں کرتا پھر واقعات و شواہد کی بنا پر یہ مفہوم صحیح ثابت نہیں ہوتا ۔ مثلاً انبیاء کرام سے بڑھ کر اس حدیث کا مصداق اور کون ہو سکتا ہے مگر قرآن کریم کہتا ہے :۔

فقال احطت بما لم تحط به وجئتك من سبا بنبا يقين (النمل)

ہد ہد نے حضرت سلیمان سے یہ کہا ہے کہ میں ایسی چیز کی خبر لایا ہوں، جس کی آپ کو خبر نہ تھی" ـــ میکش صاحب نے اس حدیث کا جو مفہوم لیا ہے اس کی بنا پر اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کی "نگاہ" بن گیا تھا، تو ملک سبا کے حالات و مناظر آپ کو نظر آنے چاہیے تھے ـــ قرآن کریم کی دوسری آیت ہے

فلما رآ ايديهم لا تصل اليه نكرهم واوجس منهم خيفة قالوا لا تخف انا ارسلنا الى قوم لوط

(پھر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر تو کھٹکا اور دل میں ان سے ڈرا، وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں قوم لوط کی طرف)

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام فرشتوں کو نہیں پہچان سکے ، حالانکہ حدیث کا جو مفہوم میکش نے بیان کیا ہے اُس کے مطابق اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم کی نگاہ بن گیا تھا، اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام برسوں حضرت یوسف کے حالات سے باخبر ہے اور چہیتے بیٹے کے غم جدائی کی کوئی حد نہیں رہی ۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض الموت میں یہ حالت ہو جاتی ہے کہ غشی آجاتا ہے اور صحابہ کرام کی مدد کے بغیر چل نہیں سکتے اگر اللہ تعالیٰ حضور کے ساتھ ہاتھ پاؤں بن گیا تھا تو آپ کو گھر تک رفاقت والوں کی کیوں ضرورت پیش آتی تھی۔

انبیاء کرام کے بعد صحابہ سے بڑھ کر قرب نوافل کا حق اور کون ادا کر سکتا ہے اُن کا واقعہ اوپر گزر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک انگشتری حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے کنوئیں میں گر گئی تھی ، انہوں نے لاکھ ڈھونڈی مگر نہیں ملی !

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کے بندے جو نوافل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے ہیں ، اُن کے جوارح و اعضاء اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہو جاتے ہیں، بہ تقاضائے بشریت کبھی کبھار بھول چوک ہو جائے تو دوسری بات ہے، نفسانی خواہش کی بنا پر اُن کے ہاتھوں سے کوئی برا کام سرزد نہیں ہوتا ، اُن کے پاؤں گناہ کی منزل میں نہیں اُٹھتے ، اُن کی آنکھ چوری نہیں کرتی اور اُن کے کان بُری باتیں نہیں سُنتے اور وہ لہو ولعب میں مشغول نہیں ہوتے ۔ حدیث میں اہل اللہ کے کمال تقویٰ کو اس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور اس عصمت کامل کا نمونہ اور اس حدیث کے مفہوم کا حقیقی مصداق انبیاء کرام علیہم السلام تھے ۔

جہاں تک قبروں کا معاملہ ہے اولیاء کرام کے اجسام کی نسبت سے اُن کی برکت ظاہر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک قبر تو سراپا

برکت ہے، لیکن دین وشریعت میں قبروں پر جاکر دعائیں کرنے کی تعلیم نہیں دی گئی، اور نہ اس کی اجازت دی گئی کہ ہم اہل قبور سے عرض ومعروض کریں اور ان سے مدد چاہیں۔ اس باب میں عام لوگوں یا بعض بزرگوں کے تجربے اور صدیوں بعد مسلمانوں نے عرس ونیاز کی جو رسمیں نکال لی ہیں، وہ دین میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، کہ ان سے استدلال کیا جائے!

حیرت ہے کہ میکش صاحب —

"وانما انا قاسم واللہ یعطی"

والی روایت کو اپنے مسلک کی تائید میں نقل کر نا کس طرح بھول گئے، اصل عبارت یہ ہے جس کا ابتدائی حصہ اہل بدعت حذف کر دیتے ہیں: —

من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین وانما انا قاسم واللہ یعطی

(جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں تو بانٹنے والا ہوں اللہ دینے والا ہے)

حدیث کے الفاظ خود بول رہے ہیں اور عبارت کا سیاق وسباق بتا رہا ہے یہاں "عطا" سے مال اور رزق و دولت کی عطا اور تقسیم مراد نہیں ہے، علامہ تور بشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم وحکمت عطا فرماتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کی یہ حکمت صحابہ کو بتاتے (تقسیم فرماتے) تھے! وہ حکمت حدیث کی کتابوں میں محفوظ اور مرقوم ومسطور ہے، اور کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وحکمت سے بے نیاز ہو کر دین میں فلاح وسعادت حاصل نہیں کر سکتا — "حدیث دراصل قرآنی آیت — یعلمھم الکتاب والحکمۃ — کی شرح وتفسیر ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر —

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ　　　تیر جستہ باز گرد انند راہ

اپنی جگہ درست ہے اولیاء اللہ کی کرامات کا کون منکر ہے مگر کتاب وسنت میں یہ کہیں نہیں آیا کہ اولیاء اللہ جن سے کرامات کا صدور ہوتا ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے سارے جہان کی پرورش، نگہداشت اور دستگیری ومشکل کشائی کا اختیار بھی دیدیا ہے! جو اولیاء اللہ کمان سے چھوٹتے ہوئے تیر کو واپس لا سکتے ہیں، وہ قدرت ومشیت کے سامنے مجبور بھی نظر آتے ہیں! سامنے کی مثال یہ ہے کہ ہمارا اپنا زمانہ اولیاء اللہ سے تو خالی نہیں ہو سکتا ہندوستان سے لے کر قبرص، حبش اور فلسطین تک مسلمانوں پر جو قیامتیں ٹوٹ رہی ہیں ان پر ہر اہل ایمان کا دل روتا ہے، اولیاء اللہ بھی یقیناً دشمنان اسلام کی تباہی اور بربادی اور ملت اسلامیہ کے غلبہ کے لئے دعائیں کرتے ہوں گے، مگر ہو وہی رہا ہے جو مشیت کو منظور ہے۔ اولیاء اللہ کی دعائیں بھی قبول نہیں ہو رہی ہیں! انبیاء کرام سے بڑھ کر اللہ کا دوست (ولی اللہ) اور کون ہو سکتا ہے، وہ بھی مشیت وقدرت کے سامنے بے اختیار اور مجبور تھے! حضرت نوح علیہ السلام اپنے لخت جگر کو ڈوبنے سے نہ بچا سکے، بیٹے کی محبت نے جوش مارا اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تو جواب تنبیہ آمیز انداز میں ملا۔

کتاب وسنت معیار حق ہے

جناب میکش صاحب نے ابن حجر مکی، شاہ ولی اللہ، نواب سید صدیق حسن خاں وغیرہ کی تحریروں کے اقتباس پیش کئے ہیں ان میں یقیناً ایسی باتیں ملتی ہیں، جن سے اہل بدعت کے مسلک کو تقویت پہونچتی ہے۔ — مگر —

دین میں اصل اعتبار کتاب وسنت کا ہے اور اس کے بعد اجماع صحابہ سے سند لی جا سکتی ہے، قرآن کریم میں یہی حکم دیا گیا ہے کہ دین کے کسی مسئلہ میں نزاع ہو تو اللہ اور رسول سے رجوع کرو، یعنی کتاب وسنت کی کسوٹی پر اس نزاعی مسئلہ کو پرکھو! اسلامی ادب میں کتابیں بھری پڑی ہیں جن میں اخلاف نے اسلاف سے دینی مسائل میں اس لئے اختلاف کیا ہے کیونکہ اسلاف کے اقوال میں کمزوریاں نظر آئیں، حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد

...مل میں امام اعظم سے اختلاف الرائے ہیں۔

...ں میں جب سے یونانی فلسفہ، ایرانی زروانیت، یہودیت کی ویدانت اور عجمی تصوف کو جس حد تک بھی اثر و نفوذ کا موقعہ ملا، اسلامی
...بڑا تکلف پیدا ہو گیا! اور یہ تکلف اُن کے عقائد تک پر اثر انداز ہوا، پھر دین کے نام پر وہ رسمیں جاری ہو گئیں، جو بدعت کا
...، جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا ان میں اضافے ہی ہوتے چلے گئے۔ اس ماحول میں جن لوگوں نے آنکھیں کھولیں، وہ جب خود صاحب
...ے تو اپنے بچپن اور جوانی کے ماحول کو پوری طرح دل و دماغ سے زائل نہ کر سکے، اس لئے اُن کے ملفوظات اور کتابوں میں ان
جھلکیاں بھی ملتی ہیں ——— اہل بدعت کتاب وسنت، آثار صحابہ اور باقیات تابعین کے مقابلہ میں ان بزرگوں کی تحریروں
اور اسی طرح رد حق وصداقت معلوم کرنے کی اس ترتیب ہی کو الٹ دیتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے ——— یعنی بزرگوں کے اقوال
کی کسوٹی پہ جانچنے اور پرکھنے کی بجائے، یہ لوگ کتاب وسنت کو بزرگوں کے اقوال کے معیار پہ جانچتے ہیں!
...با چھٹی صدی ہجری کے بعد کی کتابوں میں اس قسم کے خلجانات اور اضطرابات ملتے ہیں اور پھر آگے چل کر ان اضطرابات اور شدو ولیدگیوں
...ا چلا گیا ہے!

...ت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی بزرگی اور تبحر علمی اپنی جگہ مسلم ہے مگر وہ اپنی مشہور کتاب "اخبار الاخیار" میں صلوٰۃ
درج کرتے ہیں اور اس پر نکیر نہیں فرماتے، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے مگر ان کے سلسلہ
...کے منفرد کا نام پڑھ کر دل سخت خلجان اور وحشت محسوس کرتا ہے، کہ "قیومیت" تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت اور شان ہے اس کی نسبت
...درست نہیں۔

...طب" کا یہ تصور کہ اللہ تعالیٰ ہر خطہ کے انتظام کے لئے ایک ولی کو مقرر فرماتا ہے اور وہی "قطب" اس خطہ کے سیاہ وسپید کا مالک ہوتا
...سے ماخوذ ہے! یہی باطنی عقیدہ، سفر کے لئے امام ضامن باندھنے کی رسم اختیار کر گیا۔

...آخری صدیوں کے ملفوظات اور کتابوں کے وہی اقوال قبول کئے جا سکتے ہیں، جو کتاب وسنت کے عین مطابق ہیں جہاں کتاب وسنت سے
...طابقت نہیں ہوتی، یا اس قسم کا جھول، ابہام اور رمز واشاریت پائی جاتی ہے جس سے توحید کے تقاضے غبار آلود ہوتے نظر
...یسی تحریر، قول اور رسم کو رد کر دیا جائے گا۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کتنے بڑے بزرگ اور خانوادۂ چشت
...ہیں مگر جب ان سے یہ روایت منسوب کی جائے، کہ وہ حج کا ارادہ رکھتے تھے، مگر پاک پٹن میں اپنے پیر و مرشد کے یہاں حاضری دینے
...رنے نہیں گئے کہ وہاں کی حاضری سے حج کا مقصد پورا ہو گیا ——— تو ان کی بزرگی اور دینی عظمت کے باوجود حضرت سلطان جی کی
...اور عمل پر نکیر ہی کی جائے گی! حق شخصیتوں سے بلند ہے اور کسی کی بزرگی اور احترام کی خاطر دین کے اصول نہیں بدلے جا سکتے۔
...حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں جہاں جہاں بدعت و شرکت پر شدید نکیر کی ہے اُسے قبول کیا جائے گا، مگر جب
...یہ وہ ...

"بزرگوں کی روح کی طرف توجہ کرنا چاہئے، ان پر فاتحہ پڑھے، ان کی قبروں کی زیارت کرے اور اُن
سے انجناب کی بھیک مانگے" (ترجمہ لمعات .....)

...کے آخری جملہ کو قطعی نظر انداز کر دیا جائے گا کہ ہم مذہب خلوص اور سوز و درد کی بھیک بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی چاہئے!
...یہ مسلمات سے ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے، مگر ایک دعا کا بہر صورت نے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح کہا ہے ان مورخین
...و نیک نیتی کے باوجود اُن کی یہ بات نہیں مانی جائے گی! ختم نبوت پر ہر مسلمان کا ایمان ہے مگر شیخ محی الدین عربی نے خاص انداز سے کلام کیا ہے

کہ قادیانی اُن کا قول اپنے مسلک کفر و ضلال کی تائید میں پیش کرتے ہیں ـــــ اس قسم کی رمزیت اور ایہام بہرحال پسندیدہ نہیں چاہے وہ کسی سے بھی منسوب کیوں نہ ہو ۔

حرفِ آخر میکش صاحب نے راقم الحروف پر "نئے دیندار" کی طنز کی ہے، مگر امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں، جنہوں نے آٹھ سو سال قبل پر اہلِ بدعت کے مسلک پر نکیر کی تھی ـــــ

"جن بت پرستوں نے اصنام و اوثان اپنے انبیاء اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہوں گے تو یہ اکابر اللہ تعالیٰ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے اس کی نظیر اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں سے مشغولیت ہے اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان کی قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے" (ترجمہ)

قاضی حمید الدین ناگوری جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مستفیدین میں فرماتے ہیں ـــ

"منهم الذين يدعون الانبياء والاولياء عند الحوائج والمصائب باعتقاد ان ارواحهم حاضرة تسمع النداء [illegible] الحوائج وذلك شرك قبيح وجهل صريح قال الله تعالىٰ ومن اضل ممن يدعوا من دون الله . . . . . "

(بعض لوگ ہیں جو انبیاء اور اولیاء کو حاجت اور مصیبت کے وقت اس اعتقاد سے کہ اُن کی ارواح حاضر ہوتی ہیں اور ان کی حاجتوں کو جانتے ہیں ـــ پکارتے ہیں یہ شرک قبیح اور جہل صریح ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ـــــ جو لوگ اللہ کے سوا غیر اللہ کو پکارتے ہیں اُن سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا)

اس نوبت پر کہا جا سکتا ہے کہ فلاں بزرگ نے جو اشعار میں اولیاء اللہ سے مدد مانگی ہے اور فلاں کے ملفوظات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا گیا ہے ـــــ اس کے جواب میں عرض ہے کہ حضرت قاضی حمید الدین ناگوری کا قول اس لئے قابل قبول ہے کہ اس کی پوری پوری تائید کتاب و سنت سے ہوتی ہے اور اُن بزرگ کے اشعار اور شیخ طریقت کے ملفوظات اس لئے رد کر دینے کے قابل ہیں کہ یہ اشعار اور ملفوظات کتاب و سنت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے ۔

فتاویٰ بزازیہ میں ہے ـــــ من قال ارواح المشائخ حاضرة وتعلم يكفر ـــ یعنی جو شخص (یہ عقیدہ رکھے) اور یوں کہے کہ ارواح مشائخ حاضر ہیں اور ہمارے حالات کو جانتی ہیں ـــ وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے ۔

فتاویٰ عزیزیہ میں ہے ـــــ

"منت بزرگاں، نذر غیر اللہ مانند گلگلہائے شیخ سدو سہمنی بوعلی قلندر وغیرہ قریب حرام است"

دُرِ مختار میں ہے ـــــ

اعلم ان النذر الذي يقع الاموات من اكثر العوام وما يوخذ من الدراهم والشمع والزيت نحوها الى ضرائح الاولياء الكرام تقرباً اليهم فهو بالاجماع باطل وحرام

(تو جان لے کہ نذر جو اموات کے لئے واقع ہوتی ہے اکثر عوام کی طرف سے، روپیہ پیسہ چراغ اور تیل وغیرہ اولیاء اللہ کی قبروں کی طرف، تقرب کے لئے، وہ بالاجماع باطل اور حرام ہے ۔)

شیخ عبدالحق دہلوی (شرح) سفر السعادت میں لکھتے ہیں ـــــ

عادت . . . . نبود کہ برائے میت در غیر وقت نماز جمع شوند وقرآن خوانند وختمات خوانند
نہ بر سر گور نہ غیر آں ' وایں مجموعہ بدعت است و مکروہ . . . . . "

(یعنی دعہد نبوت میں) عادت نہ تھی کہ میت کے لیے غیر وقت نماز میں جمع ہو کر قرآن خوانی کریں اور ختم پڑھیں
نہ قبر پر، نہ اس کے سوا اور کہیں، یہ بدعت کا مجموعہ ہے اور مکروہ ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قبر کے بارے میں فرمایا کہ اسے "صنم" نہ بنانا، میلہ نہ لگانا مگر مسلمانوں نے قبروں کو صنم بھی بنا یا اور ان
ہی لگائے ہیں ! کسی صحابی، تابعی اور ائمہ فقہ وحدیث کا عرس نہیں ہوا، یہ تصور بھی قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں نہیں پایا جاتا تھا، مگر بزرگان دین
رس" مسلمانوں کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ بن گیا ہے' دین ہی کے نام پر دین کی مخالفت ! استغفر اللہ ۔

حضور نے قبروں پر چراغ روشن کرنے والوں پر لعنت کی (مشکوٰۃ) مگر مسلمان کس عقیدت ومحبت سے قبروں پر چراغاں کرتے ہیں اور
وں کی راکھ چاٹتے ہیں، بعض مزاروں اور درگاہوں کے صحن اور برآمدے میں تو" چراغی " کے نام سے زائرین سے نذر وصول کی جاتی ہے ۔

حضور نے قبروں پر گچ کرنے سے منع فرمایا مگر مسلمانوں نے قبروں کو سنگ مرمر سے تعمیر کیا، اور بعض قبروں کی جالیوں اور دروازوں پر
ے چاندی کے پتر منڈھ دئے !

قبروں کو سجدے ہیں، چادریں ہیں، گلپوشی ہے' چڑھاوے ہیں، نذرانے ہیں، اُن سے مرادیں مانگی جارہی ہیں، قبروں کو غسل دیا جاتا
، ـــــ یہ پورا قبوری انسٹی ٹیوشن کھلے خزانے توحید کا مضحکہ اڑاتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی نفی وتردید کرتا
، ـــ ! اس انسٹی ٹیوشن اور مکتبۂ فکر کے بہت بڑے مبلغ، ترجمان اور داعی خواجہ حسن نظامی تھے، اور اب اُن کے فرزند حسن ثانی نظامی
جب نے اس گدی کو سنبھالا ہے اور جناب بیکش اکبرآبادی جیسے اہل قلم ان بدعات اور مشرکانہ عقائد ورسوم کو سند جواز دینے کے لئے اپنا زور
م صرف کر رہے ہیں ! اور یہ ضلالت بزرگوں کی عقیدت ومحبت کی علامت [illegible] بن گئی ہے (استغفر اللہ)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُس راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم نظر آتے ہیں' یہی راہ
ات، سبیل مغفرت اور صراط مستقیم ہے !

بہ مصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

بقیہ۔ (مدیر" فاران" کے نام) یہ مصرعہ منظوم کرتے وقت میرے پیش نظر یہ قرآنی آیت تھی ـــــ ولا تهنوا ولا
تحزنوا انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین ۔ " رنج وغم نہ کرو، تم ہی زبردست رہو گے، اگر تم مومن ہو" حدیث ہے ایک
متقی مومن کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے اس کی آنکھیں خدا کی آنکھیں وغیرہ وغیرہ ۔ حدیث کے صحیح الفاظ مجھے یاد نہیں۔ مذکورہ بالا
آیت میں عمل اور تقویٰ کا کہیں ذکر نہیں، اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تنہا ایمان بھی ایک زبردست طاقت ہے ۔ یہ آپ کی تنقید
کی تردید نہیں کرتا۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو۔

میں نے انشا نہ کے صفحہ ۲۲۵ پر لکھا ہے کہ" ایک اچھا اور سچا تبصرہ نگار محض ستائش گر نہیں ہوتا۔ جہاں وہ کسی تصنیف
کی خوبیاں بیان کرتا ہے، وہاں اس کی خامیوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے" آپ کا بھی تبصرہ نگاری میں یہی اصول ہے، اسی لیے میں آپ
کے تبصروں کی قدر کرتا ہوں۔ ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے ممنون فرمایا۔

فرید
(عبدالحمید فرید ایڈووکیٹ)
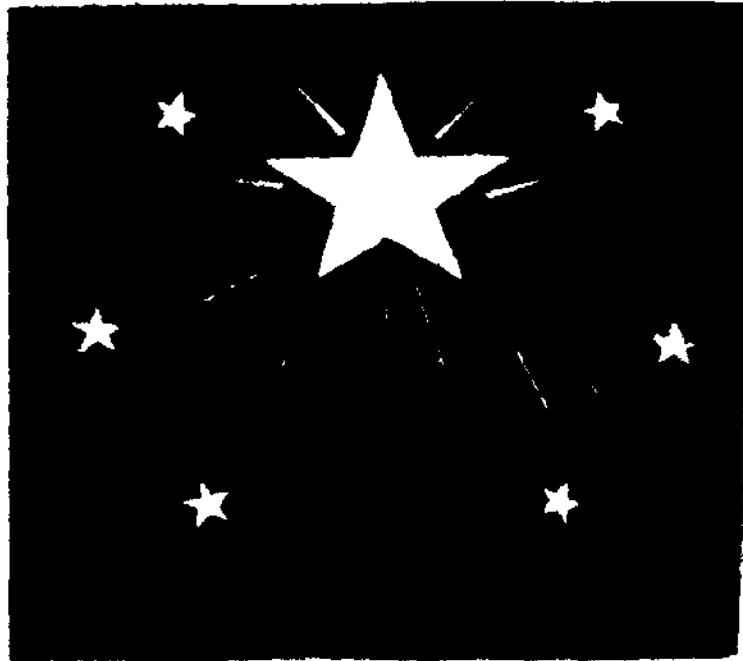
ملا واحدی

معاشرات

اللہ سے ہر وقت لو لگائے رکھنی چاہئے۔ اللہ سے تعلق کی سوتے جاگتے ایک کیفیت طاری رہنی چاہئیے۔ اللہ سے تعلق پیدا کرنا ہی تمام عبادات اور نیک کاموں کا مقصود ہے۔ عبادت پر عبادت اور نیکیوں پر نیکیاں کیں، مگر ان کا کنکشن (CONNECTION) اللہ سے نہ ملا تو کچھ نہ ہوا۔ عبادت اور نیکی وہی ہے جو خاص اللہ کے لئے کی جائے۔

بخاری میں حضرت براء بن عازب کی ایک روایت ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم خواب گاہ میں جاؤ تو نماز کے وضو کی طرح وضو کرو اور پھر داہنی کروٹ لیٹ کر کہو۔ اللھم اسلمت وجھی الیک والجأت ظھری الیک رغبۃً ورھبۃً الیک لا ملجأ ولا منجا منک الا الیک۔ اللھم امنت بکتابک الذی انزلت و نبیک الذی ارسلت۔

حضور نے فرمایا یہ پڑھنے کے بعد اگر تم اسی رات مر گئے تو مسلمان اور باایمان مرو گے۔ اس دعا کے بعد کلام نہ کرنا۔ اسے سوتے وقت کا آخری کلام بنانا۔

آئیے ہم سب بھی اس دعا کو پڑھنا شروع کریں اور اسے ورد بنائیں اور ہمیشہ ایسی حالت میں سوئیں کہ سوتے سوتے اللہ یاد رہے۔

جب تک ہم اسلام کے پابند رہے ہم ترقی کرتے رہے۔ اسلام کی پوری پابندی۔ بالکل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے جیسی پابندی، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی رہی۔ حضرت عمر نے صرف تقسیم دولت کے معاملے میں ذرا سا اجتہاد کیا تھا حضرت عمر ان صحابہ کو جو بدر و احد وغیرہ کے غزوات میں حضور سرور کائنات کے ساتھ تھے ان صحابہ پر ترجیح دیتے تھے۔ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ مگر اپنی رحلت سے کچھ قبل حضرت عمر نے اعلان کر دیا تھا کہ اگلے سال سے فرق نہیں کروں گا۔ حضرت عمر کا کہنا تھا کہ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ ابوبکر نے اس معاملے کو ٹھیک سمجھا تھا۔

حضرت ابوبکر اس معاملے میں مساوات برتتے تھے اور دولت پر ہر مسلمان کا یکساں حق قائم رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر کا قول تھا کہ ایمان میں سبقت کا صلہ اللہ کے ہاں ملے گا۔ دولت اس کا صلہ نہیں ہے

سوء اتفاق کہ حضرت عمر اسی سال شہید ہو گئے اور انہیں تبدیل شدہ رائے پر عمل کرنے کا موقع میسر نہ آیا۔

حضرت عثمان مسند خلافت پر تشریف لائے تو انہوں نے اس معاملے میں حضرت عمر کی تبدیل شدہ رائے کا خیال نہیں کیا اور حضرت ابوبکر کا مسلک اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ سابقون الاولون سے بھی زیادہ ان لوگوں کو دینا شروع کر دیا جو مسلمان ہونے سے قبل غزوات میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے آتے رہے تھے۔

حضرت علی نے حضرت ابوبکر کے مسلک کی تجدید کرنی چاہی، لیکن جو لوگ افراط زر کے عادی ہو چکے تھے ان کا زور بھی بڑھ

حضرت علیؓ کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔

کہنا یہ ہے کہ دین کا فقط ایک پیچ ڈھیلا پڑا تھا۔ دین سے کوئی بڑا انحراف نہیں کیا گیا تھا، مگر ایک پیچ ڈھیلا ہونے کا ایسا اثر ہوا
کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے زمانے کی سی بات پھر پیدا ہی نہیں ہوئی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ضرور حضرت ابوبکر اور حضرت
عمر کی جھلک دکھائی تھی، لیکن وہ جھلک عارضی تھی جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ ختم ہو گئی۔

غیر اس پیچ کے سوا حضرت عثمان کے زمانے میں اور تمام پیچ کسے ہوئے تھے، بلکہ فتوحات کے اعتبار سے زیادہ روپیہ لینے والے
آگے نکل گئے۔ حضرت عثمان اُن کے کارہائے نمایاں ہی کی وجہ سے اُنہیں زیادہ دینے لگے تھے۔ حضرت عثمان کی نیت مسلمانوں کی بہتری کی تھی۔
کسی کے ساتھ خصوصیت برتنے کی ہرگز نہیں تھی۔ تاہم ایک پیچ کے ڈھیلا ہو جانے سے دوسرے پیچ بھی رفتہ رفتہ ڈھیلے پڑنے لگے۔ اس کے
باوجود مغربیت اور فرنگیت چھانے سے قبل تک جتنے پیچ ڈھیلے ہو سکتے تھے سب تقسیم دولت کی تکمیل کرتے تھے۔ خلافت مٹ گئی۔ بادشاہت قائم
ہو گئی۔ افراط و تفریط کے عیبوں نے سر اٹھایا اور غلط کے مصائب ابھرے۔ مگر جن پیچوں کا تعلق براہ راست عامۃ المسلمین سے تھا
اُن کا کساؤ بہ تدریج گھٹا۔ اُن کی حالت ستر بہتر برس قبل تک یہ نہیں تھی جو آج ہے۔

آج مغربیت اور فرنگیت کا عروج عامۃ المسلمین کے پیچوں کو ڈھیلا کر رہا ہے۔ دولت کی صحیح تقسیم والا پیچ شاید دوبارہ کس جائے
مگر اسلام کے ذریعے کس جاتا دکھائی دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ کیا تعجب ہے وہ بہ ذریعہ بالآخر خود مسلمان ہو جائے۔ تاتاریوں کی
مثال ہمارے پیش نظر ہے۔ تاتاری مسلمانوں پر غالب آگئے تھے، لیکن پھر اسلام سے مغلوب یا متاثر ہو کر خود مسلمان ہو گئے۔ ایک
گروہ سے اسلام نہیں سنبھلے گا تو اللہ تعالیٰ دوسرے گروہ سے اُسے سنبھلوائے گا۔ اسپین کے مسلمانوں کے مٹ جانے سے اسلام نہیں مٹا
اسلام اپنی ذات سے موجود ہے اور موجود رہے گا۔

موجودہ مسلمان بھائیوں کو اس بات کا احساس ہو جانا چاہئے کہ ہمارا زوال اسلام کی پیروی کی وجہ سے نہیں ہے، اسلام کی پیروی
چھوڑ دینے کی وجہ سے ہے۔ جن مسخ شدہ مذاہب کی پیروی افیون کھانے کے مترادف بتائی جاتی ہے، انہیں اللہ نے خود منسوخ کر دیا
ہے وہ واقعی افیون کھانے کے مترادف ہیں، لیکن حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین تو اپنے پیروؤں کو ذرے سے آفتاب بنا چکا ہے
اسلام اپنے پیروؤں کی نشو و نما کرنے اور انہیں ترقی کی انتہائی منزل پر پہونچانے آیا ہے۔ اسلام زندہ اور بیدار مذہب ہے،
اُسے تنزل سے کیا واسطہ۔ پیرو صدیوں سے بنتے اور بگڑتے رہے ہیں اور بنتے بگڑتے رہیں گے۔ اسلام کی پیروی سے بنتے اور پیروی
چھوڑ دینے سے بگڑ جاتے ہیں

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مردوں نے عورت ذات کو اس قسم کے کام سپرد کر رکھے ہیں کہ وہ محض اُن کی وجہ سے کمزور ہے۔ یعنی
مرد ایسے کاموں میں مصروف رہتا ہے کہ اُس کی نشو و نما اچھی ہوتی ہے اور عورت کے مشاغل ایسے ہیں کہ اُسے بڑھنے نہیں دیتے۔
میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ پیدائش کے وقت کون سی تقسیم کار ہوتی ہے۔ عورت پیدا ہی کمزور کی جاتی ہے۔ کمزور کا
لفظ صحیح نہیں ہے۔ نازک کہنا چاہئے۔ عورت نازک بنا کر دنیا میں بھیجی جاتی ہے۔
تقسیم کار مردوں نے نہیں کی، اللہ نے کی ہے، ہر مادہ کو اللہ تعالیٰ نے نزاکت دی ہے اور نر کو کرختگی۔ شیرنی بھی شیر کی
نسبت نازک ہوتی ہے۔ کسی جانور کو لے لیجئے۔ نر کا قد و قامت بڑا اور جسم کرخت پائیے گا اور مادہ کا قد و قامت چھوٹا اور جسم نازک

جانوروں میں نر اور مادہ کے کاموں کی تقسیم ہے اور جن انسانی طبقوں کے مرد اور عورت یکساں کام کرتے ہیں اُن میں بھی فرق ہے۔ عورت مشاغل کی تبدیلی سے مرد جیسی مضبوط کبھی نہیں بن سکے گی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ عورتیں عورت پن کو بیٹھیں اور مرد مردپن سے بیزار ہو جائیں اور اس کے آثار نظر آتے ہیں۔

معجزہ نبی کے ایسے فعل کو کہتے ہیں جو خرق عادت ہو جس کے کرنے سے لوگ عاجز ہوں اور جو نبی کی شانِ نبوت ظاہر کرے۔ قرآن مجید معجزے کی بجائے آیت (یعنی نشانی، شناخت کی نشانی) کا لفظ استعمال کرتا ہے اور انبیاء سے زیادہ اللہ کے افعال پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اصل مقصود اللہ کو پہچاننا ہے۔ گو انبیاء کو پہچانے بغیر اللہ کو پہچاننا ممکن نہیں ہے۔

ہمارے ہادی و پیشوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافی معجزے دکھلائے ہیں۔ لیکن اُن حضرات کا درجہ بے حد بلند ہے جنہوں نے حضورؐ سے معجزے طلب نہیں کئے تھے اور حضورؐ کی قبل نبوت کی زندگی اور اسلام کی معقولیت سے متاثر ہو کر قرآن مجید کے لیہلک من ھلک عن بینۃ ویحیی من حیّ عن بینۃ کے مطابق اسلام قبول کر لیا تھا یعنی جسے برباد (اور گمراہ) رہنا ہو وہ دلیل و برہان اور (اسلام کی صداقت کے) بیّن ثبوت دیکھنے کے بعد بھی برباد (اور گمراہ) رہے گا اور جسے زندگی ملنی ہے (اور حق کا پیرو بننا ہے) وہ دلیل و برہان اور (اسلام کی صداقت کے) بیّن ثبوت دیکھ کر زندہ (اور اسلام کا پیرو) رہے گا۔

(مفہوم سورہ ۸ آیت ۴۲)

نبی کو معجزہ دکھانے کی طاقت بخشنا بھی اللہ کا فعل ہے۔ لہٰذا معجزات کے موافق مخالف ہونے نہ ہونے کی بحث میں پڑنے سے بہتر یہ ہے پہلے اللہ کے افعال یعنی کائنات پر غور و فکر کر کے اللہ کی قدرت کا قائل ہو جائے پھر معجزات کا قائل ہونا مشکل نہیں ہوگا۔
ہمارے ہادی و پیشوا کو تو ایسا معجزہ دیا گیا ہے کہ اسے آپ تا قیام قیامت دیکھ سکتے ہیں اور نبیوں کے معجزے صرف اُن نبیوں کے معاصر دیکھ سکتے تھے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تا قیام قیامت دیکھا جائے گا۔ وہ معجزہ قرآن مجید ہے۔

صحیح مسلم میں ابو مستوردؓ کی ایک روایت ہے کہ میں نے عمرو بن العاصؓ کے سامنے بیان کیا کہ آخری زمانے میں مغرب کے عیسائیوں کا بڑا زور ہو جائے گا۔ عمرو بن العاصؓ فاتح مصر تھے۔ وہ بولے، کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے جواب دیا، وہی کہہ رہا ہوں جو محمد رسول اللہؐ سے سُنا ہے۔
پونے چودہ سو برس قبل کی اس پیشین گوئی پر میری نظر عین اُس دن پڑی جس دن یہودیوں نے انگلستان اور امریکہ کے عیسائیوں کی بل بوتے سے مسلمان عرب حکومتوں کو شکست دی ہے اور بیت المقدس وغیرہ پر قبضہ کیا ہے۔ امریکہ والے اصلاً اور نسلاً یورپی ہیں۔
اس کے چند دن بعد، اسی ہفتے کے اندر ہفت نامہ صدق جدید لکھنؤ ایک اور خبر لایا جس سے معلوم ہوا کہ یورپ کے عیسائیوں کا اب مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر قبضہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کے دماغوں اور دلوں پر قبضہ ہے۔ صدق جدید لکھتا ہے..!

"لندن سے ایک اُردو ہفتہ وار، باتصویر اور ضخیم مشرق کے نام سے پاکستان اور ہندوستان کے اشتراک سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے ۲۰ اپریل سنہ ء کے پرچہ میں بارہ سالہ ایک پاکستانی

بچی کا خط چھپا ہے جو لیوٹن کے کسی اسکول میں پڑھتی ہے۔ خط انگریزی میں ہے۔ انگریزی کا کچھ حصہ اور پورا اردو ترجمہ مشرق نے چھاپ دیا ہے۔ دیکھئے!

"عید کے پہلے دن (گویا عید دوسرے اور تیسرے دن بھی ہوتی ہے۔ صدق) باپ لوگ صبح اٹھتے ہیں اور خوب اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور جب نو بجتے ہیں تو ہملٹن روڈ کے چرچ ہال میں نماز کے لئے جاتے ہیں۔ پاکستان میں مرد (جب عید کی۔ صدق) نماز پڑھتے ہیں تو سب مل کر پڑھتے ہیں جب نماز ختم ہو چکتی ہے تو (آپس میں) بات چیت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں اور ایک دوسرے کے کندھوں پر گرتے ہیں (VERY HAPPY CHRISTMAS (خوش تقریب کرسمس) کہتے ہوئے۔

(اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فکر و عمل کی خرابی مسلمانوں میں کہاں تک پہنچ چکی ہے ——— "فاران")
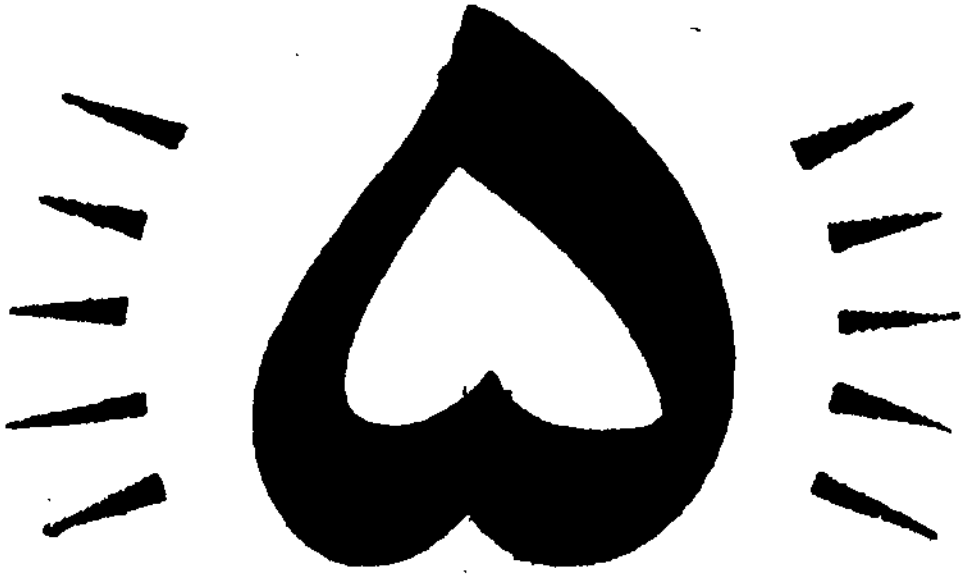
۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے

مولانا محمد حسام اللہ شریفی

تعلیم اور نصابِ تعلیم کے سلسلے میں چند قرآنی آیات

اسلام نے ملتِ مسلمہ کو خواندہ بنانے اور حق الٰہی سے مستفیض ہونے کے لئے تعلیم و تعلم سے انتہائی دلچسپی پیدا کرنے کے ساتھ ایسے علوم و فنون سے اجتناب برتنے کی تلقین بھی کی جو اسلامی معاشرہ کے لئے کسی وجہ سے بھی مفید نہ ہوں۔ اس لیا قرآن حکیم نے چند بنیادی اصول وضع کئے جنہیں نظر انداز کر کے اسلامی نظام تعلیم کا خاکہ کسی طرح صحیح مکمل نہیں ہو سکتا۔

پہلا اصول: ۔ تعلیم و تعلم کے باب میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں پہلا اصول یہ مقرر فرمایا:

ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔ (۱۷ : ۳۶)

اور اس بات کے پیچھے نہ پڑو کہ جس کا تمہیں علم نہیں کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ہر ایک سے پرسش ہوگی

علامہ آلوسی بغدادی اسی آیت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

ان النھی انما ھو عن سؤال ما لا حاجۃ الیہ [۱]

اس آیت کے ذریعے غیر ضروری سوال سے روکا گیا ہے

حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں:

قال العوفی عنہ: لا ترم احداً بما لیس لک بہ علم [۲]

جناب عوفی کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی ایسی چیز کو اپنالت نہ مت بناؤ جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہیں

علامہ شیخ زادہ محی الدین محمد لکھتے ہیں:

فمعنی الایۃ لا تتبع ما لا تعلم لک من قول او فعل [۳]

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس قول یا فعل کے متعلق تم جانتے نہیں اس پر چلنے کی کوشش ہرگز مت کرو۔

عظیم المرتبت مفسر علامہ ابو السعود محمد بن محمد العمادی اسی آیت کے ذیل میں رقمطراز ہیں:

لا تکن فی اتباع ما لا علم لک بہ من قول او فعل کمن یتبع مسلکاً لا یدری انہ یوصلہ الی مقصدہ [۴]

کسی ایسے قول یا فعل کی اتباع ہرگز نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں بعینہ یہ ایسے ہی ہے جیسے اس شخص کی پیروی کی جائے جس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو کہ وہ اپنی منزل مقصود پر بھی پہنچے

سکے گا یا نہیں۔

دورِ جدید کے مفسرِ گرامی علامہ احمد مصطفےٰ المراغی اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

ولا تتبع ایھا المرء ما لا علم لك به من قول او فعل وذلك دستور شامل لكثير من شؤون الحیاۃ[1]

اے انسان! کسی ایسے قول یا فعل کی اتباع ہرگز نہ کر جس کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں۔ یہ قانون شعبہ ہائے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو محیط ہے۔

مفکرِ عظیم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس آیت کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"اس دفعہ کا منشاء یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں وہم وگمان کے بجائے "علم" کی پیروی کریں۔ اسلامی معاشرے میں اس منشاء کی ترجمانی وسیع پیمانے پر اخلاق میں، قانون میں، سیاست اور انتظامِ ملکی میں، علوم وفنون اور نظامِ تعلیم میں، غرض ہر شعبۂ حیات میں کی گئی اور ان بے شمار خرابیوں سے فکر وعمل کو محفوظ کر دیا گیا۔ جو علم کے بجائے گمان کی پیروی کرلینے سے انسانی زندگی میں رونما ہوتی ہیں .... نظامِ تعلیم میں بھی ان نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن وتخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقائد میں اوہام پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی"[2]

اس اصولِ اول کی روشنی میں جہاں غیر ضروری مسائل ومعاملات میں ملتِ مسلمہ کے کسی فرد کو بحث مباحثہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، وہاں ضمنی طور پر اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن مسائل ومعاملات کے حل کرنے کی ذمہ داری اسلام نے خواتین پر عائد نہیں کی۔ ان امور کی تعلیم وتربیت بھی قرآن کی نظر میں ان کے لئے انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

دوسرا اصول :- اسلامی نظامِ تعلیم کے سلسلے میں قرآن حکیم نے دوسرا اصول یہ وضع کیا :

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذھا ھزوا اولئك لھم عذاب مھین۔

اور کچھ ایسے آدمی بھی ہیں جو "لھو الحدیث" کا کاروبار کرتے ہیں تاکہ بغیر علم کے لوگوں کو اللہ کے راستے سے بہکا دیں اور اللہ کی آیتوں کی ہنسی اڑائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ذلت کی سزا مقدر ہو چکی ہے۔

علامہ قرطبی "لھو الحدیث" کی تشریح میں لکھتے ہیں :

حلف علی ذلك ابن مسعودؓ باللہ الذی لا الہ الا ھو ثلاث مرات انہ الغناء ...... وعن ابن عمر انہ الغناء وکذلك قال عکرمۃ ومیمون بن مھران ومکحول ...... وروی شعبۃ وسفیان عن الحکم وحماد عن ابراھیم قال قال عبداللہ بن مسعود : الغناء ینبت النفاق

جناب عبداللہ بن مسعودؓ نے اس پر حلف اٹھایا کہ اس ذاتِ وحدہ لاشریک کی قسم جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ تین مرتبہ یہ قسم کھا کر فرمایا اس سے مراد گانا بجانا ہی ہے ...... حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور اسی طرح عکرمہ، میمون بن مہران اور مکحول بھی اسی کے قائل ہیں کہ "لھو الحدیث" سے مراد گانا بجانا ہی ہے ......

---

[1] تفسیر المراغی ص ۵۴ ج ۱۵ [2] تفہیم القرآن ص ۶۱۶ ج ۲

فی القلب ۔ وقال القاسم بن محمد : الغناء باطل والباطل فی النار[1]

جناب عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا گانا بجانا دل میں نفاق پیدا کر دیتا ہے اور قاسم بن محمد کا قول ہے کہ گانا بجانا فعل باطل ہے اور فعل باطل کے مرتکب کا ٹھکانا جہنم ہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف نے یہ حدیث نقل کی ہے :-

وروی الترمذی من حدیث علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : اذا فعلت امتی خمس عشرۃ خصلۃ حل بھا البلاء وذکر منھا : "اذا اتخذت القینات والمعازف" وفی حدیث ابی ھریرۃ ظھرت القیان والمعازف[2]

ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب میری امت میں پندرہ خصلتیں پائی جائیں ان پر مصائب کا نزول درست ہوگا ۔ اس میں آپ یہ افعال بھی ذکر فرمائے کہ جب ناچنے گانے والی لونڈیاں اور طبلے سارنگی کا رواج ہو جائے گا اور ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ ہے کہ جب لڑکے ناچنے گانے لگیں۔

امام موصوف نے اسی آیت کی تفسیر میں یہ حدیث بھی بیان کی ہے۔

وقد روی مرفوعاً ھذا المعنی من حدیث ابی موسی الاشعری انہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من استمع الی صوت غناء لم یؤذن لہ ان یسمع الروحانیین فقیل ومن الروحانیون یا رسول اللہ ؟ قال : "قراء اھل الجنۃ" . . . .

حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : جس شخص نے گانے بجانے کان دھرا اسے روحانیین کا کلام سننے کی اجازت نہ دی جائے گی ۔ دریافت کیا گیا "یا رسول اللہ ! روحانی کون لوگ ہیں ؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا اہل جنت کے قراء . . . . .

ومن روایۃ مکحول عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : من مات وعندہ جاریۃ مغنیۃ فلا تصلوا علیہ[3]

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ نقل فرماتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس شخص کو موت اس حالت میں آ جائے کہ اس کے پاس ایک گانے بجانے والی لونڈی ہو اس کی نماز جنازہ نہ پڑھو"

علامہ آلوسی بغدادی نے اسی آیت کے تحت " لھو الحدیث " پر تفصیلی بحث کی ہے۔

والبیھقی فی سننہ عن ابن عباس انہ قال ھو الغناء واشباھہ . . . .
عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الغناء ینبت النفاق فی القلب

بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ گانا بجانا اور اس کے مشابہ تمام امور لھو میں داخل ہیں . . . جناب عبداللہ بن مسعود سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

---

[1] تفسیر قرطبی ص ۵۲ ج ۱۴ [2] تفسیر قرطبی ص ۵۳ ج ۱۴ [3] تفسیر قرطبی ص ۵۴ ج ۱۴

كما ينبت الماء البقل . . . .
قال يزيد بن الوليد الناقص : يا بني امية اياكم والغناء فانه ينقص الحياء ويزيد في الشهوة ويهدم المروة وانه لينوب عن الخمر ويفعل ما يفعل السكر فان كنتم لا بد فاعلين فجنبوه النساء - فان الغناء داعية الزنا ء ـــ قال الضحاك : الغناء منفدة للمال مسخطة للرب مفسدة للقلب . . . . فاذا سمع الغناء نقص عقله وحياءه وذهبت مروته وبهاؤه . . . . . وفي التاتارخانية : علمان التغني حرام في جميع الاديان [1]

گانا بجانا قلب میں اس طرح نفاق کو بڑھاتا ہے ۔ جیسے پانی کے ذریعے سبزی بڑھتی ہے . . . . . .
یزید بن الولید الناقص نے بنو امیہ سے کہا ۔ اے بنی امیہ ! تم گانے بجانے سے احتراز کرو کیونکہ اس سے حیا جاتی رہتی ہے اور شہوت بڑھتی ہے اور مروت ختم ہو جاتی ہے اور یہ گانا بجانا شراب دو آتشہ کا کام کرتا ہے اور اس پر نشہ طاری کر دیتا ہے پس اگر تم نے گانے بجانے کی ٹھان ہی لی ہے تو عورتوں سے اجتناب کرو ۔ کیونکہ گانا بجانا زنا کی سیڑھی ہے ۔
. . . . ضحاک کہتے ہیں کہ گانا بجانا مال کو خرچ کرانے اور رب کو ناراض کر دینے کا سبب ہے اور قلب کو فتنہ و فساد میں مبتلا کر دیتا ہے ۔ . . . . . . پس سامعین غنا ، نے اس فعل کے ذریعے اپنی عقل اور حیا اور مروت کے جاتے رہنے پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور فتاویٰ تاتار خانیہ میں ہے کہ گانا بجانا مذاہب عالم میں حرام ہے ۔

شیخ زادہ علامہ محی الدین محمد " لھو " کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ـــ

اللھو کل باطل الھی عن الخیر [2]

ہر اس فعل باطل کو " لہو " کہا جاتا ہے جو خیر سے دور لے جاتے ۔

علامہ زمخشری " لھو الحدیث " کی تفسیر میں تحت یہ فرماتے ہیں :

لھو الحدیث نحو السمر بالاساطیر والاحادیث التی لا اصل لھا والتحدث بالخرافات والمضاحیک وفضول الکلام وما لا ینبغی من کان وکان ونحو الغناء وتعلیم الموسیقار وما اشبه ذلک [3]

لغو کہانیاں، بالکل بے بنیاد بات چیت خرافات محض ہنسی مذاق کی باتیں ، لایعنی کلام اور ایسی گفتگو جو کسی شریف انسان کو زیب نہیں دیتی جیسے گانا ، تعلیم موسیقار اور دیگر امور و افعال جو ان سے مناسبت رکھتے ہیں یہ سب " لھو الحدیث " ہی میں داخل ہیں ۔

علامہ احمد مصطفےٰ المراغی اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں : ـــ

ای ومن الناس فریق یتخذ ما یتلھی به عن

یعنی ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جو ان لوگوں کو

---

[1] تفسیر روح المعانی ص ۶۰ ج ۲۱ [2] حاشیہ شیخ زادہ علی تفسیر القاضی البیضاوی ص ۴۴۳ ج ۳ [3] تفسیر کشاف ص ۴۹۰ ج ۳

الحدیث النافع للانسان فی دینه ودنیاه بالخرافات والاساطیر والمضاحیك وفضول الكلام كالنضر بن الحارث الذی كان یشتری الكتب ویحدث بها الناس وربما اشتری المغنیات واوصاهن بمعاشرة من اسلم لیحملهم علی ترك الاسلام وما مقصده من ذلك الا الاضلال والصد عن دین الله[1]

ان افعال سے روکتے ہیں جو ان کے دین و دنیا کے لیے باعث فلاح ہیں اور انہیں خرافات اور داستانیں گپ بازی، اور لایعنی کلام میں مصروف رکھتے ہیں۔ جیسے نضر بن الحارث جو کتابیں خریدتا اور پھر لوگوں کو پڑھ کر سناتا اور بسا اوقات لونڈی لڑکیاں خرید لیتا اور انہیں حکم دیتا کہ وہ اسلام قبول کرنے والوں سے میل جول بڑھا کر انہیں ترک اسلام پہ آمادہ کریں اور اس سے اس کا مقصد گمراہی کو پھیلانا اور دین الٰہی کی اشاعت میں روڑے اٹکانا تھا۔

مفکرِ عظیم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

"لھو الحدیث یعنی ایسی بات جو آدمی کو اپنے اندر مشغول کر کے ہر دوسری چیز سے غافل کر دے.....

.....مثلاً گپ، خرافات، ہنسی مذاق، داستانیں، افسانے اور ناول، گانا بجانا اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کفارِ مکہ کی ساری کوششوں کے باوجود پھیلتی جاری تھی تو نضر بن حارث نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ جس طرح تم اس شخص کا مقابلہ کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ یہ شخص تمہارے درمیان بچپن سے ادھیڑ عمر کو پہونچا ہے آج تک وہ اپنے اخلاق میں تمہارا سب سے بہتر آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچا، اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے ساحر ہے، شاعر ہے، مجنون ہے، آخر ان باتوں کو کون باور کرے گا۔ کیا لوگ ساحروں کو نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کی جھاڑ پھونک کرتے ہیں؟ کیا لوگوں کو معلوم نہیں کہ کاہن کس قسم کی باتیں بنایا کرتے ہیں؟ کیا لوگ شعر و شاعری سے ناواقف ہیں؟ کیا لوگوں کو جنون کی کیفیات کا علم نہیں ہے؟ ان الزامات میں سے آخر کونسا الزام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر چسپاں ہوتا ہے، کہ اس کا یقین دلا کر تم عوام کو اس کی طرف توجہ کرنے سے روک سکو گے۔ ٹھیرو، اس کا علاج میں کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ مکہ سے عراق گیا اور وہاں سے شاہانِ عجم کے قصّے اور رستم و اسفندیار کی داستانیں لا کر اس نے قصہ گوئی کی محفلیں برپا کرنی شروع کر دیں۔ تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹے اور وہ ان کہانیوں میں کھو جائیں.........

اور ابن عباس نے اس پر مزید یہ اضافہ کیا ہے کہ نضر نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے اس پر اپنی ایک لونڈی مسلط کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گانا سنا۔ تاکہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل ادھر سے ہٹ جائے۔ یہ قریب قریب وہی چال تھی جس سے قوموں کے اکابر مجرمین ہر زمانے میں کام

---

[1] تفسیر المراغی ص ۷۴، ج ۲۱

لیتے رہے ہیں وہ عوام کو کھیل تماشوں اور رقص و سرود (کلچر) میں غرق کر دینے کی کوششیں کرتے ہیں تاکہ انہیں زندگی کے سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہ رہے اور اس عالم مستی میں ان کو سرے سے یہ محسوس ہی نہ ہونے پائے کہ انہیں کس تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے . . . .

ایک روایت ابو امامہ سے ان الفاظ میں منقول ہے کہ لا یحل تعلیم المغنیات ولا بیعھن ولا شراؤھن وثمنھن حرام ۔ لونڈیوں کو گانے بجانے کی تعلیم دینا اور ان کی خرید و فروخت کرنا حلال نہیں ہے اور ان کی قیمت حرام ہے[5]"

اس کے بعد مولانا موصوف لکھتے ہیں :-

" اس سلسلے میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اس زمانے میں گانے بجانے کی " ثقافت " تمام تر بلکہ کلیتہً لونڈیوں کی بدولت زندہ تھی ۔ آزاد عورتیں اس وقت تک " آرٹسٹ " نہ بنی تھیں ۔ اس لیے حضور نے مغنیات کی بیع و شراء کا ذکر فرمایا ۔ اور ان کی فیس کو قیمت کے لفظ سے تعبیر کیا " [6]

یہ آیت کریمہ فنون لطیفہ کے نام سے رقص و موسیقی اور مجسمہ سازی کی تعلیم و تربیت کی واضح طور پر ممانعت کرتی ہے ۔ اس آیت کا نزول ہی ان افعال کی قباحت بیان کرنے کے سلسلے میں ہوا ہے ۔

اس اصول قرآنی کی رو سے تعلیمی اداروں میں ڈراموں کے لیے بھی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی اور جس قسم کے مباحثوں کو آج کل تعلیمی اداروں میں رواج دیا جا رہا ہے وہ بھی اس ہدایت قرآنی کے سراسر خلاف ہیں ۔

تیسرا اصول :- قرآن حکیم نے تعلیمی ہدایات دیتے ہوئے تیسرے اصول کی وضاحت اس طرح کی :-

فرمایا یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا ان اللہ علیم بما یفعلون (۱۰ : ۱)	اور ان لوگوں میں سے اکثر لوگ صرف ظن و تخمین پر چل رہے ہیں حالانکہ ظن حق کی معرفت میں ذرا بھی مفید نہیں ۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں یقیناً اللہ اس سے باخبر ہے ۔

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں :-

فالمراد بالاتباع ھو الاذعان والانقیاد . . . . والمراد من الحق العلم والاعتقاد الصحیح المطابق للواقع [7]	پس اتباع سے مراد یقین اور تسلیم خم کر دینا ہے . . . . اور حق سے مقصود علم یقینی اور اعتقاد راسخ ہے ایسا صحیح اعتقاد جو حقیقت سے کامل مطابقت رکھتا ہو ۔

سید رشید رضا مصری نے اپنے استاذ شیخ محمد عبدہ سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے :

واستدل العلماء بھذہ الایۃ ھنا وفی السورۃ النجم علی ان العلم الیقینی واجب فی الاعتقادیات [8]	اور علماء نے اس آیت اور سورۃ نجم کی آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اعتقادیات کے لیے علم یقینی ضروری ہے ۔

---

[5] تفہیم القرآن ص ۸۰ ج ۴ [6] تفہیم القرآن ص ۱۰ ج ۴ [7] تفسیر روح المعانی ص ۱۱۹ ج ۱۱ [8] تفسیر المنار ص ۴۰۶ ج ۱۱

پھر اس کے بعد سید صاحب لکھتے ہیں :-

وهما من آیاته المحکمات فی اصول الایمان والاسلام ان یکون غرضه من حیاته تزکیة نفسه وتکمیلها باتباع الحق فی کل اعتقاد والهدی وهو الصلاح فی کل عمل وبناؤهما علی اساس العلم دون الظن فالعلم المفید للحق والمبین للهدی فی الدین هو ما کان قطعی الروایة والدلالة من الکتاب والسنة الذی قامت به الجماعة الاولی[1]

ان آیات کا تعلق ان محکمات سے ہے جو اصولِ ایمان واسلام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان کی غرض اپنی زندگی سے تزکیۂ نفس اور تمام اعتقادات میں کامل اتباعِ حق اور اصلاحِ عمل ہے۔ ان آیات کی اساس علمِ یقینی پر ہے ظن وتخمین پر نہیں۔ لہٰذا جو علم افادۂ حق اور دینی ہدایات کو بیان کرنے میں معاون ثابت ہو سکے اور قطعی الروایۃ وقطعی الدلالۃ ہو اور جس پر ہمارے اسلاف کاربند رہے ہوں اسی پر علم کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

آیتِ زیرِ نظر سے اسلامی نظامِ تعلیم کے اس بنیادی اصول پر روشنی پڑتی ہے کہ ایمان وعقائد کی بنیاد محض ظن وتخمین پر نہیں رکھی جا سکتی بلکہ اس کے لئے علمِ یقینی کا ہونا ضروری ہے اور وحیِ الٰہی ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جسے علمِ یقینی تک رسائی کا واحد سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے نظامِ تعلیم کی بنیاد وحیِ الٰہی پر رکھی جانی چاہئے۔

چوتھا اصول :- قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے نظامِ تعلیم کے سلسلے میں چوتھا اصول ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

فلما جاءتهم رسلهم بالبینات فرحوا بما عندهم من العلم وحاق بهم ما کانوا به یستهزءون (المؤمن - ۸۳)

جب ان کے رسول ان کے پاس دلائل لے کر آئے تو وہ اسی علم میں مگن رہے جو ان کے پاس تھا اور پھر اسی چیز کے پھیر میں آ گئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے

علامہ زمخشری اسی آیت کے ذیل میں رقمطراز ہیں :-

علمهم بامور الدنیا ومعرفتهم بتدبیرها کما قال تعالیٰ یعلمون ظاهراً من الحیاة الدنیا وهم عن الآخرة هم غافلون ذلك مبلغهم من العلم فلما جاءهم الرسل بعلوم الدیانات وهی ابعد الشیٔ من علمهم لبعثها علی رفض الدنیا والظلف عن الملاذ والشهوات لم یلتفتوا الیها وصغروها واستهزءوا بها واعتقدوا انه لا علم انفع واجلب للفوائد من علمهم ففرحوا به[2]

اس آیت میں العلم سے مراد ان لوگوں کا دنیوی امور کو جاننا اور ان کے متعلق تدابیر سے واقف ہونا ہے۔ جیسا کہ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ "وہ لوگ آخرت سے غفلت برتتے ہوتے حیاتِ دنیوی کی ظاہری حالت ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں غرض ان کی کائنات علمی یہی ہے پھر جب علوم و دیانات لیکر انبیاء ان کے پاس پہونچے تو لوگوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ کیونکہ انہیں پیغمبروں کے علومِ دیانات اپنے علوم دنیویہ سے بالکل غیر متعلق نظر آتے تھے

---

[1] تفسیر المنار ص ۲۶۵ ج ۱۱ [2] تفسیر کشاف ص ۱۸۲ ج ۴

اس سبب سے کہ ان علوم میں دنیا کے ساتھ بھی نہ لگا
کی تلقین تھی اور خواہشاتِ نفسانی سے الگ رہنے کی تعلیم
موجود تھی ۔ چنانچہ انہوں نے ان علوم نبوت کی طرف کوئی
توجہ نہیں کی اور انہیں حقیر جانا ۔ اور ان کا مذاق اڑایا
اور یہ اعتقاد کر بیٹھے کہ جو علوم ان کے پاس ہیں ان سے نہ
مفید اور حصول خیر کا ذریعہ کوئی دوسرا علم نہیں ۔ اس
پر وہ اپنے علوم ہی میں مگن رہے اور اظہار مسرت کرتے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اسی آیت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"یعنی اپنے فلسفے اور سائنس، اپنے قانون، اپنے دنیوی علوم اور اپنے پیشواؤں کے گھڑے ہوئے مذہبی افسانوں (MYTHOLOGY) اور دینیات (THEOLOGY) ہی کو انہوں نے اصل علم سمجھا اور انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے علم کو ہیچ سمجھ کر اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔" ؎

اس آیت کریمہ کے ذریعے مسلمانوں کی توجہ اس بنیادی امر کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ علم حقیقۃً وہی ہے جو انبیاء کرا[م] کی وساطت سے لوگوں تک پہنچا ہے یہی علم انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح کا ضامن ہے، جو لوگ اس علم کو ہیچ سمجھ کر اس کا کسی قسم کا التفات نہیں کرتے اور اس علم اور حاملینِ علم کا مذاق اڑاتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ سے کسی فضل و کرم کی توقع ہرگز نہ رکھ[نی] بلکہ ایسی صورت میں اس کے عذاب الیم کا انتظار کرنا لازم ہے ۔

مذکورہ چار اصولوں کو نظر انداز کر کے اسلامی نظام تعلیم کا خاکہ کسی حالت میں بھی صحیح طور پر مرتب نہیں کیا جا سکتا ۔ ان اصولوں کو نظر انداز کر کے جو نظام تعلیم بھی کسی ملک میں رائج کیا جائے گا ۔ اسلامی معاشرہ کے لئے اس کے نتائج نہایت [ب]ر[ے] برآمد ہوں گے ۔

مدیر "فاران" کے نام

القاب و آداب کے بعد !-

"فاران" کی جولائی کی اشاعت میں "خطبہ شیطانی از تلقین رحمانی" پر آپ کا تحریر کردہ تبصرہ کل میری نظر سے گزرا۔ تبصرہ مفصل اور دلچسپ ہے جس میں آپ نے افسانے کے، اور میری شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس کتاب کی جانب توجہ دلائی اور ایک جامع تبصرہ لکھنے میں وقت صرف کیا۔ اس تبصرہ میں متعدد الفاظ پر آپ کے اعتراضات ہیں جن کے متعلق چند باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

" جو ذوق بے رنگ و باد کا گل ہے — تو سوز دل مرغ صبح خواں ہے "

آپ کا اعتراض کہ " مرغ صبح خواں " میری اپنی وضع کی ہوئی مہمل ترکیب ہے، صحیح نہیں۔ " مرغ صبح خواں " اور " مرغ سحر خواں " بلبل کو کہتے ہیں اس ترکیب کو صدہا فارسی شعراء نے استعمال کیا ہے۔ دیکھئے نور اللغات، جلد چہارم صفحہ ۵۱۳۱ جس میں " مرغ صبح خواں " اور " مرغ سحر خواں " کے معنی بلبل بتائے گئے ہیں۔ " بہار عجم " میں بھی " مرغ سحر خواں " کا مطلب بلبل بتلایا گیا ہے۔ دیکھئے بہار عجم صفحہ ۳۹۲ -

" غالب پاک فہم شاعر اعجاز رقم — مات و مبہوت ہے سن اسکی نوائے رنگیں "

لفظ " مات " پر آپ کا اعتراض ہے۔ گزارش ہے کہ " مات و مبہوت " فارسی کا محاورہ ہے جو آج کل ایران میں ہر کس و ناکس کی زبان پر ہے۔ فارسی کا کوئی افسانہ ایسا نہ ہوگا جس میں یہ محاورہ دو چار مرتبہ نہ آیا ہو۔ اردو میں " مبہوت " کا لفظ تنہا مستعمل ہے ہم کہتے ہیں " اس منظر نے مجھے مبہوت کر دیا " ایرانی کہتے ہیں " مرا مات و مبہوت کرد " دیکھئے S. HAIM کی لغت THE LARGER ENGLISH PERSIAN DICTIONARY جو ۱۹۴۲ء میں ایران میں شائع ہوئی۔ اس کے صفحہ ۱۰۱ پر ASTOUND کے معنی " مات کردن " " مبہوت کردن " بتلائے گئے ہیں۔

" مفت ہیں ان کے بغیر اس کے طبیعی جوہر " [1]

لفظ " مفت " پر آپ نے اعتراض کیا ہے۔ اردو کے روز مرہ میں کہتے ہیں کہ " یہ بے معنی ہے " فضول ہے " بے کار ہے " فارسی میں کہتے ہیں " این همه مفت است " اردو میں بھی " مفت " ان معنوں میں " کا " اور " کی " کے ساتھ مستعمل ہے " مفت کا دردسر " " مفت کی ٹھاتیں ٹھاتیں " دیکھئے نور اللغات جلد چہارم صفحہ ۶۰۵ - افسانے کے صفحہ ۳۵ پر میں لکھ چکا ہوں کہ " جدید فارسی کے متعدد الفاظ جو عموماً اردو میں نہیں بولے جاتے ہیں میں نے اپنے کلام میں بلا تکلف استعمال کئے ہیں تاکہ اردو کے ذخیرے میں اضافہ ہو " لیکن اگر بعض شعراء غیرت عراقی سمجھیں تو مجھے شکایت کا حق نہیں۔

" ہاتھ ہے خالق کونین کا ایمان ترا "

(باقی ص ۲۵ پر)

---

[1] مات و مبہوت ہو یا " مفت " اردو میں فارسی محاوروں کا چلن نہیں ہے۔ (فاران)

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

نخشب جارچوی

سنہ ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے، میں حیدرآباد دکن سے کانپور آیا۔ وہاں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، کانپور سے لکھنؤ ٹھیرتا ہوا اپنے ایک عزیز سے ملنے کے لئے رام پور پہونچا، رام پور میں، علی گڑھ نمائش کے مشاعرے کا دعوت نامہ ملا، مسلم یونیورسٹی کے نامور پروفیسر جناب عبدالمجید قریشی نے بڑے اصرار و تاکید سے راقم الحروف کو لکھا کہ اس مشاعرے میں تمہاری شرکت ضروری ہے! میں رام پور سے چل پڑا، راستے میں چند گھنٹے اپنے وطن (کسیر کلاں) میں قیام کیا، وہاں سے اپنے چھوٹے بھائی (مسرور حسین) اور اپنے ایک دوست اور لنگوٹیا یار کو ساتھ لے کر شب میں گیارہ بجے علی گڑھ پہونچا، مشہور و مقبول شاعر شکیل بدایونی اُن دنوں مسلم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، اور نئی بستی کے ایک کرایہ کے مکان میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے تھے، اُن کے مکان کی بیٹھک میں سامان رکھ کر ہم تینوں پیدل نمائش کو روانہ ہوئے، دربار ہال میں مشاعرہ ہو رہا تھا، مسٹر اے ٹی نقوی مرحوم جو اُن دنوں علی گڑھ کے کلکٹر تھے، مشاعرے کے صدر تھے، اور پروفیسر عبدالعزیز لپوری اناؤنسر کے فرائض انجام دے رہے تھے!
یہ بات تو مشاعرے کے بعد معلوم ہوئی کہ یونیورسٹی کے طلبا، شاعروں پر ہوٹنگ کر رہے تھے اور شاید کسی شاعر کو بھی انہوں نے نہیں بخشا! اس طوفانِ بدتمیزی سے تنگ آ کر عبدالعزیز لپوری مرحوم مشاعرے کے برخاست ہونے کا اعلان کر ہی رہے تھے کہ مجھے دور سے آتا دیکھ کر ساغر نظامی نے اُن سے کہا :—

"...... ماہر القادری ...... وہ ...... ماہر القادری ہیں"

اس پر عبدالعزیز لپوری صاحب نے اس اعلان کو کٹ کر کے میرے نام کا اعلان کر دیا۔ مشاعرے کا یہ دوسرا دور تھا، آدھی رات گذر چکی تھی، میں نے ایک غزل پڑھی پھر سامعین کے اصرار پر دوسری غزل، اس کے بعد "جمنا کا کنارا" اور "نوجوان ہو" پھر تابڑ توڑ کئی غزلیں اور نظمیں! ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب مسلسل شعر خوانی کے بعد لوگوں کے اصرار سے میرا پیچھا چھوٹا، پھر مشاعرہ صبح کے چار بجے تک اسی انداز پر چلتا رہا۔
ساغر نظامی اور روش صدیقی کے بعد نخشب جارچوی کا نام پکارا گیا۔ اسٹیج کے ایک کنارے سے ایک صاحب اُٹھ کر آئے، چھریرا بدن، لانبا قد، کھڑا ناک نقشہ، کھدر کی قمیص اور کھدر کا چوڑی دار پاجامہ، کرتہ پر کشمیرے کی جواہر کٹ صدری اور کھدر کی کشتی نما ٹوپی! ہاتھ میں امرود کی چھڑی اور بغل میں گرم لوئی! میں پہلی نظر میں یہ سمجھا کہ یہ کوئی کانگریسی شاعر ہے! وطن کی نسبت "جارچوی" "سکندرآباد کا جارچہ ہمارے ضلع بلند شہر کا مشہور قصبہ ہے، جو قدیم زمانہ میں نقالوں کے لئے مشہور تھا۔ نخشب نے غزل اور سامعین کی تالیوں کی گونج میں ایک نظم سنائی، خاصی داد ملی —

علی گڑھ کی نمائش میں شام کے وقت بڑی بہار ہوتی تھی ۔

؎ یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

سمال امشاعرے کے دوسرے دن جب ہم نمائش میں ٹہل رہے تھے، تو پھلواری کی روش کے قریب نخشب کا آمنا سامنا ہوا، اور دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر ایسا محسوس کیا ــــ

تمہاری جیسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمہاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

علی گڑھ ہی کے قیام میں اُن سے تعارف ہوا، پھر دعوتوں اور پارٹیوں میں بار بار ملاقات! اس کے بعد جو یارانہ شروع ہوا ہے، تو قربت و بے تکلفی کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں رہی! میری اہلیہ مرحومہ کے بھانجے داماد میرٹھ میں وکیل تھے، اور محلہ خیر نگر میں نخشب کے مکان سے متصل ہی اُن کا مکان تھا، وہاں جب بھی جانا ہوا زیادہ وقت نخشب کے ساتھ ہی گزرتا، ہم تین دوست ــــ نخشب، صابر دہلوی اور راقم الحروف ـ یک جان سہ قالب تھے، ایک دو دن نہیں کئی کئی ہفتے مسلسل رامش و رنگ کی محفلوں اور نغمہ و طرب کے جمگھٹوں میں گزرے ہیں! تینوں کو اپنی شاعری، آواز اور رنگ روپ کے بارے میں خوش فہمی! اور پھر اس کی آزمائش و امتحان کے لئے دلچسپ معرکے اور رنگین مقابلے!

ناگ پور کے ایک رئیس تھے ــــ نواب محی الدین خاں ــــ جو اب مرحوم ہو چکے ـ یاروں کے یار، سیر چشم، رنگین مزاج، عیش پسند، کشادہ دست بلکہ سچ مچ لکھ لُٹ! نواب صاحب سے ناگپور کے مشاعروں اور قومی جلسوں میں میری ملاقات ہوئی، ایک دوبار ــــ اُن کی کوٹھی پر ٹھیرنے کا بھی اتفاق ہوا، میرے ہی واسطہ سے صابر دہلوی اور نخشب سے اُن کی ملاقات ہوئی، وہ مہینوں دلی میں آکر رہتے ہوٹلوں کے کئی کئی کمرے نوکروں، مصاحبوں اور یار دوستوں کے لئے ریزرو! روپیہ پیسہ اُن کی جیب اور ہاتھ میں ٹکتا ہی نہ تھا، کسی کسی مہینہ ایسا بھی ہوا کہ ان کے کارندے اور گماشتے کسانوں اور نمبرداروں سے چالیس پچاس ہزار وصول کر کے نواب صاحب کو دیا اور انہوں نے مہینہ ختم ہونے سے پہلے پہلے، سعدی کے اس شعر کو

قرار در کفِ آزادگاں نہ گیرد مال
نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

عملاً سچ ثابت کر دیا ـ نواب صاحب کی محفلوں اور صحبتوں میں ہم تینوں دوستوں کا وقت قہقہوں، چہچہوں اور خوش فعلیوں میں گزرتا، ان سے ہمارا معاملہ نوابی کا نہیں بے تکلف یار دوستوں کا تھا! شاعری کا بھی اُنہیں ذوق تھا، میں اُس رنگین دور میں بھی نواب صاحب کو ٹھیس کرا دوا اصرار کر کے جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد لے جاتا ــــ پھر نخشب فلمی لائن سے وابستہ ہو کر بمبئی چلے گئے، میں بھی اس ہجوم رنگ و بو سے اُکتا گیا، ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ پھیرا اُدھر کا ہو جاتا، مگر صابر دہلوی نواب صاحب کے سفر و حضر کے ساتھی ہو گئے!

نخشب کا فلمی دنیا میں جانا اس طرح ہوا کہ مشہور فلمی ہدایت کار مسٹر شانتا رام دہلی آئے، انہیں نغمہ نگاروں کی تلاش تھی، متعدد شاعروں کو انہوں نے بلایا، اُن کا کلام سُنا مگر یہ ایک قسم کا انٹرویو سا تھا، مگر نگاہِ انتخاب نخشب پر جا کر ٹھیری! غالباً ۱۹۴۳ء میں وہ چار سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہو کر بمبئی چلے گئے ـ

مشاعروں کے سلسلہ میں میرا بمبئی آنا جانا رہتا تھا، میری کسی کوشش کے بغیر کئی فلموں میں گانے لکھنے کا کام مل گیا ـ حکیم مرزا حمید بیگ دہلوی کی میزبانی نے قیام و طعام کی فکر سے آزاد کر دیا، حضرت جگر مرادآبادی مرحوم بھی حکیم صاحب ہی کے یہاں ٹھیرا کرتے تھے!

نخشب شاید ایک سال سے زیادہ شانتا رام کی فلم کمپنی راجکمل سے وابستہ نہ رہ سکے، کسی بات پر اختلاف ہو گیا، پھر وہ کم و بیش سال بھر

ے، یہ بیکاری کا زمانہ بھی انہوں نے ہنس کھیل کر گزارا، مگر آدمی کتنا ہی گمبھیر اور حوصلہ والا کیوں نہ ہو، حالات کی ناسازگاری کا
کرتے پریشان ہو جاتا ہے، ایک دن نخشب نے اپنے حالات کا ذکر مجھ سے اس قدر دل گرفتگی کے ساتھ کیا کہ ان کی آنکھوں میں ضبط کے
سو آگئے! میں ان دنوں مشہور فلمی ہدایت کار شوکت حسین کی "زینت" کے گانے لکھ رہا تھا! یہ کام ختم ہو گیا تو میں بمبئی سے دلی آگیا —
سے چار سال پہلے میں نے دلی کو اپنا مسکن بنا لیا تھا! سبزی منڈی کے علاقہ (شورہ کوٹھی) میں اپنے ہم زلف کے ساتھ ایک معمولی درجہ کے
مکان میں رہتا تھا، فلم اور مشاعروں کی آمدنی کی ساری جمع پونجی تو تعمیر مکان میں لگا دی تھی، مگر مکان بن کر تیار ہو ہی رہا تھا کہ
نے ایک قیامت برپا کر دی، اس مکان میں رہنا اور اس سے فائدہ اٹھانا نصیب نہ ہو سکا۔
ہاں! جن دنوں فلم "زینت" کی شوٹنگ ہو رہی تھی تو شوکت حسین کی ذہانت نے انہیں عورتوں کی قوالی کی تدبیر سجھائی، نخشب نے قوالی
ہمار کرکے اپنا تخلص اس میں شامل کرایا، "زینت" جب منظرِ عام پر آئی تو نخشب کی قوالی، —

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا

بچ گئی، ہر طرف اس قوالی کا چرچا، لاکھوں کی تعداد میں ریکارڈ فروخت ہوتے، نخشب کی زندگی کا یہی وہ موڑ ہے کہ ان کے نغمے چاندی
ی میں ہاتھ دھونے لگے، فلم والے ان پر ٹوٹ پڑے، نخشب نے ہر گانے کے منہ مانگے دام لئے، سچ پوچھو تو نخشب نے فلمی نغمہ
ن قدر و قیمت بڑھا دی اور گانوں (SONGS) کی شرح کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ فلمی شاعروں کو ان کا احسان ماننا چاہئے۔
تقسیم ہند نے دوستوں اور عزیزوں کی جمی جمائی محفلوں کو درہم برہم کر دیا، سکون و دلجمعی کی ہر بساط تتر بتر ہو گئی، بہت دنوں تک تو ایک
ی خبر ہی نہیں ملی کہ کون جیا اور کون مرا؟ اور جو جی رہا ہے وہ کس حال میں ہے؟ پاکستان بننے کے دو ڈھائی سال بعد فلمی رسالوں اور
سے پتہ چلا کہ نخشب اب فلمی نغمہ نگار ہی نہیں رہے، فلم ڈائرکٹر اور فلم پروڈیوسر ہو گئے ہیں! ۱۹۵۳ء میں وہ اپنے عزیزوں سے ملنے
ی آئے اور ان سے ملاقات ہوئی تو اب ٹھاٹ باٹ ہی اور تھے، شیروانی میں ہیرے کے بٹن، پرائیویٹ سکریٹری ہر وقت اردلی میں!
ہیں لاکھوں کی باتیں! مجھ سے کہا کہ میں تمہارے یہاں کی دعوت کھائے بغیر بمبئی نہیں جاؤں گا، وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے، کل صبح ناشتہ
ہے گی، اور ہاں آمرہیں "WHITE MEAT" ضرور رکھنا، میں نے کہا وہائٹ میٹ کیا ہوتا ہے؟ بولے پرندوں کا
یہ بھی بتا دیا کہ اتنے آدمی میرے ساتھ ہوں گے، کراچی میں ہریل، تیتر اور چہے کہاں مل سکتے تھے، مرغیاں دستیاب ہوئیں، دو ڈھائی
دعوت کے طفیل ہنسی خوشی میں گزر گئے!
بمبئی جانے کے بعد کئی سال تک ان سے کسی قسم کا کوئی ربط قائم نہ ہو سکا، میں نے ان سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ بمبئی کے کس محلہ میں رہتے ہو، پتہ کیا
ان کی عادت سے واقف تھا کہ وہ شاذ و نادر ہی خط لکھنے میں پہل کرتے ہیں، اور خطوں کا جواب دینے سے جی چراتے ہیں! فلمی دنیا
کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی تھی۔ ان کے اور میرے مشاغل کی پٹری ہی بدل چکی تھی۔
قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے متعدد مشاعروں کے دعوت نامے آتے، مگر میں نے سب کو کورا جواب دے دیا۔ ایک آدھ خط میں یہ
ی لکھ دیا —

~ از گوشۂ بامے کہ پریدیم پریدیم

ے کے لئے طبیعت میں کوئی امنگ ہی پیدا نہیں ہوتی تھی، میں نے اسی دور میں ایک قطعہ کہا تھا —

بدر و حنین آج بھی دیتے ہیں یہ پیام | کہ نہ ہو جو فتح تو ہجرت ہے ناتمام
یہ معرکہ عجیب قیامت سرشت تھا | زندوں پہ بھی درود، شہیدوں کو بھی سلام

اس زمانہ میں، اکثر میں یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ ہندوستان کے کسی شہر میں ہوں اور پاسپورٹ کے بغیر میرا آنا ہوگیا ہے کاش! کوئی اہل سیرین میرے ان خوابوں کی صحیح تعبیر بتا سکتا۔

۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے، بمبئی کی کسی ادبی یا تعلیمی سوسائٹی کی طرف سے پاک وہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا، شوکت تھانوی مرحوم نے کہا کہ تمہارے پاس بمبئی کے جس مشاعرے کا دعوت نامہ آیا ہے اس میں شریک ہونے کے لئے تختش نے ٹیلی فون پر بڑا اصرار کیا ہے! میں نے کہا کہ کبھی ہندوستان جانے کے لئے طبیعت کسی طرح آمادہ ہی نہیں ہوتی! اسی زمانہ میں فضل کریم صاحب فضلی کی کوٹھی پہ شام کے وقت شعر و شاعری نشست تھی! شوکت تھانوی نے وہاں سے ٹرنک کال کی، وقت کی بات کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں تختش صاحب فون پر مل گئے، مجھ سے بات چیت ہوئی، بمبئی آنے کے لئے وہ اصرار یا اتنی شدید تاکید کہ مجھے ہامی بھرتے بنی! گیارہ سال کے بعد بمبئی جانا ہوا، ہر قدم پر مانوس منظر اجنبی لگا، بہت سے پچھلے نقش اُبھر آئے، تختش نے میزبانی اور پذیرائی کی حد کردی، بڑی دھوم کا مشاعرہ ہوا، مسٹر چاون اُن دنوں صوبہ بمبئی کے وزیر اعظم تھے، اُن سے ہم پاکستانی شعراء کو ملایا گیا اور اصرار کر کے اسٹیج پر ان کے دوش بدوش بٹھایا گیا! اس مشاعرے اور سفر کا یہ لطیفہ یاد ہے کہ احسان دانش صاحب جن کپڑوں میں ہوائی جہاز سے بمبئی اترے تھے، وہی کپڑے وہاں زیب تن کئے رہے، ہاں! جس دن کراچی واپس ہونے لگے اُس دن لباس تبدیل فرمایا۔

چند مہینے کے بعد پھر خود تختش صاحب نے بہت بڑے پیمانہ پر مشاعرے کا اہتمام کیا، ان دنوں بھارتی ہوائی جہاز کے گرنے کے واقعہ نے پاک وہند کے تعلقات میں کشیدگی پیدا کردی تھی، ہندوستان جانے کے لئے ویزا ملنا بہت ہی دشوار تھا۔ قریب قریب روزانہ ٹیلی فون پر شوکت تھانوی سے تختش کی گفتگو ہوتی تھی، کہ آپ لوگ تیار رہیں۔ ویزا مل رہا ہے گا، صابر دہلوی اس مشاعرے کے لئے ملتان سے کراچی دو تین ہفتہ قبل ہی آچکے تھے، یہاں تک کہ عین مشاعرے کی تاریخ آگئی اور ہمیں ویزا دن کے دو بجے جیسے تیسے ملا، بھاگم بھاگ ہوائی جہاز کے ٹکٹ خریدے اور شام کے "اُڑن کھٹولے" سے بمبئی روانہ ہوگئے! جیب جالب صاحب کو بھی انڈیا ہائی کمشنر کے ویزا آفس میں دیکھا گیا، وہ لاہور سے اسی توقع پر چل پڑے تھے، کہ کراچی میں ویزا مل جائے گا۔ مگر انہیں اُلٹے پاؤں لاہور واپس جانا پڑا۔

شوکت تھانوی، صابر دہلوی اور راقم الحروف —— ہم تینوں رات میں بمبئی ایرپورٹ پر اُترے، سامان کی جانچ پڑتال ذرا سی دیر میں ہوگئی ہوائی اڈے سے ہمیں سیدھا مشاعرہ گاہ پہونچایا گیا، ہمارا وہاں پہونچنا، خاصے ڈرامائی انداز میں ہوا۔ سامعین نے ناموں کا اعلان سُن کر اور ہمیں دیکھ کر پرجوش انداز میں تالیاں بجائیں! شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی پانی کے جہاز سے بمبئی پہونچ چکے تھے، انہوں نے مصرعہ طرح پر نظم کہی جس کا یہ مصرعہ بہت مشہور ہے۔

کیا گلبدنی، گلبدنی، گلبدنی ہے

مسٹر وی شنکر رائی، سی ایس، ڈائرکٹر جنرل محکمہ ڈاک حکومت ہند، مشاعرے کے صدر تھے، اسٹیج بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، نقرئی تھالیاں شاعروں کے درمیان گردش کررہی تھیں، جن میں سونے کے ورق لگے ہوئے پان کے بیڑے رکھے تھے، تختش نے مجھے اسٹیج پر شدید اصرار کر کے ایک ایسے مقام پر بٹھایا کہ اعلان کے مطابق اُس مشاعرے کی فلم تیار ہو جاتی، تو مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر نوجوان رشک کرتے اور اہل تقویٰ ملامت! حضرت جگر مرحوم نے طرح پر غزل پڑھی غالباً یہ اُن کا آخری مشاعرہ تھا، اب اُن کی صحت کا یہ حال ہوگیا تھا کہ بعض اوقات آٹو گراف بک پر شعر لکھنے یا دستخط کرنے کی بجائے لکیریں بنا دیتے۔

میر تقی میر کی غزل کا مصرعہ اس مشاعرے کی طرح قرار پایا، پھر مشاعرے میں چند معروف و منتخب شعراء نے میر کی شخصیت و فن پر مختصر تاثرات پڑھوائے گئے جن کی فلم والوں نے صدا بندی کی، جگر صاحب کا تاثر اُن کے کہنے سے میں نے لکھا!

ا ذونادر ہی ایسا ہوا ہوگا کہ نخشب کوئی کام شروع کریں اور اُس میں اختلاف و ہنگامہ کی صورت پیدا نہ ہو جائے، اس مشاعرے میں بھی
ں ترقی پسند شعراء سے شدید اختلاف ہوگیا، انہوں نے اخبارات میں نخشب کے خلاف مضامین چھپوائے، اس اختلاف و نزاع کا اثر
پر بھی پڑا، مالی طور پر نخشب کو مشاعرے میں خاصہ خسارہ رہا۔
اس انڈو پاک مشاعرے کے تیسرے دن ترقی پسند شعراء نے صابو صدیق ہال میں مشاعرے کا اعلان پاکستانی شعراء کے ناموں کے ساتھ کیا!
عرے کے دن شام کے ۵ بجے جگر، شوکت تھانوی، صابر دہلوی، اور راقم الحروف کو شہر سے دور لے گئے، اور وہاں کسی پارسی تاجر کے
یں ٹھہرا دیا، سمندر کا کنارا، ناریل کے درختوں کی قطار، چاندنی رات، موجوں کا مدوجزر، بنگلہ میں ہر طرح کا سامان آرام، کھانے کا
نظام! یہ رات ہنسی خوشی کے پر لطف ماحول میں گذری! مشاعرے کے منتظمین شاعروں کو اُن کی قیام گاہوں پر ڈھونڈتے پھرے
شاعروں کو ایسی جگہ پہونچا دیا جہاں کا پتہ لگنا ناممکن تھا، سنا ہے کہ مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری نے معذرت کرتے
عرے میں اعلان کیا کہ بعض شعراء جن کے نام اشتہار میں دئے گئے تھے وہ کسی وجہ سے مشاعرے میں شرکت نہ کرسکے جو سامعین اُن کو
لئے آئے ہوں وہ اپنے ٹکٹوں کی رقم واپس لے سکتے ہیں۔
اسی سفر میں شکیل بدایونی کی زبانی معلوم ہوا کہ پاکستان اور ہندوستان کے سب سے بڑے فلمی نغمہ گر نوشاد سے نخشب کا شدید
ہے، شکیل نے مجھ سے کہا کہ نوشاد تم سے ملنا چاہتے ہیں، وہ خود یہاں آکر تم سے ملتے مگر اُن کا نخشب کے یہاں آنا جانا نہیں ہے؛
ہے کہ آپ نوشاد کے یہاں کیوں نہ چلے چلیں۔ میں اس پر خاموش ہوگیا، اس واقعہ کے تیسرے چوتھے دن نوشاد خود آئے، نخشب کے
آدمی بھیج کر مجھے نیچے بلایا، کسی پارٹی سے وہ آرہے تھے، گوٹے کناری اور پھولوں کے ہار آن کی موٹر کی نشست پر رکھے تھے، میرے
ڈال دئے۔ اور تھوڑی دیر باتیں کر کے چلے گئے؛
اسی زمانہ میں محمد نیاز مرحوم ڈی، ایس، پی، حیدرآباد میں کمشنر تھے، انہوں نے حیدرآباد میں شاعروں کی طرح ڈالی ——
انوی کے کہنے پر محمد نیاز مرحوم نے نخشب کو بمبئی مشاعرے کا دعوت نامہ بھجوایا، مشاعرے کے صدر سابق وزیر خزانہ جناب
تھے، شوکت تھانوی نے نخشب کو شعیب صاحب سے ملوایا۔ اس کے بعد نخشب نے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے آنے کا خیال
—— اور وہ پھر چند ماہ کے بعد کراچی آبھی گئے!
ہندوستان میں جو فلمیں انہوں نے بنائی تھیں اُن کے لانے کے سلسلہ میں نخشب کے لئے مشکلیں اور خطرے پیدا ہوگئے، سب سے
ک بات یہ تھی کہ وہ پاکستان کے نیشنل نہیں تھے، صورت ایسی پیچیدہ ہوگئی کچھ بعید نہ تھا کہ وہ گرفتار ہو جاتے —— مگر میرے شیر
زور رسوخ، شہرت اور شخصیت سے کام لے کر شاید دو تین دن میں نیشنلٹی حاصل کرلی، ہفتوں کے مراحل گھنٹوں میں طے ہوتے اور
س کا پتہ چلا تو سب ہکا بکا رہ گئے۔ حکومت کا کوئی وزیر یا سکریٹری بھی چاہتا تو اس طرح آنا فانا نیشنلٹی نہیں مل سکتی تھی مگر ——
تھا کہ جہاں کسی کی سوئی نہ جا سکے، وہاں یہ شخص بھالا داخل کرسکتا تھا۔ فلموں کی درآمد کا معاملہ خاصہ اہم اور نازک و پیچیدہ تھا
لہ بات عدالت تک پہونچی، مگر چند پیشیوں کے بعد مقدمہ اُٹھا لیا گیا!
نخشب نے ہندوستان میں کئی فلمیں تیار کی تھیں ان میں سب سے زیادہ کامیاب فلم "زندگی اور طوفان" تھی۔ پاکستان میں بھی اس فلم نے
اعتبار سے اگلے پچھلے سب ریکارڈ توڑ دئے، لاکھوں کی آمدنی ہوئی —— مگر نخشب کے اخراجات بھی نوشاہانہ تھے، اور اُس پہ
یں شرط لگانے کی لت! ریس (RASE) کے جوئے کا مارا ہوا کہاں پنپتا ہے۔ پھر نخشب نے دو فلمیں بنائیں ایک کراچی میں اور دوسری
! اتنی لاگت کی فلمیں پاکستان میں اب تک نہیں بنی تھیں، ان میں بھی کمایا نہیں گنوایا۔ اس کے بعد نخشب کی تمام دلچسپیاں "ریس کورس"

کی نذر ہو کر رہ گئیں، کسی کسی دن تو کئی کئی لاکھ کی ہار جیت! گھوڑے جو رکھنے شروع کیے ہیں تو ان کی تعداد چالیس تک پہونچ گئی! ہزاروں روپیہ کا خرچ! کیسے کیسے نامی گرامی سدھانے والے (TRAINER) بھاری تنخواہوں پر ملازم رکھے گئے، کروڑوں انسانوں کو ایسی غذا میسر آتی جیسی غذا ان گھوڑوں کو دی جاتی تھی! ـــ سچ مچ نوابی کارخانہ!

میں نے بارہا سمجھایا کہ فلم اور ریس ان دونوں دھندوں کو چھوڑ کر تم کوئی اور کام کرو، تمہارے پاس روپیہ ہے تعلقات ہیں، خود تمہاری ہے اس سے زیادہ کماؤ گے! یہ نچکیے، بھجنتری، نقال، ڈوم ڈھاڑی اور جوار بھنڈار کی بھلا شرفا کی صحبت کے قابل ہیں! ایک دن بگڑ کر بولے

"ماہر! دیکھو، ہم تمہارے نماز روزے کے معاملے میں نہیں بولتے، تم ہمارے معاملات میں مت بولو"

اُن کی اس بات پر مجھے غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی آئی!

نخشب کی زندگی عیش و راحت کی زندگی تھی، لطفِ زندگی کے بارے میں اس نے جو زیادہ سے زیادہ سوچا، اس سے بڑھ کر اسبابِ عیش چلے گئے، مکان قالینوں، آئینوں اور جھاڑ فانوس سے "قیصر باغ" اور "دلکشا منزل" بنا ہوا ہزاروں روپیہ تو باورچی خانہ کی آرائش اور صنعت خرچ کر دیا، اچھے سے اچھا کھانا کھانا اور دوسروں کو کھلانا اس شخص کی HOBBY تھی، دعوتوں کا کوئی حد و شمار نہیں، پھر ان میں طرح طرح کے پرتکلف کھانے، ہر چیز کی فراوانی، مرغ کے سیخ کباب تو راقم الحروف نے حیدرآباد دکن کے نوابوں اور لکھنؤ کے تعلقداروں کے یہاں کھائے، مگر نخشب کی دعوتوں میں ان کبابوں کا معمول تھا! کھانا پکانے میں وہ خود دلچسپی لیتے اور نئے نئے تجربے کرتے رہتے، مسلّم بکرا پہلے ہی اچھا پکتا، پھر مسلسل مشق و تجربہ نے خاصہ کی چیز بنا دیا، مسلّم بکرے کے اندر چاول بھرے ہوتے! اس کے ساتھ دہی کی لسّی! کھانوں سے اعلیٰ جنس صرف ہوتی، بید مشک، کیوڑے اور عطر کے کنستر اور زعفران کے ڈبے تحویل میں رہتے!

نخشب کے ملنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، مگر ان میں سب سے زیادہ بے تکلف اور قریبی دوست تابش دہلوی اور راقم الحروف تھے نخشب کی دعوتوں میں ہر طبقہ کے لوگ ہوتے، ایک دو بار انڈیا ہائی کمشنر کے عہدیداروں کو بھی اُن کے دسترخوان پر دیکھا گیا۔ تابش صاحب نے نخشب سے دعوت کے بعد کہا کہ ان لوگوں کا آنا جانا کہیں تمہارے لئے کسی پریشانی کا باعث نہ بن جائے تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ پاکستان اور ہندوستان کے سیاسی تعلقات میں سدا تناتنی رہتی ہے۔

نخشب سے بعض لوگوں نے ہزاروں کا فائدہ اٹھایا، کتنوں نے قرض کے نام پر روپیہ لیا اور پھر واپس نہیں کیا، کسی نے کسی معاملہ میں چک رقم اینٹھ لی، اس کشادہ دستی کے ساتھ اُن کی یہ عادت تھی کہ بھکاریوں اور فقیروں کو بُری طرح دُھتکار دیتے! میں نے ایک دو بار خیر کے کاموں مالی امداد کے لیے توجہ دلائی تو ٹال گئے!

ایران کا دو بار سفر کیا، فلم کی پبلسٹی کے سلسلہ میں دو دفعہ سیلون بھی گئے، جاپان اور ہانگ کانگ بھی ہو آئے، وہاں سے آکر کلبوں اور تفریح گاہوں کی تفصیل سناتے رہے! کسی کتب خانے، میوزیم اور تاریخی مقام کا کوئی ذکر نہیں!

نخشب کے معمولات میں طہارت کا بہت اہتمام دیکھا گیا، کبھی کبھی نماز بھی پڑھ لیتے، وہ مذہباً شیعہ تھے، مگر مذہبی مباحث اور طرح کے اختلافی مسائل نہ خود چھیڑتے اور کوئی دوسرا ان باتوں کا ذکر کرتا تو سختی سے روک دیتے! ایک بار ایک شیعہ نوجوان شاعر محرم کی عزاداری کا ذکر کرتے ہوئے بولے کہ اتنے آدمی چھریوں سے ماتم کرتے ہوئے شہید ہو گئے، میرے منہ سے بے ساختہ نکلا یہ شہادت نہیں خودکشی ہے! اس پر نخشب نے بہت بُرا مانا، کچھ دیر تک خاصی تلخ و تند قسم کی گفتگو بھی رہی۔

نخشب کے دل میں میرے لئے جتنی گنجائش تھی اور کسی دوست اور ملنے والے کے لئے نہ تھی، ہر بات میں میری دلدہی کا خیال رکھتے دعوتوں کے بعد لوگوں سے کہتے کہ ماہر کو کھانا پسند آ گیا بس میری محنت وصول ہو گئی اور میرا جی خوش ہو گیا، ایران سے میرے لیے سردے لے کر آئے

مسلم مرغ بھی! جاپان سے شیروانی کا گرم کپڑا مجھے ارمغان کو لا کر دیا۔ یہ اُن کا پہلا اور آخری تحفہ تھا۔ ایک بار میری کلائی سے گھڑی باندھ دی، میں نے کہا یہ تو میرے پاس دو دن میں خراب ہو جائے گی، مجھے گھڑی میں چابی دینی ہی نہیں آتی، میں نے ساری عمر جیبی یا دستی کسی قسم کی گھڑی نہیں رکھی، اس پر وہ مسکرانے لگے اور میرے اصرار پر گھڑی واپس لے لی ——— اپنے ریس (RACE) کے ایک گھوڑے کا نام ماہر (MAHIR) رکھا، دوستوں سے کہا کرتے کہ اس گھوڑے میں ماہر کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں!

جب وہ شروع شروع میں پاکستان آئے ہیں تو مجھ سے فلمی گیت لکھنے کے لئے بڑا اصرار کیا، میں نے انکار کیا تو جھنجلا کر بولے، تو نے ملّا بن کر اپنی اوقات خراب کر لی، سواری کے لئے موٹر تک نہیں ہے، ٹراموں اور بسوں میں مارا مارا پھرتا ہے ——— پھر انہوں نے ہوائی جہاز سے لاہور بلایا وہاں بالا ہی بالا بارہ ہزار روپیہ پر ایک کمپنی سے گانوں اور مکالموں کا معاملہ بھی طے کر دیا، میں مسلسل انکار کرتا رہا، میں بڑی سخت مشکل میں پھنس گیا، ایک طرف اتنے ہمدرد اور بے تکلف دوست کی بے غرض ہمدردی، دوسری طرف بارہ ہزار کی رقم! طبیعت آمادہ ہوتے ہوتے، پھر برگشتہ ہو گئی! حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد زکی کیفی جو مخشب صاحب کے بھی دوست تھے، اُن سے میں نے کہا کہ بھئی! اس مخمصہ سے مجھے خدا کے لئے نکالو، اُن کے سامنے جب اس کا ذکر آیا تو انہوں نے میرے "انکار و گریز" کی تائید کی، میں نے مخشب سے کہا کہ میں اس کام کے لئے تیار بھی ہو جاؤں ——— تو اس کا اندیشہ ہے کہ چند دن کے بعد پھر کہیں طبیعت بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے، اس وقت کیا ہوگا؟

"تم تمام بُری باتوں سے توبہ کر چکے ہو" ——— مخشب نے کہا

"مجھے پارسائی کا دعویٰ کب ہے؟" ——— میں نے جواب دیا

"تم جیسے ملاؤں کی عجیب ذہنیت ہے، ایسے گناہ تو کرتے ہو، جس میں گرہ سے خرچ ہوتا ہے، مگر جس کام سے مالی نفع ہوتا ہے، زندگی خوش حال ہوتی ہے اس سے بھاگتے ہو۔ ۔ ۔" مخشب کے اس ریمارک کے بعد اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ بات جہاں تھی وہیں ٹھپ ہو کر رہ گئی!

اب سے سات سال پہلے کی بات ہے مدراس سے مشاعرے کا بلاوا آیا، اس کے بعد ہی بمبئی میں "جشن شاعر" کا مشاعرہ تھا، بات طے ہو گئی مگر جس دن سفر کرنا تھا، اُس دن بین الاقوامی قانون کے تحت، کیمبرے ہوائی جہازوں کی پرواز ساری دنیا میں منسوخ کر دی گئی! مجھے بمبئی ہو کر مدراس جانا تھا، بڑی کوفت ہوئی، مدراس جانے کا اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، مگر مخشب کے تعلقات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اُس نے نہ جانے کہاں کہاں ٹیلی فون کر کے اور کس کس سے جوڑ ملا کر دلّی کے راستہ سے مجھے مدراس بھجوا کر چھوڑا، کراچی ایئرپورٹ پر ہوائی جہاز کا ٹکٹ مخشب نے ایسے وقت پر دیا کہ میں جہاز کی سیڑھی کے قریب کھڑا تھا اور ایک دو منٹ میں سیڑھیاں ہٹنے والی تھیں، جب تک کوئی کام ہو نہ جائے مجھے اطمینان نہیں ہوتا، معاملہ کا دوسرا رخ سامنے آتا رہتا ہے، راستہ بھر یہی خیال آتا تھا کہ دلّی سے مدراس کے لئے جہاز میں جگہ ملتی بھی ہے یا نہیں! دلّی پہونچ کر اطمینان ہوا کہ مدراس جانے والے جہاز میں میری نشست محفوظ ہے اس عظیم معرکہ کا سر کرنا بس مخشب ہی کا کام تھا! اس شخص کی آنکھ میں موہنی تھی اور وہ اس فن میں کہ کون شخصیت کس زاویہ سے رام ہو سکتی ہے ید طولیٰ رکھتا تھا اسی فن اور آرٹ کی بدولت مخشب نے نہ جانے کتنے غزالانِ رمیدہ کو صید کیا۔

مخشب یاروں کا یار تھا، آنکھ میں بڑی مروت تھی، دوستوں کا ہمدرد اور بے غرض دوست! مگر ان تمام خوبیوں کے ساتھ

جھلکیاں! زبان ایسی پائی تھی کہ ———

ع کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

ذرا کوئی خلافِ طبیعت بات ہوئی، زبان قابو سے باہر ہوگئی، بڑے بڑوں کو جھاڑ دیا اور اچھے اچھوں کی کرکری کر دی۔ ایک صاحب محمد علی نے بس اتنا پوچھ لیا تھا کہ جن فلم میں آپ مجھے لیتے ہیں اُس کی اسٹوری تو مجھے پہلے سُنا دی جائے بس اس بات پر جو اُس کو سنا جاتی ہیں، تو وہ بے چارہ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مشہور کہاوت ہے جہاں چار برتن ہوتے ہیں، کھٹکتے ہی ہیں، مخلص دوستوں کے درمیان بھی کبھی کبھار بدمزگی اور تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض وقت باتوں باتوں میں نخشب سے اچھے خاصے معرکے اور مچیٹے ہو جاتے۔ اُن کا مزاج شعلہ اور راقم الحروف کا مزاج بر... میں اُن کا دوست بھی تھا اور سخت نقاد بھی۔ کوئی خاص کھانا وہ پکاتے اور اس کی تعریف اس قسم کے لفظوں میں کرتے :-

"تمہاری سات پشتوں نے ایسا کھانا نہیں کھایا ہوگا"

تو میں انہیں ٹوکتا کہ اہلِ ظرف ایسی باتیں نہیں کیا کرتے، مبالغہ کی بھی انہیں عادت تھی، میں نے اس پر بھی انہیں بارہا ٹوکا، کہ لوگ منہ پر کچھ نہیں، مگر بعد میں چرچے کرتے ہیں! اور تم جو شہرۂ آفاق ایکٹروں اور ایکٹرسوں اور گلوکاروں کے بارے میں ایسی ڈینگیں لیتے ہو جیسے یہ سب تم بنائے ہوئے ہیں، اور تمہارے ممنونِ کرم اور خوشہ چین ہیں، تو سننے والے ایسی باتوں کا تمہارے بارے میں کوئی اچھا اثر نہیں لیتے۔

ایک بار بحث و گفتگو میں میں نے یہاں تک کہہ دیا ——

"تم سے میرے روابط اور تمہارے یہاں میرا آنا جانا میرے لئے موجبِ تہمت! اور مجھ سے تمہارے تعلقات تمہارے لئے نیکنامی کی سند........"

انتہائی تلخی اور بدمزگی کے بعد پھر تھوڑی دیر میں ہنسی مذاق کی باتیں ہونے لگتیں، جیسے کسی نے کسی کو کچھ کہا ہی نہ تھا، یہ زیادہ دیر تک ٹھہرنے نہ پاتا، مگر ایک بار نخشب سے ایک صاحب کے معاملہ میں اتنی سخت گفتگو ہوئی کہ اُس کے بعد ملنا جلنا اور بول چال بند ہوگئی، دوستوں نے ملاپ کے لئے بہت کچھ دوڑ دھوپ کی، کئی بار ہم دونوں کو دعوت میں بھی بلایا مگر یہ رشتہ ٹوٹ کر پھر جڑ نہ سکا۔

میانِ پختہ کاراں بود بحثِ خویشتن داری

نخشب نے لوگوں سے کہا کہ ماہر نے مجھ سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا، کوئی غلط بات نہیں کہی اُن کی دوستی ہمیشہ بے غرض رہی —— مگر ماہر ایک غیر شخص کے مقابلہ میں مجھے جو ذلیل کیا بس اس بات سے دل پھٹ گیا........!

نخشب کا یہ شعر ——

مجھے ملال ہے تم کو مگر خیال نہیں ۔۔۔ کہ لوگ کہتے ہیں آپس میں بول چال نہیں

بہت پسند تھا، میرے اور اُن کے معاملات میں یہی شعر واقعہ بن گیا! کشیدگی اور بے تعلقی کی انتہا ہوگئی کہ میری بیوی کی موت پر بھی پُرسا نہ دے سکے!

نخشب کی صحت اچھی تھی مگر کئی کئی مہینے کے وقفہ سے اُن کی آنتوں میں سُدّا پھنس جاتا تھا، یہ تکلیف علاج معالجہ سے دفع ہو جاتی اس مرض کے ازالہ کی طرف اُن کا دھیان نہیں گیا! اب کی بار پیٹ اُپھرا تو حالت بگڑتی ہی چلی گئی، معقول علاج بھی نہ ہو سکا دو تین دن تکلیف رہی پھر اس کے بعد زندگی کے ڈرامہ کا آخری پردہ گرا اور تماشا ختم!!

میں نو بجے کے قریب شب میں گھر آیا تو پتہ چلا کہ تھوڑی دیر پہلے ٹیلی فون آیا ہے کہ نخشب صاحب کا انتقال ہوگیا! نخشب کا انتقال ہوگیا نہیں...... یہ مذاق معلوم ہوتا ہے....!

یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہوگی

[م]یں نے نابش صاحب کو فوراً ٹیلی فون کیا، وہ بھی اس حادثہ سے بے خبر تھے، نظامی دواخانہ سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ خبر صحیح ہے، حکیم [ن]صیر الدین صاحب نخشب مرحوم کے یہاں گئے ہوتے ہیں۔

ڈیڑھ سال کے بعد نخشب کے یہاں میرا جانا ہوا ان سے ملنے کے لئے نہیں، اُن کی میت پر آنسو بہانے کے لئے! فلیٹ کا ہال تعزیت [ک]رنے والوں سے بھرا ہوا تھا، سب غمزدہ اور ساتھ ہی حیرت زدہ کہ ایکا ایکی کیا ہوا، مگر نخشب نے خود اپنے بارے میں پیش گوئی کی تھی!

ع ایسے انسان کی زیادہ زندگی ہوتی نہیں

[ا]ن کے منجھلے بھائی عباس ضیاء (ایڈووکیٹ) دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، زنانہ سے بھی عورتوں کی آہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں! مگر [س]اری دنیا کی چیخیں اور زمین و آسمان کے آنسو بھی جسم سے نکلی ہوئی روح کو واپس نہیں لا سکتے۔ اُن کا مکان جنت نشان سوگ میں ڈوبا [ہ]وا تھا، قد آدم آئینے دھندلے نظر آتے تھے، جھاڑ فانوس کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی، ریشمی گاؤ تکیوں اور ایرانی قالینوں پر فدا سی دیر [م]یں غم والم کی گرد جم گئی!

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے —

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اُٹھے

—— تو ——

[ص]بح ساڑھے نو بجے نخشب کا جنازہ واقعی بڑی دھوم سے اُٹھا، رات کو ریڈیو سے خبر سن کر لاہور سے اُن کے کئی فلمی دوست اور شناسا [ہ]وائی جہاز کے ذریعہ کراچی پہونچ گئے۔ جنازے کے ساتھ دُور تک موٹروں کی قطاریں! پھر گیارہ بجے کے قریب اُن کا جنازہ سپرد خاک کر دیا گیا، یہ وہ جسم تھا جو برسوں سے پھولوں میں تلتا تھا اور عطر میں لبا رہتا تھا۔ مگر اب قبر میں اتار کر لوگوں نے اُس پر مٹی ڈال دی —— [ر]ہے نام اللہ کا

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نخشب میں آگے بڑھنے اور سب سے اونچا رہنے کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا تھا، طالب علمی کے زمانہ میں ہاکی کے وہ ممتاز کھلاڑی تھے، [م]شاعروں میں شرکت شروع کی تو شاعروں کے فوٹو گروپ میں نخشب کا سانتہ کی صف اول میں بیٹھا دیکھا گیا، مشاعروں میں اسٹیج پر کلکٹر ول [س]یشن ججوں اور دوسرے افسروں کے زانو سے زانو۔ اگر بیٹھتے کسی سے مرعوب ہونا اور داب کھانا تو یہ شخص جانتا ہی نہ تھا، اجنبی لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے اور انہیں متاثر کرنے کا فن اُسے آتا تھا۔

انگریزی دور میں ریلوے کے محکمہ میں تعلقات اتنے بڑھے ہوئے کہ شاعروں کو فرسٹ اور سیکنڈ کلاس میں بے ٹکٹ اپنے ساتھ لے جاتے! ایک بار اسی طرح نخشب، صابر دہلوی اور راقم الحروف سفر کر رہے تھے، جاڑے کا زمانہ تھا، سکھ ٹکٹ چیکر کشمیرے کی نیلی وردی پہنے ہوئے، ڈبہ میں داخل ہوا، اُسے دیکھ کر میرے چہرے پر ہوائیاں چھٹنے لگیں، نخشب نے صابر دہلوی سے کہا کہ ماہر سے کہو کہ وہ ٹھیک بیٹھا رہے، بدحواسی کا مظاہرہ نہ کرے —— اتنے میں ٹکٹ چیکر نے نخشب سے ٹکٹ مانگا، نخشب نے اپنی اور ہم دونوں کی طرف اشارہ کر کے چپکے سے نہ جانے کون سے مقررہ الفاظ* (CODE WORDS) استعمال کئے کہ ٹکٹ چیکر نے ہم سے ٹکٹ نہیں مانگے اور جنکشن آنے پر خاموشی کے ساتھ [ڈ]بے سے باہر چلا گیا۔

موٹر چلانے میں اپنی آپ مثال، جس موڑ پر چاہا کار کو چابکدستی کے ساتھ گھما دیا، بعض اوقات کراچی شہر میں موٹر کی رفتار ستر اسی میل فی گھنٹہ ہو جاتی، ایسا ہوتا رہتا کہ ہم دونوں ساتھ جا رہے ہیں، نخشب نے کسی سائیکل، گھوڑا گاڑی یا بس سے موٹر اس طرح بچا کر آگے نکالی —— میں

سمجھا نکر ہو گئی، میرے منہ سے بے ساختہ "ارے بھئی! بچا کر، احتیاط سے" نکلا، اس پر وہ بگڑ جاتے! چوراہے پر سواریاں رکی کھڑی سُرخ بتی پر سب کی نگاہیں لگی ہیں، مگر نخشب نے تیزی کے ساتھ کار گزار دی، کانسٹیبل سیٹی بجاتا رہا اور نخشب کی موٹر یہ جا وہ جا، تیزی بے باکی اور خود اعتمادی قانون وانون کی زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔

یاروں کے یار، ایثار و ہمدردی کا بے پناہ جذبہ مگر جب کسی سے ان بن ہوئی اور بات قطع تعلق تک پہونچ گئی تو پھر طبیعت کا یہ عالم کہ جیسے اُس دوست سے جان پہچان ہی نہ تھی!

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے بڑے گہرے تعلقات تھے، مگر ان سے فلم سازی کے سلسلہ میں نوبت مقدمہ بازی تک پہونچ گئی جمشید علی خاں مرحوم رئیس باغپت کے صاحبزادے کنور شمشاد علی خاں سے طالب علمی کے زمانہ کی دوستی تھی، تعلقات کی کوئی حد نہ تھی، لیکن جب اختلاف ہوا تو کچے دھاگے کی طرح تعلقات ٹوٹ گئے، یہی صورت شاہد دہلوی کے ساتھ پیش آئی، ہم نے میل ملاپ کی بہت کوشش کی نخشب دوستی کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑنے کے لئے کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہوئے، شوکت تھانوی سے بھی بس منہ دیکھے کی صاحب سلامت تھی، پرانے دوستوں میں ایک میں ہی رہ گیا تھا، سو میرے ساتھ جو معاملہ پیش آیا اُس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔

طبیعت میں ضد تھی، ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بلکہ خود نگری بھی، اس کی بدولت انہیں بڑے مالی نقصانات اُٹھانے پڑے زندگی سے لیکر فلم اور پریس کی دنیا تک مقدمہ بازی اور شدید اختلاف و ہنگامہ آرائی! نخشب نے سب سے پہلی فلم (میخانہ) پاکستان میں جب بنائی ہے تو اس کے لئے طہران سے ہیروئن انتخاب کر کے لائے، اسکیم یہ تھی کہ یہ فلم اُردو فارسی دونوں زبانوں میں تیار ہوگی، فلم کی ابتدائی شوٹنگ میں ایرانی ہیروئن سے شدید اختلاف ہو گیا اور بات بڑھتے بڑھتے ایرانی سفارت خانے تک پہونچی؛ ہیروئن نے بڑی خوشامد کی مگر نخشب کی رنگ ہی کچھ اور تھا اس عورت کو بالآخر ایران واپس جانا پڑا اس جھگڑے میں پچاس ساٹھ ہزار سے کم کا کیا نقصان ہوا ہوگا! یہی صورت ... ستانی ایکٹر کے ساتھ پیش آئی اس نے جتنا کام کیا تھا فلم کے وہ ٹکڑے بھی ضائع کر دئے گئے!

نخشب ایک بے باک و جری طالع آزما ADVENTURER شخص تھا ہم نے اُس کا وہ زمانہ بھی دیکھا ... میں دو چار آنے کی گنڈیریوں سے دوستوں کی تواضع کرتا تھا اور پھر اُس کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ بھی ان آنکھوں نے دیکھے۔

مزاج و طبیعت شاہانہ اور آمرانہ پایا تھا، گھانا، تنزانیہ اور نائیجیریا جیسی حکومتیں جو چند سال پہلے آزاد ہوئی ہیں، اگر وہ ان ملکوں کی سیاسیات کی طرف توجہ کرتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ کسی علاقہ کا ڈکٹیٹر بن جاتا!

نام اصغر عباس تخلص نخشب رکھا اسی سے ان کی شانِ انفرادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کسی شاعر کا تخلص اس سے پہلے نہ سُنا اور نہ پڑھا۔ شاعری میں کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، جب وہ پندرہ سولہ سال کے ہوں گے، اُس زمانہ میں عیاں صاحب میرٹھ کے ... شاعر تھے اور اُس نواح میں اُن کا طوطی بول رہا تھا، اُن کے دو شعر —

پس مردن تپش کی یادگاریں چھوڑ آیا ہوں
شکن جو جو جہاں پر ہے وہیں رہنے دو بستر میں

مری نگاہ کی تصویر کرتی ہے دیتا
اُٹھا رہا ہے زمانہ اُس آستاں سے مجھے

... ان صاحب کے رنگ شاعری کا نخشب نے اثر قبول کیا! (غالباً) ۱۹۴۲ء میں اُن کی غزلوں کا مجموعہ — مشعلِ راہ — شائع ہوا ... پر ایک مضمون لکھا، جسے نخشب نے کسی رسالہ میں چھپوایا، کہتے تھے کہ "مشعلِ راہ" کا دوسرا ایڈیشن جب چھپے گا تو تمہارا یہ تنقید ...

کوشش کروں گا، مگر طبع ثانی کی نوبت ہی نہیں آئی! اُس دور شاعری کے چند اشعار جو اس وقت یاد آتے جا رہے ہیں :—

کوئی کس طرح راز الفت چھپائے — نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے
مرا حالِ دل سُن کے وہ مسکرائے — یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے
اشارۃً بھی نہ شکوے بیاں کئے ہوتے — سِئے تھے ہونٹ تو آنسو بھی پی لئے ہوتے
سر جھکاتا ہوں کہ دنیا دوسری ہو جائیگی — سر اُٹھاتا ہوں تو دنیا دوسری ہوتی نہیں
دل اُلجھ جائے تو پھر تفریحِ نظارہ کہاں — کوئی منظر ہو مگر، دامن بچائے جائیے
آپ ہی کے دم سے وابستہ ہے میری زندگی — آپ جس عالم میں چاہیں گے بسر ہو جائے گی

فلمی دنیا سے وابستگی کے بعد اُن کی شعر گوئی کی رفتار بہت سست ہو گئی اور ریس (RACE) کی مشغولیت نے تو اُن کو عملاً شاعر نہیں رہنے دیا، پاکستان میں آتے ہوئے انہیں آٹھ نو سال ہوئے، اس مدت میں مشکل سے تین چار غزلیں کہیں!

کوئی رشتہ کسی عنواں ہی سہی — میرا ہاتھ اُن کا گریباں ہی سہی
ہر پریشاں سے مجھے ہمدردی — وہ تری زلف پریشاں ہی سہی
حالِ دل اُن کو سنائیں گے ضرور — حالِ دل اُن پہ نمایاں ہی سہی

غالبؔ کی غزل پر بڑے معرکہ کی غزل کہی، ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے :—

؎ وار اوچھا ہے زخم کاری ہے

نخشبؔ کا مزاج خالص غزل کا مزاج تھا اپنی فلم کمپنی کا نام بھی انہوں نے غزل ساز رکھا اور "غزل" نام کی فلم بنانے کا ارادہ غالباً اس نام کا ہندوستان ہی کے قیام کے زمانے میں اعلان بھی کر دیا تھا! اچھا شعر سن کر [illegible] اور بے ساختہ داد دیتے میں نے اپنی تازہ غزل سنائی، تو اس شعر —

"فائدہ جب وفا کا ہوتا ہے
میں تمہاری مثال دیتا ہوں"

کے بارے میں ایک دن بولے بھئی! تین چار دن سے تمہارے اسی شعر میں گم ہوں۔
ایک غزل کا بس مطلع ہی کہہ کر رہ گئے، مگر ظالم نے کس قیامت کا مطلع کہا ہے —

آخری وقت آہ کرتا ہوں
آج پہلا گناہ کرتا ہوں

سلہ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ مصرعہ میں میرے حافظہ نے کچھ ردو بدل کر دیا ہو۔

روحِ انتخاب

اک وہ بھی زمانہ تھا!

● سلطان سلجوقی نے گورنر کو لکھا :-

"معلوم ہوا ہے کہ تمہاری مجلس اہلِ علم سے خالی ہے تمہارے خادم بدخو ہیں، حاجب تند و ترش ہیں حاجت مند تم سے مایوس ہیں۔ تمہاری دولت خزانہ میں ہے لیکن تم پر تنقید کرنے والے جیل میں ہیں لہٰذا! تمہیں معزول کرتا ہوں"

● امیر معاویہؓ نے اپنے عہد کے ایک عالم احنف بن قیس سے پوچھا زمانے کا کیا حال ہے؟

کہا :- "زمانہ تم ہو تم درست ہو تو زمانہ بھی درست ہے تم بگڑ گئے تو زمانے کا خدا حافظ"

● حضرت عمر فاروقؓ سے کسی نے کہا : "آپ اپنے ساتھ حفاظتی دستہ کیوں نہیں رکھتے" فرمایا "عوام کا کام میری حفاظت نہیں، میرا کام ان کی حفاظت ہے"

● ہارون الرشید کے زمانہ میں عبداللہ بن مبارک مشہور فقیہہ محدث تھے ایک مرتبہ وہ عراق کے ایک شہر رقہ میں تشریف لے گئے تو سارا شہر استقبال کو امڈ آیا یہ منظر دیکھا تو ہارون الرشید کی بیوی نے اس سے کہا :

"یہ ہے حقیقی سلطنت کہ ساری دنیا انہیں دیکھنے کے لئے سمٹ آئی ہے تمہاری حکومت بھی کوئی حکومت ہے کہ جب تک پولیس ڈنڈا نہ چلائے ایک آدمی بھی تمہارے استقبال کو نہیں آتا۔"

● علامہ تفتازانی کے متعلق اپنے گورنر کی شکایت سن کر امیر تیمور نے قاصد سے کہا :

"میں اس شخص کا کیا بگاڑ سکتا ہوں جس کا قلم ہر شہر کو میری تلوار سے پہلے فتح کر چکا ہے"

● امام ابو حنیفہؒ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ کیچڑ میں اٹھا چلا جا رہا ہے فرمایا سنبھل کر چلو! کہنے لگا :

"اے امام میں پھسلا تو تنہا گروں گا، آپ پھسلے تو ایک دنیا پھسل جائیگی احتیاط آپ کو کرنی چاہیے نہ کہ مجھے۔"

● یزید بن عبدالملک نے عمر بن ہبیرہ کو خراسان کا گورنر مقرر کیا — اس نے ایک دن حسن بصریؒ کو دربار میں بلوایا اور کہا مجھے کوئی نصیحت کریں فرمایا "یزید کے معاملہ میں خدا سے ڈر اور خدا کے معاملہ میں یزید سے قطعاً نہ ڈر۔"

● سفیان ثوری اور ہارون الرشید بچپن کے دوست تھے ہارون خلیفہ بنا تو سفیان نے رفتہ رفتہ دربار سے کنارہ کر لیا۔ ہارون نے خط لکھا کہ تشریف لائیے منتظر ہوں سفیانؒ نے جواب دیا :

"تم شاہانہ شوکت سے رہتے اور بیت المال میں خیانت کرتے ہو— تمہارے عمال کی اکثریت شرابی ہے وہ خود چوری کرتے ہیں اور دوسروں کے ہاتھ کاٹتے ہیں تم چاہتے ہو کہ تمہارے ہاں آ کر یہ سب کچھ دیکھوں اور تمہارے خلاف قیامت کو شہادت دوں' یاد رکھ اس روز تیری مشکیں بندھی ہوں گی تو آگے آگے اور تیرے عمال تیرے پیچھے پیچھے ہوں گے آئندہ مجھے خط نہ لکھنا"

● منصور عباسی نے امام جعفر صادقؓ کو دربار میں طلب کیا نہایت احترام سے اپنے مسندِ شاہی پر بٹھایا اور کہا "کوئی ضرورت ہو تو مجھے عزت بخشیں" فرمایا : "میری ایک خواہش ہے کہ مجھے دوبارہ یاد نہ کیا جائے" یہ کہا اٹھے اور چلے گئے"

(آئین - لاہور)

ہماری نظر میں

دینی دعوت کے قرآنی اصول

از :- مولانا قاری محمد طیب ضخامت ۲۴۳ صفحات ، مجلد، رنگین ، گرد پوش قیمت دو روپے ۲۵ پیسے ۔
ملنے کا پتہ :- مجلس معارف القرآن ، دار العلوم دیوبند

اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ دینی دعوت کے قرآنی اصول کیا ہیں ! اس کو کس حکمت عملی کے ساتھ لوگوں تک پہونچانا چاہیے داعی میں کون سے اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے ؟ سامع دعوت کے کیا آداب ہیں ! پوری کتاب اپنے موضوع پر صحیفۂ اخلاق و ادب ! انداز بیان دل نشین اور زبان سلیس و سادہ ہے حضرت قاری محمد طیب صاحب کا طرز استدلال علمی اور فلسفیانہ ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہوتا ہے ! واعظین اور مقررین کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے ۔

عزیز بھٹی شہید رح

از :- اصغر علی گھرال ، ضخامت ۷۵ صفحات ، کتاب کاگیٹ اپ دیدہ زیب (بھٹا بدار متعدد تصاویر کے ساتھ) ملنے کا پتہ :- مکتبہ الوکیل گجرات (قیمت پندرہ روپے)

عزیز بھٹی شہید کا نام سنتے ہی ، جرأت و سرفروشی اور جہاد و شہادت کا تصور مجسم ہو جاتا ہے ، پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی ، اُس میں پاکستان کے مجاہدین نے جس شجاعت و پامردی کا مظاہرہ کیا ، اُس نے اسلام کی گزشتہ تاریخ کی تصدیق کر دی ! بھارت کے مقابلہ میں پاکستان فوج تعداد میں بہت کم تھی اور جنگی سامان کا بھی یہی تناسب تھا ، لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت کے بھروسہ پر مجاہدین نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیے اور اپنی شجاعت کی دھاک بٹھا دی ۔

میجر عزیز بھٹی شہید بھی اسی جہاد کے ایک عظیم ہیرو ہیں ! جناب اصغر علی گھرال نے عزیز بھٹی شہید کی سیرت مرتب کر کے حقیقت میں بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے ! فاضل مصنف نے بڑی محنت اور کاوش سے اس کتاب کو مرتب فرمایا ہے ، انداز بیان بھی خوب ہے اور زبان بھی رواں اور شستہ ہے ۔

اس کتاب کے پڑھنے سے اس جنگ کا یہ پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غیبی امداد عساکر پاکستان کے جلو میں تھی ہمارے فوجیوں کے دلوں سے موت کا ڈر نکل گیا تھا ۔

سلہ "..... کوئی بندھا جڑا تحریکی قسم کا مقصد نہ ہو" (ص ۹) روزمرہ "لگا بندھا" ہے ! یہاں اس روزمرہ کا صرف صحیح نہیں ہوا ــــ غالباً وہ "پیشہ ور مقصد" کہنا چاہتے ہیں یا "بدنی سزا بھی دیتے تھے" (ص ۲۹) "جسمانی سزا" لکھنا چاہیے تھا ، "حسب معمول ساتھیوں کو باری باری الوم کرانا تھے" (ص ، ۴۳) اسی قسم کی خامیاں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں (م ۔ ق)

عزیز بھٹی شہید نے اپنے آرام کو تج کر اور اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر کسی وقفہ کے بغیر مسلسل سات دن تک جس انداز میں فوج کی کمان کی ہے وہ حرب و ضرب کا ایک مثالی کردار ہے :

عزیز بھٹی شہید ایک دیندار فوجی افسر تھے، نماز روزے کے پابند، اور دین کے معاملہ میں باحمیت اور غیرت مند مسلمان! یہ یقین و ایمان کی قوت تھی! جس کی بدولت انہوں نے اتنا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ ضرورت ہے کہ پاکستانی افواج میں نوزائیدہ کی پریڈ کی طرح لازمی قرار دیا جائے۔

یہ کتاب فنِ سیرت نگاری کا قابلِ قدر نمونہ ہے، فاضل سیرت نگار نے صاحبِ سیرت اور اپنے ممدوح کی زندگی کے تمام گوشوں کو اجاگر کر دیا ہے، عزیز بھٹی شہید کے بچپن اور جوانی کے واقعات اس کی پیش گوئی کر رہے تھے، کہ اس شخص سے قدرت آگے چل کر کوئی بڑا کام لینے والی ہے، عزیز بھٹی شہید خاصے اچھے انشاء پرداز بھی تھے، ان کے خطوط اور تحریروں کے اقتباسات اور عکس اس کتاب میں ملتے ہیں، کاش یہ تحریریں انگریزی کی بجائے پاکستان کی قومی زبان (اردو) میں ہوتیں۔

اس کتاب میں جنگ کے واقعات کی تفصیل پڑھتے ہوئے قاری ایسا محسوس کرتا ہے، جیسے وہ خود محاذِ جنگ پر موجود ہے! پاکستانی فوج کے افسروں نے جنگی تدبیروں میں کس ذہانت، مہارت اور سرفروشی کا ثبوت دیا، یہ کتاب اس کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ولولۂ جہاد بیدار ہوتا ہے اور شہیدوں کے لئے بیساختہ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

جناب اصغر علی گھرال نے بڑے اخلاص و عقیدت اور محنت و کاوش کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے جس کے لئے وہ تبریک و تحسین کے مستحق ہیں!

نقشِ قدم

مرتبہ :- حمیدہ خاتون، ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد، دیدہ زیب سرورق) قیمت آٹھ روپے۔
ملنے کا پتہ :- مکتبہ دانش افروز ۵ ایم - ارجن روڈ، کرشن نگر لاہور۔

جناب ڈاکٹر صفدر حسین شاعر بھی ہیں اور ادیب و نقاد بھی ہیں، صاحب موصوف کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جن کو اربابِ نقد و نظر اور اہلِ علم و ادب نے سراہا ہے، اس کتاب میں ایک ایک حرف جو ڈاکٹر صاحب کے بارے میں لکھا اور کہا گیا ہے جمع کر دیا گیا ہے!۔ ترتیب کے عنوانات یا ابواب :-

نقش و شخص ـــ شخص و عکس ـــ عکس و وصف ـــ وصف و نقص ـــ نقص و ذم ـــ حرفِ باقی!

ان ابواب و مضامین میں ڈاکٹر صفدر حسین کی شخصیت "ایک خوش باش انسان، مخلص دوست، شفیق استاد، صاحب دل شاعر، نکتہ رس محقق اور دیدہ ور نقاد کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتی ہے"! (سرورق کی عبارت)

عام طور پر پیش لفظوں، دیباچوں اور اس قسم کی کتابوں میں مدح و منقبت ہی کو جگہ دی جاتی ہے، مگر یہ پہلی کتاب ہے جس میں تصویر کا دوسرا رُخ یعنی ایسی تنقید کو بھی شامل کیا گیا ہے، جس میں شاعر کے کلام کی کمزوریاں بھی دکھائی گئی ہیں! "فاران" میں ڈاکٹر صفدر حسین کی کتابوں پر جو تنقید کی گئی ہے، اُسے حرف بہ حرف اس کتاب میں نقل کیا گیا ہے ـــ یہ بڑے ظرف اور خود اعتمادی کی بات ہے۔

"تازگی دیکھ کے پھولوں کو پسینہ آ جائے
سرمگیں آنکھ کے افسوں سے بہک جائیں غزال"

فاران :- کس کی تازگی دیکھ کر؟ چہرے کی، رخساروں کی ـــ اس کا شعر میں ضرور ذکر آنا چاہئے تھا۔ راقم الحروف کا اب سے تیس سال پہلے کا ہوا شعر یہ ہے ؎

یہ کس نے نقاب رُخ الٹ دی
کلیوں کو بھی آ گیا پسینہ

نقشِ قدم :— راقم الحروف جھک مارتا ہے ! بہت پیارا شعر ہے۔

صفدر صاحب کے اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں جو "سرمگیں آنکھوں کے افسوں" کو دیکھ کر غزالوں کے بہک جانے کا ذکر ہے وہ بھی
ران کو خاصہ کھٹکتا ہے۔ اس طرح کون بولتا ہے کہ فلاں شخص کی سرمگیں آنکھوں کے افسوں یعنی جادو کو دیکھ کر کوئی بہک گیا، اس میں
سوں" بے محل اور حشو و زائد ہے! راقم الحروف نے اعتراض کیا تھا کہ "افسوں" کی جگہ "مستی" کا محل تھا، اس پر "نقشِ قدم" کی مرتبہ نے یہ
راض جڑ دیا :

"کس قدر مہمل تجویز ہے" (صفحہ ۴۱۸)

ل ایک مسلسل غزل کا مطلع ہے —

وہ بدمست آنکھیں، وہ کافر ادائیں   غضب کے ہرن چوکڑی بھول جائیں

سم الحروف کے اس مصرعہ میں —

یہ کس نے نقاب رخ الٹ دی

"تنافر" بتایا گیا ہے! جگر مرادآبادی کا ایک شعر ہے :—

وہ مست نظریں جب اٹھ گئی ہیں   ٹکرا گئے ہیں ساغر سے ساغر

ے نقاب" کی صوتی کیفیت وہ نہیں ہے جو "سے ساغر" میں پائی جاتی ہے! (غالباً) امیر مینائی کا شعر ہے —

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

جو جگر" —— یہ ہے تنافر کی صحیح مثال !

".. ذرا سے سکوت کے بعد یک لخت یں اٹھا کر، آنکھیں ملا کر، وہ نکتہ برملا کہہ دیتے" اُن کا لہجہ براہِ راست تھا" ——
ذہن میں آمادگی اور کشادگی کے بغیر علم و ادب کا مطالعہ یک طرفہ لغت یا بے سود ہو جاتا ہے" —— "یہ آج کل کی غنائی دُھن کا شعر ہے"
سکی نغمہ طرازی کی دُھن صفدر صاحب کے فکری پس منظر کا اگر رنگ غالب ہے ......"

"فاران" میں ان اقتباسات کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، "نقشِ قدم" میں ہماری اس تنقید پر یہ نوٹ دیا گیا ہے —

".. بالکل صاف اور معنی خیز فقرات ہیں، جن کے اسلوب میں انگریزی زبان اور مغربی علوم کا اثر موجود ہے
مولانا چونکہ مغربی علوم سے نابلد ہیں اور انگریزی زبان و ادب کے اسلوب کو قبول کرنے کے لئے اُن کے ذہن
میں وسعت و کشادگی نہیں ہے، اس لئے وہ ان فقرات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے" (صفحہ ۴۲۲)

انگریزی زبان و ادب کے جدید اسلوب میں اگر اسی قسم کی ژولیدگی اور ابہام پایا جاتا ہے تو اس ابہام کو گوارا اور انگیز کرنے کے لئے بیشک
ہمارے ذہن میں نہ وسعت ہے اور نہ کشادگی !

"کلاسکی نغمہ طرازی کی دُھن" —— کیا ہوتی ہے! لہجہ کی یہ تقسیم —— لہجہ براہِ راست اور لہجہ بالواسطہ —— عجیب تقسیم ہے!
گریزی ادب کا مطالعہ اگر اسی قسم کا تعقیدی ذہن پیدا کرتا ہے تو ہم اس ذہن کی تحسین نہیں کر سکتے! اور اس قسم کے مطالعہ کی محرومی کا ہمیں
و بار افسوس نہیں ہے۔

اس شعر ——

ہیبت تیغ سے گونگی ہوئی حاکم کی زباں گرچہ سر دفتر اشرار مدینہ مروان (ص ۱۴۴)

پر "فاران" میں تنقید کی گئی تھی کہ مصرعہ ثانی میں الفاظ محذوف کردیے گئے ہیں، جو شاعر کی ناپختہ کاری کی دلیل ہے — اس کتاب پر ہماری تنقید پر صحیح گرفت کی گئی ہے کہ پورے بند کے ساتھ ملاکر پڑھنے سے اس مصرعہ میں حذفِ الفاظ کی کمزوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جملہ اطفال شہنشاہ مدینہ نے پیا پی چکے اصغرِ ناداں تو سکینہ نے پیا

فاران :— "جملہ اطفال" تیجہ سا لگتا ہے "اصغرِ ناداں" کہنے کا کیا محل تھا، "اصغرِ کمسن" موزوں لفظ تھا۔

نقشِ قدم :— شعر فہمی عالم بالا معلوم شد — (مرتبہ)

بچوں کے لئے ناداں ایسے موقعہ پر لانا زیادہ موزوں ہے جہاں اُن کی ضد وغیرہ کا ذکر ہو، اس شعر میں "ناداں" کی جگہ "کمسن" ہی موزوں لفظ ہے۔

جذبہ بندۂ مولود تیٔ مولا ہو قبول اپنے اس صفدر ناچیز کا سجدہ ہو قبول

فاران "جذبہ کی جگہ "ہدیہ" لانا تھا۔

نقشِ قدم :— افسوس ہے کہ مولانا کو لفظ ہدیہ کا صحیح تلفظ بھی معلوم نہیں، اس تلفظ کے ساتھ وہ جذبہ کی جگہ نہیں کرسکتا! کوئی شک نہیں عربی میں "ہدیہ" بروزن عطیہ ہی صحیح ہے (بفتح اول وکسر دال وتشدید یٰ) مگر فارسی اور اُردو والے اس لفظ کو بروزن "بندہ" بولتے، لکھتے اور اشعار میں لاتے ہیں، امیر مینائی کا مصرعہ ہے —

ہزار شکر کہ ہدیہ مرا پسند ہوا

"نقشِ قدم" کی مرتبہ — جمیلہ خاتون — ڈاکٹر صفدر حسین کی کوئی تربیت یافتہ خاتون معلوم ہوتی ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر موصوف کے عین ذوق وطبیعت اور خواہش کے مطابق اس کتاب کو مرتب کیا ہے، اگر ڈاکٹر صاحب خود اپنی شخصیت کو اس طرح نمایاں فرماتے، تو ان کا یہی انداز ہوتا —

"نقشِ قدم" کے مضامین پڑھنے کے قابل ہیں، ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے بھی کتاب دیدہ زیب ہے اور بڑے سلیقے سے مرتب کی گئی ہے۔

اُردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات

از :— میجر آفتاب حسن ،
ضخامت ۴۸ صفحات (خوش نما ٹائپ) قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
ملنے کا پتہ :— شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ۔ کراچی یونیورسٹی، کراچی

ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی صاحب صدر جوہری توانائی کمیشن نے اپنے خطبہ صدارت میں "اُردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات" کے بارے میں ایسی باتیں کہہ دی تھیں جن سے اُردو کی جامعیت، وسعت اور ہمہ گیری پر حرف آتا تھا، جو لوگ بیس سال کا زمانہ پاکستان کے دورِ آزادی میں گزار کے بعد بھی، ذہنی اور فکری طور پر انگریز کی غلامی سے آزاد نہیں ہوئے انہوں نے ڈاکٹر عثمانی کے اس خطبہ کو خوب اُچھالا۔

جناب میجر آفتاب حسن کی یہ کتاب ڈاکٹر عثمانی کے اس خطبے کا بھرپور جواب ہے، صاحب موصوف نے جذبات سے ہٹ کر خالص علمی اور مدلل انداز میں اُردو زبان کی جامعیت کو ثابت کیا ہے اور ثابت کر دکھایا ہے کہ اردو زبان ہر فن اور علم کی ترجمانی کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے جناب آفتاب حسن نے جس دقتِ نظر کے ساتھ ڈاکٹر عثمانی کے خیالات کا جائزہ لیا ہے اور پھر ان کی کمزوری اور سطحیت دکھائی ہے، انہی کا حصہ ہے! دلائل کس قدر مطمئن کرنے والے ہیں اور اندازِ بیان کس درجہ شگفتہ ہے۔

لے صفحہ اور ٹائپ کی غلطی کے سبب "لاشعائیں" چھپ گیا، شعاع کی جمع "شعائیں" ہے۔ جمع میں "ع" حذف نہیں ہوسکتا۔

جناب آفتاب حسن کی یہ کتاب زبان و ادب میں اُن کی بصیرت اور غیر معمولی واقفیت کی دلیل ہے! ڈاکٹر عثمانی نہ جانے کس جھونک [میں] کیا کیا کہہ گئے، آفتاب حسن صاحب نے اُن کی تقریر کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ ان دلیلوں میں کوئی وزن نہیں۔ اُردو خوش قسمت ہے کہ اس [کی حف]اظت اور ترقی و بقا کے لئے آفتاب حسن جیسے مجاہد موجود ہیں۔

اجنتا

جگن ناتھ آزاد، ضخامت ۳۰ صفحات (دیدہ زیب سرورق) قیمت ۷۵ پیسے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔

اجنتا پر سکندر علی وجد کی نظم خاصی شہرت رکھتی ہے، شہزادی دریشہوار نے اجنتا کے مناظر دیکھ کر انہیں "نیم ربانی آثار" کہا تھا [جن]اب جگن ناتھ آزاد نے بھی اس موضوع پر بڑے معرکہ کی نظم کہی ہے، چند منتخب اشعار:-

یہ بتا آنے سے پہلے عالم اسرار میں　　　تو دلِ کہسار میں تھا یا دلِ فن کار میں

ہم میں تارے آسمانِ ہند کے ٹوٹے ہوئے　　　ہم خزانے ہیں عظمِ ایام کے لوٹے ہوئے

وہ زمیں کانپی فلک کا نپا نجر گرنے لگے　　　گلشنِ تہذیب کے شاخ و ثمر گرنے لگے

تیشۂ بت ساز ہے یا موقلم نقاش کا　　　پتھروں کو زندگی سے آشنا کرتا ہوا

میں اب اس وقت کہاں ہوں مجھے معلوم نہیں　　　میں ہوں ساکن کہ رواں ہوں مجھے معلوم نہیں

وقت کے دوش پہ خوشبو کی ہوں اک موجِ لطیف　　　یا کوئی سنگِ گراں ہوں مجھے معلوم نہیں

دوسرا رُخ:-

آج کس عالم حیرت نے مجھے گھیر لیا　　　ہوں حقیقت کہ گماں ہوں مجھے معلوم نہیں　(ص ۲۶)

[مص]رعۂ ثانی میں "ہوں" کی تکرار بھلی نہیں لگتی۔

کاروانِ وقت کا جو چلتا ہے　　　عرش و کرسی کا دل دہلتا ہے　(ص ۲۷)

[عر]ش و کرسی کا دل آخر وقت کے کارواں کو رواں دواں دیکھ کر کیوں دہلتا ہے؟ شعر میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا!

ذہن انساں کا آفتاب عظیم　　　جس سے ہے آدمی عقیل و فہیم

[آف]تاب عظیم" کی ترکیب مانوس ترکیب نہیں ہے۔

زندگی اس سے روشنی لے کر　　　بہ تسلسل رہے گی گرم سفر

کاش مصرعۂ ثانی یوں ہوتا۔

ہاں بہ تسلسل رہے گی گرم سفر

اشارات

از:- ن، بخاری، ضخامت ۱۹۲ صفحات، قیمت چار روپے ۵۰ پیسے (مجلد رنگین سرورق)

ملنے کا پتہ:- پاک یونین اسٹوڈ پبلشرز میرپور خاص

اس کتاب میں جناب ن، بخاری کے سات ادبی و تنقیدی مضامین یکجا کئے گئے ہیں، ان مضامین کے لکھنے کی غرض و غایت مضمون نگار [نے پ]یش لفظ میں بیان کی ہے۔

"اگر میرے ان افکار نے طلبہ و طالبات کی تعلیمی مشکلات کو حل کیا اور استفادے کا موجب ہوئے اور وہ علم برائے علم کے نظریے کے حامل ہوگئے، تو میں خوش ہوں گا، کہ میری یہ محنت و کاوش رائیگاں نہیں گئی۔"

کوئی شک نہیں ان مضامین کے مطالعہ سے طلبا کی نہ صرف نصابی مشکلات حل ہو سکتی ہیں بلکہ ان میں تنقیدی شعور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے سلجھے ہوئے انداز میں اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے، یہ کتاب درس و نصاب میں مدد دینے کے علاوہ ارباب ذوق کے مطالعہ کے قابل ہے۔

کوکبم را در عدم اوج بتوی بودہ است   شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن   (ص ۴۴)

غالب کے اس شعر کو سہو کتابت نے مجروح کر دیا، اصل شعر یوں ہے:

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است   شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

"مثبتی افادیت یہ کہ یادگار غالب میں وہ تمام خوبیاں شامل ہیں جن سے اردو ادب اور ادیبوں نے فیض پایا ہے" (ص ۴۶) افادیت کی یہ تقسیم کہ وہ مثبت بھی ہوتی ہے اور منفی بھی غور طلب ہے ــــ صفحہ ۴۶ پر کسی دوسرے اہل قلم کی عبارت جس میں ڈاکٹر شوکت اور جعفر علی خاں اثر کا ذکر ہے، مولانا شبلی نعمانی کے نام سے منسوب ہو گئی ہے، یہ کتابت کی غلطی ہے ــــ "اور نہ ہی وہ آزاد کے طرز پر چلے" (صفحہ ۱۳) افسوس ہے کہ "نہ ہی" کا رواج عام ہو چلا ہے، اور اس بے ذوقی کا اہل قلم کو احساس تک نہیں ہوتا۔

اس کتاب پر جناب سید یوسف بخاری نے پیش لفظ لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"ان مضامین میں بعض ایسے تاریک گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو اب تک لکھنے والوں کی نظر سے اوجھل ہے یا کسی وجہ سے چھوٹ گئے تھے۔

میں مصنف کو ان جاندار مضامین پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

جریدہ

مرتب وستا آغا حسن، ضخامت ۹۰ صفحات (بڑا سائز، خوشنما ٹائپ، سرورق دیدہ زیب) قیمت پانچ روپے
ملنے کا پتہ:۔ شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی، کراچی

کراچی یونیورسٹی کا شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ اردو زبان و ادب کی گرانقدر ٹھوس خدمت خاموشی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ بلند پایہ مجلہ "جریدہ" کا چھٹا شمارہ ہمارے سامنے ہے جس کے مطالعہ سے سچ مچ آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا "سائنس اور کی ورسی کتابیں" فنی مضمون ہے مگر بصیرت افروز مضمون ہے جس کے مطالعہ سے اردو زبان کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں! فاضل مضمون نگار نے کتنی سچی بات کہی ہے:۔

"الحمد للہ کہ اردو کے لئے یہ چیز نہ پہلے باعث فکر تھی نہ اب ہے، یہ ایک منجھی ہوئی نعمہ زبان ہے اور گہرے اور پیچیدہ خیالات کے اظہار کی صلاحیت تامہ رکھتی ہے . . . "

اس اظہار حقیقت اور اعتراف صداقت کے بعد انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ انگریزی اور لاطینی اصطلاحات کے اردو ترجمہ کے بارے میں کیسی کیسی غلط فہمیوں کا شکار ہیں! انگریز کے دور غلامی کی مرعوبیت اگر ستد راہ نہ ہو تو ہر فن کی ترجمانی میں اردو مفید اور کارآمد ثابت ہوگی جناب آغا حسن نے اپنے اس عالمانہ مقالہ میں مثالیں دے کر، نقشے اور جدولیں بنا کر ثابت کیا ہے، کہ آلات سائنس کے ناموں، سائنس کا اور ریاضی واقلیدس کی شکلوں اور سمتوں (زاویوں) کو اردو میں تر کا اسانی اور حسن و خوبی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے، اور اردو دان کے اظہار

اور ترجمانی کی پوری صلاحیت رکھتی ہے ۔

انگریزی زبان کو باقی رکھنے اور اُردو کو مجروح کرنے کی کیا تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں، اس کی تفصیل فاضل مضمون نگار کی زبانی سنئے

"اصطلاحات کے بعد جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ انگریزی ہندسے ہیں، بعض اُردو درسی کتابوں میں اُن کی وہ بھرمار ہے کہ خدا کی پناہ! ایک وقت تھا کہ ان ہندسوں کی زیارت اس وقت ہوتی تھی، جب طالبعلم انگریزی شروع کرتا تھا، انگریزی حروف تہجی کے ساتھ اس کو انگریزی ہندسے بھی سکھائے جاتے تھے، لیکن اب یہ حال ہے کہ ان ہندسوں کو اُردو زبان پر اس طرح مسلط کیا جا رہا ہے کہ درسی کتابوں میں ڈھونڈے سے بھی ۱، ۲، ۳، ہم نظر نہیں آتے"

اور

"یہ ایک بالکل بے معنی اور بے مقصد عمل ہے اور اس کا سوائے اس کے کوئی فائدہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رومن اور لاطینی حروف کو ہم پر مسلط کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی تو اب کوشش یہ ہے کہ کم سے کم انگریزی ہندسوں ہی کو اُردو زبان میں داخل کر دیا جائے"

"جدیدہ" میں مختلف علوم وفنون کی مغربی اصطلاحات کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے شعبہ تالیف وتصنیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی کا یہ عظیم الشان کارنامہ قابل تبریک اور مستحق تحسین ہے۔

بعض اصطلاحات :-

خاص عدالت جو شراب فروشی [illegible] کا لائسنس دیتی ہے! (صفحہ ۳۷)

اس کا ترجمہ مختصر لفظوں میں یوں ہو سکتا ہے ۔۔ "عدالت مجاز لائسنس شراب فروشی"

جستی افراطِ زر (صفحہ ۴۲) ۔۔ INFLATION GALLOPING

"جست" ایک دھات کا بھی نام ہے، اس التباس سے بچنے کے لئے "تیز رو افراطِ زر" شاید زیادہ موزوں ترجمہ ہوگا ۔۔ ترجمہ میں جہاں لفظی ترجمہ سے حسن پیدا نہ ہو، وہاں مفہوم کی ترجمانی ہونی چاہئے ۔

ناظرِ مملکت، ناظرِ ریاست (صفحہ ۵۵) STATE BUFFER

اس کا ترجمہ تو پہلے سے موجود ہے "حاجز مملکت"! "Buffer" کا ترجمہ "ناظر" زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔

صفحہ ۳۰ پر [illegible] کا ترجمہ "روا" کیا گیا ہے تو [illegible] کا ترجمہ "روا النفس" کی بجائے "گوارا النفس" موزوں تر ہوگا ۔

شاخ عمل مقامی (صفحہ ۸۵) ۔۔ مختلط رجعت (صفحہ ۸۷) منحنا جانا (صفحہ ۸۷) اس قسم کی ترکیبیں محتاج نظر ثانی ہیں غور وفکر کے بعد زیادہ اچھی اصطلاحیں وضع کی جا سکتی ہیں شعبہ تالیف وتصنیف کی اصطلاحیں بہرحال حرفِ آخر نہیں ہیں ۔

"جدیدہ" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے جناب آفتاب حسن کا نام اُردو کے محسنوں کی فہرست میں آنا چاہیئے اللہ تعالیٰ اُن کے کام میں برکت عطا فرمائے ۔ (م ۔ آ ۔ ن ۔ م)

"المنبر" کا عرب اسرائیل جنگ نمبر مدیر مسئول :- مولانا عبدالرحیم اشرف، ضخامت ۹۴ صفحات (بڑا سائز، سرورق رنگین) قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ :- ہفت روزہ "المنبر" ۳۴۹ جناح کالونی لائل پور

ہفت روزہ "المنبر" کا "عرب اسرائیل جنگ نمبر" بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے، اس کے مضامین خاصے معلومات آفریں ہیں، ان میں تنوع بھی پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی جوش و ولولہ اور دردمندی بھی! اس کے مضمون نگاروں میں بعض مشاہیر علماء اور اہل قلم کے بھی نام نظر آتے ہیں۔ مولانا عبدالرحیم اشرف کا اداریہ دلی اخلاص اور سوز و درد سے لبریز ہے، یقین ہے کہ المنبر کا یہ شمارہ خاص قبول عام حاصل کرے گا! موضوع پر یہ بلند پایہ دینی، علمی، اور تاریخی پیشکش ہے۔

ACM
آدم جی کاٹن ملز لانڈھی۔ کراچی

CENTRAL
NEW DELHI

ماہنامہ فاران کراچی

دسمبر ۱۹۶۷ء

جلد:- ۱۹
شمارہ:- ۹

ایڈیٹر:- ماہر القادری

ترتیب

چندہ سالانہ:- ۷ روپے | پبلشر:- ماہر القادری | قیمت فی پرچہ:- ۶۲ پیسے

مقامِ اشاعت:- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام [illegible] احمد صدیقی۔ پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اول

یہ اب سے تقریباً ۳۵ سال پہلے کی بات ہے، جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی حیدرآباد دکن میں مقیم تھے اور ماہنامہ "ترجمان القرآن" دارت میں شائع ہوتا تھا، مولانا موصوف نہ تو کسی سیاسی یا مذہبی تنظیم سے اُس وقت وابستہ تھے، اور نہ عام اجتماعات اور پبلک جلسوں میں تقریر رتے تھے، ہاں! اُن کا قلم دعوتِ دین کے لیئے وقف تھا۔ اور اُن کے دینی افکار نے علمی حلقوں میں حرکت پیدا کردی تھی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ رجمان القرآن "ایک تحریک بن گیا، علامہ اقبال جو خود اپنی جگہ مستقل دبستانِ فکر تھے۔ مولانا مودودی کے اسلوبِ نگارش اور طرزِ فکر سے متاثر علامہ مرحوم ہی کے ایما سے بلکہ اُن کی دعوت پہ مولانا مودودی حیدرآباد دکن کی اقامت و سکونت کو خیرباد کہ کر پنجاب چلے آئے۔

مولانا مودودی کی معرکہ آرا کتاب "الجہاد فی الاسلام" منظرِ عام پہ آکر علمی و دینی حلقوں میں مقبول ہو چکی تھی، اب تک بعض اچھے درجے کے مسلمان لم کا انداز اس مسئلہ میں "معذرت آمیز" تھا، مولانا مودودی نے جرأت کے ساتھ" جہاد کی ضرورت، اہمیت بلکہ افادیت کو ثابت کیا۔ موصوف ب کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا بھی ارباب فکر اور اہلِ علم نے خاصہ اثر قبول کیا، اور اصحاب علم و دانش محسوس کرنے لگے کہ اس شخص مرِ خامہ سے امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے دینی افکار کی صدائے بازگشت آرہی ہے اور یہ تو وہ آواز ہے جس کے سننے کے لئے مدت سے ج عصر بے چین و منتظر ہے، یہی جذب و کشش، تاثر اور دینی تڑپ ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کی تشکیل کا سبب بن گئی:

جماعتِ اسلامی کے وجود میں آنے سے قبل مولانا مودودی کی تحریروں کو دیوبند، ندوہ اور بعض دوسرے علمی و دینی اداروں کے علماء اور بار سراہتے تھے، اور اس کا اعتراف تو سب کے نزدیک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا تھا کہ مودودی صاحب کی تحریریں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام سے روشناس کرنے میں موثر ترین پارٹ انجام دے رہی ہیں، مگر پھر اس مدح و ستائش میں طنز کا رنگ پیدا ہو گیا، مولانا مودودی پہ یہ تہمت جوڑی گئی وہ اپنے "مجدد" ہونے کا اعلان کرنے والے ہیں، حالانکہ مولانا موصوف کسی روحانی منصب کا دعویٰ کیئے بغیر دین کی مدافعت و تبلیغ کا بدستور کام کیئے رہے ہیں! دوسرا الزام جماعتِ اسلامی پہ یہ لگایا گیا کہ یہ خوارج کی جماعت ہے، یہ الزام بھی بے بنیاد ثابت ہوا، جماعتِ اسلامی کے عقائد و ہزاروں صفحات پہ پھیلے ہوئے ہیں اُن کے بارے میں کوئی ناقد متعین طور پر اس کی نشان دہی نہیں کرسکا کہ جماعت کا فلاں عقیدہ اور عمل خارجی عقیدہ و مسلک سے مماثلت رکھتا ہے! تہمت و الزام کے یہ دونوں حربے بیکار ثابت ہوئے، تو پھر یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ جماعت اسلامی مسلمانوں کا ایک نیا فرقہ بنتا جارہا ہے ــــــ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ اس تہمت کے غبارے سے بھی بہت جلد ہوا نکل گئی۔ جماعت اسلامی فقہ اور کلام میں کوئی خاص مسلک نہیں رکھتی، نہ جماعت والوں کی مسجدیں عام مسلمانوں سے الگ ہیں، وہ تمام مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں اور فقہ کا اختلافی

مسائل میں شدت نہیں برتتے۔ جماعت اسلامی میں شوافع حنفی اور اہل حدیث بھی شامل ہیں اور جو شیعہ صاحبان جماعت اسلامی میں آئے ہیں، انہیں اپنے سابقہ عقائد بدلنے پڑے۔ جماعتِ اسلامی میں رہ کر، کوئی شخص صحابہ کرام سے بغض و عداوت کس طرح رکھ سکتا ہے (معاذاللہ)

تقسیم ہند سے قبل جماعتِ اسلامی نے نہ تو ملک کے سیاسی انتخابات میں حصہ لیا تھا اور نہ اس سے متعلق مسائل کو اپنی جدوجہد اور توجہ کا موضوع بنایا تھا۔ اس کے باوجود بعض ارکان نے جماعت سے علیحدگی اختیار فرمائی مگران حضرات نے اپنی علیحدگی کے وجوہ واسباب کا اخباروں یا پبلک کانفرنس میں اعلان نہیں کیا، یہ حضرات غالباً ذکر وشغل کے حلقوں اور توجہ باطنی کے آثار ومظاہر کے تصورات لے کر جماعت میں شامل ہوئے تھے! جہاں تک اخلاقی زندگی کا تعلق ہے اس کے حسن وکمال کی کوئی حد ونہایت نہیں، زیادہ سے زیادہ اخلاص وخوبی کے باوجود، مطلوبہ معیار تک پہونچنے کے لیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی مزید ترقی کی ضرورت ہے! جماعتِ اسلامی کے ارکان اور خود مولانا مودودی نہ تو اب سے پچیس سال قبل منکرات و معاصی میں مبتلا تھے اور نہ اس وقت سے اب تک اُن پر کوئی ایسا دور گذرا ہے، جب وہ مکروہات میں مبتلا ہو گئے ہوں، عقیدہ و عمل کے ضعف کے لحاظ میں جماعتِ اسلامی کے ارکان جن میں مودودی صاحب بھی شامل ہیں، اُن کی زندگیاں ایسی رہی ہیں، جو اخلاقی قدروں کو توڑتی نہیں بلکہ اُن کی حفاظت ہی کرتی ہیں! یہ زندگیاں ایسی ہیں کہ اس دور میں اُن پر "مومن" کا اطلاق ہوتا ہے، فسق ونفاق کی کوئی علامت اُن میں نہیں پائی جاتی، جماعت اسلامی فرشتوں کی نہیں انسانوں کی جماعت ہے، اُس کے ارکان بھی کوتاہی اور لغزش وخطا سے محفوظ نہیں مگر آخرت کی بازپُرس کے پورے احساس ویقین کے ساتھ راقم الحروف یہ بات کہہ رہا ہے کہ مجموعی طور پر جماعت اسلامی کے وجود سے خیر ہی پھیل رہا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے لٹریچر نے لاکھوں نوجوانوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے، پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے شہروں اور قصبوں میں اس انقلاب کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد اس نوزائیدہ مملکت میں جماعتِ اسلامی کو آغاز ہی میں اس مسئلہ سے سابقہ پڑا کہ یہاں دستور کس نوعیت کا ہونا چاہئے؟ جماعتِ اسلامی اس نوبت پر کیا کرتی ——— یہ کہ جماعت کے ارکان کی تا وقتیکہ دینی اور اخلاقی تربیت مطلوبہ معیار تک نہ پہونچ جائے اور اُس کے ارکان جب تک اپنے متعلقین کو پوری طرح اسلامی قالب میں نہ ڈھال لیں، اُس وقت تک اُسے دستور وقانون جیسے مسائل سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھنا چاہئے ——— اگر جماعتِ اسلامی ایسا کرتی تو دینی اعتبار سے شدید مجرمانہ غفلت کی مرتکب ہوتی اور ذہنی افلاس اور فراست کا ثبوت دیتی، جماعتِ اسلامی نے حق کی سربلندی اور اللہ کے کلمہ کو غالب کرنے کے لئے اُس کے ارکان کے پلّے میں جتنی بھی اخلاقی قوت اور دینی حمیت تھی، اُس کے ساتھ دستور وقانون کی مہم کا آغاز کر دیا! یہ مہم پھر اسمبلیوں کے انتخابات تک پہونچ گئی! یہ بالکل نئی صورتِ حال تھی، جس سے جماعت اسلامی کو دوچار ہونا پڑا، تقسیم ہند سے قبل جماعتِ اسلامی کو اس قسم کے معرکہ سے کہاں سابقہ پڑا تھا، اس لئے نئے مسائل سے نمٹنے کے لئے پاکستان میں جماعت کو وہ طریق کار اختیار کرنا پڑا جسے تقسیم ہند سے قبل کی جماعت اسلامی کے طریقِ کار سے لازماً مختلف ہی ہونا چاہئے تھا، اب جلوس بھی تھے، پریس کانفرنسیں بھی تھیں۔ لاؤڈاسپیکر پر انتخابی جدوجہد کا اعلان بھی تھا! مگر اس ہنگامہ نے جماعتِ اسلامی کے ارکان اور متفقین و والبستگان کو دینی فرائض کی ادائیگی سے غافل نہیں رکھا، انہوں نے انتخابات کی شدید مصروفیت میں بھی باجماعت نمازیں پڑھی ہیں اور انتخابات جیتنے کے لئے کسی غیر اخلاقی ذریعہ کو اختیار نہیں کیا۔ اس طرح جماعتِ اسلامی نے اپنے عمل اور رویہ سے پاکستان میں سیاست کی تطہیر کا فرض انجام دیا اور عوام وخواص سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ دیندار لوگ تنظیم وتمدن اور سیاست وحکمرانیت کا کاروبار چلانے کا بھی کتنا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس معرکہ آرائی میں دین واخلاق کے تقاضوں سے غافل نہیں ہونے پاتے! مسلم لیگ کی تاریخ اور اُس کا ماضی ہمارے سامنے ہے کہ اس کے پاس "اسلام" کا نعرہ تو بیشک تھا مگر دین واخلاق کے فرائض کے اہتمام کا ورق سادہ تھا اس کے برخلاف تبلیغی جماعت دین واخلاق کی معلم ہے، لیکن حکومت وسیاست کے مسائل سے سروکار نہیں رکھتی! جماعتِ اسلامی کی سیاست نہ تو بے دین ہے اور نہ اُس کا دین بے سیاست ہے، اقامتِ دین کا فریضہ انجام دینے کے لئے دین کے ساتھ حکومت وسیاست کی بھی ضرورت پڑتی ہے! اقامتِ دین کی راہ میں مقصد بھی ہے، بعد ...

ی ہیں، صلح حدیبیہ بھی ہے اور فتح مکہ بھی ہے!

ایک وہ ملک جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہو، وہاں جمہوری طریق کار اور انتخابات کے ذریعہ ایسے افراد برسرِ حکومت آسکیں۔ جن کے
ہتوں اللہ کا دین نافذ اور غالب ہو سکے ——— تو اس مقصد کے لئے سیاسی جدوجہد بھی دین ہی کا کام ہے، البتہ دنیا داری اور ہوس
تدار کی کھیتی جو کوئی جیت کرتا ہے، وہ ان لوگوں کو غذا پہنچاتا ہے جو دین کو اپنے اقتدار کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل جماعت اسلامی کا جو نصب العین تھا ——— اقامت دین کا نصب العین ——— اس میں ذرہ برابر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی
ی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے جماعت مسلسل جدوجہد کر رہی ہے۔ ہاں! طریق کار بالکل پہلا جیسا نہیں رہا، اور نہ رہ سکتا تھا کہ صورتِ حال کی تبدیلی
ے ساتھ طریق کار بھی بدل جایا کرتا ہے۔ اس صورت میں مسائل کی تشریح میں بھی وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جسے بعض بالغ حضرات "تضاد" سمجھتے ہیں:
نگریز کے دور میں غیر منقسم ہندوستان کے علماء نے ترک موالات کا فتویٰ دیا اور انگریزی حکومت سے تعاون کو ناجائز ٹھیرایا۔ مگر اس کے تقریباً
پندرہ سال بعد ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ مسلمان کونسلوں اور اسمبلیوں میں جانے لگے اور بعض علماء نے مسلمان امیدواروں کی حمایت میں بیان دئے
اس پر کوئی صاحب عقل و ہوش یہ طنز نہیں کر سکتا کہ ہندوستانی علماء نے ناجائز شے کو جائز ٹھیرا کر، خوب و ناخوب کے معیار کو بدل دیا، اس طرح
نہوں نے شریعت کو ذلیل کیا اور وہ راہِ حق سے بے شک گمراہ ہو گئے ——— بس اسی ایک مثال پر جماعت اسلامی کے تقسیم ہند سے قبل اور تقسیم
کے بعد کے طریق کار اور اس کے بعض مضامین اور تنظیمی دفعات کا قیاس کیا جا سکتا ہے! سامنے کی بات ہے کہ عہد رسالت کے مکی دور اور مدنی دور
میں جہاں تک نفس دعوت اور نصب العین کا تعلق ہے ذرہ برابر کوئی فرق واقع نہیں ہوا مگر طریق کار بالکل ایک جیسا نہیں رہا!

حقائق

پاکستان میں جماعت اسلامی نے تبدیلیٔ حالات سے متاثر ہو کر کسی دینی قدر کو نہیں چھوڑا، دینی احکام بجا لانے میں وہ پہلے
ہی کی طرح سرگرم اور فعال ہے! اس کے ارکان اپنے امکان کی حد تک حلال ذرائع سے روزی حاصل کرنے کی کوشش کرتے
ہیں، جماعتِ اسلامی کا کوئی رکن کسی بنک میں ملازم نہیں ہے، بعض ارکان نے روزگار کے ایسے ذرائع و وسائل سے ترکِ تعلق کیا ہے، جن میں کسب
معاش خاصہ مشتبہ تھا اگرچہ ان وسائل سے بہت کچھ مالی منفعت حاصل ہو سکتی تھی، یہ دلیل ہے اس کی کہ ان کے اندر خشیت الٰہی پائی جاتی ہے اور
اور وہ محاسبۂ آخرت کی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہیں! کتنے ہی مقامات پر رقص و سرود کی تقریبات کو روکے جانے کے لئے جماعت اسلامی کے
ارکان نے شدید احتجاج کیا ہے اور ارباب حکومت کی دھمکیوں کی پروا نہیں کی! عائلی قوانین ہوں یا خاندانی منصوبہ بندی، جماعتِ اسلامی نے
ایسی باتوں سے صرف اظہار بیزاری ہی نہیں کیا بلکہ ان کی تردید میں بصیرت افروز کتابیں چھپوائی ہیں اور عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ صحیح
دینی نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے۔ منیر رپورٹ کے پوسٹ مارٹم کی جماعت اسلامی ہی کو توفیق نصیب ہوئی۔ پاکستان کے محترم صدر کی خود نوشتہ
سرگزشت پر مجلہ "ترجمان القرآن" میں جس فراست و بصیرت اور جرأت کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے وہ پڑھنے کی چیز ہے!
شفاخانوں کے ذریعہ برسوں سے جماعت خدمت خلق کا فرض بھی انجام دے رہی ہے اور یہ الفاظ متعدد محفلوں میں ان کانوں نے سنے ہیں
کہ پاکستان میں جماعتِ اسلامی ہی وہ تنہا جماعت ہے جو کسی قیمت پر بک نہیں سکتی۔ مخالفتوں کے طوفان اور معاندین کی ہر طرف سے یلغار کے باوجود
عوام جماعتِ اسلامی پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور انہیں اس کا اطمینان ہے کہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ جو وہ مالی تعاون کریں گے اس کا ایک ایک پیسہ صحیح
طور پر خرچ ہوگا۔

پاکستان کے ارباب اقتدار سے جماعتِ اسلامی بہت سے بنیادی مسائل میں شدید اختلافات رکھتی ہے مگر پاک و ہند کی جنگ میں اس نے
تمام اختلافات لپیٹ کر رکھ دئے اور حکومت کے جھنڈے کے نیچے اس جہاد میں جس شدتِ خلوص کے ساتھ حصہ لیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔
جماعتِ اسلامی کے ارکان نے عملاً عزیمت کا ثبوت دیا ہے، انہوں نے بارہا قید و بند کی مصیبتیں اٹھائی ہیں، مگر کوئی دھمکی، خوف اور مصیبت

ان کے کردار میں لچک پیدا نہیں کر سکی۔ جماعت کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی کو تو اللہ تعالیٰ نے پھانسی گھر سے لوٹایا ہے، موت کی سزا سن کر اُن کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی! کیسے کیسے خطرے، مصیبتیں، رکاوٹیں اور مشکلیں ہیں جن میں جماعت اسلامی اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب کرنے کے لئے جدوجہد کئے جا رہی ہے۔ اس کشمکش کا انجام کیا ہوگا، یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے مگر جماعت تو اپنا فرض ادا کر رہی ہے!

جماعت اسلامی کے ارکان اچھے مسلمان، اچھے شہری اور قابلِ اعتماد بھائی ہیں، جن لوگوں نے انہیں برتا ہے وہ ان کی بھلمنساہت اور خوش معاملگی کے معترف ہیں! روپیہ پیسہ کے معاملہ میں جماعت امانت و دیانت کے تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھتی ہے۔

جماعت کے عقائد و عزائم اور خیالات و رجحانات کتابوں کے اوراق میں موجود ہیں، ارکان کی زندگیاں کھلی کتاب کی صورت میں پائی جاتی ہیں وہاں کوئی راز اور باطنی رمز و اشارت نہیں، کسی قسم کا ابہام یا ایہام نہیں!

جماعتِ اسلامی جس جدوجہد کو جاری کئے ہوئے ہے اور جس استقامت و عزیمت کا ثبوت دے رہی ہے کیا اس کو دیکھ کر کوئی منصف مزاج شخص اس انداز پر سوچ بھی سکتا ہے کہ یہ سارے کا سارا دنیا داری کا کاروبار ہے اور جماعت اقتدار حاصل کرنے کے لئے یہ قربانیاں دے رہی ہے اور اپنے کو پریشانیوں میں ڈالے ہوئے ہے اور یہ گمراہوں اور دین فروشوں کا قافلہ ہے، جو قوم کو غلط راہ پر ڈال دینا چاہتا ہے —— یہ طرزِ فکر اور یہ اندازِ تنقید کس قدر بے رحمانہ اور نا منصفانہ ہے! مغرب زدہ طبقہ کی مخالفت تو سمجھ میں آتی ہے مگر یہ جو بہت سے دیندار جماعت کے درپے آزار ہیں اور اُس پر طرح طرح کی تہمتیں جوڑ رہے ہیں، اور اپنی لمبی ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیر کر سفید جھوٹ بول رہے ہیں اور جماعت کو امریکہ اور اسرائیل ایجنٹ ثابت کرنے کے لئے کذب و افترا کے انبار لگائے چلے جا رہے ہیں، اُن کی مخالفت سمجھ میں نہیں آتی! جن کو اقامتِ دین کی جدوجہد میں جماعتِ اسلامی کا دست و بازو ہونا چاہئے تھا۔ وہی جماعت کے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں! اور ملک میں ایسی فضا پیدا کر دینا چاہتے ہیں کہ حکومت کو احتساب کی زحمت ہی نہ گوارا کرنی پڑے، پاکستان کے عوام ہی جماعتِ اسلامی سے دست و گریباں ہو جائیں —— جو دیندار لوگ کھل کر جماعت کی مخالفت نہیں کر سکتے وہ خفیہ طور پر جماعت کے خلاف نیش زنی کرتے رہتے ہیں، کسی ادارہ کو لکھ دیا کہ جماعت اسلامی قادیانیوں کی ٹولی سے مشابہت رکھتی ہے، کسی استفتا کے جواب میں تحریر فرما دیا کہ جماعتِ اسلامی والوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے —— جماعتِ اسلامی کتنی مظلوم ہے۔

جماعتِ اسلامی دین کی جس جامع دعوت کو لے کر اُٹھی ہے، اُس کا یہی تقاضا تھا کہ جہاں جہاں جاہلیت جس صورت میں بھی پائی جاتی ہے وہاں سے جماعت کے خلاف آوازیں اُٹھیں اور چاروں طرف سے جماعت کو نرغے میں لے لیا جائے، یہی طوفانِ مخالفت اور ہنگامۂ بغض و عداوت جماعت کی حقانیت کی دلیل ہے۔

مخالفت اور تہمت

جماعت اسلامی کا یہ سرسری تعارف تو تمہید ہے اُس گزارش و تفصیل کی، جو قارئین کے سامنے آ رہی ہے۔ ہاں! تو بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ تقسیم ہند سے قبل بھی جب تک جماعت نے ہندوستان کی سیاست میں عملاً حصہ نہیں لیا تھا، بعض ارکان نے جماعت سے علیحدگی اختیار فرمالی تھی، اُن کو جماعت میں کوئی ایسی کوتاہی نظر آئی ہوگی، جس کے سبب اُنہوں نے وصل کے مقابلہ میں فصل کو ترجیح دی، اس تصویر کا دوسرا رُخ یہی ہو سکتا ہے کہ جماعت کے بارے میں ان علیحدگی اختیار کرنے والے حضرات کا تجزیہ اُن کے خاص رجحان و ذوق پر مبنی ہو —— مگر جو حضرات جماعت سے وابستہ رہے، جن میں بعض صاحبانِ علم و نیز بھی تھے، اُنہیں جماعت میں اس قسم کی کوتاہی دکھائی نہیں دی، اور وہ جماعت کو حق شناس اور خیر پسند سمجھ کر اُس میں بدستور شامل رہے یہاں تک کہ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے جماعت کی ہر مہم میں جماعت کی پالیسی اور طریقِ کار کا ساتھ دیا۔

سب سے پہلے ملک سعید صاحب نے اخبارات میں بیان دے کر جماعت کو چھوڑا، مولانا امین احسن اصلاحی، ملک صاحب موصوف کے تنقیدی رجحان کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے، اس واقعہ کے بعد مولانا اصلاحی صاحب پہلے شخص ہیں، جنہوں نے جماعت سے ترکِ تعلق کرتے ہوئے "کا سوال گم کر

ے خطاب سے جماعت کو نوازا، حالانکہ جماعت نے آغازِ تاسیس میں جو لائحہ عمل متعین کیا تھا اب تک وہ اسی راہ پر گامزن ہے اور دستور انتخابیہ کی
ہم اور جائزہ کمیٹی پر امیرِ جماعت کا احتساب یہ مسائل ایسے نہ تھے جن کی بنیاد پر جماعت کو "گم کردہ راہ" کہا جاتا! اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ امیرِ جماعت
نے احتساب میں شدت سے کام لیا اور اس معاملہ میں اُن کے نفس کی برہمی شامل ہو گئی تھی —— تو اس قسم کی انتظامی بے اعتدالیوں کے سبب جماعت
کو گم کردہ راہ تو نہیں کہا جا سکتا، اور یہ ایسا قصور تو نہیں ہے جس کی پاداش میں جماعتِ اسلامی کو گردن زدنی قرار دیا جائے!

خیال تھا بلکہ توقع تھی کہ مولانا امین احسن اصلاحی کی طبیعت میں جو جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے اور وہ ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں، یہ
اشتعال، برہمی اور جھنجھلاہٹ وقتی ہے، وقت کی رفتار کے ساتھ اس میں اعتدال پیدا ہو جائے گا —— مگر یہ توقع پانی کا بلبلہ ثابت ہوئی، مولانا
موصوف نے جماعت اور مولانا مودودی کی مخالفت اور ان پر طنز و تشنیع کو اپنا شعار بنا لیا، مولانا اصلاحی صاحب جو مودودی صاحب کے علم و فضل اور
عربی دانی کے معترف تھے، اُن کے قلم سے اب یہ الفاظ :—

"لافرق بین المودودی و پرویز"

بھی نکلے! یہ اندازِ تنقید اور اسلوبِ طنز اس بات کی واضح طور پر غمازی کرتا ہے کہ مولانا اصلاحی کو جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی سے ذاتی طور پر
کد ہو گئی ہے، اپنے ذہن میں مولانا موصوف نے یہی تصور قائم کر رکھا ہے کہ ان کی حق پسندی یہ باتیں اُن سے کہلوا رہی ہے اور وہ منکر و باطل کی تردید کا حق
ادا کر رہے ہیں —— پھر انہوں نے مارشل لاء کے آغاز میں جماعتِ اسلامی کے ارکان کو "چوہوں" سے تشبیہ دی ہے حالانکہ اس دور میں وہ خود بھی جرأت
و بے باکی کا کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے! ہم نے "فاران" میں اُسی وقت "جائزہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور تفصیل سے بتایا کہ مولانا اصلاحی
صاحب نے جماعتِ اسلامی سے نکلنے کے بعد کتنا عجیب بلکہ نامنصفانہ موقف اختیار کیا ہے! اس مضمون میں راقم الحروف نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے
غیر واقعی، بے جا الزام یا ناروا تہمت کہا جا سکے، مولانا اصلاحی صاحب کے بیانات اور تحریروں کے اقتباسات درج کر کے بتایا کہ اُن کی مدح و
منقبت اب طنز اور ذم سے بدل گئی ہے!

اس کے بعد بھی مولانا اصلاحی کا قلم جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے خلاف نیش زنی کرتا رہا۔ صدارتی انتخاب کے بعد اُن کی جو تحریر
مجلہ "میثاق" میں آئی، وہ عبرت کا مرقع ہے، اربابِ اقتدار کی منقبت خوانی ایک نئی صنعت میں اور حریفِ اختلاف پر طنز کا اسلوبِ جدید!

مجلہ میثاق کے "دورِ جدید" میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی پر طنز و تشنیع کا کام مولانا اصلاحی صاحب نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو
سونپ دیا ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف جو اپنی طبیعت سے "سیماب" واقع ہوئے ہیں، انہوں نے جماعت کو عوام کی نگاہ میں ہلکا اور بے وزن بنانے میں کوئی
کسر اٹھا نہیں رکھی! اس گروپ کے نزدیک پاکستان میں سب سے بڑا "منکر" جماعت اسلامی کا وجود ہے اور اس کے خلاف یہ اپنی توانائیاں صرف کئے جا
رہے ہیں، اس "جہاد" (؟) میں اُن کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں —— بلکہ کچھ منفعت ہی کی اُمید ہے کہ اس مہم کا قصرِ عالیہ ان کے منصوبہ
سے تیار ہو گیا ہے!

—— اب حال ہی میں ——

ناانصافی کا شاہکار

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جماعتِ اسلامی کی مخالفت اور بغض و عناد میں مجاہد الحسینی صاحب
کی کتاب "ابلیس اور جماعت اسلامی" پر مقدمہ تحریر فرما کر جس ناانصافی، بے رحمی اور حق و انصاف
کو پامال کرنے کا ثبوت دیا ہے، اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے! حیرت ہے کہ برسوں کے "تدبر قرآن" نے بھی اُن کو "الحب للنفس" "البغض للنفس"
کی پستی سے نہیں اُبھارا، جماعتِ اسلامی کی مخالفت نے اُن کو انتہائی سنگدل بنا دیا ہے اور اب اُن کا یہ حال ہو گیا ہے کہ جماعت اسلامی کی مخالفت
میں جہاں سے بھی آواز اُٹھتی ہے اس کے سُر میں سُر ملا دینا وہ اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں! اس سے اُن کے دل کو چین، روح کو تسکین اور آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے۔

اصل کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے، مگر اس پر مولانا اصلاحی نے جو مقدمہ لکھا ہے اسی سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب جماعتِ اسلامی کو بدنام اور مطعون کرنے کے لئے لکھی گئی ہے اور کتاب کے مصنف کی نگاہِ انتخاب کی داد دینی چاہئے کہ آپ نے اس پر مقدمہ نگاری کے لئے ایسی شخصیت کو منتخب کیا جس کا دل جماعت اسلامی کی مخالفت اور بغض و نفاق سے لبریز ہے۔

مقدمہ کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:—

"جناب مجاہد الحسینی صاحب کی کتاب "اسرائیل اور جماعت اسلامی" پر ایک سرسری نظر ڈالنے کا مجھے موقعہ ملا ہے یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے جس سے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوئی ہے اس وقت ہمارے ملک میں جمال عبدالناصر کی مخالفت اور اسرائیل کی درپردہ حمایت میں جو بیہودہ پروپیگنڈہ جماعت اسلامی کی طرف سے ہو رہا ہے وہ اس زخم پر نمک پاشی کے حکم میں داخل ہے، جو مشرقِ وسطیٰ کے سانحے میں پوری ملت کو پہونچا ہے، لیکن جو بے درد اور سنگدل لوگ اس ذلیل کام میں مصروف ہیں وہ اپنی غرض کے ایسے اندھے ہیں کہ مختلف حد اس حلقوں کی طرف سے تنبیہ کے باوجود اپنی اس حرکت سے باز نہیں آئے، اسی وجہ سے شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا سختی سے محاسبہ کیا جائے اور ان لوگوں کے اغراضِ مشئومہ سے پردہ اُٹھایا جائے۔"

فرمایا گیا ہے ——— "یہ ایک مفید کتاب ہے" ——— جماعت اسلامی کی مخالفت میں جو کتاب بھی آئے گی وہ لازماً مفید ہی ہوگی، کس طرح ہو سکتی ہے ——— اس کے بعد کے جملے ——— "اس وقت ہمارے ملک میں جمال عبدالناصر کی مخالفت اور اسرائیل کی درپردہ حمایت میں جو بیہودہ پروپیگنڈا جماعتِ اسلامی کی طرف سے ہو رہا ہے" ——— حالانکہ عرب افواج کے ہتھیار ڈالنے سے پہلے عرب و اسرائیل جنگ کے دوران جماعتِ اسلامی کے کسی فرد نے ایک لفظ بھی جمال ناصر کے خلاف نہیں کہا، جماعت کے اکابر نے اسرائیلی جارحیت یہودیوں کے عزائم اور امریکہ کی یہود نوازانہ پالیسی کی پُر زور مذمت کی! ہاں! جنگ بندی کے بعد نہایت ہی متوازن انداز میں شکست کے اسباب ضرور بیان کئے اور اسی بحث و گفتگو میں "اخوان المسلمون" کا بھی ذکر آیا ہے کہ جس جماعت کے جوشِ جہاد اور دینی اخلاص سے یہودیوں کو خطرہ تھا، اس کو جمال عبدالناصر نے تباہ و برباد کر دیا اور دینی وحدت کے مقابلہ میں عرب قومیت کا نعرہ بھی اُن کے کچھ کام نہ آیا اور اس ضمن میں جمہوریہ عرب کی فوجوں کی ہر محاذ کے ساتھ پسپائی جیسے "دستاویزِ شکست و اطاعت" اُن کے پاس لکھے لکھائے پہلے سے موجود تھے، اُن کا ذکر بھی کیا گیا! اور یہ تنقید جنگ بندی کے بعد کی گئی! جنگ و صلح کے واقعات کے بعد، بہرحال تنقید و تبصرہ کیا ہی جاتا ہے! یہ کوئی نئی بات اور بدعت سیئہ نہیں ہے، جس کا ارتکاب جماعت اسلامی یا اُس کے متفقین نے کیا ہے، اس تنقید سے "اسرائیل کی درپردہ حمایت" کا نکتہ پیدا کرنا ذہن و فکر کے افلاس اور جماعت کے اندھے تعصب کی دلیل ہے، یہ "درپردہ" کا لفظ کس قدر شرارت آمیز ہے جیسے جماعت اسلامی نے اسرائیلی حکومت سے بہ صیغہ ملفوف ساز باز کر لیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بارے میں مولانا اصلاحی صاحب اور اُن کے ہوا خواہوں کی کیا رائے ہے! وہ "عرب و اسرائیل جنگ" کے بعد مسلسل تنقید کر رہے ہیں، کیا وہ بھی درپردہ یہودیوں سے ساز باز رکھتے ہیں!

جناب ظفر احمد انصاری کو مولانا امین احسن اصلاحی برسوں سے جانتے ہیں، انصاری صاحب کے ملنے اور جاننے والے سینکڑوں لوگ پاکستان میں موجود ہیں، انصاری صاحب کا دینی اخلاص سب کے نزدیک مسلّم ہے، صاحب موصوف کی دیانت و ثقاہت پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے

---

[1] اس انداز پر تنقید "فاران" میں کی گئی تھی۔

ہ
بر و کی گفتگو میں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیتے اور انتہائی محتاط اور ذمہ دارانہ گفتگو کرتے ہیں انہوں نے آج تک کسی پر بھی تہمت نہیں لگا ئی
نے کبھی کوئی بے اصل بات کسی سے منسوب نہیں کی، مگر مولانا امین احسن اصلاحی اس قسم کے خیر پسند، مخلص اور مرنجان و مرنج شخص
معاف کر گئے، انصاری صاحب کا قصور یہ ہے کہ وہ دلائل کے ساتھ صدر جمہوریہ عرب کی شخصیت، اُن کے کارناموں اور سیاسی روش کو
ہیں، یہ انٹرویو "اُردو ڈائجسٹ" میں چھپا اور اسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، مولانا اصلاحی صاحب اور اُن کے اخوان و انصار کو
یہ تنقید بُری لگی؛ اس انٹرویو میں اگر انہیں غلط باتیں نظر آئیں، تو اُن کا فرض تھا کہ وہ اُن کی نفی کرتے اور اپنے منفی دلائل
ی صاحب کی کمزور دلیلوں کا رد فرماتے، دسیوں صفحے کے اس مضمون میں بس ایک بات مولانا اصلاحی نے پکڑ لی ہے کہ "پچاس ہزار اخوان المسلمون
ڈالنے کی بجائے" "پچاس ہزار اخوان کو قتل کیا" کیسے چھپ گیا۔ اللہ تعالیٰ شاہد اور علیم و بصیر ہے کہ جس دن یہ مضمون چھپ کر آیا ہے اُسی
ظفر احمد انصاری نے راقم الحروف سے فرمایا کہ رپورٹنگ میں چوک ہو گئی، اور انہوں نے اسی "سہو بیان" کا ذکر کیا، جس پر مولانا اصلاحی نے
ئی ہے! ایک شخص (یعنی ظفر احمد انصاری صاحب، جن کو مولانا اصلاحی صاحب برسوں سے جانتے ہیں) اپنی زبان سے یہ کہتا ہے یہ رپورٹنگ
ہے کہ "جیلوں میں ڈالنے کی بجائے" ــــ "قتل کیا" چھپ گیا ــــ مگر ایک ثقہ اور معقول مرد مومن کے اس اعتراف کو اصلاحی صاحب
صرف یہ کہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا بلکہ انصاری صاحب پر بہت سی تہمتیں جوڑ دیں، وہ فرماتے ہیں :-

"اگرچہ مضمون اپنے مواد و استدلال اور اعداد و شمار کے حوالہ جات سے صاف غمازی کر رہا تھا کہ یہ امریکہ و
اسرائیل کے پروپیگنڈہ آفس میں بیٹھ کر مرتب کیا گیا ہے لیکن اس کو رنگ ایک انٹرویو کا دیا گیا۔ کہ جو اس کو پڑھے
وہ اس کو وہ الائنس دے کر پڑھے، جو عام طور پر ایک انٹرویو کے لئے معروف ہے اور اگر ضرورت پڑے تو اس
کی کسی بات کو تعبیر یا رپورٹنگ کی غلطی قرار دے کر اپنے آپ کو اس کی ذمہ داری سے بچایا جا سکے۔ چنانچہ اس
ہوشیاری کا تجربہ مجھے خود ہوا ....."

"انہوں نے پہلی بات کا تو ایک قسم کے احساس خفت کے ساتھ جواب دینے کی کوشش کی، لیکن دوسری بات کی ذمہ داری
انہوں نے میری توقع کے مطابق غلط تعبیر اور غلط رپورٹنگ پر ہی ڈالی ....."

مولانا اصلاحی صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی عبارت کو پڑھ کر خدا جانتا ہے شدید صدمہ ہوا، ایسی باتیں تو وہ سیاست باز کیا کرتے ہیں جو اپنے
، کو بدنام کرنے اور اُن پر تہمتیں جوڑنے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں!
اگر اس گنہگار کی شرعی قسم کا اعتبار کیا جا سکتا ہے تو میں حرم کعبہ میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ مولانا ظفر احمد انصاری نے رسالہ میں اپنا انٹرویو
، اُسی دن مجھ سے کہا تھا کہ رپورٹنگ میں غلطی ہوئی ہے اس صورت میں وہ نہ کسی جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں اور نہ انہوں نے مبالغہ کیا ہے!
ڈائجسٹ کے رپورٹر سے سننے میں التباس کا امکان ہے اور یہ التباس کسی بدنیتی پر مبنی نہیں ہے اُن کے مرتب کئے ہوئے درجنوں انٹرویو منظر
عام پر آ چکے ہیں اور اس فن خاص میں وہ بڑی اچھی شہرت رکھتے ہیں، اُن پر کسی انٹرویو دینے والے نے غلط بیانی یا مبالغہ آمیزی کا الزام نہیں
، اسی صحافتی دیانت کے سبب بڑی بڑی شخصیتیں انہیں خوشی کے ساتھ انٹرویو دیتی رہی ہیں ا ۱۹۳۳ء میں جب راقم الحروف روزنامہ "منیر" (بجنور)
سے وابستہ تھا، تو ان دنوں ریاست الور کے مسلمانوں پر مہاراجہ الور کے ظلم و ستم کی خبریں آ رہی تھیں، پریس کی ایک خبر کا انگریزی سے ترجمہ کرتے ہوئے مجھ
سے غلطی ہو گئی، یہ غلطی خاص مبالغہ آمیز نوعیت کی تھی، مگر میں نے مہاراجہ الور کو بدنام کرنے کے لئے ایسا نہیں کیا تھا اس سہو ترجمہ کی اخبار میں تردید بھی ہو گئی
، ! بعض اوقات روایت و سماع کے سلسلہ میں راوی اور سامع دونوں بے قصور ہوتے ہیں حالانکہ روایت اور سماع میں ضعف اور سہو واقع ہو جاتا ہے
مولانا اصلاحی جس طرح جمال ناصر صاحب کی بے گناہی اور معصومیت کے مبلغ بنے ہوئے ہیں اسی انداز پر اگر کوئی مہاراجہ الور کا مداح راقم الحروف

پیرو تربیت کرکے اچھالنے اور نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ——— اور اس طرح وہ لوگوں کو یہ تاثر دیتا کہ ہمارا جو آلہ کار ہے وہ بڑے دھوکے کا ہے، اُن کے مخالفین بر بنائے تعصب یہ اُن سے غلط باتیں منسوب کر دی ہیں ——— تو ایسے کہنے والے کو کیا لقب دیا جاتا؟ کھلے ہوئے مظالم کی پردہ پوشی "تعاون علی الاثم والعدوان" نہیں قرار دیا جاسکتا ہے؟

"اخوان" کو جیلوں میں جیسی سفاک تعذیبیں دی گئی ہیں اور جو لرزہ خیز اذیتیں پہنچائی گئی ہیں، اُن کو دیکھتے ہوئے اگر خیال کیا جائے کہ ان اذیتوں کی تاب نہ لاکر جان بحق، یا پھر اعضا کارہ ہوگئے ہوں تو یہ نہ تہمت ہے اور نہ مبالغہ کی کوئی بات ہے! ہاں! جھوٹ اس وقت کہا جاتا جب کہ "اخوان" کو ظلم و ستم کا شکار نہ بنانے کی خبریں ہی سرے سے بے بنیاد ہوتیں! "اخوان" کی پوری تحریک کو مصر میں قتل کر دیا گیا اور اس دینی تحریک کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان جیتے جاگتے حادثات اور سانحوں کے ہوتے ہوئے، مولانا اصلاحی انٹرویو میں "پھرڈنگ" کے ان مظالم پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں!

تہمتیں

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب برسوں جماعتِ اسلامی سے وابستہ رہے ہیں، جماعت میں مولانا مودودی کے بعد انہی کی شخصیت سب سے زیادہ ممتاز و بلند اور فعال تھی۔ جماعت سے وہ جب علیحدہ ہوئے ہیں، انہوں نے جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے اختلاف کی بنا پر "گم کردہ راہ" تو کہا مگر جماعت پر یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ کسی بیرونی حکومت کی ایجنٹ بن کر کام کر رہی ہے یا ملک کی کسی سیاسی پارٹی نے جماعت کو خرید لیا ہے! برسوں کے اس تجربہ اور مشاہدہ کے بعد مولانا اصلاحی صاحب آخر اب کس ثبوت کی بنا پر جماعت کے بارے میں یہ غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں بلکہ جھوٹ گھڑ رہے ہیں کہ اس طرح:۔

"... ناصر دشمنی کا مقصد بھی پورا ہو رہا ہے اور اسرائیل و امریکہ کا حق نمک بھی ادا ہو رہا ہے۔"

جماعت اسلامی کے کردار سے مولانا اصلاحی اچھی طرح واقف ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اور اس یقین و تصور کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے، خود سوچیں اور غور کریں کہ ان کے زمانہ وابستگی تک کیا جماعت اسلامی نے کسی دنیوی مفاد یا لالچ کی بنا پر کسی شخص، فرد، جماعت یا حکومت کی مدح و ذم کی ہے، اور کوئی طاقت جماعت اسلامی کے لیڈر کو خرید سکی ہے؟ جس جماعت کا یہ کردار رہا ہو اُس پر امریکہ اور اسرائیل کا نمک ادا کرنے کی پھبتی کتنی ناروا پھبتی ہے، اس کا تو کبھی سان گمان بھی نہ تھا کہ جماعت اسلامی کی دشمنی میں مولانا اصلاحی اتنے غیر ذمہ دار اور پست بھی ہو سکتے ہیں۔

جس زمانہ میں مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ جماعت کے رکن بلکہ نائب امیر تھے، جماعت پر امریکہ اور بھارت کے ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا گیا، ایک احراری مولوی نے تو مسجد کے منبر پر بیٹھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ جماعتِ اسلامی کو بھارت سے ایک ایک لاکھ روپیہ کے سنی آرڈر آتے ہیں! جس طرح اُس زمانہ میں جماعت پر یہ تمام الزامات غلط اور بے بنیاد تھے، آج بھی اس قسم کی تہمتیں جھوٹ اور افترا ہیں، حیرت تو اس پر ہے بلکہ بہت بڑا المیہ ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے ان تہمت تراشوں، افترا پردازوں اور بیہودہ گوئیوں کی صف میں کس طرح جگہ بنا لی۔

مولانا موصوف اچھی طرح جانتے ہیں کہ اخوان المسلمون کی حمایت جماعت اسلامی نے کسی لالچ کی بنا پر یا کسی بیرونی طاقت کے اشارے پر نہیں کی، اخوان کے دینی لٹریچر، اس تنظیم کے اخلاقی پروگرام اور اسلامی کردار و عمل کو دیکھ کر جماعت اسلامی نے پاکستان میں اس کا تعارف کرایا، پاکستان و ہندوستان میں ایسے علماء اور ارباب فکر موجود ہیں جنہوں نے "اخوان" کی تنظیم کا اپنی نگاہوں سے مشاہدہ کیا ہے، ان کی شب بیداری کا اجتماعات کے ساتھ نوافل پڑھے ہیں، اخوان کے اکابر سے ملاقاتیں کی ہیں اور مصر، شام، عراق اور شرق اردن میں "اخوان" کی تربیت اور سعی و تدبیر کی بدولت ان کی دینی فضا اور اخلاقی ماحول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے! جماعت اسلامی نے "الحب للہ" کے دینی اصول کے تحت اور خالص دینی جذبہ کے تحت "اخوان" کو پسند کیا، اُن کے دینی کارناموں کو سراہا اور اُن پر ظلم کرنے والوں کی مذمت کی! شاہ فاروق کے دورِ حکومت میں اخوان پر جو مظالم

ں اور اس تنظیم کے بانی اور مرشد عام حضرت حسن البنا کو شہید کیا گیا ہے تو جماعت اسلامی نے اس وقت بھی اخوان پر ظلم و ستم ...
استعمار جس کسی بیرونی حکومت کا ایما رشریک نہ تھا، اور مصر کے ناصری دور میں اخوان کو جس طرح مٹایا گیا ہے اس ظلم سے جماعت اسلامی ...
دنیا میں بھی کسی حکومت کے اشارے پر نہیں ہے!

"عرب اسرائیل جنگ" کے اسباب و نتائج پر جماعت اسلامی کا تبصرہ بھی کوئی چونکنے کی چیز اور برا ماننے کی بات نہیں ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ... کی شخصیت مولانا اصلاحی کے نزدیک بھی محترم، ثقہ اور قابل اعتماد ہے۔ ۵ نومبر ۱۹۶۷ء کے سہ روزہ "مدینہ" بجنور میں اُن کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے ... دار مولانا علی میاں کے مکہ مکرمہ پہونچنے پر وہاں کے مشہور روزنامہ "الندوہ" کے ایڈیٹر نے لیا تھا، اُس کے اقتباسات ہ:—

"میرے اوپر اس حادثہ کا رد عمل وہ نہیں ہے جو کسی غیر متوقع بات سے ہوتا ہے، تمام علامتیں اس کی موجود تھیں کہ ایک نہ ایک دن یہ المیہ ہونے والا ہے .... اس معرکہ میں عربی قیادت کی مثال بالکل یہی تھی، وہ دشمن کی جنگی تیاری، منصوبوں اور سنجیدگی کا مقابلہ زبانی جمع خرچ سے کر رہی تھی، صحافت کا طمطراق، ریڈیو کی گھن گرج اور لاف گزاف اس کا کل سرمایہ تھا، اس کی صف آرائی دشمن کے خلاف تو بہت کم، لیکن ان بھائیوں کے خلاف بے حساب تھی، جو عقیدے میں بھائی تھے۔

... ن نے مسلمانوں کی صفت بیان کی :—

اذلة على المومنين، اعزة على الكافرين ... اہل ایمان کے لئے نرم اور اہل کفر کے لئے گرم

لیکن انھوں نے اس کو "اُلٹ کر" "اعزة على الكافرين" کا حال پسند کیا۔

"بہرحال دشمنوں کے مقابلہ میں ان کا سارا حال، زبانی آمدی، لن ترانی اور ڈرامہ آرائی کا تھا جیسے علی بابا اور چالیس چور" والا ڈرامہ اسکول کے بچے سٹیج کیا کرتے ہیں، چنانچہ حقیقت کا سامنا ہوا اور واقعی لشکر سے سابقہ پڑا تو یہ اداکار میدان جنگ کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔"

(اس کے بعد مولانا علی میاں نے قرآن کریم کی آیات نقل کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عربوں کی شکست کا اصل سبب اخلاقی صفات اور ایمان عمل کی کمزوری ہے)

"........ آپ کو اس قیادت سے ضرور مایوس ہو جانا چاہئے جس نے یہ جنگ ہاری لیکن اسلام جو ہماری اصل طاقت ہے اس پر تو کوئی آنچ اس جنگ میں نہیں آئی ہے، اسے اس جنگ میں شریک ہی نہیں کیا گیا، بلکہ پوری کوشش سے دور رکھا گیا ہے اس جنگ میں اگر شکست کھائی ہے تو جاہلی نعروں نے شکست کھائی ہے، اشتراکیت کا دین بے آبرو ہوا ہے، اسلام تو آزمایا ہی نہیں گیا"

کیا فرماتے ہیں صاحب "تدبر قرآن" جانشین علامہ فراہی حضرت مولانا احسن اصلاحی مدظلہ، مولانا علی میاں کے اس تبصرے کے بارے میں؟ کیا مولانا علی میاں بھی اس قسم کے تبصرے فرما کر اور انٹرویو دے کر، اسرائیل اور امریکہ کا حق نمک ادا کر رہے ہیں! اُن لوگوں کے علاوہ جن کو جماعت اسلامی کی دشمنی نے اندھا اور بہرا بنا دیا ہے اور اس جوش تعصب کے سبب وہ حق و ناحق میں ٹھیک طرح امتیاز ہی نہیں کر پاتے —— جو کوئی "عرب اسرائیل کی جنگ" پر سوچے گا اور تبصرہ کرے گا اُس کا انداز فکر ٹھیک یہی ہوگا۔ جس کی جھلکیاں مولانا علی میاں کے انٹرویو میں ملتی ہیں، حق شناسی، واقعہ نگاری اور تنقید و تبصرہ کا یہی طرز جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے۔

اپنے اس مقدمہ میں مولانا اصلاحی صاحب نے لکھا ہے :-

"جہاں تک اسرائیل کے تقویٰ اور تدین کا تعلق ہے اس کی شاید اگر کوئی جماعت خدا کی زمین پر ہے تو وہ صرف جماعت اسلامی ہے، جماعت اسلامی کے سوا نہ کسی نے پہلے شہادت دینے کی جرأت کی اور نہ آج یہ شہادت دینے کی جرأت کر سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مولانا مودودی کی تفہیم القرآن موجود ہے، جماعت اسلامی کے رسالے اور اخبارات ہیں جن میں بیسیوں مقامات پر یہودیوں کو "مغضوب" اور "ملعون" لکھا گیا ہے، جماعت کے رکن مصباح الاسلام صاحب فاروقی کی مشہور کتاب بھی یہودیوں کی مذمت سے لبریز ہے، خود مولانا ظفر احمد انصاری جن کو مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے اس مقدمہ میں جماعت اسلامی کا معنوی سرپرست کہا ہے، اُن کے انٹرویو کے خاصے بڑے حصہ میں یہودیوں کی عالمگیر سازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے ! اُس شخص پر خدا کی لعنت ہو، جو یہودیوں کے لئے اپنے دل میں ذرہ برابر بھی کسی قسم کی گنجائش رکھتا ہو، مولانا اصلاحی نے جماعت اسلامی کی دشمنی میں اُلٹی بات کہی ہے، راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ خدا کی اس زمین پر اخوان اور جماعت اسلامی سے بڑھ کر شاید ہی کوئی فرد اور جماعت یہودیوں کی اتنی دشمن اور مخالف ہو !

آج مغربی اقوام جو دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، اُن کو کافر، گمراہ، فاسق اور دشمن اسلام جانتے ہوئے بھی، خود مسلمان اہل قلم اور ارباب دانش ملت اسلامیہ کو غیرت دلانے کے لئے اُن کے ایثار، فرض شناسی اور وقت کی پابندی کی تعریفیں کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مغربی قوموں کے لوگ اپنی قوم سے غداری نہیں کرتے ـــــــ کیا اس اظہار واقعہ پر اُن مسلمان ارباب فکر وقلم پر یہ پھبتی چُست کی جا سکتی ہے کہ یہ حضرات مغربی اقوام کے مقابلہ میں ملت اسلامیہ کو ذلیل سمجھتے ہیں اور ان کافروں اور ملحدوں کے کردار کی خوبیوں کی شہادت دیتے ہیں ۔ ہم اپنی عام گفتگو میں اس قسم کی باتوں کا ذکر کیا کرتے ہیں کہ مسلمان قوم تجارت میں مغربی اقوام کی طرح دیانت دار نہیں رہی، اور دیانت جو مسلمانوں کا امتیاز تھا اُس کو غیر قوموں نے اپنا لیا ہے ۔ کیا اس قسم کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ایسی تنقید کرنے والے کافر قوموں کے مداح، قدر شناس اور اُن کے عدل و دیانت کے شاہد ہیں اور اپنی قوم کی ذلت و رسوائی کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں ! سکندر کی فتمندی، نوشیرواں کی عدالت، حاتم کی سخاوت اور نپولین کی بہادری کا ذکر کسی مسلمان کی زبان سے سُن کر، کیا اُس پر کافروں کی قصیدہ خوانی کی تہمت لگائی جا سکتی ہے ؟

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس جنگ پر جو تبصرہ کیا تھا وہ تبصرہ تو راقم الحروف کے سامنے نہیں ہے اُس کا خلاصہ اور لب لباب یہی ہے کہ یہود نے اپنے مقصد کے لئے بے پناہ قربانی دی، ایثار سے کام لیا اور وہ سب مل جل کر ملت واحدہ بن گئے، مگر عربوں کے یہاں انتشار و افتراق ہے، انہوں نے خدا پرستی ہی دینی بھائیوں کے تباہ کرنے میں اپنی قوت کو صرف کیا ہے، اُن کو اپنے مقصد اور دین وملت اور اسلامی روایات سے خاطر خواہ لگاؤ نہیں، اس لئے جہاں تک دنیوی اسباب کا تعلق ہے اس کا نتیجہ یہی نکلنا چاہئے تھا جو عرب اسرائیل جنگ میں دنیا نے دیکھ لیا ! اللہ تعالیٰ چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے مگر سنت الٰہی یہی ہے کہ کتنا ہی بڑا متقی کیوں نہ ہو اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا، تو اُس کے لئے نہ آگ خود بخود جلے گی اور نہ پانی اس کے پاس ڈھلک آئے گا۔ اور فاسق و کافر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توانائیوں سے کام لے گا تو ہر چیز کی افادیت اُس کا ساتھ دے گی ! اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ مغضوب و ملعون قوموں کے ایثار و قربانی اور محنت و جانفشانی کا اُنہیں کوئی پھل اور صلہ اس دنیا میں نہیں ملے گا اور مسلمان چاہے کتنے ہی غافل، فرض ناشناس، ناکارہ، فاسق و فاجر اور بنیان مرصوص بننے کی بجائے ٹھیکروں کی طرح منتشر ہو جائیں تو ان پر سدا رحمتوں کی بارش ہی ہوتی رہے گی ـــــــ مولانا مودودی یا جماعت اسلامی کے کسی اخبار اور رسالہ نے "عرب اسرائیل جنگ" کے نتائج پر اس طرح تبصرہ کر کے آخر کیا غلطی کی ہے، جیسے مولانا اصلاحی نے وہ معنی پہنائے ہیں جن کی ایک حقیقت پسند اور سنجیدہ انسان سے توقع نہیں ہو سکتی ـــــــ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خود صحابہ کرام پر جو اعتاب فرمایا ہے -

ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئاً وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین

اور یاد کرو، معرکہ حنین میں اپنی کثرت پر تم ناز کرنے لگے تھے، پس یہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور تنگ ہوگئی تم پر زمین اور تم پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ترکیا

...الیٰ اس نقد و احتساب سے کافروں کو معزز ثابت کرنا اور صحابہ کرام کو ذلیل ٹھیرانا چاہتا ہے! اور مولانا اصلاحی صاحب کے بقول کیا معاذاللہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح احتساب فرما کر، کافروں کی بہادری اور مسلمانوں کی بزدلی کی شہادت دی ہے ۔۔۔ ! مولانا اصلاحی صاحب کی سیع المطالعہ عالم ... اچھے انشاپرداز ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قسم کے نقد و احتساب کی اصل غرض کیا ہوتی ہے اور عبرت و موعظت اور غیرت دلانے کے لئے ایسے ... پر کیا اندازِ تحریر اور اسلوبِ بیان اختیار کیا جاتا ہے مگر جماعتِ اسلامی کی دشمنی میں فراست و سنجیدگی کی معروف حدود کا بھی انہیں دھیان ... نہ انہوں نے اس مسئلہ میں جان کر وہ نکتہ پیدا کیا ہے اور ایسا شوشہ چھوڑا ہے جس سے جماعتِ اسلامی عام مسلمانوں کی نگاہ میں خاص مطعون ہو ... ہے!

عرب قومیت کا نعرہ سو فیصدی خالص جاہلانہ نعرہ ہے، جس کی کسی عنوان بھی مدح و توصیف نہیں کی جا سکتی، مگر مولانا اصلاحی صاحب نے ... جاہلانہ نعرے کی اپنے اس مضمون میں جس انداز میں تاویل و توصیف کی ہے، وہ اس کی دلیل ہے کہ جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کی دشمنی اور بغض و ... میں، خود اُن کے اندر بھی اچھوتوں کی جاہلانہ نسلی عصبیت عود کر آئی ہے، مولانا موصوف لکھتے ہیں :۔

"قومیت کے نعرے کو جس شد و مد کے ساتھ مطعون کیا جا رہا ہے یہ بھی ایک مہمل بات ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

یعنی "عرب قومیت" کا یہ نعرہ طعن و تشنیع کا سرے سے مستحق ہی نہیں ہے اور جو لوگ اس طعن و طنز میں شدت برتتے ہیں وہ ایک مہمل بات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ہاں! "عرب قومیت" کے نعرے میں "معنویت" پائی جاتی ہے، "مہمل بات" تو اس نعرے پر طعن و تنقید ہے! ایسی لغو و مہمل بات کہ کر مولانا اصلاحی صاحب نے سید قطب شہید اور دوسرے دین پسند مصری زعماء کی قربانیوں پر پانی پھیر دیا، جنہوں نے "عرب قومیت" کے جاہلانہ نعرے کی پوری جرأت کے ساتھ تردید کی، اور اس طرح شہادتِ حق کا فرض ادا کیا!

پھر وہ فرماتے ہیں :۔

"قطع نظر اس سے کہ قومیت کا نعرہ غلط چیز ہے یا صحیح، سوال یہ ہے کہ اس جنگ میں اس نعرے سے عرب کو کیا نقصان پہونچا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

اس دینی فراست اور "تدبر قرآن" کے قربان جائیے کہ "عرب قومیت" کے نعرے کے خلاف کئی سال سے اہل علم شدید احتجاج کر رہے ہیں، بیسیوں مضامین اردو، عربی اور انگریزی میں اس کے خلاف لکھے گئے ہیں مگر مولانا اصلاحی صاحب ابھی تک غیر سے یہی طے نہیں کر پائے کہ "یہ نعرہ غلط چیز ہے یا صحیح" اس کے بعد سوال یہ ہے کہ کیا انہوں نے اس جاہلانہ نعرہ کی جس انداز میں تاویل اور توصیف کی ہے وہ ذہن کو اس طرف لے جاتا ہے کہ جماعت اسلامی جیسی ... پسند جماعت کی دشمنی کا یہ وبال اُن پر پڑا ہے کہ دین کی مسلّمہ قدروں سے انحراف کی تاویل بلکہ مدح و توصیف کی طرف وہ مائل ہوتے جا رہے ہیں۔

آگے چل کر قبلہ اصلاحی صاحب رقمطراز ہیں :۔

"ہمارے نزدیک جمال عبدالناصر نہ فرشتہ ہیں اور نہ شیطان، وہ اسی طرح کے مسلمان حکمران ہیں اُن سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور انہوں نے کارنامے بھی انجام دئے ہیں، اخوان کے معاملے میں ممکن ہے ان سے بعض زیادتیاں بھی ہوئی ہوں، لیکن اس چیز کو بہانہ بنا کر ان کی دشمنی کو دین بنا لینا اُن کی شکست ہے۔"

مولانا موصوف کے اس جملہ سے :—

"ہمارے نزدیک جمال عبدالناصر نہ فرشتہ ہیں اور نہ شیطان . . . . . . "

پڑھنے والے یہ اثر لے سکتے ہیں کہ مولانا اصلاحی صاحب شخصیتوں کے بارے میں کمال درجہ کے حق پسند واقع ہوئے ہیں اور جمال عبدالناصر کے بارے میں وہ کسی غلو میں مبتلا نہیں ہیں مگر جمال ناصر کی مدح میں اُن کے یہ الفاظ :—

".. ایسے بلند کردار لیڈر روز روز نہیں پیدا ہوتے "

پکار پکار کر اس کا اعلان کر رہے ہیں کہ لکھنے والے کا دل مستعرب جمہوریہ جناب جمال عبدالناصر کی عقیدت و محبت سے لبریز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کس سے فریاد کیجیے کہ اخوان المسلمون کو روح فرسا تعذیب، لرزہ بر اندام اذیت اور ہولناک آبرو ریزی سے لے کر ہلاکت کے جن انتہائی دردناک مراحل سے گزارا گیا ہے، ان کو مولانا اصلاحی نے "بعض زیادتیاں" فرما کر ظلم و شقاوت کی سنگینی کو کس بے دردی کے ساتھ ہلکا دکھانے اور سادہ بنانے کی مجرمانہ چابلوسی کی ہے! اور ان "بعض زیادتیوں" کو بھی ——— ممکن ہے ان سے بھی ہوئی ہوں ——— کہہ کر مشتبہ بنا دیا گیا ہے، یعنی اس کا بھی امکان ہے کہ یہ "بعض زیادتیاں" بھی سرے سے وقوع ہی میں نہ آئی ہوں۔ تیری اس دنیا میں قرآن کریم میں برسوں فکر و تدبر کرنے والے، کیا اتنے ناانصاف، اس درجہ سنگ دل، اس قدر حق ناشناس، بھی ہو سکتے ہیں؟ ظالموں کی مدافعت اور طرفداری میں اتنے چاق و چوبند، ہوشیار اور نکتہ رس اور مظلوموں کے معاملے میں نرے بے حس، بے خبر، بے پروا اور بے نیاز بن جانے والے! مولانا اصلاحی کے یہ جملے اُن کے اعمال نامہ کا سیاہ ترین باب ہیں! قیامت کے دن عبدالقادر عودہ، فرغلی، ہضیبی اور ان کے ساتھ ہزاروں اخوان اپنے کٹے ہوئے اور چھدے ہوئے جسموں، پھانسی کے پھندوں سے گھٹے ہوئے حلقوں، سڑا دیے ہوئے چہروں، نیزوں کے زخموں اور کوڑوں سے اُدھڑی ہوئی کھالوں کو لیے ہوئے اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے، اُس دن صاحب اپنی معذرت ابھی سے سوچ لیں!

یہ ظلم صرف اخوان المسلمون کے قتل و غارت، تعذیب اور قید و بند کی حد تک محدود نہیں رہا، اخوان کو تجدد و بے دینی سے ہٹا کر اسلام کے بالکل مخالف فضا پیدا کی گئی، "اللہ تعالیٰ کی تکبیر کی بجائے" قومیت عربیہ کی تکریم ——— وحدت اسلامی کے عوض قومیت اور نحن ابناء الفراعنۃ کا نعرہ ——— شاہراہوں پر فراعنہ کے مجسمے اور ڈاک کے ٹکٹوں پر اُن کی تصویریں ——— نظام کے مقابلہ میں اشتراکی نظام کی حمایت ——— مصر کے رسالوں میں ایسے ملحدانہ مضامین کی اشاعت جن میں کہا گیا کہ ناصر ازم اسلام سے بہتر ہے (نقل کفر کفر نباشد) ——— پاکستان کے مقابلہ میں بھارت کے ساتھ دوستانہ تعلقات ——— ترکوں کے علی الرغم مکاریوس جیسے دشمن اسلام سے یارانہ اور ظلم میں اُس کی حمایت کے لئے مصری رضاکاروں کی پیشکش ——— حبش کے فرمانروا سے پینگیں، یہ وہ فرمانروا ہے جو اپنے ملک میں مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کے لئے ہر ممکنہ تدبیر، چال بازی اور حربہ کو کام میں لا رہا ہے۔ یہی وہ "بلندی کردار" ہے، جس کی تعریف کرتے کرتے مولانا اصلاحی کی زبان خشک ہوئی جاتی ہے ——— یہ تمام باتیں اسلام سے محبت کا ثبوت ہیں؟ یا اس کے برخلاف دوسرا رُخ پیش کرتی ہیں ——— حیرت ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب اپنے ممدوح کے ان کارناموں (؟) سے صرفِ نظر کیے جاتے ہیں۔

جماعت اسلامی کی دشمنی اور بغض و عناد نے جس شخص کے نفس اور دل و دماغ کو اس قدر غبار آلود بنا دیا ہو، اس سے "الدین النصیحۃ . . . . لائمۃ المسلمین" کی آڑ لے کر ظالموں کو کھلا لائسنس دے گا اور مظلوموں کو

کار اور مستحقِ عقوبت ٹھیرائے گا ———— کسی فرد یا جماعت کی دشمنی جب خوب و ناخوب کے معیار کو
ے، یہاں تک کہ ظلم کی حمایت و مدافعت اور مظلومیت کی رسوائی اور بے حیائی کا مزاج بن جائے تو پھر ...... !!
اس احساس ذمہ داری کے ساتھ کہ ہمیں اپنے لکھے ہوئے کا اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہے، برسوں کے مسلسل تجربہ اور مشاہدہ کے بعد
رتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی فرشتوں کی نہیں انسانوں کی جماعت ہے اور انسانوں سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں ——— مگر مجموعی طور پر جماعت
ے خیر ہی کا مصدر ہو رہا ہے اس جماعت کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہمارے یہاں روحانی ترقی کے ذریعہ لوگ ولایت و قطبیت کے مناصب و
پر فائز ہو جاتے ہیں ——— ہاں! یہ ضرور ہے کہ جماعت اسلامی ایمان و اسلام کے تقاضوں کی داعی اور محافظ ہے، اس سے وابستگی
دینی شغف بڑھ ہی جاتا ہے، کم نہیں ہوتا! اس کے ارکان اور متفقین "منکر" سے نفرت اور "معروف" سے محبت کرتے ہیں! جماعت اسلامی
بھی دنیوی لالچ اور ذاتی منفعت کی بنا پر شریک نہیں ہوتے، بلکہ اس کے برخلاف جماعت میں شامل ہونے کے بعد دنیوی آرام و راحت
ن و مال کے لیے طرح طرح کے خطرے ہی پیدا ہو جاتے ہیں! ——— اس بنا پر عرض ہے کہ جو لوگ جماعت اسلامی کے درپے آزار
سفر آخرت کے لئے برا توشہ مہیا کر رہے ہیں! جماعت کی مخالفت سے دینی محاذ کمزور ہوتا ہے اس لئے جماعت مخالفت کی نہیں تعاون
ردی کی مستحق ہے!

اخوان المسلمون بھی حق شناس اور خیر پسند جماعت ہے جو لوگ "اخوان" کی مظلومیت پر طنز کرتے ہیں وہ قیامت کے دن حجاج اور
یزید جیسے ظالموں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو مظلومیت کی حمایت اور ظلم سے بیزاری کی توفیق و عزیمت عطا فرمائے!
اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہماری زندگی کا مقصود بن جائے۔ (آمین)

ماہر القادری
۲۷ نومبر ۱۹۶۷ء

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد ۔ کمر کا درد ۔ دانت کا درد
ایام ۔ انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے خطر علاج ہے

مُلّا واحدی

تاثرات

آج تھوڑے سے وہ واقعات پڑھئے جن کی وجہ سے ہم اپنے مطلق العنان بادشاہوں کو بھی بہ نظر محبت دیکھتے ہیں یہ واقعات مولانا سید مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمتہ کی کتاب "حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" میں بہت مفصل موجود ہیں۔ میں نے اپنی زبان میں اُن کا خلاصہ لیا ہے۔

۱- معتصم باللہ عباسی کے زمانے میں ایک بڑا ممتاز جنرل تھا۔ بغا اس کا نام تھا۔ اس کے بیٹے موسیٰ کا مقدمہ قاضی احمد بن بدیل کے سامنے پیش ہوا۔ موسیٰ کوئی جائداد خریدنی چاہتا تھا۔ جائداد کے مالکوں میں ایک یتیم بھی تھا۔ موسیٰ کے کارندے نے محسوس کیا کہ قاضی احمد یتیم کی طرف جھکتے ہیں۔ انہیں توجہ دلائی گئی کہ معاملہ موسیٰ بن بغا کا ہے۔ "انہ موسیٰ بن بغا" قاضی احمد نے بے دھڑک اور برجستہ جواب دیا "اعزک اللہ۔ انہ تبارک وتعالیٰ" اللہ تمہاری عزت برقرار رکھے، دوسرے رخ پر بھی نظر ڈالو، معاملہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہے۔ کارندہ راوی ہے کہ اس جواب سے میری گردن جھک گئی اور میں نے موسیٰ کو یہ جواب سنایا تو موسیٰ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

۲- قاضی عافیہ اودی ہارون الرشید کے زمانے میں بغداد کے قاضی تھے۔ کسی امیر نے ہارون سے اُن کی شکایت کی کہ فلاں مقدمے میں پاسداری کر رہے ہیں۔ ہارون نے بلا بھیجا۔ ابھی بلانے کا مقصد نہیں کھلا تھا کہ ہارون چھینکا اور دربار یرحمک اللہ، یرحمک اللہ کی دعاؤں سے گونج اٹھا۔ مگر قاضی عافیہ نے یرحمک اللہ نہیں کہا۔ اور ہارون نے وجہ پوچھی تو قاضی عافیہ نے جواب دیا یرحمک اللہ جب کہا جاتا ہے کہ چھینکنے والا الحمدللہ کہے۔ آپ نے الحمدللہ کب کہا تھا۔ جو میں یرحمک اللہ کہتا۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہی تھا۔ اگر چھینکنے والا الحمدللہ نہیں کہتا تھا تو حضور یرحمک اللہ نہیں کہا کرتے تھے۔ ہارون بولا آپ کے خلاف پاسداری کی شکایت کی گئی تھی۔ آپ میری رعایت نہیں کرتے تو اور کسی کی پاسداری کیا کریں گے۔ جائیے تشریف لے جائیے۔

۳- ایک مقدمے میں قاضی ابویوسفؒ نے ہارون کے وزیر کو مردود الشہادت قرار دے دیا اور فرمایا آپ کی شہادت قبول نہیں کی جاسکتی۔ وزیر نے ہارون سے شکایت کر دی۔ قاضی ابویوسف طلب کئے گئے اور پوچھا گیا کہ یہ آپ نے کیا کیا۔ قاضی ابویوسف نے جواب دیا — وزیر صاحب اپنے تئیں آپ کا عبد کہتے ہیں۔ میں ان کا فقرہ خود سن چکا ہوں۔ علاوہ ازیں وزیر صاحب جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے — ہارون دم سادھ گیا اور قاضی ابویوسف چلے گئے۔ تو وزیر سے کہا۔ مکان کے احاطے میں مسجد بنا لو اور وہاں جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو۔

۴- ایک بڑھے کسان نے خاص ہارون پر قاضی ابویوسفؒ کی عدالت میں دعویٰ کر دیا کہ فلاں باغ میرا ہے اور خلیفہ نے اسے ہتھیا لیا ہے۔ اتفاق سے دعویٰ اس دن دائر کیا گیا جس دن مقدمات ہارون کے روبرو پیش ہوتے تھے۔ (ہارون نے اس کام کے لئے بھی دن مقرر کر رکھا تھا) مقدمات دن کے دن پیش کر دئے جاتے تھے۔ قاضی ابویوسفؒ نے کہا اجازت ہو تو مدعی کو آواز دلواؤں۔ ہارون نے اجازت دے دی۔ بڑھا

آیا تو قاضی ابو یوسفؒ نے پوچھا، تم اپنے دعوے کا گواہ پیش کر سکتے ہو؟ بڈھے نے کہا، گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ امیر المومنین قسم کھا لیں یہ باغ اُن کا ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون سے کہا۔ آپ کو قسم کھانی چاہئے۔ ہارون نے قسم کھا کر کہا میرے والد نے یہ باغ مجھے عطا فرمایا بڈھا بولا یوں قسم کھالی جیسے ستو غٹ غٹ پی جاتے ہیں۔ ہارون کا چہرہ غصّے سے لال ہو گیا۔ لیکن یحییٰ بن خالد نے فوراً غصّے کو ٹھنڈا کیا ابو یوسفؒ دیکھتے ہو امیر المومنین کا انصاف؟ ابو یوسفؒ نے جواب دیا۔ انصاف کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ یحییٰ نے کہا ہارون ہی سے ایسے انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے۔ دونوں کی باتوں نے ہارون کے دل کا بوجھ اتار دیا اور غصّہ ٹھنڈا کر دیا۔

قاضی ابو یوسفؒ کہا کرتے تھے کہ مجھ سے کوتاہی رہ گئی، میں نے امیر المومنین کو کسان کے برابر کھڑا نہیں کیا۔ میں عرض کرتا تو امیر المومنین اسلامی مساوات کا قطعی لحاظ کرتے۔

۵۔ ہارون ہی کے زمانہ میں بغداد کے ایک قاضی حفص بن غیاث بھی تھے۔ زبیدہ (ملکہ ہارون) کی جاگیر کا گماشتہ اُن کی عدالت میں پیش ہوا۔ گماشتے کے خلاف کسی نے دعویٰ کیا تھا کہ تیس ہزار درہم اس کے ذمہ ہیں اور ادائیگی نہیں کرتا۔ دعویٰ سچا تھا۔ قاضی حفص نے کہا کہ رقم ادا کردو۔ ورنہ جیل جاؤ، گماشتہ جیل چلا گیا۔ ملکہ کو خبر لگی اُس نے داروغہ جیل کے پاس آدمی بھیج کر گماشتے کی رہائی کرالی۔ قاضی نے کہا کہ گماشتہ جیل واپس بھیجا جائے ورنہ میں استعفیٰ دیتا ہوں، جو آدمی رہائی کرانے گیا تھا وہ گھبرایا کہ امیر المومنین ملکہ سے تو کچھ کہیں گے میں مارا جاؤں گا۔ اُس نے ملکہ کے سامنے رونا شروع کیا کہ خدارا فی الحال قاضی حفص کا کہنا کر دیجئے پھر میں سمجھا بجھا کر رہائی دلا دوں گا۔ ملکہ نے گماشتے کو جیل واپس بھیج دیا، لیکن ہارون سے شکایت بھی کر دی۔ زبیدہ ہارون کی بڑی چہیتی ملکہ تھی ہارون نے قاضی حفص کو فرمان لکھا کہ گماشتے کے معاملہ میں سختی نہ برتیں۔ ادھر ہارون فرمان لکھوا رہا تھا اُدھر قاضی حفص کو خبر پہنچ گئی کہ ایسا فرمان آرہا ہے۔ قاضی حفص نے فوراً گماشتے کا مقدمہ لیا اور مقدمے کی تکمیل کر کے فیصلہ پر مہر لگا دی۔ ہارون کا قاصد مہر لگنے سے پہلے آگیا تھا مگر قاضی حفص نے کہا کام ہاتھ میں ہے وہ ختم کر لوں۔ قاصد بار بار توجہ دلاتا تھا کہ خلیفہ کا فرمان لایا ہوں اور قاضی حفص ٹال جاتے تھے۔

قاضیوں کا تقرر خلیفہ نہیں کرتا تھا، قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کرتے تھے، امام ابو یوسفؒ کو اتنا چڑھا دینے پر چوطرف چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن ہارون الرشید نے کہا "میں نے جو کچھ کیا ہے جان بوجھ کر کیا ہے۔ ابو یوسف کا دین آلودگیوں سے پاک ہے۔ جس باب میں ابو یوسف کو جانچا کامل پایا"۔

مسلمان بادشاہوں کی دلچسپی حکومت اور فتوحات تک محدود نہیں تھی۔ ذہنی سرگرمیوں پر بھی ان کی نظر رہتی تھی۔ اسلام سے پہلے عرب حروف شناس اِکّا دُکّا تھے۔ اسلام کے بعد مسلمان بادشاہوں کی توجہ سے وہاں علوم و فنون کے دریا بہہ گئے۔ مدارس بغداد، مدارس آگرہ، مدارس دہلی، مدارس لکھنؤ، مدارس جون پور، مدارس سہارنپور، مدارس احمد آباد (گجرات) مدارس بہار، مدارس مدراس، اور مدارس سندھ وغیرہ کو صفحہ تاریخ سے مٹایا جاسکتا ہے؟

تعلیم کے ساتھ تربیت کا الگ انتظام تھا۔ تعلیم کے لئے مدارس تھے، تربیت کے لئے خانقاہیں تھیں۔ مدارس میں علوم و فنون سکھائے جاتے تھے، خانقاہوں میں تہذیب اخلاق، تزکیہ نفس اور ترقی روحانی کا درس دیا جاتا تھا۔ موجودہ ہوسٹل خانقاہوں کا منہ چڑاتے ہیں

ایجاد و اختراع کی بھی مسلمان بادشاہوں نے سرپرستی کی۔ آلات ہندسہ، آلات جرثقیل، آلات ہیئت اور آلات کیمیا اور خدا معلوم کیا کیا چیزیں مسلمانوں نے مسلمان بادشاہوں کی حوصلہ افزائی سے بنا ڈالیں۔ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں امیر معاویہ نے بارہ سو جہازوں کا بیڑہ تیار کیا تھا جو اُس وقت دنیا کا عظیم ترین بیڑہ تھا۔

حکام اور عوام میں دلی تعاون ہو تو تمام کام آسانی سے چلتے رہتے ہیں۔ اسلامی حکومت میں حاکم باپ کی جگہ ہوتا ہے اور عوام ا

ب اولاد اپنی کمائی باپ کو دے دیتی ہے اور باپ اولاد کی پوری طرح کفالت کرتا ہے اولاد کمائی میں سے اپنے واسطے [illegible] بچائی بھی
ب کی اللہ، رسولؐ اور باپ اجازت دیتے ہیں۔ اور وہ بچائی ہوئی کمائی باپ اور بھائی بہنوں کی امانت سمجھی جاتی ہے۔ حضرت
، دورِ خلافت میں بعض حکام نے اپنا معیارِ زندگی اور رہن سہن بدل لیا تھا۔ اور اونچا کرلیا تھا۔ پھر وہ اونچا ہی ہوتا چلا گیا، ورنہ
۔ کے تو ایک سفیر حضرت معاذ بن جبلؓ نے دربارِ روم کا کرّوفر دیکھ کر یہ فرمایا تھا کہ "ہمارا خلیفہ ہم جیسا انسان ہوتا ہے اس میں اور دوسر
رق نہیں کیا جاتا۔ چوری کرے تو اُس کا ہاتھ کٹے گا۔ قتل کرے تو قصاص لیا جائے گا، ہمارا خلیفہ محلوں اور قلعوں میں چھپ کر نہیں بیٹھتا
تا۔ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول کا پیرو ہے۔ پیروی چھوڑ دے تو ہم اُسے مسندِ خلافت سے اُتار دیں"
رت ابوبکر صدیقؓ کے دسترخوان پر ایک دن حلوا آگیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اہلیہ سے پوچھا یہ حلوا کیسا ہے جواب ملا کہ ماہانہ رقم میں سے کفایت
، سے پیسے بچا لئے تھے، اُن پیسوں سے یہ حلوا پکا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے بقدر ان پیسوں کے ماہانہ رقم کم کردی۔
ضرت عمر فاروقؓ کی اہلیہ بیت المال کا مشک تول رہی تھیں۔ تول چکیں تو خوشبو لیے ہاتھ چادر پر مل لئے۔ حضرت عمرؓ نے سپاہ در نہیں
، جب تک اُسے دھو کر خوشبو کا اثر زائل نہ کر دیا۔
حضرت علی مرتضیٰؓ سے اصرار کیا گیا کہ "امیرالمومنین! ذرا تو بہتر مکان میں رہئیے" حضرت علیؓ نے منظور نہیں فرمایا۔ حضرت عثمان غنیؓ
، ان ہونے سے قبل کی دولت بہت تھی، لیکن مسندِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی اُنہوں نے سادہ معاشرت اختیار کرلی تھی اور بیت المال
ز حضرت عثمانؓ نے چھوا تک نہیں۔
خلفاء ایسے تھے تو ماتحت حکام کیسے ہوں گے۔ اس شان کے حکام کا مرتبہ اسلام میں دوسرے تمام طبقوں سے افضل مانا گیا ہے۔
عوام اور حکام میں کتنا تعاون تھا، اس کا اندازہ اُن فتوحات سے لگایا جاسکتا ہے جو ان حکام کے زمانے میں مسلمانوں نے حاصل
ن حکام کے زمانے کی مسلمان قوم وہ قوم تھی جس کا ثانی چشمِ فلک نے نہیں دیکھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے بعض حکام نے معیار
تھا، حضرت عثمانؓ نے نہیں بدلا تھا۔ یا بدلا تھا تو اپنا معیارِ زندگی نیچا کیا تھا، اونچا نہیں کیا تھا۔

ہ ابن قیمؒ
بب۔ شاہین لودھی

غنا اور مزامیر

ح المکام اور آلاتِ غنا سے موسیقی شیطان کے حیلے اور گھاتیں ہیں جن کی آڑ میں وہ کم عقل، کم علم، بے دین، جاہل اور مُبطلین
ہے۔ جن کے ذریعہ سے وہ قرآن کے لئے دلوں کے دروازے بند کرتا ہے یہ چیزیں فسق اور عصیان کا لازمہ ہیں پس موسیقی "شیطان کا
رحمٰن اور بندہ کے درمیان ایک دبیز پردہ! موسیقی آدمی کو بدکاری کی طرف لے جاتی ہے یہ ذریعہ ہے ہوس کاروں کے جذبات سفلی کو بھڑکانے
ذریعہ وہ اپنی مجبوریوں سے خواہشات پوری کرتے ہیں، شیطان نے موسیقی کو ان کے لئے دلفریب بنا دیا ہے اس پھندے میں پھنس کر وہ
سر غافل ہو جاتے ہیں۔

ئمہ هدیٰ اور علماء اسلام زمین کے ہر کونے سے پکار پکار کر ایسے لوگوں کے راستے سے منع کرتے رہے ہیں۔ ابوبکر الطرطوشی اپنی کتاب (جو
ہم سماع پر لکھی ہے) کے خطبے میں لکھتے ہیں: "سب تعریف کا سزاوار اللہ رب العالمین ہی ہے۔ انجام کار متقین لوگوں کے لئے ہے، ظالموں
پر کوئی زیادتی نہیں ہے، ہماری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم پر راہ حق واضح کر دے تاکہ ہم اس کی اطاعت کر سکیں اور باطل کے راستے کا
واضح فرما دے تاکہ ہم اس سے بچ سکیں۔ پچھلے لوگوں سے جب کبھی معصیت کا ارتکاب ہو جاتا تھا تو اسے چھپاتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ سے
استغفار کرتے تھے، پھر جہالت زیادہ ہو گئی اور علم اٹھ گیا تو لوگوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ وہ کھلے بندوں گناہ کرتے ہیں پھر اس گناہ میں
آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے سننے میں آیا ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی اللہ تعالیٰ انہیں نیکی کی توفیق دے جن کو شیطان نے
ہے اور ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ لہو اور غناء کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں، وہ طبلے اور بانسری سنتے ہیں اور ان کا یہ اعتقاد
، یہ غناء تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے اس کا وہ کھلے بندوں پرچار کرتے ہیں اور اہل ایمان فقہا اسلام، علماء اور حاملانِ دین کی مخالفت

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولیٰ ونصلہ جھنم
ت مصیرًا

"پس میں چاہتا ہوں قرآن اور سنت کی دلیلوں سے حق واضح کر دوں اور اہل باطل کے شبہات دور کر دوں میں علماء کے اقوال سے شروع
۔ جن کے فتاویٰ تمام روئے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں تاکہ یہ باطل گروہ جان لے کہ انہوں نے اپنی مذمومہ بدعت میں علماء اسلام کی مخالفت
۔ توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ موسیقی اور اس کے سننے سے منع فرماتے ہیں۔ اور انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر کوئی شخص لونڈی خریدے اور اس کے بعد اسے پتہ نہ چلے کہ یہ گانے والی ہے تو وہ اس لونڈی کو اس عیب کی وجہ سے واپس کر سکتا ہے۔ امام مالک سے اہل مدینہ کے غنا میں رخصت کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا "ہمارے ہاں یہ فساق کا کام ہے"

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمتہ بھی اُسے بُرا خیال کرتے ہیں اور اُسے گناہوں میں شمار کرتے ہیں یہی مذہب اہل کوفہ کا ہے یہی رائے سفیان ثوری، حماد، ابراہیم النخعی اور شعبی رحمہم اللہ کی ہے ان میں اس مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں ہے اہل بصرہ میں بھی اس کے ممنوع ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں (حافظ ابن قیم) " امام ابوحنیفہؒ کا مذہب اس مسئلہ میں تمام مذاہب سے سخت ہے اور ان کا قول تمام اقوال سے شدید ہے ان کے شاگردوں نے تمام آلات لہو کے حرام ہونے کی تصریح کی ہے۔ جیسے دف مزامیر وغیرہ یہاں تک کہ لکڑی پہ لکڑی مار کر موسیقی کی آواز پیدا کرنا بھی حرام ہے۔ انہوں نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ یہ معصیت اور فسق ہے ایسے لوگوں کی شہادت مردود ہے اور اس سے سخت تر قول وہ ہے کہ "سماع فسق ہے اور اس سے لذت حاصل کرنا کفر ہے" یہ ان کے الفاظ ہیں اور اس کی دلیل میں وہ ایک غیر مرفوع حدیث بھی لاتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ جب کوئی ایسی جگہ سے گذر رہا ہو، جہاں گانا بجانا ہو رہا ہو یا اس کے پڑوس میں یہ کام ہو رہا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس گانے کو نہ سننے کی جدوجہد کرے قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں جس گھر سے گانے بجانے کی آواز آرہی ہو تو کوئی حرج نہیں کہ اگر کوئی بغیر اجازت اس گھر میں داخل ہو جائے کیوں کہ نہی عن المنکر ایک فریضہ ہے اگر ایسی حالت میں داخلہ جائز نہ ہو تو فرض ادا نہ ہو سکے گا۔

ائمہ احناف کا قول ہے کہ امام المسلمین کو چاہیئے کہ جس کی گھر سے آلات موسیقی کی آواز سُنے تو وہ اہل خانہ کو منع کرے اگر وہ اصرار کرے تو وہ انہیں قید کر دے یا کوڑوں کی سزا دے اور اگر چاہے (یعنی مناسب سمجھے) تو اس کو گھر سے بے دخل کر سکتا ہے"

" امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب " ادب القضاء " میں فرماتے ہیں " غنا بُری چیز ہے یہ باطل سے مشابہ ہے جو کوئی اس میں مشغول ہو جائے وہ احمق ہے اور اس کی شہادت مردود ہے"۔ اصحاب شافعی نے جو امام شافعی کے مسلک سے اچھی طرح واقف ہیں۔ غنا کے حرام ہونے کی تصریح کی ہے اور امام موصوف سے غنا کی حلت کی نسبت کا انکار کیا ہے۔ جیسے قاضی ابوالطیب الطبری، شیخ ابو سحاق اور ابن صباغ وغیرہ، شیخ ابواسحاق " التنبیہ " میں فرماتے ہیں۔ غنا، گانے بجانے کے آلات اور شراب کے بے جانے پر اجرت لینا جائز نہیں ہے" اور اس میں انہوں نے کوئی اختلاف نقل نہیں کیا ہے" المہذب میں فرماتے ہیں" حرام چیزوں پر منافع اور اجرت جائز نہیں اور نہ ان کے عوض کچھ لینا جائز ہے، جیسے مردار اور خون وغیرہ۔

شیخ ابواسحاق کے کلام سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہوتی ہے۔

۱۔ غنا سے نفع کمانا حرام ہے۔

۲۔ اس پر اجرت حرام ہے۔

۳۔ اس کے ذریعہ سے مال کھانا باطل ہے جیسے مردار اور خون کے عوض مال کھانا۔

۴۔ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ "مغنی" کو عطیہ دے ایسا کرنا حرام ہے۔

۵۔ بانسری وغیرہ بجانا حرام ہے حالانکہ بانسری بجانا تمام آلات لہو سے ہلکا ہے اسے بھی حرام قرار دیا جا رہا ہے۔ اور اس کے متعلق کیا کہا جائے جو حکم میں زیادہ سخت ہیں جیسے سارنگی، بین، طنبورہ وغیرہ جسے تھوڑا سا بھی علم سے مس ہے وہ ان کی حرمت میں توقف نہیں کریگا۔ ہلکی ہلکی بات جو اس کے متعلق کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ "گانا بجانا فساق اور شرابیوں کا شعار ہے"

اور اسی طرح ابوزکریا نووی کہتے ہیں کہ "آلات غنا جیسے طنبورہ، سارنگی، چنگ اسی اور قسم کے تمام آلات سے گانا شراب پینے والا

ام قسم کے معازف ۔ سارنگیاں وغیرہ ان کا استعمال کرنا اور سننا حرام ہے، رہی دف بانسری وغیرہ میں اختلاف ہے لیکن امام بغوی
ہے کہ یہ حرام ہے۔
سری کی حرمت میں ابوالقاسم الدولعی نے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔
ث ابوعمرو بن الصلاح اپنے فتاوی میں ایسے سماع (جس میں دف بانسری اور گانا شامل ہو) کی حرمت پر اجماع نقل کرتے
"سماع کی حیثیت یہ ہے گانا بانسری اور دف اکٹھے ہو جائیں تو تمام ائمہ مذاہب کے نزدیک اس کا سننا حرام ہے اور ایک معتبر عالم سے بھی
ثابت نہیں اور بعض اصحاب شافعی سے اس میں اختلاف منقول ہے تو وہ بانسری اور دف کے علیحدہ علیحدہ بجانے میں ہے اور ناواقف متامل
خلاف ایسے سماع میں ہے جو آلات غنا کے ساتھ ہو حالانکہ یہ وہم ہے۔ اس کے حرام ہونے میں دلائل عقلی و شرعی ہانکے پکارے کہہ رہی ہیں
ف تو ہر قسم کا اختلاف ضروری نہیں کہ وہ قابل اعتماد ہو اور جو کوئی ایسی چیزوں کا تتبع کرے جن میں علماء کے درمیان اختلاف واقع
ان کے اقوال سے رخصتیں ڈھونڈے تو وہ زندیق اور مکار اور بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ سماع اطاعت اور تقرب کا ذریعہ ہے مسلمانوں کے
لاف ہے جو کوئی ان کے اجماع کے خلاف عمل کرے تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے - من یشاقق الرسول من بعد ما تبین
ہدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا۔"
اور انہوں (ابوبکر الطرطوشی) نے ایسے دونوں گروہوں کے بارے میں لمبی بحث کی ہے جو اسلام میں فتنہ ہیں۔
۱- اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھیرانے والے۔
۲- اور اللہ تعالیٰ سے دور پھینکنے والے کاموں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب ڈھونڈنے والے۔
اور ہے امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب میں سے متقدمین اور وہ جو مذہب شافعی کو اچھی طرح جانتے ہیں وہ تو مسئلہ میں تمام لوگوں سے سخت ہیں
سے تواتر کے ساتھ مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں بغداد میں ایک ایسی چیز چھوڑ کر آرہا ہوں جسے زنادقہ نے ایجاد کیا ہے اسے وہ "تغبیر"
اس کے ساتھ وہ لوگوں کو قرآن سے روکتے ہیں۔ اور جب تغبیر میں ان کا یہ حال ہے اور اسے قرآن سے روکنے کا سبب بتاتے ہیں حالانکہ تغبیر شعر
جس سے دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو، یہ اشعار، گانے والا گایا کرتا تھا اور کوئی دوسرا لکڑی سے موسیقی کی آواز پیدا کرتا تھا اور تغبیر کو انہوں نے
ب شمار کیا ہے تو ان آلات لہو کے متعلق ان کی کیا رائے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فتنہ میں پڑے ہوئے عالم اور جاہل عابد سے محفوظ رکھے۔
امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے بارے میں یہ ہے۔
امام احمد کے لڑکے عبداللہ فرماتے ہیں "میں نے غنا کے متعلق اپنے باپ سے پوچھا تو انہوں نے جواب میں فرمایا: غنا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے
پسند نہیں" پھر انہوں نے امام مالک کے قول کا ذکر کیا کہ "گانا بجانا ہمارے ہاں فساق کا کام ہے" عبداللہ بن احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ میں
باپ سے یحیی القطانؒ کا قول سنا ہے" کہ اگر کوئی شخص نبیذ کے معاملہ میں اہل کوفہ کے قول کو اختیار کرے اور سماع کے مسئلہ میں اہل مدینہ کے قول پر
ے اور متعہ میں اہل مکہ کو ترجیح دے تو وہ فاسق ہے" امام احمد سلیمان التیمی سے نقل کرتے ہیں" اگر تو ہر ایک عالم کی رخصت اور لغزش کو
رتا ہے تو تجھ میں تمام کا تمام شر جمع ہو جائے گا" آلات لہو جیسے طنبورہ وغیرہ جبکہ وہ ظاہر ہوں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منصوص ہے
کا توڑنا امکان میں ہے تو اس کو توڑ دیا جائے ایک دوسری روایت میں ہے" اگرچہ وہ کپڑے وغیرہ میں چھپا ہوا ہو اور اس کا علم ہو جائے،
بڑے میں طنبورہ وغیرہ ہے تو بھی اس کو توڑ دیا جائے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ سے منقول ہے کہ کچھ یتیموں کو گانے والی لونڈی وراثت
انہوں نے اسے بیچنا چاہا تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اس کو گانا نہ جاننے والی لونڈی کے طور پر بیچا جائے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اگر گانے والی لونڈی
کے طور پر بیچی گئی تو اس کے بیس ہزار کے لگ بھگ مل جائیں گے ورنہ دو ہزار بھی نہ ملیں گے، مگر امام نے وہی بات دہرائی۔ اگر غنا سے نفع حاصل کرنا

جائز ہوتا تو امام احمدؒ یتیموں کے مال کو ضائع نہ ہونے دیتے۔

اجنبیہ سے گانا سننا تو تمام محرمات سے شر یدہے اور دین کے لئے سب سے زیادہ مفسد! امام شافعی فرماتے ہیں "جس شخص کے پاس گانے والی لونڈی ہو اور لوگ اس کا گانا سننے آتے ہوں تو وہ احمق ہے اور اس کی شہادت مردود ہے" بلکہ ان کا سخت تر قول یہ ہے کہ "یہ فعل دیاثت کرنے والا دیوث ہے۔ قاضی ابو الطیب نے اس کی توجیہ کی ہے کہ انہوں نے ایسے شخص کو اس لئے احمق قرار دیا ہے کیونکہ لوگوں کو باطل کی طرف اور جو لوگوں کو باطل کی طرف بلائے وہ احمق اور فاسق ہے" امام شافعیؒ تو تغبیر کو بھی بُرا جانتے تھے، اور اس کے متعلق فرماتے تھے کہ "اسے زنادقہ نے ایجاد کیا ہے تاکہ لوگوں کو قرآن سے باز رکھ سکیں" فرمایا "سارنگی، طنبورہ وغیرہ اور تمام ملاہی حرام ہیں اور انہیں سننے والا فاسق ہے تمام امت کی پیروی زیادہ بہتر ہے ان شخصوں کے اتباع سے جو دونوں کے دونوں ملعون ہیں"

ان دو شخصوں سے ان کی مراد ابراہیم بن سعد اور عبید اللہ بن حسن ہے کیونکہ امام شافعی نے فرمایا ہے۔ غنا کے حرام ہونے میں ان دو شخصوں کے سوا کسی نے اختلاف نہیں کیا، ایک ابراہیم جس سے الساجی نے روایت کی ہے کہ "ابراہیم کے نزدیک غنا میں کوئی برائی نہیں" اور دوسرا عبید اللہ بن حسن العنبری جو بصرہ کا قاضی تھا وہ بھی مطعون ہے۔ ابوبکر الطرطوشی کہتے ہیں "یہ گروہ تمام امت مسلمہ کا مخالف ہے اس گروہ نے دین اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت تصور کر لیا ہے، مزاروں وغیرہ میں اس کا ارتکاب کرتے ہیں اس لئے کا امت کی رائے سے کوئی تعلق نہیں"

اس سماع شیطانی کے شریعت میں چند نام آئے ہیں، لہو الحدیث، لغو باطل، زور، مکاء وتصدیہ زنا کی طرف لے جانے والا، شیطان دل میں نفاق پیدا کرنے والا، آواز احمق اور فجور کی طرف بلانے والا، شیطان کی آواز۔

اسماءہ دلّت علی اوصافہ   تباً لذی الاسماء والاوصاف

(اس کے نام ہی اس کے اوصاف پر دلالت کے لئے کافی ہیں، ہلاکت ہے ایسے ناموں اور اوصاف والے کے لئے)

لھو الحدیث اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذھا ھزواً اولٰئک لھم عذابٌ مھین واذا تتلیٰ علیہ ایاتنا ولّٰی مستکبراً کان لم یسمعہا کان فی اُذنیہ وقراً۔ فبشرہ بعذاب الیم۔

واحدی وغیرہ نے کہا ہے کہ اکابر مفسرین نے یہاں لہو الحدیث سے مراد غنا لی ہے، یہی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مجاہد اور عکرمہ بیان کرتے ہیں۔ ثور بن ابی فاختہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ آپؓ نے (ومن الناس من یشتری لھو الحدیث) کی تفسیر میں فرمایا: "یہ اس شخص کے متعلق ہے جو لونڈی خریدتا ہے جو اس کا دل دن رات گانے سے بہلاتی ہے" ابن نجیح مجاہد سے نقل کیا ہے "لہو الحدیث سے مراد مالی کثیر دے کر گانے والی لونڈی خریدنا ہے اور پھر اس سے گانا سننا یا اسی قسم کی باطل چیز" یہ مکحولؒ کا ہے۔ اسی قول کو ابو اسحاق اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ آیا ہے اکثر یہی ہے کہ لہو الحدیث سے مراد گانا ہے۔ واحدی نے کہا ہے کہ اکثر اہل معانی کا کہنا ہے "کہ ہر وہ شخص جو لہو و غنا اور مزامیر کو قرآن پر ترجیح دیتا ہے اس میں داخل ہے" واحدی کا کہ یہ آیت تحریم غنا پر دلالت کرتی ہے۔

پھر اس نے امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ایسا شخص جو اعلانیہ غنا سے شغل کرے اس کی شہادت مردود ہے۔

اور میں گانے والی لونڈیاں۔ ان کا گانا سننے پر تو اور بھی زیادہ سختی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سختی سے وعید فرمائی، فرمایا:

من استمع الیٰ قینۃٍ صُبَّ فی اذنیہ الآنک یوم القیامۃِ۔ جو کوئی گانے والی کنیز سے گانا سنتا ہے تو قیامت کے

پسیسہ ڈالا جائے گا۔

حدیث کی تفسیر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً وارد ہوا ہے۔

عوا القینات ولا تشتروھن لا تعلمو ... گانے والی کنیزیں نہ فروخت کرو اور نہ انہیں خریدو اور نہ

، ولا خیر فی تجارۃ فیھن ثمنھن حرام ... لونڈیوں کو گانا سکھایا جائے ان کی تجارت میں کوئی بھلائی نہیں اور ان کی قیمت حرام ہے۔

صھباء کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے تین بار فرمایا

ں کے بغیر کوئی الٰہ نہیں لہو الحدیث سے مراد گانا بجانا ہے"۔

لٰہ بن عمرؓ سے بھی یہی ثابت ہے۔

کم اپنی کتاب مستدرک میں فرماتے ہیں " علم تفسیر کے طالب کو جان لینا چاہئے کہ جس صحابی کی موجودگی میں وحی کی تنزیل ہوتی رہی ہے

ہ تفسیر کو شیخین (امام بخاری ومسلمؒ) حدیث مسند قرار دیتے ہیں اور اسی کتاب میں وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ حکم

ں ہے۔

حاکم کا یہ قول محل نظر ہے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کی تفسیر کو ان کے بعد آنے والوں کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ

ن میں سب سے زیادہ سمجھنے والے ہیں۔ یہی تو ہیں جن میں قرآن کا نزول ہوا۔ یہی سب سے پہلے قرآن کے مخاطب ہیں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ

سیر کا علماً وعملاً مشاہدہ کیا ہے۔ یہی حقیقت میں فصحاء عرب ہیں۔ پس ان کی تفسیر سے گریز نہیں کیا جا سکتا۔

واللغو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ والذین لا یشھدون الزور واذا مروا باللغو مروا کراماً۔ اس آیت کی تفسیر میں محمد بن الحنفیہ نے فرمایا ہے " اس سے مراد گانا بجانا ہے"۔ یہی تفسیر مجاہد سے نقل کرتے ہیں۔ لغو کے معنی ہیں ہر وہ

ئی ہو اور پھینک دی گئی ہو۔ یعنی وہ باطل کی مجالس میں شرکت نہیں کرتے اور جب کبھی ان کا گزر ایسی چیز سے ہوتا ہے قولاً یا فعلاً

سے گذر جاتے ہیں اور اس کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ سلف تفسیر کرتے ہیں کہ اس میں مشرکین وغیرہ کی عیدیں اور اس نوع کی تمام

ں داخل ہیں۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا لہو پہ سے گذر ہوا تو آپ نے اس سے منہ پھیر لیا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ن اصبح ابن مسعود لکریماً اور اسی قسم کے لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے یوں مدح فرمائی ہے۔

واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنہ وقالوا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم

طل اور عمل باطل کو کہا جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے اللہ کا قول ہے " لا یشھدون الزور " یہ نہیں کہا کہ " لا یشھدون بالزور "

ن بمعنی حاضر ہونے کے ہیں پس جب اللہ تعالیٰ نے مومنین کے مجالس زور کے دیکھنے کو ترک کرنے پر ان کی مدح فرمائی ہے تو پھر ان

جن کا فعل اور تکلم ہی باطل ہے اور گانا بجانا تو سب سے بڑا باطل ہے۔

طل حق کی ضد میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا مطلب ہے معدوم۔ جس کا کوئی وجود نہیں یا اگر موجود ہے تو اس کی مضرت منفعت پر

لب ہے۔ جس طرح کہا جائے کہ اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے یا جادو باطل ہے یا کفر باطل ہے۔ وغیرہ۔ جیسے قرآن مجید میں آیا ہے۔

لحق وزھق الباطل۔ ان الباطل کان زھوقاً۔ پس باطل یا تو معدوم ہے جس کا کوئی وجود نہیں اور اگر موجود ہے تو اس

یں۔ پس کفر عصیان فسق، جادو، گانا بجانا اور اس کا سننا دوسری نوع سے ہیں۔ ابن وہب نے کہا ہے عبید اللہؓ نے حضرت

سے پوچھا " غنا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے تو قاسم بن محمدؒ (یہ فقہائے سبعہ میں سے ہیں) نے فرمایا یہ باطل ہے عرض کیا یہ تو میں

جانتا ہے کہ یہ باطل ہے یا حق تو اس کے بغیر اس کے متعلق پوچھنا ہوں" حضرت قاسم نے فرمایا " کیا تو باطل کے متعلق جانتا ہے کہ کہاں ہوگا" پوچھا " اس کا ٹھکانہ آگ ہے " عرض کیا " یہی تو میں پوچھنا تھا "

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک شخص نے سوال کیا " آپ غنا کے متعلق کیا کہتے ہیں یہ حلال ہے یا حرام " آپ نے فرمایا " میں کسی چیز کو حرام نہیں کہتا سوائے اس کے جو کتاب اللہ میں حرام ہے " عرض کیا " کیا یہ حلال ہے " آپ نے فرمایا " نہیں اسے حلال کہتا ہوں " پھر اس سے فرمایا " کیا تو حق اور باطل کے متعلق کچھ جانتا ہے جبکہ وہ دونوں قیامت کے دن آئیں گے۔ تو غنا کا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔ اس شخص نے عرض کیا " تو باطل کے ہمراہ ہوگا " تو اس سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا " تو اب جا تو نے خود ہی فتویٰ دیدیا ہے "

یہ جواب ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا اس غنا کے بارے میں جو بدوؤں میں مروج تھا جس میں شراب، زنا، لواطت وغیرہ کی، نہیں تھی اور نہ اجنبی عورتوں کے حسن کی تعریف اور نہ اس میں چنگ و رباب اور آلات طرب کی آوازیں شامل تھیں۔ اگر وہ موجودہ زمانے (ابن قیم کے زمانہ) کا گانا بجانا اور یہ محفلیں دیکھتے تو اس میں ان کا قول اور بھی سخت ہوتا۔ بلاشبہ غنا کی مضرت اور اس کا فتنہ شراب کے فتنے زیادہ ہے۔

مکاء اور تصدیہ

رہا اس کا نام مکاء اور تصدیہ (یعنی سیٹی بجانا اور تالی پیٹنا) تو اس کے بارے میں رب العزت کا ارشاد وما كان صلاتهم عند البيت الا مكاءً وتصدية۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عطیہ، مجاہد، ضحاک، حسن بصری اور قتادہ ایسے بزرگوں کا قول ہے کہ المکاء سے مراد سیٹی ہے اور تصدیہ سے مراد تالی بجانا ہے اور اہل لغت کا بھی یہی قول ہے، المکاء مختلف آوازوں کے لئے آیا ہے، مثلاً بلبلانا، چیخنا، کتے کا بھونکنا، بکریوں کا ممنانا اور گانا بجانا، تصدیہ جو ہے تو لغت میں اس سے مراد تالی پیٹنا ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ان کا یہی عیب بیان کرتے ہوئے ان کی ہجو میں کہا ہے۔

اذا قام الملئكة انبعثتم   صلاتكم التصدى والمكاء

بیشک یہ تالیاں پیٹنے والے بانسریوں اور مزامیر سے شغل کرنے والے ان لوگوں سے مشابہ ہیں جن کی مذمت قرآن نے بیان کی اگرچہ یہ مجرد تشابہ ہی ہے۔ جتنی ان کے ساتھ مشابہت ہوگی اتنی ہی مذمت کے حقدار ہیں۔

یزید بن ولید نے کہا ہے " اے بنی امیہ گانے بجانے سے بچو کیونکہ یہ حیا ختم کرتا ہے، شہوت زیادہ کرتا ہے۔ پاکیزگی کو ڈھا دیتا ہے۔ یہ شراب کا نائب ہے اور وہی کام کرتا ہے جو کام نشہ کرتا ہے اگر تم اس سے پرہیز نہیں کرتے تو کم از کم اپنی عورتوں کو اس سے بچائے رکھو کیونکہ یہ زنا کی دعوت دیتا ہے "

اسے سب جانتے ہیں کہ جب عورت کسی مرد کی طرف راغب نہ ہوتی ہو تو وہ گانے کی آواز اس تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کے دل میں نرمی آجائے کیونکہ عورت میں آواز کے معاملہ میں بہت زیادہ انفعالیت ہے اور اگر آواز گانے کی ہو تو اس کی انفعالیت دو درجہ بڑھ جاتی ہے ایک تو آواز کے اتار اور چڑھاؤ کی وجہ سے اور دوسری اس گانے کے معانی کی وجہ سے۔

اور جب گانے میں دف اور بانسریاں، رقص اور ناز و ادا بھی شامل ہو جائے تو یہی گانا ہے جس سے عورت بے قابو ہو جاتی ہے۔

خدا کی قسم کتنی ہی شریف عورتیں ہیں جو گانے کی وجہ سے بدکاری پر اتر آئیں۔ کتنے ہی شریف آدمی ہیں جو اس وجہ سے لڑکے اور لڑکیوں کے غلام بن گئے۔ کتنے ہی غیور ہیں جو موسیقی کی مہربانی سے بے غیرتی میں جانوروں سے بدتر ہو گئے۔ کتنے ہی اہل ثروت ہیں جو اس کی نوازش سے کوڑی کوڑی کے لئے محتاج ہو گئے اور کتنے ہی پاکباز ہیں جو اس وجہ سے فتنوں میں مبتلا ہو گئے۔

لنفاق — حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "غنا دل میں نفاق ایسے پیدا کرتا ہے جیسے پانی کھیتی اگاتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

نا ینبت النفاق فی القلب کما ینبت ساء البقل — غنا دل میں ایسے نفاق پیدا کرتا ہے جیسے پانی سبزی اگاتا ہے۔

بت یہ ہے کہ یہ تدبر قرآن اور اس کے فہم سے روکتا ہے اور غفلت میں رکھتا ہے۔ قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے سے منع کرتا ہے اور غناء اپنے تضاد کی وجہ سے کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتے۔ قرآن خواہشات کی پیروی سے منع کرتا ہے اور عفت کا حکم دیتا ہوات اور بدکاری کے اسباب سے مجتنب رہنے کی تلقین کرتا ہے، شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے روکتا ہے۔ موسیقی ان تمام ف بلاتی ہے جن سے قرآن روکتا ہے اور ان کو خوشنما کرکے دکھاتی ہے شہوات کی ترغیب دیتی ہے اور ہر قبیح چیز کی طرف بلاتی ہے یقی دو جڑواں بہنیں ہیں۔

رسب سے زیادہ یہ کہ جس قوم میں تصویروں سے عشق بڑھ جاتا ہے اُسے فواحش اچھی نظر آتی ہیں، موسیقی سے لگاؤ کی وجہ سے قرآن دلوں پر ہے۔ یہ نفاق کی اساس ہے کہ منافق کے ظاہر اور باطن باہم متخالف ہوتے ہیں اور موسیقی سے شغف رکھنے والے کے اندر دو خاصیتوں یت ضرور ہوتی ہے۔

۔ اگر وہ علی الاعلان موسیقی کا دلدادہ ہے تو وہ فاجر ہے۔
۔ اور اگر وہ چھپاتا ہے تو وہ منافق ہے کیونکہ وہ علی الاعلان تو اللہ تعالیٰ اور آخرت کی طرف رغبت ظاہر کرتا ہے مگر اس کا دل شہوات ہے۔ آلات غنا اور معازف کی آوازیں اسے محبوب ہیں۔ حالانکہ یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول کو بُری لگتی ہیں۔ اس لئے بھی کہ ایمان قول م ہے۔ قول بالحق اور عمل بالطاعۃ، یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تلاوت قرآن سے پیدا ہوتا ہے، نفاق قول باطل ہے اور بغاوت کا دعیہ ہے جب گانا ہے، قلت ذکر، نماز سے جی چرانا اور اس سے بھاگنا منافق کی صفات ہیں اور موسیقی سے شغف رکھنے والے بہت کم ہیں جن میں یں ہوں گی۔

یک دفعہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے لڑکے کے استاد کو لکھا "سب سے پہلے اسے ملاہی سے نفرت سکھائیے۔ جن کی ابتدا شیطان سے کا انجام اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے۔ مجھے ثقات اہل علم سے یہ بات پہنچی ہے کہ معازف اور گانے کا سننا اور اس پر فریفتگی قلب میں اس طرح رتا ہے جس طرح پانی سے گھاس پیدا ہوتی ہے" پس غنا دل کو خراب کر دیتا ہے اور بیمار دل نفاق کی آماجگاہ ہے۔
غنا، کا یہ نام تابعین سے ماثور ہے، حضرت ابوامامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں

الشیطان حضور نے فرمایا :—

ان ابلیس لما انزل الی الارض قال: یا رب انزلتنی الی الارض وجعلتنی رجیماً فاجعل لی بیتاً، قال الحمام، قال: فاجعل لی مجلساً قال الاسواق ومجامع الطرقات قال: فاجعل لی طعاماً قال: کل مالم یذکر اسم اللہ علیہ قال فاجعل لی شراباً قال کل

جب ابلیس زمین پر اُتارا گیا تو اس نے کہا اے میرے اللہ تو نے مجھے زمین پر تو بھیج دیا اور میں تیری درگاہ سے دھتکارا گیا ہوں پس میرے لئے کوئی گھر بنا دے فرمایا تیرا گھر حمام ہے شیطان نے کہا میرے لئے مجلس بھی مہیا کردے فرمایا تیری مجلس بازار اور راستوں کے ملنے کی جگہ ہے شیطان بولا میرے لئے کھانے کا انتظام بھی کردے،

جو سے تیار ہوتی ہے) کو حرام ٹھیرا دیا ہے اور ہر نشہ والی چیز حرام ہے۔

۶۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اسی حدیث کو دوسرے الفاظ میں بھی روایت کیا ہے۔

ان اللّٰہ حرم علیٰ امتی الخمر والمیسر والمرفرۃ والکوبۃ والقنین۔

بیشک اللہ تعالیٰ نے میری امت پر شراب قمار مرز (گیہوں کی شراب) کوبہ اور گانا بجانا حرام کر دیا ہے۔

۷۔ امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

۸۔ حضرت ابوہریرہؓ سے امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اذا اتخذ الفئ دولاً، والامانۃ مغنماً و الزکاۃ مغرماً۔ وتعلم العلم لغیر الدین۔ واطاع الرجل امرأتہ وعق امہ وادنی صدیقہ واقصیٰ اباہ وظھرت الاصوات فی المساجد وساد القبیلۃ فاسقھم وکان زعیم القوم ارذلھم واکرم الرجل مخافۃ شرہ وظھرت القینات والمعازف وشربت الخمر و لعن آخر ھذہ الامۃ اولھا فلیرتقبوا عند ذلک ریحاً حمراء وزلزلۃ وخسفاً ومسخاً وقذفاً وآیات تتابع کنظام بال قطع سلکہ فتتابع۔

جب مال غنے کو (فانی) دولت سمجھ لیا جائے گا اور امانتوں کو غنیمت بنا لیا جائے گا۔ زکوٰۃ کو چٹی سمجھ لیا جائے گا اور جب علم دنیاوی فوائد کے لئے حاصل کیا جائے گا جب مرد عورت کا مطیع ہو جائے گا اور ماں کی نافرمانی کرے گا دوست کی تکریم کی جائے گی مگر باپ کو دھتکارا جائیگا۔ جب مساجد میں شور و غوغا ہوگا۔ فاسق و فاجر قبیلہ کا سردار بنے گا۔ جب بذیل ترین شخص قوم کے رہبر ہونگے جب کسی شخص کی عزت اس کے شر کے ڈر سے کی جائے گی۔ جب گانے والیوں اور معازف کا دور دورہ ہوگا جب شراب عام طور پر پی جائے گی اور اس امت کے اخلاف اسلاف پر لعنت کریں گے۔ تب وہ سرخ آندھی، زلزلوں زمین کے دھنسنے، چہروں کے مسخ ہونے اور پتھر برسنے کا انتظار کریں اور یہ نشانیاں اس طرح پے در پے ظاہر ہونگی جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ جاتی ہے اور موتی پے در پے گرتے ہیں۔

۹۔ تقریباً اسی مضمون کی ایک حدیث ابی الدنیا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

۱۰۔ ابی الدنیا نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یمسخ قوم من ھذہ الامۃ فی آخر الزمان قردۃ وخنازیر، قالوا: یا رسول اللّٰہ الیس یشھدون ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمداً رسول اللّٰہ۔ قال بلیٰ ویصومون و یصلون ویحجون۔ قیل فما بالھم قال:

آخری زمانے میں اس امت میں سے لوگوں کو مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنا دیا جائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا" یا رسول اللہ کیا وہ اس چیز کی گواہی نہیں دیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا " وہ گواہی دیں گے بلکہ وہ روزے رکھیں گے نمازوں کا اہتمام

واتخذوا المعازف والدفوف والقينات فباتوا على شربهم ولهوهم فاصبحوا وقد مسخوا قردة وخنازير۔

کریں گے اور سج کریں گے" عرض کیا - تو کیا وجہ ہوگی؟ فرمایا، وہ آلات غنا اور گانے والیوں سے دل بہلائیں گے ان کی راتیں شراب اور لہو میں گذریں گی۔ جب صبح ہوگی تو وہ دیکھیں گے کہ ان کے چہرے مسخ ہوگئے ہیں اور وہ بندر اور خنازیر بنا دئے گئے ہیں۔

۱۱۔ حضرت ابوامامہ الباہلیؓ سے امام احمد اور امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یبیتُ طائفة من امتی علی اکل وشرب ولهو ولعب۔ ثم یصبحون قردة وخنازیر۔ ویبعث علی احیاء من احیاءهم ریح فینسفهم کما نسف من کان قبلکم باستحلالهم الخمر وضربهم بالدفوف واتخاذهم القینات۔

میری امت میں سے ایک گروہ شراب وکباب اور لہو ولعب میں راتیں گذارے گا ان پر صبح اس حالت میں آئے گی کہ وہ بندر اور خنازیر بنا دئے گئے ہوں گے اور باقی جو زندہ بچ جائیں گے ان پر ہوا بھیجی جائے گی جو انہیں اڑا کرلے جائے گی جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو ان کے شراب حلال کرلینے دف بجانے اور گانے والیوں سے گانا سننے کی وجہ سے ہوا اڑا کرلے گئی تھی۔

۱۲۔ مسند امام احمد میں حضرت ابوامامہ الباہلیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان الله بعثنی رحمة وهدی للعالمین۔ وامرنی ان محق المزامیر والکبارات یعنی البرابط والمعازف والاوثان التی کانت تعبد فی الجاهلیة۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے جہانوں کے لئے رحمت اور ہدایت بنا کر بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں مزامیر، طبلے، معازف اور ان بتوں کو مٹا دوں جن کی زمانہ جاہلیت میں پوجا کی جاتی تھی۔

۱۳۔ حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا تبیعوا القینات ولا تشتروهن ولا تعلموهن ولا خیر فی تجارة فیهن وثمنهن حرام۔

گانے والی لونڈیوں کی خرید و فروخت نہ کرو اور نہ انہیں گانا سکھاؤ ان کی تجارت میں بھلائی نہیں ہے اور ان کی قیمت حرام ہے۔

۱۴۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

لیبیتن رجال علی اکل وشرب وعزف فیصبحون علی ارائکهم ممسوخین قردة وخنازیر۔

لوگ شراب کباب اور راگ ورنگ میں راتیں گذاریں گے۔ لیکن صبح کے وقت وہ اپنے آپ کو اپنے بستروں پر اس حالت میں پائیں گے کہ وہ مسخ ہو کر بندر اور خنزیر بن گئے ہوں گے۔

(اغاثة اللهفان - لابن قیمؒ)

انور عالم

کیا مودودی نیشنلسٹ تھے؟

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے علمی اور ادبی محاذ پر نظریہ پاکستان کی جو خدمت تقسیم ہندوستان سے قبل انجام دی تھی اس کا انکار صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہ تو پاکستان کی تحریک میں خود شامل تھے اور نہ اس کے تاریخی پس منظر سے اُن کو کما حقہٗ واقفیت ہے۔ مولانا مودودی نے جس شدومد کے ساتھ کانگرس کی طرزِ فکر اور متحدہ قومیت کی مخالفت کی تھی اس کی کھلی ہوئی شہادت مولانا کے سینکڑوں صفحات پر پھیلے ہوئے وہ مضامین ہیں جو "سیاسی کشمکش اور مسلمان" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع شدہ موجود ہیں۔ ان مضامین کے چند اقتباسات سے مودودی صاحب کے سیاسی مسلک کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مگر ان اقتباسات کے مطالعہ سے پہلے ایک نظر اُن تاثرات پر بھی ڈالنی چاہئے جن کو متعدد مسلم لیگی زعماء نے وقتاً فوقتاً ظاہر کیا ہے۔

وزیر خارجہ جناب شریف الدین پیرزادہ صاحب نے تحریک پاکستان سے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ———— "EVOLUTION OF PAKISTAN" کتاب مذکور کا اردو ترجمہ (پاکستان منزل بہ منزل) انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر فیلڈ مارشل جناب محمد ایوب خان کی مختصر تقریظ ہے جس میں صدر موصوف نے پیرزادہ صاحب کی کتاب کو معرکۃ الآرا تصنیف قرار دیا ہے اسی کتاب کے صفحہ ۱۹۱ پر جناب پیرزادہ صاحب رقمطراز ہیں کہ:۔

> "مولانا مودودی نے ترجمان القرآن کے ایک سلسلہ مضامین کے ذریعہ جو ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئے کانگریس کے چہرے سے نقاب اتار دی اور مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ موصوف نے برصغیر ہند میں مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیا کانگریس کی لادینیت کا خوب تمسخر اُڑایا اور یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کے لئے (وہاں کے مخصوص حالات میں) جمہوریت ناموزوں ہے اس لئے کہ مسلمانوں کے ایک ووٹ کے مقابل ہندوؤں کو چار ووٹ ملیں گے۔ انہوں (مودودی) نے ہندوؤں کے قومی استعمار کی بھی مذمت کی اور اس رائے کا اظہار کیا کہ محض مخلوط انتخاب یا اسمبلیوں میں کچھ زیادہ نمائندگی اور نوکریوں میں مقررہ شرح مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا حل نہیں ہے"

اس سلسلہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جائنٹ سکرٹری جناب ظفر احمد انصاری صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

> "اس موضوع پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "مسئلہ قومیت" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین لکھا جو اپنے دلائل کی قوت اور زورِ استدلال کے باعث مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا اور جس کا چرچا تھوڑے عرصہ میں بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں میں ہو گیا۔ اس اہم بحث کی ضرب متحدہ قومیت کے نظریہ پر پڑی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا۔ قومیت کے مسئلہ پر یہ ایک نظری بحث نہ تھی بلکہ اس کی ضرب کانگریس اور جمعیت العلماء ہند کے پورے موقف پر پڑتی تھی۔" (تحریک پاکستان اور علماء۔ نظریہ پاکستان چراغ راہ صفحہ ۲۴۴)

بانیٔ تصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کے ہم نشین جناب میاں محمد شفیع صاحب کی گواہی ایک معتبر حیثیت رکھتی ہے جس سے مولانا کی صحیح پوزیشن کا تعین کیا جا سکتا ہے، موصوف لکھتے ہیں کہ :۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تو درحقیقت نیشنلسٹ (کانگریسی) مسلمانوں کی ضد تھے، میں یہاں پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں نے حضرت علامہ اقبالؒ کی زبانی کم وبیش اس قسم کے الفاظ سنے تھے کہ مودودی ان کانگریسی مسلمانوں کی خبر لیں گے۔" (لاہور کی ڈائری ہفت روزہ اقدام - ۹ر جون ۱۹۶۳ء)

جن لوگوں کا آج یہ دعویٰ ہے کہ مولانا مودودی کانگریس کے حامی نیشنلسٹ مسلمان تھے، غالباً ان کو یہ حقیقت معلوم نہیں ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے یو۔پی مسلم لیگ نے اسلامی مملکت کا دستوری خاکہ بنانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کے ایک ممبر مولانا مودودی بھی تھے، قابلِ غور بات ہے کہ مودودی کانگریس کے طرفدار نیشنلسٹ ہوتے تو مسلم لیگ کی اس کمیٹی میں مودودی صاحب کی شرکت کیسے ممکن ہوتی۔ اس سلسلہ میں مسلم لیگ کے مؤقر نائب مولانا عبدالماجد دریا بادی مدیر "صدقِ جدید" (لکھنؤ) کے پیش لفظ کی چند سطریں ملاحظہ ہوں :۔

"غالباً ۱۹۴۰ء یا شاید اس سے بھی کچھ قبل مسلم لیگ کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا۔ اربابِ لیگ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جس اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ شد ومد سے کیا جا رہا ہے خود اس کا نظام یا قانون اساسی بھی تو اسلامی ہونا چاہئے۔ اس غرض سے یو۔پی مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کر دی جو اس کے خیال میں ماہر شریعت تھے کہ یہ مجلس ایسا نظام نامہ مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے۔ اس مجلس نظامِ اسلامی کے چار نام تو اچھی طرح یاد ہیں (۱) مولانا سید سلیمان ندوی (۲) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۳) مولانا آزاد سبحانی (۴) مولانا عبدالماجد دریا بادی۔" (اسلام کا سیاسی نظام - مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ص۳)

چند سربرآوردہ حضرات کی ان تصریحات کے بعد مودودی صاحب کی پوزیشن بالکل واضح ہو جاتی ہے مگر مزید صراحت کے لئے خود مودودی صاحب کی تحریروں کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے بات اور زیادہ نمایاں اور فیصلہ کن ہو جاتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

- "جدید ہندی قومیت کا لیڈر (جواہر لال نہرو) وہ شخص ہے جو اعلانیہ مذہب کا مخالف ہے۔ ہر اس قومیت کا دشمن ہے جس کی بنا کسی مذہب پر ہو اس نے اپنی دہریت کو کبھی نہیں چھپایا یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے اور مکرر وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ دل و دماغ کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں۔ یہ شخص ہندوستان کی نوجوان نسل کا رہنما ہے اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم نوجوانوں بلکہ خود مسلمانوں کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو سیاسی حیثیت سے ہندوستانی وطن پرست اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ اور تہذیبی حیثیت سے مکمل فرنگی ہے، سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقیماندہ آثار کو زندہ رکھ سکیں گے؟"

  (سیاسی کشمکش اور مسلمان حصہ اوّل ص۱۲)

- "عام طور پر آزاد خیال مسلمان اپنی قوم پرستی کی نمائش کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ ہمارا نصب العین ہندوستان کی مکمل آزادی ہے لیکن یہ بات بغیر سوچے سمجھے کہہ دی جاتی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری منزل مقصود محض آزادی ہی نہیں ہے بلکہ ایسی آزادی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف اسلام قائم رہے بلکہ عزت وطاقت والا بن جائے آزادیٔ ہند ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ اصل مقصد کے لئے ایک ضروری اور ناگزیر وسیلہ ہونے کی ۔۔۔

حیثیت سے مقصود ہے ہم صرف اس آزادی کے لئے لڑنا چاہتے ہیں بلکہ لڑنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ ملک کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے" (سیاسی کشمکش حصہ اول صـ۱۲۶)

- مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے ارض ایک ملک ہے انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے یہ اب تک کی تقسیم جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا۔ اس بت کے ٹوٹنے پر وہ تڑپے جو اسے معبود سمجھتا ہو مجھے تو یہاں اگر ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حکومت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرہ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔" (سیاسی کشمکش حصہ سوم صـ۷۶)

- میرے نزدیک پاکستان کے قومی مطالبہ پر یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی ان کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کی اصل پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک ان کا قومی وطن نہیں ہے اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں لا بسایا جائے اور اسے بزور ہمارا قومی وطن بنا دیا جائے بخلاف اس کے مطالبہ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے۔ مسلمانوں کا کہنا صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے ساتھ لگے رہنے سے ان کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہونچا ہے اس سے ان کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔" (ترجمان القرآن جولائی، اکتوبر ۱۹۴۴م)

تقسیم ہندوستان سے پہلے کے یہ تحریری اقتباسات ہر ذی علم و شعور کا اس فیصلہ پر پہونچنے میں مدد دیں گے کہ نظریہ پاکستان تحریک کانگریس اور [illegible]یت کے متعلق مولانا مودودی کا طرز فکر اور سیاسی مسلک کیا تھا۔ ہمارے نزدیک بعض حضرات کی تاریخ دانی کا یہ عجیب و غریب پہلو ہے کہ جس شخص نے [illegible] کانگریس اور ہندو مہاسبھا کو ایک قرار دیا ہو اس کو یہ حضرات نیشنلسٹ مسلمان کے خطاب سے نوازیں حالانکہ نیشنلسٹ مسلمان نے کبھی بھی کانگریس اور ہندو [illegible] سبھا کو ایک نہیں کہا ہے اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی ہے البتہ ہمیشہ غیر کانگریسی مسلمانوں نے کانگریس اور ہندو مہاسبھا کو ایک ہی تصویر کے دو [illegible] سمجھا چنانچہ مولانا مودودی کا بھی اس معاملہ میں یہی موقف تھا کہ کانگریس اور ہندو مہاسبھا درحقیقت ہم معنی اور ایک ہیں مولانا کے اپنے الفاظ اس [illegible] میں مندرجہ ذیل ہیں:۔

"یہاں پہونچ کر ہندو مہاسبھا اور کانگریس نظری اور عملی حیثیت سے ایک ہو جاتی ہیں گو ان کے نام اور کام مصلحتاً جدا ہیں نظری حیثیت سے نہ دونوں میں پہلے فرق تھا نہ آج ہے دونوں وطنی قومیت کے علمبردار ہیں دونوں اس ملک میں قوموں کے امتیازی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں دونوں علیحدگی کے ہر رجحان کی دشمن ہیں حتیٰ کہ کسی معاملہ میں وہ دونوں مسلمانوں کے جداگانہ مفاد تک کا نام سننے کی روادار نہیں دونوں کا آخری نصب العین یہ ہے کہ یہاں ایک قومیت پیدا ہو جائے جو تہذیب، تمدن، اخلاق، معاشرت زبان، ادب، جذبات و حسیات غرض ہر لحاظ سے بالکل یک رنگ ہو فرق صرف اتنا ہے کہ کانگریس جہاں ہندوستانی کا لفظ بولتی ہے وہاں مہاسبھا ہندو کا لفظ استعمال کرتی ہے مگر معنی دونوں کے ایک ہیں۔"
(تحریک آزادی ہند اور مسلمان صـ۱۴۹)

سید معروف شاہ شیرازی

صحابہ کرامؓ
ایک بے مثال قرآنی گروہ

تاریخ انسانی کے صفحات میں ایک ممتاز منظر (حضورؐ کے قدسیوں کا منظر) موجود ہے، تحریک اسلامی کے کارکن، جس دور میں اور جس جگہ
رہے ہوں، انہیں اس منظر کو سامنے رکھ کر اس کا عمیق مطالعہ کرنا چاہئے۔ گہرا مطالعہ اور طویل غور و خوض! یہ کیوں؟ اس لئے کہ یہ منظر
اسلامی اور اس کے طریقہ کار کا رخ متعین کرنے میں فیصلہ کن اثر رکھتا ہے۔
دعوت اسلامی نے ایک دور میں یہاں ایک مثالی گروہ پیدا کیا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا گروہ ——— جو نہ صرف یہ کہ پوری اسلامی
ایک ممتاز گروہ رہا ہے بلکہ پوری انسانی تاریخ میں بھی ——— اس کے بعد تاریخ ایسی ممتاز جماعت آج تک پیدا نہ کر سکی، ہاں اس سے
نہیں کر سکنے کہ تاریخ میں اس طرز کے اکا دکا انسان کبھی کبھار پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی ایک جگہ ایسے افراد کی کوئی
اد کبھی جمع نہ ہو سکی جیسا کہ تحریک اسلامی کے ابتدائی دور میں جمع ہو گئی تھی۔
اللہ تعالیٰ کا قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے ——— رسول مقبولؐ کی حدیث ہمارے درمیان ہے، حضورؐ کی پاکیزہ سیرت اور آپ کی
ہانی ہمارے سامنے ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے پاس ہے، جیسا کہ یہ سب کچھ اس پاکیزہ گروہ کے سامنے تھا، جسے تاریخ دوبارہ نہ پیدا کر سکی،
ریمؐ کی ذات گرامی کے سوا سب کچھ ہمارے پاس موجود ہے تو پھر کیا یہی وہ راز ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔
دعوت اسلامی کے قیام کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا جسمانی طور پر ہمارے درمیان ہونا ضروری نہیں ہے ورنہ پھر اللہ تعالیٰ
اسلامی کو پوری کائنات کے لئے اور ہر زمانے کے لئے ضروری دعوت، ہرگز نہ قرار دیتا۔ آپ کی رسالت اور آپ کے پیغام کو آخری پیغام نہ قرار دیا
ابد الآباد تک پوری انسانیت کو اس دین اور اس دعوت کے حوالے نہ کیا جاتا۔
لیکن اللہ تعالیٰ نے "الذکر" یعنی قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لیا، وہ جانتا تھا کہ یہ دعوت رسول اللہ کے بعد بھی قائم ہو سکتی ہے
آپ کے بعد بھی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے حضورؐ کو رسالت کے تئیس (۲۳) سال کے بعد ہی اپنے ہاں واپس بلا لیا اور آپ کے بعد دین
بد الآباد تک قائم رکھا ——— تو پھر سوال یہ ہے کہ صحابہ کی قوت کا راز کیا ہے؟ ——— کیونکہ صرف آپ کا اس دنیا سے چلا جانا اس
طرح کی نہ تشریح کر سکتا ہے اور نہ اس کا کوئی حقیقی سبب بتاتا ہے۔
ہمیں چاہئے کہ ہم اس کا کوئی اور راز اور کوئی دوسرا سبب تلاش کریں اور دیکھیں کہ یہ مبارک جمعیت کس سرچشمہ سے سیراب ہوا کرتی
ی؟ ہمیں چاہئے کہ بغور دیکھیں کہ شاید اس سرچشمہ میں کسی قسم کی تبدیلی آ گئی ہے؟ ہمیں اس نظام زندگی اور اس دین کو بھی دیکھنا چاہئے جس کے

سائے میں ان کی تربیت ہوئی ۔ شاید اس میں کوئی تغیر ہو گیا ہو ؟

جس سرچشمے سے انہوں نے اپنے دل و دماغ کی آبیاری کی وہ قرآن اور صرف قرآن تھا، بایں معنی کہ رسول اللہ کی حدیث اور آپ کا طریق کار اور اسوہ حسنہ تو اسی سرچشمہ کے آثار و مظاہر تھے، جب حضرت عائشہ سے پوچھا جاتا ہے کہ رسول خدا کے اخلاق کیا تھے تو آپ نے بے ساختہ فرمایا کہ آپ کا اخلاق " قرآن " تھا ۔

معلوم ہوا کہ وہ قرآن کے سرچشمہ ہی سے سیراب ہوتے تھے، وہ قرآنی کیفیات ہی میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے اور وہ اسی منبع سے اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے، اور ان کا یہ طرز عمل، اس لئے نہ تھا کہ اس وقت انسانیت کے پاس کوئی تہذیب نہ تھی یا وہ ثقافت سے محروم تھی یا اس کے پاس علم نہ تھا اور وہ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس سے محروم تھی ـــــــ ایسا ہرگز نہ تھا بلکہ اس وقت رومی تہذیب، اس کی ثقافت اس کی علمی تصانیف اور اس کا وہ قانونی نظام موجود تھا، جس کے مطابق آج بھی پورا یورپ زندگی بسر کر رہا ہے ۔ یا اس کی ترقی یافتہ اور تفصیلی شکل کے مطابق ـــــــ نیز یونانی تہذیب کے آثار بھی ابھی باقی تھے ۔ اس کی منطق، اس کا فلسفہ اور اس کے فنون سبھی موجود تھے ۔ نیز عربوں کے پاس ہی ایرانی تہذیب اس کی شعر و شاعری، عقائد اور داستانیں موجود تھیں اس کے ساتھ ساتھ ایرانی، ایک مخصوص نظام حکومت بھی رکھتے تھے ـــــ اس طرح کئی اور قریب و بعید کی تہذیبیں موجود تھیں، مثلاً ہندوستانی تہذیب، چینی تہذیب وغیرہ ۔ رومی اور ایرانی تہذیب نے تو عرب کو شمال اور جنوب سے گھیر رکھا تھا ۔ جبکہ یہودیت اور عیسائیت جزیرۃ العرب کے دل میں آکر بس گئی تھیں ۔

لہٰذا یہ بالکل واضح ہے کہ صحابہ کرام کی یہ مقدس جمعیت اپنے دور تشکیل میں صرف قرآن کریم پر اعتماد اس لئے نہیں کرتی تھی، کہ اس وقت کوئی عالمی تہذیب اور ثقافت موجود نہ تھی، بلکہ ابتدائی دور میں غیر ملکی تہذیبوں سے جان بوجھ کر ایک خاص مقصد کے لئے قطع تعلق کیا گیا تھا ۔ یہ قطع تعلق بالارادہ تھا، اس پر بین دلیل یہ واقعہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں صحیفہ تورات دیکھا تو آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور آپ نے پر زور الفاظ میں فرمایا " کہ خدا کی قسم آج اگر آپ کے درمیان موسیٰ بھی زندہ ہوتا تو اس کے لئے میری اطاعت کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہ ہوتا "

پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصداً اور ارادتاً چاہتے تھے، کہ یہ جمعیت صرف قرآن یعنی ہدایت کے واحد سرچشمے سے سیراب ہو ۔ بالخصوص جبکہ دور بھی ابتدائی اور تشکیل کا دور ہو تاکہ ان کے نفوس اس کے لئے خاص ہو جائیں، ان کی تعمیر صرف قرآنی طریقہ پر ہو ۔

دراصل آپ کے پیش نظر یہ تھا کہ ایک خاص قسم کی جمعیت تیار کی جائے، جس کا دل و دماغ بالکل صاف ہو جس کی ذہنیت مصفی ہو، جس کے تصورات بے آمیز ہوں، جس کا شعور خالص اور جس کی تعمیر اس نہج پہ ہوئی ہو جس نہج پر قرآن کریم مشتمل ہے اور وہ تمام غیر قرآنی اثرات سے پاک ہو ۔

جب اس جمعیت نے اس واحد سرچشمے سے اپنے دل و دماغ کی آبیاری کی، تو پھر تاریخ انسانیت میں اس نے وہ عروج حاصل کیا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔ لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوا ؟ کئی فکری مصادر باہم مل گئے ـــــ جس سرچشمے سے آنے والی نسلیں سیراب ہوتیں اسے یونان کے فلسفہ و منطق، ایران کے تصورات و توہمات اور یہود کی اسرائیلیات و نصاریٰ کے لاہوت نے گدلا کر دیا تھا اور آنے والی نسلیں بے شمار تہذیبیں اور ثقافتوں کے اثرات پڑ چکے تھے ۔ یہ سب تصورات ایک طرف تو علم تفسیر اور علم کلام کا حصہ بن گئے اور دوسری جانب انہوں نے مدرسوں اور خانقاہوں پر اپنے اثرات ڈالے اس گدلے اور غیر خالص سرچشمے سے آنے والی نسلوں نے استفادہ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرن اول جیسی ہیئت اجتماعی پھر وجود میں نہ آسکی ۔

یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ اس جمعیت، اور بعد میں آنے والوں کے درمیان ایک بین فرق موجود ہے یہ کیوں ؟ یہ محض اس لئے

ام کے ابتدائی خالص سرچشمے کے ساتھ غیر اسلامی اثرات مل گئے ہیں اس فرق کا بنیادی سبب ہے۔
خالص اسلامی منہج فکر و نظر میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا بنیادی عامل FACTOR بھی کارفرما رہا ہے، وہ یہ کہ
ادوار میں اس سرچشمے سے استفادہ کرنے کے طریقے میں تبدیلی پیدا ہو گئی، اب وہ طریقہ نہیں رہا جو اس مقدس گروہ کا طریقہ
رسائل کے مسلمان قرآن کو محض اس لئے نہیں پڑھتے تھے کہ اس کے مطالعہ سے کچھ ثقافت کے آثار انہیں مل جائیں یا ان کی معلومات
ضافہ ہو جائے۔ قرآن کے مطالعے سے ان کا مقصد محض تسکین ذوق نہ تھی اور نہ قرآنی علم حصول فائدہ کا ذریعہ تھا۔ اس میں کوئی
قرآن کریم کو محض اس لئے نہیں پڑھتا تھا، کہ وہ صرف علم و ثقافت کی خاطر، سامان ثقافت میں اضافہ کر سکے یا وہ علمی اور فقہی معلومات
کر کے دینی اعزاز و منصب حاصل کر سکتے۔ وہ تو قرآن عظیم کو اس لئے پڑھتے تھے کہ وہ خود اپنے متعلق یا اس معاشرہ کے متعلق جس میں وہ
تھے، ہدایات حاصل کریں۔ وہ اس کتاب عظیم کو اس لئے پڑھتے تھے کہ وہ حکم خداوندی کو جانیں اور جاننے کے بعد کسی توقف کے بغیر اس پر
را ہو جائیں جس طرح ایک فوجی میدان جنگ میں حکم الیوم (ORDER OF THE DAY) پاتا ہے اور حکم سنتے ہی اس کی
تعمیل میں لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام ایک ہی نشست میں فرائض و احکام کی ذمہ داری کے پیش نظر قرآن کریم کی دس آیتوں کی
ت و تعلیم ہی کافی سمجھتے تھے، تاکہ ان پر عمل بھی کر سکیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے ایک روایت میں مذکور ہے[1]
یہ شعور —— تعمیل کے لئے حکم لینے کا شعور —— ان کے لئے قرآن میں ایک نئی دنیا کے دروازے کھول دیتا تھا۔ اور اسی سے
و معرفت کی نئی راہیں کھلتی تھیں۔ اگر وہ قرآن مجید کو مجرد حصول علم اور محض تحقیق و تدریس کے لئے پڑھتے تو ان پر یہ راہیں ہرگز نہ کھلتیں،
—— لیکن امتثال امر کی اس تڑپ کی وجہ سے ان کے لئے عمل آسان کر دیا جاتا تھا، مصائب و تکالیف کا بوجھ اس کتاب سے ہلکا ہو
تا تھا، قرآن ان کی شخصیت میں گھل مل جاتا تھا، ان کے کردار و اوصاف کی زندگی میں ڈھل کر وہ ایک واقعی نظام کی شکل میں نمودار ہوتا
، وہ ایک متحرک ثقافت بن جاتا تھا —— ایسی ثقافت جو نہ صرف ذہنوں اور قرطاس پر رہ جائے یا بڑی بڑی کتابوں کے اندر دفن ہو بلکہ وہ
یسے عوامل و حقائق اور آثار و واقعات کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہو، جن سے زندگی کے غلط راستے بدل جائیں۔
یاد رکھئے کہ قرآن عظیم اپنے خزانوں کو صرف اس شخص کے حوالے کرتا ہے، جو قرآن کی جانب اسی نقطۂ نظر سے متوجہ ہو جائے اور
پڑھے، یعنی حصول علم کی روح اور اصل مقصد حصول عمل ہو۔ قرآن کریم اس لئے نہیں آیا کہ وہ ذہنی تعیش کا سامان بنے اور نہ وہ بطور
ادبی کتاب کے بھیجا گیا ہے نہ وہ تاریخ یا قصہ گوئی کی کوئی کتاب ہے —— (اگرچہ یہ سب باتیں بھی قرآن میں شامل ہیں) بلکہ قرآن
صرف اس لئے آیا ہے کہ وہ ایک نظام حیات WAY OF LIFE بنے اور خالص ربانی طریقہ حیات —— اللہ تعالیٰ کو منظور
تھا کہ دور اول کے ان لوگوں کو اس نظام کے مطابق تدریجاً آگے بڑھائے، اس لئے قرآن مجید متفرق طور پر مسلسل نازل ہوتا رہا۔
وقرآناً فرقناه لتقرأه على الناس على مكث ونزلناه تنزيلا (اور قرآن جس کو ہم نے متفرق کیا تاکہ آپ اسے لوگوں
کے سامنے وقفے وقفے کے بعد پڑھیں اور ہم نے اسے اتارا ہے)
قرآن کریم تمام کا تمام ایک ہی بار نازل نہیں فرمایا گیا بلکہ مختلف اوقات میں نجماً نجماً نازل ہوتا رہا اس میں زندگی کی پیش آمدہ ضروریات
اور مشکلات کا حل بھی شامل تھا، اسلامی تحریک کو جن مشکلات سے سابقہ پڑتا تھا قرآن کریم میں ان کے لئے معاشرتی زندگی کے ارتقاء کے مطابق
رہنما اصول دئے گئے، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ صحابہ کرام کے ذہن و فکر میں بعض واقعات و حوادث کے سبب جو باتیں کھٹکتی تھیں اس

---

[1] ابن کثیر نے مقدمہ تفسیر میں اس کا ذکر کیا ہے۔

کھٹک اور خلش کو قرآنی آیات کا نزول دور کر دیتا اور وحی الٰہی ان کے ذہن و فکر کو آئینہ دکھا دیتی اور زندگی کے ایسے موڑوں پر ان کی رہنمائی کی جاتی ان کے فکر و عمل اور شعور و احساس کی کوتاہی پر انہیں متنبہ کر دیا جاتا اور انہیں بتا دیا جاتا کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی کونسی صفات کیا اثر کر رہی ہیں قرآن کریم انہیں احساس دلاتا کہ ان کی زندگی کا ربط عالم بالا سے قائم ہے۔ عین اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں احساس کے سائے میں وہ چل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عملی زندگی کا رنگ "صبغۃ اللہ" تھا۔

یہ طریق کار ایسا تھا کہ اس میں علم و ہدایت نقل در کمال اس لئے حاصل کئے جاتے تھے کہ انہیں نافذ کیا جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔ یہی طریق کار تھا جس پر پہلی اسلامی جماعت تیار ہوئی۔ لیکن محض تعلیم اور ذہنی عیاشی کا طریقہ کار وہ تھا جس پر اس جماعت کے بعد آنے والی نسلیں تیار ہوئیں۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ یہی حقیقت سبب ہے، جس کی وجہ سے صحابہ کرام اور بعد میں آنے والی نسلوں کے درمیان ایک عظیم الشان فرق نظر آتا ہے۔

یہاں ایک تیسرا عامل —— بھی ہے جسے پیش نظر رکھنا اور نوٹ کر لینا نہایت ضروری ہے۔

دور اول میں جب ایک آدمی اسلام میں داخل ہوتا تھا تو اپنی ماضی کی تمام جاہلیتوں کا جوا اپنی گردن سے یکلخت اتار پھینکتا تھا جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہوتا تھا تو اسے اس بات کا شعور کامل ہوتا تھا کہ وہ بالکل ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہا ہے اور اس طرح وہ اپنی جاہلیت کی زندگی سے پورے طور پر بالارادہ کٹ جاتا تھا۔ اس کی حالت یہ ہوتی تھی کہ وہ جاہلیت کی تمام عادات رسم و رواج کے متعلق بدظن ہو جاتا تھا اور ہر چیز کو شک کی نظروں سے دیکھتا تھا، وہ ہر وقت ڈرتا تھا اور محتاط رہتا تھا، جاہلیت کی ہر چیز کو ایسی ناپاک چیز سمجھتا کہ وہ اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتی، اس احساس سے پھر وہ مسلسل اسلامی ہدایات حاصل کرتا اور قبول کرتا چلا جاتا تھا۔ جب کبھی اس کا نفس اس پر غالب آ جاتا، جب کبھی اس کی پرانی عادات اسے جاہلیت کی طرف کھینچتیں اور جب کبھی وہ اسلامی تکالیف و احکام کے مقابلہ میں کمزوری محسوس کرتا تو دفعتاً اسے اپنی اس کمزوری، غلطی اور خطا کا احساس ہو جاتا اور وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں احساس پاتا کہ اسے تطہیر کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا کردار آلودہ ہو چکا ہے لہٰذا وہ پھر سے قرآنی ہدایات کے مطابق زندگی شروع کر دیتا تھا۔

اس جاہلی سوسائٹی کو چھوڑ کر جب ایک شخص اسلام میں داخل ہوتا، تو اس کی جاہلانہ زندگی اور اسلامی زندگی کے درمیان ایک شعوری انقطاع اور بعد ہوتا تھا۔ اس کے ارد گرد جاہلی معاشرہ سے اس کے تمام روابط کٹ جاتے تھے۔ اور وہ ہر لحاظ سے جاہلی معاشرہ سے کٹ کر اسلامی معاشرہ سے جڑ جاتا تھا۔ اگرچہ وہ روزمرہ کے مادی روابط اور دنیاوی تعلقات اسی معاشرہ سے قائم کئے ہوئے تھا اور مشرکین سے خرید و فروخت اور لین دین کے معاملات علی حالہ رہتے تھے۔ لیکن شعوری طور پر وہ اس معاشرے سے کٹا ہوا ہوتا تھا اور ظاہر ہے کہ شعوری انقطاع اور آپس کے لین دین کے تعلقات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غرض اس دور میں اسلام میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ایک شخص کو جاہلی معاشرہ سے مکمل طور پر کٹ جاتا اس کے تصورات سے رسم و رواج سے اور اس کی عادات و رسومات سے۔ اور یہ تبدیلی واقع ہوتی جیسے ایک مسلم عقیدۂ شرک سے نکل کر عقیدہ توحید میں مکمل طور پر داخل ہو جاتا۔ حیات انسانی اور اس کائنات کے متعلق جاہلانہ تصورات چھوڑ کر اسلامی تصورات اپناتا۔ ایک جدید معاشرہ میں ضم ہو کر ایک نئی قیادت کے زیر نگیں آ جاتا اور اپنی پوری محنت اور اپنی پوری تابعداری اور اطاعت کے ساتھ نئی ملت میں داخل ہو جاتا۔

جب صحابہ کرام اسلام میں داخل ہوتے تھے تو اس کے بعد ان کی زندگی کے ایک نئے سفر اور ایک نئے باب کا آغاز ہو جاتا تھا، یہ سفر ایک آزادانہ سفر، جاہلیت کی تمام تقلیدوں کے بھاری بوجھ سے آزاد اور جاہلی معاشرہ کے تمام تصورات اور تمام غالب قدروں سے بالکل ہٹ کر تھا —— اس دور میں ایک مسلمان کے راستے میں ایذا رسانیاں اور فتنہ پردازیاں ضرور رکاوٹ بنی رہتی تھیں، لیکن وہ ان کے مقابلے میں

م ہتا تھا اسے اگے ہی بڑھتا رہتا تھا اور اس پر جاہلی تصورات کے دباؤ اور جاہلی معاشرہ کے اوضاع و اطوار کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔
یاد رکھئے اور غور کیجئے کہ ہم اس وقت ایک ایسی ہی جاہلیت میں مبتلا ہیں جس سے کبھی اسلام کو اپنے ابتدائی دور میں واسطہ پڑا تھا بلکہ میں
لہ یہ جاہلیت اس سے بھی تاریک ترین جاہلیت ہے۔ یہ ہمارے سارے گرد ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ لوگوں کے تصورات اور عقائد ان کی عادات اور
ر، ان کے فنون و آلات، ان کی دساتیر و قوانین، ان کی ثقافت کے تمام سرچشمے یہاں تک کہ جسے ہم اسلامی ثقافت سمجھتے ہیں، جسے ہم اسلامی
یتے ہیں، جسے ہم اسلامی فلسفہ کہتے ہیں، جسے ہم اسلامی نظر و فکر سے پکارتے ہیں، یہ سب کچھ بھی جاہلی تہذیب کی صنعت کاریاں ہیں!
یہی وجہ ہے کہ ہمارے دلوں میں اسلامی اقدار اجاگر نہیں ہوتیں۔ ہمارے ذہنوں میں اسلامی تصورات جاگزیں نہیں ہوتے اور ہم میں ایسے
تیار نہیں ہو رہے ہیں جن میں دور اول کی اس مبارک جماعت کی سی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔

لہذا یہ نہایت ضروری ہے کہ تحریک اسلامی کا طریق کار اور پروگرام متعین کرتے وقت ہم اس جاہلیت سے بالکل علیحدہ ہو جائیں جس میں ہم
رنگے جا رہے ہیں ——— خصوصاً اس وقت جبکہ تحریک اسلامی، تربیت اور تشکیل کے دور میں ہو ——— ہمارے لئے یہ نہایت
ری ہے کہ اس سرچشمے کی طرف لوٹ جائیں جس سے دور اول کے یہ مقدس لوگ سیراب ہوئے تھے، وہ سرچشمہ جو اب تک صافی ہے اور اس میں کسی
ی کوئی ملاوٹ نہیں۔ ہم اس کو مضبوطی سے تھام لیں اور اسی کی تعلیمات کی روشنی میں فیصلہ کریں کہ انسانی وجود اور اس پوری کائنات کے وجود کی
قت کیا ہے؟ انسانی وجود کا اس کائنات کے وجود سے کیا تعلق ہے اور پھر ان دونوں کا "ایک وجود کامل" یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات سے کیا تعلق
؟ اسی سرچشمے سے ہم اپنے لئے تصور حیات لیں، اپنے اخلاق اور اپنی اخلاقی اقدار متعین کریں، اپنی حکومت و سیاست، معیشت و اقتصاد
زندگی کے تمام شعبوں کے طور طریقے سیکھیں۔

جب بھی ہم اس سرچشمے کی طرف رجوع کریں ہمیں اس شعور اور احساس سے لوٹنا چاہیئے کہ ہم اس سے ہدایت صرف اس لئے لے رہے ہیں کہ اللہ
رضا حاصل کرنے کے لئے اسے نافذ کریں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ اسے پڑھیں اور لذت (ENJOYMENT) حاصل کریں، ہم
آن مجید کی طرف مراجعت محض اس لئے کریں کہ وہ ہمیں کیا بنانا چاہتا ہے تاکہ ہم ایسے ہی بنیں۔ یہی ہے نزول قرآن کا اصل مقصد۔ اگرچہ مطالعہ
آن کے ضمن میں ہمیں قرآن میں اعلیٰ فنی خوبیاں بھی نظر آئیں گی، بہترین قصے بھی ملیں گے، قیامت کے خوفناک مناظر بھی سامنے آئیں گے، جگہ جگہ
جدانی فکر بھی موجود ہوگی، غرض وہ ساری چیزیں وہاں ہوں گی۔ جو ایک خالص علم کے متلاشی اور ذوق کی خاطر پڑھنے والے کے لئے لذت کام و
ہن کا سامان ہوتی ہیں۔ لیکن ہمیں چاہیئے کہ ان سب پہلوؤں پہ غور کرتے وقت انہیں قرآن کا مقصد اول نہ قرار دیں۔ ہمارا نصب العین اور ہدف
ول ہمیشہ یہ رہے کہ قرآن ہم سے کیا عمل چاہتا ہے؟ وہ کیا مجموعی تصور ہے جس پر قائم رہنے کی قرآن ہدایت کرتا ہے۔ قرآن ہم میں خدا کا تصور
س طرح کا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہمارے اخلاق و اوضاع و اطوار اور ہمارے واقعی نظام زندگی کے تعین کے بارے میں کیا ہدایت دیتا ہے

ان مثبت چیزوں کے بعد ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جاہلی معاشرہ، جاہلی تصورات، جاہلی عادات و اطوار اور جاہلی
قیادت سے اپنے آپ کو آزاد کرلیں ——— خصوصاً ذہنی طور پر ——— ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ ہم اس جاہلی معاشرہ کے ساتھ کسی قسم کی
مصالحت کریں یا ہم اس کے ساتھ کسی قسم کی دوستی رکھیں کیونکہ یہ معاشرہ اپنی اس صفت ——— صفت جاہلیت کے ساتھ ——— اس
قابل ہی نہیں ہیں کہ ہم ان سے مصالحت کریں۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ پہلے ہم خود اپنے آپ کو بدلیں تاکہ بالآخر اس معاشرہ کو بدل سکیں۔

ہمارا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم سرے سے اس معاشرہ ہی کو اکھاڑ پھینکیں اور ہمیں یہ فیصلہ کرلینا ہوگا کہ موجودہ صورت حال کو
بہر حال ختم ہی ہونا چاہیئے؟ جو اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام حیات کی راہ میں بنیادی رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور جو ہمیں ایسی اسلامی
زندگی بسر کرنے سے بالجبر روک رہی ہے جس کا مطالبہ ہم سے اسلامی نظام حیات کرتا ہے۔

اس رستے میں ہمارا پہلا قدم ہی یہ ہوتا کہ ہم اس جاہلی معاشرے اس کے تصورات اور اس کی اقدار پر غالب ہوں اور اس غرض کے
خود اپنے تصورات اور اقدار پر غالب ہوں اور اس غرض کے لئے خود اپنے تصورات اور اقدار میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کریں اور کچھ لو اور دو
کی بنیاد پر مصالحت نہ کریں ہمیں اپنے اس موقف پر مضبوطی سے جم جانا چاہیئے کیونکہ ہم میں اور اس معاشرے میں کلی تضاد ہے اور
ہم نے اس معاشرہ کے ساتھ چلنے کی کوشش کی، تو ہم پہلے ہی قدم پر اپنا نظام اور خود اپنا طریق کار ہی گم کر بیٹھیں گے۔

یقیناً اس راستے میں سخت ترین دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں بھاری قربانیاں دینی
ہونگی۔ لیکن ان مشکلات سے بچ نکلنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے اگر فی الواقع ہم نے دور اوّل کی اس مبارک جماعت کے راستے پر چلنے کا تہیہ کر لیا
ہو، جس کے ذریعے اللہ نے دور اول میں اس کرہ ارض پر اسلامی نظام حیات نافذ کیا اور اس نظام کی جاہلی نظام کے بارے میں مدد کی
اور اسے غالب کیا۔

یہ بات ہمارے لئے بے حد اہم ہے کہ ہم صحابہ کرام کی اس مبارک جماعت کی طرح اسلامی نظام حیات کے مزاج کو پانے کی کوشش
کریں۔ اس کائنات اور انسانی معاشروں میں ہمارا جو موقف ہے اسے سمجھیں اس فریضے اور اس کے طریق کار کے لوازم و عواقب کو جانیں
جسے ہم نے جاہلیت سے نکلنے کے لئے اپنایا ہے۔

مولانا محمد مصطفیٰ (علی گڑھ)

خواجہ آتش کا درسِ معرفت

۱؎ حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا — ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

حسن پری ظاہر ہے کہ عطیۂ الٰہی اور پرتو حسن حقیقی ہے اس لئے محبوب حقیقی کا جلوۂ مستانہ ہوا، جب حسن مجازی میں یہ آن بان ہے تو حسن حقیقی میں یانہ کچھ شان ہوگی پس عقل کامل کا تقاضا ہے کہ انسان اُسی کا ہو رہے سہ خوبرا آنکہ نہ ڈالے شیدا تیرا ؎ سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا
شعر میں نصیحت ہے عاشقانِ مجاز کو اور تنبیہ ہے فلاسفۂ بے بصیرت کو کہ عشق حقیقی مزیلِ عقل نہیں، بلکہ مکمل عقل ہے۔
مولانا سہ شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ؎ اے طبیب جملہ علت ہائے ما ؎ اے تو افلاطون و جالینوس ما ؎ اے دوائے نخوت و ناموس ما۔

ربط. چونکہ عشق کا تقاضا ہوتا ہے کہ محبوب اپنا ہو جائے، اس لئے طالب کو ہدایت فرماتے ہیں کہ

۲؎ یوسف نہیں کہ ہاتھ لگے چند درم میں — قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُس کا

مشہور ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام جو حسن و صورت سیرت اور پاک دامنی میں ضرب المثل ہیں بازارِ مصر میں چند درم میں فروخت کئے گئے۔ خواجہ فرماتے ہیں کہ تم محبوب حقیقی کو اُن پر قیاس نہ کرنا، اُس کی قیمت تو کچھ ادا ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے کہ معاملۂ محبت میں اُس کا بیعانہ "دو عالم" یعنی ماسوا ہے یعنی طالب خدا کو چاہئے کہ توجہ الی اللہ پر اولاً ترک ماسوا کرے پھر اپنی بے بضاعتی کا اقرار، کیونکہ جب دونوں عالم سے وہ دستبردار ہو گیا تو اب کیا باقی رہا جو قیمت کے نام سے ادا کی جائے اور عقدِ بیع کی تکمیل ہو سکے۔
شعر میں حکیمانہ تعلیم ہے کہ انسان نہ غافل و معطل رہے اور نہ افعال و اعمال پر نازاں ہو، بلکہ اس کے فضل و کرم سے لو لگائے رہے (۲) اور تعبید ہے اُن لوگوں کی جو جزائے اعمال کے قائل نہیں اور اُن لوگوں کی بھی جن کا زعم یہ ہے کہ جو کچھ ملتا ہے وہ اپنے ہی کاموں کا نتیجہ ہے خدا تعالیٰ کا ہم پر کچھ احسان نہیں، اور نہ وہ ہمیں کچھ اپنے لطف مزید سے دے سکتا ہے، شاعر جہاں ہمیں غفلت سے بیدار کرتا ہے وہاں رعونت اور جہالت سے بھی باز رکھتا ہے،
خسروؒ نے کہا تھا ع قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ، خواجہ آتش نے اس پر ترقی کی ہے اس لئے اب اس معروضہ کی ضرورت نہ رہی کہ ع نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ربط. جب طالب نے ارادت صادقہ حاصل کی تو برکات محبت رنگ نے اس پر گونا گوں کیفیات دمواجید وحالات طاری کر دئے کبھی وہ رعب جمال سے حیران ہے اور کبھی شمشیرِ عشق سے سینہ چاک لیکن نتیجہ اس حیرت و جراحت کا رحم و کرم محبوب ہے اس لئے ہمت افزائی کے لئے فرماتے ہیں

۳؎ جو چشم کہ حیران ہوئی آئینہ ہے اُس کا — جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا

یعنی اے طالب کیوں گھبراتا ہے، یہ بات ہوتی آئی ہے اور عارفین کاملین اس پر صاد کرتے ہیں کہ چشم مشتاق کو اس کا دیدار نصیب اور دلِ حزیں کو اس کا قرب حاصل ہوتا ہے۔
یہ تو مسلمہ ہے کہ محبوب کو اظہار نمود پسند ہے اور خود بینی و خود نمائی کے سامان میں آئینہ و شانہ داخل ہیں، پس طالب کو چاہئے کہ اشتیاق دید میں آئینہ وار حیران بن جائے اور اپنے سینہ کو شانہ کی طرح شمشیرِ غم سے چاک چاک کر ڈالے، کہ یہی چیزیں جو سرمایۂ محبت ہیں محبت کو بھی محبوب ہیں یعنی

حیرانی و پریشانی کہ لازمۂ عشق ہے محبوب کو پسند ہے (ووجدک ضالاً فہدیٰ)

شعر میں اشارہ ہے کہ جب طالب بیابانِ فراق کو طے کر کے نخلستانِ وصال میں باریاب ہوتا ہے تو خود محبوب کا محبوب بن جاتا ہے (اذا احبّہ فقتلتہ ومن قتلتہ فعلیّ دیتہ وانا دیتہ)۔

ربط سابق اشعار میں بتایا تھا کہ محبت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اور اگلے اشعار بالا میں حیرانی اور سینہ فگاری کو موجب حصول قرب باری تعالیٰ بتایا گیا اب ارشاد ہے کہ یہ چیزیں جو موصل الی المطلوب ہیں یعنی ترک دو عالم اور حیرت و بیماں اس طرح حاصل ہوتی ہیں کہ

شعر وہ یاد ہے اس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو — حالت کو کرے غیر وہ پیمانہ ہے اس کا

اس کی یاد کثرت سے کرو، محبت الٰہی کا غلبہ ہوگا، اور دنیا و آخرت کی محبت دل سے نکل جائے گی، بلکہ ایسی خود فراموشی یا خودشناسی ہوگی۔ کہ نفس کی حکومت سے روح کو نجات مل جائے گی۔

خواجہ صاحب نے قرآنی تعلیم لظم فرما دی ہے قرآن پاک میں والذاکرین اللہ کثیراً والذاکرات کو مقام مدح میں بیان فرمایا ہے دیگر محسنین کے ذکر کے آخر میں اظہار شرف خاص کے طور پران کا ذکر کیا ہے اور ذکر کی تعریف میں ولذکر اللہ اکبر بھی آیا ہے اور واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون بھی ارشاد ہے اور اس سے بڑی نعمت اہل محبت کے لئے کیا ہے کہ بندہ جب اس کی یاد کرتا ہے تو وہ بھی بندہ کا ذکر کرتا ہے فاذکرونی اذکرکم۔

ربط بیابانِ محبت میں انسان کبھی دشت و کوہ میں مارا مارا پھرتا ہے کہ کہیں محبوب کی جھلک دیکھ لے سے صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ مارا (حافظؒ) اس لئے خواجہ آتش تسلی دیتے ہیں کہ سے یار در تو پس چرائی بے خبر تو یار در تو پس چہ گردی در یعنی محبوب تو طالب کے دل میں جلوہ فرما ہے، دل بمنزلۂ قصر شاہی ہے اور باقی عالم آفاقی بمنزلہ جلو خانہ ہے، قصر کو جلو خانہ پر فضیلت ہوتی ہے، تمام عالم پر فضیلت ہے سے دل ہیں وہ دل ہیں کہ معمار قضا سے اب تک تو ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا، اور سے ارض و سما کہاں وسعت کو پا سکے تو میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے۔ پس ہدایت فرماتے ہیں کہ اسی قصر میں اس کو تلاش کرو، یک در گیر و محکم گیر

شعر دل قصر شہنشہ ہے وہ شوخ اس میں شہنشہ — عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے اس کا

محبوب کی شانِ جلال کو "لفظ شہنشہ" سے ظاہر کیا ہے، اور شانِ جمال کی طرف "لفظ شوخ" سے اشارہ کیا ہے۔

ربط ۔ محبوب اپنی صفات سے عیاں ہے جس کو اس مصرع سے تعبیر فرمایا کہ ع عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے اس کا، وہ اپنی ذات سے نہاں ہے اس لئے ارشاد ہوتا ہے۔

سے وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اس میں — معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اس کا

مشہور ہے کہ گنج ویرانہ میں ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ نابردہ رنج گنج میسر نمی شود، محبوب بھی اس کون و مکاں میں اس طرح نہاں ہے جس طرح خزانہ، ویرانہ خود مقصود و مرغوب نہیں ہوتا، گنج مطلوب ہوتا ہے البتہ گنج کی طلب میں ویرانوں کی خاک چھانی بھی پڑتی ہے بس یہی حال طالب مشتاق کا ہے کہ اس گنج باقی کی تلاش میں ساری دنیا اس کا ویرانہ ہے، مقصود ہے تو وہی، مطلوب ہے تو وہی، یہ بھی ملاحظہ ہے کہ ویرانہ کی نہیں، اسی طرح اس کا فضل ہے۔

ربط ۔ چونکہ طالب کو حصول ارشاد کے لئے مرد کامل کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس راہ کے نشیب و فراز اور آب و سراب بتائے، اخلاقی نفسیاتی امراض کی صحیح تشخیص اور ان کے ازالہ کے لئے مجرب تجویز کرے اور یہ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں بقول مولاناؒ اے بسا ابلیس آدم روئے

لہ وفی الارض آیات للسائلین وفی انفسکم افلا تبصرون

ہر شخص اس کا اہل نہیں - بہت سے رہزن خضر صورت بنے ہوئے ہیں ،

شعر　　یہ حال فقیروں سے ہوا اُس کے ہویدا　　　آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اُس کا

یعنی اہل اللہ آلودۂ دنیا نہیں ہوتے، استقرا اور تجربہ بھی اس کی تائید کرتا ہے اور قرآن حکیم سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، واما من طغیٰ و آثر الحیاۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماویٰ، پس اس کا عکس مستوی صحیح طور پر یہی ہوا کہ جو آلودۂ دنیا ہے وہ اللہ والا نہیں یعنی اُس سے بیگانہ ہے -

ربط - اب چونکہ اہل اللہ عرفان و محبت الٰہی کے مضامین حقانی بعض تو بے پردہ اور بعض سر دلبراں در حدیثِ دیگراں کے طور پر گلبانگ عاشقانہ میں بیان فرماتے ہیں، کہ اہل عالم کی راہ نمائی کریں، لیکن اُن سے مستفید وہی ہوتے ہیں جو استعداد فطری روز ازل سے لائے ہیں، وہی ہمہ تن گوش ہو کر اُن کا کلام سنتے ہیں اور ہمہ تن دل ہو کر محبوب حقیقی پر نثار ہوتے ہیں، اس لئے اظہار ہے -

شعر　　گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش　　　بلبل کا یہ نالہ نہیں، افسانہ ہے اُس کا

گل کو دیکھئے تو صورۃً ہمہ تن گوش ہوتا ہے، یہ کیوں؟ بلبل کا نالہ سننے کے لئے لیکن یہ تو بلبل سے واقف ہی نہ تھا، اُس کی بات سننے کے لئے عدم سے مستعد ہو کر کیوں آتا، ہاں ہاں معلوم ہوا کہ یہ بلبل محبوب حقیقی کا بیان کر رہی ہے، جس کو غور سے سارا گلشن سن رہا ہے، غافل انسان یہ سمجھا کہ گل و بلبل میں راز و نیاز ہے، اصل یہ ہے کہ بلبل بھی اسی کی دیوانی اور گل بھی اسی کے سینہ فگار -

ربط - چنانچہ اسی کی تائید میں ارشاد ہے -

شعر　　آوارگیٔ نکہت گل ہے یہ اشارہ　　　جامہ سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اس کا

یعنی گلاب کی خوشبو جو برگ گل سے نکل رہی ہے اور اپنے جامہ سے باہر ہو کر حیران و پریشان ہے، اشارۃً اس نکتہ کا بیان ہے کہ اُس کے دیوانے اسی طرح بے خود رہتے ہیں، اور اس دیوانگی و بے خودیٔ شوق میں نفحات عشق یعنی کلمات معرفت واسرار اُن کی زبان فیض ترجمان سے نکل جاتے ہیں جو تمام عالم کو معطر کر دیتے ہیں -

ربط - شعر مذکور میں ایک کیفیت کی تصویر ہے جس کو حضرات صوفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ سکر سے تعبیر کرتے ہیں - اور غالباً اس سے خود مغلوب ہو کر خواجہ نے یہ غزل کہی ہے، اس واسطے اپنا پردہ بھی چاک کرتے ہیں -

شعر　　شکرانہ ساقی ازل کرتا ہے آتش　　　لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

مئے شوق یعنی شراب عشق، وجہ تشبیہ سکر و بے خودی و تشجیع، ساقی ازل مراد محبوب حقیقی جس نے اپنی حکمت سے جس کو چاہا اپنا شیدا بنا دیا - اور شراب محبت و معرفت جتنی جتنی چاہی پیمانۂ دل میں ڈال دی، کسی کو لبا لب کیا اور کسی کو لبریز،

خواجہ آتش فیاض حقیقی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے اتنی محبت عطا فرمائی کہ پیمانۂ دل چھلک رہا ہے، جس سے بے قصد و اختیار یہ مضامین عارفانہ زبان سے نکل رہے ہیں، گویا ایک نکہت گل ہے کہ اپنے جامہ سے باہر ہے، ایک دیوانہ ہے جو اپنے خانماں سے آوارہ ہے، اور لا یؤخذ المجنون بما صدر عنہ (مجنوں مرفوع القلم ہے)

شعر میں اشارہ ہے کہ عشق الٰہی وہبی ہے، اور شکرانہ مشعر ہے کہ واردات عشقیہ آلیہ نعمت ہی نعمت ہیں خواہ بظاہر تکلیف ہی تکلیف ہو -

آگ ہی سے دھواں اٹھتا ہے ......
..... لیکن جب آپ ہمارے سگریٹ سلگاتے ہیں تو جو دھواں اٹھتا ہے
اس سے کئی گھر روشن ہوتے ہیں ، لوگوں کو روزی نصیب ہوتی ہے۔
جسم ڈھکتے ہیں اور بہت سے خاندانوں کو گھر میسر آتا ہے۔
ہمارے کاروبار سے ہزاروں آدمی کسی نہ کسی طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسان ہمارے
اچھے سگریٹوں کے لئے تمباکو پیدا کرتا ہے۔ اس کو اچھے دام ملتے ہیں۔
جب ہمارے سگریٹ پیک ہو کر تجارتی تقسیم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو
وسیع پیمانے پر تجارت اور معاشی نقل و حمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح
سارے ملک میں کئی ہزار لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔
مزید یہ کہ جب ہم ٹرکوں، کشتیوں یا ریل کے ذریعے اپنے سگریٹ بازاروں تک پہنچاتے ہیں
یا جب ہم سگریٹ کے پیکٹ کے لئے گتہ ، چھپے ہوئے پیکٹ یا لکڑی کے پیکنگ کیس
خریدتے ہیں تو تجارت اور معاشی سرگرمی کو اور فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جب
سگریٹوں کے لئے پیکنگ کا تمام ترسامان پاکستان ہی میں بننے لگے گا تو ملکی صنعت
اور زیادہ ترقی کرے گی۔
پاکستان ٹوبیکو کمپنی کو فخر ہے کہ وہ عوام کو خوشحال بنانے
میں مدد کرتی ہے اور وہ نہ صرف اپنے ہی دفتروں اور کارخانوں میں
بلکہ متعلقہ صنعتوں میں اور زراعت میں بھی روزگار کے مواقع
پیدا کرتی ہے۔
PTC
پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
پاکستان کی سگریٹ کی صنعت کے رہبر

یادِ رفتگاں

عبدالقیوم خاں مرحوم

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم کے عزیزوں میں ایک بزرگ اکبر حسین تھے، جو حیدرآباد دکن کی کسی جاگیر میں منصف تھے، اُن زمانے میں شعر و ادب کا بہت ذوق تھا، اکبر حسین مرحوم کے صاحبزادے اختر حسین (ایم اے) روزنامہ "پیام" کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ ان کے یہاں روزانہ ادبی صحبتیں ضرور ہوتیں، افسانے اور تنقیدی مضامین پڑھے جاتے اور شعر خوانی بھی ہوتی، اس گھرانے میں پردہ تھا مگر رفتہ حجاب و نقاب کے بند ڈھیلے ہونے لگے، اور پھر کچھ دن بعد پردہ رخصت ہو گیا۔

۱۹۶۱ء میں "جشن شاعر" بمبئی میں بڑی دھوم سے منایا گیا، مدراس کے مشاعرے میں شرکت کرنے کے بعد میں بمبئی پہونچا، جشن شاعر کے مشاعرے میں اسٹیج کے قریب ایک لڑکی نے آکر سلام کیا ـــــ میں چونک پڑا، صورت جانی پہچانی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ سید اکبر حسین موہانی مرحوم کی صاحبزادی کی وشوامتر عادل سے سول میرج ہو گئی ـــــ شریعت کی حدود توڑنے کے بعد ہر "المیہ" ظہور میں آسکتا ہے۔

اسی گھرانے میں حیدرآباد دکن کے روشن خاندانوں کا آنا جانا تھا، سب لوگ شاعری سے شوق و دلچسپی رکھتے تھے! قصبہ لوہاری ضلع سہارنپور کے رہنے والے ایک صاحب عبداللطیف خاں تھے، جو اب سے تقریباً ۸۰ سال قبل ریاست حیدرآباد دکن میں ملازم ہوئے اور اپنی ذہانت و قابلیت کی بدولت ترقی کرکے محکمہ آبکاری کے ناظم ہو گئے۔ اور "نواب لطیف یار جنگ" کے خطاب سے نوازے گئے، ان کے داماد احمد علی خاں مرحوم ۱۹۳۳ء میں محکمہ آبکاری میں مہتمم (سپرنٹنڈنٹ) تھے، اور پھر انہوں نے نائب ناظم کے عہدہ سے وظیفہ حاصل کیا ان کے یہاں بھی اکثر شاعری کی محفلیں جمتیں اور ان محفلوں میں تنہا راقم الحروف ہی گھنٹوں شعر سناتا۔ عبدالقیوم خاں صاحب جو ان دنوں ہوم آفس میں مددگار معتمد (ڈپٹی سکریٹری) تھے، احمد علی خاں صاحب ہی کے یہاں تعارف ہوا، پھر رفتہ رفتہ اُن سے روابط اور تعلقات بڑھتے اور استوار بنتے چلے گئے، عبدالقیوم خاں، نواب لطیف یار جنگ بہادر کے فرزند تھے اور احمد علی خاں مرحوم کے برادرِ نسبتی!

احمد علی خاں صاحب کا زیر تعمیر مکان ایک پہاڑی پر تھا، اچھی خاصی لمبی چوڑی کوٹھی، منظر خوشنما اور محل وقوع شاندار! دو سال میں دو تین بار پکنک کے لئے ضرور جاتے، پہلے سے ڈاک بنگلہ ریزرو کرایا جاتا، گرمی میں برف کی سلیں اور سوڈا واٹر کی بوتلیں ساتھ رہتیں، اچھے سے اچھے کھانوں کا اہتمام، سیر کے لئے موٹریں، شکار کے لئے بندوقیں اور کارتوسوں کی بہتات، شعر خوانی، کھیل کود، تفریح، پیچ پیچ جنگل

میں مشکل !

۱۹۴۱ء ہوگا جب قائداعظم محمد علی جناح کسی مقدمہ کی پیروی کے لئے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تھے۔ تو قائدِ ملت بہادر یار جنگ کا پیغام خاکسار کو ملا کہ میرے یہاں فلاں دن شام کو مسٹر جناح کا ایٹ ہوم ہے، تمہیں اس تقریب کی مناسبت سے کچھ پڑھنی ہوگی، میں نے جواب میں کہلوا بھیجا کہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل میں نظم ضرور سنا دوں گا مگر یہ نظم "قصیدہ" نہیں ہوگی! انہی دنوں احمد علی خان صاحب مرحوم کے ساتھ پک نک میں جانا نکل آیا، ایک دن اور ایک رات گزر چکی تھی، ڈیڑھ دن کا پروگرام اور باقی تھا، دوسرے دن عبدالقیوم خاں بھی بلدہ حیدرآباد سے اپنی کار میں آگئے، میں نے اُن سے کہا کہ آج شام کو نواب بہادر یار جنگ کے یہاں جناح کا عصرانہ ہے، مجھے اس میں ضرور شریک ہونا ہے، وہ بولے مجھے بھی وہاں جانا ہے، مگر تم نے اس پروگرام کا یہاں ذکر کر دیا تو یہ لوگ تمہیں کسی قیمت پر جانے نہیں دیں گے، یہاں سے چلنے کی بس ایک ہی سبیل ہے کہ ان لوگوں سے کہے بغیر موٹر میں بیٹھ کر ہم روانہ ہو جائیں، بستر اور کپڑے یہ دوسرے دن اپنے ہمراہ لے آئیں گے!

دوپہر کا کھانا کھا کر، درختوں کے سایہ میں سب لوگ آرام کر رہے تھے، کوئی آرام کرسی پر نیم دراز تھا، کسی نے سفری پلنگ کو بنا رکھا تھا۔ کچھ لوگ سبزے پر لیٹے تھے، بچے ڈاک بنگلہ کے صحن میں کبڈی کھیل رہے تھے، اتنے میں عبدالقیوم خاں مرحوم نے مجھے اشارہ کیا، وہ ٹہلتے ہوئے چلے، میں اُن کے پیچھے، سب لوگ سمجھے کہ ہم باغیچہ کی روشوں پر گھومنے جا رہے ہیں، پھر ہم موٹر میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا! کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا! وہ جو گاؤں والوں کی کہاوت ہے کہ گھوڑوں کو گھر کیا دور ہے —— اور یہ تو موٹر تھی، جسے پچاس میل کی مسافت طے کرنے میں بہت سے بہت ڈیڑھ گھنٹہ لگا ہوگا! میں اپنے گھر پر اُتر گیا اور شام کے وقت کپڑے بدل کر نواب بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی پر پہنچا، بیگم بازار میں تماشائیوں کی کافی بھیڑ تھی، عصرانہ میں بلدہ حیدرآباد کے اعیان و اکابر جمع تھے، قائداعظم وقتِ مقررہ پر تشریف لائے، ان کے آتے ہی بینڈ بجنے لگا، ڈیوڑھی کے صدر دروازے پر چاؤش بندوقیں لئے اور کمر سے تلواریں لگائے کھڑے تھے، کسی کسی کی ڈاڑھی اور پیش قبض تھا!

قائداعظم جب لوگوں سے ملنے کے لئے گھومنے لگے تو نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے ایک خالی کرسی اٹھا کر رکھ دی اور ان کے قریب میں اس پر کھڑا ہو گیا، قائداعظم اُس کے سامنے آ کر رُک گئے اور میں نے "قائداعظم کا پیغام ملت کے نام" کے عنوان سے چند اشعار پڑھے، پہلا اور آخری شعر ——

جینے کا قصد ہے تو سکوں کی نہ کر تلاش
یہ زندگی کشاکشِ پیہم کا نام ہے
نظریں بلند ہوں تو زمیں بھی ہے آسماں
سعیِ قبول ہو تو خموشی پیام ہے

مسٹر جناح نظم ختم ہونے تک کرسی کے سامنے کھڑے رہے!

مسٹر عبدالقیوم خاں کے یہاں بھی دعوتیں اور شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتیں، حیدرآباد دکن میں اُن کا بنگلہ بڑا خوشنما پہاڑی پر پھول پتے بنے ہوئے، پائیں باغ وسیع و کشادہ، چاروں طرف گملوں کی قطاریں، مکان کے برآمدے کی دیوار سے پانی کا آبشار تھا، اس کے لئے انہوں نے موٹر پمپ لگایا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد کراچی میں پہلی بار اُن سے ملنا ہوا تو لپٹ گئے، اُن دنوں وہ حیدرآباد دکن کا مقدمہ مجلس اقوام میں

بنوا آجا رہے تھے اور سفر کی تیاریوں میں مصروف تھے ـــــ کراچی میں جب بھی ملنا ہوتا، غیر معمولی خلوص و تواضع کا
اپنے یہاں کی دعوتوں میں اصرار کرکے بلاتے، دو تین بار غریب خانہ پر بھی تشریف لائے، دل کے مریض تھے یا سیڑھیاں
ن نہ کرسکے۔ ڈرائیور کو بھیج کر مجھے بلوایا اور موٹر میں بیٹھ کر باتیں کیں۔

چار سال سے اُن کی صحت گرنے لگی تھی، دل کا مریض ڈاکٹروں کے چکر میں پھنس جائے تو پھر اس چکر سے موت کے بعد ہی شاید
علاج معالجہ کی بڑی سے بڑی سہولتیں موجود تھیں، انگریز عورت سے شادی کی تھی، پاکستان آنے کے دو تین سال بعد وہ عورت
چلی گئی۔ مرحوم کے کوئی اولاد نہ تھی، اکیلے دم کے لئے چار چار پانچ پانچ نوکر، ہر طرح آرام اور بے فکری! میں نے ایک دن صبح
ن کی خبر اخبار میں پڑھی، اور شرافت و سنجیدگی کی تاریخ فلم کے پردے کی طرح سامنے آگئی ـــــ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

دالقیوم خاں مرحوم نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی، نوابزادہ لیاقت علی خاں اور وہ ہوسٹل کے ایک کمرے میں رہتے
نے انگلستان جاکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا، حکومت دکن میں متعدد عہدوں پر فائز رہے ـــــ ڈپٹی سکرٹری، ڈسٹرکٹ جج
رجسٹرار، پٹنہ کے سر عبدالعزیز مرحوم وزیر عدالت کے پرسنل اسسٹنٹ اور اس کے بعد امور مذہبی کے ناظم!

لستان بننے کے بعد مشتاق احمد خاں صاحب جن دنوں حکومت دکن کے ایجنٹ جنرل تھے، عبدالقیوم خاں اُن کے سکرٹری تھے،
کے بعد ایسی صورت پیش آئی کہ مولوی مشتاق احمد خاں صاحب اس عہدے سے سبکدوش ہوگئے، اور اس وقت سے اب تک
خاں مرحوم سکریٹری جنرل کے منصب پر فائز رہے، تنخواہ دو ہزار سے کچھ اوپر ہی ہوگی، موٹر کار اور کرایہ مکان وغیرہ کے الاؤنس اس
انتہائی آرام کی نوکری، کوئی خاص ذمہ داری اور مصروفیت نہیں۔ اُن کے دفتر اور عہدے سے حکومت حیدر آباد دکن کا کیس زندہ
ن کے بعد بھی رہے گا! مگر کشمیر ہی کا معاملہ جب کھٹائی میں پڑا ہوا ہے اور پاک و ہند کی خون ریز جنگ بھی اس کا تصفیہ نہ
یدر آباد دکن اور جونا گڑھ کے تصفیوں کو کون پوچھتا ہے ـــــ قبضہ سچا دعویٰ جھوٹا، اسی کہاوت پر آج کل کی سیاست
ہوتا رہا ہے!

عبدالقیوم خاں مرحوم نے کلفٹن پر ایک بنگلہ خریدا تھا اور اُسے اپنی خوش ذوقی سے باغ و بہار بنا دیا، مگر پھر اُسے بیچ کر ناظم آباد
مکان بنایا، مکان کے دروازے سے لیکر باتھ روم تک ہر گوشہ دیکھنے کے قابل، کوٹھی کا فرنیچر دیدہ زیب! باغیچہ انتہائی خوشنما
چاروں طرف سبزہ اس قدر خوش منظر کہ اس کے نظارے سے دکھتی آنکھیں اچھی ہوجائیں۔ موت آئی تو اعمال کے سوا، مکان کا ایک
اپنے ساتھ نہ لے جاسکے، ہر کسی کو اس منزل سے گزرنا ہوتا ہے مگر دنیا کے مکروہات آدمی کو آخر دم تک غافل بنائے رہتے ہیں! مرحوم
مکان اور مال و متاع اُن کے وارثوں (بہن، بھائی، بھتیجوں) کے حصے میں آئیں گے ـــــ رہے نام اللہ کا!

کی بڑی بہن کے اکلوتے فرزند خورشید علی خاں حیدر آباد میں محکمہ فنانس کے ڈپٹی سکریٹری تھے پاکستان آکر انہوں نے ملازمت کی بجائے تجارت
زندگی کا آغاز کیا، اُن کی اہلیہ نے خلع لے کر مشہور ناول "تسنیم" کے مصنف نیاض علی خاں ایڈووکیٹ جنرل سے شادی کرلی اور اُن کے مرنے کے
مسٹر محمد شعیب (سابق وزیر خزانہ پاکستان اور حال وائس چیرمین ورلڈ بنک) کی شریک زندگی ہیں۔

بادۂ ہر رنگ

فرشی :-

بھرنے لگا، آہ پہ آہ — ہائے کمبخت محبت کی نگاہ
نی ہے بہت کم گمراہ — اور اگر ہو تو عیاذاً باللہ
ش، تمنائے دوام — اور اظہار تمنا ہے گناہ
ت کا ادا ہو نہ سکا — ایک مدت سے مشکل تھا نہ آہ
رر، تلافی نہ کرم — یوں تو اے دوست! نہ ہم ہو گئے تباہ
پوچھ مگر یوں نہ پوچھ — جیسے پہلے سے نہیں تو آگاہ
سادہ نگاہی پہ نہ جا — وہ نگہ دیکھ جو ہے زیر نگاہ
ن شباب اے تسکین — عہد پیری میں بہت ہے جانکاہ

آپ اور دعویٰ رندی تسکین
وہ بھی اس عمر میں ماشاء اللہ

زاہدی بدایونی

ہے فرزانے خبردار نہیں — اس طرح جاگ رہا ہوں کہ میں بیدار نہیں
راس اگر وقت کی رفتار نہیں — میرے نغموں میں بھی تیغ کی جھنکار نہیں
وں بار نہیں سانس سے زیر بار نہیں — میں ابھی تیری نوازش کا سزاوار نہیں
احباب سے دشمن ہی بہت اچھے ہیں — بات سچی ہے مگر موقعۂ اظہار نہیں
عین عبادت ہے مری نظروں میں — میرے معیار سے دنیا کوئی معیار نہیں

شفقت کاظمی :-

یہی نہیں کہ ہمیں درد دل سنانا تھا — تری نگاہ کرم کو بھی آزمانا تھا
یہ اتفاق کہ تیری گلی میں آ نکلے — وگرنہ دور بہت دور ہم کو جانا تھا
مرا قصور بھی آخر مجھے بتا دیتا — مرے وجود کا دشمن اگر زمانہ تھا
ترے فقیر نہ کیونکر وہیں کے ہو رہتے — ترے دیار کا منظر بڑا سہانا تھا

قفس سے چھوٹ کے جب آئے چمن میں ہم شفقت
نہ وہ بہار کا موسم نہ آشیانہ تھا

پریم ناتھ دت :-

جو سر جھکا نہ کعبۂ اسلام کی طرف — کیوں سجدہ ریز ہو در اصنام کی طرف
کعبہ کی سمت آ کے ٹھٹھکنے لگے پائے برہمن — اور شیخ وقت کے قدم اصنام کی طرف
اے تیری یاد کیف و سرور نشاط روح — رغبت ہو کیوں مجھے قدح و جام کی طرف
ملتا نہیں ہے لفظ کوئی ترجمان شوق — کھنچتا ہوں ایک جلوۂ بے نام کی طرف
پیتا ہوں میکدے میں عجب رنگ سے شرار — دل یار کی طرف ہے تو منہ جام کی طرف

وارث القادری

ہوس کی جیت محبت کی ہار! کیا ہوگا
غم جہاں نے کیا شرمسار کیا ہوگا
کبھی کسی کو نہیں ملتی خود جنوں کے بغیر
وہ بے خبر نہ ہوا ہوشیار کیا ہوگا
ہزار طاقتیں ایٹم کی ہوں زمانے میں
مگر مقابلۂ ذوالفقار کیا ہوگا

[illegible]

پروفیسر افتخار احمد افتخار دھولیری :-

ممکن نہیں علاجِ غمِ زندگی نہ ہو — مایوس زندگی سے مگر آدمی نہ ہو
ایسی سحر جہاں میں الٰہی! ہوئی نہ ہو — سورج نکل رہا ہو مگر روشنی نہ ہو
ظلمت میں شامِ غم کی اُجالا سا کیوں ہے آج — اپنے ہی داغِ دل کی کہیں روشنی نہ ہو

شوق دکھنڈوم :-

صورت کوئی تسکین کی دکھلائی تو ہوتی — جھوٹی ہی سہی تم نے قسم کھائی تو ہوتی
زنجیر مجھے آپ نے پہنائی تو ہوتی — کچھ اور نہ ہوتا، مری رسوائی تو ہوتی
کس جرمِ محبت کا گنہگار ہوا ہوں — یہ بات مجھے آپ نے سمجھائی تو ہوتی

یہ لوگ جو سایہ کی طرح ساتھ لگے ہیں — اک روز یہی آپ کو بدنام کریں گے
اُن مست نگاہوں کا سماں دیکھ چکے ہیں — ہم کیا ہوسِ بادۂ گلفام کریں گے

ضیاالآفاق ضیا عباسی :-

میں اپنے دیدہ و دل کس طرح کشادہ کروں — غمِ حیات سے نبٹوں تو شغلِ بادہ کروں

خود اپنے شہر میں رہتے ہیں اجنبی جیسے — دیارِ غیر میں پرساں نہ ہو کوئی جیسے
کلی کلی ہے فسردہ، چمن چمن ماتم — گلوں سے روٹھ گئی ہو شگفتگی جیسے

منظر کلیمی :-

ہاں! عمرِ مختصر! دیرِ محبوب دور ہے — تو ساتھ دے نہ دے مجھے جانا ضرور ہے

ضیا اکبرآبادی :-

قفس کی حد میں خزاں بھی بہت غنیمت ہے — فضائے تنگ میں گنجائش بہار کہاں

ہماری نظر میں

ISLAM IN THEORY AND PRACTICE

از :- مریم جمیلہ ، ضخامت ۳۰۸ صفحات (سرورق ، کتابت ، طباعت اور کاغذ ـــ ہر چیز معیاری اور دیدہ زیب)
قیمت دس روپے
ملنے کا پتہ :- محمد یوسف خاں ، سنت نگر لاہور

محترمہ مریم جمیلہ کا نام علمی اور دینی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ، ان کے مضامین بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوکر اہل علم سے خراج تحسین و ستائش وصول کر چکے ہیں ! یہ اللہ کا کرم اور اسلام کا فیض ہے کہ چند برس میں یہ نومسلم خاتون ایمان و یقین اور فکر و نظر کی کس بلندی پر فائز ہوگئیں ! ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

اس کتاب کا ہر مقالہ انتہائی جان دار ، یقین افروز ، استدلال کے اعتبار سے مطمئن کن اور زبان و بیان کے لحاظ سے حسین و دلکش اور موثر ہے ، محترمہ مریم جمیلہ کی فکر کتنی صحیح اور مستقیم ہے اور ان کے خیالات میں کس قدر سلجھاؤ پایا جاتا ہے ! اسلام اور فطرت کا انہوں نے مطالعہ کس تعمق نظر سے کیا ہے اور اس مطالعہ کا حاصل جب قلم سے " الفاظ " بن کر ظاہر ہوا ہے تو " سحر حلال " بن گیا ہے ۔

مغرب کے نومسلم حضرات کے بارے میں عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ پردہ ، تصویر ، موسیقی بنک کے سود تعدد ازدواج وغیرہ مسائل میں اسلامی فکر سے اپنے کو وہ پوری طرح ہم آہنگ نہیں کر پاتے ، اس قسم کے مسائل میں ان کے اندر جاہلیت کے کچھ نہ کچھ آثار کسی نہ کسی حد تک باقی رہ جاتے ہیں ـــــ مگر محترمہ جمیلہ اس قسم کے تمام مسائل میں خالص دینی زاویہ نگاہ رکھتی ہیں ، اسلام لانے کے بعد اُن کے دل و نگاہ اور جذبات و خیالات پوری طرح مسلمان ہوگئے ہیں اور کفر و جاہلیت کی سیاہی ایمان و یقین کے نور سے بدل گئی ہے اس معصیت زدہ دور میں جب کہ پشت ہا پشت کے نسلی مسلمانوں کے شریف گھرانوں میں " پردے " کو دیس نکالا دیا جا رہا ہے ، محترمہ مریم جمیلہ کا اسلام قبول کرنے کے بعد " پردہ نشین " بن جانا ، اُن کی سعادت مندی اور مکمل ذہنی و فکری انقلاب کی دلیل ہے ۔

اپنی اس کتاب میں فاضل مصنفہ نے بتایا ہے کہ اسلام نظریاتی طور پر دنیا میں کیا رول ادا کرتا ہے ! معاشرے سے اُس کا کیا تعلق ہے ؟ مسلمان عورت سوسائٹی میں کیا کارنامہ انجام دیتی ہے ! اس قسم کے آٹھ مقالے جو ISLAM IN THEORY کے عنوان کے تحت لکھے گئے ہیں ، اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں ، اسلام کی حقانیت اور برتری پر مصنفہ پوری طرح یقین رکھتی ہیں ، اور انسانیت کے لئے اسی دین کو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ترین دین سمجھتی ہیں ، اس لئے ان کی تحریروں میں خلوص و صداقت اور یقین کی تابناکیاں ملتی ہیں ۔

کتاب کا دوسرا باب "ISLAM IN PRACTICE" ہے جو چودہ مضامین پر مشتمل ہے، اس میں انھوں نے ان دینی فرائض کو پیش کیا ہے، جو اسلامی تاریخ میں اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اٹھی ہیں اس کے بعد اسلام کی بعض عظیم شخصیتوں کے حالات و افکار بیان کئے ہیں۔ تیسرے باب میں اس تمام گفتگو کا نتیجہ اور خلاصہ پیش فرمایا ہے۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ نوجوان نسل میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے، جو بڑے لوگ سائنس اور مغربی تمدن کی چکاچوند سے مرعوب ہو کر اسلام کے بارے میں تطبیق کے نام پر کچھ اور طرح سوچنے لگتے ہیں۔ اُن کو خاص طور سے یہ کتاب پڑھنی چاہئے تاکہ اسلام کے بارے میں اُن کا زاویہ نگاہ درست ہو جائے!

یہ معرکہ آراء کتاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے دینی افکار کی صحت اور اثر انگیزی بلکہ کردار سازی کا زندہ ثبوت ہے کہ دور حاضر کے علماء میں مولانا موصوف کی کتابیں پڑھ کر، محترمہ جمیلہ کو یہ تنویر فکر اور پاکیزگی کردار میسر آئی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں استقامت عطا فرمائے۔

ختم نبوت کامل

از :- مولانا مفتی محمد شفیع، ضخامت ۳۹۵ صفحات ڈبل سائز، مجلد، دیدہ زیب سرورق، قیمت مجلد بارہ روپئے

ملنے کا پتہ :- ادارۃ المعارف ڈاکخانہ دارالعلوم کراچی

اس کتاب میں قرآنی آیات، احادیث رسول، اجماع امت صحابہ، تابعین اور ائمہ دین کے اقوال سے مسئلہ ختم نبوت کی قطعیت کو واضح اور موکد کیا گیا ہے، پوری کتاب نقلی اور عقلی دلائل سے لبریز ہے، افہام و تفہیم کا انداز ناصحانہ ہے، گرم و تند اسلوب نگارش سے اجتناب کیا گیا ہے۔ قادیانی جن دلیلوں سے امت کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان دلیلوں کی اس کتاب میں تردید کی گئی ہے، یہاں تک کہ قادیانیت پوری طرح بے نقاب ہو گئی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مرزا غلام احمد (علیہ ما علیہ) کی نبوت کا جھوٹ اور فریب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کسی کی فطرت بالکل ہی مسخ ہو گئی ہو تو دوسری بات ہے ورنہ نگاہ انصاف سے جو کوئی بھی اس کتاب کو پڑھے گا وہ اس نتیجہ پر پہونچ کر رہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر نبوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم فرما دیا گیا۔ دین کامل ہو چکا، اب کسی قسم کے تشریعی یا غیر تشریعی یا ظلی اور بروزی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس قسم کا دعویٰ کرتے ہی، دعویٰ کرنے والا مرتد ہو جاتا ہے اور اس کے ماننے والے بھی دین اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔

وہ جو ایک کمزور روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منسوب کی جاتی ہے اس کے مقابلہ میں حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کی یہ روایت کس قدر محکم اور دوسری احادیث کی تصدیق کرنے والی ہے۔

انا خاتم الانبیاء و مسجدی خاتم مساجد الانبیاء — میں خاتم الانبیاء ہوں اور میری مسجد مساجد انبیاء کی خاتم اور آخر ہے۔

حضرت مفتی صاحب قبلہ نے اس حدیث کی کتنی دلنشین تشریح کی ہے۔

"حاصل یہ ہے کہ آپ کے بعد نہ کوئی نبی پیدا ہوگا اور نہ کسی نبی کی اور مسجد بنے گی"

مسیلمہ کذاب کے دعویٰ نبوت کے سلسلہ میں مفتی صاحب نے کتنی اچھی بات فرمائی ہے۔

"الغرض نبوت و قرآن پر ایمان اور نماز روزہ سب ہی کچھ تھا، مگر ختم نبوت کے بدیہی مسئلہ کے انکار اور دعویٰ نبوت کی وجہ سے مسیلمہ باجماع صحابہ کافر سمجھا گیا۔

—— اور ——

- "آج مرزائیوں کو اپنی اس کوشش پر ناز ہے جس کا نام انہوں نے تبلیغ اسلام رکھا ہے، لیکن مُسیلمہ کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ اگر یہ تبلیغ واقعی اور صحیح اسلام کی تبلیغ بھی ہوتی، تب بھی ان کے عقائد کفریہ کے ہوتے ہوئے اُن کے ہاتھ سوائے خسران کے اور کچھ نہ آتا۔"
- "یہ بھی واضح ہو گیا کہ کسی شخص کے اتباع اور پیرووں کی کثرت اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی ورنہ مسیلمہ کذاب کے متبعین کی کثرت و شوکت و قوت بدرجہ اولیٰ اس کی حقانیت کی دلیل ہوتی"
- "صحابہ کرام کے اس طرز عمل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امت محمدیہ میں سے جو فرقہ کسی اور مدعی نبوت کی پیروی اختیار کر لے وہ اسلام اور مسلمانوں سے اتنا بعید ہے کہ اسلام کے صریح مخالفین یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے مقابلہ کے وقت بھی اُن کو مسلمانوں کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا۔"

شیخ محی الدین عربیؒ کی جس عبارت سے قادیانی جھوٹی نبوت کے لئے استدلال کرتے ہیں، اس عبارت کی حضرت مفتی صاحب نے بڑی بھی تاویل اور تشریح فرمائی ہے، آخر میں موصوف لکھتے ہیں ۔

"الغرض جس بقاء کے شیخ محی الدین ابن عربی قائل ہیں وہ نبوت نہیں اور جو نبوت ہے اُس کی بقاء کے قائل نہیں اور یہی تمام امت کا اجماعی عقیدہ ہے۔"

—— اور اگر ——

"بالفرض شیخ کی مراد ہماری سمجھ میں نہ آتی، تب بھی نصوص قرآن و حدیث اور اجماع صحابہ اور جمہور امت کے متفقہ عقیدہ کو شیخ اکبرؒ کی کسی مبہم عبارت پر شیخ کی جلالت قدر مُسلم ہونے کے باوجود نثار نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ مشہور شعر مفتی صاحب قبلہ نے جو درج فرمایا ہے کہ ۔

رات محفل میں ہر اک مہ پارہ گرم لاف تھا
صبح دم خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا　　　(ص ۲۷۹)

تو اس کے مصرعہ اولیٰ کو انبیا سے نسبت اور بہت و تمثیل میں پیش نہیں کرنا چاہئے، کئی جگہ حضرت مفتی صاحب موصوف فارسی کا یہ شعر ۔

سر ازل کہ عارف سالک بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

لائے ہیں اور مقصود مرزا غلام احمد پر طنز ہے مگر اصل شعر میں "بادہ فروش" کی مدح کا پہلو نکلتا ہے!

ختم نبوت کی قطعیت اور قادیانیت کی تردید میں یہ کتاب ہر اعتبار سے جامع و مانع ہے، کاش! قادیانی اسے غور سے پڑھیں اور انہیں اپنے ارتداد سے اسلام کی طرف واپس آنے کی توفیق میسر آ سکے!

عزیزانِ ندوہ کے نام

از :- پروفیسر رشید احمد صدیقی، ضخامت ۱۴۴ صفحات ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
ملنے کا پتہ :- جمعیۃ الاصلاح ندوۃ العلماء لکھنؤ ۔

یہ وہ مقالہ ہے جو ۳۰ ستمبر ۱۹۶۷ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء کے سلیمانیہ ہال میں اہل علم کے منتخب اجتماع میں پڑھا گیا، یہ مقالہ فکر و نظر کی بلندی اور زبان و ادب کی صحت و دلکشی کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ مدح و توصیف کا مستحق ہے، کیسی کیسی نازک باتوں کو فاضل مقالہ نگار

نے کس طرح سلجھا کر بیان کیا ہے! یہ مقالہ دین ودانش کا شاہکار ہے اس میں مایوسی اور دل شکستگی کی بجائے جوش و ولولہ اور دین سے لگاؤ اور ربط وتعلق ملتا ہے۔

اس عبارت میں کس قدر ادبیت پائی جاتی ہے۔

"قومی زندگی میں جب بھی مشکل مقام آئے گا، ہم کو سرسید کے صحیفہ خدمات کی ورق گردانی کرنی پڑے گی، اور سرسید کی خدمات کی سب سے کھلی ہوئی اور سب سے مستند کتاب "علی گڑھ" ہے"۔

چند اور اقتباسات:-

- "جہاں فرائض کا سوال ہو، وہاں فوائد کے پہلو تلاش کرنا مذہب، معاشرہ، حکومت انسانیت سب سے غداری ہے مسلمان کی زندگی فرائض کی زندگی ہے، فوائد کی زندگی نہیں، مسلمان کے لئے آسائش نہیں آزمائش تقدیر ہو چکی ہے"۔
- "اردو میں جدید شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید زیادہ تر، ناسازگار حالات سے بیزاری اور برہمی کا اظہار ہے، اس بیزاری و برہمی نے اب تک جو ادبی سرمایہ پیش کیا ہے وہ تعداد کے اعتبار سے جتنا زیادہ ہے معیار کے اعتبار سے اتنا ہی ہلکا ہے اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ یہ بغاوت یا تو مخلصانہ نہ تھی یا اس کے علمبرداروں میں شعر وادب کو صحیح خطوط پر لے جانے اور رکھنے کی صلاحیت نہ تھی"۔
- "اُردو کی اعلیٰ شاعری میں اقبال وہ نابغہ ہیں، جو نامعلوم مدت تک "نابغۂ ممتنع" کی حیثیت رکھیں گے"
- "جس طرح قرآن پاک کا معجزہ سیرت رسولؐ ہے اسی طرح عشق رسولؐ کا معجزہ کلام اقبال ہے"۔
- "مجھے یقین ہے کہ یہ بچے اور ناخواندہ نابالغ ایک دفعہ اُردو کی کشش لقش میں داخل ہو جانے کے بعد اس کے تصرف سے باہر نہ ہو سکیں گے"۔
- "میں تو صحیح بات کی خاطر ہارنے والے کا ساتھ دینے کو اپنی سب سے بڑی جیت سمجھتا ہوں"

کہیں کہیں کتاب پڑھنے میں جملے کھٹکے بھی ——

"جہاں کے امراض ہر تدبیر وتریاق کے خلاف امنیت حاصل کرنے کے بعد سفر پر نکلتے ہیں" (ص ۷۴) "امنیت" نامانوس اور اجنبی لفظ ہے —— "حالی مذہب اخلاق اور تہذیب کا نمونہ ہونے کے ساتھ غیر معمولی شاعر اور ادیب بھی تھے" (ص ۶۱) "غیر معمولی کی بجائے کوئی موزوں تر لفظ لاتے تو اچھا تھا —— "اس پر سختی سے نظر ثانی کرنا پڑے گا" (ص ۱۱۶) "نظر ثانی" بالاتفاق مونث ہے اس لئے نظر ثانی کرنی پڑے گی" یا "نظر ثانی کرنا پڑے گی" لکھنا چاہیئے تھا۔ اس کا بعد کا یہ جملہ —

"ابتدا اس حقیقت کو سامنے رکھ کر کرنی پڑے گی"

بھی وجدان کو کھٹکا، قریبی جملوں میں "کرنی پڑے گی" کی تکرار بھلی نہیں لگتی۔

اس کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ ناسازگار ماحول میں کس طرح وقار و خود داری کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں، انہیں مسائل سے کس طرح نمٹنا ہے، ناخوشگوار حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں کیا کرنا چاہیئے؟ پوری کتاب بار بار پڑھنے کے قابل ہے اس میں بڑے باریک نفسیاتی نکتے اور فلسفیانہ اشارے ملتے ہیں جن کے اندر ایک مرد مومن کا دل دھڑک رہا ہے اور ایک مجاہد اہل قلم کی —— روح رواں دواں ہے۔

مکتوبات

مرتبہ :- مولوی ضیاء احمد بدایونی (ایم اے) ضخامت ۲۰۸ صفحات، قیمت دو روپیہ پچاس پیسے

ملنے کا پتہ : - ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد بلڈنگ علی گڑھ

اب سے تقریباً ۳۰ سال قبل ساغر نظامی نے اُن خطوط کا مجموعہ شائع کیا تھا، جو اُن کے نام شاعروں اور ادیبوں نے لکھے تھے !

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے بھی اس قسم کے خطوط کا مجموعہ کتابی شکل میں مرتب فرمایا ہے، مگر اس غرض و غایت کے ساتھ ــ

"شامل اشاعت میں صرف وہ خطوط ہیں، جو نہ تو کسی ادیب وغیرہ کے نتائج نگارش ہیں یا دین میں کسی ادبی مسئلہ سے متعلق استفسار یا بحث ہے"۔

مکتوب نگاروں میں علامہ اقبال سے لیکر حکیم مولوی ظہور الدین عیش سنبھلی تک ہر طبقہ اور فن کے مشاہیر شامل ہیں، بعض خطوں میں کام کی باتیں ملتی ہیں اس کتاب پر فاضل مرتب نے عالمانہ "پیش لفظ" لکھا ہے ۔ مولوی سبطین احمد بدایونی کے خطوط زبان و ادب اور علم و ذہانت کا شاہکار ہیں۔

دل لخت لخت

از :- عروج بدایونی، ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ :- مکتبہ جوہرلال نیر، رام پور (یو۔ پی)

جناب عروج زیدی بدایونی مشہور شاعر ہیں مگر جتنے اچھے شعر وہ کہتے ہیں اس کے لحاظ سے انہیں اور زیادہ مشہور ہونا چاہئے تھا۔ ان کے کلام کا یہ انتخاب مکتبہ جوہر (رام پور) نے شائع کیا ہے۔ عروج بدایونی کی غزلوں میں جوش و تازگی کے ساتھ طہارت فکر ملتی ہے، بعض اشعار میں ان کا اپنا آہنگ بھی پایا جاتا ہے ۔ منتخب اشعار :ــ

حسنِ کردار نے اس درجہ سنوارا ہے مجھے
اپنے ماحول پہ تنقید گوارا ہے مجھے

دنیائے اعتبار میں تم بے مثال ہو
اب کس کا نام لوں میں تمہاری مثال میں

حضورِ دوست جب عرضِ بیاں تک بات جا پہونچی
لبِ خاموش سے اشکِ رواں تک بات جا پہونچی

تجھے بھلانے کی تدبیر کر رہا ہوں میں
خدا کرے مری تدبیر کامیاب نہ ہو

فضا میں گونج رہی ہے صدا! "میں تیرا ہوں"
یہ بازگشت کی آواز ہی جواب نہ ہو

ہزاروں ٹھوکریں کھا کر ملا ہے کوچۂ دوست
اب اس کے بعد۔ کوئی اور انقلاب نہ ہو

اے نگاہِ برق ساماں ! تجھ کو شاید علم ہو
یہ دھواں سا اُٹھ رہا ہے کیوں مرے دل کے قریب

کیا اور چاہتا ہے بتا حسنِ خود نگر
آئینہ بن گیا ہوں میں تیری جناب میں

دم بخود، آنکھوں میں آنسو، خشک لب، چہرہ اُداس
میرا قصہ اب نہ سنئے اپنی حالت دیکھئے

سوزِ دل یوں بڑھ رہا ہے آنسوؤں کے باوجود
جیسے پانی کی جگہ برسے کبھی ساون میں آگ

مری تاریخ حاضر کچھ بتا تو نے تو دیکھا ہے
حقیقت پر زوال آیا تو افسانوں پہ کیا گذری

یہ چاہتا ہے گردشِ دوراں کو روک دے
انسان مشتِ خاک، ارادے فلک مقام

ربطِ حسن و عشق پر سطحی نگاہیں تا بکے
اپنے معیارِ نظر کو اور اونچا کیجئے

میں نشہ بادہ کا منکر تو نہیں لیکن
ساقی کی توجہ کا ہوتا ہے اثر پہلے

کوئی اس حال میں اک سانس نہیں لے سکتا
میں نے جس حال میں جینے کی قسم کھائی ہے

نامہ الفت کا یہ کتنا جواب صاف ہے
حسن نے بھیجا ہے اک سادہ ورق میرے لئے

دوسرا رُخ :-

ایسا نہ ہو کہ عشق کی دُنیا کو پھونک دیں   وہ بجلیاں تو کوند رہی ہیں جمال میں (ص۳)

شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے! جمال میں بجلیوں کا کوندنا محلِ نظر ہے۔

ہر جورِ نادرست کو احساں بنا دیا   اک اہرمن کو عشق نے یزداں بنا دیا (ص۲۵)

شعر میں تکلف کی فراوانی ہے "جورِ نادرست" کی ترکیب بھی وجدان کو کھٹکی۔

نازِ وفا و قدرِ محبت کی جھلکیاں   میرے سوال میں نہ تمہارے جواب میں (ص۳)

مصرعہ اولیٰ صاف اور واضح نہیں ہے!

اس کو تم دیوانگی سمجھو کہ سعیٔ اتحاد   ہم نے دامن کو ہم آغوشِ گریباں کر دیا (ص۴)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ ہم نے دامن اور گریبان کو ایک کر دیا۔ مگر "سعی اتحاد" سے اس مفہوم کی خاطر خواہ ترجمانی کہاں ہوتی ہے۔

آپ اہلِ وفا کے دشمن ہیں   یہ تصور جواں نہ ہو جائے (ص۵۲)

یعنی ———— !! " تصور کے جواں ہونے سے" شاعر کی شاید یہ مراد ہے کہ یہ تصور کہیں یقین کا درجہ حاصل نہ کرے!

جناب عروج زیدی کے اس مجموعہ میں، جہاں اس قسم کے شعر آگئے ہیں :-

قیدِ ایماں کی نہ اس میں کافری کی شرط ہے
ان کی تربت کے لئے خود رفتگی کی شرط ہے
جوہرِ ذاتی نہ ہو تو کیا جلا، کیسی نمود؟
پھول بننے کے لئے نورسِ کلی کی شرط ہے

وہاں اُن کی فن کاری کا عروج نظر آتا ہے ——— عروج کی غزلوں میں صحت زبان اور ندرتِ فکر و خیال پائی جاتی ہے، وہ ایک مخلص اور حساس انسان ہیں اُن کی شاعری اُن کی سیرت و مزاج کی آئینہ دار ہے۔

رُوس کا انقلاب

از :- ستیہ پرکاش، ضخامت ۴۰ صفحات، قیمت پچاس پیسے
ملنے کا پتہ :- نیشنل اکاڈمی ۹ - انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

اس کتابچہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ روس میں اشتراکی انقلاب کن مراحل سے گزرا اور زار شاہی سے لے کر کمیونسٹ مطلق العنانی تک کیسے کیسے سانحے اور المیے پیش آئے، آخری صفحہ کتابچہ کا خلاصہ اور لب لباب ہے :-

" انقلابی طریق کار سے کام لے کر، کمیونزم نے کامیابی کے ساتھ ایک سماجی نظام کو ختم کر کے مطلق العنانہ طور پر دوسرا سماج قائم کر دیا۔ شروع شروع میں کمیونزم کی رہنمائی مساوات اور انسانی اخوت کے دلکش اور انسانی تصورات کرتے تھے، لیکن بعد میں اس نے ان تصورات کو ہر ممکن طریقہ سے اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے پردے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا "

یہ کتابچہ روسی انقلاب کا آئینہ دار ہے، اس کے مطالعہ سے اس انقلاب کے حقیقی خد و خال نگاہ کے سامنے آتے ہیں۔

گُلِ نو

از :- واحد پریمی، ضخامت ۱۴۴ صفحات مجلد، شاعر کی تصویر کے ساتھ، قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ :- مکتبہ صبحِ ادب، نزد مسجد ٹرل والی، بھوپال۔

ن کی رائیں بہ ترتیب حروف تہجی درج ہیں ان سب نے واحد پریمی کے کلام کو سراہا ہے، شاید ہی کسی کتاب کے لیے اتنی بہت سی آراء حاصل کی گئی ہوں!
واحد پریمی جواں سال شاعر ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جب جذبات میں گرمی اور تیزی پائی جاتی ہے اور شاعر شعر و ادب کے ماحول پر چھا جانے کا ارادہ رکھتا ہے! واحد پریمی کی غزلوں میں جذبات کی گرمی ملتی ہے، یہ آگ کہیں دھیمی ہے اور کہیں تیز ہے، اُن کے جمالیاتی ذوق کا یہ عالم ہے

ہے شامِ اودھ گیسوئے دلدار کا پرتو
اور صبحِ بنارس ہے رُخِ یار کا پرتو

ں دوریٹ باب میں بھی تمناؤں اور ارمانوں کے بارے میں اُن کا تجربہ یہ ہے کہ :-

ریت کا تاج محل بن کے بکھر جاتا ہے

واحد پریمی کا تغزل نکھرا ہوا ہے، اظہار جذبات کا بھی وہ سلیقہ رکھتے ہیں، ان کے کلام میں روانی بھی ہے، مگر ابھی اور زیادہ مشق ضرورت ہے، ان کی شاعری ابھی منزلِ آغاز میں ہے، مسلسل مشق، تجربہ اور مطالعہ کے بعد اُن کے کلام میں اور زیادہ نکھار پیدا ہوگا، اور خامیاں رفتہ رفتہ دور ہو جائیں گی۔

منتخب اشعار :-

ہر ایک زخم ہے نسرین و نسترن کی طرح — بہ فیضِ بادِ بہاراں ہے دل چمن کی طرح
نہیں پروا جو راہیں سخت تر ہیں — ہمارا عزم، عزمِ کوہکن ہے
خمِ گیسو کو او سلجھانے والے — جبینِ وقت پر بھی اک شکن ہے
اس طرح ظلمتِ حالات پہ آنسو نہ بہاؤ — سوزِ دل میں ہے تو خود شمعِ فروزاں بن جاؤ
جنسِ وفا کے ہم ہیں خریدار دوستو! — ہے اپنے دم سے گرمیٔ بازار دوستو
آج ان کو بھی سکوں کی ہے تلاش — روشنی کو ڈھونڈتی ہے روشنی
کیوں حقارت سے دیکھتے ہو ہمیں — سنگریزے گہر بھی ہوتے ہیں
نہیں موقوف طوفانوں پہ یارو — سرِ ساحل بھی کشتی ڈوبتی ہے
حیاتِ عشق میں ایسی بھی اک گھڑی آئی — خودی ہی آئی نہ کچھ کام بے خودی آئی
ہم بارہا یہ سوچ کے شکوہ نہ کر سکے — ساقی کے التفات کا کچھ تو بھرم رہے
وہ بھی وقت آتا ہے گلشن میں کہ اہلِ گلشن — مصلحت دیکھ کے کانٹوں سے بہل جاتے ہیں
حیاتِ عشق میں ایسا بھی ایک دور آیا — کوئی خوشی نہ کوئی غم شریکِ حال ہوا
مرحبا کیا حوصلہ میرے شکستہ دل میں ہے — جستجو ساحل کی اک دریائے بے ساحل میں ہے
ستارے سو گئے شمعیں بھی ہو گئیں خاموش — نہ جانے کتنی شب انتظار باقی ہے

دوسرا رُخ :-

نشیمنِ دلِ دیوانہ ہم نے نذر کیا — کوئی بلا جو اٹھی برقِ شعلہ زن کی طرح (ص ۶۵)

شعر میں سادگی کی بجائے تکلف پایا جاتا ہے، "نشیمنِ دلِ دیوانہ" کی ترکیب خاص طور سے محلِ نظر ہے۔

ہمارے جذبۂ کامل کو پوچھتے کیا ہو — ہزاروں سنگ تراشے ہیں کوہکن کی طرح (ص)

مصرعہ ثانی کس قدر بیساختہ ہے، مگر مصرعہ اولیٰ اس کے جوڑ کا نہیں ہے۔

چند معذور سے ہاتھ اور عنانِ تنظیم   دستِ نازک میں چلکتی ہوئی شمشیر کہو   (ص ۶۷)

نومشقوں کا سا اندازِ بیان! "چلکتی ہوئی شمشیر" کا شعری معنویت سے آخر کیا ربط ہے؟

جس پہ انسانیت کا مسکن ہو   میرا کعبہ ہے وہ زمینِ پاک   (ص ۶۸)

خیال بہت پاکیزہ —— مگر شعریت؟

کعبہ و دیر و کلیسا کا تجسس کیوں ہو   جب مرے قلب ہی میں میرا خدا ہے یارو   (ص ۶۹)

مصرعہ اولیٰ میں "کا" کی جگہ "میں" آنا چاہئے تھا — دوسرا مصرعہ پھیکا سا ہے۔

کوزۂ نان کا راز سمجھے گا   ہم اگر ہو رہے کناروں کے   (ص ۷۷)

مصرعہ ثانی بہت خوب ہے، کاش! مصرعہ اولیٰ بھی اسی انداز کا ہوتا۔

تم پرستارِ جفا ہم ہیں نثارانِ وفا   تم سیہ رات ہو تابندہ سحر ہیں ہم لوگ   (ص ۸۰)

واحد پریمی صاحب کئی جگہ "نثار" کی جمع "نثاراں" لائے ہیں، فارسی اور اردو میں "نثار" کی جمع کہاں آتی ہے، ہاں "جاں نثار" کی جمع بولتے اور لکھتے ہیں۔

زخم کھاتے ہیں تیرگی کے اسیر   کتنے بے بس ہیں روشنی کے اسیر   (ص ۸۱)

شعر میں اہمال بھی ہے اور یہ اس لطف سے بھی عاری ہے جو کلام موزوں کو "شعر" بناتا ہے۔

ان کی نگاہِ ناز سے پاکر بہارِ غم   میرا دل فگار ہے اک لالہ زارِ غم   (ص ۸۴)

نگاہِ ناز سے "بہارِ غم" کا پانا، مہمل بات ہے!

زخمِ زیبِ جگر بھی ہوتے ہیں   خار گلہائے تر بھی ہوتے ہیں   (ص ۸۵)

دوسرے مصرعہ کی بے ساختگی کے باوجود بات بنی نہیں۔

جن پہ نظروں سے سجدہ ہوتا ہے   ایسے کچھ سنگِ در بھی ہوتے ہیں

مصرعہ اولیٰ پڑھنے میں زبان تکلف بلکہ ناگواری محسوس کرتی ہے۔

دامنِ مہر کا جلنا تو مسلّم ہے مگر   دامنِ ماہ میں بھی ہم نے شرارے دیکھے   (ص ۸۶)

"دامنِ مہر" ہی ترکیب ہی اول تو بھلی نہیں لگتی، پھر "دامنِ مہر" کا جلنا کس کے نزدیک مسلّم ہے؟

یہاں جو آیا وہ اپنا ہی خون پیتا رہا   بہت پرانی ہے یہ رسم بادہ خانے کی   (ص ۸۷)

مصرعہ اولیٰ غیر شاعرانہ! "بادہ خانہ" کی ترکیب قطعاً نامانوس! اور یہ واقعہ غلط کہ میخانہ میں جو کوئی بھی آتا ہے اُسے شراب پینے کو مطلق نہیں ملتی، بس وہ اپنا ہی خون پیتا رہتا ہے۔ "بادہ خانہ" سے دنیا مراد ہے تو اس کا کوئی قرینہ شعر میں نہیں پایا جاتا۔

شبِ فراق ستم پر ستم ہوا دل پر   تمہاری یاد تمہارا ہی پوچھتی آئی   (ص ۹۱)

شعر میں کتابت کی غلطی اگر نہیں ہوئی تو شعر مہمل بھی ہے اور متبذل بھی ہے۔

ہر مرحلے میں خندہ بلب دیکھ کے ہمیں   اب خود غمِ حیات کے دھارے اداس ہیں   (ص ۹۵)

باشتیاق جو پھولوں کے درمیاں گزرے لئے ہوئے وہی دامن کی دھجیاں گزرے (ص ۱۰۱)

[میرے] خیال اس بیان کسی چیز کا بھی کوئی لطف نہیں ! "باشتیاق" پڑھتے ہی وجدان مکدر ہو گیا۔

ہجوم غم سے ملی ہے حیات نو مجھ کو ہجوم درد سے پایا ہے حوصلہ میں نے (ص ۱۰۸)

[مص]رعہ اولیٰ میں "ہجوم غم" لائے تھے، تو مصرعہ ثانی میں "وفور درد" لانا تھا، "ہجوم" کی تکرار وجدان پر گراں گزرتی ہے۔

قطرہ ہائے خون واحد کتنے خشک ہوتے ہیں

جب دماغ شاعر سے شعر کوئی ڈھلتا ہے (ص ۱۰۹)

[اس] قسم کے اشعار مجموعہ میں شامل ہونے کے قابل ہرگز نہ تھے !

دل میں جب اُن کا غم اُبھر آیا شہر بھی مجھ کو بن نظر آیا (ص ۱۲۵)

[مف]ہوم ادا کرنے کے لئے خاطر خواہ الفاظ نہیں مل سکے !

بار یاب جمال ہو نہ سکی کس قدر بدنصیب ہے فریاد (صفحہ ۱۲۶)

[""]بار یاب بزم جمال" یا "بار یاب بزم دوست" کہنا تھا :

جو ٹکراتے ہیں پیہم موج غم، سیل حوادث سے

اُنہیں ساحل نہ ملنے کا کبھی ماتم نہیں ہوتا (ص ۱۳۰)

[مص]رعہ ثانی زبان کے اعتبار سے غلط ہے۔ "انہیں ماتم نہیں ہوتا" کون بولتا ہے !

ہر وقت جو بدلتی ہو ایسی نظر ہی کیا اُس کی نوازشات بھلا معتبر ہی کیا (ص ۱۴۲)

[مص]رعہ ثانی گنجلک ہے اور "نوازش" کی جمع "نوازشات" غلط ہے،

ان خامیوں کے باوجود "گل نو" میں جگہ جگہ پڑھنے والے کو لطف سخن ملے گا، اُردو شاعری واحد پریمی کے مستقبل سے اچھی توقع [ر]کھتی ہے۔

ایم جی کے پارچہ جات

دیرپا ہوتے ہیں

ماہنامہ فاران کراچی

فروری ۱۹۶۸ء

جلد :- ۱۹

شمارہ :- ۱۱

ایڈیٹر :- ماہر القادری

ترتیب

قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے　پبلشر :- ماہر القادری　چندہ سالانہ :- ۷ روپے

مقام اشاعت :- دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

باہتمام مستفیض صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

ماہ دسمبر ۶۶ء کے "فاران" میں ہم نے تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ جماعتِ اسلامی کس مقصد کے لئے وجود میں آئی تھی ... تک کیا موقف رہا ہے؟ اور معترضین و معاندین نے جماعت کو کس کس طرح ہدفِ طنز و ملامت بنایا ہے؟ جماعت کے حلقوں میں تو اس مضمون کو پسند کیا جانا ہی چاہیے تھا۔ مگر وہ حضرات جو غیر جانب دار ہیں اور جماعت سے کد نہیں رکھتے، انہوں نے بھی ہماری معروضات کو پسند فرمایا، اس قسم کے لوگوں کی پسند اور تحسین بہت کچھ وزن رکھتی ہے! مگر جو صاحبان جماعت کی بدخواہی کو اپنا مشن بنا چکے ہیں اور جو اس دینی ... کے درپے آزار ہیں، اُن کو ہماری سچی باتیں بری لگیں اور ہم پر جماعتِ اسلامی کے "وکیل" بننے کی طنز فرما کر، اپنے دل کا تھوڑا بہت غبار تو نکال ہی لیا۔ ایک وکیل کسی واقعی مجرم کی وکالت محنتانہ لے کر کرتا ہے تو اُس کا یہ فعل نہ صرف مکروہ ہے بلکہ گناہ ہے۔ جس کے لئے اسے ... تعالیٰ کے روبرو جواب دہی کرنی ہوگی، مگر کسی مظلوم کی مدافعت اور وکالت اور وہ بھی "بے مزد" خالصتًہ لوجہ اللہ یہ وہ نیکی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر ملنے کی توقع رکھنی چاہیئے!

جماعتِ اسلامی کے آغازِ تاسیس ہی سے، ہم اُس کے لٹریچر اور روش و موقف کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور اُس کے ارکان سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آتے رہے۔ جماعت کے بارے میں ہم نے کوئی رائے ظن و تخمین اور سُنی سنائی باتوں پر قائم نہیں کی! سالہا سال کے اس مسلسل تجربہ، مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد آخرت کی بازپرس کے پورے احساس و یقین کے ساتھ ہماری یہ رائے ہے کہ جماعتِ اسلامی خیر پسند جماعت ہے اور اُس کے وجود سے ملتِ اسلامیہ اور مسلمانوں کو ہمیشہ فائدہ ہی پہونچا ہے! اور جہاں تک دین کی جامع ... ہمہ گیر تبلیغ و اشاعت کا تعلق ہے، یہ جماعت عالمِ اسلام کی تمام دوسری دینی تنظیموں اور اسلامی اداروں میں ممتاز و منفرد ہے! مگر ... کو کیا کیجیے کہ جماعتِ اسلامی کی یہی ممتاز جامعیت اور ہمہ گیری اُس کے لئے "بلائے جان" ہو گئی ہے! جماعتِ اسلامی کی ہمہ گیر ... کو دیکھ کر اس مصرعہ:—

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

کی معنویت پوری طرح سمجھ میں آئی!

جماعتِ اسلامی کی تائید، مدافعت اور محبت نے ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے کسی غلو میں مبتلا نہیں کیا! جو کوئی جماعتِ اسلامی

لی نہیں رکھتا، یا جماعت میں رہ کر، اُس سے علیحدہ ہوگیا ہے یا اس پر طنز و تشنیع کرتا ہے۔ اس کے ایمان و اسلام کو ہم نا معتبر بتے! ہاں! جماعتِ اسلامی کی دشمنی میں کوئی اس حد تک پہونچ جائے کہ اقامتِ دین ہی کو سرے سے فعل عبث سمجھنے لگے حکومت نزدیک خالص دنیا داری کا کاروبار اور شجرِ ممنوعہ بن گئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی تشریعی ربوبیت میں بو میں میکھ نکالتا ہو۔ اور کی مدافعت بلکہ تائید و تحسین اور مظلوموں پر تہمت تراشی اور اُن کی دل آزاری کو جس کسی نے شیوہ بنا لیا ہو، اُس کا معاملہ دوسرا ہے کی روش و موقف اور فرد و جماعت کی ایسی دشمنی سے ہر صاحبِ ایمان کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ (آمین)

جس طرح پودا اپنے پھول سے اور درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح کسی فرد یا جماعت کو اُس کے قول و فعل سے پہچانا ہے، جماعتِ اسلامی کا لٹریچر جو ہزاروں صفحوں پہ پھیلا ہوا ہے، وہ موجود ہے اس میں عقیدہ کا، دینی ارکان کا، شریعت کا، تک کہ علم کلام کا بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر کفر یا ضلالت کا فتویٰ لگایا جا سکے! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے ذہین وجنہوں نے انگریزی لٹریچر کا بھی خاصہ مطالعہ کیا ہے، مصر کے تجدد پسند علماء کی روش پر جانا چاہئے تھا مگر اللہ تعالیٰ کا اُن پر فضل ہے کہ مودودی صاحب نے ــــــ پردہ، سود، تصویر، مرتد کی سزا، یتیم پوتے کی وراثت، تعددِ ازدواج، خاندانی منصوبہ ی، زکوٰۃ کی شرح، مشین کے ذبیحہ وغیرہ مسائل میں صحیح دینی نقطۂ نگاہ کو پیش کیا ہے، اور سلفِ صالحین کے مزاج و فکر کی ترجمانی ہے، اشتراکیت ہو، ڈارونزم ہو، سیکولرزم اور مغرب زدگی ہو، انکارِ حدیث کی ضلالت ہو یا فتنۂ قادیانیت، مولانا مودودی نے ان پر ان فتنوں سے دست بدست جنگ کی ہے اور ان پر بڑی کاری ضربیں لگائی ہیں، اُن کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اُنھوں نے ذہنِ رسا طبیعت دانا پائی ہے، اُن کی تحریروں میں کمال درجہ کی ادبیت ملتی ہے، کوثر میں دھلی ہوئی زبان اور انتہائی دلنشین اندازِ بیان! ال تک استدلال کا تعلق ہے، مولانا مودودی اس فن کے بادشاہ ہیں! ان کے تبحرِ علمی کی یہ شان لیکن اُن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ وہ تفسیر، ریث اور فقہ کی نزاکتوں اور باریکیوں پر مجتہدانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں، "جبر و قدر" کا مسئلہ کتنا نازک و دقیق، مابہ النزاع اور معرکہ آرا ہے، مولانا موصوف نے ان الجھنوں کو جس طرح سلجھایا ہے، وہ دلیل ہے اُن کی ژرف بینی اور اصابتِ فکر کی! اُن کا مزاج دین سے خاص مناسبت لتا ہے، وہ ایک صاحب الرائے عالم ہیں، دین کا یہ علم انہوں نے اردو ترجموں سے نہیں بلکہ براہِ راست عربی کتابوں سے حاصل کیا ہے "رسائل و مسائل" میں مولانا موصوف نے، تفسیر، فقہ، حدیث، تصوف، علم کلام، تاریخ، تہذیب و تمدن، سائنس، معاشیات دستور کے بوقلموں اور متنوع مسائل کو جس طرح سلجھا کر بیان فرمایا ہے اور اُن کا حل پیش کیا ہے، اُس کی نظیر موجودہ دور کے علماء ی تحریروں میں خال خال ہی ملتی ہے، ان کی ذات اور شخصیت اکابر سلف کے سلسلۃ الذہب کو اُستوار کرتی ہے! مولانا مودودی کی کتابیں جس زبان میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں، اہل علم نے اُن کی تحسین کی ہے، انڈونیشیا سے لے کر ترکستان تک مولانا کی کتابیں پسند کی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ایران میں بھی ان کی کتابوں کے ترجمے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے ہیں، نجد، حجاز، شام، عراق، مصر اردن، الجزائر، قطر، کویت وغیرہ ملکوں کے اکابر علماء مولانا مودودی کے علم و فضل اور ان کی دینی فہم کے معترف و مداح ہیں اور بہت سے تو اُن کے دیکھنے اور اُن سے ملنے کی تمنا رکھتے ہیں! عیسائی اور یہودی علماء دورِ حاضر میں اپنا سب سے بڑا حریف مولانا مودودی کو سمجھتے ہیں! یورپ کی بعض یونیورسٹیوں میں مولانا موصوف کی تصانیف پر اہل علم نے ریسرچ کی ہے مستشرقین نے پاکستان پر جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں سب سے زیادہ ذکر مولانا مودودی ہی کا کیا گیا ہے، فیلڈ مارشل جناب محمد ایوب خاں صدرِ پاکستان نے اپنی سرگزشت

میں علمائے پاکستان پر جو احتساب فرمایا ہے تو اُن میں مولانا مودودی ہی کی تنہا شخصیت کو قابلِ ذکر سمجھا ہے، اُن معاندین اور[illegible] کو کیا کہیئے، جو اس علم و فضل کے آدمی اور بین الاقوامی شہرت کے عالم اور مفکر کو "مکتشی" کہہ کر اُس کی تحقیر کرتے ہیں جو شخص اپنے [illegible] تبحر کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ قدرشناسی کا مستحق ہے، اُس کو بعض علماء "مولوی" اور "مولانا" کے معمولی خطاب و لقب تک کا[illegible] اور سزاوار نہیں سمجھتے ۔ یہ گروہی عصبیت نہیں تو اور کیا ہے! وہ جو غالب نے کہا ہے —

ما مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

تو ———

اس فتنۂ معاصرت کے سبب بعض اکابر اور رجال کار کی شخصیتوں کو اُن کے معاصرین نے اُبھرنے نہیں دیا اور اُن کی اہمیت اور شخصیت کو گھٹانے کی کوشش کی ۔

ہم اس غلو عقیدت میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے مبتلا نہیں ہیں کہ مولانا مودودی کے قلم سے جو کچھ بھی نکل گیا ہے وہ حق کے سوا [illegible] کچھ ہو ہی نہیں سکتا! مودودی صاحب فرشتہ نہیں انسان ہیں، اور دنیا میں آج تک کوئی ایسا مصنف، مفکر اور اہلِ قلم پیدا نہیں ہوا جس کے قلم سے لغزش نہ ہوئی ہو! امام ابوحنیفہ، امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے اکابر تک بھی [illegible] سے محفوظ نہیں رہ سکے، اور ان کے تسامحات پر جب نقد و جرح کی گئی ہے، اس صورت میں مولانا مودودی کی تحریریں تنقید سے بالاتر کس طرح قرار دی جا سکتی ہیں! جب وہ خود حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے "اضطرابات" پر بحث و تنقید کر سکتے ہیں، تو خلیفۂ [illegible] کے مقابلہ میں مودودی صاحب بے چارے کس گنتی میں ہیں کہ اُن کی ذات پر تنقید کو برداشت نہ کیا جائے! اُن کی کتاب "تجدید و احیاءِ [illegible]" ہے، "خلافت و ملوکیت" ہے، حکمتِ عملی کے موضوع پر اُن کے مضامین ہیں جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام جو غلافِ کعبہ کی نمائش ہوئی تھی، اُس کی [illegible] میں مولانا موصوف کی تحریریں ہیں۔ ڈاڑھی کی شرعی مقدار کا مسئلہ ہے۔ اُن میں ایسے پہلو پائے جاتے ہیں جو ایک ناقد کے دل میں کھٹک پیدا کر سکتے ہیں، اور اُن پر تنقید [illegible] جا سکتی ہے! حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اضطرابات پر جرح کے مقابلہ میں تعدیل ہی پسندیدگی کی مستحق ہے، چنانچہ بعض اہلِ علم نے [illegible] جماعتِ اسلامی کو خیر پسند جماعت اور مولانا مودودی کو حق پسند دینی مفکر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کے تمام ابواب سے پوری طرح اتفاق نہیں فرمایا۔

خود مولانا مودودی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ اُن کے قلم سے نکلا ہوا حرف حرف "حق" ہوتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ مولانا مودودی پر جب اُن کا تسامح اور غلطی واضح ہو گئی ہے تو انہوں نے اُس کا شرحِ صدر کے ساتھ اعلان کیا ہے اور غلطی کی اصلاح کر لی ہے۔ راقم الحروف کو اس کا تجربہ ہے کہ مجھ جیسے ابجد شناس نے مولانا موصوف کے بعض تسامحات پر توجہ دلائی تو انہوں نے اپنی تحریر میں مناسب ردوبدل کر دیا۔ ایک بار تو انہوں نے میری "گرفت" پر یہ لکھا کہ آپ نے میری ایک غلطی پر گرفت کی ہے مجھے تو اس عبارت میں ایک [illegible] غلطی بھی نظر آ گئی! زبان و محاورہ کے بارے میں بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ مولانا موصوف کی توجیہ و تاویل مجھے پوری طرح مطمئن نہ کر سکی ——!

اکابر کے ساتھ امت کا اور اسلاف کے ساتھ اخلاف کا یہ سلوک رہا ہے کہ اُن کی چند غلطیوں کے سبب اُنہیں بے اعتبار اور گمراہ نہیں ٹھیرا گیا، اور نہ اُن پر دین کی بدخواہی کی طنز کی گئی، غلطیوں کے باوجود ایک شخص کی بزرگی اور اُس کا احترام باقی رہ سکتا ہے

ضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے اُن کی تحریروں میں بعض شدید قسم کے اسقام بھی پائے
ہی میں اُن کی کتاب "تاویل الاحادیث" حیدرآباد کے ایک ادارے نے شائع کی ہے، جس میں حضرت سیدتنا مریم علیہا السلام
یا الفاظ انہوں نے استعمال کئے ہیں اور جس کیفیت کو بیان کیا ہے اُسے ذوقِ سلیم گوارا نہیں کرسکتا۔ حیرت ہے کہ شاہ صاحب
ت اتنی غیر محتاط نکتہ آفریں کس طرح ہوگئی ــــــ مگر ان اسقام اور لغزشوں کے باوجود حضرت شاہ صاحب امت کے
الاحترام ہیں کہ مجموعی طور پر اُن کی کتابوں سے دین اور معاشرے کو فائدہ ہی پہونچا ہے۔
بسندستان کے قریب اور بعد کے اکابر میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت شیخ الہند
ن اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ عظیم شخصیتیں گذری ہیں ان کی کتابوں میں بھی غلطیاں اور
ئے جاتے ہیں اور ان کے راہوار خامہ بھی کہیں کہیں ٹھوکر کھا گئے ہیں، مگر ان چند کمزوریوں اور تسامحات کے باوجود ان حضرات کی
سلم ہے! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے عقیدہ وعمل اور فکر ونظر کی کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی، جس کے سبب اُنہیں
کا بدخواہ ٹھیرایا جاسکے! اُن کی کتابوں میں خیر کا پہلو غالب ہے۔ وہ دین متین کے قابلِ اعتماد ترجمان اور ثقہ مبلغ ہیں اُن
اور ملت کے درد اور خیر خواہی سے لبریز ہے۔
لانا مودودی کی دعوت صرف تبلیغ صلوٰۃ وزکوٰۃ تک محدود نہیں ہے، وہ اقامتِ دین کی جامع دعوت لیکر اُٹھے ہیں، اور
جماعتی تنظیم سے وابستہ ہوئے ہیں جب کہ موصوف خاموشی کے ساتھ مسلسل بیس سال تک دینی علوم کا مطالعہ کرچکے تھے اور
سرآچکی تھی! اس لئے ان کے افکار وآرا میں ہمہ گیری پائی جاتی ہے! وہ کسی فقہی مذہب سے تعصب نہیں رکھتے، امام ابوحنیفہ ہوں
امام شافعی ہوں یا امام احمد حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ، ان سب کو اپنا امام سمجھتے ہیں، ہندوستان میں وہ غالباً پہلے مقلد عالم
ں نے مسلکِ اہل حدیث کو فقہی مذاہب کی طرح "حق" بتایا ہے، مگر اہل حدیث کے بعض اہلِ قلم نے ان کو اس حق گوئی کا یہ صلہ
مودودی اور جماعتِ اسلامی کو قادیانی گروہ کا مماثل ٹھیرادیا ــــــ اس ناانصافی اور ظلم کی شکایت اللہ تعالیٰ کے سوا اور
ی جاسکتی ہے۔
عوام کے لئے ائمہ فقہ کی تقلید کی افادیت مولانا مودودی واضح کرتے ہیں تو اہلِ حدیث ان سے خفا ہوجاتے ہیں اور جب وہ کسی مسئلہ
بوحنیفہؒ کے قول واجتہاد کے مقابلے میں کسی دوسرے مذہب کے امام کے قول ومسلک کو ترجیح دیتے ہیں تو احناف برہم ہوجاتے ہیں،
یں مولانا مودودی کا مسلک اعتدال وتوازن کا مسلک ہے وہ کسی ایک فقہی مذہب میں حق کو محدود ومحصور نہیں سمجھتے! احناف
طحاویؒ جیسے اکابر علماء گزرے ہیں، جنہوں نے بعض مسائل میں حنفی فقہ کے مسلک پر دوسرے مذاہب فقہ کے مسلک کو ترجیح دی
یا کرنے سے دین کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ تقلید کا ایسا وجوب کہ اپنے اختیار کردہ فقہی مذہب کے کسی مسئلہ کو تحقیق کی بنا پر
ان کے دوسرے فقہی مذہب کے مسئلہ کو اختیار کرلینے کو گناہ سمجھنا، یہ ایک انتہا ہے دوسری انتہا تقلید کو شرک جاننا ہے۔ کوئی
کسی فقہی امام کی تقلید سے نکل جاتے تو وہ دین سے ہرگز نہیں نکلتا۔ کوئی امام اور شیخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح
الاطاعت نہیں ہے! نہ تو مقلدین مشرک ہیں اور نہ غیر مقلدین دین سے خارج ہیں۔ مولانا مودودی ان دونوں انتہاؤں کے
میان معتدل مسلک رکھتے ہیں۔

مولانا مودودی، سنت رسولؐ کو دین میں حجت سمجھتے ہیں، "ترجمان القرآن" کے "منصب رسالت نمبر" میں انہوں نے سنت
ولؐ کی جس حسن وخوبی اور اخلاص ویقین کے ساتھ حمایت کی ہے، بس وہ انہی کا حصہ ہے۔ بعض ایسی احادیث جن کو منکرین حدیث
، خاص طور پر ہدف طنز بنا رکھا ہے اُن کی جیسی دل نشین تطبیق کی ہے وہ اور کسی کے یہاں دیکھنے میں نہیں آئی! ہاں! یہ ضرور ہے
اُن کے نزدیک چند احادیث درایت کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں، مودودی صاحب کی اس تحقیق کو رد کیا جا سکتا ہے، مگر جب کہ وہ سنت
ولؐ کو دین میں حجت سمجھتے ہیں، تو دو چار حدیثوں کو قبول نہ کرنے کی بنا پر اُن کو "منکرین حدیث" کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا، حدیث
، رد وقبول کے معاملہ میں اگر اس اصول کو برتا گیا تو امام رازی جیسے نہ جانے کتنے اکابر کو انکار حدیث کا مجرم ٹھیرانا پڑے گا۔ کوئی شک نہیں
مت رسولؐ دین کا ماخذ ہے، دین میں حجت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت منصوص ہے، اور حضورؐ کا اسوۂ حسنہ انسانیت کے
یے آخری اور قطعی معیار ہے، مگر احادیث کا کوئی صحیح ترین مجموعہ بھی قرآن کریم کی طرح قطعی نہیں ہے کہ اس کی کسی حدیث کے بارے میں درایت
روایت کے اعتبار سے گفتگو ہی نہ کی جا سکے! حیرت ہے کہ جس شخص (مودودی صاحب) نے فتنۂ انکار حدیث کا سب سے زیادہ رد کیا
، اور جس کی قوت استدلال نے منکرین حدیث کو حواس باختہ کر دیا ہو اُسی پر انکار حدیث ہی کی تہمت لگائی جائے!

تصوف اگر "تزکیۂ نفس" کا نام ہے تو اس کی اہمیت اور افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے، مولانا مودودی بھی تزکیۂ نفس کی ضرورت
افادیت کے قائل ہیں، ان کی کتابوں میں بھی تزکیۂ نفس اور اصلاح کے مضامین ملتے ہیں کہ عبادتیں زیادہ سے زیادہ اخلاص کی کیفیت
یدا ہونی چاہئے! صوفیاء کرام نے تبلیغ دین کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اُس کے وہ معترف ہیں، وہ خود بھی اُس خانوادے سے
ملق رکھتے ہیں، جس خانوادے سے اکابر مشائخ چشت نے فیض حاصل کیا ہے! مگر وہ اُس تصوف کے قائل نہیں ہیں جہاں نعرۂ "انا الحق"
تحسین کی جاتی ہے اور منصور حلاج کو امام نے ناز اور عارف کامل سمجھا جاتا ہے! جہاں تصوف شریعت سے ٹکراتا ہے اور توحید غبار آلود
رتی ہے، مودودی صاحب وہاں عقیدت مندوں میں محتسب نظر آتے ہیں: آج مزارات پر جو مشرکانہ رسمیں اور طرح طرح کی بدعتیں ہو
ہی ہیں، اُن کے جواز کے لئے صوفیاء کے ملفوظات ہی سے اہل بدعت نکتے تراشتے ہیں، بعض صوفیاء نے قرآن کریم کی جو تفسیریں کی ہیں
ہ کس درجہ خطرناک اور خدشات سے لبریز ہیں! "متشابہات" جس کے پیچھے پڑنے سے روکا گیا ہے، فن تصوف کا یہی انداز بیان ہے
رآن کریم کا کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" ہے لاموجود الا اللہ یا لا ھو الا ھو نہیں ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہر کسی کے
"الٰہ" ہونے کی نفی کی گئی ہے، یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی شے کائنات میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے! اللہ تعالیٰ سے
کائنات کی نسبت خلق وربوبیت کی ہے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کتنے متشرع بزرگ ہیں مگر جب وہ "تصوف" پر گفتگو
رماتے ہیں، تو ان کے قلم سے ایسی باتیں بھی نکل جاتی ہیں، جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ حضرت حکیم الامت کی تصنیف "التکشف عن
مہمات التصوف" پر ہم "فاران" میں مفصل تبصرہ کر چکے ہیں! "تزکیۂ نفس" کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ ثابت اور مسلّم ہے مگر "تصوف"
کی فنی اصطلاحات، کشف وواردات اور بعض صوفیاء کے دعوے، یہ باتیں ذہن وفکر میں خاصی الجھن پیدا کرتی ہیں، طریقت کو مغز
ور شریعت کو قشر سمجھنا، یہ تقسیم ہی غلط ہے، اصل چیز دین وشریعت ہی ہیں، اسی کسوٹی پر ہر کسی کے قول وفعل کو پرکھا جانا چاہئے!
مولانا مودودی نے اس عجمی تصوف پر احتساب کیا ہے، جہاں خالق اور مخلوق کو۔

✓ من تو شدم تو من شدی

ٹھیرایا جاتا ہے ! قانون شخصیتوں سے بالاتر ہے، یہاں بزرگوں کی ذات سے بدگمانی اور بدعقیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور
ل پیدا کرنا چاہئے ! کتاب وسنت وہ معیار ہے جس پر ان کے اقوال واعمال اور نظریات وافکار کو جانچا جاتا ہے ! جو چیز اس
ری نہیں اترتی وہ رد کردینے ہی کے قابل ہے چاہے اس کی نسبت کتنی ہی عظیم شخصیت سے کیوں نہ ہو ! مثلاً اسرارِ غیب معلوم
ششش اور ہر چیز کے باطن اور غیب سے واقف ہونے کی سعی ، تکلیف مالایطاق نہیں تو اور کیا ہے ، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ
عین کی سیرت میں اس قسم کی سعی اور جد وجہد کا پتہ نہیں ملتا مثلاً تصوف میں "حقیقت محمدی" جس کشف وعرفان کا عنوان ہے
یک جھلک علامہ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھی جاسکتی ہے ۔۔ وہ لکھتے ہیں کہ جبریل نے "حقیقت محمدی" رحم مریم
ک دی تھی ، اس لئے حضرت عیسیٰ کو "ابن محمد" کہنا چاہئے ! یہ کشف اور لطیفہ قرآنی تعلیم کے مخالف جاتا ہے ، کیونکہ قرآن
عیسیٰ کی ابنیت کی نسبت کسی مرد سے نہیں کرتا ــــ اسی قسم کے عجیب غریب لطائف ، اسرار اور وجد وکشف کے نکتے تصوف
ی تعدادمیں ملتے ہیں ، جسے اللہ کی دین کی حفاظت مطلوب ومقصود ہوگی ، وہ ان لطائف کی تحسین نہیں کرسکتا ۔ مولانا مودودی نے اسی
ہ تصوف پر احتساب کیا ہے !

جماعت اسلامی کا لٹریچر جس میں مولانا مودودی کی تحریروں کا غالب عنصر ہے ، دین کی متوازن ترجمانی کرتا ہے اس میں یہ تقاضائے
ت کہیں کہیں کوتاہیاں اور کمزوریاں بھی ہیں ، مگر مجموعی طور پر جماعت کا پیش کیا ہوا دینی لٹریچر اپنے اندر بہت کچھ افادیت رکھتا ہے
پڑھ کر ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی دین سے قریب ہوگئے ہیں اور جو دین سے قریب تھے وہ قریب تر ہوگئے ہیں ۔

جماعت اسلامی کا معاملہ سیاسی پارٹیوں کی طرح نہیں ہے جو لوگوں کو گھیر گھار کر اپنا ممبر بناتی ہیں ، جماعت میں رکنیت کے لئے
اوقات کئی کئی سال تک امیدواری کرنی پڑتی ہے ، جماعت کے ارکان امیدوار کے حالات کا اپنی امکانی حد تک پتہ لگاتے ہیں کہ
لند اور حق العباد کے معاملہ میں اس شخص کے کیا حالات وکوائف ہیں ؟ جماعت کے ارکان دینی احکام کی پابندی کرنے میں متساہل
ہیں جماعت کے دفتروں کو ہم نے دیکھا ہے کہ نماز کے وقت دفتری کام بند کردیا جاتا ہے اور عمال وکارکن جماعت کے ساتھ نماز
رتے ہیں ، اسی طرح دین کے دوسرے ارکان کی پابندی بھی کی جاتی ہے ۔ جماعت کے سالانہ اجتماعات میں ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہے
ح کی نماز جو لوگوں پر شاق گزرتی ہے وہ اس طرح باجماعت ادا ہوتی ہے کہ جلسہ گاہ میں ٹھیرے ہوئے لوگوں کی ننانوے فی صدی تعداد جماعت
شریک ہوتی ہے ! جماعت کے ارکان جن میں اس کے امیر مولانا مودودی بھی شامل ہیں روزی اور روزگار و معیشت کے معاملے میں
ے محتاط واقع ہوتے ہیں ، اکل حلال کے لئے انہوں نے غلط اور مشتبہ ذرائع کی منفعت سے محرومی گوارا کرلی ہے ، سامنے کی بات
ہے کہ تبلیغی جماعت کے ارکان بنکوں (BANKS) میں ملازم ہیں ، مگر جماعت اسلامی کے کسی رکن کا بھی بنک سے ملازمت کا تعلق نہیں
ہے ۔ جماعت کے بعض ارکان تہجد کے بھی پابند ہیں ، جماعت کے حلقوں میں درسِ قرآن اور درسِ حدیث بھی ہوتا ہے ! جماعت کے ارکان
بندوں کے حقوق ادا کرنے میں دوسرے دیندار لوگوں سے پیچھے نہیں ہیں ، ان کے محلہ اور پاس پڑوس کے لینے والے ارکان جماعت
ن خوش معاملگی اور منتعلق زندگی کی شہادت دیں گے ! جماعت والے اچھے مسلمان بھی ہیں اور اچھے شہری بھی ہیں ! ان میں انفاق
ی سبیل اللہ کا جذبہ اور امورِ خیر میں ایثار وقربانی کا داعیہ پایا جاتا ہے ! وہ جن سرکاری دفتروں یا تجارتی اداروں میں ملازم ہیں وہاں
ان کی فرض شناسی اور دیانت وسچائی کا لوگ آپس میں ذکر کرتے ہیں ! کھانے پینے ، رہنے سہنے ، جلسوں کے اہتمام اور دفتروں

کی تنظیم میں جو سلیقہ ان میں پایا جاتا ہے۔ اُس نے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی اس طنز کو کہ مذہبی لوگ سادہ لوح اور بے سلیقہ ہوتے ہیں باطل ٹھرا دیا ہے! ارکان جماعت اپنے وقت اور پیسہ کی قربانی دے کر دوسروں تک بھی دین و اخلاق کا پیغام پہونچاتے ہیں! جماعت کے لٹریچر اور اُس کے ارکان کی شریفانہ زندگی سے متاثر ہو کر، ہزاروں نہیں لاکھوں مسلمانوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب آیا ہے! خدا جانتا ہے کہ راقم الحروف کو جماعت سے متاثر طلبا کی صاف ستھری اور صالحانہ زندگی دیکھ کر ہمیشہ ندامت ہوئی ہے کہ یہاں "قال" زیادہ ہے اور حال بہت کم ہے! اور ان نوجوانوں میں قال کم اور "حال" کی فراوانی ہے! کالجوں کی لڑکیاں اس کی شہادت دیں گی کہ جماعت اسلامی سے متاثر طلبا کتنے نیک، باحیا اور صاحب کردار ہیں! اعمال کے اخلاص کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ ہم تو ظاہر ہی پر قیاس کر سکتے ہیں جہاں تک دین و اخلاق کی پابندی اور حق اللہ اور حق العباد کے ادا کرنے کا تعلق ہے، جماعتِ اسلامی کے ارکان کسی بھی دینی جماعت سے گھٹ کر نہیں ہیں! اعمال میں حُسن و خوبی اور اخلاص و للّٰہیت کی کوئی حد و نہایت نہیں زیادہ سے زیادہ اخلاص کے بعد بھی اللہ کے نیک بندے یہی محسوس کرتے ہیں کہ اخلاص کا واقعی حق کہاں ادا ہوا ہے ــــ مگر ضعفِ اعتقاد و عمل کے اس زمانے میں ایسی زندگی جس پر اچھے مسلمان اور اچھے شہری کا اطلاق ہوتا ہے، اُس زندگی کے اچھے نمونے جماعت اسلامی کے ارکان کی سیرت و کردار میں ملتے ہیں۔

جماعت اسلامی کا کوئی رکن عہدہ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کرتا، جلسوں اور جلوسوں میں پیش پیش رہنے اور شہرت و نمود کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کا اُن میں سرے سے کوئی داعیہ ہی نہیں پایا جاتا، اُن کے جلسوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ جماعت کا رکن جو ایم۔اے تک تعلیم حاصل کر چکا ہے، سائیکلوں کی نگرانی کر رہا ہے اور ایک عالم دین اسٹیج پر بیٹھنے کی بجائے جلسہ گاہ کے دروازے پر ہینڈبل بانٹ رہا ہے جماعت کا کوئی رکن عہدہ حاصل کرنے کے لئے کنویسنگ نہیں کر سکتا اور نہ کسی عہدے کا امیدوار بن سکتا ہے۔ سال کے سال جماعت کے جو انتخاب ہوتے ہیں اُن میں کبھی کوئی نزاع اور اختلاف سننے میں نہیں آیا!

جماعت کے حلقوں میں اجتماعی طور پر درسِ قرآن ہوتا ہے وہ خود بھی فرداً فرداً تلاوتِ قرآن کرتے ہیں مگر اُن کے یہاں مروجہ انداز پر "ختم قرآن" نہیں ہوتا، اسی طرح درسِ حدیث کے ساتھ "ختم بخاری شریف" کا بھی اُن کے یہاں دستور نہیں ہے، جماعت کے ارکان کو پڑھنے کے لئے نہ تو شجرے دیئے جاتے ہیں نہ ان سے الا اللہ کی ضربیں لگوائی جاتی ہیں اور نہ وہ پاسِ انفاس کرتے ہیں نہ وہ صلوٰۃ معکوس اور صلوٰۃ غوثیہ سے واقف ہیں، امیر جماعت کی نہ وہ دست بوسی کرتے ہیں۔ اور نہ اُن کے جھوٹے کھانے اور پہنے ہوئے کپڑوں کو "متبرک" سمجھتے ہیں، مولانا کے سامنے ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکتا ہے۔ اپنی مجلس میں مولانا ہنسی مذاق کی باتیں بھی کر لیتے ہیں! ارکانِ جماعت نہ تو قوالیاں سنتے ہیں اور نہ عرسوں میں شریک ہوتے ہیں اور نہ اس قسم کی دوسری بدعتوں میں مبتلا ہیں! قیام معروف کی تبلیغ کے ساتھ وہ منکر پر نکیر بھی کرتے رہتے ہیں۔ کتنے ہی مقامات پر انہوں نے رقص و سرود کے مظاہروں اور کھیل تماشوں اور سینما گھروں کی تعمیر رکوانے کے لئے شدید احتجاج کیا ہے! جماعت اسلامی کی دیانت و صداقت دیکھ کر عوام اُس پر اعتماد کرتے ہیں، بقرعید پر تمام قومی اداروں کے مقابلے میں جماعت ہی کو قربانی کی کھالیں سب سے زیادہ تعداد میں ملتی ہیں۔ عوام نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور تجربہ کیا ہے کہ جماعت رفاہی کاموں میں کس خلوص و دیانت اور جفاکشی کے ساتھ ایک ایک پائی صحیح طور پر خرچ کرتی ہے! جماعت کے جلسوں میں سلیقہ اور احتیاط و کفایت شعاری کا یہ عالم ہے کہ دوسری جماعتیں اور پارٹیاں غالباً ایک لاکھ روپے میں بھی اس قدر قرینہ اور خوش نمائی کے ساتھ اہتمام نہ کر سکیں، جتنا اچھا اہتمام جماعت چند ہزار روپیوں میں کرتی ہے! دین آدمی کی دنیا کو بھی سنوارتا ہے اور دنیا کو

سلیقہ اور حسن و خوبی کے ساتھ برتنے کے طریقے سکھاتا ہے۔

جماعت اسلامی کے متفقین اور متاثرین دنیا کے مختلف ملکوں میں پائے جاتے ہیں، اس لئے جماعت کے کام کی نوعیت ہر جگہ ایک ہی جیسی نہیں ہے، حالات کے لحاظ سے کام کرنے کے طریقے متعین کئے جاتے ہیں اور وہ ضرورتاً بدلے بھی جاسکتے ہیں، نجد و حجاز، ایران اور افغانستان میں جماعت کا کوئی آدمی "ملوکیت" کی تردید سے اپنے کام کا آغاز کرے۔ تو اُس سے زیادہ احمق کون ہوگا، امریکہ میں صرف اتنا کام ہی شروع میں ہو جائے کہ مستشرقین نے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں، اُن کو دُور کر دیا جائے، تو یہ بھی اقامتِ دین ہی کا کام ہے! فرانس، انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک میں اسلامی نظام حکومت کے قیام کی تحریک شروع نہیں کی جاسکتی۔ وہاں عیسائیوں اور یہودیوں کو کلمہ پڑھوا کر مسلمان بنا دینا ہی دین کی بہت بڑی خدمت ہے! ہندوستان کی جماعت اسلامی پاکستان کی جماعت سے تنظیم کا کوئی تعلق نہیں رکھتی مگر ہندوستان میں یہ جماعت کس جرأت اور بے خوفی اور عزیمت و استقامت کے ساتھ دین کی تبلیغ کر رہی ہے، پاکستان کی جماعت اسلامی کو شروع ہی سے اس معرکہ آرا مہم سے سابقہ پڑا کہ پاکستان میں کس انداز کی حکومت اور کس طرح کا قانون اور دستور ہونا چاہئے! جماعت اسلامی نے مطالبہ کیا کہ پاکستان اسلام کے نام پہ بنا ہے، یہاں مسلمانوں کی اکثریت بھی ہے، اس ملک کے دستور کی تشکیل کتاب و سنت کی اساس پہ ہونی لازمی اور ضروری ہے اور پاکستان کا نظام حکومت اسلامی ہونا چاہئے! اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے جماعت اسلامی نے ایسی شدید جدوجہد کی اور اس کو ان مراحل میں اس قدر شدائد سے دوچار ہونا پڑا کہ کوئی دوسری سیاسی پارٹی ہوتی تو سب ان چھوڑ کے بھاگ کھڑی ہوتی یا ناسازگاری حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیتی، مگر جماعت اللہ تعالیٰ کے فضل سے پامردی اور جرأت کے ساتھ جمی رہی یہ کام ہی ایسی نوعیت کا تھا جس کے لئے جماعت کو جلوس بھی نکالنے پڑے پریس کانفرنسیں بھی کرنی پڑیں، پروپیگنڈے کا بھی سہارا لینا پڑا یہاں تک کہ دستور ساز اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی جماعت نے حصہ لیا، اصول نہیں بلکہ تدبیر کی حد تک بعض ایسی صورتیں اور ذرائع بھی جماعت کو اپنانے پڑے، جو مغرب کی تنظیم سیاست سے ملتے جلتے تھے، مگر ان کے اختیار کرنے میں کوئی دینی قباحت نہ تھی، سامنے کی بات یہ ہے کہ آج مسلمانوں کو جہاد میں یورپ امریکہ اور روس کے جنگی اسلحہ اور طریقوں سے کام لئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور ایسا کرنا ——— دین کے کسی اصول کے منافی نہیں ہے، ہاں! جہاد میں اسلام کے ضابطہ اخلاق کی پابندی کرنی ضروری ہے!

جماعت اسلامی نے انتخابات میں حصہ لے کر سیاست کی تطہیر کا ریکارڈ قائم کر دیا، اس نے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کیا اور اس پوری مہم میں دین کے کسی فریضہ کے ادا کرنے میں تساہل نہیں برتا۔

جماعت اسلامی کے ارکان نے اقامتِ دین کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ طرح طرح کے نقصانات بھی اٹھائے ہیں مگر کوئی دباؤ، خوف، دھمکی، لالچ، دھونس اور دھاندلی اُن کے کردار میں لچک پیدا نہیں کر سکی، معاشرے میں جن کو شاخ گل اور ابریشم و حریر پایا گیا ہے، حق کی حمایت میں وہ سنگِ خارا ثابت ہوتے ہیں، جن کو توڑا تو جاسکتا ہے مگر جھکایا نہیں جاسکتا۔

جماعت کے ساتھ حکومت کا جو برتاؤ رہا ہے، وہ سب پہ آشکارا ہے مگر پاک و ہند کی جنگ میں جماعت نے حکومت کے جھنڈے کے نیچے مدافعت کا فرض انجام دیا اور اس معرکہ میں جماعت کی خدمات تمام دوسری پارٹیوں اور اداروں سے بڑھ چڑھ کر ہیں! ضلع کے ڈپٹی کمشنروں، پولیس کپتانوں اور دوسرے عہدیداروں کو بھی تجربہ ہو گیا کہ جماعت اسلامی کتنی فعال اور اصول پسند جماعت ہے

جس کی وضاحت پر پوری طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے ۔

ہم پر طنز کی جا سکتی ہے کہ تم نے جماعت کے مناقب بیان کرکے اُس کے ارکان کے نفس کو غذا پہونچائی ہے ، مگر اس نوبت پر جب کہ جماعت اسلامی کو قادیانیوں سے تشبیہ دی جارہی ہے اُس کے وجود کو اسلام کے لئے خطرہ بتایا جارہا ہے' اُس پر امریکہ اور اسرائیل کے ایجنٹ ہونے کی تہمت لگائی جارہی ہے ——— ہمارے ضمیر نے ہمیں اس کے لئے اُبھارا کہ جماعت کے افکار و کردار اور اقوال و اعمال منظر عام پر لے آئیں تاکہ لوگ حقیقت حال سے واقف ہوکر ان غلط فہمیوں اور بدگمانیوں سے بچ سکیں جو جماعت کے بارے میں پھیلائی جارہی ہیں

تہمتیں

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پر جو تہمتیں جوڑی گئی ہیں ، اُن کی وضاحت ، کذب بیانی اور افتراء پردازی کی بھی کوئی حد انتہا ہے ! مجاہدین کشمیر اور بھارت کے مابین جو معرکہ آرائی ہوئی ہے ، اس سلسلہ میں مولانا مودودی سے یہ فتویٰ منسوب کیا گیا کہ انہوں نے اس جنگ میں مارے جانے والے مسلمانوں کے لئے کہا ہے کہ وہ حرام موت اور سور رکھنے کی موت مرے ہیں ! کئی سال تک مسلسل تہمت اور کذب و افترا کی اس مہم کو چلایا گیا ——— مولانا مودودی کی تحریروں کو دانستہ توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ، جماعت اسلامی کو خوارج اور قادیانیوں کے مسلک ضلال سے تشبیہ دی گئی ۔ پاکستان جب بنا ہے تو یہ کہا گیا کہ جماعت اسلامی کو بھارت سے منی آرڈر آتے ہیں ، جب یہ دروغ فروغ نہ پاسکا تو امریکہ سے سازباز کا الزام لگایا گیا ۔ اور اب یہ کہا جارہا ہے کہ جماعت اسلامی والے اسرائیل کے ایجنٹ ہیں ، ہر دور میں ایک نیا الزام ، ایک نئی تہمت اور جماعت کو بدنام اور مطعون کرنے کے لئے ایک نیا منصوبہ ! کوئی نئی تہمت نہ تراشی جاسکی تو پھر انہی تہمتوں اور الزاموں کی تکرار اور اعادہ !

حضرت سیدنا عثمان غنی ، حضرت امیر معاویہ ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم ، مروان اور یزید کے بارے میں بعض اکابر مورخین اور علماء نے جو باتیں کہی ہیں ، انہی کو مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں دہرایا ہے' اگر یہ باتیں سراسر تہمت ہیں اور ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے ، تو پھر ان تمام مورخین ، مفکرین اور اہل علم کو " رافضی " قرار دیا جائے ——— ! مگر ہو یہ رہا ہے ان تمام اکابر کو چھوڑ کر مولانا مودودی کی ذات ہدف ملامت بنی ہوئی ہے ! یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ چاروں خلفا راشد تھے اور خلافت کی زمانی ترتیب حق تھی ، تمام صحابہ کرام عدول تھے ، اُن کا احترام و محبت ہمارے ایمان کا تقاضا ہے ، اور اجماع صحابہ کتاب و سنت کے بعد دین میں حجت ہے ——— کسی صحابی کے قول و فعل پر " تنقید " رفض " نہیں ہے ! اگر یہ رفض اور توہین صحابہ ہے تو صاحب ہدایہ کو اس مخمصے سے کس طرح نکالئے گا ۔ جنہوں نے حضرت معاویہ کو " سلطان جائر " کہا ہے ! سامنے کی بات یہ ہے کہ جن مورخین نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے اضطرابات کا ذکر کیا ہے' وہ حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کو مطعون کرنے کے لئے اُن کے دور سے بھی اضطرابات منسوب کرسکتے تھے ، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا ۔ اگر تاریخ کو یکسر غلط ٹھیرا دیا گیا تو خلافتِ راشدہ کے مناقب و محاسن کے لئے کس کتاب کو ماخذ بنایا جائے گا !

انقلاب و تضاد

جماعتوں اور پارٹیوں میں لوگ شامل بھی ہوتے رہتے ہیں اور نکلتے بھی رہتے ہیں ! جماعت اسلامی سے بعض ایسے ارکان بھی علیحدہ ہوئے ہیں جنہوں نے پریس میں بیانات دئے ہیں ان میں بعض تو پھر خاموش ہوگئے اور چند حضرات جماعت کی تنقیص اور تردید میں مسلسل لگے ہوئے ہیں ! ہم نے گزشتہ مضمون میں عرض کیا تھا کہ مولانا امین احسن اصلاحی جماعت کے بے رحم نقاد ہیں ، جو جماعت کی دشمنی میں عدل و انصاف کی معروف حدود سے بھی گذر جاتے ہیں ! انہوں نے جماعت کو " گم کردہ راہ " کہا ، اُس کے بعد انتخاب صدارت کا جو معرکہ آرائی ہوئی ، تو فرمایا :-

"جماعت اسلامی کے متعلق تو ہماری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے لئے اس ملک میں اس سے زیادہ مضر جماعت کوئی نہیں ہے (میثاق - ماہ شعبان ١٣٨٣ھ)

اور

"اس نازک موقعہ پر اس بات کو یاد رکھئے کہ دین وعقل دونوں سے بعید تر جماعت اس ملک میں اگر کوئی ہے، تو جماعت اسلامی ہے"

جماعت کے بارے میں مسلسل مخالفت نے اُن کا یہ مزاج بنا دیا ہے کہ جہاں چٹکی لینی چاہئے وہاں وہ خنجر بھونک دیتے ہیں! ماہ دسمبر ٦٧ء "نقش اول" میں ہم مولانا اصلاحی صاحب کی تحریر کا اقتباس نقل کر چکے ہیں جس میں انہوں نے جماعت اسلامی پر امریکہ اور اسرائیل کے ایجنٹ ہونے کی تہمت لگائی ہے! اب اُن کا مزاج یہ ہو گیا ہے کہ جماعت جس کی تعریف کرتی ہے اُس کی وہ مذمت فرماتے ہیں اور جماعت جس پر احتساب کرتی ہے، اُس کے وہ مدح خواں اور قدر شناس ہیں۔ ہفت روزہ "المنبر" (لائل پور) کے اخوان المسلمون نمبر (جنوری ١٩٥٥ء) کا تراشہ ہمارے سامنے ہے، جس میں مولانا موصوف کا پیام شائع ہوا ہے، اُس میں انہوں نے ارشاد فرمایا تھا:-

"ہماری تاریخ کے اس دورِ انحطاط میں اخوان نے اللہ کے راستہ میں قربانی و فدویت کی جو شاندار مثال قائم کی ہے، وہ اس قابل ہے کہ اس کا چرچا گھر گھر پھیلے...... الاخوان کی داستانِ مظلومیت اگرچہ اس پہلو سے نہایت درد انگیز اور دل شکن ہے کہ ہمارے دیرینہ دشمن انگریزوں اور خدا کی مغضوب قوم یہودیوں نے اُن کو تباہ کرنے کے لئے جو اسکیم بنائی، اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے والے ہاتھ ان کو ہمارے ہی اندر مل گئے.........

........ان واقعات کے اندر غلبۂ حق کی سب سے پہلی نشانی ہم نے یہ دیکھی کہ مصر کی فوجی آمریت نے اگرچہ اخوان کے خلاف بہتان تراشی کی مہم چلانے میں اپنی پوری طاقت صرف کر ڈالی اور تمام خبر رساں ایجنسیوں نے اس مہم کو کامیاب بنانے میں اُس کا پورا پورا ساتھ دیا، لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے، جس کا انکار اخوان کے بدتر دشمن بھی نہیں کر سکتے کہ آج دنیا کی نگاہوں میں اخوان بالکل بے گناہ ہیں اور جمال عبدالناصر نے ان کے خلاف دنیا کو جو کچھ باور کرانے کی کوشش کی ہے، اس کو اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں ——— کے سوا کسی نے بھی کذب و افترا کے ایک لاطائل ہنگامہ سے زیادہ وقعت نہیں دی۔

اس داستانِ مظلومیت کا تیسرا پہلو جو کبھی بھی نہیں بھلایا جا سکتا وہ یہ ہے کہ الحمد للہ آج اس دورِ انحطاط و زوال میں بھی ایسے نفوس قدسیہ موجود ہیں، دس بیس کی تعداد میں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں جو محض اس جرم میں وہ اللہ کے کلمہ کی سربلندی چاہتے ہیں، گرم سلاخوں سے داغے گئے، کوڑوں سے پیٹے گئے، وحشیانہ اور ذلیل کرنے والی ایذاؤں کے نشانے بنائے گئے بغیر کسی ثبوت جرم کے بیس بیس تیس تیس کے لئے جیلوں میں بھر دئیے گئے ہیں اور بالکل بے گناہ

پھانسیوں پر چڑھائے گئے، لیکن یہ ساری مصیبتیں انہوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کی ہیں، ایک شخص بھی ان ہزاروں اشخاص میں سے ایسا نہیں نکلا ہے جو ان چیزوں سے مرعوب ہو کر حق سے منحرف ہو گیا ہو۔

یہ باطل کے مقابل میں حق کی کامیابی کی ایسی شہادت .[illegible]. اس دور میں ہمارے لئے صرف اخوان نے فراہم کی ہے۔ [illegible]. ہماری تاریخ میں ایسے روشن باب کا اضافہ ہے، جو اگر نہ ہوا ہوتا، تو ہمارے اس دور کی تاریخ ہماری آنے والی نسلوں کے لئے بالکل بے معنیٰ ہو کر رہ جاتی۔

جن جانباز حق پرستوں نے جان کی بازیاں کھیل کر تاریخ کے اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی ہے وہ بلاشبہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ہم خود بھی ان کی ایک ایک چیز کو یاد رکھیں اور اس کی یاد اپنے بعد آنے والوں کے لئے بھی ورثہ میں چھوڑیں۔

اللہ تعالیٰ رحمت و برکت نازل کرے اُن سعید روحوں پر جو راہِ حق کی آخری بازی کھیلنے میں کامیاب ہو گئیں اور صبر و استقامت نازل کرے ہمارے ان بھائیوں پر جو آج مصر کی جیلوں میں طرح طرح کی اذیتیں جھیل رہے ہیں اور طمانیت و سکون نصیب کرے ان بہنوں، بیٹیوں، ماؤں اور بچوں پر جن کے دل آج زخمی اور جن کے سینے فگار ہیں "

اور اب

ن جماعت اسلامی کی دشمنی میں مولانا اصلاحی کی اس طرح "قلب ماہیت" ہوئی ہے کہ جس "باطل" کے مقابلہ میں اخوان نے شہادت حق دی تھی، باطل مولانا موصوف کا ممدوح بن گیا ہے۔ اور اُسے وہ تاریخ کا بہت بڑا ہیرو سمجھتے ہیں اور اخوان پر جن دل ہلا دینے والے مظالم کا ہوں نے ذکر کیا تھا وہ اب "زیادتیاں" بن کر رہ گئے ہیں، اور یہ "زیادتیاں" بھی مشتبہ ہیں، ممکن ہے ہوئی ہوں اور نہ بھی ہوئی ہوں۔ ظلم کو اپنی ائدت اور تحسین و تائید کے لئے ایسے ثقہ وکیل اور پیرو کار شاذ و نادر ہی ملے ہوں گے۔

محمود عباسی صاحب وہ بزرگ ہیں جو مروان اور یزید کے مداح و قدر شناس اور حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے متعصب ناقد ، عباسی صاحب حضرت علی کرم اللہ وجہ اور اُن کے مقدس خانوادے سے بغض و عداوت رکھتے ہیں، ان کی کتابوں میں حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ اور آپ کے اعوان و انصار کی تنقیص کی گئی ہے، وہ اپنی پرائیویٹ صحبتوں میں جگر گوشۂ رسول حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا پر پھبتیاں کسنے سے نہیں چوکتے! ان کی کتابیں ناصبیوں کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتی ہیں، مولانا مودودی کا مسلک جو حقیقت میں حق کا مسلک ہے اس کی بالکل ضد ہے، مودودی صاحب کے نزدیک علیؓ و معاویہؓ کی نزاع میں حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنا سب کچھ لٹا کر شہادت حق کا فریضہ انجام دیا تھا، یزید امت کا مبغوض اور حضرت حسینؓ سب کے محبوب! رسولانا امین احسن اصلاحی کے رسالہ "میثاق" میں محمود عباسی کی کتابوں کی مدح سرائی کی گئی ہے اور انہیں فن تاریخ کا محقق ٹھیرایا

[illegible] سیاہی گرنے کے سبب الفاظ پڑھے نہیں جاسکے۔

گیا ہے ـــــــ

مولانا مودودی کی "خلافت و ملوکیت" پر محمود عباسی نے جو کتاب لکھی ہے، اُس کی مدح و توصیف مولانا اصلاحی صاحب کو اس لئے بھی کرنی تھی کہ اس سے مودودی صاحب کی شخصیت مجروح ہوتی ہے، لیکن مشکل یہ آن پڑی تھی کہ حضرت سیدنا عثمان غنی اور حضرت امیر معاویہ کے بارے میں خود ان کے قلم سے بھی ایسی باتیں نکل گئی ہیں، جن سے مولانا مودودی کے موقف کی تائید ہوتی ہے اس کے لئے انہوں نے اپنی پہلے کی کہی ہوئی باتوں سے رجوع کرلیا، دسمبر ۶۶ء کے "میثاق" میں مولانا موصوف لکھتے ہیں :ـــ

"نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی کبھی عام تاریخی روایات کے اثر سے میرے قلم سے بھی وہی باتیں نکل گئی ہیں جو تمام تر جھوٹ اور افترا ہیں ...."

"... اگر خود میری کتابوں میں بھی کوئی بات سیدنا عثمان غنیؓ اور سیدنا امیر معاویہؓ کے متعلق نکل گئی ہے جو تحقیق سے جھوٹی ثابت ہوگئی ہے تو میں نے اس سے رجوع کرلیا ....."

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی دشمنی میں مولانا اصلاحی صاحب کو نہ جانے اپنی کس کس بات سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئے گی اور کس کس مظلوم پر طنز اور کس کس ظالم کی مدافعت اور تحسین کرنی پڑے گی :

ـــ ساری دنیا جانتی ہے کہ جمال عبدالناصر کے دور میں "نحن ابناء الفراعنہ" کا نعرہ ایجاد کیا گیا ہے، مصری حکومت کے ڈاک کے ٹکٹوں پر فرعون اور ابوالہول کی تصویریں چھاپی گئی ہیں، قاہرہ کی شاہراہ کے چوراہے پر ریامیس کا بت نصب کیا گیا ہے، جس کے عینی شاہد موجود ہیں، یہ "فرعونیت کا احیاء" نہیں تو اور کیا ہے مگر مولانا امین احسن اصلاحی ان سورج سے زیادہ روشن و واضح، واقعات کی بھی کس دیدہ دلیری سے تردید فرماتے ہیں :ـــ

"... آج جمال عبدالناصر پر فرعونیت کے احیاء کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ سب سامراجیوں کا پروپیگنڈا ہے ....
جو لوگ بلا تحقیق اس قسم کی باتیں پھیلا رہے ہیں، میرے نزدیک وہ اسلام کی نہیں بلکہ بلا واسطہ اسرائیل کی خدمت کر رہے ہیں (جولائی ۱۹۶۲ء)

سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی واقعہ کی تحقیق کا معیار اُن کے نزدیک کیا ہے ؟ اور جو کوئی جمال عبدالناصر پر زبانِ تنقید کھولتا ہے وہ اسرائیل کا ایجنٹ اور کارندہ اُسی آن بن جاتا ہے ۔

جماعت اسلامی نے ہر دور میں حکومتوں کی پر احتساب کیا ہے اور نشاندہی کی ہے کہ فلاں فلاں بات غلط ہو رہی ہے، موجودہ دور میں بھی وہ احتساب کے اس فریضہ کو ادا کر رہی ہے! اس معاملہ میں مولانا امین احسن اصلاحی کا رنگ یہ ہے :ـــ

"حکومت کو مجبوری یہ ہے کہ اس غریب کو کیا خبر کہ کیا چیز اسلامی ہے اور کیا چیز غیر اسلامی ہے وہ تو رہنمائی حاصل کرسکتی ہے، جب کونسل اس کو رہنمائی ہی نہ دے تو آخر وہ کیا کرے اور مجالس قانون ساز کے سامنے کیا پیش کرے۔ (ماہنامہ میثاق، اگست ۶۳ء)

کس بھولپن کے ساتھ مولانا اصلاحی نے حکومت کی طرف سے صفائی پیش کی ہے ـــــ سود، قمار، شراب، زناکاری اس قسم کی برائیاں

جو ایک قلی اور چپراسی تک کو معلوم ہیں، اُن کے لئے کسی کونسل اور کمیشن کی رائے حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کے بارے میں کونسل کے لئے بغیر سب سے پہلے قانونی قدغن لگنی چاہئے تھی! مولانا نے اس افسوسناک صورتِ حال کی ساری ذمہ داری کونسل پر ڈال دی ہے کہ وہ اپنا فرض ادا نہیں کرتی اور حکومت غریب کیا کرے وہ بالکل بے خبر ہے۔

۱۹۶۳ء میں لاہور کے طلباء کے ساتھ پولیس نے جو سلوک کیا تھا اُس سے پاکستان کے عوام کو دکھ ہوا، مگر اس واقعہ میں بھی مولانا اصلاحی صاحب نے حکومت کی مدح و منقبت کا پہلو نکال لیا۔

"پچھلے دنوں طلبہ کی طرف سے جو ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا، خوشی ہے کہ حکومت نے اپنے حُسنِ تدبیر سے اس پر اُس پر قابو پا لیا، اور حالات زیادہ خراب نہ ہونے پائے"۔ (نومبر، دسمبر ۶۳ء)

حکومت کے اس "حسنِ تدبیر" میں "طاقت" کس حد تک شریک تھی، اس تصویر کا یہ رخ مولانا اصلاحی کو اس لئے نظر نہیں آیا کہ اُن دنوں ان کی آنکھیں شاید دکھ رہی تھیں۔

پاکستان میں صدر کے انتخاب کے بعد حضرت مولانا اصلاحی مدظلہٗ صاحب "تدبرِ قرآن" کے تاثرات پڑھنے اور عبرت حاصل کرنے کے قابل ہیں، فرماتے ہیں :-

"صدر ایوب پہلے شخص ہیں، جو فی الواقع عوام کے ووٹ سے منتخب ہو کر اس ملک کے صدر بنے ہیں۔۔
پولنگ کے لئے جو قواعد و ضوابط اختیار کئے گئے، ان قواعد و ضوابط نے ممکن حد تک دھاندلی
اور دھونس کے امکانات کا سدباب کر دیا، انسانی کاموں میں جو احتیاط ممکن تھی وہ اختیار کی گئی۔۔۔"

(میثاق، رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ)

اس انتخاب کے سلسلہ میں نہ اخبارات میں مولانا اصلاحی نے کچھ پڑھا نہ لوگوں کی زبانی واقعات اُن کے کانوں تک پہنچے، نہ عوام کے رجحان کا انہیں پتہ چلا، نہ اس کا انہیں علم ہے کہ انتخاب میں جو کچھ ہوا۔ اس کی تفصیل "قرطاسِ اسود" (BLACK PAPER) کی صورت میں شائع کرنے کا جماعت اسلامی کی طرف سے اعلان کیا گیا، تو اُس زمانہ کے گورنر نواب کالاباغ (مقتول) نے آرڈی ننس کے ذریعہ اُس پر پابندی لگا دی ـــــ حالانکہ۔

"آں راکہ حساب پاک است، از محاسبہ چہ باک" (گلستاں)

انہی مولانا اصلاحی صاحب نے اب ایک ایسی نئی دینی تنظیم کی بنا ڈالی ہے، جس کے ارکان پہلے اپنی ذات پر دین کو قائم کریں گے پھر اپنے گھر والوں پر، اُس کے بعد دوستوں اور عزیزوں پر۔ بڑی مبارک تنظیم ہے، اللہ تعالیٰ برکت اور کامیابی عطا فرمائے (آمین) مگر جب کسی فرد و جماعت کی دشمنی اس حد تک رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے کہ عدل و انصاف کے معروف تقاضوں کا بھی حق ادا نہ ہو سکے، خوب و ناخوب کا معیار بدل جائے، ظلم اور مظلومیت کی نسبتیں اور قدریں الٹ دی جائیں۔ اس صورت میں اپنی ذات اور اقربا پر جو دین قائم ہوگا اس میں بے نفسی اور للّٰہیت کتنی ہوگی! اس نئی دینی تنظیم کے کتابچہ میں لفظ "جماعت" پر طنز کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ اس طنز کا مصداق غریب "جماعت اسلامی" ہی ہو سکتی ہے، جب تک یہ حضرات، جماعت سے وابستہ رہے اس وقت تک اس لفظ کی غرابت ذہن میں نہیں آئی، یہ انکشاف جماعت سے نکلنے کے بعد ہوا ہے ـــــ اس انکشاف کے بعد اہل سنت والجماعت کو چاہئے کہ وہ اب سے اپنے کو "اہل سنت

[illegible] کہا کریں! مگر انبیاء اور صحابہ کے قدم بہ قدم چلنے والے یہ بھی بتا دیں کہ کیا صحابہ یا تابعین نے اصلاح حال کے لئے امت ہی میں
[illegible]یسی دینی تنظیم قائم کی تھی اور اس تنظیم میں صدر، معتمد اور خازن کے عہدے بھی قائم فرماتے تھے، یورپ کے "آرگنائزیشنوں"
(ORGANISATIONS) کے انداز و نہج پر یہ دینی تنظیم کیسی[1]! پھر اس نئی دینی تنظیم کے کتابچہ میں یہ اشارے بھی ملتے ہیں جن
[illegible] ذہن اس طرف جاتا ہے کہ مسلم ممالک کے ارباب اقتدار تو بڑے خیر پسند اور اسلام دوست واقع ہوئے ہیں، ان غلط قسم کے
[illegible]نے انہیں ٹوک ٹوک کر اور ان پر سخت تنقیدیں کر کر کے، ضد کی کیفیت پیدا کر دی، اور اس طرح دین کے قائم نہ ہونے دینے کے اصل
[illegible]، ارباب اقتدار نہیں بلکہ اُن کے ناقدین ہی ہیں، اب یہ نئی دینی تنظیم "ائمۃ المسلمین" کی خیر خواہ اور دوست بن کر اس فریضہ کو انجام
[illegible] اگر اس نئی تنظیم" کی کوششوں سے اصلاحِ حال ہو جائے تو چشمِ ما روشن اور دلِ ما شاد!
ان حضرات سے ہماری گزارش اور انتہائی مخلصانہ گزارش یہ ہے کہ اپنی ذات پر دین قائم کرتے ہوئے، اپنے دل و دماغ کو دوسروں کی
[illegible] اور تعصب و عناد کے زنگ سے بھی پاک صاف کرلیں اور کسی کی دشمنی میں عدل و انصاف کی حدود سے نہ گزر جائیں اور دین کے مخلص
[illegible]گزاروں کو دین کا بدخواہ ثابت کرنے کی کوشش سے دست بردار ہو جائیں! حیرت ہے کہ جو لوگ ارباب اقتدار کو خیر خواہانہ انداز میں وعظ و
[illegible]ن کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں، وہ دین کی خدمت کرنے والوں پر تنقید کرتے ہوئے اس قدر بے رحم اور سفاک کس طرح بن جاتے ہیں! ان
[illegible] کوئی نرم گوشہ نہیں، ان کے کسی قول و فعل کے لئے تاویل و تعبیل کا کوئی نکتہ نہیں سوجھتا، بلکہ ان پر اُلٹی تہمتیں لگائی جاتی ہیں دوسری
[illegible] جہاں ـــ اُمید بھی ہے اور خوف بھی ہے، وہاں ذہانت بڑی سے بڑی غلطی، زیادتی اور دھاندلی کو ہلکا اور پھیکا بنانے کے لئے
[illegible]ہتی ہے! دینداری جب اس قسم کا روپ دھارتی ہے تو خود دین چیخنے لگتا ہے ـ
کہ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

ماہر القادری
۲۴ جنوری ۱۹۶۸ء

---

[1] یعنی جن چیزوں پر یہ حضرات طنز کیا کرتے ہیں، اُسی کو اختیار بھی فرماتے جاتے ہیں ـ

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے خطر علاج ہے
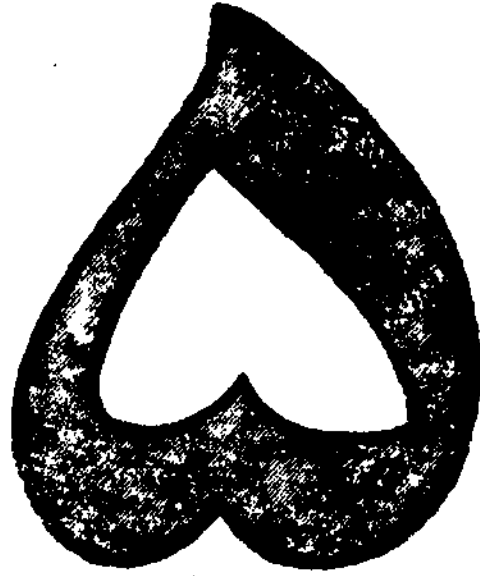
وحید نظمی (ایم۔ اے)
لیکچرار اردو کالج کراچی

ابونصر الفارابی

(۲۵۹ھ / ۸۷۰ء تا ۳۳۹ھ / ۹۵۰ء)

(اپنے علم و فکر، ذہنی بیداری، نکتہ رسی، گہرائی، باریک بینی اور اختراعی صلاحیتوں کے اعتبار سے فارابی نہ صرف یونان کے اکابر فلسفیوں کے برابر بلکہ کئی مقامات پر اُن سے بڑھ گیا ہے۔ فلسفہ کی پوری وسعتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اس سے متعلقہ جتنے بھی علوم ہو سکتے ہیں ان میں سے ہر علم پر ماہرانہ انداز میں قلم اُٹھانا اور اعلیٰ ترین معیار کی سَو سے زیادہ کتابیں لکھ دینا فاراب کے اس فرزندِ جلیل ہی کا کام تھا۔)

پیدائش اور نام و نسب

ابونصر محمد بن محمد بن اوزلغ بن ترخان اصلاً ایرانی النسل تھا لیکن اس کے آباؤ اجداد کافی عرصہ پہلے ایران سے ترکِ سکونت کر کے ترکستان چلے گئے تھے، اور وہیں پر مستقلاً آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۲۵۹ھ (۸۷۰ء) میں ابونصر ترکستان ہی کے ایک شہر فاراب میں پیدا ہوا اور اسی نسبت سے فارابی کہلایا۔

فارابی کی زندگی کے ابتدائی حالات کسی تذکرے میں محفوظ نہیں کئے جا سکے۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اُسے بچپن ہی سے اپنے آبائی پیشے (سپہگری) سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اس کے برعکس اس کا دل و دماغ علم و فنون کی طرف زیادہ متوجہ تھا چنانچہ اس نے ابتدا ہی میں متعدد زبانیں سیکھ لی تھیں۔ ابن خلکان کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فارابی پچاس ساٹھ زبانیں جانتا تھا۔ خود اُس نے ایک موقع پر بیان کیا ہے کہ وہ ستر سے زیادہ زبانوں کا ماہر تھا۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ فارابی ایک غیر معمولی ذہن کا مالک تھا اور جس کثرت سے اس نے زبانیں سیکھی تھیں۔ ان میں بلا مبالغہ وہ بالکل منفرد تھا۔

ء ابن خلکان

بغداد میں قیام

ے زمانے میں علوم و فنون کا سب سے بڑا مرکز بغداد تھا جہاں دنیا کے بڑے بڑے اہل کمال جمع تھے ۔ اور علوم و فنون کے
ن عالم سے یہاں آکر کسب کمال کیا کرتے تھے ، فارابی کے دل میں بھی بغداد پہونچنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ ابن خلکان کی روایت
ا اپنے وطن سے بغداد آیا یہاں سے وہ حران گیا اور وہاں سے پھر بغداد واپس آیا اور آکر اب اس نے تحصیل اور تدریس کا
ـد شروع کر دیا ۔ اپنی کتابوں کا بہت بڑا حصہ اس نے بغداد ہی میں تصنیف کیا ۔
ـمانہ کیونکہ مسلمانوں کے عروج اور استیلا کا زمانہ تھا اس لئے سلطنت عباسیہ کے علاوہ بھی متمدن دنیا کے ایک بڑے حصے
ان بولی اور سمجھی جاتی تھی اور حقیقی اعتبار سے اس عہد کی سب سے بڑی علمی زبان عربی ہی تھی ۔ اس لئے باوجود کئی زبانوں
ـکے ، فارابی کی اصل توجہ عربی ہی کی جانب مرکوز رہی چنانچہ بغداد پہونچنے کے بعد اس نے اپنی کافی محنت اور صلاحیت اسی
ـکی کہ وہ عربی زبان پر حاوی ہو جائے ۔ اس کے اسالیب پر پوری قدرت حاصل کرے اور اس کے طرز بیان کے ہر پہلو کو
ـمیں لے لے[1] ۔ چنانچہ اس کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ :-

> " فارابی کو عربی زبان پر ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی ، وہ حسن ادا ، خوبی تحریر ، دل آویزی بیان کا مالک تھا ۔ دقیق معنی کو سیاف اور ستھرے الفاظ میں اس طرح اور اس خوبی سے بیان کرتا تھا کہ وہ پانی ہو جاتے تھے ، چنانچہ اس کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علمائے منطق میں سے بعض کا قول ہے کہ وہ معانی جزلہ کو الفاظ سہلہ سے عام فہم بنا دیتا تھا ۔ وہ تفہیم معنی کے ایسے راستے پر چلتا تھا ، ہر اعتبار سے مفید مقصد تھا[2] "

اپنے علوم کی پیش کش کا ذریعہ بھی اس نے عربی ہی کو بنایا تھا اس لئے اس کی تمام تصانیف کی زبان عربی ہے ۔
ـے علاوہ فارابی کو فلسفہ و حکمت کی اشاعت و ارتقا کی پوری تاریخ سے بھی گہری دلچسپی تھی چنانچہ اس نے قدیم یونانی فلسفیوں سے
ـا اپنے زمانے تک کے فلسفہ کی پوری تاریخ بھی مرتب کر ڈالی ۔ اس کی اس کوشش سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تاریخ فلسفہ کی درمیانی
ـو غائب ہو چکی تھیں دوبارہ دستیاب ہو گئیں ۔

سفر اور سیاحت

حصول علم کے دوران میں فارابی کا کوئی مستقر نہیں تھا ۔ جہاں وہ جم کر بیٹھ گیا ہو بلکہ وہ تحصیل علم کے لئے برابر ایک شہر سے دوسرے
ـا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا کرتا تھا ۔ آج یہاں ہے کل وہاں ۔ کبھی اس شہر میں ہے اور پھر کسی دوسری بستی میں ۔ جہاں بھی

ـبی کی جانب فارابی کے غیر معمولی انہماک کی وجہ سے بعض تذکرہ نویسوں کو یہ غلط فہمی نصیب پیدا ہوئی ہے کہ فارابی جب بغداد پہونچا تو وہ
ـے بالکل نا آشنا تھا ۔ یہ بات غلط ہے کیونکہ عربی اس کے وطن میں بھی علمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج تھی اور اہل علم اس زبان سے
ـواقف ہوتا تھا ۔ فارابی جو اپنے زمانے کی تقریباً تمام ہی زبانوں سے واقف تھا ۔ عربی سے کس طرح نا آشنا رہ سکتا تھا ۔

اُسے کسی اہل علم کا سراغ لگا بس اس نے بوریہ بستر باندھا اور اس سے اکتسابِ فیض کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ غرض یہ کہ تحصیل علم کے زمانہ میں اس کا کوئی ایک مستقر نہیں تھا۔ بلکہ وہ برابر رواں دواں اور سرگرم سفر رہتا تھا۔ جن مقامات پر اس نے زیادہ قیام کیا ان میں سب سے پہلے فاراب سے ترکِ وطن کر کے بغداد آیا اور یہیں مقیم ہو گیا۔ لیکن بغداد سے حرّان گیا اور پھر واپس بغداد آ گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بغداد آنے سے پہلے وہ کچھ عرصے خراسان میں بھی مقیم رہ چکا تھا۔ بغداد سے وہ شام گیا اور وہاں بھی ایک مدت تک مقیم رہ کر بغداد واپس آ گیا۔ (۲) تمام عرصے میں بغداد کو کم و بیش اس کے مستقر کی سی حیثیت حاصل رہی لیکن اس کے بعد اس کو مصر جانا پڑا اور ایک عرصہ وہیں گزارنے کے بعد بغداد سے دل برداشتہ ہو کر حلب پہنچا اور وہاں سیف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اور اپنی زندگی کا ایک حصہ وہیں بسر کیا اس کے بعد جب سیف الدولہ دمشق گیا تو فارابی کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ چنانچہ اپنی عمر کا بالکل آخری حصہ فارابی نے دمشق ہی میں بسر کیا۔ اب یہ اس کے سفر کی گویا آخری منزل تھی اور وہ زندگی کی اسی سالہ طویل مسافت طے کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے تھک کر اب ۳۳۹ھ (۹۵۰ء) میں اپنا رختِ سفر کھول دیا اور سرمدی راحت حاصل کرنے کے لئے اسی سرزمین میں ہمیشہ کے لئے محوِ خواب ہو گیا۔

اخلاق و عادات

فارابی ایک عظیم مفکر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑا صوفی اور زاہد بھی تھا۔ اُسے جاہ و مرتبت یا زر و مال کی کوئی پروا نہ تھی۔ طبیعت میں تنہائی پسندی اور عزلت پسندی موجود تھی۔ دنیا کے ہنگاموں سے بہت دور رہتا تھا۔ انتہا یہ کہ اس نے اسی سال کی طویل عمر پائی لیکن کبھی شادی نہ کی[1] چنانچہ اس کے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی۔ وہ ہر وقت ایک پرسکون ماحول اور خموشی کا دلدادہ تھا اور یہ سکون اور خموشی وہ اس لئے چاہتا تھا کہ اپنے نفس کی تقویم کر سکے۔ اور اس کی خواہش کو صرف حق کے لئے مائل کر سکے۔ چنانچہ جب وہ اپنی تقویم نفس میں کامیاب ہو گیا تو اس نے دوسروں کے نفس کی اصلاح کا کام شروع کر دیا۔ اس کے مزاج میں قناعت بھی بہت زیادہ تھی جس زمانے میں سیف الدولہ کے دربار سے وابستہ تھا تو دنیوی اعتبار سے بڑی شان و شوکت کی زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن وہ اس کے بیت المال سے صرف چار درہم روزانہ لیا کرتا تھا اور اپنی کل ضروریات اسی میں پوری کرتا تھا۔ سیف الدولہ کی یہ خواہش تھی کہ وہ بیت المال سے اتنا وظیفہ حاصل کیا کرے کہ جس سے اس کی زندگی خوشحال تر ہو جائے۔ لیکن فارابی اس کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوا۔ اس کے دل کو مال و دولت سے کوئی لگاؤ ہی نہ تھا اور نہ اس کا دل وطن کی محبت میں گرفتار رہتا تھا وہ ان دونوں پر علم اور صرف علم کو ترجیح دیتا تھا۔ علم ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھا اور علم ہی اس کے قلب و روح کے لئے سامانِ تسکین تھا۔ علم کی محبت نے اس میں حکیمانہ وقار اور خود داری پیدا کر دی تھی۔ وہ بڑا خود شناس شخص تھا۔ نہ کبھی چاپلوسی کرتا تھا اور نہ دربار داری اس کو پسند تھی۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ پوری مملکت میں جو شخص سب سے زیادہ صاف گو اور بیباک تھا وہ یہی فیلسوفِ اعظم تھا۔

فارابی اشعار بھی کہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے تین اشعار میں زندگی کی عکاسی اس طرح کی ہے:-

"میں نے دو پیالوں پر اپنی پوری عمر گذار دی اور انہیں دو پر اپنے کل معاملات کو ختم کر دیا۔
ایک پیالہ روشنائی سے لبریز تھا اور دوسرا شراب سے ایک سے میں نے فلسفہ و حکمت

---

[1] فارابی کے اس عمل کو فلسفہ کی کسی دلیل سے درست نہیں ثابت کیا جا سکتا۔

کی تدوین کی اور دوسرے سے اپنے دل کے غموں کو دور کرتا رہا ۲ سلے

حصولِ حکمت کے شرائط

ابی نے فلسفہ وحکمت کی تحصیل کے لئے جو شرائط مقرر کئے ہیں ان سے بھی اس کی اخلاقی اور دینی حالت کا اندازہ ہوتا ہے وہ

"جو شخص علم وحکمت کو شروع کرنا چاہتا ہے اس کو جوان، صحیح المزاج اور نیک لوگوں کے اخلاق کا پابند ہونا چاہئے اور سب سے پہلے اس کو قرآن پاک، لغت اور شرعی علوم کی تحصیل کرنی چاہئے اس کو پاکباز اور سچا ہونا چاہئے۔ بدکاری، فریب، خیانت اور مکر وحیلے سے اجتناب کرنا چاہئے اس کو معاش کی طرف سے مطمئن ہونا چاہئے اور ہمیشہ شرعی اعمال کو ادا کرنا چاہئے اور شریعت کے ارکان و آداب میں سے کسی کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔ علم اور علماء کی عزت کرنا چاہئے اور علم اور اہل علم کے سوا کسی دوسری چیز کی قدر نہیں کرنی چاہئے۔ اس کو یہ بھی چاہئے علم کو کسب معاش کا ذریعہ نہ بنائے۔ جو شخص اس کے خلاف عمل کرتا ہے وہ جھوٹا حکیم ہے۔ اس کا شمار حکماء میں نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کا علم دنیا میں اس کے اخلاق کی اصلاح اور تہذیب نہیں کرتا وہ آخرت میں بھی سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ سعادت کی تکمیل مکارم اخلاق سے ہوتی ہے جس طرح درخت کی تکمیل پھل سے ہوتی ہے"

تصانیف

فارابی کی اکثر کتابیں ضائع ہو گئیں، اب بہت کم ہیں جو موجود ہیں۔ چنانچہ اسی وقت کے باعث نہ اس کی مؤلفات وتصانیف کی مکمل تاریخ بیان کی جا سکی اور نہ اس پر کبھی اتفاق آرا ہو سکا۔ جو کتابیں ضائع ہونے سے بچ رہی ہیں ان کی تعداد بھی ایک سو تک پہونچ گئی ہے۔ جن علوم وفنون پر یہ کتابیں مشتمل ہیں ان کا نقشہ ذیل میں درج ہے:-

	علم یا فن	تعداد کتب
۱۔	منطق	۴۳
۲۔	علوم تعالیم	۱۱
۳۔	طبیعات	۱۰
۴۔	الٰہیات	۱۱
۵۔	اخلاقیات	۷
۶۔	سیاسیات	۷

ہاس محمود (مصری) مؤلف "الفارابی" کی تحقیق یہ ہے کہ فارابی شراب بالکل نہیں پیتا تھا۔ یہاں جام سے شراب کا ذکر کیا ہے وہ اصطلاح شاعری کے پیچھے۔ سلے تاریخ الحکماء "شہرزوری" بحوالہ حکمائے اسلام۔

۷ـ	شروح وتعلیمات	۱۱
۸ـ	متفرقات	۱۲
	کل تعداد	۱۱۷

ان کتابوں میں سے بیشتر شائع ہو چکی ہیں اوران کے عربی قلمی نسخے بھی دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں یہ کتابیں آج بھی محفوظ ہیں۔ جہاں سے یہ کتابیں شائع ہوئیں اور جن کتب خانوں میں یہ کتابیں آج بھی موجود ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:۔
برٹش میوزیم۔ آکسفورڈ۔ پیرس۔ میونخ (جرمنی) برلن۔ لیڈن۔ ویانا۔ بلینبرج۔ اسکوریال۔ اولسال۔ برسلو دارالکتب مصریہ۔ مکتبہ تیمور پاشا۔ ایاصوفیہ (ترکی) جامعہ ازہر (مصر) اور ہندوستان وغیرہ۔
پھران کتابوں کے اصل عربی سے دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ترجمے بھی کئے جا چکے ہیں۔ جن زبانوں میں ترجمے کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں: انگریزی۔ فرانسیسی۔ لاطینی۔ جرمن۔ عبرانی اور فارسی وغیرہ۔
فارابی کی تصانیف کی تعداد کے علاوہ مختلف علوم وفنون میں اس کو جو دستگاہ حاصل تھی اور جس انتہائی ذہن کا وہ مالک تھا اس کی آئینہ دار بھی یہی کتابیں ہیں اوران میں سے ہر کتاب اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے زندۂ جاوید ہے۔ فلسفہ کی پوری وسعتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے متعلقہ جتنے بھی علوم ہو سکتے ہیں ان میں سے ہر علم پہ ماہرانہ انداز میں قلم اٹھانا اور اعلیٰ ترین معیار کی سو سے زیادہ کتابیں لکھ دینا فاراب کے اس فرزند جلیل ہی کا کام تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس کے بعد مشرق ومغرب میں جتنے بھی بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے سب ہی نے اس کی کتابوں سے استفادہ کیا۔

حکمت اور فلسفہ

(انسان موجوداتِ عالم کی جو تحقیق اور جستجو کرتا ہے وہ فلسفہ ہے، فلسفہ ظن اور تخمین پر نہیں بلکہ یقین اور حقیقت پر مبنی ہوتا ہے اوراس کے حصول کی غایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے جو اس کائنات کا خالق اور مرتب ہے)

فلسفہ کی تعریف

فلسفہ نام ہے علمِ موجودات کا یعنی انسان اپنی قدرت اور صلاحیت کے مطابق موجوداتِ عالم کے حقائق کی جو کچھ تحقیق اور جستجو کرتا ہے وہی فلسفہ ہے۔ ان موجودات میں بعض امور ایسے ہیں جو ہمارے قبضۂ قدرت سے باہر ہیں اور بعض امور ایسے ہیں جو ہمارے دائرہ اختیار میں ہیں۔ فارابی کے نزدیک یہ دونوں ہی قسم کے امور فلسفہ کا موضوع ہیں۔ وہ فلسفہ کو ایک ایسا علم قرار دیتا ہے جو ظن اور تخمین پر نہیں بلکہ یقین اور حقیقت پر مبنی ہوتا ہے اوراس علم کے حصول کی غایت یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی معرفت حاصل کی جائے جو اپنی ذات وصفات میں واحد ویکتا ہے اور تمام اشیاء کی علتِ فاعلہ ہے اور اپنی حکمت، عدالت اور ربوبیت کے لحاظ سے اس کائنات کا خالق اور مرتب ہے یہ علم اس کے نزدیک بہت مشکل ہے اوراس کا حصول ہر شخص کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اس کو صرف وہ شخص حاصل کر سکتا ہے

ن شرائط پر پورا اترتا ہو۔ اس کے اشکال کی دوسری وجہ یہ ہے کہ فارابی جس علم کو فلسفہ قرار دیتا ہے وہ علم اور عمل دونوں کا ہے۔ علمیت کا پہلو یہ ہے کہ اس کے پیش نظر پہلے اصلاحِ نفس ہو اور پھر اصلاحِ غیر یعنی پہلے اصلاحِ منزل پھر اصلاحِ ... فلسفہ کا ایسا مدعی جس کی زندگی ان دونوں خصوصیات کی حامل نہ ہو فارابی کے نزدیک ہرگز فلسفی نہیں ہے۔

اس کے نزدیک فلسفہ کی دو قسمیں ہیں (۱) علومِ ریاضی (۲) علومِ طبعی (۳) علوم الہیات۔ اور فلسفہ عملی کو دو حصوں میں منقسم ... (۱) علم الاخلاق (۲) علم السیاست۔ اس طرح گویا سیاسیات اس کے نزدیک عملی فلسفہ کی صرف ایک قسم ہے یہاں اس ... دوسرے فلسفوں سے قطع نظر صرف اسی سیاسیات کا جائزہ مدنظر ہے۔

علم السیاست

سیاسیات فارابی کے فلسفہ کا ایک لازمی جزو ہے اور اس کے نزدیک اس کا تعلق عملی فلسفہ سے ہے۔ جب تک یہ موجود نہ ہو اس ... تک فلسفہ کامل ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ابھی تک اس کی جتنی تصانیف دریافت ہو سکی ہیں ان میں سے سات کتابیں علم سیاست ... متعلق ہیں۔ جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ فی آراء اہل المدینۃ الفاضلہ۔

۲۔ السیاستہ المدنیہ۔　۳۔ جوامع کتب النوامیس لافلاطون۔

۴۔ الالفاظ الافلاطونیہ وتکوین السیاست الملوکیتہ والاخلاق۔　۵۔ فی الاجتماعات المدنیہ

۶۔ التلخیص المدنی۔　۷۔ رسالتہ ابی نصر الفارابی فی السیاستہ۔

فارابی کی مندرجہ بالا کتابوں میں "السیاستہ المدنیہ" اور "فی آراء اہل مدینۃ الفاضلہ" زیادہ اہم ہیں جن میں اس نے ... سیاست کے اصول اور قواعد سے بحث کی ہے۔

نظریۂ اجتماع

(لوگ معاشرہ اس لئے قائم کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے زندگی کی ضروریات فراہم ہوتی ہیں اور حیات انسانی اپنی بہترین حالت تک پہونچ سکتی ہے۔ گویا معاشرے پہ زندگی کا نہیں صرف بہتر زندگی کا انحصار ہے)

... کی گفتگو کسی نہج یا کسی بھی پہلو سے کیوں نہ کی جائے اس کا محور ہمیشہ معاشرہ اور اجتماع رہے گا یا اجتماع کے بارے میں کسی بھی قسم کی بحث کیوں نہ کی جائے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق سیاست سے ضرور ہوگا۔ چنانچہ ایسا فلسفہ جس کا معاشرے یا اجتماع سے کوئی تعلق نہ ہو سیاسیات کا موضوع ہرگز نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ فارابی نے اپنی کتاب "السیاستہ المدنیہ" میں اجتماع اور عمران کی بحث کو سیاسی فلسفہ کی بنیاد قرار دیا ہے۔

اپنی بحث کے آغاز میں وہ اس مشاہدے کو پیش کرتا ہے جو اس نے نباتات اور عام حیوانات کے بارے میں کیا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ صرف حیوانات ہی نہیں بلکہ نباتات کی بھی بعض قسمیں ایسی ہیں جو بغیر اجتماع کے اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتیں اور بعض انفرادی

ے سے اپنی ضروریات تو پوری کرلیتی ہیں لیکن وہ بھی اجتماع کے بغیر اپنی بہتر حالت تک نہیں پہونچ سکتیں اور بعض ایسی بھی ہیں
یہ وہ انفرادی حیثیت سے ان دونوں باتوں کو حاصل کرلیتی ہیں لیکن اجتماع کی صورت میں بھی ان کا کوئی فرد ان چیزوں کے
ہیں کوئی رکاوٹ یا دقت محسوس نہیں کرتا۔ البتہ حیوانات میں بعض قسمیں ایسی ضرور ہیں کہ جب ان میں اجتماع ہو جاتا ہے تو ایک
سرے فرد کے لئے ان اشیاء کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے جو اس کے لئے افضل یا ضروری ہوتی ہیں۔ چنانچہ بعض جانور تنہا
بسر کرتے ہیں۔ ایسے جانور سمندر میں بکثرت ہوتے ہیں۔ لیکن جانوروں کی بعض اقسام تو ایسی ہیں کہ وہ اکثر حالات میں اجتماعی زندگی
لی ہیں مثلاً چیونٹی، شہد کی مکھی، اور بعض پرندے وغیرہ۔ نباتات اور حیوانات کی زندگیوں کا یہ مطالعہ فارابی نے اس غرض سے پیش
کہ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ فطرت کا رجحان کیا ہے؟ اور کائنات میں پھیلے ہوئے حیات و قوت کے کل ذخائر کس طرح
یت کی جانب رجوع ہیں۔؟

جہاں تک انسانی زندگی کا تعلق ہے اس کے بارے میں فارابی متیقن ہے کہ اس کی کل ضروریاتِ زندگی اور اس کی زندگی کے حالا
ں کا دار و مدار کلیتہً معاشرے یا اجتماع پر ہے یعنی اگر انسانی زندگی میں اجتماع قائم نہ ہو تو پھر وہ ان دونوں نعمتوں سے محروم رہ
گا۔ فارابی اس خیال کا حامی نہیں ہے کہ معاشرے کا وجود فطری ہے یا انسان فطرتاً ایک متمدن ہستی ہے[۱]۔ اور فطرت ہی نے اس
پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ معاشرے کے اندر رہے ورنہ وہ نعمتِ زندگی ہی سے محروم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اس کی رائے یہ ہے
معاشرہ اس لئے قائم کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے زندگی کی ضروریات فراہم ہوتی ہیں اور حیاتِ انسانی اپنی بہترین حالت تک پہنچ
ہے۔ گویا معاشرے پر زندگی کا نہیں ضروریاتِ زندگی کا انحصار ہے۔ اس طرح اس نے معاشرے کو قیودِ فطرت سے آزاد کر کے انسانی
ب دے دیا ہے اور انسانی زندگی کی ضروریات کو معاشرے یا اجتماع پر منحصر کر دیا ہے۔

اجتماع کی قسمیں

فارابی کی رائے میں اجتماع کئی قسم کے ہوتے ہیں لیکن تمام ہی قسم کے اجتماعات کو دو ناقص اور کامل دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔
تماعات میں سب سے پہلے گھرانے یا خاندان کا اجتماع پھر راستوں اور منزلوں کے اجتماعات اور سب سے آخر میں محلوں اور دیہاتوں
ا عات شامل ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ ناقص گھرانے کا اجتماع ہے اور اس وجہ سے سب سے زیادہ ناقص ہے کہ وہ اپنی ضروریا
نے میں سب سے زیادہ مجبور اور سب سے زیادہ کمزور ہے اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ محلہ کے اجتماع کا ایک جزو ہے اور اسی کی
اعانت پر اس کا مدار ہے۔ راستوں اور منزلوں کے اجتماعات بھی قطعاً ناقص اجتماعات ہوتے ہیں اور وہ صرف اس لئے قائم

---

[۱] سب سے ابتداءً افلاطون نے پیش کیا تھا کہ "انسان فطرتاً ایک متمدن ہستی ہے" لیکن بعد میں اس کے شاگرد ارسطو نے اس میں یہ اضافہ کر دیا کہ
"فطرتاً ایک سیاسی وجود ہے" اور "خود ریاست بھی ایک فطری انجمن ہے" لیکن یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ ارسطو کی سیاسی
ں میں سے کوئی بھی تصنیف اس وقت کے عربوں کو دستیاب نہیں ہو سکی تھی اس لئے ارسطو کا کوئی سیاسی نظریہ فارابی کے سامنے
تھا۔ اس نے جتنی رائیں بھی قائم کی ہیں وہ سب ارسطو کے نظریات سے آزاد رہ کر قائم کی ہیں سیاسیات کے موضوع پر اس کے زمانے میں صرف
ں کی دو کتابیں جمہوریہ اور نوامیس موجود تھیں جن کا اس نے مطالعہ کیا تھا۔

تے ہیں کہ محلے کے اجتماع کی خدمت کر سکیں۔ پھر محلہ کا اجتماع بھی کیونکہ اپنی ضروریات کے بارے میں خود کفیل نہیں ہوتا اس لئے
نقص اجتماع ہے اور اس کی حیثیت دیہات کے اجتماع کے ایک جزو اور اس کے معاون کی ہے۔ دیہاتی اجتماع البتہ ایک ایسا
ع ہے جو بڑی حد تک اپنی ضروریات پوری کر لیتا ہے اور بعض اوقات اس میں کل ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں لیکن حیات
اس اجتماع میں بھی اپنی بہترین حالت تک نہیں پہونچ سکتی اس لئے یہ اجتماع بھی ناقص اجتماع ہے اور اس کی حیثیت یہ ہے کہ
بے اجتماع کا خادم اور اس کا سہارا بن کر رہتا ہے۔ اس طرح محلے اور دیہات دونوں کے اجتماع شہری اجتماع کے لئے قائم
ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ محلے شہر کے جزو اور دیہات شہر کے خادم ہوتے ہیں۔

شہری اجتماع ناقص اجتماعات کے مقابلہ میں سب سے بڑا ہے اور یہ ایسا اجتماع ہے جو اپنی تمام ضروریات میں خود کفیل ہے
ساتھ ہی اس میں وہ خصوصیت بھی موجود ہے کہ اس میں رہ کر انسانی زندگی اپنی بہترین حالت تک پہونچ جاتی ہے۔ یعنی جسمانی اور
ذہنی دونوں اعتبار سے انسانی زندگی اس میں پوری طرح نشو و نما پا سکتی ہے اور ہر ممکن ترقی کر سکتی ہے۔ اسی لئے فارابی شہری اجتماع
کو کامل اجتماع قرار دیتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ کمالات حاصل کرنے کا اولین مرکز شہر ہے لیکن کامل اجتماعات میں شہری اجتماع جہاں سب
سے پہلا ہے وہیں سب سے چھوٹا بھی ہے اور اس کی ایک حیثیت یہ بھی ہے کہ یہ کسی قوم یا ملت کا ایک جزو ہے۔ ہر قوم یا ملت کئی شہروں پر
مشتمل ہوتی ہے اور کمال کے اوسط درجے پر فائز ہوتی ہے اس لئے فارابی قومی اجتماع کو متوسط درجے کا کامل اجتماع قرار دیتا ہے
اس اجتماع کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک سیاسی تنظیم (مملکت) بھی رکھتا ہو یعنی اگر وہ کئی سیاسی تنظیموں میں منقسم ہو تب بھی اس کو
متوسط درجے کا کامل اجتماع " ہی سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد سب سے آخری درجے میں اجتماع انسانیت ہے جس میں تمام اقوال و ملل
شامل ہیں اس لئے فارابی اس کو سب سے بڑا کامل اجتماع کہتا ہے۔

ان تمام اجتماعات کی، خواہ وہ ناقص ہوں یا کامل، بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے سے نہ بالکل آزاد ہیں اور نہ
قطعاً الگ بلکہ ان میں ایک مستقل رشتہ اور رابطہ ہے اور وہ اس طرح کہ منزل راستے کا ایک حصہ ہے راستہ محلہ کا ایک جزو ہے۔
محلہ شہر کا ایک ٹکڑا ہے، شہر قوم کا ایک عضو ہے اور قوم عالم انسانیت میں شریک ہے اس پوری بحث سے فارابی یہ ثابت کرتا ہے کہ
عالم انسانیت اجتماعیت پسند ہے اور اس کے کل اجزاء و عناصر پوری آسودگی اجتماع کے اندر رہ کر ہی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جتنے
اجتماعات بھی عالم انسانیت میں ابھی تک متصور ہیں ان میں کامل اجتماعات صرف تین ہیں۔
(۱) شہری اجتماع (۲) قومی یا ملی اجتماع۔ اور (۳) اجتماع انسانیت۔ ان کے علاوہ باقی تمام اجتماعات اس کے نزدیک
ناقص اجتماع کے زمرے میں شامل ہیں اور ان کا مقصد صرف کامل اجتماع کی خدمت ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن وحدت انسانی
کے اس فلسفہ کو ذہن میں رکھنے کے باوجود فارابی اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہے کہ عملی زندگی میں ایسی مکمل وحدت کا قائم ہو
جانا سخت مشکل امر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں قوموں کے درمیان اختلافات اور امتیازات موجود رہے ہیں اور اجتماع انسانیت
کے قیام میں رکاوٹ بنے ہیں۔

قوموں کی تفریق اور تقسیم

قوموں کی تفریق و تقسیم یا اجتماع انسانیت کی عدم موجودگی فارابی کے نزدیک دو وجہوں سے ہوتی ہے۔ پہلی وجہ بالکل طبعی اور

طری ہے اور دوسری وجہ اگرچہ غیر فطری ہے لیکن فطرت سے وہ بھی قریب تر ہے۔ طبعی وجہ جو قوموں کے درمیان فرق پیدا کرتی ہے
غرافیائی ہے۔ قومیں جو کرۂ ارضی کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں مختلف جغرافیائی کیفیات کے زیر اثر ہیں۔ مثلاً زمین کے مختلف خطوں پر
اند، سورج اور ستاروں کے اثرات مختلف ہوتے ہیں زمین کے ہر حصے پر بادل، بخارات اور ہوائیں یکساں طور پر اثر انداز نہیں ہوتیں
ور مختلف اقطاع زمین کی پیداواریں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ہر علاقے کی زمین، آب و ہوا، نباتات اور حیوانات وغیرہ
ند طبعی ماحول دوسرے علاقے کے پورے طبعی ماحول سے مختلف ہوتا ہے۔ جغرافیہ کا یہ اختلاف ان علاقوں میں رہنے والے انسانوں
پڑتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جگہ کے رہنے والے لوگوں کے اخلاق و عادات، رسوم و رواج اور مزاج دوسرے علاقے میں
ہنے والے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں اور پھر یہی چیزیں ان لوگوں کے باہم مختلط اور متحد ہونے میں رکاوٹ بنتی ہیں اور اجتماع
ل انیت قیام پذیر نہیں ہو پاتا۔

قوموں کے درمیان تفریق و اختلاف کی دوسری وجہ جس کو فارابی اگرچہ فطری نہیں قرار دیتا لیکن اس کو بھی فطرت سے بہت
ریب تر سمجھتا ہے، لسانی ہے۔ لسان یا زبان کا مسئلہ اجتماعی مسائل میں بہت اہم ہے۔ لوگ اپنے مافی الضمیر کا اظہار زبان ہی کے
ذریعے سے کرتے ہیں۔ اور اس طرح باہم قریب تر ہونے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں لیکن جہاں زبانیں مختلف ہوتی ہیں وہاں ایک دوسرے
ہ سمجھنے یا باہمی روابط کے پیدا ہونے کے امکانات ہی مفقود رہتے ہیں اس کا بھی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں
یں طاپ اور اختلاط نہیں پیدا ہونے پاتا اور اس عظیم اجتماع کے جو پورے عالم انسانیت پر مشتمل ہو، قیام میں رکاوٹ بنتا ہے۔

اس طرح فارابی بین الانسانی اتحاد اور اجتماع عالم انسانی کی اہمیت اور ضرورت کو پوری طرح محسوس کرتا ہے لیکن
ن عملی دشواریوں کا بھی مکمل جائزہ لیتا ہے جو اس اتحاد اور اجتماع کے راستے میں حائل ہیں اور یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کامل اجتماعات
یں صرف شہری مد (مملکت) اجتماع ہی تنہا وہ اجتماع ہے جس میں انسانیت پوری فلاح اور مکمل آسودگی حاصل کر سکتی ہے اس لئے وہ
پنی گفتگو اور توجہ کا مرکز شہر یا مملکت ہی کو بناتا ہے۔

مملکت اور اسکی تنظیم

(مملکت کا انحصار حاکم اور محکوم کے رشتے اور تعلق پر ہے چنانچہ جب تک یہ رشتہ متحقق نہ ہو جائے
مملکت وجود پذیر نہیں ہوتی)

فارابی کی تمام سیاسی گفتگو کا مرکز مملکت ہے وہ اجتماع کی سب سے بہتر صورت اسی کو قرار دیتا ہے اور اس کے ایک ایک پہلو کا بڑی
ذہانت اور ذکاوت کے ساتھ جائزہ لیتا ہے چنانچہ مملکت کے بنیادی مقصد سے لے کر اس کی دور دراز اقسام تک کوئی گوشہ بھی
اس کی نگاہ سے بچ نہیں سکا۔

ملہ یونانی فلسفیوں کی طرح فارابی کے یہاں بھی شہر (مدینہ) کا لفظ مملکت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

آغاز مملکت کا نظریہ

فارابی کے خیال میں مملکت کا انحصار حاکم اور محکوم کے رشتے اور تعلق پر ہے چنانچہ جب تک یہ رشتہ متحقق نہ ہو جائے مملکت وجود
نہیں ہوتی سلہ وہ اس بات پر متیقن ہے کہ حاکم و محکوم کے رشتے کی بنیاد ایک ناگزیر ضرورت ہے اور وہ ضرورت بجز حصول سعادت
کچھ نہیں چنانچہ وہ کہتا ہے کہ انسان کے وجود کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ سعادت کے انتہائی درجے تک پہونچ جائے لیکن اس درجے
پہنچنے کے لئے سب سے پہلے اس کو دو باتیں جاننا ضروری ہیں اول یہ کہ سعادت کیا چیز ہے؟ اور دوم یہ کہ وہ کن طریقوں سے حاصل کی
جا سکتی ہے؟ جب تک ان دونوں باتوں سے واقف نہ ہو جائے وہ نہ کوئی عملی قدم اٹھا سکتا ہے اور نہ سعادت کے کسی مرتبے تک پہونچ سکتا ہے
فارابی یہاں اس بات کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ انسانوں کی صلاحیتیں اور قابلیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں چنانچہ ہر شخص اس قابل نہیں
ہوتا کہ وہ بذاتِ خود سعادت سے بھی واقف ہو جائے اور ان طریقوں کو بھی معلوم کرے جن کے ذریعے سے سعادت کا حصول ممکن ہوتا
ہے اسی لئے اس کو ایک معلم اور مرشد کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو اس کو ان دونوں چیزوں سے باخبر کرتا رہے لیکن صرف باخبر ہو جانا بھی
کافی نہیں ہوتا اور وہ اس لئے کہ انسان کے قدم عمل کے راستے میں اس وقت تک نہیں اٹھتے جبتک کہ کوئی خارجی محرک موجود نہ ہو۔ بیشتر
لوگوں کی حالت یہی ہوتی ہے کہ تا وقتیکہ کوئی چلانے والا نہ ہو وہ خود نہیں چلتے یہی وجہ ہے کہ عام لوگ ایک ایسے شخص کے محتاج
ہوتے ہیں جو ان کو سیدھا راستہ بھی دکھائے اور ان کو اس پر چلنے کے لئے آمادہ بھی کرے۔ فارابی کے نزدیک ان کی یہ حالت ہی ان کی
محکومیت کی دلیل ہے پھر وہ اس بات کو بھی جانتا ہے کہ یہی دونوں صلاحیتیں بہت کم لوگوں میں ہوتی ہیں چنانچہ اس کے خیال میں جو شخص
دوسروں کو صرف سیدھا راستہ تو دکھا سکتا ہے لیکن ان کو اس راستے پر چلنے کے لئے آمادہ نہیں کرسکتا۔ ایسا شخص بھی حاکم نہیں ہوسکتا
بلکہ وہ بھی ہمیشہ محکوموں ہی کے زمرے میں رہے گا۔ البتہ وہ شخص جس میں سیدھا راستہ دکھانے کی بھی صلاحیت ہے اور اس راہ پر
چلنے کے لئے وہ دوسروں کو آمادہ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے تو یقیناً ایسا شخص حاکم ہے اور وہ تمام لوگوں پر حکومت قائم کرے گا
اب رہا وہ شخص جس میں بذات خود تو استنباط کی صلاحیت نہیں ہے لیکن اگر اس کو ایک بات
بتا دی جائے تو اس کو سمجھ لیتا ہے اور دوسرے شخص کو اس پر عمل کرنے کے لئے آمادہ بھی کرسکتا ہے تو ایسا شخص پہلے شخص کا تو محکوم ہی رہیگا
لیکن دوسرے شخص کا حاکم ہوگا۔ اسی بنیاد پر فارابی یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ ایک حاکم بھی حاکم اول ہوتا ہے اور کبھی حاکم ثانی اور
حاکم ثانی سے وہ یہی مراد لیتا ہے جس پر پہلے ایک انسان حکومت کرتا ہے پھر وہ اسی طرح دوسرے انسان پر حکومت کرنے لگتا ہے۔
یہ دونوں قسم کی حکومتیں جس طرح زندگی کے کسی ایک معاملے میں قائم ہوسکتی ہیں اسی طرح کل مسائل انسانی میں قائم ہوسکتی ہیں۔
حکومت کے اس طرفہ تصور کے پیش کرنے میں فارابی بالکل منفرد ہے۔ حاکم اور محکوم کے جو مدارج اس نے متعین کئے ہیں اور ہر
درجے کو جن قدرتوں اور صلاحیتوں سے اس نے مشروط کیا ہے اس میں معاشرے کی پوری وسعتیں سما جاتی ہیں اور پورا معاشرہ ایک مستقل
تنظیم کی صورت اختیار کرلیتا ہے جہاں کم و بیش ہر شخص اپنے افضل سے راہنمائی حاصل کرتا اور اپنے مفضول کی رہنمائی کرتا نظر آتا ہے

سلہ مملکت کی تخلیق کے بارے میں فارابی کا یہ نظریہ شائستہ التفات اس لئے بھی ہے کہ اس سے ایک جانب تو ارسطو کا نظریہ باطل قرار پاتا ہے جس میں اس نے مملکت
کو ایک فطری انجمن قرار دیا ہے اور دوسری جانب اس کے بہت بعد میں پیدا ہونے والے کئی اہم مغربی مفکرین کے افکار بھی کھوکھلے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

تا آنکہ معاشرے کے ایک سرے پر ایسا شخص ہوتا ہے جس سے افضل اور کوئی نہیں ہوتا۔ اور دوسرے سرے پر ایسا شخص ہوتا ہے جس سے کوئی نہیں رہ جاتا۔ یہ افضل ترین شخص معاشرے کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے اور مفضول ترین شخص محکوم ہوتا ہے اور بجز اطاعت کے دوسرا اس کا کوئی حکم نہیں چلتا۔ لیکن درمیانی مدارج میں رہنے والے اشخاص بیک وقت کسی کے حاکم اور کسی کے محکوم ہوتے ہیں۔ اس معاشرے کو زینے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کی ہر سیڑھی پر بیٹھنے والا اپنے سے نیچے بیٹھنے والے کا حاکم اور اپنے سے اوپر بیٹھنے والا کا محکوم سب سے اونچے زینے پر بیٹھنے والا شخص مملکت کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے جس کے اوپر کوئی اور حاکم نہیں ہوتا۔

حاکمِ اوّل یا اقتدارِ اعلیٰ

فارابی جس حاکم اعلیٰ کا تصور پیش کرتا ہے اس کو وہ حاکمِ اول قرار دیتا ہے اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ کسی انسان کا محکوم نہیں ہوتا۔ اس کو جملہ علوم اور معارف بالفعل حاصل ہوتے ہیں اس لئے اس کو کسی دوسرے انسان سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ لیکن چونکہ فارابی ایک عام معاشرے اور ایک عام مملکت کی واقعی حالت سے باخبر ہے اس لئے محسوس کرتا ہے کہ ہر مملکت کے حاکم اوّل کے لئے اتنے بلند مرتبے تک پہونچنا ممکن نہیں ہے چنانچہ وہ ایسے ہر حاکم اوّل کے لئے ان شرائط کو نرم کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کو ایک ایک جزئیات کا صحیح علم ہو اور جو کچھ اس کو معلوم ہو دوسروں کو بھی اس کی ہدایت کرسکے اور اس ہدایت کے مطابق تمام لوگوں سے عمل کراسکے پھر ان کے اعمال کا صحیح اندازہ اور ان کی مناسب تحدید کرسکے اور ٹھیک سعادت کی طرف ان کا رُخ پھیرسکے۔ وہ جانتا ہے کہ صلاحیت کا یہ معیار صرف ان جلیل القدر ہستیوں کو حاصل ہوتا ہے جن کے نفس عقل فعال سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں۔ قدما کے نزدیک ایسے انسان کو فرشتہ کہتے ہیں اور وہ صاحب وحی ہوتا ہے کیونکہ جب وہ صلاحیت کے اس معیار علیا پر پہونچ جاتا ہے تو اس میں اور عقل فعال میں کوئی واسطہ باقی نہیں رہتا اور عقل فعال چونکہ علتِ اولیٰ (اللہ) سے صادر ہوتی ہے اس لئے علتِ اولیٰ ہی عقلِ فعال کے ذریعے سے اس پر وحی نازل کرتی ہے۔ جیسے ہی وحی نازل ہوتی ہے وہ شخص رہنمائی کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہو جاتا ہے[1] اوّل درجے کی حکومت اسی انسان کی ہے باقی تمام حکومتیں اس سے نیچے درجے کی ہیں۔

جو لوگ ایسے حاکم کے زیر حکومت ہوتے ہیں وہ افاضل، اخیار اور سعادت مند ہوتے ہیں کیونکہ ان کی ہدایت اور ان کو راہِ ہدایت پر چلانے والا انسان عالمِ انسانیت میں سب سے زیادہ برگزیدہ شخص ہوتا ہے یہ لوگ اگر ایک قوم میں ہوں تو وہ بھی برگزیدہ کہی جاتی ہے اور اگر چند لوگ ہیں اور ایک مقام پر سکونت رکھتے ہیں تو اس مقام کو برگزیدہ شہر کہا جاتا ہے اگر مختلف مقامات میں سکونت رکھتے ہیں اور دوسری حکومتیں ان پر مسلط ہیں تو یہ برگزیدہ لوگ کہے جاتے ہیں جو ان میں پردیسیوں کی حیثیت میں رہتے ہیں

شیرازہ بندی

حکومت اور خدمت کے لحاظ سے چونکہ اہل مملکت کی سیرتیں اور صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں اس لئے حاکم اوّل ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتا ہے اور ہر شخص کا درجہ اس کی اہلیت اور صلاحیت کے مطابق متعین کرتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگ خدمت کے درجوں پر مامور ہوتے ہیں لیکن بعض کو حکومت کے مناصب ملتے ہیں۔ حکومت کے ان درجوں میں بعض درجے حاکم اوّل سے قریب

[1] فارابی کے اس بیان سے یہ شبہ نہ پیدا ہونا چاہئے کہ نبوت اکتسابی چیز ہے امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو نبوت کے منصب سے سرفراز فرمانا چاہتا ہے

ں بعض ان سے کچھ کم اور بعض ان سے اور زیادہ کم ہوتے ہیں۔ اس طرح حکومتِ اعلیٰ کے درجے سے کم ہوتے ہوتے یہ درجات
رت کے درجے تک جا پہنچتے ہیں جہاں کوئی منصبِ حکمرانی نہیں ہوتا، اس لئے اُن سے نیچے کوئی درجہ بھی نہیں ہوتا۔ مدارج
کے اس تعین اور ترتیب سے جہاں ہر ایک حاکم بھی ہوتا ہے اور محکوم بھی، مملکت کے تمام اجزا میں ایک مستقل ربط اور مکمل نظام
پیدا ہو جاتا ہے جس میں مناسب قسم کی تقدیم و تاخیر اور معقول طرز کی افضلیت اور مفضولیت پائی جاتی ہے۔

مملکت کا مقصد

مملکت کی اس پوری تنظیم کی اصل غایت یہ ہوتی ہے کہ سعادت کا درجہ حاصل ہو لیکن یہ درجہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب طبعی اور
ارادی دونوں قسم کی برائیاں پوری مملکت سے دور کردی جائیں اور تمام طبعی اور ارادی بھلائیاں حاصل ہو جائیں[1] اسی لئے فارابی مملکت
کے حاکمِ اوّل یا بادشاہ یا مدبر کے لئے یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ مملکت کی اس پوری تنظیم کو اس طرح استعمال کرے کہ برائیاں ختم ہوں
اور بھلائیاں قائم ہوں اور ایسی تمام چیزیں جو حصولِ سعادت میں مفید اور مددگار ہوں ان کی حفاظت کی جائے اور ترقی دی جائے
اور وہ تمام چیزیں جو حصولِ سعادت میں مخل یا مضر ہوں ان کو مٹا دیا جائے۔ مختصر یہ کہ مملکت کی تمام قوتوں کو ان دونوں قسم کی
برائیوں کو مٹانے اور ان دونوں قسم کی بھلائیوں کو نشو و نما دینے میں صرف کیا جائے جن کی معرفت سعادت کا حصول ممکن ہوتا ہے۔

مملکت کی اقسام

مملکت کی عام تنظیمی نوعیت کی وضاحت کے بعد فارابی مملکت کی قسمیں پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ مملکتیں صرف چار
قسم کی ہوتی ہیں (۱) مدینۃ الفاضلہ (۲) مدینۃ الجاہلیۃ (۳) مدینۂ فاسقہ (۴) مدینۂ ضالہ ـــــ پھر ان میں سے ہر ایک قسم
مملکت کی اس نے علیحدہ علیحدہ تشریح بھی پیش کی ہے۔ اسی تشریح کے دوران اس نے مدینۃ الجاہلیہ کی چھ قسمیں کردی ہیں اور اس
کی بھی ہر قسم کی علیحدہ علیحدہ وضاحت کی ہے۔ فارابی کی یہ تقسیم مملکت دراصل انسان کی مختلف اخلاقی کیفیتوں سے وابستہ ہے یہ
بات ہر شخص جانتا ہے کہ اخلاقی اعتبار سے انسان دو ہی قسم کے ہوتے ہیں نیک یا بد۔ اور یہ بات بھی بالکل بدیہی ہے کہ نیکی سب سے
بڑی فضیلت ہے۔ اس لئے جو لوگ اس فضیلت کے حامل ہوتے ہیں اور ان پر جو مملکت مشتمل ہوتی ہے اس کو فارابی مدینۃ الفاضلہ
قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس بدی صرف ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی بلکہ اس کی تین بڑی قسمیں ہیں (۱) جاہلیت (۲) فسق (۳) ضلالت
چنانچہ جو لوگ جاہلیت میں مبتلا رہتے ہیں ان کی مملکت کو فارابی مدینۃ الجاہلیہ کہتا ہے۔ جو اشخاص فسق کو اختیار کرتے ہیں ان کی
مملکت کا نام مدینۂ فاسقہ رکھتا ہے اور جو اربابِ ضلالت ہیں ان کی مملکت کو مدینۂ ضالہ سے موسوم کرتا ہے پھر اس نے مدینۃ الجاہلیہ
کے چھ پہلو یا چھ قسمیں بتائی ہیں جن میں سے ہر ایک قسم کے ایک علیحدہ علیحدہ اجتماع سے وابستہ ہے۔ چنانچہ پہلا ضروری اجتماع
ہے۔ دوسرا پست درجے کا اجتماع ہے تیسرا ذلیل اجتماع ہے چوتھا شریف اجتماع ہے۔ ان میں سے مملکت جس اجتماع کی
بھی حامل ہوگی، مدینۃ الجاہلیہ اسی قسم کا ہوگا۔ موجودہ دور کی اصطلاحات کی رو سے پہلے اجتماع کو دستوری مملکت، دوسرے
اجتماع کو مینیاماج، تیسرے اجتماع کو مملکت عیش و عشرت (یہ دوسرے اور تیسرے اجتماعات بہ اعتبار کیفیت ایک دوسرے
سے بالکل الگ ہیں لیکن رائج اصطلاح ان دونوں ہی کے لئے ایک "عدیدیت" استعمال کی جاتی ہے۔ چوتھے اجتماع کو
اشرافیت یا پانچویں اجتماع کو اس کی مختلف کیفیتوں کے پیش نظر آمریت یا فسطائیت یا سامراجیت اور چھٹے اجتماع کو جمہوریت

کہا جا سکتا ہے۔ فارابی کی مملکت کی یہ پوری تقسیم مندرجہ ذیل خاکے کی مدد سے بھی سمجھی جا سکتی ہے۔
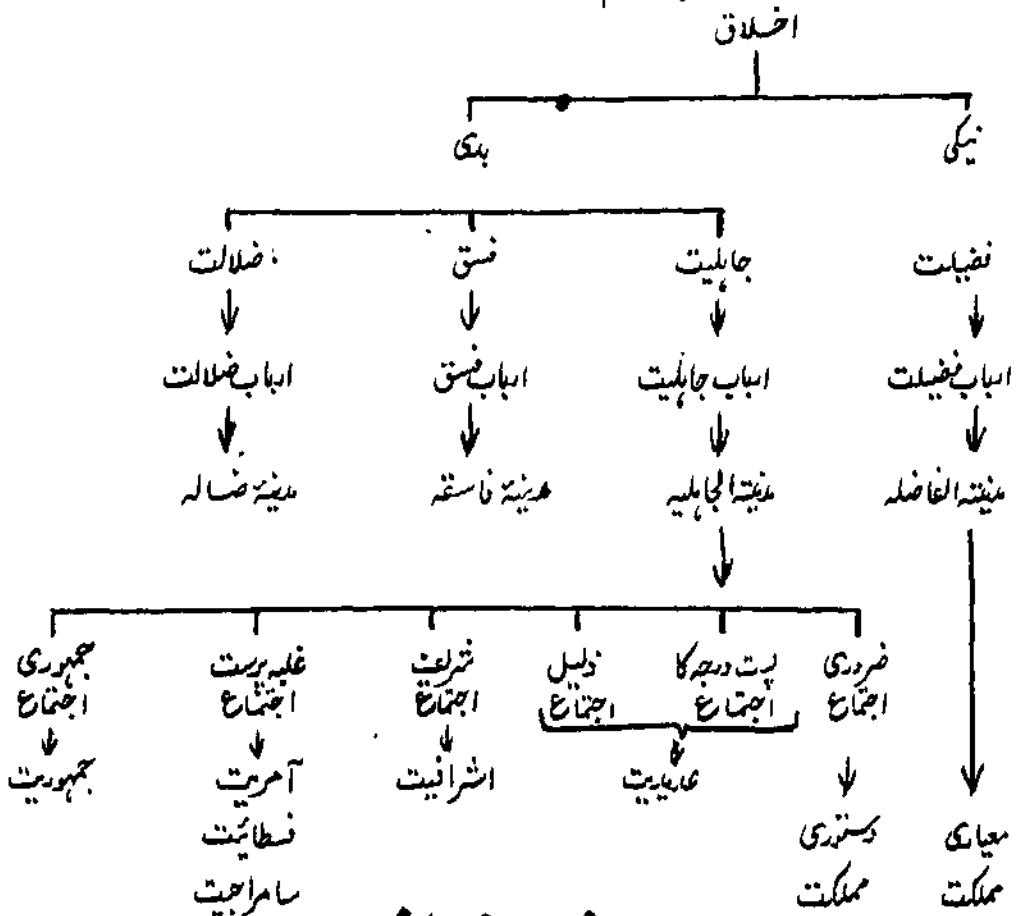
۱۔ مدینۃ الفاضلہ

ایسا اجتماع جس کا نصب العین حقیقی سعادت کا حصول ہو اور جس کے افراد، ان چیزوں کے حاصل کرنے میں جن میں حقیقی سعادت حاصل ہو سکتی ہے، باہمی تعاون سے کام کریں، اس کو فارابی "اجتماع فاضل" اور اس پر مشتمل مملکت کو "مدینۃ الفاضلہ" اور ایسی قوم کو "امت فاضلہ" کے ناموں سے موسوم کرتا ہے۔ مدینۃ الفاضلہ کو وہ ایک صحیح، صحت مند اور کامل بدن سے تشبیہ دیتا ہے[1] جس کے اعضا زندگی کے تحفظ...

---

[1] فارابی نے یہاں جو تشبیہ پیش کی ہے اس سے علم لوپیپ نے اپنے علم السیاست میں بہت استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور مفکر ٹامس ہابز نے تو اپنی سیاسی تصنیف کا نام ہی لیویاتھن LEVIATHAN رکھا جس کے معنیٰ ہیں عظیم جثہ اور اس عظیم جثہ سے اس کی مراد مملکت ہے۔ ہابز کا زمانہ ۱۵۸۸ء سے ۱۶۷۹ء تک کا ہے اپنی اس کتاب میں ہابز نے فارابی کی اصل فکر کا چربہ اتارا ہے اور یہی اس کی کل شہرت کی بنیاد ہے لیکن ہابز کی علمی دیانت کا یہ عالم ہے کہ یہ سب کچھ اس نے صرف اپنے ہی نام سے پیش کیا ہے اور فارابی کا کوئی تذکرہ تک نہیں کیا۔ تقریباً یہی عمل دوسرے علمائے مغرب کا ہے جنہوں نے فارابی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

ں کے لئے ہر وقت ایک دوسرے کے معین اور مددگار رہتے ہیں اور یہ اعضا اگرچہ اپنی فطرت اور صلاحیت کے اعتبار سے ایک
سے مختلف ہوتے ہیں تاہم ان میں ایک عضو رئیس ہوتا ہے جس کی یہ سب اطاعت کرتے ہیں ان مختلف اعضا کی یہ نوعیت ہوتی ہے
و رئیس سے کچھ کم درجہ رکھتے ہیں لیکن بعض کا درجہ ان سے بھی کم ہوتا ہے حتیٰ کہ درجہ بدرجہ ان اعضا پر جا کر سلسلہ ختم ہوتا ہے
خادم کی حیثیت رکھتے ہیں کسی عضو کے مخدوم نہیں ہوتے ۔ فارابی کے نزدیک بالکل یہی صورت مملکت کی بھی ہے ۔ اس کے اجزا
کی فطرت اور ان کے اوصاف بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں تاہم وہ ایک دوسرے سے ملحق اور مربوط ہوتے ہیں اور
ں ایک انسان رئیس ہوتا ہے جس کی سب لوگ اطاعت کرتے ہیں پھر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا درجہ رئیس سے کچھ کم ہوتا ہے
ن سے بھی کچھ کم اور اسی طرح درجہ بدرجہ سلسلہ ان لوگوں تک جا پہونچتا ہے جو صرف خادم ہوتے ہیں، کسی کے مخدوم نہیں ہوتے
ہ سب سے ادنیٰ درجہ ہوتا ہے ۔ لیکن ایک بدن اور ایک مملکت میں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ بدن کے اجزا طبعی ہوتے ہیں اور
باط بھی طبعی ہوتا ہے لیکن مملکت کے اجزا اپنی اپنی جگہ پر پیدائش اور قابلیت کے اعتبار سے اگرچہ طبعی ہوتے ہیں لیکن اپنی
نیت میں وہ مملکت کے اجزا نہیں قرار پاتے بلکہ وہ اپنے ارادے سے مملکت میں شامل ہوتے ہیں اور ان کا باہمی ربط بھی
یں ارادی ہوتا ہے [1]

مملکت کی ساخت کے علاوہ فارابی اس کے اعمال اور اوصاف کو بھی بدن ہی کے مشابہ سمجھتا ہے چنانچہ کہتا ہے کہ :-

"جس طرح بدن کا عضو رئیس (قلب) تمام اعضا میں کامل ترین ہوتا ہے اس کے بعد جو اعضا
اس کے شریک ہوتے ہیں اس سے کم درجے کے کامل ہوتے ہیں ۔ اسی طرح مملکت کا رئیس ہے کہ وہ
بھی شہر کے تمام اجزا میں کامل ترین ہوتا ہے پھر اس کے بعد دوسرے اجزا میں کمال کا درجہ علی التواتر
کم ہوتا جاتا ہے اور جس طرح سب سے پہلے قلب پیدا ہوتا ہے پھر وہ دوسرے تمام اعضائے
بدن کے پیدا ہونے کا سبب بن جاتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے ان اعضا میں قوتیں پیدا ہوتی
اور مدارج قائم ہوتے ہیں اور اگر کسی عضو میں کچھ خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو وہی اس کو دور بھی کرتا ہے
بالکل اسی طرح سب سے پہلے مملکت کا رئیس پیدا ہوتا ہے [2] پھر وہ مملکت اور مملکت کے کل اجزا
کے پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اس کے بعد ان اجزا کے مدارج قائم کرنے کے لئے ان میں ملکات
ارادیہ پیدا کرتا ہے اور جب ان اجزا میں خلل واقع ہوتا ہے تو وہی اس خلل کو دور کرتا ہے"[3]

رئیس مملکت کے بارے میں فارابی کا خیال یہ ہے کہ ہر شخص اس منصب جلیل کا اہل نہیں ہوتا اس کے لئے وہ دو چیزیں ضروری

فارابی کی اس دلیل سے بھی ارسطو کا یہ نظریہ کہ مملکت کا وجود طبعی ہے باطل ہو جاتا ہے [2] آغاز مملکت کے بارے میں فارابی کا یہ نظریہ بالکل
ہوتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی بات اقرب الی الصواب ہے کہ پہلے رئیس پیدا ہوتا ہے پھر مملکت کے دوسرے اجزا وجود میں آتے ہیں
یہ اس لئے کہ سب سے پہلے حضرت آدمؑ پیدا ہوئے اور ان کی نسل بعد میں دنیا میں آئی اور یہ ثابت ہے کہ حضرت آدمؑ حاکم تھے اور آپ کی آل و اولاد
آپ کی محکوم تھی مغربی مفکرین یا تو اس نظریہ کی باریکی تک پہنچ نہیں سکے یا انہوں نے نظریاتی تعصب کی بنا پر اس کو دانستہ طور پر تاریکی میں
رکھنے کی کوشش کی ہے ۔

سمجھتا ہے۔ اوّل یہ کہ ایک شخص فطرتاً اور طبعاً اس منصب کے لئے موزوں ہو اور دوسرے یہ کہ اس میں خاص اوصاف اور خاص ملکات ارادیہ ہوں۔ پھر وہ اس چیز کو بھی واضح کر دیتا ہے کہ اگر ایک شخص فطرتاً منصب ریاست کے لئے موزوں بھی ہو تب وہ بھی ہر پیشے کے ذریعے حکومت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اکثر پیشے خادمانہ حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ذریعے سے صرف خدمت کی جا سکتی ہے اور بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جن کے ذریعے سے دوسرے پیشوں پر تو حکومت کی جاتی ہے لیکن اس سے آگے وہ بھی نہیں بڑھ سکتے اس طرح ہر پیشہ مدینۃ الفاضلہ کے رئیس کے کام نہیں آ سکتا اور نہ ہر مملکت اس رئیس کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد وہ بالکل صاف الفاظ میں اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے کہ جس طرح رئیس الاعضاء یعنی دل پر دوسرا عضو حکومت نہیں کر سکتا اسی طرح مدینۃ الفاضلہ کے رئیس اول کا پیشہ اطاعت اور خدمت گذاری کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا اور نہ وہ دوسرے پیشوں کے زیر حکومت رہ سکتا ہے درحقیقت یہ ہے کہ یہ پیشہ دوسرے تمام پیشوں کا مرکز اور ان کا مقصود و مدعا ہے اور یہ انسان، انسان کامل ہے جس پر کوئی دوسرا انسان حکومت نہیں کر سکتا اور جب اس کی قوتِ نظریہ قوتِ عملیہ اور قوتِ متخیلہ تینوں میں کمال پیدا ہو جاتا ہے تو اس پر براہِ راست خدا کی جانب سے وحی کی جاتی ہے[2] اور فیضانِ رحمت شروع ہو جاتا ہے چنانچہ اس کی عقل پر جو فیضان ہوتا ہے اس کے اعتبار سے وہ حکیم اور فلسفی ہوتا ہے اور جو فیضان اس کی قوتِ متخیلہ پر ہوتا ہے اس کے لحاظ سے وہ پیغمبر ہوتا ہے[3] وہ آئندہ کے واقعات کی پیشین گوئی کرتا ہے اور موجودہ حالات سے باخبر رہتا ہے وہ مراتبِ انسانیت میں کامل اور سعادت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوتا ہے اور اس کو ان تمام امور سے واقفیت ہوتی ہے جن سے سعادت حاصل کی جا سکتی ہے۔

مدینۃ الفاضلہ کے رئیس کے لئے فارابی پہلی شرط یہ قرار دیتا ہے کہ اس کو زبان اور بیان پر اتنی قدرت حاصل ہونی چاہئے کہ وہ جو کچھ جانتا ہے اس کا خوبی کے ساتھ اظہار کر سکے۔ دوسری شرط وہ یہ مقرر کرتا ہے کہ اس میں اتنی صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ خوبی کے ساتھ سعادت اور اس کے اعمال کی طرف لوگوں کی رہنمائی کر سکے اور تیسری شرط یہ ہے کہ اس کی جسمانی قوت ایسی ہونی چاہئے کہ وہ اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام دے سکے۔

رئیس الاوّل کے اوصاف

مدینۃ الفاضلہ کے رئیس الاوّل کے لئے فارابی نے بارہ اوصاف متعین کئے ہیں جن کا اس کی ذات میں پایا جانا ضروری ہے۔ یہ بارہ اوصاف دراصل مملکت کے اقتدار اعلیٰ کی لازمی خصوصیات ہیں جن کو بعد میں آنے والے یورپ کے سیاسی فلسفیوں نے اپنایا ہے۔

وہ بارہ اوصاف مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اس کے تمام اعضا مکمل ہوں تاکہ وہ ان کے ذریعہ سے اپنے تمام فرائض بخوبی انجام دے سکے۔

۲۔ بہت زیادہ سمجھ دار ہو تاکہ اس سے جو کچھ کہا جائے اس کو اچھی طرح سمجھ سکے۔

۳۔ اس کی قوتِ حافظہ نہایت قوی ہو تاکہ وہ تمام مشاہدات، مسموعات، اور مدرکات کو بھول نہ سکے۔

---

[1] اس سے فارابی کی مراد غالباً اطاعت و فرمانبرداری یا پیروی ہے ورنہ حکومت کی غایتِ اصلی تو خدمت ہی ہے اس گمان کی تائید اس کے آئندہ کلمات سے بھی ہوتی ہے۔ مملکت کے اقتدار اعلیٰ کی یہ حقیقت جو فارابی نے پیش کی ہے آسٹن AUSTIN نے اپنے اقتدار اعلیٰ کے نظریئے کی بنیاد اسی کو بنایا ہے[2] یہاں بھی نبوت کے اکتسابی ہونے کا شبہ پیدا ہوتا ہے لیکن واضح رہے کہ نبوت اکتسابی چیز نہیں ہے[3] اس مقام پر فارابی افلاطون سے منزلوں آگے بڑھ گیا ہے اُس نے بادشاہت کو صرف فلسفہ کی سطح تک ابھارا تھا لیکن فارابی اس کو نبوت کی بلندیوں تک

۴۔ نہایت ذہین ہو تاکہ ایک بات کو معمولی اشارے سے اس طرح سمجھ سکے جس طرح دلیل اس پر دلالت کرتی ہے۔
۵۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ ہو تاکہ اپنے مافی الضمیر کو پوری وضاحت کے ساتھ ظاہر کر سکے۔
۶۔ تعلیم اور افادہ کا شائق ہو اور تعلیم دینے میں جو زحمتیں پیش آتی ہیں ان کو برداشت کر سکے۔
۷۔ کھانے پینے کا حریص نہ ہو، لہو و لعب سے نظرتاً بیزار ہو اور ان کی لذتوں کو محبوب نہ رکھے۔
۸۔ سچ اور سچوں کا دوست، جھوٹ اور جھوٹوں کا دشمن ہو۔
۹۔ نہایت بلند ہمت ہو۔ عزت و شرف کو محبوب رکھے۔ عزت پر دھبہ لگانے والے کاموں سے اعراض کرے اور بلند کاموں کی طرف نطرتاً مائل ہو۔
۱۰۔ دولت اور دنیوی اغراض کو نہایت حقیر سمجھے۔
۱۱۔ عدل اور انصاف کا نطرتاً دوست اور ظلم و جور کا دشمن ہو اگر اس کو عدل و انصاف کی دعوت دی جائے تو اس کو نہایت آسانی اور رضا سے قبول کرے لیکن اگر ظلم و جور کی دعوت دی جائے تو اس کو کبھی قبول نہ کرے۔
۱۲۔ اولوالعزم ہو اور جو کام کرنے کے قابل ہیں ان کو دلیری اور بے خوفی سے کرے۔ بزدل نہ ہو۔

فارابی اس بات سے پوری طرح باخبر ہے کہ رئیس الاول یا مملکت کے اقتدار اعلیٰ کے لئے اس نے جو اوصاف تجویز کئے ہیں وہ مکمل طور پر ایک شخص میں بمشکل ہی جمع ہو سکتے ہیں لیکن وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ مدینۃ الفاضلہ یا معیاری مملکت صرف وہی ہو سکتی ہے جس کے اقتدار اعلیٰ میں اس کے تجویز کردہ اوصاف بدرجہ اتم پائے جائیں۔ لیکن جب اقتدار اعلیٰ میں یہ اوصاف کم ہوں گے۔ اس مملکت کا معیار بھی اسی تناسب سے کم ہو گا۔ لیکن جہاں اس اوصاف میں سے کوئی ایک وصف بھی موجود نہ ہو فارابی کے نزدیک اس مملکت کا کوئی معیار ہی نہیں ہے اور وہ یہ اندیشہ رکھتا ہے کہ ایسی مملکت تباہی سے بچ نہیں سکتی مملکت کے اعلیٰ یا ادنیٰ معیار کا انحصار اقتدار اعلیٰ پر اس لئے ہے کہ مملکت کی اصل غایت سعادت کا حصول ہے اور حصول سعادت کلیتہً اقتدار اعلیٰ پر منحصر ہے۔

سعادت کے مدارج

سعادت کے بارے میں وہ اس بات کو بھی واضح کرتا ہے کہ اس کا کوئی ایک معیار یا ایک درجہ نہیں بلکہ اس کے مختلف مدارج ہوتے ہیں جس طرح دو مختلف پیشوں میں ایک پیشے کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے اور یہ اختلاف نوعیت کا اختلاف ہوتا ہے یا جس طرح ایک ہی پیشہ رکھنے والے دو افراد میں ایک فرد زیادہ فنون سے واقف ہوتا ہے اور دوسرا کم فنون جانتا ہے، بالکل اسی طرح ایک ہی قسم کی سعادت دو افراد میں کم و بیش مقدار میں پائی جاسکتی ہے لیکن یہ اختلاف مقدار کا اختلاف کہلائے گا۔ آخری صورت یہ کہ جس طرح دو افراد پیشہ تو ایک ہی رکھتے ہیں اور اس پیشے سے متعلقہ فنون بھی دونوں برابر جانتے ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک اپنے فن میں زیادہ مہارت رکھتا ہے اور دوسرا کم ماہر ہے بالکل یہی معاملہ سعادت میں بھی پایا جاتا ہے لیکن یہ اختلاف کیفیت کا اختلاف کہلاتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ تمام سعادتیں ایک ہی قسم یا ایک ہی درجے کی نہیں ہوتیں بلکہ ان میں نوعیت، مقدار اور کیفیت کے اعتبار سے مدارج اور فضائل قائم ہوتے ہیں۔ سعادت حاصل کرنے کے طریقے بھی یکساں نہیں ہوتے، ہر قوم اپنے ماحول اور مزاج کے مطابق علیحدہ علیحدہ طریقے اختیار کرتی ہے اس لئے فارابی اس امر کی بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ امم فاضلہ اور مدن فاضلہ کا مقصد اگرچہ ایک ہی ہوتا ہے ا سبھی سب سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں تاہم ان کے مذاہب مختلف ہو جاتے ہیں ———

(۱) مدینۃ الفاضلہ کے مفاسد

فارابی ایک عملی فلسفی ہونے کی حیثیت سے اپنی معیاری مملکت کو دنیا میں جنت کی حیثیت سے نہیں پیش کرتا بلکہ روشن پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے تاریک پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور اس بات کا پورا احساس رکھتا ہے کہ جو مملکت انسانوں پر مشتمل ہوگی اس کے اعلیٰ ترین معیار میں بھی کوئی نہ کوئی نقص یا مفسدہ ضرور پایا جائے گا۔ عیوب اور خرابی سے بالکل پاک کوئی مملکت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ اپنے مدینۃ الفاضلہ کو نقائص سے بالکل پاک نہیں سمجھتا البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اس میں جن مفاسد کو محسوس کرتا ہے ان کو گوارا نہیں کرتا اور نہ ان کے آگے ہتھیار ڈالتا ہے بلکہ اس کے برعکس ان کے اندمال کی تجاویز پیش کرتا ہے[۱]

وہ کہتا ہے کہ مدینۃ الفاضلہ میں مفاسد کی مثال ایسی ہے، جیسے گیہوں میں گھن ہوتا ہے یا باغ میں کانٹے ہوتے ہیں یا کھیت میں مضر اور غیر مفید گھاس ہوتی ہے۔ عقلمند مالک ان مضرتوں کو دور کرتا ہے اور اپنے مطلوب کو حاصل کرتا ہے۔ مفاسد کی اس بحث میں فارابی اس سے زیادہ موثر ایک مثال وحشی جانوروں کی پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ بعض جانور درندے ہوتے ہیں جو جنگلوں پر منتفرق طور پر زندگی بسر کرتے ہیں اور بعض جتھے بنا کر بھی رہتے ہیں لیکن سب ہی چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ بعض جانور ایسے ہوتے ہیں جو کچا گوشت کھاتے ہیں اور شہروں سے متصل رہتے ہیں لیکن بعض جانور صرف گھاس پات پر زندگی بسر کرتے ہیں یہی تین قسمیں ان انسانوں کی بھی ہوتی ہیں جو بہائم خصلت یا بہائم طبع ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نہ متمدن ہوتے ہیں اور نہ اجتماعی اور تمدنی زندگی بسر کرتے ہیں ان میں بعض درندہ خصلت اور زیادہ خطرناک ہوتے ہیں لیکن بعض کم خطرناک۔ اور بعض چرندوں کی طرح بے آزار لیکن وحشی ہوتے ہیں اس لئے ان لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے جو ان مختلف قسم کے جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی جو زیادہ خطرناک ہوں ان کو ختم کر دینا چاہئے لیکن جن سے کسی کام میں فائدہ اٹھایا جا سکے ان کو چھوڑ دینا چاہئے اور ان سے جانوروں کی طرح کام لینا چاہئے[۲]

مدینۃ الفاضلہ کی اس بحث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فارابی نے سیاست کے بنیادی مسائل کس خوبی سے حل کئے ہیں اس کا مدینۃ الفاضلہ حقیقت میں ایک معیاری مملکت کا خاکہ ہے جس میں اس نے یہ واضح کیا ہے کہ مملکت کے قیام کی غرض و غایت کیا ہے اور اس کا مقصود اصلی کس شئے کو قرار دیا جا سکتا ہے؟ پھر اس نے اس امر کی بھی توضیح کر دی ہے کہ مملکت وجود میں کس طرح آئی؟ اس کے علاوہ جدید علم سیاست میں اقتدارِ اعلیٰ کا مسئلہ سب سے اہم سمجھا جاتا ہے لیکن فارابی نے صدیوں پیشتر ہی اس مسئلہ کی شرح جس خوبی اور کمال کے ساتھ کی ہے اس میں کوئی فلسفی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس نے اقتدار اعلیٰ کی اصلی حیثیت اور حقیقت اور اس کے مقام کے صحیح تعین کے علاوہ اس کے اوصاف اور خصوصیات کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کی خوبی اور خامی کے اعتبار سے معیاری مملکت کی بھی خامیوں کی نشاندہی کر کے جس حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے اس میں بھی وہ بالکل منفرد ہے۔

(۲) مدینۃ الجاہلیہ

مملکت کی دوسری قسم فارابی کے نزدیک مدینۃ الجاہلیہ ہے، چونکہ انسان ہونے کے اعتبار سے ارباب جاہلیت[۳] کی غرض و غایت

---

[۱] یہاں یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ فارابی، افلاطون کی طرح ایک از خود رفتہ فلسفی نہیں بلکہ ایک بیدار مصلح اور ہوشیار مدبر بھی ہے افلاطون نے اپنی مثالی ریاست کی پیش کش میں اس درجہ غلو کیا کہ وہ خواب و خیال کے علاوہ دنیا میں کہیں بھی قائم نہ ہو سکی۔ لیکن فارابی کا مدینۃ الفاضلہ پہلے بھی قائم ہو چکا ہے اور آج بھی اس کا قیام غیر ممکن نہیں [۲] جرائم پیشہ لوگوں کو مختلف مملکتوں میں مختلف قسم کی سزائیں دی جاتی ہیں چنانچہ باغیوں اور قاتلوں کو تو ہر جگہ موت ہی کی سزا دی جاتی ہے البتہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷ پر)

[۳] صفحہ ۳۷ پر

ی معاشرے کے اندر رہ کر ہی پوری ہوتی ہیں اس لئے وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اہل جاہلیت متمدن ہوتے ہیں اور اپنی ضروریات کے مطابق اجتماعات قائم کرتے ہیں لیکن ان کے تمام اجتماعات کا جائزہ لیکر وہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اہل جاہلیت کے تمدنی اجتماعات لازماً ایک ہی نوعیت کے نہیں ہوا کرتے بلکہ ان کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم اپنی ہیئت اور کیفیت کے اعتبار سے دوسری سے بالکل الگ ہوتی ہے چنانچہ اس نے مدینۃ الجاہلیہ میں ایسے چھ قسم کے اجتماعات دریافت کئے ہیں جو ذیل میں درج ہیں :-

(۱) ضروری اجتماع (۲) پست درجہ کا اجتماع (۳) ذلیل اجتماع (۴) شریفانہ اجتماع (۵) غلبہ کا اجتماع (۶) جمہوری اجتماع ۔

(۱) ضروری اجتماع

جاہلیت کے اجتماعات میں پہلا اجتماع ضروری اجتماع ہوتا ہے اور یہ صرف اس غرض سے قائم کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی معاشی ضروریات کے حصول میں کام آسکے، چنانچہ اس اجتماع کے پیش نظر صرف معیشت کے قواعد واصول اور اقتصادی ضرورتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا یہ لوگ اپنی معاش علانیہ اور خفیہ دونوں طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔ علانیہ طریقوں میں کاشت کاری، گلہ بانی اور شکار وغیرہ شامل ہیں لیکن خفیہ (نا جائز) طریقوں میں چوری، غبن، دھوکا دہی اور رشوت خوری وغیرہ شامل ہیں۔ بعض شہروں میں تو یہ تمام ہی پیشے پائے جاتے ہیں لیکن بعض میں کچھ کم وبیش بھی ہوتے ہیں۔ اس اجتماع کو فارابی ضروری اجتماع اس لئے قرار دیتا ہے کہ اس کے بغیر ارباب جاہلیت کی ابتدائی تمدنی ضرورتیں ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوسکتیں اس اجتماع میں چونکہ دولت انسانی کی خادم رہتی ہے اور وہ اس سے تمتع حاصل کرتا ہے اس لئے اس میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں دولت کے اس حد تک استعمال کو کسی قدر جائز کہا جاسکتا ہے۔

(۲) پست درجہ کا اجتماع

ارباب جاہلیت کا پہلا اجتماع جب تک ضروریات زندگی فراہم کرنے کی خدمت انجام دیتا رہتا ہے تو فارابی کے نزدیک وہ ان کے لئے ایک ضروری اجتماع رہتا ہے لیکن جب اس مملکت کے لوگ کسب کے تمام طریقوں کو محض دولت بڑھانے اور سرمایہ جمع کرنے استعمال کرنے لگتے ہیں تو فارابی اس کو پست درجہ کا اجتماع قرار دیتا ہے اور اس کی پستی کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان لوگوں میں مال ودولت کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بخیل اور تنگدل ہو جاتے ہیں چنانچہ ان کا رُخ عروج کی بجائے پستی کی جانب ہو جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر

(ص۳ کا بقیہ حاشیہ) دوسری قسم کے جرائم کرنے والوں کے لئے سزاؤں کے معیار اور طریقے مختلف ہیں لیکن فارابی نے ان کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کرنے کی جو تجویز پیش کی ہے وہ اس لحاظ سے غور طلب ہے کہ جانوروں کو ظلم کا نشانہ بناتے بغیر ہی مفید کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے اس طرح وہ اپنی وحشی زندگی کے خطرات سے بچ جاتے ہیں اور ان کی ضروریات اچھی طرح پوری ہو جاتی ہیں اور دوسری جانب ان کی فطری قوت تخریب کی بجائے صالح تمدن کی تعمیر میں صرف ہوتی ہے (بقیہ حاشیہ ۳ ص۲۶) حقیقی سعادت سے محرومی جاہلیت کہلاتی ہے۔ رہی سعادت تو وہ مادی اور اخلاقی بہتری اور برتری کا دوسرا نام ہے۔ مادی بہتری کے حصول میں انسانی سعی وجہد اور باہمی تعاون، موثر عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اخلاقی برتری ہدایت اور تربیت پر موقوف ہوتی ہے چنانچہ جو لوگ انبیا اور رسولوں سے ہدایت اور تربیت حاصل کرلیتے ہیں اور ارباب فضیلت کہلاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ خود اپنی یا اپنے جیسے دوسرے ناقص انسانوں کی عقل کی پیروی کرتے ہیں وہ حقیقی سعادت سے محروم رہتے ہیں اور نتیجتہً ارباب جاہلیت کہلاتے ہیں۔

ایسا معاشرہ جو بخل اور تنگدلی کی نحوست میں گرفتار ہو جاتے پست درجہ کا معاشرہ ہے۔اس معاشرے میں دولت انسان کی زر بن جاتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے خود دولت کمانے کی مشین بن جاتا ہے۔چنانچہ یہ دولت اور پیدائش دولت کی صلاحیت دونوں ہی کا غلط استعمال ہے۔

(۳) ذلیل اجتماع

اہل جاہلیت کا ایک اجتماع ایسا بھی ہوتا ہے جس کے لوگ کھانے، پینے، کھیل کود اور تماشے اور تفریحات میں مستغرق ہو جاتے ہیں اور ان تمام چیزوں سے بدن کو بھی کوئی فائدہ پہونچانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ یہ سارے جتن صرف لذت گیری اور لطف اندوزی کی خاطر کئے جاتے ہیں۔تمدن کا یہ درجہ چونکہ ضروریات زندگی کی فراہمی اور حصول دولت کے بعد آتا ہے اس لئے اس میں عیش و عشرت کے اسباب بدرجۂ کمال موجود ہوتے ہیں اور ان میں بھی وہ شخص سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھا جاتا ہے جس کو حصول لذت کے ذرائع اور اسباب زیادہ سے زیادہ حاصل ہوں اور جو سب سے زیادہ عیش پسندانہ زندگی بسر کرتا ہو۔ایسے اجتماع میں چونکہ انسانیت کے تمام جوہر فنا ہو جاتے ہیں اور وہ عزو شرف بھی جو صرف انسان کے لئے مخصوص ہے ذلت و نکبت سے بدل جاتا ہے اس لئے فارابی ایسے اجتماع کو ذلیل اجتماع قرار دیتا ہے۔یعنی وہ معاشرہ جس میں عیش و عشرت کی وبا پھوٹ پڑی ہو اور دولت صرف نفس کی لذتوں پر لٹائی جا رہی ہو وہ انتہائی ذلیل اور خبیث معاشرہ ہے اور اس کی یہ صورت چونکہ دولت کے اسراف سے پیدا ہوتی ہے اور اسی کے سہارے سے معاشرہ اخلاقی زوال میں مبتلا ہوتا ہے اس لئے دولت کا یہ استعمال بھی بالکل غلط اور ناجائز ہے۔

(۴) شریف اجتماع

اہل جاہلیت کے اجتماعات کی چوتھی قسم وہ ہے جس میں عزت و شرافت کا اعتبار کیا جاتا ہے اور لوگ باہمی احترام کی بنیاد پر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔یہ عزت و احترام زبان کے ذریعے سے بھی کیا جاتا ہے اور عمل کے ذریعے سے بھی۔کبھی یوں ہوتا ہے کہ ایک شخص جس طرح دوسرے شخص کی عزت کرتا ہے اسی طرح دوسرا شخص بھی پہلے شخص کی عزت کرتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرا شخص بھی پہلے شخص کی عزت کرتا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرا شخص پہلے سے بڑھ کر عزت کرتا ہے کبھی یہ عزت و احترام کا معاملہ ایک ہی مملکت کے لوگوں کے درمیان میں رہتا ہے لیکن کبھی دوسری مملکتوں کے لوگ بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔اس طرح پورا معاشرہ شرافت و عزت کا دلدادہ بن جاتا ہے۔چنانچہ اسی خصوصیت کی وجہ سے فارابی اس کو اہل جاہلیت کے شریف اجتماع کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

اہل جاہلیت کے نزدیک عزت کا جو تصور اور جو معیار ہے فارابی اس کی بھی وضاحت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ جو شخص اپنی ذات یا اپنے حامیوں کے سہارے سے کچھ برتری حاصل کر لیتا ہے وہ اہل جاہلیت کے نزدیک قابل عزت سمجھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ خاندانی بزرگی آبا و اجداد کی دولت مندی اور اسباب لذت کی بہتات کو بھی عزت کے اسباب میں شمار کیا جاتا ہے۔جن لوگوں سے اہل شہر کو کسی قسم کا فائدہ پہونچتا ہے یا جو خوبصورت یا بہادر ہوتے ہیں وہ بھی قابل عزت سمجھے جاتے ہیں۔مختصر یہ ہے کہ اس قسم کے اجتماع میں مملکت کا رئیس یا بادشاہ ایسا شخص ہوتا ہے جس میں شرافت و عزت کے یہ فضائل سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں اب اگر اس مملکت میں مدار سیادت خاندان ہے تو اس کو عالی نسب ہونا چاہئے اگر دولت وجہ امتیاز ہے تو اس کو سب سے زیادہ دولت مند ہونا چاہئے لیکن ایسا شخص جو نہ عالی نسب ہو اور نہ زیادہ دولت مند ہو اسے ایسی مملکت میں کوئی امتیاز حاصل نہیں ہوتا۔ان رئیسوں میں وہ رئیس زیادہ اچھا ہوتا ہے جو مال و دولت دوسروں پر خرچ کرتا ہے۔اور خود اس کا خواستگار نہیں ہوتا اور اپنے لئے صرف عزت و شہرت ہی کو

...انی سمجھتا ہے - اب اگر عزت کی یہ خواہش معقول حدود سے متجاوز نہ ہو تو فارابی اس کو اہل جاہلیت کی بہترین مملکت سمجھتا ہے -

(۵) غلبہ کا اجتماع

اہل جاہلیت کے اجتماعات کی پانچویں قسم غلبہ کا اجتماع ہے چنانچہ جب لوگوں میں غلبہ حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں تا آنکہ غلبہ پسندوں کے باہمی تعاون اور اشتراک کے نتیجے میں ایسا اجتماع وجود میں آجاتا ہے لیکن ان تمام غلبہ پسندوں میں جن کے تعاون اور حمایت سے غلبہ کا اجتماع معرض وجود میں آتا ہے - غلبہ کی خواہش بالکل یکساں نہیں ہوتی بلکہ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ - پھر جس غلبہ کے لئے وہ کوشش کرتے ہیں وہ بھی ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا بلکہ اس کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں مثلاً بعض لوگ محض درندہ خصلت ہوتے ہیں اور وہ دوسروں کے خون کے پیاسے رہتے ہیں چنانچہ جب خون بہا لیتے ہیں تب ان کی غلبہ حاصل کرنے کی خواہش مطمئن ہوتی ہے - بعض دوسرے لوگ انسانوں کو اپنا غلام بنانے اور ان کی ذاتوں اور ان کے نفوس کو اپنے قبضے میں رکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں چنانچہ جب اتنا اقتدار ان کو حاصل ہو جاتا ہے تب ان کی غلبہ حاصل کرنے کی خواہش پوری ہوتی ہے لیکن تیسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو مال و دولت پر قبضہ و تصرف حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگ اپنی ضروریات کے حصول میں ان کے محتاج رہیں اور نتیجۃً ان کی اطاعت و فرمانبرداری کو قبول کرلیں چنانچہ جب یہ لوگ اتنی دولت حاصل کر لیتے ہیں تب ان کی غلبہ حاصل کرنے کی خواہش آسودہ ہوتی ہے -

ان غلبہ حاصل کرنے والوں میں بعض لوگ عالی حوصلہ ہوتے ہیں چنانچہ وہ غفلت کی حالت میں کسی پر حملہ آور نہیں ہوتے - پہلے اس کو مقابلے کے لئے للکارتے ہیں تب اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے حریف کی کسی چیز پر نگاہ بھی نہیں ڈالتے تا وقتیکہ پورا مقابلہ کرکے اس کو حاصل نہ کریں - ان لوگوں کا مقصد صرف قہر و غلبہ ہوتا ہے اور وہ اپنے اہل مملکت کو بھی مغلوب ہی رکھنا چاہتے ہیں - لیکن بعض غلبہ حاصل کرنے والے متانت و سنجیدگی اور حسن تدبیر کے ذریعے سے بھی غلبہ حاصل کرتے ہیں - ان لوگوں کے اصول اور قواعد و رسوم اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کی پابندی سے وہ دوسروں پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں - یہ لوگ غلبہ کی کثرت اور اس کے ساز و سامان پر باہم فخر کرتے ہیں - غلبے کے یہ ساز و سامان یا تو انسان کی رائے میں یا اس کے جسم میں یا اس کے جسم کے باہر پائے جاتے ہیں - رائے میں یہ کہ وہ خوش تدبیر ہو، جسم میں یہ کہ وہ طاقتور ہو اور جسم سے باہر یہ کہ اس کے پاس ہتھیار ہوں -

غلبہ پسند لوگ بڑے سنگدل، ظالم اور مغرور ہوتے ہیں غیظ و غضب ان کی فطرت میں شامل ہوتا ہے اپنی ہر بات پر ناز کرتے ہیں اور دوسروں کو کمتر حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں کھانے پینے کے حریص اور نفسانی خواہشات کے بندے ہوتے ہیں - ہر قسم کے فوائد کے درپے رہتے ہیں اور ہر چیز اور ہر شخص پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں ان میں سے جو شخص دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے میں ان لوگوں سے زیادہ خوش تدبیری سے کام لے اور دوسروں کو ان پر غلبہ حاصل نہ کرنے دے وہی ان کا رئیس یا بادشاہ ہوتا ہے -

غلبہ کے شہر میں درحقیقت غالب یہی ایک شخص ہوتا ہے جو رئیس یا بادشاہ کہلاتا ہے اور باقی اس کی پوری قوم دوسرے لوگوں کو مغلوب کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اب اگر اس رئیس کا مقصد صرف قہر اور غلبہ ہوتا ہے تو وہ اپنی ضروریات زندگی کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں کرتا - اس کی خواہشات کی تسکین تو صرف اس امر میں مضمر رہتی ہے کہ لوگ اس کے غلام رہیں اور کوئی بھی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے لیکن اگر رئیس دوسری قسم کا ہوتا ہے جو اس لئے غلبہ حاصل کرتا ہے کہ اس کے ذریعے سے مال و دولت حاصل کرے اور ہر قسم کے اعزاز اور لذتیں اس کے لئے فراہم ہوں تو یہ غلبہ کا شہر یا تو پست درجے کا ہے یا پھر ذلیل مملکت ہے -

غلبہ کے شہر اقتدار پسند لوگوں کے شہر ہوتے ہیں - لیکن بعض اوقات دولت کے حریص اور اعزاز پسند لوگ بھی جب دوسرے طر...

سے اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتے تو وہ بھی اقتدار پسند لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں تاکہ اس ذریعے سے وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکیں۔

(۶) جمہوری اجتماع

ارباب جاہلیت کا چھٹا اجتماع جمہوری اجتماع کہلاتا ہے اس اجتماع میں ہر فرد کو مکمل آزادی اور خود مختاری حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے تمام امور اپنی منشا اور اپنی مرضی کے مطابق انجام دیتا ہے اس اجتماع میں کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اس کی مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کر سکے اس طرح تمام لوگوں میں مساوات پائی جاتی ہے اور کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ہوتی۔ قانون کی نگاہ میں تمام انسان برابر اور یکساں حیثیتوں کے مالک ہوتے ہیں چنانچہ کسی کے لئے امتیازی حقوق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مختصر یہ ہے کہ جمہوری مملکت میں کسی کو کسی پر کوئی اقتدار حاصل نہیں ہوتا بلکہ تمام لوگ حکومت کے اقتدار میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ آزادی بسیط کے اس عالم میں اغراض اور مقاصد کی کثرت ہو جاتی ہے اخلاق کے معیار بھی مختلف قائم کر لئے جاتے ہیں اور اجتماعی امور کے بارے میں آراء و افکار میں بے شمار اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں جن کے نتیجے میں پورا معاشرہ مختلف جماعتوں اور گروہوں میں منقسم ہو جاتا ہے (مثلاً سیاسی جماعتیں وغیرہ) مختلف گروہ بعض امور میں متفق بھی ہو جاتے ہیں اور بعض میں مختلف ہی رہتے ہیں لیکن اس معاشرے میں منصب حکومت پر صرف وہی لوگ فائز ہوتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی منشا کے مطابق حکومت چلا سکیں اور اگر وہ زیادہ لوگوں کی نافرمانی کرنے لگیں تو وہ پھر حکومت پر فائز نہیں رہ سکتے۔ ایسی مملکت میں بالعموم ہوتا یہ ہے کہ لوگ ایسے افراد کو اپنے لئے حاکم منتخب کرتے ہیں جو ان کے نزدیک زیادہ قابل تعریف اور پسندیدہ ہوتے ہیں اور جو باشندگانِ مملکت کو زیادہ سے زیادہ آزادیاں عطا کرتے اور پھر خود ہی ان آزادیوں کی حفاظت بھی کرتے ہیں ہر مرحلے میں عوام کی خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔ بیرونی حملوں سے ان کو محفوظ رکھتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی ذاتی خواہشات کو عوام پر قربان کر دیتے ہیں۔

اس قسم کی جمہوری مملکت میں چونکہ ہر شخص کی خواہش پوری ہو سکتی ہے اس لئے مختلف قومیں یہاں آکر آباد ہو جاتی ہیں۔ جن کے باعث یہاں مختلف قسم کے کاروبار فروغ پاتے ہیں اور معاشی اور تمدنی حیثیت سے پورا معاشرہ ترقی کرنے لگتا ہے۔ مختلف نسلیں جو اپنی فطرت اور تربیت کے اعتبار سے بھی مختلف ہوتی ہیں جب بڑھنے اور پھیلنے لگتی ہیں تو ان کی وجہ سے بہت سے شہر پیدا ہو جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے ممتاز بھی ہوتے ہیں اور باہم مربوط بھی رہتے ہیں پھر چونکہ اس مملکت میں مختلف اخلاق اور مختلف جذبات کے لوگ جمع ہوتے ہیں اس لئے مختلف قسم کے رجحانات بھی پرورش پانے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ اس معاشرے میں علماء، حکماء، خطباء اور شعراء پیدا ہو جاتے ہیں اور نئے نئے علوم و فنون معرض وجود میں آتے ہیں۔ جمہوری مملکت جب اس درجہ تک پہونچ جاتی ہے تو اس میں سے مدینۃ الفاضلہ کے اجزا کا انتخاب کیا جا سکتا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ ارباب جاہلیت کی تمام مملکتوں میں جمہوری مملکت ہی ایسی ہوتی ہے جس میں سب سے زیادہ برائی اور بھلائی کا اجتماع ہوتا ہے۔

۳- مدینۂ فاسقہ

مملکت کی تیسری قسم فارابی کے نزدیک مدینۂ فاسقہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فطرت اور مزاج کے اعتبار سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نیکی اور سعادت کا اعتقاد تو رکھتے ہیں لیکن اپنے اعمال اور معاملات میں اس عقیدے کی پیروی کرنے کی بجائے اہل جاہلیت کا اتباع کرتے ہیں۔

ء اس مرض میں مرزا غالب بھی مبتلا رہ چکے ہیں چنانچہ خود ہی ارشاد فرماتے ہیں :-

یعنی زبان سے تو نیکی اور بھلائی کی تعریف ہی کرتے ہیں لیکن دل کا میلان بدی اور ارباب جاہلیت کے طریقوں کی جانب ہوتا ہے۔ اور اغراض و مقاصد بھی ان کے وہی ہوتے ہیں جو جاہلیت والوں کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں انہی مقاصد کو حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال و اخلاق اور اطوار و عادات بالکل جاہلیت کی مانند ہو جاتے ہیں، البتہ ان میں اور اہل جاہلیت میں فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا اعتقاد سعادت کے اصولوں پر ہوتا ہے اور اہل جاہلیت سرے سے سعادت پر اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ اہل جاہلیت کو جو یکسوئی حاصل ہوتی ہے اس کے کچھ نہ کچھ اثرات ان کے اعمال پر بھی مرتب ہوتے ہیں لیکن یہ عقیدے اور عمل میں تضاد رکھنے والے فساق ایک کشمکش پیہم[1] میں مبتلا رہنے کے باعث ایک جانب تو سعادت سے دور رہتے ہیں اور دوسری جانب جاہلیت کے اعمال کے نتیجہ میں جو عارضی اور حقیر مادی فوائد ممکن ہو سکتے ہیں ان سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر جو مملکت مشتمل ہوتی ہے، فارابی اس کو مدینۂ فاسقہ کے نام سے موسوم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس مملکت کے تمام لوگ فاسق اور بدکار ہوتے ہیں اور وہ کبھی کسی بھلائی کو نہیں پہونچ سکتے۔

۴۔ مدینۂ ضالہ

فارابی کے نزدیک مملکت کی چوتھی قسم مدینۂ ضالہ ہے۔ یہ مملکت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو سعادت کے مقابلے میں ضلالت کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں اور اپنی زندگی کے لئے ایسے طریقوں کو پسند کرتے ہیں جو سعادت کی عین ضد واقع ہوئے ہیں۔ یہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں پہلی قسم ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو اہل جاہلیت کے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن مذہبی قانون جب اس کی اجازت نہیں دیتا تو اس قانون کے الفاظ کی تاویل اپنی خواہشات کے مطابق کر لیتے ہیں اور اس طرح اپنے مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں یہ لوگ محرفہ کہلاتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو واضح قانون کے مقصد کو نہیں سمجھتے اور غلط معلومات پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس طور پر گمراہ ہونے والے لوگ مارقہ کہلاتے ہیں۔ ان دونوں قسموں کے لوگوں پر جو مملکت مشتمل ہوتی ہے وہ ضلالت اور گمراہی میں مبتلا رہتی ہے اور کبھی بھی سعادت سے ہمکنار نہیں ہوتی اسی لئے فارابی ایسی مملکت کو مدینۂ ضالہ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

---

[1] پھر اس مرض کے نتیجے میں مرزا کی جو حالت ہوئی اس کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

" ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عصرِ حاضر

قمر ساحری

وہی فضائے چمن ہے وہی ہیں لیل و نہار
کہاں ہیں میرے سفیرانِ موسمِ گلبار
سکونِ دیدہ و دل آج بھی ہے خوابِ خیال
وہی عذابِ شبِ کرب ہے وہی آثار
کس آفتاب کے دھوکے میں رقص فرما ہیں
ترانہ خوانِ سحر! طالبانِ روزِ شمار
یہ دور چیخ رہا ہے کہ گنگناتا ہے
ذرا بتائیں تو خنیا گرانِ فصلِ بہار
نئے سروں پہ چمکنے لگے ہیں تاجِ شہی
نئی ادا سے سجائے گئے ہیں ناصیہ زار
صدائے حق کے تعصب میں کل بھی تھے جلّاد
صدائے حق پہ لچکتی ہے آج بھی تلوار
کہاں ہے غزنوی سومناتِ جمہوری
نئے بتوں کی پرستش ہوئی ہے سر پہ سوار
قدم قدم پہ خراجِ خوشامد و سجدہ
عوام بن گئے جمہوریت کے باجگزار

محشر بدایونی

کوئی غنچہ کھلے چونک پڑتا ہوں میں
جیسے میری ہی جانب ہے روئے سخن

نذرِ شاعرِ الحاد

آغا صادق

کیونکر رُخِ کائنات پہچانے گا
کس طرح مقاماتِ بشر جانے گا
اللہ کو اللہ نہیں مان سکا
انسان کو انسان ترکیا مانے گا

خود بینی و خود آرائی کی بو آتی ہے
سطحی سی خرد کی گفتگو آتی ہے
عرفانِ حقیقت کا تجھے بھی دعویٰ
باتوں سے ترا الحاد کی بو آتی ہے

تاریک ہے دل، دماغ گردش ہے
خالق سے مذاق بھی کمالِ فن ہے
اے شاعرِ الحاد ترا ہر نکتہ
بوجہل کے دل کی آخری دھڑکن ہے

اعجاز ڈیروی

شاید قریب تر ہے مری منزلِ مراد
حالات آ رہے ہیں نظر سازگار سے
چھٹ جائیں گے غموں کے اندھیرے بھی یکدن
مایوس کیوں ہوں رحمتِ پروردگار سے

جب خزاں ہی نصیب ہے اپنا
ذکرِ فصلِ بہار کیا کیجے

محمد حنیف اللہ پھلواروی

سلطان محمود غزنوی کے جانشینوں کا علمی ذوق

شہاب الدین مسعود

(۴۲۱ھ - ۴۳۲ھ — ۱۰۳۰ء - ۱۰۴۰ء)

علم پروری اور علمی ذوق سلطان محمود غزنوی کے جانشینوں میں بھی قائم رہا۔

نرمندرا ناتھ لا کے بیان کے مطابق مسعود کو ہم محمود کا صحیح جانشین پاتے ہیں۔ جس نے اپنے باپ کی روایت کو قائم رکھا۔ شاندار عمارتیں جن میں مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی عمارتیں بھی شامل تھیں۔ تعمیر کرائیں ان کے انتظام کے لئے معقول اور منقول اوقاف قائم کئے۔ عالموں کے لئے غزنیں کی دلکشی اور حسن کو برقرار رکھا۔ تعلیمی ترقی ذلوسیع کی طرف خاص توجہ دی اور اپنی حکومت کے مختلف شہروں میں بہت سے تعلیمی ادارے قائم کر کے عوام کے لئے تعلیمی سہولتیں فراہم کیں۔ (عہد اسلامی میں علمی ترقی)

سلطان مسعود کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ علماء کے لئے بے انتہا فیاض تھا۔ اُسے قابل لوگوں کی صحبت کا اس قدر شوق تھا۔ کہ مختلف ممالک سے ماہرین علم و فن اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔

مسعود کو خود علم و ادب کے ساتھ جو ذوق تھا وہ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانہ ولی عہدی میں جب وہ خراسان سے غزنیں آیا اور شعراء نے قصائد تہنیت پیش کئے تو عنصری اور زینتی کو پچاس پچاس ہزار درہم اور شعراء کو بیس بیس ہزار انعام دلوائے۔ سلطان محمود نے لاہور فتح کیا تو مسعود یہاں کا گورنر بنایا گیا۔ اس کے دامن دولت سے علماء و فضلاء کی جماعت وابستہ تھی۔

سلطان مسعود کریم و فیاض، علم دوست اور معارف پرور ہونے کے ساتھ بے انتہا دلیر و شجاع مشہور ہو گیا تھا۔ مسعود فضول خرچ کی حد تک فیاض تھا وہ خاص طور پر ان علماء کا زیادہ خیال رکھتا تھا جو اقالیم عالم سے غزنیں میں آ کر جمع ہو گئے تھے (فرشتہ)

مسعود نے مختلف حصوں میں اس قدر کثرت سے معابد و مساجد، مدارس و دارالعلوم تعمیر کرائے کہ اُن کا شمار مشکل ہے اور اس کی فیاضی اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ ایک بار ماہ رمضان میں بھی اس نے ایک لاکھ درہم ایک ہی دن میں غربا کو تقسیم کر دئے۔ مسعود نے

مدارس ومکاتب کو عطیات واوقاف سے مالامال کردیا ۔ (روضۃ الصفا)

مسعود دلیر، شجاع اور علماء کا قدر دان تھا، جنہوں نے اس کے لئے کئی کتابیں لکھیں، خیرات اس کا شغلہ تھا۔ مساجد کی تعمیر اسے مرغوب تھی۔ اس نے جو عمارتیں تعمیر کرائیں انہیں دور دور سے لوگ دیکھنے کے لئے آتے۔ وہ شعراء کو بیش بہا انعامات دیتا۔ اس کا خط نہایت عمدہ تھا۔ حدود مملکت دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

اس کے کارناموں پر بہت سی کتابیں ہیں (زینت الخواطر)

الغرض مسعود اشاعت علم پر اور قدرشناسی فضل وکمال میں اپنے باپ محمود کا صحیح جانشین تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ معمولی سے معمولی شخص بھی علم کی طرف توجہ کرے اور یہی وجہ تھی کہ اس نے کسب علم کے لئے بہت سی آسانیاں پبلک کے واسطے بہم پہونچا دی تھیں۔ طلباء کو وظائف دئیے جاتے تھے۔ ان کے تمام مصارف کا بار برداشت کیا جاتا تھا اور ہمت افزائی میں کوئی دقیقۂ کوشش کا اٹھا نہ رکھا تھا

مسعود کے ہمراہیوں میں کئی قابل لوگ تھے جنہیں وہ معقول معاوضہ دیا کرتا تھا۔ ایک شاعر کو ایک ہزار دینار بخش دئیے اور دوسرے کو ایک ہزار درہم فی شعر (زینت الخواطر) ایک بار زینتی کو ایک لاکھ درہم اور ایک ہاتھی عطا کیا۔

منوچہری متوفی ۴۳۲ھ مسعود کے دربار کا شاعر تھا اس نے اپنے زیادہ قصیدے اسی بادشاہ اور اس کے وزراء اور امراء کی تعریف میں کہے (تاریخ ادبیات ایران)

ابوریحان البیرونی اپنے عہد کا ممتاز فلسفی اور منجم تھا مسعود کے عہد میں اس کی بڑی قدرافزائی ہوئی اور اسی کے عہد میں بہت سی بے مثل تصانیف ملک کے سامنے پیش کیں اس نے مسعود کے نام پر ایک کتاب "قانون مسعودی" لکھی جس میں حکیم بطلیموس سے مطابقت مقصود ہے ——
(زینت الخواطر) کتاب کے لکھنے پر مسعود نے ہاتھی کے ہم وزن چاندی انعام دی لیکن اس نے خزانہ میں واپس کردی۔

البیرونی نے مسعود کے لئے "کتاب الجماہر فی الجواہر" لکھی جس میں جواہرات کے اقسام اور ان کے متعلقات پر بحث ہے (زینت الخواطر)
مسعود ہی کی خاطر البیرونی نے کتاب التاریخ المسعودی" لکھی۔ بیہقی کی تاریخ الحکماء میں البیرونی کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے چالیس سے زیادہ سال تحصیل علم میں صرف کئے اور ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ کتابیں لکھیں (آب کوثر)

قاضی ابومحمد ناصحی نے فقہ احناف پر ایک کتاب "فقہ مسعودی" لکھی اور مسعود کے نام سے منسوب کی۔ اسی طرح اکثر ماہرین نے مختلف علم و فنون پر کثیر التعداد کتابیں تصنیف کیں اور مسعود کے نام سے معنون کیں۔ بیہقی سلطان مسعود کے زمانہ میں تھے، انہوں نے "تاریخ آل غزنیہ" لکھی ضمناً شعراء عصر کا تذکرہ کیا (شبلی)

شیخ ابوعبداللہ اوزبہ پسر عبداللہ نکتی لاہوری، عہد سلطان مسعود ابن محمود غزنوی کے ممتاز عالم، بحسب قول عوفی در لباب الالباب اوزبہ کہ وہ فارسی میں بہت نغز گو شاعر تھے۔ انہوں نے مسعود کی شان میں قصائد کہے۔

شیخ فاضل سعد ابن سلمان ہمدانی لاہوری اپنے عہد کے ممتاز الافاضل تھے۔ سلطان مسعود نے انہیں ۴۲۷ھ میں اپنے بیٹے مجدود کے ساتھ ہندوستان بھیجا اور مستوفی الملک کا خطاب ارزانی فرمایا۔ سعد نے لاہور کو اپنی اقامت گاہ قرار دیا (بروایت بیہقی)

بیدیہ کے بیان کے مطابق مسعود ریاضیات کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس نے خود ہی ایک عظیم الشان نئے پل کی تعمیر کی وہ مہندس تھا اس نے بڑے بڑے محل بنوائے اور شاندار باغ بھی۔ البیرونی کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعود کے عہد میں عربی اور فارسی ادب نے بڑی ترقی کی۔

اسی زمانہ میں مسلمان علماء ریاضی، نجوم، طب وغیرہ علوم وفنون کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے۔ انہوں نے جدید تحقیق و تفتیش کے شعبے بھی قائم کئے۔ بہت سی سنسکرت اور ہندی کتابوں کے ترجمے کئے گئے (ذمہ دار ما تقدالہ)
مسعود کی بڑی خواہش تھی کہ غزنیں ایشیا کی ایک ممتاز یونیورسٹی بن جائے۔

عبدالرشید

(۴۴۳ - ۴۴۴ھ — ۱۰۵۱ - ۱۰۵۲ء)

سلطان عبدالرشید بھی بڑا فاضل اور ذہین تھا۔ اپنا وقت اکثر لکھنے پڑھنے میں صرف کرتا۔ اسے تاریخ سے خاص طور سے دلچسپی تھی۔
عبدالرشید کے دورِ حکومت میں ابوسعید عبدالحی بن ضحاک بن محمود نے ایک کتاب "زین الاخبار" لکھی جس میں اس کے زمانے تک کی ایران کی مختصر تاریخ اور ظہورِ اسلام کا حال، خلفاء کی تاریخ اور ۳۲۳ھ تک کے واقعات اختصار کے ساتھ درج ہیں۔ زین الاخبار کا شمار فارسی کی قدیم ترین تاریخی کتابوں میں ہوتا ہے، سامانیوں اور غزنیوں کی تاریخ کے لئے قربِ زمانی کے لحاظ سے اس تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ (تاریخ ادبیات ایران)

ابراہیم بن مسعود

(۴۵۱ - ۴۹۲ھ — ۱۰۵۹ - ۱۰۹۸ء)

سلطان ابراہیم نے تعلیم کی ترویج و اشاعت کے لئے بڑی کوشش کی۔ ابراہیم خطاطی میں بہت مشہور تھا۔ وہ ہر سال ایک مصحف اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایک سال مکہ معظمہ اور دوسرے سال مدینہ منورہ بھیجا کرتا تھا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ سلطان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن کریم کے بعض نسخے اب بھی کتب خانہ نبوی میں محفوظ ہیں (فرشتہ) مشہور ادیب "ابوالعلا بن یعقوب" ابراہیم کا کاتب تھا۔
فرشتہ جامع الحکایات کے حوالہ سے بیان کرتا ہے کہ سلطان ابراہیم دینیات کی طرف بہت مائل تھا اور نہایت پابندی کے ساتھ وہ امام یوسف سجاوندی کی صحبت میں دینی معلومات حاصل کیا کرتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ سجاوندی نے سلطان ابراہیم کو سخت الفاظ میں اخلاق کا درس دیا اور اس نے ہمیشہ صبر و تحمل کے ساتھ اسے سنا۔
سلطان ابراہیم درس کے وقت اپنی شاہانہ حیثیت بالکل فراموش کر دیا کرتا تھا۔ اور ایک معمولی شاگرد کی طرح زانوئے ادب تہ کر کے تمام زجر و توبیخ کو تلمیذانہ رواداری کے ساتھ برداشت کرتا تھا۔
جامع الحکایات میں لکھا ہے کہ شاہی محل میں ہر سال ایک محفل وعظ و نصیحت ہوا کرتی تھی جس میں امام یوسف سجاوندی اپنی تقریروں سے سلطان اور اہلِ محفل کے دل گرمایا کرتے تھے۔ سلطان امام یوسف کے علم و فضل اور اتقا و پرہیزگاری کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ (فرشتہ)
ابراہیم کے دورِ حکومت میں لاہور علوم وفنون کا بڑا مرکز تھا۔ بلخ، بخارا، سمرقند اور دوسرے ممالک سے اہلِ علم کھنچ کر آ گئے تھے۔
ابراہیم کے ایک وزیر ابونصر فارسی کو علم و ادب سے ایسی دلچسپی تھی کہ اس نے لاہور میں ایک خانقاہ بنائی جو اہلِ علم کا مرکز بتائی جاتی ہے (اسلامی کتب خانے)

ملا عبدالقادر بدایونی تحریر فرماتے ہیں :-
"ابراہیم نے اپنے لئے کوئی محل سرائے تعمیر نہیں کرائی۔ سوائے ایک مسجد اور مدرسہ کے اور وہ بھی خدا کے لئے۔

اسے سید السلاطین بھی کہا جاتا ہے اور اسے ولی اللہ بھی سمجھا جاتا ہے۔
مسعود سعد سلمان سلطان ابراہیم کے زمانہ کا شاعر تھا۔ ذیل کے اشعار اسی کے ایک قصیدہ کے ہیں جو اس نے سلطان کی مدح میں لکھے تھے ؎

ابوالقاسم ملک محمود ابراہیم بن مسعود
کہ ماند چار چیز از وے کند ہر یک بد معز
یکے افروختہ چیزے دوم افراختہ رایت
سوم دینار گو گلکے چہارم آب گوں خنجر

مسعود سعد سلمان اور ابو عبد اللہ النکتی جو سلطان ابراہیم کے زمانے میں گزرے ہیں، فارسی کے مشہور شاعر ہیں، ہندی میں شعر کہا کرتے تھے، انہوں نے ہندی کلام کے دواوین بھی مرتب کئے تھے۔ (عرفی و ہفت اقلیم بحوالہ اردوئے قدیم)
استاد ابو الفرج رونی بھی سلطان ابراہیم کا مدّاح تھا۔ اور اس کے قبل وہ سلطان مسعود کا مداح تھا ان دونوں کی مداح میں اس نے بے شمار قصیدے لکھے تھے۔ جو اس کے کلیات میں موجود ہیں۔ استاد ابو الفرج نے ذیل کا قصیدہ بھی سلطان ابراہیم کی مدح میں لکھا تھا ؎

زہے بہ بازو، شمشیر کامگار ترا
شبیہ نفس عزیز و نظیر عقل عدیم
امیر کردہ آں بے نفس چو حلق گلو
یتیم کردہ ایں بے عقب چو دُرِّ یتیم

اس کے کلیات عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں ہیں۔ (منتخب التواریخ)

بہرام ابن مسعود

(۵۱۲-۵۴۷ھ — ۱۱۱۸-۱۱۵۲ء)

نرینسلا ما تھرلا لکھتا ہے کہ سلطان ابراہیم کے بعد بہرام ابن مسعود بادشاہ ہوا۔ یہ غیر معمولی طور پر علم کا دلدادہ تھا۔ اس نے اپنی علم دوستی اور اہل علم کی فراخدلانہ سرپرستی کے ذریعہ ادبی دنیا میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس کے دربار میں بہت سے علماء اور فضلاء جمع ہو گئے تھے۔ جن میں شیخ نظامی اور سید حسن غزنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں فلسفی اور شاعر تھے اور غیر معمولی شہرت کے مالک تھے۔

بہرام کی تخت نشینی کے روز سید حسن نے جو قصیدہ کہا تھا اس کا مطلع یہ ہے ؎

ندائے بر آمد ز ہفت آسماں
کہ بہرام شاہ است شاہِ جہاں

خاندان غزنوی میں بہرام شاہ بھی خاص صفات کا بادشاہ تھا۔ اس نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اپنے ذوقِ علم کو

ہمت دینا شروع کیا۔ اس نے علم وفضل کی اس درجہ قدر کی اور ترقی ادب میں اس قدر فیاضی اور عالی حوصلگی سے کام لیا کہ لوگ محمود کے زمانہ کو بھول گئے۔ شیخ نظامی اور سید حسن غزنوی جو مشہور شعراء اور حکماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بہرام ہی کے دربار کے جوہر تابندہ تھے، بہرام نے مختلف کتابیں غیر زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کرائیں۔

بہرام شاہ کی علم دوستی اور عالم نوازی کے باعث بہت سے علماء غزنیں میں جمع ہو گئے تھے۔ بہرام کتابیں جمع کرنے کا بھی شائق تھا۔ اور اپنے سامنے پڑھوا کر سننے کا عادی تھا۔

نزہت الخواطر میں تحریر ہے کہ بہرام شاہ اخلاق ستودہ سے بہرہ مند اور عقیدہ میں عمدہ تھا، علماء کا محب، ان کی تعظیم وتکریم میں پیش پیش۔ ان کے لئے داد ودہش میں فراخ دل۔ ایک بڑے کتب خانہ کا جمع کرنے والا۔ جو کتاب اس کے حضور میں پڑھی جاتی۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیتا۔ اہل قلم نے اس کا یہ ذوق دیکھ کر بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔

امام فخر الدین علوم دینیہ میں امام وقت سمجھے جاتے تھے۔ بہرام ان کی بڑی عزت کرتا۔ امام صاحب نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں
فرشتہ کے بیان کے مطابق بہرام شاہ بڑے رعب وداب اور شان وشوکت کا بادشاہ تھا۔ وہ عالموں، فاضلوں اور درویشوں کی صحبت میں بیٹھنا پسند کرتا تھا تاکہ ان کی اچھی عادتیں سیکھ سکے۔ وہ ہر لکھے پڑھے اور ماہر فن شخص کی قدر کرتا تھا۔
بہرام شاہ کی علم دوستی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے عہد کے بڑے بڑے مصنفوں نے اپنی تصانیف اس کے نام سے معنون کی ہیں۔

بہرام کی خواہش پر ابو المعالی نصر اللہ نے "کلیلہ ودمنہ" کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا اور ان کے نام سے منسوب کیا مشہور شاعر حکیم ابو المجد مجد الدین سنائی نے اپنی مشہور مثنوی "حدیقۃ الحقیقت" کو ۵۲۵ھ میں مکمل کر کے اسے بہرام شاہ کے نام سے منسوب کیا۔ ان کتابوں کے علاوہ بہرام نے مختلف کتابیں غیر زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کرائیں۔ نیز بہت سی کتابیں احاطۂ تحریر میں آئیں۔ ممتاز شاعر مسعود سعد سلمان نے سلطان بہرام شاہ اور دوسرے غزنوی سلاطین کی مدح میں قصائد کہے (اسلامی کتب خانے)

علامہ شبلی کے بیان کے مطابق نظامی نے "مخزن الاسرار" ۵۵۹ھ میں بہرام شاہ کے نام پر لکھی اور صلہ میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں، ایک قطار شتر اور انواع واقسام کے بیش بہا قیمتی کپڑے بھیجے۔ مخزن کی تصنیف کے وقت نظامی کا سن تقریباً ۲۵ برس کا تھا۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں کہ بہرام شاہ کے عہد کا یہ کارنامہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ تصوف اور اخلاقی شاعری کا سنگ بنیاد اسی عہد میں رکھا گیا اور صدی ختم ہونے سے پہلے یہ عمارت گویا انجام کو پہونچ گئی۔ (شعر العجم جلد اول)

غرض سلاطین غزنویہ نے علم وحکمت کو فروغ دینے میں لائق ستائش جدوجہد کی۔ ابن احمد رازی مولف "ہفت اقلیم" کا بیان ہے کہ غزنیں میں مدرسوں کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی۔

البیرونی کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی عہد میں عربی، فارسی زبانیں کس قدر ترقی کر رہی تھیں اور یونان وہند کا نایاب علمی ذخیرہ ان زبانوں میں منتقل ہو رہا تھا۔ ریاضی، نجوم، فلسفہ، علم الادویہ، ہئیت وہندسہ یہ فنون تھے جن کی طرف مسلمانوں کو عام طور پر توجہ تھی اور اسی کے ساتھ ادب کا ذخیرہ بھی سنسکرت وغیرہ سے عربی وفارسی میں منتقل ہو رہا تھا۔

(PREFACE TO ALBERUNI'S INDIA BY SASHOE)

غزنوی دور میں علما نے فارسی نثر پر زیادہ توجہ دی چنانچہ ان کی کوشش اور تحقیق سے بعض بیش قدر علمی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ ان میں دانش نامہ علائی، التفہیم، تاریخ بیہقی اور ترجمان البلاغت خاص طور سے مشہور ہیں (بدخشانی)

غزنوی دور میں شعراء کے علاوہ علماء، فضلاء اور ادبا کی کمی نہ تھی۔ ان میں ہر ایک علم و ادب میں استاد کا درجہ رکھتا تھا۔ غزنوی سلاطین کی علم پروری سے ہزاروں شعرا اس سلطنت کے دور میں دربار سے وابستہ رہے اور فارسی و عربی ادب میں ان کے نقوش تازہ ہیں۔ پنجاب میں ان کے پچاس ساٹھ سال کی حکمرانی کے دور میں یہاں فارسی گو ہندوستانی شعراء بھی پیدا ہوگئے چنانچہ عوفی نے اپنے تذکرہ میں ان کے لئے ایک مستقل باب قائم کیا ان میں ابوالفرج بن مسعود رونی متوفی ۴۸۴ھ اور مسعود سعد سلمان اور روزبہ بن عبداللہ لاہوری خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ (عہد اسلامی کا ہندوستان)

اسی عہد میں اسلامی علوم وفنون کے مرکز منصورہ اور ملتان سے منتقل ہو کر لاہور پہونچ گئے۔ محمود کی نیک نیتی کا یہ اثر تھا کہ غزنوی خاندان کے تقریباً تمام افراد محمود کی کسی نہ کسی خصوصیت کے حامل تھے یہاں تک کہ آخری فرماں روا خسرو بھی عدو درجہ فیاض شریف الطبع اور حلیم تھا۔ (طبقات ناصری)

گو اس زمانہ میں مسلمانوں کی پائدار اور مضبوط حکومت ہندوستان میں قائم نہیں ہوئی تھی لیکن کتب خانوں کی تشکیل و ترقی کی صورتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ غزنوی سلاطین کی علم دوستی، علماء نوازی اور ان کے عہد کے مدارس اور تصنیفات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ غزنوی دور میں پنجاب کتب خانوں سے معمور تھا (اسلامی کتب خانے)

مولانا سعید الاعظمی ندوی

روحِ انتخاب

۵ر نومبر کو عرب اسرائیل جنگ پر پورے پانچ گذر چکے ہیں، اب چھٹا مہینہ بھی تقریباً نصف گذر چکا ہے، اس اثناء میں جنگ کے تلخ نتائج اور اس کے حقیقی اسباب پر کافی بحثیں ہوئیں اور تقریباً ہر تبصرہ کرنے والے نے عربوں کی شکست کے اس غیر معمولی واقعہ کو بے انتہا اہمیت دی اور اس کو اسلامی تاریخ کا ایک ایسا المیہ قرار دیا جس کی نظیر قوموں کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ اس شکست کی اہمیت اس لئے بھی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ عرب اسرائیل کے مقابلہ میں ایک متحدہ طاقت تھے۔ ان کے آپس میں خواہ جتنے بھی اختلاف رہے ہوں لیکن وہ فلسطین کے مسئلہ پر اور صیہونیت کے مقابلہ میں ایک آواز تھے۔ اور ان کی تعداد اسرائیل سے چالیس گنا زیادہ تھی۔

اب تک اس تاریخی المیہ کے چہرہ سے نقاب پوری طرح اٹھ چکی ہے اور جتنے حقائق سامنے آچکے ہیں ان سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ عربوں کی صف میں اسرائیلی نواز عناصر ایک بڑی تعداد میں خفیہ طور پر موجود تھے۔ یہ عنصر منصب قیادت سے لے کر میدان جنگ تک اپنا کام کرتا رہا اور عرب کے بعض میں یہودی خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی حد تو یہ ہے کہ شامی علاقہ میں قنیطرہ کو جواب یہودیوں کے قبضہ میں ہے وہاں کے قائدین اور حکام نے از خود یہودیوں کے حوالہ کرایا اور اس کے سقوط سے پہلے ہی ریڈیو سے یہ اعلان کر دیا کہ قنیطرہ پر یہودی فوج کا قبضہ ہو گیا۔

مصر کے صدر نے اپنی ۲۳ر جولائی کی تقریر میں صراحت سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کو متعین طور سے معلوم تھا کہ دوشنبہ ۵ر جون کو اسرائیل حملہ کرنے والا ہے۔ اور اس کا پہلا نشانہ ہماری فضائی طاقت ہوگی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں انني ابلغت المسئولين العسكريين عندي ان الحرب ستكون يوم الاثنين على التحديد میں نے اپنے نزدیک فوج کے ذمہ داروں کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ جنگ متعین طور پر دوشنبہ کے دن ہوگی۔

اس کے بعد پھر یہ کہنا کہ حملہ اچانک ہو گیا تھا ایک لغو اور دور از کار تاویل ہے اس سے اس شکست کے اصل اسباب اور حقائق پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔

اس موضوع پر اب تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہم اس وقت صرف ان چند اسباب کی طرف اشارہ کر کے واقعات کی روشنی میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ ان اسباب کو عوامی اور حکومتی دونوں سطح پر زائل کرنے کی کتنی کوشش کی گئی اور کہاں تک حالات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

شکست کے اسباب میں یہ تصور تقریباً ہر مبصر کے نزدیک قدر مشترک ہے کہ عام عرب فوج اور خصوصاً مصری فوج نے فدائیت

اور قربانی کے اس جذبہ سے جنگ نہیں لڑی جس جذبے سے اسرائیلی فوج لڑ رہی تھی۔ اور جنگ کی جو ٹیکنک اسرائیلی فوج نے اپنائی تھی اس سے عرب فوج یکسر عاری تھی۔ یہاں تک کہ عرب فوج میدانِ جنگ میں بھی عام طور سے ان تمام حالات کا شکار تھی جو عموماً خدا بیزار قوموں اور ان کی بے ضمیر فوجوں میں پائے جاتے ہیں دوسری طرف اسرائیلی فوج نہ صرف اپنے جوانوں کے خالص اندرونی جذبہ سے لیس تھی، بلکہ اسرائیلی عورتیں اور ان کی لڑکیاں بھی اس شان سے جنگ میں حصہ لے رہی تھیں کہ سینا میں متعد محاذوں پر انہوں نے مصری فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا، کسی جنگ میں شکست کا یہ سب سے بڑا سبب ہے کہ فوج اندرونی جذبہ سے بالکل خالی ہو اور اس کو اپنی نفس پرستی اور عیش کوشی کے سامنے اس بات کی مطلق پروا نہ ہو کہ انجام کس صورت میں ظاہر ہوگا، ہمارا اور ہمارے ملک کا کیا حشر ہوگا بالکل یہی صورت اس جنگ میں پیش آئی۔ بجز ان مٹھی بھر مجاہدین کے جنھوں نے اپنے ذاتی احساس کی بنا پر مجاہدانہ شان سے دشمن کا مقابلہ کیا، اور اس کو نقصان پہونچا کر شہید ہوئے۔

لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ان فوجوں کے قائدین نے خصوصاً اس جنگ کے ذمہ دار ملک نے ان حالات کو زائل کرنے اور ان کو دور کر کے صحیح حالات سے بدلنے میں اتنی طویل مدت گذر جانے کے باوجود کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے اور خدا کا خوف، ذمہ داری کا احساس اور تلخ نتائج پر غم و رنج کا اظہار اور ندامت کا احساس کس درجہ میں پیدا ہو سکا ہے۔ اب تک جو باتیں سامنے آرہی ہیں اور جس طرح احتیاط اور خوف ملے جلے جذبہ سے دشمن کا نام لیا جا رہا ہے اس کے جارحانہ عزائم کے سامنے جس طرح مصالحانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے اور اس کے انسانیت سوز اور وحشیانہ مظالم کو جس طرح نظر انداز کر کے اس سے کسی نہ کسی بہانے مفاہمت کی کوشش کی جا رہی ہے یہ سب باتیں علامت ہیں اس بات کی کہ جنگ سے پہلے جن حالات کو ہم نے اپنایا تھا آج اتنی مدت گذر جانے کے بعد بھی بعینہٖ وہی حالات ہم کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا ہے بلکہ خدا بیزاری اور دشمن نواز طاقتوں پر اعتماد اور ان کے سامنے تذلل و مسکنت کے جذبات تو شاید پہلے سے بھی کچھ بڑھ گئے ہیں۔

دین کا آج بھی اسی طرح مذاق اڑایا جا رہا ہے جس طرح پہلے اڑایا جاتا تھا، علمائے دین اور اسلامی شعائر کی اسی طرح بے حرمتی کی جا رہی ہے، جس طرح پہلے کی جاتی تھی اسلام کو دیس نکالا دینے کے لئے ہر طرح کی طاقتیں اسی طرح استعمال کی جا رہی ہیں اور جنگی تدبیروں میں صرف بیرونی طاقتوں اور بڑی حکومتوں کے اعتماد کی بھیک مانگی جا رہی ہے اور ان کو خوش کرنے کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کی پیشکش کی جا رہی ہے اور اسلام دشمن ملکوں سے روابط بڑھانے اور ان سے بہتر تعلقات پیدا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف ہو رہا ہے۔ ابھی چند مہینے پہلے مصر کے نیم سرکاری اخبار "الاہرام" نے یہ خبر شائع کی تھی کہ حکومت اخوان المسلمین کے گرفتار شدہ لوگوں میں سے ایک ہزار افراد کو جلد ہی رہا کر دے گی۔ اس خبر سے دین پسند اور اسلامی حلقوں میں اس لئے خوشی ہوئی تھی کہ چلئے اس جنگ کا اتنا فائدہ تو ہوا کہ اخوان کے معاملہ میں مصری حکومت کی وحشیانہ پالیسی میں کچھ نرمی پیدا ہوئی، لیکن اس خبر کے شائع ہونے کے صرف چار دن بعد بیک جنبش قلم اس خیال کی تردید یوں کر دی گئی کہ اخوان المسلمون سے تعلق رکھنے والے افراد کی رہائی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت مصر کی پالیسی میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔

اور یہ اعلان صرف اس لئے کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ کہیں ان آقاؤں کے دل پر کوئی میل نہ آ جائے جن کے حکم و اشارہ سے یہ کام ہوا تھا۔ اس لئے کہ ان کو خوش رکھنا تو ہر قیمت پر ضروری ہے۔ خواہ ملک تباہ ہو جائے قوم برباد ہو جائے دین و مذہب اور علمائے

اسلام کا جنازہ نکل جائے۔

اس طرح عوامی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی؟ عرب عوام میں شکست کا احساس پیدا ہوا؟ وہ اپنے لہو ولعب اور کھیل تماشوں سے کچھ بھی بیزار ہوئے ان میں دشمن سے مقابلہ کرنے اور اس کے وجود کو مٹانے کا جذبہ پیدا ہوا، فوجی حیثیت سے ان میں تیار ہونے کا کوئی داعیہ ابھرا، اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کا خیال ان کے دل میں آیا۔ بیت المقدس کو واپس لینے کے لئے ان کے خون میں گرمی پیدا ہوئی، فلسطین اور نابلس وغیرہ کی بازیابی کے لئے جدوجہد کرنے اور قربان ہو جانے کے لئے وہ تیار ہوئے اور اپنے ملک وقوم کی عزت بحال کرنے کے لئے وہ سرفروشی وجاں نثاری کے جذبے سے سرشار ہوئے؟؟

ان سب کا جواب صرف یہ ہوگا کہ نہیں اور ہرگز نہیں، بلکہ ان کی زندگی کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ جس طرح پہلے عیش پرستی میں مبتلا تھے۔ اب بھی ہیں اور جس طرح پہلے وہ کھیل تماشے، ناچ گانے میں منہمک تھے آج بھی ہیں۔ ان کو ام کلثوم کے گانوں، غیر ملکی فلموں اور رقص وسرود کی محفلوں سے کب فرصت ہے کہ وہ کچھ اس تلخ حقیقت کے بارے میں بھی سوچ سکیں۔

یہ ایسا تاریخی سانحہ ہے جس کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہ بات تقریباً متفقہ طور سے تسلیم کی جا چکی ہے کہ عرب اسرائیل کے مقابلہ میں اپنی فوجی طاقت اور تعداد ہر اعتبار سے بہت فائق تھے۔ اس کے باوجود وہ اس طرح اور اتنی جلدی شکست کھا گئے جیسے انہوں نے دشمن سے خوف کھا کر بغیر لڑے ہوئے اپنے تمام علاقہ اور اسلحہ اور صحیح وسالم ٹینک آن کے حوالے کر دئیے ہوں پھر بھی دشمن ان کو رحم کی بھیک نہ دے سکا اور ان کو ہر طرح سے عظیم جانی ومالی نقصان پہونچا کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ہم مٹھی بھر لڑنے والے کس طرح دس کروڑ تعداد والے ملکوں کی متحدہ فوج کو پسپا کر رہے ہیں۔

قوموں کے زوال کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم اور مؤثر سبب ہر دور میں یہ رہا کہ وہ اپنے اصل مقام اور کردار سے ہٹ کر لہو ولعب اور عیش وعشرت میں مبتلا ہو گئیں، لذت وآسائش کی بھول بھلیوں میں کھو جانے والی قوم کبھی فتحمند باعزت اور سرخرو نہیں ہو سکی اور نہ وہ کبھی کسی کے مقابلہ میں کامیاب ہو کر دنیا کے سامنے آ سکی۔ (تعمیر حیات لکھنؤ)

آگ ہی سے دھواں اٹھتا ہے......
..... لیکن جب آپ ہمارے سگریٹ سلگاتے ہیں تو جو دھواں اٹھتا ہے
اس سے کئی گھر روشن ہوتے ہیں، لوگوں کو روٹی نصیب ہوتی ہے۔
جسم ڈھکتے ہیں اور بہت سے خاندانوں کو گھر میسر آتا ہے۔
ہمارے کاروبار سے ہزاروں آدمی کسی نہ کسی طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کسان ہمارے
اچھے سگریٹوں کے لئے تمباکو پیدا کرتا ہے۔ اس کو اچھے دام ملتے ہیں۔
جب ہمارے سگریٹ پیک ہو کر تجارتی تقسیم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو
وسیع پیمانہ پر تجارت اور معاشی ردعمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح
ہمارے ملک میں کئی ہزار لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔
مزید یہ کہ جب ہم ٹرکوں، کشتیوں یا ریل کے ذریعے اپنے سگریٹ بازاروں تک پہنچاتے ہیں
یا جب ہم سگریٹ کے پیکٹ کے لئے گتہ، چھپے ہوئے پیکٹ یا لکڑی کے پیکنگ کیس
خریدتے ہیں تو تجارت اور معاشی سرگرمی کو اور فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جب
سگریٹوں کے لئے پیکنگ کا تمام تر سامان پاکستان ہی میں بننے لگے گا تو ملکی صنعت
اور زیادہ ترقی کرے گی۔
پاکستان ٹوبیکو کمپنی کو فخر ہے کہ وہ عوام کو خوشحال بنانے
میں مدد کرتی ہے اور یہ نہ صرف اپنے ہی دفتروں اور کارخانوں میں
بلکہ متعلقہ صنعتوں میں اور زراعت میں بھی روزگار کے مواقع
پیدا کرتی ہے۔
PTC
پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
پاکستان کی سگریٹ کی صنعت کے راہبر

ہماری نظر میں

علامہ اقبال اور تصوف

از پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل (ایم۔اے) (صدر شعبہ فارسی اُردو کالج کراچی) ضخامت ۳۰۴ صفحات (مجلد، سفید کاغذ، رنگین دیدہ زیب سرورق) قیمت سات روپے غیر مجلد چھ روپے پچیس پیسے، نیوز پرنٹ مجلد چار روپے پچھتر پیسے غیر مجلد چار روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر ادارۂ تنویرات علم و ادب ۵۰۵۔ پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی

پروفیسر سید عبدالرشید صاحب فاضل کے عالمانہ مضامین "فاران" میں شائع ہو کر، اہل علم سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں، ان کی کتاب کے چند اوراق بھی مجلہ "فاران" کی زینت بن چکے ہیں، فاضل مصنف نے راقم الحروف (مدیر فاران) کے "نوٹ" کو اپنی کتاب میں "تعارف" کے عنوان سے شائع فرمایا ہے۔

علامہ اقبال "تصوف" کے بارے میں کیا نقطۂ نگاہ رکھتے تھے! یہ خاصہ مابہ النزاع مسئلہ ہے، حضرت مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ کو وہ اپنا روحانی مرشد مانتے ہیں، اس نسبت کے سبب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال اُس معروف تصوف کے حامی تھے جو "وحدت الوجود" اور "انا الحق" کا مزاج رکھتا ہے۔ پروفیسر عبدالرشید صاحب نے کلام اقبال کا بڑی دیدہ وری کے ساتھ جائزہ لیکر بتایا ہے کہ تصوف کے بارے میں اُن کا اصل نقطۂ نگاہ کیا تھا۔

پروفیسر صاحب موصوف سالہا سال سے کالج کے طلبا کو فارسی ادب پڑھا رہے ہیں، اُن کا مطالعہ بھی خاصہ وسیع ہے، خود شاعر بھی ہیں، ناقد بھی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سلجھی ہوئی فکر رکھتے ہیں، اس کتاب میں انہوں نے اقبال کے فارسی اشعار کی جس سلیس و دلنشین انداز میں شرح کی ہے، بس وہ اُنہی کا حصہ ہے! بیان میں ژولیدگی نہیں، زبان منجھی ہوئی ہے اور اسلوب نگارش میں بڑی شائستگی اور نزاکت و رعنائی پائی جاتی ہے! علامہ اقبال اگر زندہ ہوتے تو اپنے فارسی کلام کی اس تشریح کو پسند فرماتے ——

تصوف کے بارے میں علامہ اقبال خود کیا کہتے ہیں:۔

"صوفیہ نے وحدت الوجود کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے اس معنیٰ کر دونوں اصطلاحوں کو مترادف سمجھ لیا، حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے، توحید کا مفہوم مذہبی ہے اور وحدت الوجود ایک خالص فلسفیانہ مسئلہ ہے، توحید کی ضد کثرت نہیں بلکہ شرک ہے، ہاں! وحدت الوجود کی ضد کثرت ہے، اور چونکہ ذات باری تعالیٰ نظام عالم میں دائر و سائر نہیں بلکہ اُس سے

[illegible] نے "مزاج" کو البتہ مذکر باندھا ہے۔ مگر یہ لفظ بالاتفاق مونث ہے (م۔ق)

وما وا الورا ہے اس لئے شکر اور بے خودی کے ذریعے کیفیت وحدت الوجود کا قلب پر وارد کرنا کوئی فائدہ بھی نہیں رکھتا"

اقبال کے بعض مکاتیب و مقالات کا خلاصہ اور ما حصل اپنی کتاب میں فاضل مصنف نے پیش کیا ہے :-

● " اقبال نفس تصوف کے خلاف نہیں ہیں، اس تصوف سے بیزار ہیں جو عجمی تصورات کا معجون مرکب اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، وہ شیخ محی الدین ابن عربی اور منصور حلاج کے نظریات سے اتفاق نہیں کرتے "

● " وہ اس بے خودی کے قائل ہیں، جو رجوع الی اللہ کا نتیجہ ہے اور ذاتی اور شخصی میلانات ختم کر کے اللہ تعالیٰ کے احکام کا اس طرح پابند ہو جاتا ہے کہ انسان اس پابندی کے نتائج سے بھی بے پروا ہو کر محض تسلیم و رضا کو اپنا شعار بنالے "

● " تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد لی جائے تو کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا کہ قرون اولیٰ میں اس سے یہی مراد لی جاتی تھی، مگر جب اخلاص فی العمل کو چھوڑ کر تصوف کو فلسفہ بنایا جاتا ہے اور اس کے ذریعے نظام عالم اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کیا جاتا ہے تو اقبال کی روح اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے "

● " وہ (اقبال) تصوف کے " مسئلہ عینیت " کے سخت خلاف ہیں کیونکہ یہ بات قرآن سے ثابت نہیں، بلکہ قرآنی تعلیم کی رو سے کائنات کو باری تعالیٰ کے اتحاد کے ساتھ عینیت کی نسبت نہیں مخلوقیت کی نسبت ہے "

اس کتاب کا اختتام فاضل مصنف کے ان جملوں پر ہوتا ہے ۔

" اقبال ایسے ہی تصوف اور اسی قسم کے جاہل صوفیوں کے خلاف ہیں اور ان غلط نظریات اور ایسے صوفیوں کی مذمت " اسرار خودی " کی تصنیف کے وقت سے لے کر وفات تک کرتے رہے، اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اقبال تصوف اسلام کے مخالف یا عجمی تصوف کے حامی تھے، یا تصوف کے بارے میں متضاد خیالات رکھتے تھے تو ایسے شخص کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس نے اقبال کو مطلق نہیں سمجھا "

یہ کتاب " اقبالیات " میں گرانقدر اضافہ ہے اور فاضل مصنف کے علمی تبحر، ناقدانہ بصیرت اور دینی فکر کا شاہکار ۔

دلائل السلوک

از :- مولانا اللہ یار خاں صاحب ۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات ۔ قیمت سفید کاغذ ۔ پانچ روپیہ ، نیوز پرنٹ ۳ روپے
ملنے کا پتہ :- ادارۂ نقشبندیہ اویسیہ ، مسجد مجددیہ چکوال

اس کتاب کا اصل نام ۔ " التبیان فی مسائل السلوک والاحسان " ہے، مگر " دلائل السلوک " کے نام سے معروف ہے ! جناب مولانا اللہ یار خاں صاحب (چکڑالہ ضلع میانوالی) کے افادات حافظ عبدالرزاق صاحب (ایم اے) نے مرتب فرمائے ہیں ۔

اس کتاب کے چند اہم عنوانات ـــــ

اسلامی تصوف کی حقیقت ـــــ تصوف کا ثبوت ـــــ منازل سلوک ـــــ توجہ اور تصرف شیخ ـــــ الکشف والالہام ـــــ تصوف اور اصحاب تصوف وسلوک پر چند اعتراضات اور اُن کے جوابات !

مولانا اللہ یار خاں صاحب نے اپنے مسلک کا کتاب میں اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں :-

"میں مسلک کے لحاظ سے دیوبندی ہوں، شرک وبدعت کا دشمن ہوں، انسان پرستی اور قبر پرستی کا دشمن ہوں، نذر نیاز کھانا، مقررہ[1] اوقات پر عرس کرنا، غیروں کے مال پر نظر رکھنا میرے مسلک کے خلاف ہے . . . . . !

"میں تصور شیخ کا حامی نہیں، اور ہمارے سلسلہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، وظائف لسانی میں ہمارے ہاں سب سے بڑا وظیفہ تلاوت قرآن مجید ہے، پھر استغفار و درود شریف، صرف "اللہ ہو" کا ذکر کرایا جاتا ہے یا ہر مقام پر آیات قرآنی کا وظیفہ بتایا جاتا ہے، سیر کعبہ میں لبیک کا وظیفہ اور فنافی الرسول[2] میں درود شریف ـــ"

اس کتاب میں تصوف وسلوک کے مسائل عام فہم انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں تک تزکیۂ نفس اور احسان کا تعلق ہے اس کی افادیت اور اہمیت کا کوئی بد باطن ہی انکار کرسکتا ہے، تصوف جسے ہم اسلامی تصوف کہتے ہیں اُس کا یہ کارنامہ کوئی شک نہیں عظیم الشان ہے ! مولانا اللہ یار خاں صاحب بھی یہی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اعمال میں اخلاص پیدا ہو اور اُن کے نفس کو تزکیہ نصیب ہو۔

ـــــ مگر ـــــ

اُن کے قلم سے بعض ایسی باتیں بھی نکل گئی ہیں، جو شدید خلجان پیدا کرنے والی ہیں، انہوں نے اس کتاب میں "قیوم" اور "قیومیت" کا ذکر کیا ہے "قیوم" اور "صمد" یہ وہ نام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی مخلوق سے منسوب نہیں ہونے چاہئیں "قیومیت" اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو سزاوار ہے، مولانا موصوف نے جس طرح "تصور شیخ" کے عمل سے انکار کیا ہے اسی طرح جرأت ایمانی کا تقاضا تھا کہ وہ مجددیوں کے تراشے ہوئے روحانی منصب ـ قیوم ـ سے بھی انکار کر دیتے ۔

دین وشریعت میں بالغ ونابالغ اور مکلف وغیر مکلف اصطلاحیں تو ملتی ہیں۔ لیکن "مجذوب" کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ اس عجمی اصطلاح نے عجیب وغریب روپ دھارے ہیں۔ یہ کہ لایعقل، ننگ دھڑنگ ملنگوں کو جو نماز تک نہیں پڑھتے تھے اور طہارت و نجاست میں امتیاز نہیں کر پاتے تھے، اُنہیں اولیاء اللہ بلکہ تاج الاولیاء سمجھا گیا ہے! استغفراللہ !

"کامل کے مزار پر جاکر اُس کی روح سے رابطہ قائم کرکے فیض حاصل کرے ـــ فیض سے مراد وہ روحانی تربیت ہے جو اہل اللہ سے حاصل کی جاتی ہے" (ص ۷۴)

---

[1] مقررہ اوقات نہ ہوں تو کیا "عرس" کے لئے شریعت میں جواز ملتا ہے ؟
[2] یہ "فنافی الرسول" شریعت کی کون سی ضرورت اور اصطلاح ہے !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیارتِ قبر کی غایت یہ بتائی ہے کہ وہاں جاکر دنیا سے بے رغبتی حاصل ہوتی ہے۔ حضور نے کہیں نہیں فرمایا کہ اولیاء اللہ کی قبروں پر جاکر ان کی ارواح سے روحانی تربیت حاصل کیا کرو۔

صفحہ ۱۴۸ کے آغاز ہی میں عنوان ہے :۔

".. رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی بیعت"

اس سلسلہ میں دو بزرگوں کی روایتیں نقل کی ہیں کہ انہوں نے حضور کی وفات کے صدیوں بعد آپ کی زیارت کی اور حضور سے مصافحہ اور بیعت کیا ——— لیکن صحابہ کرام اور تابعین سے اس قسم کا کوئی واقعہ ثابت نہیں ہے۔ حالانکہ اس قسم کے واقعات کا وجود قرن اولیٰ میں ملنا چاہئے تھا۔

اس کتاب میں الخیر الدال اور مواہب لدنیہ سے جو روایتیں قطب اور غوث کے بارے میں نقل کی گئی ہیں، وہ درایت اور روایت دونوں لحاظ سے بے اصل معلوم ہوتی ہیں! مواہب لدنیہ میں موضوع روایتیں بکثرت پائی جاتی ہیں اور علامہ سیوطی اس قسم کے مسائل انتہائی کمزور روایتوں سے سند لاتے ہیں۔

تصوف کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ متشرع سے متشرع آدمی "متشابہات" کی زبان میں گفتگو کرنے لگتا ہے اور "متشابہات" کے پیچھے پڑنے سے قرآن کریم میں روکا گیا ہے۔

اتحاد۔ ہماری ہار

مصنف :۔ ڈگلس ہائڈ۔ مترجم :۔ جے۔ کے شرما۔ نظرثانی ۔ گوپال متل، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت :۔ ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی۔

اس کتاب کے مصنف مسٹر ڈگلس ہائڈ ہیں، یہ قلمکار برسوں کمیونسٹوں کی خفیہ اور علانیہ سرگرمیوں میں شریک رہا ہے اس نے مارکسزم پر لیکچر بھی دیتے ہیں اور برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے آرگن روزنامہ "ورکر" کا نیوز ایڈیٹر بھی رہا ہے، مگر پھر وہ اس تحریک سے بیزار ہو کر علیحدہ ہو گیا۔ اور اس نے کمیونزم کی مخالفت میں کتابیں لکھیں اور کمیونزم کے طلسم کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی، اس کتاب میں بھی اس نے بتایا ہے کہ یہ کمیونسٹ "امن و اتحاد" کا نعرہ لگاتے ہیں مگر حقیقت میں :———

"اُن کا ایمان ہے کہ نئی دنیا کو عالم وجود میں لانے کے لئے جنگ کرنا ضروری ہے" (ص ۱۴۱)

آخر میں مصنف نے لکھا ہے :———

".. متحدہ محاذ کے ہتھکنڈے بھی وہی ہیں، اس کے فوری مقاصد بھی وہی ہیں، اور اس کا دوررس مقصد بھی وہی ہے ——— یہ مقصد ہے ساری دنیا کی تسخیر، ہر مملکت کی سیاسی طاقت پر کمیونسٹوں کا قبضہ"

کوئی شک نہیں کمیونزم انسانیت کے لئے ایک قسم کا عذاب ہے!

آتشِ خوابیدہ

از :۔ فدا خالدی دہلوی۔ مرتب :۔ اسلم اکبرآبادی، ضخامت ۱۴۴ صفحات (مجلد رنگین گردپوش) قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ ضیا پبلیکیشنز ڈی بلاک شیرشاہ کالونی، کراچی

کتاب کے آغاز ہی میں شاعر کی تصویر ہے، جس پر یہ شعر لکھا ہوا ہے :-

فدا کو دیکھا ہے سو بار ہم نے دیکھا ہے   خراب حال بھی آدمی خراب نہیں

اس کتاب پر متعدد اہل علم اور ارباب فن نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور سب نے فدا خالدی کے فن کی تعریف کی ہے۔ اس کوئی شک نہیں فدا صاحب مشاق رباعی گو شاعر ہیں یہ صنف اُن کے ذوق کی چیز ہے اس لئے اُن کی طبیعت کے پوری طرح جوہر کھلے ہیں۔

رباعیات کے ابواب کی فہرست :-

اول و آخر۔ حسن و عشق، کیف و سرور، مشاہدات، شیب و شباب، انسان، رمز حقیقت، سعی عمل، متفرقات۔

"حمد" میں یہ رباعی کتنی حسین ہے۔

افلاک کو تاروں سے سجانے والے
ذروں کو مہ و مہر بنانے والے
کونین ترے حُسن کا آئینہ ہیں
مٹی سے حسین پھول اگانے والے

اور "نعت" میں اس رباعی کا انداز بیان خوب ہے :-

ہر مدحت و توصیف کے قابل تو ہے
سرتا بہ قدم رحمت کامل تو ہے
شرمندۂ احساں ہیں دو عالم تیرے
حاصل ہے تو کونین کا حاصل تو ہے

یہ رباعی اس مجموعہ کی سب سے اچھی رباعی ہے، چوتھے مصرعہ کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔

اب روح نہ رہ سکے گی پیاسی ساقی
لِلّٰہ کرم کہ جان نکلی ساقی
آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی ہے کب سے
شیشے میں چمک رہی ہے بجلی ساقی

"خدا کے وجود پر" ———— مندرجہ ذیل رباعی کتنی قوت رکھتی ہے۔

سوئے ہوئے جذبات جگا دیتی ہے
تاریک دماغوں کو جلا دیتی ہے
تو لاکھ نگاہوں سے ہے مستور مگر
دنیا ترے ہونے کا پتا دیتی ہے

اور

ہر صبح ترے حُسن سے رخشندہ ہے　　　ہر شام ترے فیض سے پائندہ ہے
کونین کو کونین بنانے والے　　　ہر شے ترے احساں سے شرمندہ ہے

دوسرا رُخ ــــــ

گلشن کی فضا میں لہلہانے والو
پُرکیف ہوا میں سر ہلانے والو
کل موت کی آغوش میں بھی ہو گے
شبنم کے الم پہ مسکرانے والو (ص ۱۱)

مصرعہ ثانی میں "سر ہلانے والو" نے رباعی میں "مزاح" کا سا رنگ پیدا کر دیا، تیسرا مصرعہ انتہائی پھس پھسا ہے ــــ چوتھے مصرعہ میں "شبنم کے الم" کی جگہ "شبنم کا گریہ" یا "شبنم کے آنسو" لانا چاہئے تھا۔

وہ دورِ جوانی کا عجب گزرا ہے
دل ہے کہ اُسی دَور کا متوالا ہے
اللہ رے پیری میں نقاہت میری
ہر جوڑ اب آوازہ کشی کرتا ہے (ص ۱۱۱)

دوسرا مصرعہ تو عشقوں کے کہنے کا ہے! رباعی کے آخری مصرعہ کو "آوازہ کشی" نے بے لطف بنا دیا۔

بنتی ہوئی ہر بات بگڑ جاتی ہے
بستی دل ونظر کی اجڑ جاتی ہے
ہو جائے اگر مہر دل افروز غروب
انسان پہ کچھ اوس سی پڑ جاتی ہے (ص ۱۳۴)

رُباعی میں کوئی لطف نہیں، اس پر مستزاد مفہوم کا ابہام! "کچھ" نے چوتھے مصرعہ کو اور بانہ کمزور بنا دیا۔

ماہنامہ "فیض الاسلام" کا قرآن کریم نمبر

نگران :- غلام قادر غبارؔ،
ضخامت ۔۲۳۲ صفحات، قیمت دو روپے ۵۰ پیسے
(سالانہ چندہ پانچ روپے)
ملنے کا پتہ :- انجمن فیض الاسلام راولپنڈی

ماہنامہ "فیض الاسلام" برسوں سے دین و اخلاق کی خدمت انجام دے رہا ہے، اُس کا "قرآن نمبر" مضامین کی افادیت و تنوع کے اعتبار سے قدر و ستائش کا مستحق ہے اس کے مطالعہ سے قرآن کریم کی تلاوت، اُس کے سمجھنے اور عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے "تاریخ القرآن" جس مضمون کا عنوان ہے، اُس کے سامنے "شیخ محمد اسماعیل پانی پتی" لکھا ہوا ہے یہ شخص قادیانی ہے، دینی رسائل اور مسلمانوں کے اخباروں میں کسی ہندو، انگریز اور سکھ کا مضمون چھپ سکتا ہے مگر "قادیانی" کا مضمون شائع نہیں کرنا چاہئے ــــ غیرتِ نبوت "قادیانیت" سے کسی قسم کے تعلق، نسبت اور لگاؤ کو گوارا نہیں کر سکتی۔

(ولعنۃ اللہ علی المتنبئین واذنابہم)

سن قریشی ، مدیر مسئول ، ظفر اللہ خان
معاون ، ضخامت ۳۲۰ صفحات
کا پتہ :- اردو ڈائجسٹ سمن آباد ، لاہور
نامہ ہے اور کمال یہ ہے کہ عورتوں کی
قبول خاص و عام ہے ! اردو ڈائجسٹ نے
میں ذکر آنا چاہئے ۔
کر ہی طبیعت خوش ہو گئی ، جس سالنامہ کا آغاز

انٹرویو کا نام آتے ہی ' الطاف حسن قریشی کی طرف ذہن
کے قابل ہے ' ظاہر ہے کہ ایک بادشاہ سے دوسرے
کا کمال ہے کہ اس کا قلم انٹرویو کے ۔ ۔ ساتھ ادب و
کی فضا پیدا کرتا چلا گیا ہے
ملک فیصل کے بعض جوابات جو شاہ موصوف کے ذہنی افکار
آئینہ دار ہیں ، موجودہ دور کے مسلمان فرمانرواؤں کے
ہیں ؛

جنرل چودھری کی غیر مطبوعہ کتاب کا ایک حصہ جس کا عنوان " بھارت کی خفیہ دستاویز " ہے ایک اہم مقالہ ہے ، ترجمہ مقبول جہانگیر صاحب نے سلیس و رواں عام فہم انداز میں کیا ہے ! دوسرے مضامین جو ـــ پراسرار کہانیوں ، طنز و مزاح ، سائنسی معلومات اور نظموں غزلوں ـــ پر مشتمل ہیں ، خوب سے خوب تر ہیں ! اس سالنامہ کی مقبولیت اپنی جگہ مسلم ہے ، ہر طرف اس کے چرچے ہیں ۔ اردو ڈائجسٹ کے ارکانِ ادارہ کو مبارک باد ۔

ماہنامہ " نئی صدی " لندن

مدیر اعلیٰ ۔ سردول سنگھ ، مدیر اعزازی ، عبد العلیم صدیقی ، معاونین ، کشتی ریدی ' صابر بدھیانوی
شاکر لاہوری ، قیمت سالانہ ایک پونڈ ، ہندو پاکستان سے ۳۰ روپے

ملنے کا پتہ :- NAI SADI

30 CRAVEN STREET THE STRAND – LONDON W.C.2

اب سے تیس سال پہلے ماہنامہ " مست قلندر " اردو کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت رسالہ تھا ، ڈاکٹر پریتی سنگھ اس کے ایڈیٹر تھے ، اردو کے ناول بھی ادارہ مست قلندر نے شائع کئے تھے ، ان کے صاحبزادے سردار سردول سنگھ نے لندن سے ماہنامہ " نئی صدی " جاری کر کے اپنے والد محترم کی صحیح جانشینی کا حق ادا کیا ہے ! اردو کے مشہور مخلص کارکن جناب خیر بھوروی اس رسالے کے سرپرست و نگراں ہیں ۔

لاہور اور دلی میں نہیں لندن میں " نئی صدی " کی اشاعت اور پوری دیدہ زیبی کے ساتھ ، بہت بڑی بات ہے ـ پاکستان اور ہندوستان میں اتنا قیمتی سفید چکنا کاغذ کہاں میسر آسکتا ہے اور ملے گا بھی تو سونے کے مول ! مضامین

اور غزلیں رنگا رنگ اور ہلکی پھلکی ہیں، جن میں عوام کے رومانی ذوق کی خاص طور سے رعایت رکھی گئی ہے سرورق
ت پہ ایک حسین خاتون کی تصویر ہے جس کے نیچے یہ شعر درج ہے ۔

نظر اُس حسن پہ ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی جو پھول بن جائے، کبھی رخسار ہو جائے

"نئی صدی" کے اب تک دو شمارے آچکے ہیں، ماہ دسمبر ۱۹۶۷ء کے شمارے میں صفحہ ۵۵ پہ جو نظم جاگیردارانہ نظام
اثر ہو کر کہی گئی ہے، وہ زبان و عروض کی غلطیوں سے بھری ہوئی ہے، بعض مصرعے ناموزوں ہیں اس نظم کی اگلی قسطوں
عت روک دینی چاہئے ۔

ماہنامہ "نئی صدی" کی لندن میں اشاعت اس کی دلیل ہے کہ اُردو بین الاقوامی زبان ہے یقین ہے کہ ماہنامہ انگلستان میں
ترویج کا عظیم کارنامہ انجام دے گا، پاکستان اور ہندوستان میں جو لوگ اُردو کی اہمیت گھٹانے کے در پے ہیں اُن کو شرم آنی چاہئے
نیا کی عظیم ترین زبان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں !
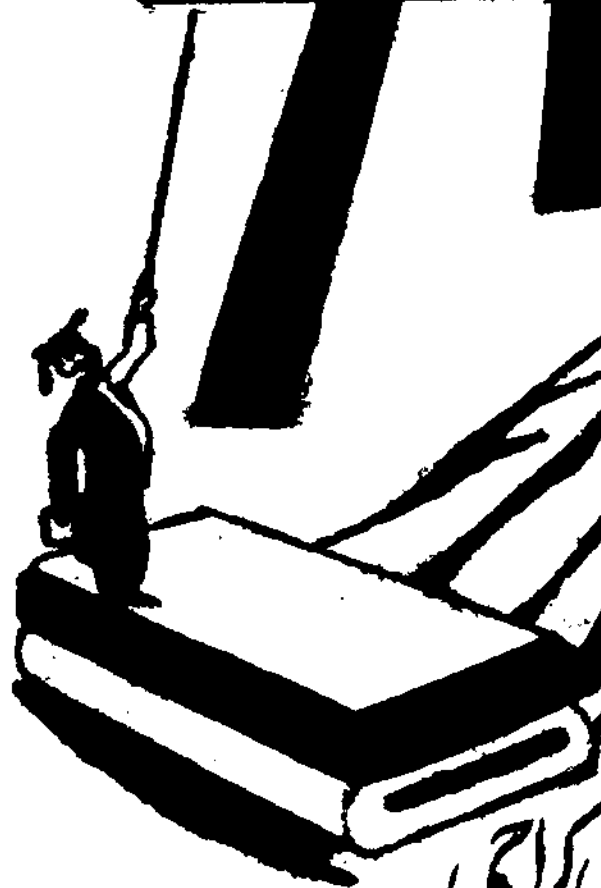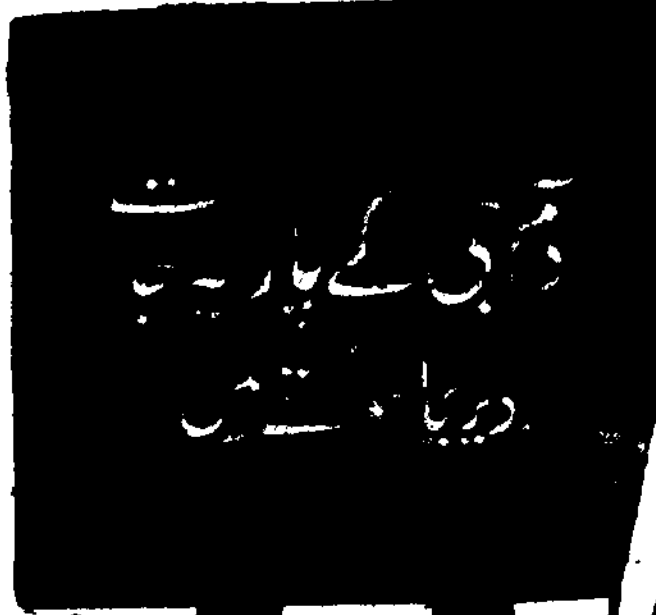
شنل اور الفرڈ
ILFORD
ILFORD
ILFORD
HP3
ROLL FILM
ہمہ وقت
آپ کی
مسرتوں
کے ساتھی!
رضوی برادرز لمیٹڈ
کراچی — لاہور — ڈھاکہ
ORIENT
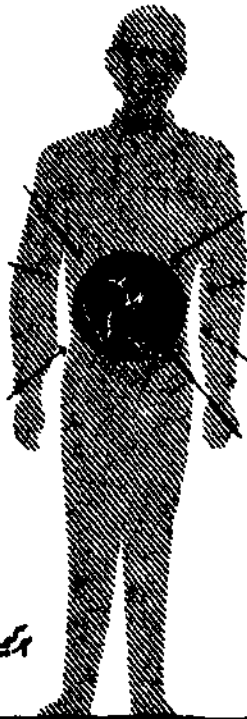
نامہ فاران کراچی

مارچ ۱۹۶۸ء

جلد :- ۱۹

شمارہ :- ۱۲

ایڈیٹر :- ماہر القادری

قیمت فی پرچہ :- ۶۲ پیسے — پبلشر :- ماہر القادری — چندہ سالانہ :- ۷ روپے

دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

مستفیض احمد صدیقی پبلشر ماہر القادری نے انٹرنیشنل پریس کراچی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱ سے شائع کیا -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

جماعت اسلامی کے سلسلہ میں ہماری تائید، موافقت، ہمدردی اور خیر خواہی صرف اس لئے ہے کہ یہ ایک مخلص دینی تنظیم ہے، جو دین کی دعوت لے کر اٹھی ہے، اس کے پروگرام میں دین کے کسی ایک جز یا رکن کی تبلیغ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے پورے کے پورے دین کی تبلیغ شامل ہے۔ جماعت اسلامی اس تصور کی نفی اور اس نظریہ کی تردید کرتی ہے کہ دیندار لوگ تو مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں میں بند رہیں اور حکومت اُن لوگوں کو سونپ دی جائے جن کا عقیدہ عمل سے زیادہ کمزور ہے اور عمل عقیدہ سے زیادہ مضمحل ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی داعیہ اور جذبہ ہی نہیں رکھتے۔

جماعت اسلامی حکومت و ریاست کے کام کو دنیا داری کا کام نہیں سمجھتی، اُس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء کی روشن مثالیں ہیں، جہاں دینداری اور تقویٰ مسجدوں ہی کو نہیں حکومت کو بھی سنبھالے ہوئے تھے اور جس جگہ سیاست، ریاست، جنگ، تجارت، زراعت اور معیشت و معاش کے تمام کاروبار اسلامی اخلاق کی نگرانی میں چلتے تھے۔

پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور اسلام کے لئے بنا ہے اگر اسلام کا نعرہ نہ ہوتا تو مسلم لیگ کی قیادت ہی مسلمانوں میں مقبول نہ قائداعظم کی شخصیت، شہرت اور ہر دلعزیزی ہوتی یا پاکستان کا قیام ان سب پر اسلام کا احسان ہے، پاکستان کا معاملہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں جیسا نہیں ہے۔ پاکستان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے یہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہونے کے قوی امکانات

پاکستان بننے کے بعد ہی یہاں یہ مسئلہ سب سے پہلے سامنے آیا کہ پاکستان کا دستور اور نظام حکومت کیسا ہونا چاہیئے؟ اس موقعہ پر جماعت اسلامی نے سب سے آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ پاکستان کا دستور کتاب و سنت کی اساس پر بننا چاہیئے اور یہاں "اسلامی نظام" کے علاوہ دوسرے نظام حکومت" کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس جدوجہد میں جماعت اسلامی نے جس خلوص، جانفشانی اور ایثار و قربانی کا ثبوت دیا اس کی نظیر پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

۱۹۵۱ء میں بنیادی دستوری سفارشات سب سے پہلے منظر عام پر آئیں۔ اُن میں "سیکولرزم" کا رنگ خاصہ نمایاں تھا، جماعت اسلامی نے دستور کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی! قرارداد مقاصد جو دستور اسلامی کی اساس ہے اُس کے منظور ہونے میں بھی جماعت اسلامی

،کا نمایاں اور موثر دخل رہا ہے! چوہدری محمد علی صاحب کی وزارت عظمیٰ کے دور میں جو دستور مرتب ہو کر مرکزی اسمبلی میں منظور ہوا،
، اعتبار سے چند خامیاں ضرور تھیں مگر جو اس وقت کے حالات تھے، اُن کے اعتبار سے یہ دستور پھر بھی غنیمت تھا؛ اگر اس پر عمل کیا
اف مارکو یہ بہرحال پاکستان میں فروغ ہی ہوتا اس دستور کے منظور ہو جانے پر ملک کے سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار "جنگ"
نے "اداریہ" لکھا جس میں جماعت اسلامی کو مبارک باد دی گئی، ملک کے طول و عرض میں عام تاثر یہی تھا کہ جماعت اسلامی ہی کی
کی بدولت یہ معرکہ سر ہوا ہے۔

اب سے پندرہ سولہ سال قبل جو حکومت پاکستان پر مسلط تھی، وہ اسلامی دستور سازی اور دینی نظام حکومت سے گریز کے لیے مسلمانو
فرقوں کے اختلافات کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی؛ جماعت اسلامی نے اس موقعہ پر کمال اخلاص اور حکمت و تدبیر کے ساتھ مختلف فرقوں
علماء کو ۱۹۵۱ء میں اور چونتیس علماء کو ۱۹۵۳ء میں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اور اُن علماء نے متفق الرائے ہو کر اور اسلامی دستور
دفعات کا خاکہ مرتب فرما کر اتمام حجت کا حق ادا کر دیا۔ جو علماء کرام ان اجتماعات میں شریک تھے وہ اس کی گواہی دیں گے کہ مولانا سید
مودودی کی اصابت فکر اور دینی و سیاسی سمجھ بوجھ نے ان موقعوں پر کتنا عظیم الشان پارٹ ادا کیا، بعض کانگریسی مولویوں نے مولانا
و تک پہونچانے کی کوشش کی، مگر مولانا کے صبر و تحمل اور وسعت ظرف نے فضا کو مکدر نہیں ہونے دیا!
۱۹۶۲ء میں جو دستور مرتب ہوا عوامی لیگ نے کوشش کی کہ اسے منسوخ کر دیا جائے اور ملک میں پھر مارشل لا کی صورت پیدا کر دی جائے
، اسلامی نے اس کے مقابلہ میں شدت کے ساتھ اس کا اعلان کیا کہ دستور ہرگز منسوخ نہیں ہونا چاہیے، اُسے ترمیمات کے ذریعہ درست
سکتا ہے اور اس طرح جماعت کی کوششوں نے ملک کو شدید بحران (SARIOUS CRISIS) سے بچا لیا۔ اس دستور میں دستور
کے لیے "اسلام" کا لفظ تھا۔ جماعت اسلامی کے احتجاج اور جدوجہد کے نتیجہ میں ایک سال بعد یعنی ۱۹۶۳ء میں "اسلام" کی بجائے
"سنت" دستور میں درج کیا گیا، اس طرح متجددین اور منکرین سنت کی سازشیں ناکام ہو گئیں!
عائلی قوانین جب منظر عام پر آئے ہیں تو جماعت اسلامی ہی کی کوششوں سے مختلف مکاتیب فکر کے علماء جمع ہوئے اور سرکردہ علماء نے
ان کی خامیاں دینی نقطہ نگاہ سے واضح فرما دیں۔
اسلامی حکومت کے خدوخال کیا ہیں؟ اسلامی حکومت کے حکمرانوں کو کن قابلیتوں (QUALIFICATIONS) کا حامل ہونا چاہیے؟
دستور و قانون کی صفات و وظائف اور خصوصیات کیا ہیں؟ مرکز اور صوبہ کی اسمبلیوں کے انتخابات کن حدبندیوں کے ساتھ ایماندارانہ
ہیں اور کس طریقہ سے دھاندلیوں اور شرارتوں کا بڑی حد تک سد باب ممکن ہے ——— ان موضوعات پر جماعت اسلامی نے سینکڑوں
، کا لٹریچر پیش کیا ہے اسلامی قانون و دستور کے موضوع پر مولانا مودودی کی معرکۃ الآرا کتاب جس کا انگریزی میں

ISLAMIC LAW

AND

CONSTIUTION

بے شک نہیں اسلامی قانون و دستور سازی کی جدوجہد میں پاکستان کی دوسری جماعتوں اداروں اور افراد نے بھی حصہ لیا ہے مگر ہر موقعہ پر جسے انگریزی
INITIATE کہتے ہیں اُس کا سہرا جماعت اسلامی کے سر ہے اس سلسلہ میں جماعت اسلامی کی کوششیں سب سے زیادہ نمایاں اور موثر اور غالب ہی رہیں۔

سے ترجمہ ہوا ہے غیر ملکوں کے ارباب سیاست و صحافت سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے ؟

ظاہر ہے کہ ان سائل سے نمٹنے کے لئے جماعت اسلامی کو جو جد وجہد کرنی پڑی، اس میں جلسے، جلوس، پوسٹر و اشتہارات، استقبالئے اژ
بالعموم ناگزیر تھیں! اور دینی نقطۂ نگاہ سے ان میں کوئی چیز بھی حرام، ناجائز اور منکر نہیں ہے! غزوۂ خندق کی مثال اُمّت کے سامنے ہے۔
ب کام کے حصول کے لئے تدبیر کی حد تک ایسے مباح ذرائع اختیار کر سکتے ہیں جن کا غیر قوموں کے یہاں چلن ہو! ہاں! جن ذرائع اور وسائل کا اوپر
ا ہے اُن پہ نمود و نمائش کی بعض صورتوں کے سبب کراہت کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر جس طرح فریضہ حج ادا کرنے کے لئے "فوٹو" کی کراہت گوارا
ی ہے اسی طرح اسلامی دستور اور اسلامی حکومت کے قیام کی خاطر کسی ناگزیر ذریعہ کی کراہت جس کا تعلق ایک عظیم اور بلند تر نیک مقصد کے
سے ہے گوارا کی جا سکتی ہے۔

جماعت اسلامی کی اس جدوجہد کا مقصد۔ اللہ کے دین کو غالب کرنا تھا، یہ مقصد سو فیصد ہی نیک اس کے ذرائع جائز و مباح! تمنا یہ
ہوٹے پیمانہ پر ہی ہی ایک بار پھر خلافت راشدہ کی بہار دیکھ لے!

ہم ارباب فکر اور اہل علم کو دعوت دیتے ہیں بلکہ چیلنج کرتے ہیں، وہ بتائیں کہ ان میں سے کون سا مقصد، ذریعہ، وسیلہ اور طریقہ اسلام
ہے، اور اس کے اختیار کرنے سے دین کو آخر کیا نقصان پہونچا ہے، جماعت اسلامی نے یہ جدوجہد دین کے غلبہ اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو
کے لئے اب تک جاری رکھی ہے، اس پر "سیاست" کی پھبتی کس کر اس کام کی اہمیت اور افادیت کو چٹکیوں میں اُڑا دینا کوئی منصفانہ
ہے۔

جس طرح ہم بعض اکابر سلف پر تنقید کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ فلاں مسئلہ میں متساہل تھے، اور فلاں صاحب متشدد تھے، اسی طرح ممکن
ن ارباب فکر آنے والے زمانے میں، جماعت اسلامی کے بارے میں یہ رائے ظاہر کریں کہ اقامتِ دین کے معاملے میں حکومت کی ضرورت پر
اسلامی نے اس قدر زور دیا کہ اس میں تشدد پیدا ہو گیا ——— مگر جماعت کا یہ تشدد تو کوئی گناہ کی بات ہے اور نہ بے راہ روی
ت کی یہ رائے ہے اور صحیح رائے ہے کہ حکومت حدود اللہ کے اجراء اور اقامتِ دین کا مؤثر ترین ذریعہ ہے، منکرات پر قانونی پابندی حکومت
تی ہے اور پریس، ریڈیو اور دوسرے ذرائع کے ساتھ امر بالمعروف اور تبلیغ دین کا فریضہ حکومت بڑے حسن و خوبی کے ساتھ انجام
ہے! اس لئے جہاں اسلامی حکومت کے قیام کے امکانات پائے جاتے ہوں، وہاں اس کام کے لئے جدوجہد دین کی بہت بڑی خدمت
تعالیٰ کا دین مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں ہی کے لئے نازل نہیں کیا گیا، حکومت کے قصر و ایوان، دفاتر، تجارت گاہیں، کارخانے
کے دوسرے شعبے بھی اس کے حدود عمل میں شامل ہیں اُن کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔

دین کے بارے میں جماعتِ اسلامی کا یہ ہمہ گیر عقیدہ نقد و جرح کا نہیں، تحسین و ستائش کا مستحق ہے، آج پاکستان میں جہاں سے

ہ صدر پاکستان کے سلسلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کی جماعت اسلامی نے جو تائید کی تھی، اُس پر ہم "فاران" میں خاصی تفصیل کے ساتھ
ہیں! جماعت نے "اہون البلیتین" کے طور پر اسے مجبوراً گوارا کیا۔ متحدہ محاذ کے فیصلہ کے بعد یہ حضرات ایک ہفتہ تک سوچتے رہے، مولانا
؛ دنوں جیل میں تھے پھر انہیں ایک دو دفتر سے بھی اس موقف کی بڑی حد تک تائید مل گئے اُس کے باوجود جماعت اسلامی کی طرف سے کہا گیا
، بات درست ہے عورت کی حاکمیت میں خیر نہیں ہے جس طرح مضطر کے لئے مردار کھانا جائز ہے اُسی طرح پر اس مکروہ صورتِ حال کو گوارا کیا جا رہا ہے اور یہ
ہ کے لئے نظر نہیں نے گا۔

بھی یہ آواز آرہی ہے کہ اسلام انسان کی پوری زندگی کو ہدایت دیتا ہے۔ یہ جماعت اسلامی کے فکر وعقیدہ کی صدائے بازگشت ہے۔ جماعت یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام صرف تلاوت اور تجوید وقرأت کے لئے نازل نہیں ہوتے اور نہ صرف اس لئے کہ علمائے امت ان کی زبانی یا تحریری شرح وتفسیر کرکے مطمئن ہوجائیں کہ ان کی اطاعت کا حق ادا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام عملی طور پر نافذ ہونے کے لئے نازل ہوئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اسلامی اسٹیٹ کی بنا ڈالی تھی اور جو ہر حیثیت سے حضورؐ ہی کی زندگی میں تکمیل کو بھی پہونچ گئی اُس اسٹیٹ میں اللہ اور رسول کے احکام کے علاوہ اور کوئی قانون نہیں چلتا تھا، حضورؐ کے بعد خلافتِ راشدہ اسی دینی ریاست کا مکمل ترین مظہر تھی، اللہ تعالیٰ نے رقبہ کے اعتبار سے اس ریاست کو بہت کچھ وسعت عطا فرمائی، جو کوئی فرد یا جماعت اس اسلامی اسٹیٹ کی تجدید واحیا کے لئے جدوجہد کرتی ہے، وہ حکومت وسیاست کے معروف عنوان کے ساتھ دراصل دین ہی کا کام ہے۔ جو لوگ جماعت کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا کرتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کو تبلیغ دین ہی سے سروکار رکھنا چاہئے تھا سیاست میں نہیں اُلجھنا چاہئے تھا ـــ وہ دین کے بارے میں بڑا ہی تنگ ومحدود نظریہ رکھتے ہیں! جماعت اسلامی نہ سیاست بے دین کی قائل ہے اور نہ دین بے سیاست پر ایمان رکھتی ہے!

قربانیاں اور مخالفت

پاکستان میں اسلامی نظام حکومت کا قیام ـــ یہ وہ مطالبہ اور عنوان ہے جو ہر دور کے ارباب اقتدار کو ناگوار گزرا ہے، بلکہ ان کی برہمی اور ناخوشی کا سبب قرار پایا ہے' انہوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس مطالبہ کی زد اُن کے اقتدار اور شخصیت پر پڑ رہی ہے! اسی لئے ہر دورِ حکومت میں جماعت اسلامی معتوب رہی ہے، اُس کے سینکڑوں ارکان جیلوں میں محبوس رہے ہیں، کتنوں کو سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ کیا گیا ہے' اور معیشت و روزگار کی بعض دوسری راہیں بھی اُن کے لئے تنگ و دشوار کی گئی ہیں' خود مولانا مودودی چار بار جیل گئے ہیں' دوبارہ جماعتِ اسلامی کو ممنوع قرار دیا گیا، اور جب جماعت بحال ہوئی ہے تو اُس کے فنڈ واپس نہیں کئے گئے۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر پر یہ پابندی لگائی گئی ہے وہ فوجی حلقوں اور بعض دوسرے سرکاری اداروں میں نہیں جا سکتا، جماعت کے رسالوں کو احتساب کے زخم اُٹھانے پڑے ہیں، جماعت کی بعض کتابیں ضبط کی گئی ہیں، جماعت اسلامی کے امیر کو ملک کے باہر جانے سے روکا گیا ہے، جماعت کے جلسوں کو دفعہ ۱۴۴ سے دوچار ہونا پڑا ہے! ان سختیوں اور زیادتیوں کے مقابلے میں جماعت اسلامی کے ارکان نے عزیمت واستقامت کا ثبوت دیا ہے، وہ اپنے موقف سے بال برابر نہیں ہٹے، کوئی سختی ان کے کردار میں لچک پیدا نہیں کرسکی! اُن کے کسی فرد نے حکومت سے معافی نہیں مانگی، پریشانیوں اور مصیبتوں سے بچنے کے لئے اُنہوں نے دب کر اور گڑگڑا کر کوئی بات نہیں کی! لاہور کے سالانہ اجتماع میں جماعت پر قیامت گزر گئی مگر جماعت کے ارکان ومتفقین کے صبر وضبط کا پیمانہ نہیں چھلکا!

جماعت اسلامی اقتدار نہیں چاہتی اگر اُس کے کسی کارکن کے دل میں اقتدار کی خواہش چھپی ہوئی ہے تو اُسے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس جدوجہد کا کوئی صلہ اور ثواب نہیں ملے گا! حالات ہی مجبور کردیں تو دوسری بات ہے ورنہ جماعت اس کو اچھا نہیں سمجھتی کہ حکومت میں کسی عہدے اور منصب کی طلب اور تمنا کی جائے! جماعت پر ہوسِ اقتدار کی جو کوئی بھی پھبتی چست کرتا ہے وہ جماعت کے مزاج اور کردار ہی سے واقف نہیں ہے، اگر جماعت اقتدار چاہتی تو پاکستان میں ایسے دور آئے ہیں جب جماعت حکومتوں سے سمجھوتہ کرکے اقتدار میں شریک ہوسکتی تھی اور اگر اُسے اپنی دنیا بنانی ہی مقصود ہو تو اُس کے لئے وہ روش کارآمد اور مفید نہیں ہوسکتی جو روش جماعت اسلامی اختیار کئے ہوئے ہے، یہ اُن حق شناسوں اور حق پرستوں کی روش ہے جو کسی عظیم مقصد کے لئے اپنی زندگیوں کو خطرے

لتے ہیں، جہاں مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہوتی ہے اور پھر راہِ حق میں ؎

یہ کہہ کے چل دیئے کہ خدا کارساز ہے

ایسے سچے، کھرے اور راستباز لوگوں پر جو کوئی بیرونی ملکوں سے امداد و اعانت کی تہمت جوڑ کر اُن کی ہوا خیزی اور بدنامی پے ہے وہ اپنی فردِ عمل کو سیاہ کر رہا ہے اللہ کے جو مخلص بندے اقامتِ دین کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں، اُن کی معاونت ید و ہمدردی تو ایک طرف رہی، اُلٹی ان پر تہمتیں لگائی جا رہی ہیں! یہ کتنی ناانصافی بلکہ سفاکی ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت کے مطالبہ کو ہر دورِ حکومت کے اربابِ حل و عقد نے یہ سمجھا ہے جیسے یہ مطالبہ اُن کے اقتدار و اختیار کے بلینج ہے اور جماعتِ اسلامی اس مطالبہ کی داعی ہے، اس لئے اس طبقہ کی مخالفت تو سمجھ میں آتی ہے کہ یہ حضرات اسلامی نظامِ حکومت اپنی کرسیوں کو نہیں چھوڑ سکتے اور وہ یہ بھی نہیں کر سکتے کہ خود کو دینی نظام میں فٹ کرنے کے قابل بنا لیں! مگر یہ جو علماء کی ٹولیوں کی جماعتِ اسلامی کے درپے مخالفت بلکہ درپے آزار ہیں اُن کی روش سمجھ میں نہیں آتی، اُن کی مخالفت، عناد و تعصب اور دل آزاری وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ بندگانِ کرام اور فقیہانِ عظام شدید قسم کی گروہی عصبیت میں مبتلا ہیں اور جماعتِ اسلامی کے اثر و نفوذ کو وہ ہی چودھراہٹ کی راہ میں حائل سمجھتے ہیں!

چنیوٹ سے آیا ہوا ایک پمفلٹ ہمارے سامنے ہے جس میں علماء، وکلاء، مساجد کے خطیبوں، معزز تاجروں اور مذہبی تنظیموں ورافراد کے نام درج ہیں، اس پمفلٹ میں لکھا ہے:-

"۔۔۔ جو کانفرنس ختمِ نبوت کے منکرین کی تردید و اصلاح کے لئے قائم کی گئی تھی اب وہی کانفرنس ایک دینی جماعت کو کافر و فاسق اور معتوب و مطعون قرار دینے کے لئے استعمال ہونے لگی ہے۔۔۔"

اس کانفرنس میں جماعتِ اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر الزامات و اتہامات کی وہ لوچھاڑ بلکہ چاند ماری کی گئی کہ خدا کی پناہ مانگنے لگے! یہاں تک کہ چنیوٹ کے شرفا کو پمفلٹ کے ذریعہ ان خرافات سے اظہارِ بیزاری کرنا پڑا۔

علماء کا یہ وہ گروہ ہے کہ جسے نہ خدا کا خوف ہے اور نہ بندوں کی شرم ہے ان بھلے مانسوں کو اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ ایسی ری باتوں سے خود علماءِ دین عوام کی نگاہ میں ذلیل ہوتے ہیں اور تعلیم یافتہ طبقہ علماء اور دیندار لوگوں سے بدگمان ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں احراری علماء جو شرمناک کھیل کھیل رہے ہیں ٹھیک یہی پارٹ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے صاحبزادے صاحب بھارت میں انجام دے رہے ہیں۔ ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کو انہوں نے عناد و تعصب کا نشانہ بنا رکھا ہے، مجلس مشاورت ف بھی اُنہوں نے اس جرم میں مورچہ لگایا ہے کہ اس میں جماعتِ اسلامی کیوں شامل ہے؟

علماء کی اس ٹولی کا اور ان مذہبی لوگوں کا چاہے وہ پاکستان میں ہوں یا ہندوستان میں، آخر یہ مزاج اور افتادِ طبع کیا ہے؟ ت اخلاق و انسانیت کے معروف اصولوں سے بھی واقف نہیں ہیں، ان کو نہ اپنی زبان پر قابو ہے اور نہ قلم پر! کسی جماعت یا فرد کی ت میں اخلاق و شرافت کی ہر حد کو توڑ دینا ان کے نزدیک شاید کارِ ثواب ہے۔ ان کی روش سے دینی محاذ کو جو نقصان پہونچ رہا ہے جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے!

زین جماعت جماعتِ اسلامی کا کوئی شدید سے شدید مخالف او معاند آج تک نہیں بتا سکا کہ جماعت کا یہ عقیدہ جمہوریت

ہ کے خلاف ہے! یا جماعت نے شریعت کے اس بنیادی رکن و عمل میں کچھ اضافہ یا ترمیم کر دی ہے؟ یا اس کے فلاں عمل پر بدعت
صادق آتی ہے! جماعتِ اسلامی والے مسلمانوں کی مسجدوں میں ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، مسلمانوں میں اُن کی بیاہ
ہوتی ہے، مسلمانوں کے بعض دوسرے فرقوں کی طرح جماعت اسلامی نے اپنی الگ مسجدیں نہیں بنائیں، اُن کا کوئی ایسا دینی شعار
ے، جو امتِ مسلمہ کے دینی شعار سے مختلف ہو، اُن کا لباس، ہیئت اور وضع قطع بھی عام مسلمانوں سے ملتی جلتی ہے، اب یہ گروہ
ور تحزّب کی طنز، تو جماعت اسلامی کے اپنے عمل اور روش سے تحزّب اور گروہ بندی کی نفی ہوتی ہے، یہ وحدت و اخوت صرف
ت اسلامی کا طرّہ امتیاز ہے کہ ہر فقہی مذہب کے لوگ اس میں شامل ہیں، مقلدین اہل حدیث کے پیچھے اور احناف، شوافع کی امامت
اقتدا کرتے ہیں اور فقہی اختلافات کے باوجود، اُن میں کسی تصادم، نزاع اور بحث و مناظرہ کی نوبت نہیں آتی، اقامتِ دین کی جدوجہد
کی کوششوں کا مقصود ہے اور یہ وحدتِ مقصد فقہ کے جزئی اختلافات کو اُبھرنے نہیں دیتی!

جماعتِ اسلامی دینی ارکان کی پوری طرح پابند ہے، یہ لوگ فواحش و منکرات سے اجتناب کرتے ہیں یہاں تک کہ مکروہ مشاغل
یعنی افعال سے بھی بچتے ہیں، ان کی روزی کے ذرائع حلال ہیں، معیشت و روزگار کے نہ صرف ناجائز بلکہ مشتبہ وسائل و ذرائع
سے ان حضرات نے محروم ہونا گوارا کیا ہے، ان کے یہاں قرآن و حدیث کے درس کا بھی اہتمام ہے، اجتماعات کے علاوہ انفرادی
پر بھی یہ حضرات ملاقاتوں کے ذریعہ دین کی دعوت پہونچاتے اور خیر و تقویٰ کی طرف مسلمانوں کو رغبت دلاتے ہیں، جماعتِ اسلامی
لٹریچر کے ذریعہ دورِ حاضرہ کے تمام فتنوں کا رد کیا ہے، عقل و نقل، درایت و روایت، استدلال، افہام و تفہیم اور زبان و ادب
بیان جماعت اسلامی کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، انڈونیشیا سے لے کر ترکی تک جماعت اسلامی کی متعدد کتابیں ترجمہ ہو کر مقبول ہوتی
اور صفِ اول کے علماء ۔۔ اکابر ان کے مداح اور قدرشناس ہیں! حق گوئی کے جرم میں جماعت کے سینکڑوں ارکان نے قید و بند کی
ختیں بھی اُٹھائی ہیں، دعوتِ دین کے ساتھ عزیمت اور خیر و تقویٰ کے ساتھ حق گوئی اور استقامت جماعتِ اسلامی کے ارکان کی ممتاز
خصوصیت ہے! اللہ تعالیٰ کے یہ مخلص بندے دعوتِ دین کے لئے اپنا وقت اور مال صرف کرتے ہیں، انفاق فی سبیل اللہ کے معاملہ میں
حضرات کشادہ دست اور ایثار پسند ہیں ـــ اُس تنظیم، ادارے اور جماعت کا ہمیں نام بتایا جائے، جو جماعت سے زیادہ دینی خوبیاں
تی ہے؟ ہم نے پاکستان اور ہندوستان کی بہت سی مذہبی جماعتوں اور سیاسی تحریکوں اور تنظیموں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے، ہم
ی ذمہ داری کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں کہ جماعت اسلامی ان تمام جماعتوں اور تنظیموں سے ممتاز ہے اور دینی خوبیوں میں منفرد ہے!

اگر خیر و تقویٰ کی خوبیوں کے ساتھ اسرارِ باطن کا کشف ہوتا ہے، غیب کے کچھ پردے اُٹھتے ہیں، ملاء اعلیٰ سے ربط پیدا ہوتا
ہے، عالمِ برزخ و ارواح سے فیض ملتا ہے، روحانیت کے مراتب بلند ہوتے ہیں ـــــ تو پھر جماعتِ اسلامی کے ارکان ان تمام
مناصب و مراتب اور درجات کے سب سے زیادہ مستحق ہیں! کسی مذہبی ادارے، جماعت یا سلسلہ ارشاد و روحانیت کا یہ زعم کہ جماعت
اسلامی والے تو ان تمام دینی خوبیوں کے باوجود، روحانیت کے معاملے میں کورے ہیں، اور اس منصب کے اہل ہم ہیں، روحانیت اور کشف و
وجد کا فیضان ہم پر ہوتا ہے ـــــ یہ زعم اور دعویٰ خوش فہمی بھی ہو سکتا ہے اور غلط فہمی بھی!

خانقاہوں کی پرسکون فضاؤں میں سلسلہ ہائے طریقت کے شجرے پڑھنے والے باطن و روحانیت کے شیوخ سمجھے جائیں، اور
ابوالاعلیٰ مودودی حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی مصیبت سے لے کر پھانسی کی کوٹھڑی تک پہونچ جائیں تو بھی ان کو محض ایک سیاسی قسم

کے لیڈر سے زیادہ وقعت نہ دی جائے ! یہ کیا ذہن و فکر اور کہاں کا عدل و انصاف ہے !

جماعت اسلامی ارکان دین کی پابندی اور خیر و تقویٰ کے ساتھ "خدمتِ خلق" کا جو کام کرتی ہے یا اُس نے اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لیا ہے، تو یہ کوئی گناہ کی باتیں نہیں ہیں کہ جن کے سبب یہ سمجھا جائے کہ ان گناہوں (؟) نے اُن کے اعمال حبط کر دیئے، اور اُن کی تمام نیکیوں پر پانی پھر گیا! جماعتِ اسلامی کے اس کام پر بھی آخرت میں انشاء اللہ اجر ہی ملے گا کہ وہ یہ کام بھی دین اور امتِ مسلمہ کی خیر خواہی کے لئے ہی انجام دیتی ہے۔

اسلاف کا احترام

جماعتِ اسلامی پر نرم سے نرم تنقید یہ کی جاتی ہے کہ اُس کے عقائد میں نہ تو کوئی خرابی ہے اور نہ اُس کے اعمال شریعت کے خلاف ہیں، بس اُس کے یہاں اسلاف کا احترام نہیں کیا جاتا، اس معاملہ میں وہ متساہل ہے۔ جو لوگ جماعت کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں ہم اُن کی نیت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رکھتے، انہیں اس قسم کی رائے رکھنے کا حق ہے۔

اسلاف کا مکمل ترین اطلاق جو ہر جہت سے موزوں ہے وہ صحابہ کرام پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی تھا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی تھے! صحابہ کرام کا جس مسئلہ پر اجماع ہو جائے وہ کتاب و سنت کے بعد دین میں حجت ہے، امت کے یہ مقدس ترین افراد ہیں جماعت اسلامی جن کا دل سے احترام کرتی ہے اور ان کی محبت اور تکریم کو ایمان کا تقاضا سمجھتی ہے، مولانا مودودی نے حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے جن اضطرابات کا ذکر کیا ہے، یا حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص یا مروان پر جو تنقید کی ہے، یا معاویہؓ و علیؓ کی نزاع میں حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو حق پر مانا ہے —— تو یہی باتیں اُمت کے اکابر سلف نے بھی کہی ہیں اور اُن پر کسی نے صحابہ کرام کی تنقیص کا الزام نہیں لگایا۔

صحابہ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین، مفسرین، ائمہ حدیث و فقہ اور مبلغین اخلاق و تزکیہ ہیں جماعت اسلامی اُن کا احترام کرتی ہے اور ان کی دینی خدمات کو قدر و ستائش نگاہ سے دیکھتی ہے (رحمہم اللہ تعالیٰ) ! مگر وہ ان بزرگوں کو معصوم نہیں سمجھتی ! جماعتِ اسلامی ان بزرگوں کا احترام کرتی ہے اُن کی پرستش نہیں کرتی، اور اطاعت تو بس جو اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص و منصوص ہے، اُس اطاعت کا معاملہ جماعت کی طرف سے کسی بزرگ کے ساتھ نہیں کیا جاتا ! وہ لوگ جو بزرگوں کی عقیدت میں غلو کرتے ہیں وہ جماعت کے مسلک کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی بزرگوں کے احترام کا وہ حق ادا نہیں کرتی، جس کے یہ حضرات مستحق ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے قابل فخر شاگردوں نے اپنے واجب الاحترام اُستاد اور امام سے کتنے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے اس اختلاف پر کسی نے بھی امام ابو حنیفہؒ کی تنقیص عدم احترام یا احترام میں تساہل و کوتاہی کا الزام نہیں لگایا ' —— یہ ایک ہی مثال اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے بہت کافی ہے کہ اخلاف اسلاف سے دینی مسائل میں اختلاف کر سکتے ہیں، اور کرتے رہے ہیں اور ایسا کرنا احترام کے منافی نہیں ہے !

مشاہیر و اکابر کی کتابوں میں اسلاف سے اختلاف اور اُن کی کہی ہوئی باتوں پر جرح و احتساب اور نقد و اختلاف کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، جماعت اسلامی کے لٹریچر میں بھی کہیں کہیں یہ صورت نظر آتی ہے ! خاص طور سے تصوف کے مسائل میں یہ گرفت سب سے زیادہ نمایاں ہے ! مثلاً طریقت کے جو چار سلسلے (نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ) ہیں اُن میں "بجا —— اور کثرت

کے ساتھ بزرگوں کا نام لے کر شجرے پڑھے جاتے ہیں، متقدم صوفیا کا یہ مسلک اور عمل نہ تھا، یہ بعد کے بزرگوں کی ایجاد
ہے، جماعت اسلامی اس عمل کے لئے کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے دلیل مانگتی ہے؟ اور صوفیاء اس قسم کی دلیل اور نظیر پیش کرنے
سے قاصر ہیں ـــــ اب اس پر وہ لوگ جو بزرگوں کی عقیدت میں غلو کرتے ہیں۔ اس طرح سوچتے ہیں کہ بڑے بڑے اولیاء اور صوفیاء
دین سے نا واقف تھے، اُن کا مسلک کتاب و سنت سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے جو لوگ اُن پر تنقید کرتے ہیں، وہ بزرگوں کا احترام
ملحوظ نہیں رکھتے، وہ منہ پھٹ اور بے ادب ہیں، اور

بے ادب محروم شد از فضلِ رب

حالانکہ دین میں شخصیتوں پر نہیں اصول پر نظر رہنی چاہیے۔ اصول و قانون کو ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے اور شخصیتوں کو اصول و قانون
سے اولیٰ سمجھا گیا ہے اس ترتیب کے الٹ جانے سے طرح طرح کی خرابیاں اُبھر آئیں! بے شک جماعت اسلامی کے لٹریچر نے ایسا مزاج
بنا دیا ہے اور ایسی نظر پیدا کر دی ہے جو دین کے ہر مسئلہ میں سب سے پہلے کتاب و سنت اور آثار صحابہ پر جاتی ہے اور اسی معیار پر ہر بزرگ کے
قول و فعل کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے جس کا قول و عمل اس معیار پر پورا نہیں اُترتا اُسے رد کر دیا جاتا ہے!

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کتنے بڑے بزرگ گزرے ہیں مگر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی عقیدت
میں اس درجہ سرشار ہیں کہ صلوٰۃ غوثیہ کا اپنی کتاب (اخبار الاخیار) میں ذکر فرماتے ہیں اور اس پر نکیر نہیں کرتے! اس قسم کے تسامحات پر بزرگوں سے
اختلاف کیا جاتا ہے تو اسلاف کے عقیدت مند پکارنے لگتے ہیں کہ دیکھنا! ان لوگوں کے دلوں سے بزرگوں کا احترام اُٹھ گیا ہے اور ان کے سینے
نورِ صفا سے خالی ہو گئے ہیں!

ہم نے بعض علماء کو اُن کے بزرگوں کی کھلی ہوئی غلطیوں کی دور از کار تاویل کرتے دیکھا ہے، اور اس تاویل میں جو علم کلام انہوں نے
استعمال کیا ہے اُس سے اندازہ ہوا کہ عقیدت کا غلو اہل علم و فضل تک کو معتدل اور متوازن نہیں رہنے دیتا۔ جماعت اسلامی میں بھی
جو کوئی مولانا مودودی صاحب سے اس قسم کی بے جا عقیدت رکھتا ہے اُس نے جماعت کے مزاج و فکر کو پوری طرح نہیں سمجھا!

بعض حضرات جماعت کی تحسین و ستائش کرتے ہوئے، یہ فرما دیتے ہیں کہ انگریزی تعلیم یافتہ کو جماعت اسلامی سے قرب میں
دینی فائدہ ہے مگر دیندار لوگوں کی اس سے دور ہی رہنے میں بھلائی ہے، ان حضرات کا یہ تجزیہ صحیح نہیں ہے! آخر جماعت اسلامی کے
ارکان میں کون سی ایسی خرابی پائی جاتی ہے جس کے سبب سے دیندار طبقہ اُن سے قرب یا متاثر ہو کر عقیدہ و عمل کے کسی فساد اور خرابی میں مبتلا
ہو جائے گا! جماعت اسلامی میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ دیندار حضرات بھی شامل ہوئے ہیں اور انہوں نے جماعت میں رہ کر
دینی اعتبار سے کوئی اجنبیت محسوس نہیں کی اور جماعت کے ساتھ تعاون و اشتراک عمل نے اُن میں کسی قسم کا دینی بگاڑ پیدا نہیں کیا، یعنی
ایسا نہیں ہوا کہ جماعت کے ساتھ وابستگی نے اُن کے کسی عقیدہ کو کمزور کر دیا ہو، یا وہ دین کے فرائض و واجبات ادا کرنے میں متساہل اور
بے پرواہ ہو گئے ہوں! جماعت کی قربت اور وابستگی تو دینداری میں اور نکھار پیدا کر دیتی ہے، جماعت پر کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب کہ علماء
دین کی تھوڑی بہت تعداد اُس میں شامل نہ رہی ہو، اس کو کون باور کر سکتا ہے کہ یہ حضرات اہل علم جماعت میں رہ کر اپنی دینداری اور خیر و تقویٰ
کا نقصان گوارا کرتا رہے! جماعت میں رہ کر دین پسند اور صاحبانِ علم و تقویٰ کچھ کھوتے نہیں ہیں بلکہ اُن کی دینداری میں کچھ نہ کچھ اضافہ
ہی ہو جاتا ہے۔

جماعتِ اسلامی کے ارکان یا متفقین کے بارے میں اس قسم کا فتویٰ کسی جہت سے بھی درست نہیں ہے کہ اُن کی امامت میں مسلمانوں کو نماز نہیں پڑھنی چاہیے، فقہی اعتبار سے یہ فتویٰ نہ تو ثقاہت رکھتا ہے اور نہ اصابت! یہ تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ جماعت اسلامی مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہے اور اُس سے جو وابستگی رکھتے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں، مسلمانوں کے گمراہ فرقوں —— روافض و خوارج —— جیسی کوئی ضلالت اور خرابی بھی جماعت اسلامی کے عقائد و عمل میں نہیں پائی جاتی، جماعتِ اسلامی میں جو کوئی شامل جائے گا یا اُس کے لٹریچر سے متاثر ہو گا وہ بدعات اور مشرکانہ عقائد و رسوم کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا! اس صورت میں جماعت اسلامی کی تھوڑی بہت تعریف کرتے ہوئے یہ شوشہ چھوڑ دینا کہ جماعتِ اسلامی والوں کے پیچھے مسلمانوں کو نماز نہیں پڑھنی چاہیے یا دیندار طبقہ کو ان سے دور رہنا چاہیے۔ درحقیقت جماعت اسلامی کو مسلمانوں کی نگاہ میں مشتبہ، مشکوک اور بے وقعت بنانے کی تدبیر ہے! اس طرح کے اوہام و شکوک اہلِ علم کو زیب نہیں دیتے۔ جماعتِ اسلامی کے کسی رکن کی امامت میں نماز پڑھنا کسی کراہت کا سبب بھی نہیں ہو سکتا، اس قسم کے فتوے فقہ کے دامن پر بدنما داغ ہیں۔

جماعت اسلامی کے بارے میں لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں، ایسے کم نکلیں گے، جنہوں نے جماعت کے بارے میں خود تحقیق کی ہو، بعض علماء، مشائخ اور اہلِ قلم کی باتوں پر اعتماد کرتے ہوئے لوگوں نے جماعت کے بارے میں رائے قائم کر لی ہے! مگر جن حضرات نے جماعت کا لٹریچر پڑھا ہے اور جماعت کے ارکان کی زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے، اُن کے ذہن و فکر جماعت کے بارے میں صاف ہو گئے ہیں! اور جماعت سے اُن کا اجتناب اور نفرت، قدر و ستائش اور محبت و قربت سے بدل گئی ہے۔

جماعت اسلامی فرشتوں کی نہیں انسانوں کی جماعت ہے اور انسانوں سے کوتاہیاں اور غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی ہیں، جماعتِ اسلامی کو ہم خطاؤں سے معصوم اور محفوظ نہیں سمجھتے مگر اس پر ہمارا پوری طرح اطمینان ہے کہ مجموعی طور پر جماعت اسلامی سے خیر ہی کا صدور ہو رہا ہے اور عالم اسلام میں جماعتِ اسلامی دین کا سب سے زیادہ مضبوط مورچہ ہے جو کوئی جماعت اسلامی کو مطعون کرتا ہے وہ لوگوں کو خیر کی طرف سے آنے سے روکتا ہے اور ساتھ ہی اُس کی اس حرکت سے دینی محاذ کمزور ہوتا ہے۔

جماعتِ اسلامی کی کتابیں، اُس کے اخبارات اور رسالے اور جماعت کے ارکان کی زندگیاں اس کی شاہد ہیں کہ یہ جماعت اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے جدوجہد کر رہی ہے اور اس تمام جدوجہد کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہے! جماعتِ اسلامی کے لٹریچر نے عمل و عقیدہ کے اعتبار سے ہزار مسلمانوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے بہت سے غیر مسلم بھی جماعت کے افکار و اعمال سے اتنے متاثر تو ہوئے ہیں کہ اسلام سے جو اُن کو وحشت و نفرت تھی وہ دور ہو گئی، بعض ملکوں میں جماعتِ اسلامی کی کوششوں سے غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی بھی توفیق میسر آئی ہے! جو کوئی جماعت اسلامی کا دشمن اور درپے آزار ہے وہ اپنی اس روش سے دراصل قادیانیت، انکار حدیث، اشتراکیت، مغرب زدگی اور تجدد و اباحیت کے فتنوں کو طاقت پہونچا رہا ہے۔

جو حضرات علم و تقویٰ کے مدعی ہیں اور معتقدین و مریدین کے حلقے رکھتے ہیں اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ دین کو بعض اجتماعی غلطیاں اتنا نقصان پہونچا دیتی ہیں کہ خیر و تقویٰ کی بڑی سے بڑی مقدار بھی اس نقصان کی تلافی اور اس غلطی کے کفارہ کے لئے کافی نہیں ہوتی! جماعت اسلامی کے ساتھ اُن کا عناد اور تعصب بھی رنگ اختیار کرتا جا رہا ہے! —— اُمتِ مسلمہ کی خوش قسمتی ہے کہ دورِ حاضر میں جماعت اسلامی جیسی دینی تنظیم پائی جاتی ہے جو انفعال و کمتری کی بجائے مسلمانوں کو دنیا کی سیادت و قیادت رنیا پر چھا جانے اور اسلام پر فخر کرنے کا جذبہ اور ولولہ دیتی ہے اس جماعت کی تائید و معاونت دین کی بہت بڑی خدمت ہے!

ماہر القادری —— ۵ مئی ۱۹۶۸ء

سید معروف شاہ شیرازی

قرآن کریم کی تلاوت اور مطالعہ کے آداب

اسلامی نظام حیات میں علم کی جو قدر و منزلت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کا آغاز ہی علم و کتابت علم کے تذکرے سے ہوا ہے۔ قرآن کریم نے علم کو نور اور جہالت کو اندھیرے سے تشبیہ دی ہے اسلئے اسلامی نظام میں حصول علم کے قواعد و آداب کی وضاحت کر دی گئی ہے یہاں صرف قرآن عظیم کے مطالعے کے آداب کا بیان مقصود ہے۔

تلاوت کلام پاک

۱۔ کثرت سے تلاوت کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو سمجھ کر تلاوت کی جائے۔ اگر سمجھ نہ سکتا ہو تو قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش ضروری ہے قرآن کریم میں مومنین اہل کتاب کی صفت میں آیا ہے یتلون آیات اللہ آناء اللیل "اللہ کی آیات کو رات کے وقت پڑھتے ہیں" (۳ : ۱۱۴) یتلون کتاب اللہ "جو اللہ کی کتاب کو پڑھتے ہیں" (۳۵ : ۲۹)

۲۔ فجر کے وقت تلاوت قرآن مجید کی فضیلت خاص طور پر آئی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں کے علاوہ صبح کے وقت قرآن پڑھنے کی بھی ربانی ہدایت کی گئی ہے کہ ان قرآن الفجر کان مشہودا "بے شک صبح کا قرآن (تلاوت) فرشتوں کے حاضر ہونے کا وقت ہے" (۱۷ : ۷۸)

۳۔ بے شمار احادیث میں تلاوت قرآن مجید کی فضیلت آئی ہے۔ حضور فرماتے ہیں "جو قرآن مجید کا ایک حرف بھی تلاوت کرے گا اُسے دس گنا ثواب ملے گا" ـــــ "دو چیزوں میں حسد جائز ہے ایک یہ کہ کسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآنی علوم سے نوازا ہو اور وہ رات اور دن تلاوت کرتا ہو . . ." ـــــ ایک حدیث قدسی کا مضمون ہے "جس طرح مجھے تمام مخلوقات پر فضیلت ہے، اسی طرح تلاوت قرآن کرنے والے کو دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل ہے" ـــــ "اپنے گھروں کو نماز اور تلاوت قرآن پاک سے روشن کرو" ـــــ "میری امت کی سب سے افضل عبادت تلاوت قرآن پاک ہے" ـــــ "تلاوت اللہ کا دستر خوان ہے اُسے نہ چھوڑو" ـــــ "قرآن والو!

قرآن کو اس طرح پڑھو جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ سات دن پڑھو، اُسے پھیلاؤ، اس پر غور و فکر کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"
——— غرض بے شمار حدیثیں ہیں جو تلاوت قرآن مجید کے بارے میں وارد ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی سمجھ کر مطالعہ نہیں کر سکتا تو وہ ویسے ناظرہ تلاوت کرے اور اپنے اندر فہم پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

۲- تلاوت قرآن پاک کی مقدار۔

شریعت نے تلاوت قرآن پاک کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی اس سلسلہ میں ایک عام حکم فرمایا کہ جس قدر تم سے ہو سکے تلاوت کرو۔ تاہم احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سات دنوں سے کم عرصے میں قرآن کریم کو ختم کرنا مستحسن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جو احادیث وارد ہیں ان کا مضمون یہ ہے ——" جو شخص قرآن مجید کو تین دنوں سے کم عرصہ میں ختم کرے گا۔ وہ کچھ نہ سمجھے گا" —— "تین دنوں سے کم وقت میں قرآن مجید ختم نہ کرو" یہ ابن مسعودؓ اور معاذ بن جبلؓ کا قول ہے۔ مگر عبداللہ ابن مسعودؓ اور معاذ بن جبلؓ کے اثر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تین دنوں سے کم عرصہ میں بھی ختم قرآن کی اجازت ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ وہ کتنے عرصے میں قرآن مجید ختم کریں تو آپ نے فرمایا " ایک ماہ میں" عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے اندر مزید قوت پاتا ہوں تو آپ نے دس دن کے اندر ختم کر لینے کی اجازت دیدی۔ لیکن انہوں نے پھر اصرار کیا کہ حضورؐ میں اس سے بھی کم عرصے میں ختم کر سکتا ہوں تو آپ نے فرمایا کہ" سات دنوں میں ختم کرو اور اس سے کم میں نہیں" نیز ابو صعصعہ کی روایت میں بھی یہ ہے کہ میں نے حضورؐ سے دریافت کیا تو اُن کو بھی صرف سات دن یعنی ایک ہفتہ میں ختم کرنے کی اجازت دی گئی۔ حضرت مکحولؒ سے روایت ہے کہ " صحابہ میں طاقت ور لوگ سات دن میں ختم کرتے تھے، بعض ایک ماہ میں، بعض دو ماہ میں اور بعض اس سے بھی زیادہ عرصے میں" اور لیث کہتے ہیں کہ۔ "سال میں دو دفعہ ختم کرو۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر سال میں دو دفعہ ختم کیا تو حق ادا ہو گیا۔ کیونکہ حضرت جبریلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، عمر کے آخری سال میں دوبارہ دور کیا تھا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ دینی اور اجتماعی کاموں میں مصروف ہوتے ہیں انہیں فرصت کے مطابق کچھ حصہ سمجھ کر پڑھنا چاہئے۔ لیکن جن لوگوں کو فراغت اور فرصت میسر ہے اُنہیں زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہئے۔

۳- **یاد کر کے بھول جانا** - قرآن کریم کو یاد کر کے بھول جانا گناہ کبیرہ[1] ہے۔ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کئے گئے ان میں سب سے بڑا گناہ قرآن کریم کو حفظ کر کے بھول جانے کا گناہ تھا۔ بھول سے مراد صرف لفظوں کا بھول جانا ہی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کی تعلیمات کو بھول جانا بھی اس میں شامل ہے ایک حدیث کا مضمون ہے کہ ایسا شخص، قیامت کے دن، کوڑھی ہو کر اٹھے گا۔ اور ایک حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کرو، اُسے بار بار پڑھو، ورنہ تم اُسے بھول جاؤ گے۔

۴- پاکیزگی اور طہارت۔

افضل یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت، ہر حال میں، انسان پاک صاف اور باوضو ہو لیکن اگر وہ زبانی پڑھ سکتا ہو تو بغیر وضو کے بھی تلاوت جائز ہے۔ عورتوں کے لئے ناپاکی کے دنوں میں پڑھنا جائز نہیں البتہ وہ قرآن مجید کے مطالب پر غور و فکر کر سکتی ہیں بغیر وضو اور طہارت کے مصحف کو چھونا جائز نہیں ہے[2]۔ لا یمسّہ الا المطھرون "اسے صرف پاک لوگ ہی چھوتیں" (۵۶ : ۷۹)

---

[1] الاتقان اول ص ۱۰۵ طبع مصطفی البابی مصر ۱۹۵۱ء [2] احکام القرآن۔ الجصاص جلد ۳ ص ۱۵۱ مصر مکتبہ بہیہ ۱۳۴۷ھ

۵۔ اعوذ باللہ

جب بھی تلاوت قرآن شروع کی جائے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم سے آغاز کیا جائے ہر سورۃ کو شروع کرتے وقت سوائے سورۃ توبہ کے، بسم اللہ ضرور پڑھی جائے اور اگر کسی سورت کے درمیان سے آغاز تلاوت ہو رہا ہو تو بھی اعوذ باللہ اور بسم اللہ سے آغاز کیا جائے۔ فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ "پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے، خدا کی پناہ مانگ لیا کرو" (۱۶: ۹۸) لیکن "اس کا مطلب صرف اتنا نہیں ہے کہ بس زبان سے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم کہہ دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ فی الواقع دل میں یہ خواہش اور عملاً یہ کوشش ہونی چاہئے کہ آدمی قرآن پڑھتے وقت، شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے محفوظ رہے، شک کی میں مبتلا نہ ہو، قرآن پاک کی ہر بات کو اس کی صحیح روشنی میں دیکھے اور اپنے خود ساختہ نظریات یا باہر سے حاصل کیے ہوئے تخیلات کی آمیزش سے قرآن کے الفاظ کو وہ معنی نہ پہنانے لگے، جو اللہ کے منشا کے خلاف ہوں۔ اس کے ساتھ آدمی کے دل میں یہ احساس بھی موجود ہونا چاہئے کہ شیطان سب سے بڑھ کر جس چیز کے درپے ہے وہ یہی ہے کہ ابن آدم قرآن سے ہدایت نہ حاصل کرنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کتاب کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیطان اسے بہکانے اور ہدایت سے روکنے اور فکر و فہم کی غلط راہوں پر ڈالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ اس لئے آدمی کو اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت انتہائی چوکنا رہنا چاہئے۔ اور ہر وقت خدا سے مدد مانگتے رہنا چاہئے کہ کہیں شیطان کی دراندازیاں اسے اس سرچشمہ ہدایت کے فیض سے محروم نہ کر دیں۔ کیونکہ جس نے یہاں سے ہدایت نہ پائی وہ پھر کہیں ہدایت نہ پا سکے گا اور جو اس کتاب سے گمراہی میں پڑ گیا اسے پھر دنیا کی کوئی چیز گمراہی کے چکر سے نہ نکال سکے گی[۱]۔"

۶۔ ترتیل سے پڑھنا۔ قرآن مجید کو آہستہ آہستہ اور ترتیل سے پڑھنا چاہئے، ایک ایک حرف اپنے مخرج سے ادا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ورتل القرآن ترتیلاً "اور قرآن مجید کو خوب صاف صاف پڑھو" (۷۳: ۴) ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "واضح کرکے پڑھو" اور طاؤس کہتے ہیں۔ "اس طرح واضح کرکے پڑھو کہ تم مطلب سمجھ جاؤ[۲]۔"

قرآن کریم نے، تلاوت کا یہ طریقہ محض اس لئے مقرر کیا ہے تاکہ لوگ قرآن مجید کو خوب سمجھ کر پڑھیں اور سرسری طور سے نہ گزر جائیں اسی بنا پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ قرآن تھوڑا پڑھنا اور سمجھ کر پڑھنا، اس سے بہتر ہے کہ بغیر سوچے سمجھے زیادہ پڑھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بار بار آیات میں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

۷۔ تدبر فی الآیات۔ قرآن و حدیث کے متعدد نصوص سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں غور و فکر کرنا نہایت ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے "ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ قرآن مجید کی تلاوت کریں گے اور وہ ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا" اور قرآن نے تو اس کی بار بار صراحت کی ہے کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ۔ "یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف اتارا، بابرکت تاکہ لوگ اس کی بات پر تدبر کریں" افلا یتدبرون القرآن۔ "کیا یہ لوگ قرآن پر غور و فکر نہیں کرتے؟" علماء نے لکھا ہے کہ

---

[۱] تفہیم القرآن جلد دوم از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لاہور ص ۵۷۱

[۲] الجصاص ج ۳ ص ۵۷۶ طبع مصر مکتبہ بہیہ ۱۳۴۷ھ

قرآن مجید کو غور کر کے پڑھنا چاہئے اور پھر اس کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لینا چاہئے۔ اپنی کو
پر غور کرنا چاہئے۔ اور اس پر رونا باعثِ ثواب ہے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو رونا نہ آئے تو وہ بتکلف روئے اور اپنے آپ
سے متاثر کرے۔

۸۔ **خوش الحانی سے تلاوت** ۔ اگرچہ قرآن مجید کو خوش الحانی سے پڑھنا جائز ہے لیکن اگر خوش آوازی ایسی ہو
کہ وہ موسیقی سے قریب تر ہو جائے اور تجوید و قرآت کے اصول پامال ہو جائیں تو یہ سخت ناپسندیدہ ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ
کریم کو اپنی اچھی آوازوں سے مزین کرو۔

۹۔ **جہر اور اخفاء** ۔ قرآن کریم کو جہر اور اونچی آواز سے پڑھنا بالاتفاق جائز ہے لیکن اس پر قیود بھی عائد کی گئی ہ
اگر کوئی پاس ہی سو رہا ہو، نماز پڑھ رہا ہو اور یا کسی ایسے کام میں مصروف ہو کہ جہراً پڑھنے سے حرج کا امکان ہو تو پھر اونچی آواز سے
جائز نہیں ہے۔ ایک حدیث کا مضمون ہے۔ حضرت ابو سعیدؓ فرماتے ہیں کہ حضور اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ مسجد میں ا
بجہ پڑھنے لگے۔ آپؐ نے پردے سے اپنا سر مبارک باہر نکالا اور فرمایا ۔آپ لوگ اپنے رب سے مناجات کر رہے ہیں لہذا ایک
سے مقابلہ میں اونچی آواز سے بھی نہ پڑھیں"۔ ہاں اگر موانع نہ ہوں اور دوسرے لوگ سننے کے لئے آمادہ ہوں تو بلند آواز سے پڑھ
ثواب ہے اور یہ بھی دائرہ تبلیغ اور اشاعت قرآن میں شامل ہے۔

۱۰۔ **سلسلہ تلاوت کا انقطاع** ۔ کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ سلسلہ تلاوت قرآن مجید کو، بغیر کسی ضرو
کے منقطع کرے۔ بعض صحابہ کرام جب تلاوت شروع کر دیتے تھے۔ تو درمیان میں کسی سے بات نہ کرتے تھے۔ البتہ اگر ضرورت ہو تو
جا سکتی ہے۔ ضرورت کا معیار کیا ہے؟ یہ صرف تلاوت کرنے والے کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ ضرورت ہے یا نہیں ہے۔ البتہ
مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ تلاوت کرنے والے کو خواہ مخواہ پریشان نہ کریں۔

۱۱۔ **ترجمہ کی تلاوت** ۔ قرآن مجید کے مطالب اور مضامین کو سمجھنے کی غرض سے تراجم کا پڑھنا بالاتفاق جائز اور کار ثوا
لیکن محض ثواب کی غرض سے ترجمہ کی تلاوت میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ایک رائے منسوب ہے کہ ؛
جائز سمجھتے ہیں لیکن واضح قول یہی ہے کہ امام صاحب نے بعد میں اپنے سابق قول سے رجوع فرما لیا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ ترجمہ پڑھتے وقت
عربی عبارت کی تلاوت کی جائے۔ اگر کوئی عربی پڑھنے پر قادر ہی نہیں ہے تو اس وقت تک صرف ترجمہ پڑھے جب تک عربی پڑھنے پر قدر
نہ ہو جائے۔

۱۲۔ **ختم قرآن کا مسنون طریقہ** ۔ ختم قرآن کے بعد دعا کرنا، اپنی حاجات کا سوال کرنا اور قبولیت تلاوت کی د
کرنا مسنون ہے ختم قرآن کے وقت اپنے اہل و عیال کو جمع کر کے دعا کرنی چاہئے جس میں گناہوں کی مغفرت طلب کرے اور رسول خدا صلی
علیہ وسلم پر درود بھیجے۔

۱۳۔ **ذریعہ معاش بنا لینا** ۔ تلاوت قرآن پاک کو ذریعہ معاش بنا لینا ممنوع ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی
میں روایت کرتے ہیں: "جس شخص نے کسی ظالم کے سامنے اس لئے قرآن کریم پڑھا کہ اس سے کچھ منفعت حاصل کرے۔ ایسے شخص کو ہر حرف
دس لعنتیں ملیں گی" اور ایک دوسری حدیث کا مضمون ہے: "جو شخص قرآن پڑھے، اُسے چاہئے کہ قرآن کے واسطے سے اپنی حاج

بلکہ آگے کچھ لوگ ایسے بھی آنے والے ہیں، جو قرآن کو پڑھ کر لوگوں سے بھیک مانگیں گے؟ تلاوت قرآن مجید پر اجرت لینا ممنوع ہے۔

۱۴۔ ایصال ثواب۔

امام ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قرآن مجید پڑھ کر اس کا ثواب اپنے رشتہ داروں یا کسی اور کو بخشے تو ثواب پہنچ جاتا ہے لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں نہیں پہونچتا۔ اس ذیل میں وہ قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے ہیں لیس للانسانِ الا ما سعٰی "انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے کمایا"۔ کئی دوسرے مقامات پر بھی یہ آتا ہے کہ کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا ہر شخص اپنا ذمہ دار خود ہوگا۔

۱۵۔ رموز اوقاف۔

قرآن حکیم عام انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا گیا ہے۔ اس لئے اس کے اسلوب میں گفتگو کا پیرایہ ملتا ہے۔ اسی کے پیش نظر علماء اسلام نے رموز اوقاف (PUNCTUATION) پر بڑا عظیم کام کیا ہے اپنی غفلت کی بنا پر ہم اسے مغرب کی دین سمجھتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے رموز اوقاف اس مفروضے کی صریح تردید کرتے ہیں۔ مثلاً دائرہ " O " فل سٹاپ اور "م" وقف لازم کی علامت ہے چند اہم رموز اوقاف یہ ہیں:—

O ۔ وقف تام اور آیت کی علامت ہے۔

م ۔ وقف لازم کی علامت ہے تاکہ معانی میں ابہام پیدا نہ ہو۔

ط ۔ وقف مطلق کی علامت ہے، اکثر اس علامت کے بعد موضوع گفتگو جاری رہتا ہے۔

ج ۔ اختیاری وقف کی علامت ہے ٹھہرنا بہتر ہے اور آگے تلاوت جاری رکھنا جائز ہے۔

ز ۔ ایسے مقامات پر نہ ٹھہرنا مناسب ہے۔

صلے ۔ یہ علامت " الوصل اولیٰ " کی ہے۔ یعنی عبارت کو اگلے ٹکڑے سے ملا کر پڑھا جائے۔

قف ۔ اس کے معنی ہیں " ٹھہر جاؤ "۔

س ۔ یہ "سکتہ" کا اختصار ہے یعنی ایسا مختصر وقفہ کہ سانس نہ ٹوٹے۔

لا ۔ "نہیں" اگر یہ علامت آیت کے اوپر ہو تو ٹھہرنے اور نہ ٹھہرنے میں اختلاف ہے اور اگر عبارت کے اندر ہو تو ٹھہرنا لازم ہے۔

قرآن کریم کی تلاوت اور سمجھ کر عمل کرنے کی نیت سے تلاوت دین و دنیا کے فلاح کی ضامن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کیلئے۔

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

محمد عثمان (ایم۔ ایل۔ ایس)
لائبریرین علامہ اقبال کالج۔ کراچی

برصغیر میں علوم اسلامیہ کی ترقی

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ وہ چند عقائد و رسوم کا مجموعہ نہیں ہے، اس کا اپنا سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی نظام ہے۔ مسلمانوں کی اپنی ایک تاریخ ہے جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ماضی نہایت شاندار رہا ہے انہوں نے نہ صرف فتوحات کے میدان میں شہرت حاصل کی اور اپنے دورِ فتوحات میں متمدن دنیا کو اپنے زیرِ اقتدار لے آئے بلکہ انہوں نے عالم انسانیت کو حیات نو بخشی، تہذیب و تمدن سے آشنا کیا، علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے لئے مدارس و درس گاہیں اور جامعات قائم کیں جن میں علوم و فنون کو مدون کیا، بڑے بڑے کتب خانے قائم کئے اور ہر شعبہ علوم و فنون میں انہوں نے بیش بہا اضافے کئے جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اور علم و حکمت لازم و ملزوم ہیں۔

قرآن کریم میں اس کی متعدد جگہ نشاندہی کی گئی ہے۔

"اقراء باسم ربك الذی خلق ۝ خلق الانسان من علق ۝ اقراء وربك الاكرم الذی علم بالقلم ۝ علم الانسان ما لم یعلم ۝" (سورہ ۹۶۔ رکوع ۱۔ آیات ۱-۵)

ترجمہ: (اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھ جس نے (عالم کو) پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو اور تیرا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

وعلم آدم الاسماء کلها ثم عرضهم علی الملئكة۔ (سورہ ۲۔ رکوع ۴۔ آیت ۳۱)

ترجمہ:۔ اور اللہ نے آدم کو نام سکھلا دئے کل کے کل پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

ومن یؤت الحكمة فقد اوتی خیرا كثیرا (سورہ ۲۔ رکوع ۳۷۔ آیت ۲۶۹)

ترجمہ:۔ جس شخص کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی۔

انظروا ماذا فی السموٰت والارض ط　(سورہ ۱۰ - رکوع ۱۰ - آیت ۱۰۱)

ترجمہ :- دیکھو آسمان اور زمین میں کیا کچھ ہے۔

وقل رب زدنی علما　(سورہ ۲۰ - رکوع ۱۵ - آیت ۱۱۴)

ترجمہ :- اور آپ کہئے کہ اے میرے پروردگار بڑھا دے میرے علم کو۔

ولیعلم الذین اوتوا العلم انہ الحق من ربک　(سورہ ۲۲ - رکوع ۱۴ - آیت ۵۴)

ترجمہ :- اور (یہ سب اس لئے بھی) تاکہ جن لوگوں کو فہم عطا ہوا ہے وہ یقین کر لیں کہ یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء　(سورہ ۳۵ - رکوع ۱۶ - آیت ۲۸)

ترجمہ :- اللہ کے عالم بندے اللہ سے ڈرتے ہیں۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون　(سورہ ۳۹ - رکوع ۱۵ - آیت ۹)

ترجمہ :- آپ کہئے کہ کیا علم والے اور بے علم کہیں برابر بھی ہوتے ہیں۔

الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان　(سورہ ۵۵ - رکوع ۱۱ - آیات ۱تا۴)

ترجمہ :- خدائے رحمٰن ہی نے قرآن کی تعلیم دی۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا اس کو گویائی سکھلائی۔

یرفع اللہ الذین امنو منکم والذین اوتوا العلم درجات　(سورہ ۱۱ - رکوع ۲ - آیت ۵۸)

اور

جناب رسول کریم کا ارشاد گرامی ہے۔

اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔

ترجمہ :- علم کو طلب کرو خواہ وہ چین ہی میں ہو۔

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ

ترجمہ :- علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

ان ارشادات کی روشنی میں مسلمانوں نے اس وقت دنیا کو علوم وفنون کے خزانوں سے مالا مال کر دیا جب کہ یورپ جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا اور مینارۂ رشد و ہدایت مشرق میں فروزاں تھا۔ کون سا وہ علم ہے اور کونسی وہ ایجادات ہیں جن سے مسلمانوں کا تعلق نہیں رہا۔ مسلمانوں نے دوسری زبانوں سے اپنی زبانوں میں علوم وفنون بذریعہ تراجم منتقل کئے اور دوسری قوموں سے علوم وفنون حاصل کئے اور ان کو ترقی دی۔ دورِ بنو عباس کے "بیت الحکمت" سے کون ناواقف ہے۔

جب مسلمان بہ حیثیت فاتح برصغیر ہند و پاک میں داخل ہوئے تو انہوں نے نہ صرف اپنی حکومت قائم کی بلکہ اس سرزمین کو علوم وفنون سے بھی بہرہ ور کیا۔ عربوں کے دور فتوحات میں بڑے بڑے محدث اور علماء آئے اور انہوں نے اپنے تبلیغی ادارے اور مدارس قائم کئے۔ مسلمانوں کا پہلا دور بھی علمی اعتبار سے نہایت شاندار رہا۔ منصورہ، قصدار، دیبل، حدیث کے بڑے مرکز تھے۔ ربیع بن صبیح ہندوستان کے پہلے مصنف ہیں اور سندھ میں قرآن کریم کا پہلا ترجمہ ۲۷۰ھ کی مقامی زبان میں مہروک بن رائق کی فرمائش پر ہوا (بزرگ بن شہریار)

مسلمانوں کا دوسرا دور غزنوی دور کی فتوحات سے شروع ہوتا ہے اس نے مغربی پاکستان کے شمال مغربی حصے کو اپنی حکومت میں شامل کر کے یہاں اسلامی تہذیب و ثقافت کا اجرا کیا۔ شیخ علی ہجویری، اسمٰعیل محدث اور شیخ سرور اس دور کی نامور علمی و تبلیغی شخصیتیں ہیں، بہت سے قبائل داخل اسلام ہوئے اور اسلامی معاشرے کو استحکام نصیب ہوا۔ شیخ علی ہجویریؒ کی کتاب کشف المحجوب تصوف کے ادب میں ایک نمایاں حیثیت کی مالک ہے۔

مسلمانوں کا تیسرا دور غوری فتوحات سے شروع ہوتا ہے جس کا پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک جو ۱۲۰۶ء میں لاہور میں تخت نشین ہوا اور اس کی آخری آرام گاہ بھی لاہور ہی میں ہے اور مسلمانوں کے اقتدار و سطوت کی آخری نشانی بہادر شاہ ظفر تھے جو ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کے ہاتھوں قید ہو کر رنگون میں ، ر نومبر ۱۸۶۲ء کو فوت ہوئے۔

قطب الدین ایبک سے لے کر آخری تاجدار مغلیہ کے زمانے تک مسلمانوں نے ہند و پاکستان میں علوم و فنون کی ہر شاخ میں بڑی بیش قیمت تصنیف و تالیف کیں اور علوم معارف اسلامیہ ان کے خاص موضوع رہے۔

اس زمانے کے بادشاہ اسلام دوست اور مذہب کے پابند ہوتے تھے اس لئے وہ علماء و فضلاء کی خاص قدر کرتے تھے اور ان کو وظائف دے کر معاش کی طرف سے فارغ البال کر دیتے تھے تاکہ وہ اپنی زندگی رشد و ہدایت، درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں گزاریں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کا علماء و فضلاء کو وظائف اور جاگیریں اور جائدادیں دینے کا یہ طریقہ آخری وقت تک قائم رہا جس سے تصنیف و تالیف کے شعبوں کو خاص مدد ملی۔ شمس الدین التمش کے مدمقابل ملتان و اوچ کے حکمران ناصر الدین قباچہ کی علمی سرپرستیوں سے کون واقف نہیں۔ اس کے عہد میں پاکستان کی سب سے پہلی تاریخ "چچ نامہ" عربی سے فارسی زبان میں منتقل ہوئی اور عوفی کا مشہور فارسی تذکرہ "لباب الالباب" اور اس کی دوسری کتاب "جوامع الحکایات و لوامع الروایات" لکھی گئیں۔

اس زمانہ میں دہلی علوم و فنون کا مرکز تھا۔ خاندان غلامان اور خلجیوں کے زمانہ میں بھی تصنیف و تالیف کا خاصہ کام ہوا لیکن تغلق دور میں تصنیف و تالیف کے کام میں بہت تیزی آئی بہت سی تاریخی اور علمی کتابیں لکھی گئیں۔ محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق دونوں بادشاہ خود صاحب علم اور اہل علم کے قدردان تھے، فیروز شاہ تغلق نے کانگڑہ کے پہاڑوں پر ایک فوجی مہم کے دوران وہاں کے کتب خانہ کو خاص طور پر دہلی لانے کا حکم دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کتابوں کو سنسکرت سے فارسی میں منتقل کرنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔ وہ خود بھی "فتوحات فیروز شاہی" کا مصنف ہے اسی دور میں حضرت امیر خسرو اور میر حسن وغیرہ جیسے ادیب اور شاعر ملتے ہیں جن کی تصانیف سے دنیا واقف ہے۔

لودھیوں کا دور بھی علمی اعتبار سے بڑا شاندار ہے۔ سکندر لودھی علوم و فنون اسلامیہ کا بڑا شائق تھا۔ معارف اسلامیہ سے اس کی دلچسپی کا ایک خاص واقعہ ملتا ہے کہ اس نے اپنے سنبھل کے قیام کے زمانہ میں برہمنوں سے ایک مجلس مباحثہ منعقد کرائی اور اس کے زمانہ میں فارسی زبان کے دروازے ہندوؤں پر کھولے گئے۔

مغلوں کا دور علوم و فنون کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔ ان کا ہر بادشاہ خود ذی علم اور علم پرور تھا۔ بابر نہ صرف فارسی اور ترکی زبان کا شاعر تھا بلکہ وہ "تزک بابری" کا مؤلف بھی تھا۔ ہمایوں کی علمی دلچسپی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتب خانہ کی سیڑھیوں سے گر کر فوت ہوا۔ اکبر خود ذی علم نہ تھا مگر اس کے زمانہ میں تو باقاعدہ اس کی سرپرستی میں ایک ریسرچ اکیڈمی یا دار التصنیف قائم تھا جس کے تحت بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور سنسکرت سے ترجمے بھی ہوئیں۔ اس کے زمانے کے مشہور مصنفوں میں ملا عبدالقادر بدایونی، فیضی، ابوالفضل اور عبدالرحیم خان خاناں وغیرہ مشہور ہیں۔

جہانگیر اور شاہجہان کا دور بھی تصنیف و تالیف کے اعتبار سے خاصہ اہم اور مشہور ہے۔ جہانگیر تو خود بھی "تزک جہانگیری" کا [مصنف] ہے، اس کے زمانہ میں دو ایسی شخصیتیں موجود تھیں جنہوں نے تبلیغ و اشاعت اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی بڑی خدمت کی۔ ان میں [ایک] نام حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کا ہے، اور دوسرا نام عبدالحق محدث دہلوی کا ہے حضرت مجدد کی تصنیفات میں ان کے مکتوبات تو [ایسے] ہے مستغنی ہیں وہ علوم اسلامی کے "دائرۃ المعارف" ہیں ان کی دوسری تصانیف "معارف لدنیہ" "اثبات النبوت" اور "رسالہ تحلیلیہ" [وغیرہ] ہیں جن میں انہوں نے اسلامی فلسفہ کو بیان کیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث، فقہ اور تاریخ و سیرت پر بڑی گرانقدر تصانیف چھوڑی ہیں "شرح مشکوٰۃ" (عربی و فارسی) "مدارج النبوت" "اخبار الاخیار" اور مکتوبات وغیرہ مشہور ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر خود عالم، فقیہ اور متشرع بادشاہ تھا۔ اس کے علم و فضل پر اس کے رقعات دال ہیں اس کے زمانہ کا سب سے بڑا کا[م] معارف اسلامیہ کے اعتبار سے "فتاوائے عالمگیری" کی تدوین ہے جو فقہ اسلامی کی بہت بڑی خدمت ہے اور آج تک تمام عالم اسلام میں کسی زبان میں [اس] نوع کی کتاب تیار نہ ہو سکی۔ بادشاہ نے اس کتاب کی تدوین کے سلسلہ میں برصغیر کے چیدہ علماء کی ایک مجلس قائم کی تھی اور خود بہ نفس نفیس علماء [کے] مذاکروں میں شرکت کرتا تھا۔

مغلوں کا آخری دور سیاسی اعتبار سے انحطاط کا دور ہے لیکن اس زمانہ میں بھی علوم و فنون اسلامیہ کی بڑی خدمت ہوئی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی اسی دور کی شخصیت ہیں انہوں نے علوم اسلامیہ کے ہر شعبہ میں بہت عمدہ کتابیں لکھی ہیں ان کی کتابوں کی تعداد کم و بیش ساٹھ کے قریب ہے تفـ[سیر] حدیث، فقہ، تصوف، علم الکلام اور تاریخ و سیر ہر موضوع پر انہوں نے گرانقدر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ انہوں نے قرآن کریم کا فارسی میں تر[جمہ] کیا اور حدیث کی مشہور کتاب "موطا" (امام مالک) پر شروح لکھے۔ ان کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" علوم معارف اسلامیہ میں بے مثل کتاب ہے [اسی] طرح "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کا جواب نہیں۔

ان کے فرزند اول شاہ عبدالعزیز نے بھی اپنے والد ماجد کی طرح اسلامی علوم و فنون پر گرانقدر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں تفسیر، حدیث، فقہ، اور علم القرآن وغیرہ پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ جن میں "تفسیر عزیزی" "بستان المحدثین" "فتاوائے عزیزی" اور "تحفہ اثنائے عشر[یہ]" مشہور ہیں۔ ان کے دیگر فرزندان شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے قرآن کریم کے اردو میں تراجم کئے اس طرح ان خانوادہ نے علوم معارف [اسلامیہ] کی بڑی خدمات انجام دیں۔

شاہ عبدالعزیز کے بعد اس خاندان کے نامور رکن شاہ محمد اسحاق دہلوی تھے جو علم حدیث کے بڑے عالم تھے، انہوں نے مشکوٰۃ شریف [کا] اردو ترجمہ کیا اور دو کتابیں "مسائل اربعین" اور "مائۃ مسائل" ان کی یادگار ہیں ان کے مشہور تلامذہ میں نواب قطب الدین خان، مفتی عنایت ا[حمد] کاکوروی، مولانا احمد علی سہارنپوری اور شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی جیسے نامور اکابر علماء ہیں۔

نواب قطب الدین خان نے قرآن کریم کی اردو میں تفسیر "جامع التفاسیر" کے نام سے لکھی اور مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ کیا اور شرح "مظاہر [حق]" کے نام سے لکھی اور عربی کی مشہور کتاب "حصن حصین" کا اردو ترجمہ "ظفر جلیل" کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے اصلاحی اور تبلیغی رسالے بھی ہیں۔

۱۔ عبدالرحمٰن، سید صباح الدین بزم تیموریہ اعظم گڑھ دارالمصنفین ۱۹۴۸ء ص ۳۴۶ تا ۳۷۵

مفتی عنایت احمد کاکوروی کی اردو میں سیرت پر مشہور کتاب "تواریخ حبیب اللہ" ہے، اس کے علاوہ انہوں نے بہت سے رسائل اسلامی
پر لکھے ہیں، "تواریخ حبیب اللہ" سید کی کتاب "خطبات احمدیہ" سے پہلے لکھی گئی۔ اور اس موضوع پر قابل قدر کتاب ہے۔
مولانا احمد علی سہارنپوری کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے حدیث کی مشہور کتاب "بخاری و مسلم" وغیرہ کو اپنی تصحیح
کے ساتھ اپنے مطبع دہلی سے شائع کیا۔

شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی نے علم حدیث کی بڑی خدمت کی انہوں نے سنن ابن ماجہ پر حاشیہ لکھا۔ شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا
ار دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ شاہ صاحب کے شاگرد ہیں۔ اور دارالعلوم دیوبند نے علوم معارف اسلامیہ
مات انجام دیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحب کی مشہور تصانیف "آب حیات" "تقریر دلپذیر" "حجۃ الاسلام" وغیرہ مشہور ہیں۔ اسی طرح مولانا گنگوہی بھی متعدد
کے مصنف ہیں۔ علماء دیوبند میں کثرت تصانیف کے اعتبار سے مولانا اشرف علی تھانوی سب سے ممتاز ہیں انہوں نے علوم اسلامی کے ہر موضوع پر کتاب
ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا ترجمہ قرآن کریم، مولانا شبیر احمد عثمانی کی "شرح مسلم"، مولانا انور شاہ صاحب کی "شرح ترمذی" وغیرہ
ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کے زمانہ ہی میں لکھنؤ میں علماء فرنگی محل اپنی مسند علم بچھائے ہوئے تھے، جن میں ملا نظام الدین سہالوی سرخیل
ت ہیں اور کہا جاتا ہے کہ موجودہ درس نظامی انہی سے منسوب ہے ان کے نامور فرزند ملا عبدالعلی بحر العلوم علمی دنیا میں کسی تعارف کے
ج نہیں۔ اس خاندان میں بڑے بڑے نامور اکابر دانا ضل گذرے ہیں جیسے ملا حسن اور ملا مبین وغیرہ۔ دور آخر میں سب سے ممتاز شخصیت مولانا
ی فرنگی محلی کی تھی جو نامور استاد اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ علماء فرنگی محل کو زیادہ دلچسپی علوم معقول سے رہی ہے۔ علما معقول
یک ممتاز شاخ خیرآباد میں بھی تھی جس کے مشہور ارکان مولانا فضل امام صاحب مرقات اور خاتم الحکما مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ مولانا
ل حق کی متعدد تصانیف میں سے "ہدیہ سعیدیہ" روض المجود وغیرہ مشہور ہیں۔

ہند و پاکستان پر انگریزوں کا پورا تسلط ہونے کے باوجود علوم معارف اسلامیہ کی شمع ٹمٹماتی رہی اور علماء اسلام نیز ملت اسلامیہ
پی بے بضاعتی اور محدود وسائل کے باوجود علوم معارف اسلامیہ کی بڑی خدمت کی۔ علماء اسلام نے انفرادی و اجتماعی طور سے اپنی ذمہ داری
س کیا۔ عیسائیوں نے ملک میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے چرچ، بائبل سوسائٹیز، اسپتال اور بہت سے ادارے کھولے، علماء اسلام نے
میدان میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انگریزوں کے سیاسی استیلاء اور عیسائیت کے مقابلے میں جماعت مجاہدین نے جن کو عرف عام میں "وہابی" کہا
ا ہے بڑا کام کیا۔ جماعت مجاہدین کے دو مشہور مرکز دہلی اور صادق پور (پٹنہ) میں تھے۔ اکابر دہلی نے سید احمد شہید، اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی
مانا خرم علی، اور مولانا سخاوت علی وغیرہ مشہور ہیں ان سب کی اسلامی تعلیمات پر متعدد کتابیں ہیں۔ مولانا شاہ محمد اسمعیل کی "تقویۃ الایمان"
مولانا خرم علی کی "نصیحت المسلمین" شہرۂ آفاق ہیں۔ علماء صادق پور میں مولوی احمد اللہ، مولوی یحییٰ، مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی
ت مشہور ہیں۔ آخر الذکر دونوں حضرات کے متعدد اصلاحی رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

جماعت مجاہدین کا بنگال میں بھی بڑا اثر تھا اور ان کے چھوٹے چھوٹے مراکز ماچ محل اور مالدہ وغیرہ میں تھے، اس علاقہ میں بڑا کام مولانا
یت علی نے کیا ہے۔ وہ نامور عالم، محدث، مصنف اور مبلغ تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ پر بنگال میں لاکھوں آدمی مسلمان ہوئے اور بہت سی کتابیں

ان کی تصنیف ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانہ کی مشہور فرائضی تحریک سے اختلاف بھی کیا تھا۔ جماعت مجاہدین کے دوسرے ایک رکن بہادر علی حسینی کے فرزند مولوی سید عبداللہ تھے۔ جنہوں نے ہگلی میں لوہے کا ایک مطبع قائم کرکے بہت سی علوم اسلامیہ کی کتابیں چھاپیں اور شائع کیں وہ خود بھی کئی کتابوں کے مصنف و مترجم تھے، اسی زمانہ میں عیسائیت کے رد میں مولانا رحمت اللہ خاں کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی عبد المنصور دہلوی مشہور ہیں، مولانا کیرانوی کی "ازالۃ الاوہام" مشہور تصنیف ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ بعض علماء نے زمانۂ جدید کی ضروریات کے پیش نظر " ندوۃ العلماء " کی تشکیل کی اور اس میں ضروریات زمانہ کو ملحوظ خاطر رکھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی معتمدی کے زمانہ میں اس میں بہت سی اصلاحات کیں۔ مولانا شبلی نے اپنے آخر زمانہ میں ایک مستقل تحقیقی اور علمی ادارہ " دارالمصنفین " قائم کیا۔ جس نے تاریخ اسلام، تاریخ ہند اور ادب وغیرہ پر بڑی گرانقدر تصانیف شائع کی ہیں۔ مولانا شبلی کے بعد اس کے سربراہ علامہ سید سلیمان ندوی مقرر ہوئے تھے۔ ان کے زمانہ میں اس ادارے نے بڑی ترقی کی اور حقیقت یہ ہے کہ آج تک اس کی ٹکر کا کوئی ادارہ وجود میں نہ آسکا۔ " معارف " اس کا ماہانہ رسالہ ہے، یہاں مولانا شبلی کی " سیرت النبی " کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ سیرت پاک پر آج تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کی تکمیل میں ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

انہی کے نقش قدم پر ۱۹۴۰ء میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمٰن وغیرہ نے دہلی میں " ندوۃ المصنفین " کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے نے بھی علوم اسلامیہ پر بڑی اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے ماہانہ " برہان " میں ماہ بہ ماہ علوم اسلامی پر بہت سے مقالے شائع ہوتے ہیں۔

آخر میں ہم مشہور اسلامی ریاست حیدرآباد دکن کی ان خدمات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں جو اس نے معارف اسلامیہ کی ترویج و اشاعت میں انجام دی ہیں۔ " دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ " " کتب خانہ آصفیہ " دائرۃ المعارف " اور فقہ اہل بیت " خاص ادارے تھے، جن کی وجہ سے تفسیر، حدیث، فقہ، اسماء الرجال، علم الکلام، سیرت، تاریخ اسلام، اور فلسفہ و حکمت وغیرہ پر بیشتر کتابیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ ہوئیں۔ اس کے علاوہ ریاست کی طرف سے ہندوستان میں بہت سے علماء کو وظائف دئے جاتے تھے تاکہ وہ اطمینان سے تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھ سکیں۔

محمد زکریا مائل

محمد بن طفیل الاندلسی

اسلامی دنیائے ادب و فلسفہ کی اس مشہور و معروف شخصیت کا پورا نام "ابوبکر محمد بن عبدالملک بن محمد بن محمد بن طفیل الاندلسی ہے، وطنی اعتبار سے انہیں "قرطبہ" اور "اشبیلیہ" کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اسی لئے وہ کبھی "قرطبی" اور کبھی اشبیلی کہلاتے ہیں اور اندلس کے مشہور قبیلہ "قیس" سے منسوب ہیں۔

ان کی ولادت بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی۔ "غرناطہ" میں طبابت کا شغل تھا۔ کچھ مدت کے بعد اسی صوبہ کے حاکم نے انہیں اپنا معتمد بنا لیا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ان کی شہرت کے پر لگ گئے اور ان کے ہم عصر ان کے فضل و کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر جب ۵۵۸ھ (۱۱۶۳ء) میں ان کی رسائی ابو یعقوب تک ہوئی تو یہ اس دور کے ممتاز اکابر میں شمار ہوئے۔ ابو یعقوب نے انہیں سر آنکھوں پر جگہ دی اور اپنے مخلص دوستوں اور مصاحبوں میں سب سے زیادہ امتیازی درجہ عطا کیا۔

ابو یعقوب یہ ابو یعقوب وہی ہیں جن کا نام اسلامی اندلس کی تاریخ میں "یوسف بن عبدالمومن" ہے اور ابو یعقوب کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد "حکومت موحدین" کے بانی تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ابو یعقوب "سبتہ" اور طنجہ کے حکمراں ہوئے اسی زمانے میں انہوں نے ابن طفیل کو اپنا سکرٹری یا معتمد، مصاحب خاص اور طبیب مقرر کیا۔ وہ ابن طفیل کی کسی رائے کے خلاف نہ کرتے اور نہ ان کے کسی مشورے کو رد کرتے۔

یہ "ابو یعقوب" ایک شائستہ، خیر اندیش اور مثالی حاکم تھے۔ انہوں نے اپنے درباریوں میں بڑے بڑے ذی عقل اور صاحب فکر و رائے اشخاص کو جمع کر رکھا تھا۔

"المراکشی" نے ابو یعقوب کے جو اوصاف لکھے ہیں ان میں اور خوبیوں کے علاوہ اس کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے کہ ابو یعقوب بڑے خوش بیان اور شیریں زبان شخص تھے۔ ان کی صحبت بڑی خوش گوار اور پاکیزہ تھی وہ فصحائے عرب کے طرز بیان سے سب سے زیادہ واقف تھے۔ انہیں اہل عرب کے اخبار و احوال سب سے زیادہ یاد تھے اور عربوں کے زمانہ جاہلیت و اسلام کے تاثر کا نہایت اچھا علم تھا۔

ابو یعقوب نے یہ کمالات اسی زمانے میں حاصل کر لئے تھے جب وہ اپنے والد کی زندگی میں اشبیلیہ کے حاکم تھے وہ اس وقت تک

علوم لغت ونحو وقرآن کے متعدد اکابر سے مل چکے تھے ۔

بقول المراکشی ابو یعقوب کی حکومت بڑے رعب وادب اور طنطنے کی حکومت تھی وہ بڑے سخی وفیاض اور بلند ہمت فرماں روا تھے رعایا ان کے عہد حکومت میں بڑی مرفہ الحال تھی ۔ ان میں مال ودولت کی ریل پیل تھی ۔ ہر طرف امن وامان اور سکون واطمینان کا دور دورہ تھا ۔ اس کے ساتھ ہی ابو یعقوب علم ادب ، نحو اور فن لغت میں ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے ، ان علوم میں ماہر ہونے کے بعد ان کے حوصلوں نے انہیں فلسفہ سیکھنے پر مائل کیا اور اب انہوں نے اس علم کی کتابیں جمع کرنے کا حکم دیا ۔ چنانچہ ان کے یہاں فلسفہ کی اتنی کتابیں جمع ہو گئیں کہ ان کا ذخیرہ المستنصر باللہ اموی کے ذخیرۂ کتب کے قریب قریب ہو گیا ۔ وہ اندلس اور مغرب کے علاقوں سے کتابیں جمع کرنے میں برابر مصروف رہے جس کے نتیجے میں ان کا کتب خانہ اتنا بڑھ گیا کہ مغرب کے فرمانرواؤں میں کسی کے یہاں پہلے اتنا بڑا کتب خانہ جمع نہ ہوا تھا ۔

ابن طفیل کے فضائل

المراکشی کا بیان ہے کہ جو لوگ ابو یعقوب کے مصاحبین میں شامل تھے ان میں ابو بکر محمد بن طفیل بھی تھے جو مسلمان فلاسفہ میں نظر امتیاز سے دیکھے جاتے تھے ۔ انہوں نے فلسفے کے تمام شعبوں کی تحقیق کی تھی اور محققین کی ایک جماعت سے یہ علم حاصل کیا تھا ۔ المراکشی کہتے ہیں " میں نے ابن طفیل کی کئی کتابیں فلسفۂ طبیعیات والہیات وغیرہ کے موضوع پر دیکھی ہیں ۔ جو رسائل علوم طبیعی پر لکھے ہیں ان میں ایک رسالہ " رسالہ حی بن یقظان " کے نام سے ہے اس رسالہ کا مقصود نوع انسانی کی ابتدا کا حال اپنے مذہب واعتقاد کے مطابق بیان کرنا ہے ۔ یوں تو یہ رسالہ مختصر ہے مگر فوائد ومعلومات کے اعتبار سے بہت بڑا ہے ۔ الہیات کے موضوع پر ان کا ایک رسالہ " رسالۃ فی النفس " بھی ہے ۔ میں نے یہ رسالہ انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے ۔ ابن طفیل نے اپنی عمر کا آخری حصہ الہیات ہی کے لئے وقف کر دیا تھا ، اس کے سوا باقی تمام علوم سے صرف نظر کر لیا تھا ۔ وہ حکمت اور شریعت کی تطبیق پر بہت حریص تھے ان کی نظر میں ظاہری وباطنی اعتبار سے نبوت کے معاملات کی بڑی عظمت تھی ، اور یہ سب کا ہر وہ علوم اسلامیہ کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ کرتے رہتے تھے " ۔

المراکشی ہی کا یہ قول بھی ہے ۔

> " امیر المومنین ابو یعقوب کو ابن طفیل سے انتہائی محبت تھی ، وہ انتہائی شوق اور شغف کا رنگ اختیار کر گئی تھی ۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ابن طفیل کے ساتھ اپنے قصر میں کئی کئی دن شب وروز رہا کرتے تھے اور انہیں دنیا کے اچھے ساز وسامان اور لطیف نعمتوں میں سے شمار کرتے تھے "

ابن طفیل کے بعض منتخب اشعار

المراکشی نے ابن طفیل کے چند اشعار کا انتخاب بھی دیا ہے جن سے ان کے شاعرانہ انداز فکر پر روشنی پڑتی ہے ۔ یہاں ان کے چار شعر درج کئے جاتے ہیں جو " زہد " کے موضوع پر کہے ہیں ۔

یاباکیاً فُرقَۃَ الاحبابِ عن شَحَطٍ هَلاَّ بَکَیتَ فِراقَ الرُّوحِ لِلبَدنِ

(اے ، دوری کی وجہ سے احباب کی جدائی پر رونے والے ، کیا تو بدن کے لئے روح کے فراق پر نہ روئے گا ــــ)

نُورٌ تَرَدَّدَ فی طِینٍ اِلیٰ اَجلٍ فَانحَازَ عُلواً وَخَلَّی الطِّینَ لِلکَفَنِ

(یہ روح) کا ایک نور تھا جس نے ایک مقررہ وقت تک مٹی میں آمدورفت رکھی پھر وہ بلندی کی طرف مائل ہو گیا اور اس مٹی کو کفن کے لئے چھوڑ گیا)

یا شدۃ ما افترقا من بعد ما اعتنقا　　اظنہا ھزنۃ کانت علی دخن

(ان دونوں (دولہا دلہن) کے ملاپ کے بعد یہ جدائی کس درجہ شدید ہے! میں تو ایسا خیال کرتا ہوں کہ ان کی یہ مصالحت مکر و فساد پر مبنی تھی)

ان لم یکن فی رضا اللہ اجتماعھا　　فیا لھا صفقۃ تمت علی غبن

(اگر دونوں کا اجتماع اللہ کی رضامندی میں نہ ہو تو ایسے سودے پر کتنا افسوس ہے جو نقصان پر طے ہوا ہو ———)

ابن طفیل اور ابن رشد

ابن رشد کو سلطان ابو یعقوب کے یہاں پہنچانے کا سہرا ابن طفیل ہی کے سر تھا۔ المراکشی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

"یہی ابوبکر (ابن طفیل) سلطان کے پاس علماء کو تمام اطراف سے لے جاتے"

"سلطان کو ان کے حالات سے آگاہ کرتے اور علماء کی تعظیم و تکریم اور قدر دانی پر ابھارا کرتے۔ انہیں نے سلطان سے ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد کا تعارف کرایا اور ان کا اعزاز و اکرام کرنے پر توجہ دلائی۔

"ابن ارشد نے خود کہی یا بیان کیا کہ جب میں امیر المومنین ابو یعقوب کے یہاں گیا تو میں نے دیکھا کہ ان کے پاس صرف ابوبکر بن طفیل ہیں۔ ان دونوں کے سوا کوئی اور نہیں۔ مجھے دیکھ کر ابن طفیل میری تعریف کرنے اور میرے اشعار سنانے لگے میرے اسلاف کا حال بیان کرنے کے علاوہ اپنی مہربانی سے میری نسبت بہت سی ایسی باتیں کہیں جو میرے اندازہ سے زیادہ تھیں۔"

ابن ارشد نے اسی سلسلے میں اور واقعات بھی بیان کئے جو بہت دلچسپ ہیں اور جنہیں المراکشی نے ابن رشد ہی کے الفاظ میں نقل کیا ہے ۱۔

"امیر المومنین نے میرا اور میرے باپ کا نام اور نسب پوچھنے کے مجھ سے سب سے پہلی بات یہ کی۔

——— آسمان کے بارے میں فلسفیوں کی کیا رائے ہے؟ ۔ وہ قدیم ہیں یا جدید ———؟

اس موقعہ پر مجھے حیا اور خوف نے گھیر لیا میں نے ٹالنے کی کوشش کی اور علم فلسفہ کے ساتھ اپنی شغل اور شغف سے انکار کیا ابن طفیل نے امیر المومنین سے میری نسبت جو کچھ طے کر رکھا تھا اس سے میں واقف نہ تھا امیر المومنین نے میرے خوف اور حیا کو سمجھ لیا اب وہ ابن طفیل کی طرف متوجہ ہوتے اور جس مسئلے کو مجھ سے پوچھا تھا اس پر کلام کرنے لگے اس ضمن میں ارسطا طالیس، افلاطون اور تمام فلاسفہ نے جو کچھ کہا تھا اس کا ذکر کیا ساتھ ہی اہل اسلام نے ان کے خلاف جو حجت قائم کی تھی اسے بیان کیا اس طرح مجھے ان کے نہایت گہرے اور سیر حاصل حافظے کا اندازہ ہوا اور میں نے خیال کیا کہ اس فن میں مشغول رہنے والوں میں سے کسی کی یادداشت اتنی قوی نہ ہوگی۔ وہ اسی طرح برابر مسئلہ کی توضیح کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے بھی اپنی معلومات بیان کرنا شروع کیں جن سے انہیں میرے مبلغ علم کا اندازہ ہو گیا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو انہوں نے حکم دیا کہ مجھے نقد انعام بڑھیا خلعت اور گھوڑا دیا جائے۔ . . . . . . شلہ

ؔلہ یہ مضمون مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ میرے کاغذات میں کھو گیا۔ تاہم اتنا حصہ بھی منفعت سے خالی نہیں۔ مالا یترک جلہ لا یترک کلہ
(محمد زکریا مائل)

۵
آزمودہ دواؤں کا مرکب
انالجین
سر درد - کمر کا درد - دانت کا درد
ایام - انفلوئنزا اور ہر قسم کے دوسرے درد کے لئے
یقینی زود اثر اور بے ضرر علاج ہے
Opal

محمد نعیم ندوی صدیقی (اعظم گڈھ)

کیا تجارتی سُود جائز ہے؟

(قرآن کی روشنی میں)

فرمان نبوی ہے۔

ان بین یدی الساعۃ ایاما یرفع فیھا العلم و ینزل فیھا الجھل۔

(بخاری کتاب الفتن)

بلاشبہ قیامت سے پہلے ایک ایسا زمانہ آئے گا جب علم اٹھا لیا جائے گا اور جہالت کا ہجوم ہو جائے گا۔

آج زمانہ کا پہیہ جس تیز رفتاری سے گردش کر رہا ہے اس کے ساتھ مذکورہ بالا ارشاد نبوی کی حقیقت کتنے نمایاں اور جلی عنوانات کے ساتھ سامنے آتی جا رہی ہے، علم حقیقی سطح عالم سے مفقود ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ جو ترہات علم و آگہی کے نام سے منظر عام پر آتی جا رہی ہیں، وہی آج کی جدید تہذیب کی پروردہ انسان کی "معراج" ہیں۔

دیکھئے ——— کتاب اللہ دین و اخلاق کا ایک کامل اور منضبط قانون ہے جس میں بنی نوع انسان کی دنیوی اور اخروی فوز و فلاح کے ہر طریقہ کار کی رہنمائی بڑے ہی حکیمانہ اور دلنشین الفاظ میں کی گئی ہے، معاشرہ انسانی کا کوئی شعبہ ہو، خواہ اس کا تعلق اجتماعیات سے ہو یا اخلاقیات سے، عقائد سے ہو یا عبادات سے، معاملات سے ہو یا حقوق و آداب سے، غرض ان سب پر اس نے سیر حاصل بحث کر کے قرآنی زندگی کو اختیار کرنے پر ابھارا ہے، دنیا کا کوئی قانون اور کوئی مذہبی کتاب اس کی نظیر و مثیل پیش کرنے سے قاصر ہے، قرآن نے تو اپنے عہد کی سب سے بڑی زباندان قوم عرب کو ببانگ دہل یہ چیلنج دیا تھا "فاتوا بسورۃ من مثلہ" لیکن ——— فصحاء عرب بھی اس کھلے ہوئے چیلنج کو قبول کرنے سے عاجز اور درماندہ رہے اور قرآن کی معجز نمائی و اثر انگیزی کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے۔

خدائے عز و جل نے ان ھو الا ذکر للعالمین فرما کر قرآن کو سارے جہان کے لئے نصح و ہدایت کا منبع قرار دیا ہے

ن پھر ھدی للمتقین کی تخصیص بھی کر دی، یعنی یہ کتاب انہی کے لئے "ذکر" ہے جن کے قلوب طلب صادق کی نعمت سے سرشار ہیں اور
منا و اطعنا کا جذبہ ان کے رگ و پے میں ساری ہے، پھر دیکھئے کلام اللہ کا ایک ایک لفظ سے ان کے دل و دماغ پر کیسے کیسے
،ے کھلتے ہیں اور ان پر ابتہاج و اہتزاز کی کیفیت طاری ہوتی ہے ۔

ورنہ پھر ——————— بقول ابو المعالی صاحب برہان

"اگر کسی کے دل میں بدعت، تکبر، خواہش نفسانی اور دنیا کی محبت موجود ہے یا وہ گناہ کا عادی
ہے یا ایمان کمزور ہے یا تحقیق کا مادہ کم ہے، غیر مستند لوگوں کی تفسیر قبول کر لیتا ہے، تو نہ وہ قرآن
سمجھ سکتا ہے اور نہ اس پر اس کے اسرار کھل سکتے ہیں ——"

علامہ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں اس قول کو نقل کر کے آیت ساصرف عن آیتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق
،استدلال فرمایا ہے اور پھر اس کی تفسیر میں سفیان بن عینیہ کا یہ قول نقل کیا ہے،

"ایسے لوگوں سے فہم قرآن چھین لی جاتی ہے[1]"

مطلب یہ ہے کہ جب انسان دانا اور چشم بینا رکھنے کے باوجود اس کتاب مبین میں غور و فکر
ے کے بجائے اس کی تعلیمات کو اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق استعمال کرنے کے لئے تاویلات باطلہ سے کام لینے لگتا ہے تو اس کے دل و
غ پر مہر ثبت کر دی جاتی ہے اور فہم قرآن کی نعمت عظمیٰ سے محروم کر دیا جاتا ہے، وذلک هو الخسران المبین ۔

مذکورہ بالا تمہید کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے دور حاضر کا سرسری جائزہ لیجئے تو ——— ——— معلوم ہو گا کہ حقیقی حاملین
علم و آگہی یوماً فیوماً صفحۂ ہستی سے اٹھ کر یرفع فیھا العلم کو پایۂ ثبوت تک پہنچا ئے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ایک نئی نسل
ن جا رہی ہے جو "اجتہاد و امامت" کا لبادہ اوڑھ کر دین قیم کے روشن جبین چہرہ کو اپنی نت نئی "ریسرچ اور تحقیقات" کے نام پر
غ کر کے ینزل فیھا الجھل پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے، اسلام کے وہ مسلمہ اصول و عقائد جو تواتر علمی اور تواتر عملی کے ساتھ
ت میں معمول بہا رہے ہیں، عہد حاضر کے "متجددین اور مجتہدین" کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بنے ہوئے ہیں ۔

چنانچہ حرمت سود کے سلسلہ میں قرآن نے جس صراحت ——— سے کام لیا ہے وہ ہر جہت سے ظاہر و منکشف ہے اس مسئلہ
علمائے اسلام نے بہت کچھ لکھ کر موجودہ دور کے بہروپ مسلمانوں کے لئے راہیں ہموار کر دی ہیں، اور بہت سے ارباب فہم و دانش
مذ احقاق حق میں سرگرم ہیں، راقم الحروف کا مقصود اس مختصر مضمون میں صرف ایک نئی "تحقیق" کی حقیقت کو مفسرین امت کے اقوال
روشنی میں واضح کرنا ہے اور بس ۔

بعض متشککین کا خیال ہے کہ حرمت سود کے سلسلہ کی اساسی آیت احل اللہ البیع وحرم الربا خدائے تعالیٰ کا قول نہیں ہے
بعض لوگوں[2] نے تادیل کر کے بیع و ربا کو مماثل قرار دینے کی کوشش کی الہی کے قول (انما البیع مثل الربا کا تتمہ و تکملہ ہے) اور احلال ربا
مطلق حرمت پھر کسی بھی آیت سے ثابت نہیں ہوتی، یا تو وہ حرمت اضعافاً مضاعفۃً سود تک محدود رہ جائے گی یا مہاجنی و صرفی سود تک

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ج ۲ ص ۱۸۱ [2] کتب تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ قبیلہ بنی ثقیف کے تجار تھے (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۴ ۵)

ربا آخر ـــــــ نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ معمولی شرح سود، بینکنگ انٹرسٹ اور تجارتی سود کا جواز باقی رہ جائے گا (ھذا مرادھم)۔

اولاً یہ خیال ہی سراسر کج فہمی پر مبنی ہے کہ آیت زیر بحث کی تاویل کرنے والوں کا قول ثابت ہو جانے کے بعد حرمت ربا کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی ثانیاً سلف سے خلف تک تمام اکابر مفسرین نے اس آیت کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے بصراحت اسے قول باری تعالیٰ ہی تسلیم کیا ہے، ہاں ـــــــ آٹھویں صدی کے امام ابوحیان اندلسی اور تیرہویں صدی کے علامہ آلوسی کے یہاں خفیف سا ذکر اس بات کا ضرور ملتا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک دوسرے مفہوم کا بھی "احتمال" ہے لیکن ہر دو حضرات نے پھر خود ہی اس قول کو مرجوح قرار دیکر بڑے شد و مد کے ساتھ اس کی تردید بھی کر دی ہے[1]۔

محمد بن جریر طبریؒ چوتھی صدی کے مشہور جلیل القدر مفسر گذرے ہیں، جن کی شہرہ آفاق تفسیر جامع البیان تفسیر القرآن کے متعلق حاجی خلیفہ نے امام نووی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

اجمعت الامۃ علی انہ لم یصنف مثل تفسیر الطبری[2]

امت کا اجماع ہے تفسیر طبری کے مثل اب تک کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

آیت زیر بحث کے ذیل میں علامہ طبری رقمطراز ہیں۔

فقال اللہ تعالیٰ لیست الزیادۃ من وجہ البیع نظیر الزیادۃ من وجہ الربا لانی احللت البیع وحرمت الربا والامر امری والخلق خلقی اقضی فیھم ما اشاء[3]

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بیع کی زیادتی اس زیادتی کے مماثل نہیں ہے جو ربا میں حاصل ہوتی ہے اس لئے کہ میں نے بیع کو حلال اور ربا کو حرام قرار دیا[4]۔ اور (ظاہر ہے) حکم میرا ہی نافذ ہوگا کیونکہ تمام مخلوق میرے ہی تحت ہے، میں ان میں جو فیصلہ بھی چاہونگا نافذ کرونگا

امام فخرالدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ اپنی مشہور و معروف تفسیر میں ارقام فرماتے ہیں۔

اما اکثر المفسرین فقط اتفقوا علی ان کلام الکفار انقطع عند قولہ انما البیع مثل الربا واما قولہ احل اللہ البیع وحرم الربا فھو کلام اللہ تعالیٰ ونصہ علی ھذا الفرق ذکرہ ابطالاً لقول الکفار

اکثر مفسرین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ کفار کا قول انما البیع مثل الربا پر ختم ہوگیا اور احل اللہ البیع وحرم الربا اللہ تعالیٰ کا قول ہے جو اس فرق پر نص صریح ہے اور جسے کفار کے قول انما البیع مثل الربا کو باطل کرنے کے لئے ذکر کیا ہے اور اس

(صفحہ ۳۳ کا حاشیہ) اس خود ساختہ مفہوم کے بعد آیت کا مطلب یہ ہو جائے گا کہ "سود خواروں کا یہ دردناک انجام اس لئے ہوگا کہ انھوں نے کہا تھا کہ بیع و ربا میں درحقیقت کوئی فرق نہیں ہے جسطرح بیع میں زر خرید پر زیادتی جائز ہے اسی طرح اگر کسی کو مثلاً دس روپے دے کر اس سے زیادہ لے لے تو کیا فرق رہا، پھر اللہ نے بیع کو حلال اور ربا کو حرام قرار دیا" اب سوچئے اس مفہوم کے بعد اگلا جملہ فمن جاءہ موعظۃ من ربہ الخ کتنا بے ربط ہو جاتا ہے، فیا للعجب!

[1] البحر المحیط ص ۳۳۵/۲ و روح المعانی ص ۴۹/۳ [2] کشف الظنون ج ۱ ص ۳۳۲ [3] تفسیر ابن جریر ج ۳ ص ۶۴ [4] خدائے تعالیٰ نے بیع و ربا کے مماثل نہ ہونے کی توجیہ بیان نہیں فرمائی، مقصد یہ ہے کہ ہر انسان معمولی غور و فکر سے ہر دو معاملات کے واضح فرق کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

انما البیع مثل الربا و الحجۃ علی صحۃ القول وجوہ[1] قول کی صحت پر کئی دلائل ہیں

امام رازی نے اپنی بات کو مؤکد بنانے کے لئے تین دلائل پیش کئے ہیں جن میں دوسری اور تیسری دلیل بہت ہی وزنی اور ٹھوس ہے ہم طوالت کے خوف سے صرف انہی دونوں دلائل کا خلاصہ پیش کرتے ہیں ۔

۱ :- بیع وشرا کے تمام مسائل میں امت مسلمہ اسی آیت سے ہمیشہ استدلال کرتی رہی ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب انہیں اس آیت کے قول باری تعالیٰ ہونے پر یقین کامل رہا ہو ورنہ پھر ان کے لئے اس سے استدلال جائز نہ رہ جاتا ۔

۲ :- اللہ تعالیٰ نے اس جملہ کے فوراً ہی بعد فرمایا فمن جاء ہ موعظۃ من ربہ فانتھی فلہ ما سلف وأمرہ الی اللہ و من عاد فاولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون ، پس اس کلام کا مطلب یہ ہوا کہ جب کفار کے دلوں میں انما البیع مثل الربا کا شبہ پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے شبہ کو زائل اور ان کی مماثلت کو باطل قرار دینے کے لئے یہ جملہ ارشاد فرمایا ، اگر احل اللہ البیع (الخ) اللہ کا قول نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے شبہ کا جواب بھی موجود نہیں ، اور پھر فمن جاء ہ موعظۃ الخ اس جگہ پر مناسب و موزوں نہ ہوگا[2]

حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ تحریر فرماتے ہیں ۔

قیل لھم ھذا ربا قالوا سواء علینا ان زدنا فی اول البیع او عند محل المال فھما سواء فکذبھم اللہ تعالیٰ فقال واحل اللہ البیع وحرم الربا فمن جاء ہ موعظۃ من ربہ یعنی البیان الذی فی القرآن فی تحریم الربا[3]	ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ ربا ہے وہ جواب دیتے کہ چاہے بیع کے وقت زیادتی لے جاتے چاہے مدت ادائیگی آنے پر دونوں برابر ہیں پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا احل اللہ البیع وحرم الربا فمن جاء ہ موعظۃ من ربہ) یعنی قرآن میں تحریم ربا کے متعلق جو صراحت آئی ہے ۔

متذکرۃ الصدر تصریحات ان اکابر مفسرین سے منقول ہیں ، جن کے زہد و ورع ، دیانت ومتانت اور علم وفضل پر جمیع امت کا اجماع رہا ہے ، ان اقوال کی حیثیت ظاہر ہے "مشتے از خروارے" کی ہے ، ورنہ تطویل پر آ کر شوکانی ، خازن ، جصاص ، ابی السعود ، کشاف ، آلوسی اور ابوحیان جیسے دسیوں مفسرین کی آرا مزید ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں ۔

عہد حاضر کے جلیل المرتبت محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ اسی آیت کے تحت ارقام فرماتے ہیں ۔

قولہ تعالیٰ (احل اللہ البیع وحرم الربا) ھذا جواب عن قولھم (انما البیع مثل الربا) د حاصل الجواب انکم کیف حکمتم بالتوبۃ بین البیع والربا مع الفرق الجلی بینھما فالبیع	اللہ تعالیٰ کا قول احل اللہ البیع (الخ) تاویل کرنے والوں کے قول انما البیع (الخ) کا جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تم بیع اور ربا کو مساوی کیوں قرار دیتے ہو باوجودیکہ دونوں میں جلی فرق ہے ، پس بیع حلال ہے

---

[1] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵۲۵ [2] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵۲۵ [3] الدر المنثور ج ۱ ص ۳۶۵

حلال وارباحرامٌ ۔ اور ربا حرام ۔

علاوہ ازیں مسئلہ زیر بحث پر ایک اور حیثیت سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے ، یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ رموز الاوقاف یعنی کلام پاک میں آیات کے مابین وقف و وصل کی جو علامات پائی جاتی ہیں ان کا جاننا ہر قرآن کی تلاوت کرنے والے کے لئے انتہائی ضروری ہے ، اس علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ماہرین فن نے اس باب میں مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں ۔ امام سجاوندیؒ جنہوں نے رموز الاوقاف پر تفصیلی بحث فرمائی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک ورتل القرآن ترتیلاً کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کو حروف کی صحیح ادائیگی اور وقوف کا لحاظ رکھتے ہوئے تلاوت کیا جائے ۔

چنانچہ اگر تلاوت کلام پاک میں وقف و وصل کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو بسا اوقات آیت کا مفہوم و مطلب منشائے الٰہی کے خلاف ہو جائے گا ،

اس کے بعد غور کیجئے ——— کہ کلام پاک کے تمام متداول نسخوں میں انما البیع مثل الربا پر وقف لازم کی علامت " م " موجود ہے جس کا واضح اور بین مطلب یہ ہے کہ تاویل کرنے والوں کی بات یہاں پر تمام ہوچکی ہے اور مابعد کے جملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔

امام سجاوندیؒ اپنے مقدمہ میں وقف لازم کے متعلق لکھتے ہیں ۔

والوقف اللازم ھوالذی لو ترک یحصل فی المعنی شناعۃ مثل قولہ تعالیٰ وکذالک حقت کلمۃ ربک علی الذین کفروا انھم اصحاب النار ۞ فلو وصل یکون قولہ الذین یحملون العرش صفۃ لاصحاب النار[۲]	وقف لازم وہ ہے جس کے ترک کر دینے سے معنی میں خلل واقع ہو جاتا ہے ، جیسے قول خداوندی میں وکذالک حقت کلمۃ ربک الخ پر اگر وقف نہ کیا جائے تو مابعد کا جملہ الذین یحملون العرش اپنے ماقبل اصحاب النار کی صفت ہو جائے گا (العیاذ باللہ)

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ وقف لازم پر ٹھہرنا انتہائی ضروری ہے اور وصل کرنے کی صورت میں نہ صرف معنی میں خلل و شناعت واقع ہو جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی اس کے ڈانڈے شرک وکفر کی سرحدوں سے جاملتے ہیں ۔

لہذا انما البیع مثل الربا پر تاویل کرنے والوں کے قول کا خاتمہ ماننا لازمی ہے اور جملہ مابعد قول باری تعالیٰ قرار پاتا ہے ۔

یہ اشکال بھی بے وزن ہے کہ اگر آیت کا زیر بحث حصہ ارشاد خداوندی ہوتا تو اس کے ذکر کا مناسب محل و مقام وہیں تھا جہاں اضعافاً مضاعفۃً سود کی حرمت بیان کی گئی ہے ، در اصل بات یہ ہے ——— اہل نظر سے یہ امر مخفی نہیں رہ گیا ہے ربا کی حرمت دیگر محرمات کی طرح یک دم وجود میں نہیں آئی ، بلکہ معاشرہ کے اس گھن کے قلع قمع کرنے کے لئے بتدریج احکام کا نزول ہوا ہے ۔ وجہ یہ تھی کہ ربا یعنی سودی دادوستد اس وقت کی عرب معیشت کا جزو لاینفک بن گیا تھا ۔ لہذا حکمت خداوندی کا تقاضا یہی تھا کہ اولاً ان کے دلوں میں اس عنصر انسانی نظام کی قباحتوں اور مضرتوں کو جاگزیں کیا جائے ، چنانچہ سب سے پہلے اضعافاً مضاعفۃً (چند در چند) سود کی حرمت بیان کی گئی جو اس انسانیت کش رواج کا آخری مرحلہ تھا اس طرح سورہ آل عمران والی آیت حرمت سود کے سلسلہ کی سب سے پہلی آیت قرار پائی ۔

---

[۱] فیض الباری کتاب البیوع ج ۳ ص ۱۸۳ [۲] مقدمہ سجاوندی

چنانچہ مصر کے مشہور مفسر سید رشید رضا لکھتے ہیں :-

یا ایہا الذین آمنوا لا تاکلوا الربا الخ وھذہ آیۃ نزلت فی تحریم الربا المخصوص بھذا القید[1]

یا ایہا الذین آمنوا لا تاکلوا الربٰو آیت حرمت سود کے سلسلہ کی سب سے پہلی آیت ہے جس میں مخصوص یعنی چند در چند (اضعافاً مضاعفۃ) سود کی حرمت ہے۔

اور بالآخر جب سودی کاروبار خود اس معاشرہ کے نزدیک بھی ایک جرم عظیم کے مترادف سمجھا جانے لگا تو احل اللہ البیع (الخ) کے ذریعہ علی الاطلاق اس کی حرمت پر آخری مہر ثبت کر دی گئی، اس آیت کا قرآنی پس منظر یہی ہے کہ جو منشائے خداوندی کے عین مطابق ہے اور جیسا کہ اوپر وضاحت معلوم ہو چکا کہ جمیع مفسرین بھی اسی منشا و مقصد تک پہنچے ہیں، لہٰذا اس کے سوا تمام خود ساختہ مطالب باطل قرار پائیں گے!

علاوہ ازیں ربٰوا کی حرمت آیت مذکورہ بالا کے قول خداوندی ثابت ہونے یا نہ ہونے پر موقوف و منحصر نہیں بلکہ اس کی حرمت پر متعدد آیات عبارۃ النص اور دلالۃ النص کے ساتھ نیز احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی دال ہیں، تواتر عملی سے بھی یہی ثابت ہے جو بجائے خود ایک شرعی حجت ہے۔

اسی طرح شرعاً سود خواہ قلیل ہو یا کثیر دونوں کی حرمت یکساں ہے یہ خیال صریحاً غلط ہے کہ حرمت صرف چند در چند سود ہی تک محدود ہے، اضعافاً مضاعفۃ کی قید تو درحقیقت اتفاقی ہے احترازی نہیں جیسا کہ عرض کیا گیا کہ چونکہ حرمت سود کے سلسلہ کی یہ سب سے پہلی آیت ہے اس لئے اس میں اضعافاً مضاعفۃ سود کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ لیکن اس کے بعد والی آیات مثلاً سورہ بقرہ کی احل اللہ البیع (الخ) سے ربٰوا بلا کسی قید کے حرام قرار دیدیا گیا ہے۔

مفسر تھانوی علیہ الرحمۃ نے اپنی حکیمانہ نظر سے بہت پہلے ہی اس خطرہ کو تاڑ لیا تھا، چنانچہ انہیں کہنا پڑا۔

"خوب سمجھ لو بعض ہوا پرست اس قید سے جو احترازی نہیں ہے عام مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں ——"[2]

وقت کا ایک اہم فتنہ

خاتمہ کلام پر وقت کے ایک اہم فتنہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے متاثر کے نتیجہ میں یہ مضمون سپرد قلم کیا گیا ہے اور جس کی اجمالی جھلک میں نے مضمون کے آغاز میں بھی دکھانے کی کوشش کی ہے۔

آج —— مغربی تہذیب و تمدن اور افکار و عقائد کا سیلاب بلاخیز نئی نسل کو دین و مذہب سے کامل برگشتگی اور تنفر کی طرف بہائے لیئے جاتا ہے، اس کے ظاہری رنگ و روغن، غلبہ و استیلاء اور ترقی اور جگمگاہٹ سے مرعوب ہو کر مسلمانوں کا ایک گروہ مذہب کی جانب سے تشکیک و تذبذب میں مبتلا ہو گیا ہے وہ ایک طرف دینی اقدار کا دامن بھی تھام رکھنا چاہتا ہے، اور دوسری طرف تہذیب فرنگ بھی پوری طرح اس کے دل و دماغ پر مسلط ہے، لہٰذا اسے درمیانی راہ یہی نظر آتی ہے کہ مذہب اور اس لادینی تمدن میں سمجھوتہ کی سبیل پیدا کرے اور پھر —— اس کی ذہنی اپج دین کی قدروں کو مسخ کرنے میں مصروف عمل ہو جاتی ہے۔

---

[1] تفسیر المنار صفحہ ۱۱۳/۴ 　[2] بیان القرآن صفحہ ۵۶/۲

بے شک یہ ذہنیت اور مغربی تمدن سے مرعوبیت درحقیقت اسلام اور شیرازۂ ملی کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے، جو دین حنیف کے پیرواروں کو دعوت مبارزت دے رہا ہے، اور اگر ——— فی الواقع علمائے اسلام "ریسرچ اور تحقیق" کے پردہ میں مستور دجل و ہیں کے ان سیاہ چہروں کو بے نقاب کرنے کے لئے اپنی تمام استعداد اور توانائیوں اور مادی و روحانی قوتوں کے ساتھ میدانِ عمل میں نہ آئے ——— اندیشہ ہے کہ خطرناک اندازِ فکر جدید نسل کو کامل طور سے اپنی لپیٹ میں لے کر ان کو مذہب سے بالکل ہی بیگانہ بنا دے۔

قرآنی نظام کون و مکان اور عہد و زمان کی قیود سے بالاتر ہے، ایک بیدار قوم کے ہر ہر گام پر اس سے رہنمائی کا حصول ہی اس کی فلاح کی ضمانت ہے، زمانہ اپنی نوع بنوع کی اختراعات و اکتشافات میں کتنا ہی ترقی پذیر کیوں نہ ہو جائے، مگر ——— اس کتاب مقدس کا یہ اعجاز ہے کہ وہ تا قیام الساعۃ بنی نوع انسان کے لئے منبع ہدایت اور منبع نجات بنی رہے گی، معیشت و معاشرت کے ہر عقدۂ مشکل کی رہ کشائی اسی سے ممکن ہے، تاریخ کی کتنی قومیں جو وسائل معیشت کی ترقی پذیری میں عروج و کمال کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں، اسی کتاب سے روگردانی کی پاداش میں صفحۂ ہستی سے نسیاً منسیاً کر دی گئیں۔

اس لئے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اگر ہمیں فوز و فلاح کی راہوں پر گامزن ہونا ہے تو اسوۂ قرآنیہ کو من وعن معاشرہ انسانی میں نافذ کرنے کے لئے تگ و دو کرنا ہو گی، ورنہ ——— اس "الکتاب" کے کسی بھی فرمان پر (معاذ اللہ) فرسودگی یا کہنگی کا الزام عائد کر کے صرف نفسانیات اور "متاع قلیل" کی خاطر تاویلات فاسدہ اور تحریفات کاسدہ سے کام لینا درحقیقت خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہے اور کسی قوم یا فرد کا یہ وہ زیان و خسران ہے جو اسے ہر حیثیت سے دیوالیہ بنا دینے کے لئے کافی ہے۔

یاد رکھئے ——— عصر حاضر کی ستائی ہوئی انسانیت جس پر آج چاروں طرف سے خطرات و مصائب کی آندھیوں کی یلغار ہے اس کا مداوا یہی "آب نشاط انگیز" بن سکتا ہے اور اس کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو حسبنا کتاب اللہ وسنۃ رسولہ کا نعرہ ہی ساحل مراد تک پہونچا سکتا ہے۔

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

نکتہ چیں ہے غم دل

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے نقشہ پر پاکستان کا وجود اسلام کے مقدس نام پر ہوا تھا ——— وہی عہد صدیقی و فاروقی اور عہد عثمانی و مرتضوی والا اسلام، جبکہ دنیا کا چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ امن و سلامتی کا گہوارہ بنا ہوا تھا

اور ——— جب تحریک پاکستان کے قائدین نے اسلام اور اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کرتے ہوئے برصغیر کی ایک لادینی حکومت کو للکارا تھا اور اسلام کی فرمانروائی کے لئے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا تو چشم تصور نے اسی معیاری حکومت اور انہی شاہی حکمرانوں کا جلوہ دیکھا تھا اور ہر سچے مسلمان نے اپنے خوابوں کی دنیا میں ایک جنت تعمیر کر لی تھی، مگر ——— اس افسوسناک حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے قلم کا سینہ شق اور دل فرط رنج و الم سے پاش پاش ہوا جاتا ہے کہ حسین خوابوں کے وہ فلک رفعت محل کیا سے کیا ہوتے جا رہے ہیں؟

یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اسلام کا پودہ "سیاست حاضرہ" کی آندھیوں کی تاب لانے سے قاصر ہے

ی نہیں ——— اسلام کا پیغام ترہمہ گیر، زندہ جاوید اور ابدی وسرمدی ہے، اس میں ہر عصر و عہد اور مکان د
ان کی رہنمائی کی صلاحیت نہاں ہے۔

تاریخ کے صفحات سے اس قسم کے متعدد نظائر وشواہد پیش کئے جاسکتے ہیں کہ سیاست وجہانبانی کے خطرناک ترین موڑوں
اسلام رہنمائی کی شمع فروزاں لے کر نمودار ہوا ہے، سوچئے ——— آخر عہد بنی امیہ کی تیز و تند آندھیوں کے درمیانی
ملیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے کس طرح خلافت راشدہ کے چراغ روشن کئے٭ اور دنیا کو ایک مرتبہ پھر شادمانی وکامرانی سے ہمکنار کیا ہے

یہ ایک مسلمہ دعویٰ اور حقیقت ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی نظیر آج دنیا کا کوئی بھی ازم اور کوئی بھی ترقی یافتہ لادینی حکومت
پیش نہیں کرسکتی!

کاش ——— پاکستان کے ارباب حل وعقد اپنی فہم ودانش کا صحیح استعمال کرکے اللہ کے دین کے قائم کرنے کی سعادت
حاصل کرسکیں۔

٭ انشاءاللہ العزیز عنقریب ہی اس موضوع پر ایک مستقل مضمون قارئین "فاران" کی خدمت میں پیش کروں گا (ن۔ص)

اسعد گیلانی

تشنگی

چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھری ہوئی اس بستی میں یوں تو بہت سے انسان آباد تھے جو باہمی محبت، والفت اور نفرت وعداوت دونوں قسم کے تعلقات میں جکڑے ہوئے زندگی گذار رہے تھے لیکن ان میں دو چھوٹے چھوٹے بے خبر اور معصوم انسان تو آپس میں بہت ہی مانوس تھے گیارہ سال کا تمیر اور سات سال کی بشریٰ۔ دونوں بستی کے قریب کی چھوٹی چھوٹی پتھریلی اور چٹیل پہاڑیوں میں روزانہ بکریاں چرانے تھے۔ صبح سے شام تک بستی والوں کی طرف سے ان کی یہی ڈیوٹی تھی۔ کبھی کھجوریں کبھی پنیر اور کبھی ستو باندھ کر وہ ہمراہ لے جایا کرتے اور دن بھر فطرت کی گود میں اپنی بکریوں اور اپنے تھکے ماندے جسموں کے ساتھ پھرا کرتے۔

اس رفاقت نے ان میں بڑی الفت پیدا کر دی تھی۔ اکثر کسی روز دونوں میں سے کوئی ایک نہ جاسکتا اور گھر والوں کی طرف سے اُسے کسی دوسرے ضروری کام کے لئے روک لیا جاتا تو دوسرا ساری چٹیل وادی میں یوں پھرا کرتا جیسے خزاں دیدہ پتہ ہواؤں میں جھول رہا ہو۔ یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی نصف ہستی بکریوں کے ساتھ اور نصف ہستی کہیں اور ہوتی۔ اس کا ظاہری جسم بکریوں کے پیچھے بہکا بہکا تھکا تھکا کہیں جا رہا ہوتا اور دل و دماغ کھوئے کھوئے کہیں اور ہوتے۔

تمیر کو بشریٰ کی یہ ادا بہت پسند تھی کہ جب وہ بات کرتا تو وہ چپ چاپ حیرت زدہ، مبہوت، خاموش اور متحیر اس کی باتیں سنا کرتی۔ اس کی طرف خاموشی سے دیکھا کرتی۔ اس کے قریب رہنے کی کوشش کیا کرتی۔ جہاں وہ کھڑا ہوتا وہیں وہ کھڑی ہوتی۔ جو بات وہ کہتا اس پر اثبات میں گردن ہلا دیا کرتی اور اگر زبان سے تائید کرنی ہی پڑتی تو بھی اس کی تائید کرتی۔ وہ ہر معاملے میں اس کی خاموش لیکن دل کی گہرائیوں سے مؤید، ہمدرد اور ساتھی تھی۔ بشریٰ کو تمیر کی کہانیاں، اس کی دلچسپ بات چیت، اس کی خود اعتمادی، بے خوفی، اس کی شرافت اور لڑکیوں کی طرح اس کا شرمیلا پن بہت پسند تھا وہ اپنے دل میں اس کی الفت کا گہرا احساس رکھتی تھی جس کی گہرائی زیادہ تھی اور اوپر کی سطح پر وہ زیادہ نمایاں — نہیں تھی جس کی محبت کی جڑیں اس کی شاخوں سے زیادہ طویل تھیں جس کے دل کی خاموش الفت کو وہ خوب پہچانتی تھی جو تمیر کی آنکھوں سے جھلکتی، اس کی جھکی جھکی نگاہوں سے ٹپکتی اس کی چال ڈھال اور بات چیت سے نمایاں ہوتی اور وہ تمیر کے بارے میں بڑی ہی اطمینان بخش اپنائیت محسوس کرتی۔ اگر بشریٰ سے پوچھ لیا جاتا کہ پوری بستی میں اس کے خیال میں بہت ہی اچھا آدمی کون تھا تو شاید وہ فی الفور بول اُٹھتی — تمیر — سوچ سمجھ کر ممکن ہے وہ خاموش رہتی یا کچھ اور کہہ دیتی۔

انہیں ایک دوسرے سے دیر دیر تک باتیں کرنا بہت پسند تھا انہیں ایک دوسرے کے قریب قریب رہنا بھی بہت پسند تھا۔

انہیں باہمی چپکے چپکے ایک دوسرے کو بے مقصد دیکھتے رہنا بھی بہت بھاتا تھا۔ ان کی باتوں کے موضوعات بھی بڑے عجیب اور معصوم ہوا کرتے
موسم بہار میں کونجوں کی گزرنے والی ٹکڑیاں ان کی باہمی الفت کی کہانیاں۔ بیریوں کے موسم میں سرخ سرخ بیروں کے ڈھیر، کھجوروں کے جھنڈ
ور چشموں کی گنگناہٹیں، تالابوں میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں، گرمیوں میں سرخ سرخ آندھیاں اور بگولے، بستی کا سالانہ میلہ جس میں دور
دراز سے لوگ شرکت کے لئے آتے تھے۔ پھر چوریاں، ڈاکے، سانپ، جن اور بستی میں گھوڑوں کی دوڑیں، یہ سب ان کی گفتگو کے موضوع ہوتے
اور ایک ایک موضوع پر ہی گھنٹوں باتیں ہوا کرتیں۔

کبھی کبھی وہ آپس میں روٹھ بھی جایا کرتے لیکن وہ روٹھنا بس دو چار گھڑی سے زیادہ نہ ہوتا، پھر خود ہی دونوں میں سے کوئی ایک
کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر دوسرے کو متوجہ کر لیتا اور وہ بدمزگی خوش گواری سے بدل جاتی۔

دونوں میں ایک دوسرے کے لئے بڑی تشنگی تھی۔ باہمی ایک دوسرے کی باتوں کی تشنگی، قربت کی تشنگی، ایسا محسوس ہوتا کہ دو چشمے ایک
دوسرے کے پہلو میں بہہ رہے تھے، اور باہمی مل کر بہنے کے لئے اپنے اپنے کناروں کے درمیان بے تاب و مضطرب تھے، اس باہمی دلچسپی کے باوجود
ان کی تمنائیں بے نام سی تھیں، وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے اتنا لگاؤ کس لئے رکھتے ہیں، ایک دوسرے کو دیکھ کر ان کی آنکھوں
میں چمک کیوں آجاتی ہے۔

یوں عمیر کے کئی برس گذر گئے۔ بشریٰ ایک پوری خاتون بن گئی اور عمیر ایک تنومند جوان۔ دونوں کے شب و روز کے پروگرام بھی بدل گئے لیکن
دونوں کے باہمی تعلق خاطر میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ بلکہ الفت و محبت کے رشتے بھی جوان ہو گئے تھے اور جب تک دونوں دن میں ایک آدھ بار ایک
دوسرے کو دیکھ نہ لیتے۔ ان کی روحیں تشنگی محسوس کیا کرتیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ایک دوسرے کی رفاقت کے لئے یہ تشنگی بڑھتی ہی چلی گئی
اور جاہلیت کے اس دور میں ایسی تشنگیوں کے لئے آزادی و پرورش کے سارے مواقع بھی موجود تھے۔

پھر بستی میں ایک دعوت زور پکڑنے لگی۔ کوئی شخص کہہ رہا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی مالک نہیں ہے اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی آنے والی
ہے اور جو کام ہم یہاں کر رہے ہیں ان سارے کاموں کا حساب دوسری زندگی میں جا کر دینا ہوگا۔ بات بڑی عجیب اور حیران کن تھی۔ بستی کے اندر اس
دعوت کے نتیجے میں اعتراف، انکار اور شک و شبہات کی ملی جلی فضا بن گئی تھی، البتہ بستی کے چودھریوں کی طرف سے شدید مزاحمت شروع ہو گئی تھی۔

"دیکھو جی اپنے ہی قوم کو پھاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے" کسی ایک برادری کا چودھری بول اٹھتا۔

"معزز اور کمین رذیل کے امتیاز کو تباہ کیا جا رہا ہے" دوسرا کہتا۔

"لوہاروں اور موچیوں اور پست حیثیت لوگوں کو جمع کر کے کیا یہ ہمیں ہماری جگہ سے ہٹا دے گا؟" تیسرا کہتا

"یار تم اس کی باتوں میں زیادہ مداخلت نہ کرو۔ اس کی باتوں میں تاثیر کا کیا ٹھکانہ ہے" کوئی ایک اعتراف کے انداز میں کہتا

"بھائی میرے اگر تاثیر کا خطرہ ہے تو کانوں میں انگلیاں دے لیا کرو۔ ساحروں سے بچنے کی یہی واحد صورت ہے" آواز آتی
ساحر وہ نہیں ہے، نہ شاعر ہے، نہ کاہن ہے، نہ مجنوں ہے، اس کے کلام کی تاثیر تو ایک نامعلوم کیفیت ہے
جو عجیب کیفیت استاثر کی حامل ہوتی ہے"

"دیکھنا اس کے جال میں نہ پھنس جانا، جس نے بیٹوں کو باپوں سے کاٹ دیا ہے اور کمینوں کو شریفوں کے
برابر لا کھڑا کیا ہے" آواز آتی۔

اس طرح بستی میں اعتراف و انکار، ریب کی دھیمی اور ہلکی سی رو چل پڑی تھی۔ جس نے آہستہ آہستہ پوری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ بڑھ رہی تھی۔ پھیل رہی تھی۔ اور اس کے گھیرے میں بستی کا پورا ماحول آ گیا تھا۔ گھروں میں دسترخوانوں پر یہی موضوع تھا۔ مجلسیں تھیں اور بحث کا تراف، اور اظہار یا رفاقت کرنے والوں پر تشدد کے بادل امنڈنے لگے تھے اور جاہلیت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی!

تشنگی بھی عجیب چیز ہے یہ انسانی روح کے اندر تڑپ، طلب، آرزو، تمنا، لگن، جد و جہد، حسرت، اور محبت کا مرکب ہے جب کسی روح میں پیدا ہوتی ہے تو یہ ساری کیفیات اس کے پیچھے جھلکتی ہیں اور اپنے ہدف کے لئے اس کی بے چینی اسے پیہم مضطرب رکھتی ہے، کسی دیوانے کی تشنگی صحرا کی خشک پہنائیوں میں محمل کی تلاش میں بجھتی ہے۔ کسی کی تشنگی کچے گھڑے کی ہتھیلی پر جان رکھے ہوئے چناب کی تند لہروں میں ڈوب کر بجھتی ہے۔ کسی کی پیاس ریگستانوں کی گرم بالو پھانکتے ہوئے اونٹنی والے محبوب کی جستجو میں بجھتی ہے۔ کسی کی تشنگی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کی تسکین کے لئے آگ کے الاؤ میں اپنے محبوب کا نام لے کر کود جائے جو آگ کو بھی گل گلزار کر دے اور کسی کی تشنگی احد کے بیابانوں میں خوں چکاں زخموں کے ساتھ سربسجود ہونے سے بجھتی ہے اور عمیر کی تشنگی بشیر سے طویل طویل ملاقاتوں اور باتوں سے بجھتی تھی

لیکن عجیب واقعہ پیش آ گیا کہ عمیر بستی میں اٹھنے والی نئی دعوت سے متاثر ہو گیا۔ اعتراف، انکار و تذبذب کی ملی جلی کیفیات میں سے وہ کسی دلدل میں نہیں پھنسا۔ اس نے ایک بار معلوم کیا کہ کہنے والا کون تھا اور پھر یہ کہ وہ کیا کہتا تھا معلوم کرنے کے بعد اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ پھر اس میں شک ہی کیا ہے وہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ اس سے پہلے اس نے کب کوئی بات غلط کہی تھی جو یہ بات غلط ہو گی اور اس سے بڑی صداقت کیا ہو گی۔ کہ ہمارا پیدا کرنے والا ہی ہمارا حاکم ہے آخر دنیا میں کوئی چیز بھی تو پیدا کئے بغیر اپنے زور سے وجود میں نہیں آ گئی ہے اور جس نے اسے پیدا کیا ہے اس کا حق ہے کہ اپنی مخلوق کے لئے زندگی کا طریقہ مقرر کرے یہ تو سیدھی سچی بات ہے آخر دوسری زندگی میں حیرانی کی کیا بات ہے موسموں کے تغیر کے ساتھ زندگی کی مختلف انواع پلٹ پلٹ کر آتی ہی رہتی ہیں۔ پھولوں کے تختے مرجھا جاتے ہیں اور پھر لوٹ آتے ہیں سبزہ بیگانہ اپنا بانا تی فرش بار بار بچھاتا ہے پھر زرد ہو کر معدوم ہو جاتا ہے لیکن بارش کے چند چھینٹوں سے پھر اپنی سبز وردی پہنے ہوئے لوٹ آتا ہے۔ پھلوں کی لدی پھندی شاخیں پھلوں کے ٹوکرے دے دے کر تہی دامن رہ جاتی ہیں اور پھر دوسرے موسم میں پھلوں کے ڈھیر لئے ہوئے لوٹ آتی ہیں۔ سفید بادل برس برس کر چلے جاتے ہیں اور پھر دامانِ تر لئے ہوئے آ موجود ہوتے ہیں تو آخر کیا صرف انسان کے لئے ہی یہ مقدر ہے کہ وہ ایک بار جا کر دوبارہ نہ آ سکے اور اتنے عظیم کارخانے کے مالک کے لئے اپنے کارخانے کی بس اسی ایک مخلوق کو لوٹانا مشکل ہے۔ جو ہوا میں سے پانی برساتا ہے اور خشک لکڑیوں میں سے خوش نما پھول اور تر و تازہ پھل دیتا ہے اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے اور کیوں مشکل ہے" یہ ساری باتیں عمیر نے ایک مجلس میں صاف صاف کہہ دیں اور پھر اٹھ کر چلا گیا اس کے چہرے پر عزم کی روشنی تھی۔

"ابن عبداللہ بات سچ کہتے ہیں، مجھے ان کی باتوں پر حرف بحرف ایمان ہے"۔ عمیر نے اعتراف و اقرار کر لیا اور اس کے بعد اس کی کایا ہی پلٹ گئی وہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔

چودھریوں نے جب اپنی گرتی ہوئی کبریائی کا انتقام لینا شروع کیا تو اس کی لپیٹ میں عمیر بھی آیا اور زمانے کے ہاتھوں نے اسے بستی سے نکال کر پردیس میں پہونچا دیا۔ برسوں ہی اس نے انتقام حق لینے کے لئے اپنے سینہ کو تیروں کی ڈھال بنایا اس کی جد و جہد کا ہدف، اس کی کوششوں کا منتہا اور اس کی محبتوں کا مرکز وہ عظیم ہستی تھی جس کی لائی ہوئی عظیم صداقت کو اس نے سونے سے زیادہ قیمتی اور جواہرات سے زیادہ کھرا پا کر قبول کیا تھا۔ اس کی تشنگی کی سیرابی کے لئے اسے ایک چشمہ صافی مل گیا تھا۔

برسوں ہی تو گزر گئے، بالآخر وہ بستی مفتوح ہو گئی اور اس کی گلیوں نے اپنے بچھڑے ہوئے باسیوں کے فاتحانہ قدموں کے لئے اپنے سینے فراخ کر دئیے ایک مانوس گلی اور پرانی یادوں کی امین گذرگاہ سے عمیر گذر رہا تھا۔ جب اچانک بشریٰ اس کے سامنے آ گئی "میرے عمیر تم آ گئے" اور ایک چیخ نما سسکی لیتے ہوئے وہ اس سے لپٹ ہی تو گئی۔ عمیر کی آنکھیں امڈ آئیں اس کا دل دھڑکنے لگا لیکن اس نے نہایت آہستگی، نرمی اور ملائمت سے اسے اپنے سے علیحدہ کر دیا اور ضبط وتحمل کی قوت سے قدم آگے بڑھا دیا۔

حیرت واستعجاب سے بشریٰ ششدر سی رہ گئی۔ عمیر کی یہ تبدیلی اس کے لئے حیران کن تھی۔

"عمیر وہ تمہارا عشق کیا ہوا" بشریٰ نے اس کا دامن پکڑتے اور سسکی لیتے ہوئے کہا

"حق کے تابع ہو گیا" عمیر نے گردن موڑے بغیر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کہا

"اور وہ تمہاری تشنگی جو مجھ سے باتیں کئے بغیر کبھی نہ بجھتی تھی" بشریٰ نے پھر دہرایا

"حق کے چشمہ صافی سے بجھ گئی" جواب ملا

"کیا اب ہم تم ہمیشہ کے لئے اجنبی ہو گئے" بشریٰ نے کہا

"ہمارے درمیان کفر اور ایمان کی دیوار حائل ہے۔ زندگی کے تصور کی چٹان کھڑی ہے" عمیر نے کہا

"میں یہ دیوار گرا کر اور یہ چٹان توڑ کر تم تک پہنچ جاؤں گی" بشریٰ نے کہا

"بے شک حق کے چشمہ صافی پر سارے ہی تشنہ لبوں کی تشنگی کا سامان موجود ہے" عمیر نے کہا

"عمیر میں پہلے بھی ہمیشہ تمہارے ساتھ تھی اور اب بھی جہاں تم ہو گے مجھے وہیں پاؤ گے"

بشریٰ نے کہا اس کی آنکھیں نم آلود تھیں۔

"ہماری خوش بختی ہے" عمیر نے جھکی جھکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، اور پھر وہ آگے بڑھ گیا، اس کے چہرے پر مسرت وسکون کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

(صفحہ ۴۲ کا بقیہ)

وہ ان دونوں کے درمیان ایک سیدھی اور صحیح راہ پر گامزن رہتی ہے۔ (مگر افسوس) اس امت کے لئے یہ مقام حاصل کرنا اب اس لئے دشوار ہو گیا ہے کہ اس نے اس نظام حیات کو ترک کر دیا ہے جس کو اللہ نے اس کے لئے پسند کیا تھا۔ اب اس نے ایسے طریقہ زندگی اختیار کر لئے ہیں جن کو اللہ نے پسند نہیں کیا ہے اور اس نے ان مختلف رنگوں سے اپنے آپ کو رنگ لیا ہے جن میں سے کوئی بھی صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) نہیں ہے!!! اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتا ہے کہ وہ صرف اللہ کے رنگ میں رنگ جائے!!!

(فی ظلال القرآن - مجلد اول - طبع بیروت ۱۹۶۶ء)

از:- سید قطب شہید
ترجمہ:- السید حامد عبدالرحمٰن الکاف (جدہ)

امتِ وسط

وکذالک جعلناکم امۃً وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیداً۔

(البقرہ - ۱۴۳)

بلاشبہ یہ ایک ایسی امتِ وسط ہے جو لوگوں کے سامنے شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیتی ہے اور ان کے درمیان بے لاگ عدل اور انصاف قائم کرتی ہے اور ان کے لئے رد و قبول کے معیار اور چیزوں اور تصورات کو ناپنے تولنے کے پیمانے متعین کرتی ہے اور ان سب امور کے بارے میں ایسی رائے ظاہر کرتی ہے جو قابلِ اعتماد ہو۔ لوگوں کے درمیان ایسی اقدار اور ایسے تصورات اور ایسے رسم و رواج کو پروان چڑھاتی ہے جو فیصلہ کن اہمیت کے حامل ہوتے ہیں یہ ان سے کہتی ہے: یہ چیز حق ہے اور یہ چیز باطل ہے۔ یہ ایک ایسی امت نہیں ہے جو لوگوں سے اپنے تصورات اور اپنی اقدار اور اپنے رد و قبول کے پیمانے طلب کرتی ہو۔ درحالانکہ اس کا مقام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اسلامی تصورات اسلامی اقدار اور اسلامی رد و قبول کے پیمانوں سے روشناس کرائے، اور ان سب معاملات میں شہادتِ حق کا فریضہ انجام دے اور ان کے لئے راہِ عدل کو روشن کر دے۔ جہاں اس امت کو لوگوں کے لئے گواہ بنایا گیا ہے وہیں رسولؐ کو گواہ ٹھیرایا گیا ہے۔ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے لئے پسند و ناپسند کے معیار مقرر کرتے ہیں اور اس کے اعمال اور طور طریقوں کے بارے میں اپنا فیصلہ سناتے ہیں اور اس کی ہر چیز کو تولتے اور وزن کرتے ہیں جو اس سے صادر ہوتی ہے۔ غرض رسولؐ اس کے ہر قول اور ہر عمل کے بارے میں آخری اور فیصلہ کن رائے دیتے ہیں۔ یہیں سے اس امت کی حقیقت اور اس کی ذمہ داری ایک محدود اور متعین شکل میں ظاہر ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو پہچان سکے اور اس کو اپنے مقام اور اپنی ذمہ داری کا کما حقہٗ احساس ہو سکے اور اس کے نتیجہ میں وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے مناسب تیاری کر سکے۔

یہ سب باتیں ایک ایسی امت کے لئے ہیں جو ہر معنیٰ میں امتِ وسط ہے خواہ یہ معنی حُسن اور فضل کے ہوں یا اعتدال اور میانہ روی کے ہوں یا پھر مادی اور محسوس معنی میں وسط کے ہوں۔ یہ امت تصور اور اعتقاد میں امتِ وسط ہے........ نہ تو یہ روحانی تجرد میں غلو کی روش اختیار کرتی ہے اور نہ مادی گراوٹ میں انتہا پسندی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی فطرت کا اتباع کرتی ہے جس میں روح جسم کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے اور جسم روح کے ساتھ پیوست ہوتا ہے وہ اس مشترک ہیکل کے ہر جز کو اپنی توانائیوں کا مناسب حصہ دیتی رہتی ہے اور اس بات کے لئے کوشاں رہتی ہے کہ جہاں وہ زندگی کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرتی جائے وہیں اس زندگی کی حفاظت بھی کرتی رہے۔ وہ ان ساری سرگرمیوں کی باگ ڈور کو کسی افراط و تفریط کے بغیر چھوڑ دیتی ہے جو عالمِ شوق اور دنیا کے جذبات میں پائی جاتی ہے۔

——— یہ امت فکر اور شعور کے میدان میں بھی امت وسط ہے .... جو کچھ علم اس کو حاصل ہوا ہے
کو جمود کا شکار ہونے نہیں دیتی اور اپنے آپ پر علم و معرفت اور تجربے کے دروازوں کو بند نہیں کرتی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر چیخنے
ے کی پکار پر لبیک بھی نہیں کہتی ہے۔ اور نہ بندروں کی طرح نقالی کرنے کو اپنا شعار بنا لیتی ہے۔ بلکہ وہ ان تصورات اور اصولوں
مضبوطی سے تھامے رہتی ہے جو اس کے پاس موجود ہیں۔ اس کے بعد وہ افکار و تجربات کا بہ نظر غائر جائزہ لیتی ہے اس سلسلے میں اس کا
مسلک یہ ہوتا ہے کہ حقیقت مومن کی گم شدہ پونجی ہے اسے جہاں بھی پاتا ہے پورے یقین کے ساتھ لے لیتا ہے۔

——— یہ امت تنظیم اور تنسیق کے معاملہ میں بھی امت وسط ہے .... یہ زندگی کو نہ تو جذبات اور ضمیروں
والے کر دیتی ہے اور نہ اس کو قانون اور عقاب کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے۔ اس کے برخلاف وہ انسانی ضمیر کو تعلیم اور تہذیب کے
ہ بلند تر مقام تک پہونچانے کی کوشش کرتی ہے اور معاشرتی نظام کی کفالت اور حفاظت قانون اور عقاب کے ذریعہ کرتی ہے وہ ان
ں کو ایک خاص انداز سے شیر و شکر بنا دیتی ہے جس کے نتیجہ میں نہ تو لوگوں کی گردنوں پر قانون اور اقتدار کی تلوار مسلط کرتی ہے اور
کو وجدان اور ضمیر کی پکار کے حوالے کر دیتی ہے۔

——— یہ امت تعلقات کے دائرہ میں بھی امت وسط ہے .... یہ نہ تو فرد کی شخصیت اور اس کی خصوصیات
کالعدم قرار دیتی ہے اور نہ اس کی شخصیت کو جماعت یا ریاست کی شخصیت میں تحلیل کر دینا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ فرد کو ایک
جانور کی طرح آزاد بھی نہیں چھوڑ دیتی جس کے نزدیک اپنی ذات کے علاوہ کوئی چیز قابل التفات نہیں ہوتی بلکہ وہ ان جذبات
رتوں کا نشوونما کرتی ہے جو حرکت اور ترقی میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اور ان خصائص کو ابھارتی ہے جو اس کی شخصیت کو مستقل حیثیت
ہیں اس کے بعد وہ ایسی بندشیں قائم کرتی ہے جو انتہا پسندانہ رجحانات کو بے قابو ہونے سے روکتی ہیں اور ان سرگرمیوں کی نگہداشت
ہے جو فرد میں جماعت کی خدمت کا جذبہ پیدا کرتی ہیں اور اس پر ان فرائض کو واجب قرار دیتی ہے جو اس کو جماعت کا خادم
ہیں ——— اس طرح جماعت اور فرد میں توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

——— یہ امت جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے بھی امت وسط ہے .... یہ دنیا کے وسط میں پائی
ہے اور اس وقت تک وہ خطۂ ارض جس کو اسلام نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا دنیا کے بیچوں بیچ واقع ہے مشرق اور
ب کے درمیان اور شمال اور جنوب کے وسط میں۔ اب تک یہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز ہے اور یہ لوگوں پر اپنی نظریں جمائے
ہے۔ یہ لوگوں کو وہ کچھ دیتی رہی ہے جو اس کے پاس موجود ہے اور اسی کے راستوں سے گذر کر فکری، روحانی اور طبیعی
ار مشرق اور مغرب تک پہونچتی ہے اور وہ ان مختلف پیداواروں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔

——— باعتبار زمانہ بھی یہ امت امت وسط ہے .... انسانیت کی طفولیت کا دور اس کے نمودار
کے بعد ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ظہور پذیر ہونے کے بعد عقلی ہدایت کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور یہ بیچ میں کھڑی ہو کر
رف تو انسانیت کے دامن سے ان اوہام اور خرافات کے کانٹوں کو چھڑاتی ہے جو عہد طفولیت میں اس کے دامن گیر ہو
نہ تو دوسری طرف وہ اس کو عقل اور ہوائے نفس کے فتنوں سے بچاتی ہے، اس طرح ایک قسم کا توازن پیدا ہو جاتا ہے اس
ورثہ میں جو اس کو انبیاء کرام کے روحانی ادوار سے ملا تھا اور اس سرمایہ میں جو اس کو ترقی پذیر علم سے حاصل ہوتا رہتا ہے،

مولانا محمد مصطفیٰ (شارح قصیدۂ تائیہ فارضیہ)
کراچی

میر درد علیہ الرحمۃ اردو زبان کے خواجہ حافظ ہیں، تصوف و سلوک کے مضامین و حقائق آپ کے کلام میں نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، یہاں چند شعر تبرکاً نقل کرتے ہیں اور باوصف اپنی بے بضاعتی کے ان کی صوفیانہ شرح سپرد قلم کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اہل کمال اصلاح صواب اور دعائے خیر سے دریغ نہ فرمائیں گے،

۱؎ مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں		ہم آئینہ کے سامنے جب آکے "ہُو" کریں

فرماتے ہیں کہ جب ہم مرید (یا طالب مسترشد) کے آئینہ دل پر جس میں ماسوا کا عکس اور کثرت موہوم کی ظلمت ہوتی ہے "ھو" یعنی ذات بحت کے اسم مبارک کی ضربیں لگائیں تو بعونہ تعالیٰ فوراً ساری محبت غیر دور اور کثرت کی ظلمت کافور ہو جائے اور وحدت کے نور سے معمور ہو جائے۔
فی الواقع یہ کرامت ہے ان حضرات کی جو مسند ارشاد پر متمکن ہیں، صوفیانہ مضمون شاعرانہ زبان میں کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ سبحان اللہ اور دعویٰ متضمن، دلیل ہے کیونکہ آئینہ پر "ھو" کرنے سے تمام عکس جو اس میں پیشتر موجود تھے نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

۲؎ تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی		دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

تردامنی بمعنی آلودہ دامنی و گنہگاری، شیخ کا لفظ شعرائے متصوفین کے یہاں طنزاً زاہد خشک اور علمائے قشر کے لئے آتا ہے، فرماتے ہیں کہ شیخ صاحب میرے اعمال پر جو تنگ نظری کی وجہ سے جناب والا کو گناہ معلوم ہوتے ہیں نکتہ چینی نہ کیجئے، اگر میں اپنا دامن تر نچوڑ دوں تو معصوم اور پاک فرشتے بھی اس سے وضو کرنے لگیں۔
فرشتے اگرچہ معصوم ہیں، حدث و جنابت سے بھی پاک ہیں، لیکن نوری ہونے کی وجہ سے نار عشق سے محروم ہیں، یہ نار عشق اور یہ تردامنی محبت انسان اور محض انسان کامل کا حصہ ہے اور ع رشک صد سجدہ ہے اک لغزش مستانہ دل
شعر میں اظہار ہے کہ عشق حقیقی عبادت محض اور زہد بے کیف سے بمراتب افضل ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین نیکیوں کی نیکیاں مقربین کے گناہ ہیں۔
یہاں فقہی تلمیح بھی ہے کہ وضو کے لئے آب مطہر چاہئے، نہ آب نجس سے وضو ہو سکتا ہے نہ آب طاہر سے، پس جب دامن کے نچوڑے فرشتے وضو کرتے ہیں تو ثابت ہوا کہ اس میں نجاست کا شائبہ تک نہیں، پس اسی ضمن میں گناہ کی نفی بھی ہو گئی ——— اور اس جانب بھی اشارہ ہوا کہ عشق حقیقی مُطہر ہے۔

سے سرتا قدم زبان ہیں، جوں شمع گو کہ ہم — پہ یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

شمع کا سرتا قدم زبان ہونا بہت ظاہر ہے، اس کی لَو زبان ہے اور اس کے جسم کا ہر حصہ سر سے لے کر قدم تک آہستہ آہستہ زبان بنتا رہتا [ہے] یہاں تک کہ وہ منزل عدم کو سدھارتی ہے، شمع نے ایک آتشیں اور سوزش زبان پائی ہے تاہم مجال نہیں جو گفتگو کر سکے، یہی حال اولیائے کاملین [کا ہے]، کہ سرتا قدم زبان ہوتے ہیں لیکن لب پر مہر سکوت لگی ہوتی ہے کیا مجال اظہار اسرار ہو جائے چنانچہ کہا گیا ہے من عرف اللّٰہ کل لسانہ، [جس] نے خدا کو پہچانا وہ گونگا ہو گیا۔ کسی بزرگ کا شعر ہے سے

باتو خاموشم ولے با یادِ دوست — ہر سر مویم زبانے دیگر است

(ترجمہ) میں تمہارے ساتھ تو خاموش ہوں لیکن دوست کی یاد میں بدن کا ایک ایک رواں "زبان" بن گیا ہے، اس ذکر کو صوفیہ کی [اصطلا]ح میں "سلطان الاذکار" کہتے ہیں۔

"سرتا قدم زبان ہیں" اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ بوجہ علوم عقلیہ و نقلیہ و فنون فصاحت و بلاغت کے، یا بسبب آتش بیانی و [سوزِ] عشق کے . . . .

شعر میں ایک علمی لطیفہ ہے کہ شمع اگرچہ زبان قال سے اہل بزم کو مستفیض نہیں کرتی لیکن زبان حال سے تو ضرور ماحول پر روشنی ڈالتی ہے اسی [طرح] عارفین کاملین زبان حال سے ضرور ہدایت فرماتے ہیں کہ لسان الحال افصح من لسان المقال حال کی زبان قال کی زبان سے [ف]صیح ہوتی ہے سے

اُن کی صورت دیکھ کر آنے لگی یادِ خدا! — نورِ رُخ اُن کا چراغِ راہِ عرفاں ہو گیا

سے وحدت میں تیری حرفِ دوئی کا نہ آ سکے — آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

خدائے واحد ہر لحاظ سے بے مثل ہے قل ھو اللّٰہ احد، اور اس کی شان ہے لیس کمثلہ شیءٌ، حتیٰ کہ آئینہ میں بھی اس کا عکس نہیں آ سکتا [کیونکہ ا]س میں بھی نظیر ہونے کا شبہ اور شائبہ ہوتا ہے، اور ذات صمدیت اس سے منزہ ہے کہ اس کی یکتائی میں دوئی کی بو بھی ہو۔

آئینہ سے مراد عارفین کاملین اور انبیائے مرسلین کے قلوب مجلّا و مصفّا، مطلب یہ کہ ریاضت روحانی اور معرفت الٰہی کا مرتبہ اعلیٰ حاصل [کر کے] بھی کوئی اس کا مقابل نہیں ہو سکتا، بلکہ شرم و ندامت تقصیر عبادت کی وجہ سے یہی کہنا پڑتا ہے ما عرفناک حق معرفتک وما [عبدن]اک حق عبادتک اور لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علیٰ . . . . . ع خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست،

سے غافل خدا کی یاد سے ہرگز نہ بھولنا — اپنی تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

شعر بالا میں اشارہ تھا کہ معرفت الٰہی و ذکر خدا سے دل آئینہ صفت ہو جاتا ہے اس لئے اس نعمت کے حاصل کرنے کی ترغیب دیتے [ہیں۔] ذکر کے غلبہ سے ذاکر اور ذکر دونوں کالعدم ہو جاتے ہیں، محض مذکور ہی مذکور رہ جاتا ہے۔

سے وہ یاد ہے اس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو — حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا

(نوٹ) بعض نسخوں میں بجائے یاد سے ہرگز نہ بھولنا یا بھولنا ہے "بھولنا" کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ وہ یاد کیا [ک]ر کہ طمانیت پیدا ہو جائے،

سے کوئے جاناں میں پہنچ کر کیا دلا کرتا ہے ناز — اس گلی میں تجھ سے بہتر سینکڑوں افتادہ ہیں

مولانا کی صحبت کے معنی یہ ہیں کہ ذاکر کو ذکر سے مذکور تک پہنچنا چاہئے ؎

جناب شیخ کو یہ مشق ہے یادِ الٰہی کی ۔۔۔ خبر ہوتی نہیں دل کو زباں سے یاد کرتے ہیں

ملے گو بحث کرکے بات بٹھاتی پہ کیا حصول ۔۔۔ دل سے اٹھا غلاف اگر تو اٹھا سکے

راہ معرفت میں سب سے بڑا سنگ گراں، سب سے بڑا حجاب کثیف اپنا نفس ہے نفس وہ ہے جس نے شیطان کو بھی بہکایا، سرکش ومغرور اور ہمیشہ کے لئے طوق لعنت ڈلوایا۔ چنانچہ اعدی عدوک التی بین جنبیک سب سے بڑا دشمن اے شخص تیرا ۔۔۔ وہ ہے جو تیرے پہلوؤں کے درمیان ہے، شیطان تو عدو مبین ہے یعنی کھلا ہوا دشمن اور نفس دشمن مستور و مخفی ہے اور آستین کا سانپ، یہی جنگ کراتا ہے، یہی مکابروں پر آمادہ کرتا ہے، یہی چاہتا ہے کہ اپنی غلط بات بھی صحیح ثابت ہو جائے اور حریف کی صحیح بات بھی غلط کر دی جائے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی، بے شک نفس برائی کا بڑی سختی سے حکم دیتا ہے وہ نفس جس پر میرے رب نے رحم فرمایا اس بات سے مستثنیٰ ہے۔

خواجہ میر درد فرماتے ہیں کہ اے مباحث منطقی، اے مقرر بے مثل، تو اپنے اس دشمن کو زیر کرلے اس کو مغلوب کرکے اپنا بنالے تو ایک بات ہے بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا، اوروں کو جیتنے ہرانے میں تو یہ اکثر پہنچتا ہے، پہلے اس کی اصلاح کر، ورنہ ہیچ۔ تاثریامی رود دیوار کج

ملے ہے مظہر انوار صفا میری کدورت ۔۔۔ ہر چند کہ آہن ہوں، پہ آئینہ بنا ہوں

"آہن" بذات خود کدورت رکھتا ہے، لیکن جب اس پر صیقل کی جاتی ہے تو وہ آئینہ بن جاتا ہے، اور اس میں انعکاس تجلیات و انوار کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے حتیٰ کہ آفتاب سے کسب نور کرکے "نور علیٰ نور" ہو جاتا ہے۔

یہی حال انسان کامل کا ہے کہ اگرچہ خاک کثیف سے بننے کے باعث ظلمت و کدورت ذاتی رکھتا ہے لیکن جب اس پر ریاضت و عبادت سے صیقل کی جاتی ہے تو وہی آئینہ انوار الٰہی اور تجلی گاہ اعظم ہو جاتا ہے۔

شعر میں اشارہ ہے انسان کامل کی افضلیت و اشرفیت کی طرف اس لئے کہ سوائے انسان کے باقی مخلوق یا نوری ہے مثلاً ملائکہ یا ناری ہے مثلاً جن، یا عقل سے محروم مثلاً بہائم یا روح سے عاری مثلاً جمادات و نباتات، بہائم و جمادات و نباتات پر انسان کی فضیلت بہت بدیہی ہے، حاجت استدلال نہیں، رہے ملائکہ اور جن تو ظاہر ہے کہ وہ مخلوق ظلمت سے صاف یا قریب قریب صاف ہے اور تجلیات کے عکس کو قبول کرنے کے لئے جہاں جلا اور صفائی کی ضرورت ہے، وہاں قدرے کدورت کی بھی حاجت ہے یہی وجہ ہے کہ آئینہ جس قدر ہمرنگ آفتاب ہو جاتا ہے اس قدر ہوا یا فضا نہیں ہوتی، کیونکہ آئینہ ذو جہتین ہے، حامل صفا بھی، حامل کدورت بھی اور ہوا میں اور فضا میں "صفا ہی صفا" ہے یہی سبب ہے کہ انسان کامل میں تجلیات الٰہی کا جس قدر ظہور ہوتا ہے دوسری مخلوق میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

مرزا عبدالمجید بیگ
(دبیر لیڈ خاص)

دہلی کا ایک شاعرِ کامل
مرزا محمد تقی بیگ مائل

اُردو زبان کا ایک مایۂ ناز شاعر مائل دہلوی اپنے کلام فصاحت نظام کے پیش نظر جس ادبی شہرت کا مستحق تھا۔ اس سے محروم رہ کر وقت کی ناسازگاری کا شکار بن کر رہ گیا۔ ایسے شاعر کی شخصیت اور اس کے کلام کو اربابِ ذوق سے روشناس کرانا ادب کی خدمت ہی سمجھی جائیگی مرزا مائل کو دیکھنے اور ان سے انتساب رکھنے والے حضرات ابھی پاکستان و بھارت میں موجود ہیں۔ بہرحال مرزا مائل ایک یادگار شاعر ہیں، اور دہلی مکتبِ شاعری کے متأخرین میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ اس سے پیشتر کہ ان کے کلام کی چاشنی قارئین کے ذوق کی تواضع کی جائے، ان کی زندگی کے مختصر حالات کا تعارف ازدیادِ لطف کا باعث ہوگا۔

مرزا مائل کا نام مرزا محمد تقی بیگ اور مائل تخلص تھا۔ مولد و منشاء دہلی محلہ ٹیامحل نزد جامع مسجد تھا۔ مرزا مائل نسلاً مغل چغتائی اور مذہباً حنفی تھے۔ ایک مرتبہ راقم الحروف نے مرزا صاحب سے غدر کے حالات سنتے وقت ان کی عمر دریافت کی تو فرمانے لگے "مرزا، میں اس خونی انقلاب میں سات آٹھ سال کا تھا" اور پھر یہ بھی کہا "ہم نے اس پُرآشوب ہنگامہ میں مقبرۂ ہمایوں (بادشاہ) میں پناہ لی تھی" اس اعتبار سے مرزا مائل کا سالِ پیدائش ۱۸۴۹-۵۰ قرار پاتا ہے۔ ان کے والد کا نام مرزا مغل بیگ صاحب جائیداد اور خوش حال آدمی تھے۔ مرزا صاحب کہا کرتے تھے کہ لوگ ان کو والد کی وفات کے بعد نئے نواب کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ خیر تو مرزا مائل کو شاعری کا چسکا جیسا کہ وہ کہا کرتے تھے کم سنی میں ہی لگ گیا تھا۔ ذوق فطری تھا لہٰذا غزلیں کہنا شروع کردیں اور سید شجاع الدین انور سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ انور اپنے وقت کے دلی میں مسلم الثبوت استاد مانے جاتے اور سلطان الشعراء کے لقب سے یاد کیئے جاتے تھے۔ انور بعد میں دلی سے ترک سکونت کر کے جے پور چلے آئے اور ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی ناظم الدولہ ظہیر دہلوی بھی جے پور آ گئے مگر آخر العمر ٹونک میں چندے قیام کر کے مستقلاً حیدرآباد دکن میں جا بسے!

مرزا مائل بھی ترکِ وطن کر کے تلاشِ معاش میں جے پور آ نکلے جے پور اس وقت والیٔ ریاست مہاراجہ سوائے رام سنگھ کی علم پروری اور اہلِ کمال کی قدردانیوں کے باعث علم و ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ یہاں مرزا مائل کو زمرۂ اہل کاراں میں ایک اسامی مل گئی۔ دورانِ ملازمت ان کو قصبہ سانبھر میں کافی عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ سانبھر ہندوستان میں نمک کی ایک بہت بڑی جھیل ہے۔

الی ریاست ہائے بودھ پور اور جے پور کی درمیانی سرحد پر واقع ہے۔ یہ قصبہ عہدِ مغلیہ میں فوجی قیام گاہ اور خواجہ حسام الدین جگر سوختہ رحمتہ اللہ علیہ نبیرہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کا مدفن ہونے کی وجہ سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا یہ مرزا مائل کو اس قدر پسند آیا کہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد یہیں توطن اختیار کر لیا۔

مرزا مائل کی شاعری کا آوازہ دراصل جے پور میں آنے کے بعد ہی بلند ہوا اور مولانا سلیم الدین صاحب تسلیم نارنولی بت بابرکت نے ان کی شاعری کو چار چاند لگا دئے۔ مرزا مائل مولانا تسلیم کو بھی اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔ جے پور غدر کے دلی کے شرفاء، ادباء، شعرا، اور دوسرے اہل کمال کا مامن بن گیا تھا۔ اور یہی وقت جے پور میں اردو شاعری کے آغاز و ترقی کا ہے۔ الفت، ظہیر، ذکی، آگاہ، تسلیم جیسے نامور شعرا اور استادانِ فن یہاں جمع ہو گئے تھے، اور مرزا مائل ان حضرات کی موجودگی اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ ان کے بعد جے پور ہی میں نہیں بلکہ پورے راجپوتانہ میں مرزا مائل کا طوطی ان کے آخری دم تک بولتا ۔ان کی شاعری کا شہرہ جے پور کی چار دیواری سے نکل کر دلی، لکھنؤ، حیدرآباد دکن، اور دوسرے بڑے بڑے شہروں تک پہونچ تھا۔ نواب سراج الدین احمد خاں، سائل دہلوی مرزا صاحب کے خواجہ تاش تھے، اور مرزا صاحب اکثر ان کی اور حکیم محمد اجمل خاں حب کی دعوت پر دلی مشاعروں میں شرکت کی غرض سے جایا کرتے تھے، لالہ سری رام دہلوی مصنف تذکرہ خمخانۂ جاوید مرزا مائل بڑے مداح اور قدرشناس تھے۔

ایک مرتبہ دلی میں لالہ سری رام صاحب کی حویلی پر دورانِ ملاقات لالہ جی نے مرزا مائل کو اپنا ہم مشرب سمجھ کر ان کی تواضع لئے —— نائو نوش کا اہتمام کیا۔ مرزا مائل کہتے تھے کہ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر چونک پڑے اور حیرت سے کہنے لگے "ہیں! یہ کیا! میں تو اس کا قطعی عادی نہیں! لالہ جی مرزا مائل سے معذرت خواہی کرتے ہوئے بولے کہ مجھے آپ کے رنگین کلام نے مغالطے میں ال رکھا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ مرزا مائل خمریات بہت اچھی کہا کرتے تھے، اور اپنے کلام میں مضمون شراب سے وہ رنگ آمیزیاں تے کہ سننے اور پڑھنے والے ان کو مرزا غالب کا ہم مشرب سمجھ بیٹھتے، مگر معاذ اللہ۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ مرزا مائل مسلمان ورت اور مومن سیرت انسان تھے۔ کہتے ہیں۔

مائل شراب خوار نہیں ہوں خدا گواہ
کیفیتوں سے مست ہوں اپنے کلام کی

مرزا مائل ایک واقعہ اور لالہ سری رام صاحب کی علم دوستی اور اردو پرستی کا سناتے تھے، وہ کہتے تھے کہ لالہ جی کا کمرہ ختلف زبانوں کی کتابوں سے پر تھا ان میں اردو زبان کی کتابیں سب سے زیادہ تھیں۔ ان میں اکثر کتابیں قلمی بھی تھیں۔ جس میز پر مرزا صاحب بیٹھتے تھے اس سے انہوں نے ایک کتاب اٹھا کر دیکھی۔ معلوم ہوا کہ وہ میاں قلندر بخش جرأت کا قلمی دیوان تھا۔ نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب خط میں لکھا ہوا تھا۔ لالہ جی کہنے لگے "مرزا صاحب میں نے یہ دیوان لکھنؤ میں ایک صاحب سے تین سو روپے دے کر حاصل کیا تھا۔ وہ صاحب کہیں چارپائی پر بیٹھے اس کو پڑھ رہے تھے میں نے اس کو دیکھ کر ان سے کہا کہ حضرت کیا آپ مجھے اس کو قیمتاً دے دیں گے؟ انہوں نے تیوری چڑھا کر کہا کہ میاں، اس کو خرید بھی لوگے" انہوں نے شاید بڑھ چڑھ کر تین سو روپیہ اس کی قیمت بتائی۔ میں نے فوراً جیب سے نکال کر ان کو منہ مانگے روپے دے دئے۔ میاں صاحب کا چہرہ فق ہو کر رہ گیا۔ چپکے سے

دیوان حوالہ کرکے میری صورت کو تکتے رہ گئے" اُردو زبان کے کیسے کیسے قدردان اور شیدائی گذر چکے ہیں۔ آفریں ہے ان کی ہمت کو
ایک مرتبہ حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی کے یہاں مشاعرہ میں شریک تھے، مرزا مائل کی قدیمانہ وضع قطع کو دیکھ کر حاضر
آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ مرزا مائل بات کو فوراً تاڑ گئے۔ خیر یہ غزل سنائی اور یہ مقطع پڑھا۔

مائل لئے ہوئے ہیں جو وضع قدیم کو
ہر ایک پوچھتا ہے یہ حضرت کہاں کے ہیں

مرزا جی کہتے تھے کہ مشاعرہ میں ہوحوم مچ گئی اور آوازیں آنے لگیں۔ واہ! حضرت واہ! ولی کے! دلی کے!!
اسی طرح ایک مشاعرے میں محفل کا رنگ دیکھ کر جو مقطع پڑھا تو سامعین پہ ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔

خدا کا نور ہوتا ہے چراغ صبح گاہی میں
حقارت کی نظر ڈالو نہ اہلِ بزم مائل پہ

حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرزا مائل کے مداح ہی نہیں بلکہ مخلص دوست بھی تھے۔ ایک مرتبہ اپنے ساتھ ان کو بغرض تفریح
ڈیرہ دون لے گئے۔ ڈیرہ دون کی پرفضا پہاڑیوں اور رنگین مناظر سے متاثر ہو کر غزل کہہ ڈالی، جس کا مندرجہ ذیل شعر کافی دلچسپی کا باعث
رہا اور خوب پسند کیا گیا۔

میں نے تو ڈیرہ دون کو سرسبز کر دیا!
موسیٰ تو کوہِ طور جلا کر چلے گئے!

مرزا مائل کو اپنی زبان پر ناز تھا اور کیوں نہ ہو، آخر دلّی کے مغل زادے تھے اور دلّی کے نامور شعرا کے ادبی معرکے دیکھے ہوئے
اور ان کی صحبتوں سے فیض اٹھائے ہوئے تھے، لہٰذا انہوں نے محض شاعرانہ تعلّی سے نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت کے طور پر اس ضمن میں کئی اشعار
کہے ہیں۔ زبان کے اس چٹخارہ سے کچھ وہی حضرات مزہ حاصل کر سکتے ہیں جو زبانِ اُردو کی نزاکتوں اور دلفریبیوں سے واقف ہیں۔ کہتے

فصاحت کے کتب خانے سے مائل — پسِ قرآں ترا دیوان نکلا

کہ دو یہ شاعروں سے کہ آپس میں بانٹ لیں — ٹکڑے ہزار ہا مری اُردو زبان کے ہیں

پڑھے مائل نے گو دو چار ہی شعر — مگر لطف آ گیا اُردو زباں کا

طواف آ کر مری تربت کا کر جائے کہ آخر ہوں — کوئی دلی میں میرے بعد اگر اہلِ زباں پیدا ہو

مرزا مائل حقیقت میں ایک عظیم المرتبت شاعر تھے مگر اس بندۂ خدا نے اپنے کلام کی اشاعت شہرت کی غرض سے پسند نہیں کی صرف
رسالہ "صلائے عام" دہلی میں اکثر غزلیں میر ناصر علی مدیر ماہنامہ کی پاس خاطر سے ارسال کر دیا کرتے تھے۔ مگر ان کی وفات کے بعد
ماہنامہ بھی ختم ہوا اور یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ کہتے تھے کہ ایک مرتبہ ان کی طلبی حیدرآباد دکن بھی ہوئی تھی۔ مگر ان کی قناعت پسندی اور
وضعداری نے وہاں جانا بھی گوارا نہیں کیا۔ کہتے ہیں۔

کس کس کے در پہ ناصیہ فرسا ہوں اے خدا
تقدیر کے لکھے کو مٹاؤں کہاں کہاں

صرف سانبھر اور جے پور کی پرسکون فضا میں ایسی زندگی گذار دینے پر اکتفا کیا۔ ویسے بحیثیت انسان مرزا مائل میں بڑی خوبیاں تھیں
ی طبیعت میں بلا کی شوخی اور مزاج میں غضب کی ظرافت تھی۔ باتوں باتوں میں ایسے ایسے گل کھلا دیتے کہ سننے والوں کی طبیعت باغ
ہو جاتی۔ ان کی خوش مذاقیوں کا تذکرہ اکثر مجلسوں میں رہتا۔ ایک مرتبہ سانبھر میں جمعہ کی نماز کے بعد واپس ہو رہے تھے۔ میں بھی ہمراہ تھا
ب سے ایک صاحب مرزا محمود بیگ نے لپک کر اپنے استاد مرزا مائل کا جوتا تعظیماً اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اسی مقام پر مرزا مائل کی لکڑی بھی
ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر مرزا جی نے اپنی لکڑی اٹھانے میں بڑی عجلت سے کام لیا۔ لکڑی ہاتھ میں لے کر فوراً گویا ہوئے، "لو میاں مرزا،
نے جوتا اٹھایا تو ہم نے بھی لکڑی اٹھائی"۔ کتنا بلیغ فقرہ تھا۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

ایک مجلس میں دانتوں کی حفاظت اور ان کی افادیت کا ذکر ہو رہا تھا۔ مرزا مائل خاموشی سے سن رہے تھے۔ خود ان کے دانت گر چکے تھے
ے لگے مجھے تو اپنے دانتوں کے ٹوٹ جانے کا مطلق غم نہیں، اور یہ شعر پڑھا —

ٹوٹے ہیں جب سے دانت یہ آرام تو ملا
دیتا نہیں ہے اب کوئی دنداں شکن جواب

ایک مرتبہ کہیں ایک دعوت میں مرزا صاحب تشریف لے گئے۔ اتفاق سے کھانے میں اروی گوشت ملا۔ سالن میں بوٹیوں کی قلت اور
رویوں کی کثرت تھی۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ شوربہ پتلا۔ ایک صاحب لقمہ کٹورے میں ڈال کر اس کو پھیرتے ہوئے کہنے لگے "اماں، بوٹیاں
لاش کرتی ہیں تو غوطہ لگاؤ۔ دیکھتے نہیں کہ اروياں کھڑکی لگا رہی ہیں"۔ کھڑکی لگانا، ایک ایسا برمحل اور بامحاورہ فقرہ تھا کہ لوگوں کو کھانے
سے زیادہ مزہ اس میں آگیا۔

مرزا مائل رنگینیٔ طبع اور شگفتگیٔ مزاج میں بذات خود باغ و بہار تھے،
عادتاً مرزا محمد تقی بیگ مائل نہایت خلیق، حلیم الطبع، مرنجاں مرنج اور وضعدار تھے۔ خلوص ان کی طبیعت کا خاصہ تھا اور
ضبط و تحمل ان کا شیوہ۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت نشیب و فراز دیکھے مگر آخر دم تک خودداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ مندرجہ ذیل
اشعار ان کے مسلک کی خوب ترجمانی کرتے ہیں۔

واللہ دشمنی ہے بڑی آبرو کے ساتھ
جانا کسی کے در پہ کسی آرزو کے ساتھ
شداد تو نہیں ہوں جو ہو کر رہوں ذلیل
دوزخ مجھے قبول مگر آبرو کے ساتھ

اور یہی ان کی شرافت، روش اور شاعرانہ وضعداری تھی جس نے مرزا مائل کو جے پور اور سانبھر میں ایک بلند مقام پر فائز کر کے ہر دلعزیز
بنا رکھا تھا۔

مرزا مائل کو شاعری کی جملہ اصناف پر عبور حاصل تھا مگر غزل گوئی میں یکتائے زمانہ تھے۔ اسی وجہ سے کسی نے ان کی وفات پر
'بادشاہ غزل' سے ۱۳۵۰ھ تاریخی مادہ نکالا تھا۔ ان کا دیوان بہت پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا۔ مگر اس کو کبھی طبع کرانے میں کوئی دلچسپی
نہیں لی۔ ان کا دیوان ان کے جانشین لالہ چندی بہاری لال صبا کے پاس جے پور میں بطور تبرک و یادگار استاد محفوظ ہے۔ لالہ چند

مائل صاحب جے پور کے معتبر اساتذہ میں سے ہیں۔ اور اس وقت جے پور میں اردو شاعری کے آثار قدیمہ میں اپنی جگہ ایک تاج محل ہیں۔ ان کی شاعری میں تغزل، خمریات، اور دلی کی ٹکسالی زبان کا رنگ نمایاں طور پر جھلکتا ہے، محاکات اور استعارہ آفرینی ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایک زمانے میں ان کی مندرجہ ذیل غزلیں بہت مشہور و مقبول تھیں۔

یہ نرگس میں ہے رنگ ستانہ کس کا | زباں پر ہے سوسن کی افسانہ کس کا
کسی سے ہو کیا رشک بزم جہاں میں | چھلک جائے کیا جانے پیمانہ کس کا
دوئی دل سے نکلے تو ہو جائے ظاہر | کہ کعبہ ہے کس کا صنم خانہ کس کا
مرے دل کو توڑو دیر اتنا سمجھ لو | کہ برباد ہوگا یہ کاشانہ کس کا
جو اس رنگ دلبر بھی ہے چاک داماں | خدا جانے یہ گل ہے دیوانہ کس کا
خبر شمع کو بھی نہیں ہے کہ بے خود | بنایا ہوا ہے یہ پروانہ کس کا

طوافِ حرم میں جو پڑھتے تھے مائل
خدا جانے تھا شعر رندانہ کس کا

(۲)

چلے گئے وہ ادائیں دکھا کے پڑے ہیں | شرارتیں بھی تھیں شرم و حیا کے پڑے ہیں
کسے ہے تاب جو دیکھے یہ حسن کا عالم | سنا کرے تری باتیں بٹھا کے پڑے ہیں
اک آہ گرم جو کھینچی، کہا کہ دیکھو تو! | یہ کس نے آگ لگا دی ہوا کے پڑے ہیں
خموش ادب سے ہوں لبِ خضر ورنہ کہہ دیتا | شراب پیتے ہو آبِ بقا کے پڑے ہیں

کسی کو پاس کسی کا نہیں رہا مائل
اک انقلاب ہے روزِ جزا کے پڑے ہیں

یہ تھیں وہ بھولی بسری باتیں جو مرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی کی زندگی اور ان کے کلام کی ترجمانی کرتی ہیں۔ دنیا میں اکثر قابل اسی طرح گمنامی کے بحرِ عمیق میں غرق ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اردو زبان کا یہ مایۂ ناز شاعر اپنی زندگی کی بیاسی سالہ منازل طے کرنے کے بعد کو اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوا۔

اپنے گھر سے وہ خدا کے گھر گیا
لوگ کہتے ہیں کہ مائل مر گیا

بھر سے جے پور پنشن لینے گئے تھے کہ وہیں اچانک شکارِ اجل ہو گئے۔ ان کے ایک شاگرد مرزا اختر نے کیا خوب کہا ہے۔

کیا مائل نے خالی اس جہاں کو | نہ آئی موت مرگِ ناگہاں کو

سانبھری مرحوم نے ان کی وفات پر شاہدِ غم (۱۳۵۰ھ) تاریخی قطعات و منظومات کا مجموعہ تصنیف و تالیف کر کے طبع کرایا جو شاد سانبھری کی تاریخی صلاحیتوں اور جولانیٔ طبع کا ایک قابلِ قدر نمونہ ہے۔

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا پیغام
(بوساطت ڈاکٹر فضل الرحمٰن ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی)

محترمی و مکرمی ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔

میں نے آپ کے دعوت نامے کے جواب میں یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں انشاء اللہ نزول قرآن کے چہاردہ صد سالہ جشن میں ضرور شرکت کروں گا اور اس موقع پر پیش کرنے کے لئے آپ کے دئیے ہوئے موضوع پر ایک مقالہ بھی تیار کروں گا ۔ لیکن افسوس ہے کہ مجھے پچھلے چند ماہ سے وجع المفاصل کی جو تکلیف تھی وہ گذشتہ ماہ رمضان میں شدت اختیار کر گئی اور اب وہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے جس کی وجہ سے میرے لئے سفر کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے اور دماغی محنت بھی کم ہی برداشت کر سکتا ہوں ۔ اسی بنا پر میں اپنا مقالہ تیار نہ کر سکا اور مجبوراً آپ کے اجتماعات میں شرکت سے بھی معذرت پیش کر رہا ہوں ۔

میں آپ کا شکر گذار ہوں گا اگر آپ حاضرین مجلس تک میرا سلام اور یہ پیغام پہنچا دیں کہ جس مبارک مقصد کے لئے آپ جمع ہوئے ہیں اس میں قلب و روح کے ساتھ آپ کا شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے کلام پاک کے صحیح فہم ، اور اس نازک دور میں اس کی صحیح تبلیغ اور زندگی کے اہم مسائل پر اس کی تعلیمات کو صحیح طریقے سے منطبق کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

اللہ جل شانہ نے اپنے آخری نبیؐ پر اپنی کتاب اس اعلان کے ساتھ نازل کی ہے کہ اس میں دین کی تکمیل کر دی گئی ہے اور اب دنیا میں نہ کوئی نبی آنے والا ہے نہ کوئی کتاب ۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن پوری نوع انسانی کے لئے تمام دنیا میں اور تمام زمانوں میں ایک مستقل ہدایت ہے کیونکہ اگر کسی زمانے یا کسی خطہ زمین یا انسانی معاشرے کی کسی حالت کے لئے بھی اس کی ہدایت ناکافی یا محتاج تکمیل ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا اعلان غلط ہے ۔

حالانکہ اللہ اس سے پاک ہے اور برتر ہے کہ اس کی کوئی بات غلط ہو ۔ لہٰذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے مسائل حیات کی ہر بحث میں ہمارا اولین نقطہ آغاز یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے لئے اصل سرچشمہ ہدایت یہ کتاب ہے اور ۔ رہنمائی حاصل کرنے کے لئے اسی کی طرف ہم رجوع کریں گے ۔

یہ " نقطہ آغاز " کا سوال ہی اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کے اہل فکر و نظر اور رہنما طبقوں کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے ۔ اگرچہ ہمارا اصل کام دنیا کو خدائی ہدایت کی طرف دعوت دینا ہے لیکن بدقسمتی سے جدید مادی تہذیب کے ہمہ گیر غلبہ نے خود ہمارے اپنے اندر یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ ہم جملہ مسائل حیات میں قرآن کو اصل سرچشمہ ہدایت مانتے بھی ہیں یا نہیں ، اور مانتے ہیں تو خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ مانتے ہیں یا نہیں ۔ اس لئے ہم بحیثیت ایک مسلم ملت کے اپنے عالمگیر منصب کا حق ادا نہیں کر سکتے جب تک خود اپنے اندر اس سوال کو طے نہ کر لیں اور ہم

قسمت ہوں گے اگر نزول قرآن کی پندرہویں صدی کا آغاز ہم اسی سوال کے ایک قطعی اور واضح جواب سے کریں ۔

۱) ہمارے رہنما اور کارفرما طبقوں میں کچھ عناصر ہیں جو قرآن کو اس دور میں سرچشمۂ ہدایت نہیں مانتے ہیں یا کم از کم اس میں شک ضرور رکھتے
ایسے اطمینان بخش دلائل کے محتاج ہیں جن سے ان کو یہ یقین حاصل ہو جائے کہ انسان رہنمائی کے لئے خدا کی ہدایت کا محتاج ہے اور یہ قرآن
ہی کی طرف سے ایک محفوظ، کامل اور ابدی ہدایت ہے ۔

۲) کچھ دوسرے عناصر ہیں جو دین و دنیا کی تقسیم کا نظریہ اختیار کر چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص تصورات کے مطابق جس
"سمجھ بیٹھا ہے"، صرف اسی کے دائرے تک قرآن کی ہدایت کو محدود رکھنا چاہتا ہے ۔ اس طرح کے لوگوں کی یہ غلط فہمیاں رفع نہیں ہو سکتیں
دین و دنیا کی اس بے معنی تقسیم پر فیصلہ کن ضرب نہ لگائی جائے اور مضبوط دلائل کے ساتھ یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ انسان اپنی پوری زندگی کے
ں خدا کی ہدایت کا محتاج ہے اور قرآن زندگی کے ہر پہلو میں بالکل ٹھیک ہدایت دیتا ہے ۔

۳) کچھ اور عناصر ہیں جو قرآن کی ہدایت کو جامع اور ہمہ گیر مانتے ہیں مگر جب اس سے استفادے کا سوال سامنے آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ
رہنمائی کا اصل ماخذ و منبع قرآن سے باہر کسی اور جگہ ہے جہاں سے نظریات و تصورات لا کر وہ قرآن سے ان کی تصدیق و توثیق کرانے کے
نکا رہا ہے ۔

۴) اور کسی کی کوشش یہ ہے کہ قرآن کا تعلق نہ صرف سنت رسولؐ سے کاٹ کر بلکہ پچھلی چودہ صدیوں میں امت کے علماء، فقہا اور مفسرین نے
قرآن کی تشریح اور تعلیمات قرآن سے اخذ استنباط کا جو کچھ کام کیا ہے اس سب سے بے نیاز ہو کر اس کا اپنا ذہن الفاظ قرآن سے جو
ذکرتا ہے صرف اس سے ہدایت حاصل کرے ۔ یہ دونوں مسلک ایسے ہیں جنہیں کوئی معقول آدمی قرآن کی ہدایت سے استفادے کی صحیح صورت
سکتا اور ان کی بنیاد پر امت مسلمہ کا کوئی ایک نظام فکر و عمل بھی نہیں بن سکتا ۔ کیونکہ نہ امت کا مجموعی ذہن کبھی اس تعبیر و تفسیر کو قبول کر
اور نہ خود ان لوگوں کے درمیان تعبیرات میں اتفاق ممکن ہے ۔

اس لئے ان مسلکوں کے فروغ پانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں مزید تفرقے فروغ پائیں، ان کے ذہنوں میں اپنے دین کے متعلق
شبہیں پیدا ہوں اور دنیا کو ہدایت الٰہی کی طرف دعوت دینے کے بجائے وہ خود اپنی جگہ ہی اس پراگندگی میں مبتلا رہیں کہ وہ ہدایت فی الواقع
لیکن اس کا علاج بھی طعن و تشنیع نہیں ہے ۔ بلکہ دراصل یہ عناصر اس کے محتاج ہیں کہ معقول اور اطمینان بخش دلائل سے ان کو قرآن کی
استفادے کا صحیح طریقہ بتایا جائے اور جن طریقوں کو وہ اختیار کر رہے ہیں ان کی غلطی واضح کی جائے ۔

لغزش قدم کے ان مواقع سے جو لوگ بچ گئے ہیں ان کے معاملہ میں بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ فی الحقیقت قرآن کو اصل سرچشمۂ ہدایت
وہ کس حد تک سنجیدہ ہیں ۔ اس معاملہ میں سنجیدگی کے معنی صرف اتنے ہی نہیں ہیں کہ ہم خلوص دل کے ساتھ قرآن کے متعلق یہ عقیدہ رکھیں اور اس
بھی نہیں ہیں کہ ہم اس عقیدے کے صرف اعلان و اظہار پر اکتفا کریں، بلکہ

ہمارے سنجیدہ ہونے کا اصل تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عملاً اس چشمۂ ہدایت کی طرف
رجوع کریں اور جو رہنمائی اس سے ملتی ہے اس کے مطابق اپنے اخلاق و معاملات اور طرز زندگی کو، اپنے تمدن اور
اس کے قوانین کو، اپنے نظام تعلیم اور نظام معیشت اور نظام سیاست کو بالفعل ڈھالنے کے لئے تیار ہو جائیں ۔

میرا احساس اور شدید یہ ہے کہ ہمارے رہنما اور کارفرما طبقوں میں جہاں صحیح اعتقاد موجود ہے وہاں بھی اس معیار کی سنجیدگی مفقود ہے ۔

بفقود نہیں تو کم از کم معیار مطلوب سے بہت فروتر ہے ہمیں اس سنجیدگی کو پیدا کرنے کی کوشش سب سے پہلے کرنی چاہئے۔ کیونکہ جب تک یہ پیدا نہ ہو
ملی زندگی پر قرآنی تعلیمات کے انطباق کی علمی بحثیں کا غذکی زینت بنی رہیں گی، عمل کی دنیا میں ان کا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ دنیا صرف ان
ذہنی بحثوں سے اسلام کے برحق ہونے کی قائل نہیں ہوسکتی۔ اسے قائل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ہماری قومی زندگی میں اسلام اس کو جلوہ گر نظر
ے اس کے بغیر ہم جتنی بھی اسلام کی تبلیغ کریں گے، اس کے آگے دنیا کو ایک بہت بڑی علامت استفہام ہی لگی نظر آئے گی جس میں یہ سوال
یدہ ہوگا کہ کیا یہ امت جو اپنی مسجدوں کے باہر زندگی کے ہر شعبے میں دوسروں کے افکار و نظریات، تہذیب، قوانین اور اصولوں کی تقلید کر رہی
ہ، فی الواقع اسلام کو خود بھی برحق سمجھتی ہے۔

یہ چند امور ہیں جن کی طرف میں اہل علم کے اس گرانقدر اجتماع کو توجہ دلانا چاہتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ ان کو التفات کا مستحق سمجھا
ئے گا۔

خاکسار

سید ابوالاعلیٰ مودودی

حبیب احمد صدیقی

دلفگاروں کی بھلا ہنس کے خوشی کیا ہوگی — شاخ جو ٹوٹ چکی ہو، وہ ہری کیا ہوگی
دیکھ کر دہر کے اربابِ فراست کی روش — محوِ حیرت ہوں کہ بے راہ روی کیا ہوگی
عشرتِ زیست کو ہم جانتے ہیں حاصلِ زیست — آگہی یہ ہے تو پھر بے خبری کیا ہوگی
ہم ہیں اور دل میں تمناؤں کی اصنام گری — بُت تراشوں سے بھلا بُت شکنی کیا ہوگی

نصرت قریشی

محبت کی کرن دل کے سیہ خانے کا حاصل ہے — یہی تو ایک جگنو ہے جو ویرانے کا حاصل ہے
دعا کیونکر نہ دے تجھ کو وہ پتھر پھینکنے والے — ترا سنگِ ملامت ہی تو دیوانے کا حاصل ہے
بنا شہرِ نگاراں کی بھی اک وحشی نے ڈالی تھی — مگر دنیا سمجھتی ہے کہ فرزانے کا حاصل ہے
میں کیوں صحرا کی چھانوں خاک اے وحشت بتا مجھ کو — اگر خانہ خرابی میرے کاشانے کا حاصل ہے

میں لب تشنہ بھی ہوں نصرت تہی ساغر بھی ہوں لیکن
نگاہِ مستِ ساقی میرے پیمانے کا حاصل ہے

اعجاز ڈیروی

لوگ دُہرائیں گے ہمارے بعد — وہ فسانہ جو ہم نہ کہہ پائے
یاد آئے جو وہ شبِ ہجراں — اور تاریک ہو گئے سائے
عشق آزار تو نہیں اے دوست — ہاں! مگر جس کو راس آ جائے

جگر[1]

اے فلک محفلِ انجم پہ بہت ناز نہ کر
اک ستارہ بھی رہے گا نہ سحر ہونے تک

[1] جگر مرادآبادی نہیں ہیں، بہار کے شاعر ہیں جن کا تخلص جگر ہے۔ عزیزی حکیم ناصر الدین (خلف جناب حکیم نصیر الدین ندوی، مالک نظامی دواخانہ) کو سینکڑوں اچھے اشعار یاد ہیں، انہوں نے یہ شعر سنایا۔ (م۔ق)

...امی مذاہب

از :- ابوزھرہ مصری، ترجمہ :- غلام احمد حریری (ایم ۔ اے) ضخامت ۳۱۶ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت نو روپے، ملنے کا پتہ :- ملک برادرز کارخانہ بازار لائل پور

علامہ شیخ محمد ابوزھرہ قاہرہ یونیورسٹی کے لا کالج میں پروفیسر ہیں اور فقہ میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں، علامہ موصوف متعدد کتابوں کے ...ہیں، جن میں سے آٹھ کتابیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔

"المذاہب الاسلامیہ" میں انہوں نے مسلمانوں کے فرقوں کے عقائد و افکار کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ مندرجہ ذیل ابواب سے اس کتاب ...بت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں کے اختلاف کے اسباب ——— سیاسی مذاہب ——— مسئلہ خلافت میں اختلاف کے مراحل و ادوار ——— شیعہ ——— ...ع ——— خلافت کے مسئلہ میں مسلک جمہور ——— اعتقادی مذاہب ——— جبریہ ——— قدریہ، مرجئہ، معتزلہ، مسئلہ قرآن، اشاعرہ، ماتریدیہ اور وہابیہ۔

ان تمام مذاہب اور فرقوں کے عقائد و افکار فاضل مصنف نے پوری تحقیق کے ساتھ بیان کئے ہیں، جن کے مطالعہ سے معلومات میں ...ہد اضافہ ہوتا ہے اور ذہن و فکر کو روشنی ملتی ہے، جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے، لائق مصنف نے بعض گمراہ کن عقائد کی ساتھ کے ...تردید بھی کر دی ہے، ان مذاہب کے عقائد کا جائزہ لینے میں شیخ ابوزھرہ نے بڑی بالغ نظری اور دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ شیعہ مذہب کے ...ے میں وہ لکھتے ہیں :—

> "بعض یورپین مستشرقین کا خیال ہے کہ شیعہ نے فارسی تہذیب کے بجائے یہودیت سے زیادہ استفادہ کیا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ عبداللہ بن سبا جو حضرت علیؓ کی تقدیس کا بانی تھا، پہلے یہودی تھا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہودی آثار کے علاوہ شیعہ مذہب میں بعض ایشیائی مذہب مثلاً بدھ مت کے عقائد بھی شامل ہیں۔"

باطنی عقائد اور صوفیاء :—

"۔۔۔۔ باطنیہ الفاظ قرآن کی بڑی دور ساز کارتاویلیں کرتے ہیں، بعض نے تو عربی الفاظ کو بھی عجیب و غریب تاویلات کا جامہ پہنا دیا، ان تاویلات بعیدہ اور اسرار امام کو وہ علم باطن کا نام دیتے ہیں، ظاہر و باطن کے اس چکر میں اثنا عشریہ بھی باطنیہ کے ہمنوا ہیں، اور بہت سے صوفیاء نے بھی باطنی علم کا عقیدہ اسماعیلیہ سے اخذ کیا۔"

"خلق قرآن" کے سلسلہ میں فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ معتزلہ کے افکار غیرت ایمانی کے آئینہ دار تھے اور اس کا محرک جذبہ ایمان و
ن ہے ——

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں شیخ ابوزہرہ نے قریب قریب انہی خیالات کا
ار فرمایا ہے جن پر مولانا مودودی کو مطعون کیا جاتا ہے۔

کتاب کا ترجمہ سادہ اور سلیس اردو میں کیا گیا ہے، کلامی مسائل کی تشریح میں بھی کوئی ژولیدگی نہیں ہے کہیں کہیں عبارت میں کھٹک
اہوئی۔ مثلاً "غزوات اسلامی" کو "غزوہ ہائے اسلامی" (ص۲۷) لکھا گیا ہے، "غزوہ" کی فارسی انداز پر جمع بنانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ
زوات" اردو میں بولا اور لکھا جاتا ہے۔

"میں نے ان کو ایک ایک ہزار درہ مارا" (صفحہ ۲۰۰) "۔۔۔۔ ایک ایک ہزار درے مارے" لکھنا تھا —— "نہ ہی" وہ فاحش
ی ہے جس کا چلن عام ہوگیا ہے، اور فاضل مترجم نے بھی "نہ ہی" لکھ کر اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

"تسجیل نکاح سے متعلقہ محکمہ کا اشارہ۔۔۔" اردو داں طبقہ "تسجیل" کو نہیں سمجھ سکتا، اس کی جگہ "رجسٹریشن" لکھنا چاہیے تھا۔

کتاب کے آخر میں بہائی مذہب اور قادیانیت کا ذکر ہے، قادیانیت کے بارے میں علامہ ابوزہرہ نے بڑی سچی بات کہی ہے ——

"۔۔۔۔ بہرحال مرزا صاحب (غلام احمد قادیانی) کی تعلیمات
کا، اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔"

"اسلامی مذاہب" —— اردو ادب میں ایک بلند پایہ معلومات آفریں کتاب کا اضافہ ہے! اس کے مطالعہ سے عوام و خواص بھی
اٹھا سکتے ہیں۔

دنِ کربلا

از :- محمد سہراب خاں، ضخامت، صفحات، قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ :- آئیڈیل بک سنٹر ۳۰ سونیہ مارکیٹ، اجمیر جینسدوڈ، چاٹگام

کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں کیا ہوگا؟ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے اعوان و انصار نے کربلا کے میدان
پنی جانیں دے کر اور سب کچھ لٹا کر شہادتِ حق کا جو عظیم فریضہ انجام دیا تھا، اس کتاب میں اس کو اثر انگیز انداز میں بیان کیا گیا ہے! فاضل
ف کا قلم تاریخی واقعات کی عکاسی کے ساتھ محبتِ اہل بیت کا بھی حق ادا کرتا گیا ہے!

یزید کے بارے میں :—

"۔۔ یزید میں اس کے علاوہ اور کوئی خوبی نہیں تھی کہ وہ حضرت امیر معاویہؓ کا بیٹا تھا، تقویٰ اور طہارت تو

درکار حکمرانی اور کشورکشائی کے لئے جس تدبر اور دوراندیشی کی ضرورت ہے، وہ بھی اُس میں نہیں تھی۔"

لائق مصنف کے نزدیک یزید کی شخصیت ناپسندیدہ اور مبغوض ہے، مگر یزید پر لعنت بھیجنے کے سلسلہ میں اُن کا مسلک یہ ہے —

"۔۔۔ ممکن ہے لعنت بھیجنے پر گرفت ہو، نہ بھیجنے پر کوئی گرفت نہیں ہوگی، کیونکہ لعنت بھیجنا کوئی جزو ایمان نہیں ہے"

—— مگر ——

"تصویر کا دوسرا پہلو بھی انتہائی غلط اور گمراہ کن ہے کہ یزید کو برسرِحق اور مسلمانوں کا صحیح امیر المومنین مانا جائے اور خلیفہ برحق کہ کر حضرت امامؑ عالیمقام پر خروج وبغاوت کا الزام لگایا جائے۔"

محرم کے زمانے میں جو کھیل تماشے اور غیر شرعی رسمیں ہوتی ہیں، کتاب کے آخر میں اُن پر نکیر کی گئی ہے!

محترم

از:- محمد طفیل، ضخامت ۱۵۰ صفحات، (مجلد، رنگین گردپوش) قیمت چار روپے،

ملنے کا پتہ:- ادارہ فروغ اُردو، ایبک روڈ انارکلی لاہور

مجلہ "نقوش" (لاہور) کا نام آتے ہی، محمد طفیل صاحب کا نام اور کام "خوشگوار یاد" بن کر اُبھر آتا ہے۔ "نقوش" نے اُردو ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے اور ایسے ایسے شاندار "خاص نمبر" شائع کئے ہیں جو ادب وصحافت کی دنیا میں سنگ میل بن کر رہ گئے ہیں۔

محمد طفیل صاحب ایک پبلشر کی حیثیت سے شروع شروع میں منظرِ عام پر آئے تھے، مگر پھر وہ رفتہ رفتہ اپنی قلمکاری اور تحریروں کے ذریعہ صاحبِ قلم بھی بن گئے، حسنِ اتفاق سے پریس اور سرمایہ کی سہولتیں انہیں حاصل ہیں، اس لئے اُن کی کئی کتابیں —— صاحب، جناب، آپ .... شائع ہوئیں۔ اور مقبول بھی ہوئیں۔

اُن کی تازہ ترین ادبی پیشکش —— محترم —— ہمارے سامنے ہے، جو کتابت وطباعت کی تمام خوبیوں سے آراستہ ہے اور "نقوش پریس" کے فن طباعت کا حسین شاہکار ہے!

جولائی ۱۹۶۳ء میں فاضل مصنف سندھ کے مشہور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس میں شریک ہوئے تھے، حیدرآباد اور کراچی بھی جانا ہوا۔ اسی سفر کی داستان پھیلتے پھیلتے پوری کتاب بن گئی، اس سفر میں متعدد ادیبوں اور شاعروں سے بھی اُن کا ملنا ہوا، بعض اُن کے رفیقِ سفر بھی رہے! ان حضرات کے تذکرے نے —— "محترم" —— کو اور زیادہ دلچسپ اور قابلِ احترام بنا دیا ہے۔

ایک صاحب ہیں —— الف۔ الف اکبرآبادی —— مت پوچھئے کہ کیا ہیں! —— مگر محمد طفیل صاحب اپنے سفر میں اس "دریافت" پر قابلِ مبارکباد ہیں، کہ اُن کی کتاب پڑھ کر، اُن صاحب کے بارے میں لوگ محتاط ہو جائیں گے۔

● —— "ریاض نے کہا —— "جو کچھ بھی ہو، مگر اُن کی ساکھ بڑی خراب ہے، اس کی وجہ سے پوری ادیب برادری بدنام ہوتی ہے، مثلاً انہوں نے شیر افضل جعفری سے روپے، اس غرض سے لئے کہ مجموعہ کلام چھپوا دوں گا، مہینے تک تو یہ لیت ولعل کرتے رہے، جب انہوں نے نوٹس دیا تو بڑی معمولی گیٹ اپ

کے ساتھ اخباری کاغذ پر مجموعے کو توپ تھاپ کر جعفری کے حوالے کر دیا۔ شیر افضل جعفری نے اپنے مجموعے کو دیکھ کر کہا ـــ کہ اپنی زندگی میں دوبار رویا ہوں ـــ ایک بار والدہ کے مرنے پر دوسری بار اپنے مجموعۂ کلام کے چھپنے پر" (ص۵۲)

سندھی موسیقار کے گانے اور نرت کی تصویر کشی، صاحبِ "محترم" کے قلم سے :-

"۔ ۔ ۔ عمر کوئی سو کے لگ بھگ، آنکھوں سے معذور، مگر جب گانے کے لئے بیٹھے، تو اُن میں بلا کی حرکت عود کر آتی، میں انہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوا جا رہا تھا، یہ تان اُڑائی، وہ ہاتھ لہرایا، کبھی گردن اور ہاتھ کے اشاروں سے سازوں کا ساتھ دیا کہ لطف آگیا، یہیں تک نہیں بلکہ دو ایک موقعوں پر بے خود ہو کر گھٹنوں کے بل قدرے کھڑے ہو کر، ہلکے ہلکے ناچ کا جو تصوراتی ٹچ (TOUCH) دیا، تو لوگ آپے میں نہ رہے :

اور شہ پارہ ؛ـــ

"کراچی چھوڑنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ کچھ اس کوٹھی کا بھی نقشہ کھینچوں، جہاں میں مہا، میری مراد پیر علی محمد راشدی کی کوٹھی سے ہے، صاف ستھری، بہت بڑی، قیمتی سامان، قیمتی پینٹنگس، مگر وہ جوانوں کے رہنے کی جگہ نہیں اس لئے کہ وہاں ایسی ایسی تصویریں آویزاں ہیں کہ بڈھا جوان ہو اُٹھے، یہی وجہ ہے کہ وہ تصویریں بولے بغیر دعلاقی رہتی ہیں، کون ان کے خاموش تکلم سے متاثر ہوتا ہے کون نہیں ہوتا یہ معاملہ ظرف[1] کا ہے"

سارخ ؛ـــ

کتاب کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے ـــ

"چھ سات، آٹھ تاریخ کو شاہ عبداللطیف بھٹائی کا عرس ہے، اگر فرصت ہو تو اس میں چلے جائیں" ـ یہ ٹیلی فون رائٹرز گلڈ کے سکریٹری کا تھا"

صاحب اُردو جانتے ہیں تو اُنہوں نے "اس میں چلے جائیں" نہیں بلکہ "وہاں ہو آئیں" یا "اس کا بھی تماشہ دیکھ لیں" کہا ہوگا۔
ن سے خوب جھاگ نکالا" (ص۱) شاید یہ کتابت کی غلطی ہو، "جھاگ نکالے" ہونا چاہیے تھا ـــ "ابھی وہ کچھ دن دہی میں، اسی پوسٹ پر تھے مگر آج کل ملتان بہہ گئے تھے" (ص۱۹) "بہہ گئے تھے" کا تلازمہ اس عبارت میں عجیب سا لگتا ہے ـــ
یہ قصیدہ پڑھا جا رہا ہے وہ حیدرآباد کے بڑے ہوٹلوں میں سے ہے اس لئے **چارجز** بہت زیادہ ہیں" (ص۲) "چارجز" سے یہ بے ربط لفظ عبارت میں آخر کیوں آگئے ! ـــ
لاہور اور راولپنڈی سے چلے تھے، سب تھڑدلے تھے" (ص۲۳) "تھڑدلا" عام پر بزدل اور کم ہمت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے

---

[1] "ظرف اور ذوق کا ہے" (م ـ ق)

"مجھے شاہ کے کچھ اشعار یاد نہ ہوں" (ص۲۱) "شاہ صاحب کی کانیاں" لکھا تھا ـــــ "شاہ کی شاعری کا لہجہ مقامی رنگ آمیزی سے بھرپور ہے" (ص۳۸) "رنگ آمیزی" کے ساتھ "بھرپور ہے" دعبدال کو خامہ کھٹکتا ہے ـــــ "کھانے پر بھی بے حد اہتمام کیا ہوا تھا" (ص۱۳۲) "بے حد اہتمام تھا" یا "بے حد اہتمام کیا تھا" ـــــ "کیا ہوا تھا" زبان و محاورہ کے اعتبار سے محل نظر ہے۔

"کوئی چار بجے کے قریب میں انجمن ترقی اردو بورڈ سے نکلنے میں کامیاب ہوا وہ بھی اس صورت میں کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری سے نہ ملا، جو بلاشبہ زیادتی کی ذیل میں آتا ہے" (ص۱۴۵)

"جو بلاشبہ زیادتی کی ذیل میں آتا ہے" یہ ٹکڑا ترجمہ سا لگتا ہے، اور لکھنے والے کی مشاقی پر اس سے حرف آتا ہے۔

مجموعی طور پر کتاب دلچسپ ہے، باتوں باتوں میں صاحب کتاب نے بعض مقامات پر خوب خوب چٹکیاں لی ہیں اور اس طرح بہت سی شخصیتوں کی خاصی نقاب کشائی کر دی ہے، سندھ کی تاریخ چند صفحوں میں جس حسن و خوبی کے ساتھ بیان کی ہے، وہ اس کتاب کا سب سے زیادہ اہم حصہ ہے!

"محترم" میں جن شخصیتوں کا ذکر ہے اُن میں سے بیشتر کے "اسکیچ" بھی کتاب میں ملتے ہیں، چند تصاویر بھی ہیں، یقین ہے کہ صورت و معنی کی ان خوبیوں کے ساتھ یہ کتاب مقبول ہوگی۔

حاصل مطالعہ

از: سید الطاف علی بریلوی ضخامت ۱۶۸ صفحات، مجلد رنگین گرد پوش، قیمت آٹھ روپے، ملنے کا پتہ: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، حبیبہ منزل متصل سرسید گرلز کالج، ناظم آباد بی روڈ کراچی۔

جناب سید الطاف علی بریلوی نہ صرف مصنف ہیں بلکہ مصنف گر ہیں، اُن کی متعدد کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں، صاحب موصوف کا قلم ثقاہت و سنجیدگی کا ترجمان ہے۔

"حاصل مطالعہ" میں کیا ہے؟ اس کی تفصیل خود فاضل مصنف کی زبان سے سنئے، جن لفظوں میں وہ لکھتے ہیں:—

"راقم نے بھی ان بزرگوں کی تقلید میں وقتاً فوقتاً کتابوں اور مقالات پر کچھ مقدمے، دیباچے، پیش لفظ، تبصرے اور تعارفی نوٹ وغیرہ لکھے اور وقتی طور پر اُن کو محفوظ کر دینے کے خیال سے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ "معارف" علی گڑھ اور "العلم" کراچی میں شائع کیا۔ . . ."

---

[1] راقم الحروف کے بارے میں محمد طفیل صاحب نے جو تاثر پیش کیا ہے کہ میں بڑے بڑے آدمیوں سے بے تکلفی کا رشتہ بتاتا ہوں، یہ اُن کا تاثر صحیح نہیں ہے! انجمن ادبی مسائل کے ارکان اس کے شاہد ہیں کہ جب کسی سکریٹری یا وزیر سے ملاقات کے لئے کوئی وفد یا کمیٹی بنی ہے تو میں نے اصرار کرکے اس سے اپنا نام نکلوایا ہے! میں نے طفیل صاحب سے کیا گفتگو کی، گفتگو کا کیا موضوع تھا؟ یہ باتیں مجھے بالکل یاد نہیں رہیں، اس کا امکان ہے کہ کسی سلسلہ میں وزراء سے ملنے کا ذکر آیا ہو اور میں نے اُس زمانے کے بعض وزراء سے اپنے تعلقات کے بارے میں کچھ کہا ہو! ۱۹۳۳ء میں جب کہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے ملنا بڑے فخر کی بات تھی، بغداد میں عراق کے بادشاہ ہز مجسٹی غازی الاول سے میری ملاقات ہوئی حیدرآباد کے وزیر اعظم ہز ایکسلنسی سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کے دربار میں برسوں آنا جانا رہا، مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان جس زمانہ میں حیدرآباد دکن میں وزیر فنانس تھے اُن سے وہاں کی ملاقات تھی جو شخص پاکستان بننے سے پہلے اتنی بڑی شخصیتوں سے متعارف ہو وہ کسی وزیر سے ملاقات کا ذکر فخر کے انداز میں کیوں کرنے لگا۔

"جس طرح ایک شاعر جب بوڑھا ہو جاتا ہے، تو اپنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ منتشر کلام کو جمع کرکے اپنا دیوان مرتب کرتا ہے، بالکل اسی طرح بعض احباب کے مسلسل اصرار پر کچھ عرصے سے میں بھی اپنے مختلف النوع نثر پاروں کو الگ الگ موضوعات کے تحت یکجا کرکے ان کو کتابی شکل دے رہا ہوں . . . . ."

بعض مقدمے اور تعارفی نوٹ چند سطروں پر مشتمل ہیں، اور بعض خاصے طویل ہیں، جن کو مقالے کہا جا سکتا ہے! سید الطاف علی بریلوی تجربہ کار اور صاحب نظر انشاء پرداز اور مورخ ہیں، اُن کی تحریریں دلچسپ ہی نہیں معلومات آفریں بھی ہوتی ہیں، انہوں نے تاریخ شعر و ادب، معاشیات اور تعلیم کے رنگارنگ موضوعات پر مقدموں اور دیباچوں کے عنوان سے مضامین لکھے ہیں جو اُن کی وسعتِ مطالعہ کی دلیل ہیں! سید صاحب موصوف کی اس کتاب کی بدولت راقم الحروف کے علم میں پہلی بار یہ بات آئی کہ حضرت اکبر الہ آبادی نے ۱۹۱۲ء میں ولفریڈ اسکاؤن بلنٹ کی کتاب " FUTSRE OF ISLAM " کا ترجمہ "مستقبل اسلام" کے نام سے کیا تھا۔

صفحہ ۹۵ پر صاحبِ "خاص مطالعہ" نے کلیاتِ حسن مطبوعہ حیدرآباد کے حوالہ سے حیرت ہے کہ "حسن سنجری" کس طرح لکھ دیا، حالانکہ کلیات پر مولوی مسعود علی محوی کا جو دیباچہ ہے، اُس میں اُنہوں نے بتایا ہے کہ "سنجری" غلط مشہور ہو گیا ہے، حضرت حسن کے وطن کی نسبت سے صحیح لفظ "سجزی" ہے۔

"زیادہ سے زیادہ وہ الطال و عجائب پرستی اور ذہنی آسودگی کا سامان بہم پہونچائیں" (ص۲۰۳) غالباً وہ "اباطیل" کہنا چاہتے ہیں یہی تباہی باتیں، ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو ——— "اور بعض مضمون کو بغیر حشو و زوائد اور عبارت آرائی سے مبرا کرکے کسی بے ساختہ انداز سے شروع کر دیا جاتا ہے" (ص۲۳۴) اس جملے میں "مبرا کرکے" نے جھول پیدا کر دیا۔

اس کتاب پر پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب صدر شعبہ اُردو سندھ یونیورسٹی نے مقدمہ لکھا ہے اور کھلے دل سے اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔

".. فاضل مصنف کی زبان اسقام سے پاک ہے، ان کا طرزِ تحریر رواں اور شگفتہ ہے، ان کی پختہ کاری اور کہنہ مشقی لائقِ ستائش ہے۔"

صحرا

از :۔ طالب جے پوری، ضخامت .. اصفحات (مجلد) قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ :۔ طالب جے پوری، ۱۸ ہسٹنگز روڈ، الہ آباد

جناب طالب جے پوری خوش گو شاعر ہیں غزل اور نظم پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اُن کی فکر سلجھی ہوئی، دماغ مرتب اور دل چوٹ کھایا ہوا ہے۔

منتخب اشعار :۔

اب جس کو دیکھئے وہی بنتا ہے سرفروش — کیا اس دیار میں کوئی قاتل نہیں رہا

سلہ "مرتب کرتا ہے" لکھنا تھا۔ (م۔ق)

وہ معذرتِ شب کہاں ہیں وہ شام و سحر کہاں
سب اُن کے ساتھ اُن کی طرح جا کے رہ گئے

پاسِ ادب سے ہو نہ سکے لب کشا کبھی
ہم شمعِ انجمن کی طرح بے زباں رہے

ہزار بت شکن آئے مگر نہ توڑ سکے
غرورِ رب سے بڑا سومنات ہے شاید

یوسف نہیں تو گرمیٔ بازار بھی نہیں
جنسِ گراں نہیں تو خریدار بھی نہیں

دنیا کا کب کام رکا ہے
ہم بھی نہ ہوتے تو کیا ہوتا

سبق دے کر اولوالعزمی کا خاک افتادہ ذروں کو
کیا ہے ہمسرِ ماہ و مشتری کا ہمسفر میں نے

چمن میں اپنی بے نوری پہ نرگس اب نہ روئے گی
کئے ہیں نرم رنگ و بُو میں پیدا دیدہ ور میں نے

نصیب آج زمانے کی ٹھوکریں ہیں مجھے
وہ دن بھی تھے مری ٹھوکر میں جب زمانہ تھا

اشجار پہ مرغانِ نوا سنج کے نغمے
فطرت کے مغنی نے سنبھالا تھا دو تارا

عارض کے قریں کان کے آویزے کا موتی
مہتاب کے پہلو میں چمکتا ہوا تارا

مچل رہے ہیں پہاڑوں کی گود میں جھرنے
ہوا میں زمزمۂ آبشار ہے ساقی

دلوں کو مست کئے دے رہی ہے صوتِ ہزار
ٹٹیریوں کی نوا خوشگوار ہے ساقی

والدۂ مرحومہ کی یاد میں :—

تو نے ہونے نہ دیا دانۂ یتیمی محسوس
باپ کی موت کا غم تازہ ہوا تیرے بعد

اب وطن کس کی زیارت کے لئے جاؤں گا
اب وہاں کون مجھے دے گا دعا تیرے بعد

کاش دیکھتے مرے احباب مرے بعد تجھے
تعزیت ناموں میں جو مجھ کو لکھا تیرے بعد

دوسرا رخ :—

سنتے ہیں اک زمانے پہ وہ مہرباں رہے
ہم سے مگر ہے تو اذیت رساں رہے (ص ۳۵)

"اذیت رساں" نے مطلع کا سارا لطف غارت کر دیا۔

اللہ رے احتراز میں بھی یہ پاسِ وضعِ عشق
سرزد نہ ہو سکی کوئی دیوانہ پن کی بات

"سرزد نہ ہو سکی" — غزل میں اس کا استعمال کھٹکتا ہے!

شعورِ زندگی ہے عشق جب سے
ہر اک گتھی سلجھتی جا رہی ہے (ص ۴۸)

شعر میں کوئی مزہ نہیں!۔

محبت ہے دلیلِ آدمیت
مگر یہ شے بہت صبر آزما ہے (ص ۶۵)

"دلیلِ آدمیت" کو "صبر آزما" سے کیا مناسبت ہے!

خوب ہے گنگ و جمن کا بھی یہ سنگم غالب
دل مگر کہتا ہے یہ رودکشِ جے پور نہیں (ص ۶۸)

"رودکش" یہاں صحیح استعمال نہیں ہوا!

جناب حبیب احمد صدیقی نے اس کتاب پر خامہ شگفتہ "پیش لفظ" لکھا ہے، خود شاعر نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت دلچسپ ہے۔

ماہنامہ دوام

ترتیب دینے والے:— مختار احمد مظاہری (مسؤل) اور شبنم سبحانی (معاون) سالانہ چندہ سا

ملنے کا پتہ:— ماہنامہ دوام، ٹانڈہ، ضلع فیض آباد (یو۔پی۔ انڈیا)

ماہنامہ "دوام" کا دوسرا سال جنوری میں شروع ہوا ہے، اب تک اس کے چار شمارے ہماری نگاہ سے گذرے ہیں مضامین کی ترتیب، تنوع اور افادیت غرض ہر اعتبار سے یہ رسالہ خوب بلکہ بہت خوب ہے، اس کے ترتیب دینے والے صاحب ذوق اور سلیقہ مند ہیں۔

"دوام" پاکیزہ ادب کا ترجمان ہے، اس کے بعض مضامین اور غزلوں میں "معمان" بھی ہے مگر شائستہ اور سنجیدہ! اور کاسائز، کتابت، طباعت اور کاغذ، ہر چیز جاذب نظر! "دوام" کی مقبولیت اور کامیابی کے لئے ہم دعا کرتے ہیں اور توقع ہے کہ اس کا معیار بلند ہوتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ جدید شعر و ادب پر نقش دوام بن جائے۔

فارابی — یا — فاراجی

جناب محمد حفیظ پھلواری نے سلطان محمود غزنوی کی علم دوستی اور معارف نوازی کا ذکر کرتے ہوئے مشہور فلسفی فارابی کا نام لکھ دیا، جس پر صاحب نے گرفت کی کہ فارابی تو محمود غزنوی سے پہلے گزرا ہے! محمود غزنوی کے عہد سے اس کا کیا تعلق؟ ہم نے صاحب مضمون نگار کو وہ خط بھیج دیا، آ جواب بہت مختصر آیا، ہم نے پھر وضاحت چاہی، اس پر صاحب موصوف نے لکھا!

"مسٹر ایس: ایس حامد ایم۔اے، ایل، ایل، بی صدر شعبہ تاریخ ایم اے او کالج لاہور کی کتاب "پاکستان و ہند کی اسلامی تاریخ" کے صفحہ ۹۳-۹۴ پر محمود غزنوی کی "علمی اور ادبی سرگرمیاں" کے تحت درباری علماء کی جو فہرست دی ہے اس میں لکھا ہے۔

"فاراجی —— اپنے زمانے کا ماہر فلسفی تھا"

میرے پہلے مسودے میں فاراجی درج ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جب مضمون صاف کیا گیا، تو میں نے شاید فارابی لکھ دیا ہو!

"فاراجی" کا نام میری نظر سے کسی کتاب میں نہیں گزرا، میں نے پروفیسر محمد ایوب قادری کو لکھا ہے کہ پتہ لگائیں فاراجی کوئی فلسفی تھا یا نہیں"

بعض اوقات ناموں کے تلفظ اور املا کی یکسانی اور تشابہ کے سبب اس قسم کے تسامح ہو جاتے ہیں، علامہ اقبال تک کو دھوکا ہوا کہ انہوں نے شہاب الدین (مقتول) کو شہاب الدین سہروردی سمجھ لیا!

(ادارہ "فاران")

آدم جی کے پارچہ جات
دیرپا ہوتے ہیں
آدم جی کاٹن ملز۔ لانڈھی کراچی

FARAN Karachi – March 1968. Regd: S, No.

انٹرنیشنل پریس کراچی